DUE DATE

Cl No ________________ *Acc No* ________________

Late Fine **Re. 1.00** per day for first 15 days
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date





۱۸ اگست ۱۹۶۹ء کو پروفیسر ہمایوں کبیر کا انتقال ہوگیا۔ انھیں اچانک قلبی دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔
پروفیسر کبیر فروری ۱۹۰۶ء میں بنگال میں فرید پور کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انھوں نے کلکتہ اور آکسفورڈ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں وہ کانگرس میں شامل ہوئے اور برسوں جدوجہد آزادی میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ آزادیٔ وطن کے بعد ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۶ء تک مولانا آزاد کے ماتحت حکومت ہند کے مشیر اور سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد وہ لگ بھگ ۹ برس تک مرکزی کابینہ کے رکن رہے۔ ۱۹۶۶ء میں کانگرس سے مستعفی ہو کر بنگلہ کانگرس میں شامل ہو گئے۔ اُن کی موت سے ملک ایک عظیم مدبر، سیاست دان، ماہر تعلیم اور محب وطن سے محروم ہوگیا ہے۔

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
راج نرائن راز

جلد ۲۸ — شمارہ ۲

ستمبر ۱۹۶۹ء

بھادوں شک ۱۸۹۱

سرورق: گوہر جن اروڑہ

ترتیب

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ وشائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

خط ملاقات

چاند کی سطح پر انسان کا اُترنا اور پھر صحیح و سالم واپس آنا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ سائنس کے اس کارنامے کی تکمیل میں ۸ سال لگے۔ اور ایک اندازے میں چار لاکھ سے زیادہ اشخاص نے اس کی منصوبہ بندی، مشینوں اور کارخانوں کے ڈیزائن اور تعمیر اور افراد کی تربیت کے سلسلے میں کام کیا۔

اس کامیابی نے خلاکی ان دیکھی دُنیا کے لئے راستہ کھول دیا ہے اور انسان کی تلاش و تجسس اور جرأت و ہمت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

چونکہ چاند ہوائی کرّے اور زندگی سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے خالی ہے اس لئے یہ اس زمین اور تمام نظام شمسی کے ارتقاء کے متعلق سراغ مہیا کر سکتا ہے۔ چاند زمین سے تین دن کی مسافت اور زمین کی جسامت کا تقریباً ۵۰ فی صد حصہ ہونے کی وجہ سے کافی نزدیک، ٹھوس اور مستحکم کرہ ہے۔ یہ تقریباً کسی بھی مقصد کے لئے سائنسی تحقیق کا اسٹیشن بنایا جا سکتا ہے۔ اس بے مثال کامیابی پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ بلاشبہ ناز کر سکتا ہے مگر اس مشن کی کامیابی میں دُنیا کے بہت سے ملکوں کے سائنسدانوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے اپنے طور پر کھوج اور تحقیق کے ذریعے سائنس کے اس زبردست کارنامے کو ممکن بنایا ہے۔ اس لئے بجا طور پر امریکی خلاباز دُنیا کے تمام ممالک کے جھنڈے اپنے ساتھ لے گئے تھے جو تختی انھوں نے وہاں نصب کی تھی اس پر کندہ تھا: "ہم یہاں سارے نوعِ انسانی کے امن کے لئے آئے ہیں"

نیل آرم اسٹرانگ اور ایڈون۔ ای۔ ایلڈرن جنہیں چاند کی دھرتی پر پہلے پہل قدم رکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ انسانی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

ہندوستان کے دستور میں ملکی پالیسی کے لئے جو ہدایتیں درج کی گئی ہیں، ان میں کہا گیا ہے کہ حکومت ایسے اقدامات کرے گی جس سے امیری اور غریبی کا فرق کم سے کم ہو، اور معاشی طاقت چند ہاتھوں میں مرکوز اور مجتمع نہ ہو۔

کل ہند کانگریس کمیٹی بھی اصولی طور پر اس بات کو تسلیم کر چکی تھی کہ بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے گا۔ ملک کے مختلف طبقے بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ کر رہے تھے اس لئے جب حکومت نے ۱۴ بڑے بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا تاریخی اعلان کیا تو بجا طور سے سارے ملک میں اس فیصلے کو سراہا گیا اور اس کا خیر مقدم کیا گیا۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنی حکومت کے فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ قدم صرف ملک کے مفاد کے پیش نظر اٹھایا گیا ہے اور اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ترقی کی رفتار کو تیز کیا جائے اور غریبی اور بے روزگاری کے مسئلے کو موثر طور پر کم کیا جائے۔ امیر و غریب اور ترقی یافتہ اور پسماندہ علاقے کے فرق کو کم کیا جائے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے بنکوں کو قومیانا ایک قومی ضرورت ہے۔ ۱۹۶۸ء کے آخر میں ۱۴ بنکوں میں ۲۷۴۲ کروڑ روپے کی رقم جمع تھی۔ اور ان بنکوں نے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء میں بالترتیب ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ اور ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ کا منافع کمایا تھا۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ان بنکوں پر مخصوص گروہوں یا طبقوں کا قبضہ تھا۔ تمام حصہ دار سارے ملک میں منتشر ہوئے اور بعض دوسری وجوہ کی بنا پر ان بنکوں کو چلانے میں کوئی موثر آواز نہیں رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ چھوٹے پیمانے پر تجارت کرنے والوں یا کاشتکاروں یا کسانوں کو ان بنکوں سے برائے نام مدد حاصل ہوتی تھی۔ پھر پسماندہ علاقوں کی ترقی کے معاملے میں بھی ان کا رویہ سرگرم نہ تھا۔

لہٰذا بنکوں کا قومی ملکیت میں آنا کئی لحاظ سے مفید اور کارآمد ہوگا اور حکومت ہند نے ہر لحاظ سے مفید اور مستحسن قدم اٹھایا ہے۔

یہ خبر ہندوپاک کے تمام علمی و ادبی حلقوں میں بڑے رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ مسعود اللہ کے ڈاکٹر عندلیب شادانی کا انتقال ہو گیا۔ عندلیب شادانی کئی حیثیتوں سے ہماری ادبی تاریخ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ادبی تنقید، تاریخ اور تحقیق کے دائرے میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

غزلیں

رہگزر بے نقاب ہوئے، راہبر کھلے ÷ کتنے ہی راز ہم پہ سرِ رہگذر کھلے
پہنچا نہ بڑھ کے محملِ شب تک کسی کا ہاتھ ÷ چاہا کئے کہ بندِ قبائے سحر کھلے
اکثر رہی ہے چھیڑ نسیمِ خیال سے ÷ اکثر وہ بامِ شوق پہ آئے ہیں سر کھلے
اِک موجِ زہرخند لبوں پر مچل گئی ÷ بے چارگیٔ درد پہ جب چارہ گر کھلے
اتنا بھی طائرانِ چمن کو کرو نہ تنگ ÷ گھبرا کے چھوڑ جائیں نہ یہ اپنے گھر کھلے
جب بھی کسی کے عیب و ہنر پر گئی نگاہ ÷ ایسا لگا کہ اپنے ہی عیب و ہنر کھلے
ہوں پانؤں بیڑیوں کی کھنک سے لہولہان ÷ سر ہوں جنوں پسند تو زنداں کا در کھلے
ہر ہر قدم ہے فطرتِ خود دار کارساز ÷ بند ایک در ہوا، تو کئی اور در کھلے!
جب تک سطے پستیوں میں بڑے مضمحل تھے ÷ اونچی ہوئی اڑان تو کچھ بال و پر کھلے
پہلے سے جانتا تو نہ چلتا میں اِن کے ساتھ ÷ اب دور آ گیا ہوں تو یہ ہم سفر کھلے

خبروں کی بھیڑ بھاڑ میں اعجازؔ ہم کہاں؟
جب ہر خبر ہو بند تو اپنی خبر کھلے!

اعجاز صدیقی

فضا ابن فیضی

مہ وشوں، لالہ رخوں، سیم تنوں کے پیچھے
کتنے رسوا ہوئے غنچہ دہنوں کے پیچھے

ہم بھی اِس عہد سے اک ربطِ جنوں رکھتے ہیں
ایک تاریخ ہے خونیں کفنوں کے پیچھے

پوچھ لو اُترے ہوئے چہروں کی ویرانی سے
کتنے صحرا ہیں بھری انجمنوں کے پیچھے

آج شرمندہ ہوئی وضعِ جنوں بھی کیا کیا
ڈھیر شیشے کے ملے تیشہ زنوں کے پیچھے

کوئی حالات کے تیور کو نہ پہچان سکا
قافلے چلتے رہے راہ زنوں کے پیچھے

نظر آیا کوئی چہرہ بھی نہ شیریں کی طرح
کتنے دروازے کھلے کوہکنوں کے پیچھے

رنگ اُڑ جاتے ہیں خوشبوئیں بکھر جاتی ہیں
کیوں صبا وار پھرو گلبدنوں کے پیچھے

ہم وفاؤں کے سلیقے کہیں خود بھول نہ جائیں
اِن وفا دشمنوں، پیماں شکنوں کے پیچھے

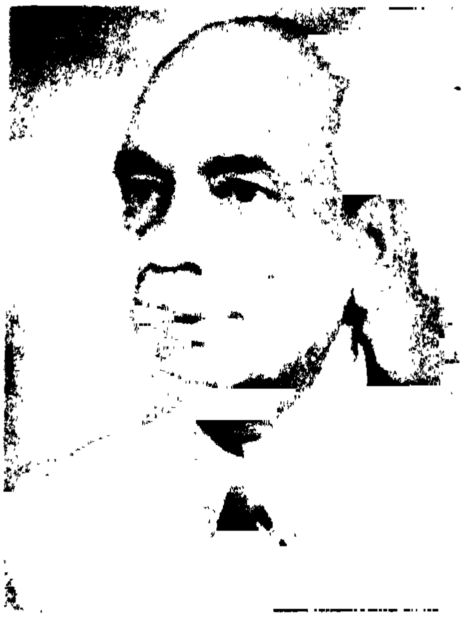
داد یوں بھی ستم وقت کی دی جاتی ہے
پھول بکھراتے چلو سنگ زنوں کے پیچھے

اِس نگر میں تو ہر اک شخص خدا لگتا ہے
یہ کہاں آ گئے، ہم بت شکنوں کے پیچھے

عقل و تہذیب کی جسموں پہ عبائیں ہیں مگر
کون عریاں نہیں اِن پیرہنوں کے پیچھے

کیسے عشاق ہیں صیاد بنے پھرتے ہیں
اپنے آہو نگہوں، سحر فنوں کے پیچھے

اک زمانے کو فضاؔ علم و ہنر بخشا ہے
کچھ روایات ہیں ہم خوش سخنوں کے پیچھے



خانِ آرزو

کی

حیات اور تصانیف

منوہر سہائے انور

اُردو داں طبقہ خانِ آرزو کے نام سے باخبر اور کام سے بے خبر ہے۔ اگر خانِ آرزو نے آبرو، مضمون، یکرنگ، میر، سودا، درد وغیرہ ریختہ گو شعرا کی تربیت نہ کی ہوتی اور ریختہ گویوں کے تذکرے اُن کے چند سطری ذکر سے خالی رہ جاتے تو اُن کا نام کبھی کا فراموش ہو چکا ہوتا۔

خانِ آرزو جیسے جامع حیثیات لوگ ہمیشہ نادر الوجود رہے ہیں۔ ہندوستان میں خسرو اور فیضی جامعیتِ کمال اور کمالِ جامعیت کے لحاظ سے نہایت بلند و برتر مقام رکھتے تھے۔ اِن دو شخصوں کے ناموں کے ساتھ جس تیسرے شخص کا نام لیا جا سکتا ہے وہ خانِ آرزو ہیں۔

خانِ آرزو ہر جہتی قریحے اور ہمہ گیر طبیعت کے مالک تھے، علم و فضل میں اُن کی ہمہ دانی مُسلّم تھی، شاعری میں وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے اُستاد تھے، علمی تحقیق و تدقیق میں اُن کا جواب نہ تھا۔ نقاد اور شارح کی حیثیت سے اُن کو جو رتبہ حاصل تھا اس کی مثال نہیں ملتی، وہ فارسی اور سنسکرت میں توافق دریافت کرنے والے پہلے شخص تھے۔ میر محمد محسن مُصنف محاکمات الشعرار کا قول ہے کہ خانِ آرزو نے اپنے علمی اجتہاد سے فارسی کو عربی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔

مُغولِ مُتاخرین کا عہدِ سلطنتِ مُغلیہ کے سیاسی زوال اور مالی انحطاط کا دَور تھا۔ اِس عہد میں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی علم پروریاں، ادب نوازیاں اور گنج بخشیاں قصۂ ماضی ہو چکی تھیں۔ بدقسمتی سے خانِ آرزو کی زندگی اسی عہد میں گزری۔ بہرحال وہ کمالات کی خاطر خُواہ قدر نہ ہونے کے باوجود آخری دم تک فارسی علم و ادب کی بیش از بیش خدمت کرتے رہے۔

شیخ سراج الدین علی استعداد خاں آرزو ۱۶۸۸ء میں بمقام اکبرآباد پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد شیخ حُسام الدین کا پیشہ سپہ گری تھا۔ خانِ آرزو والد کی طرف سے شیخ کمال الدین خواہرزادہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی اولاد میں سے تھے اور والدہ کی جانب سے اُن کے رشتے کا سلسلہ شیخ محمد غوث گوالیاری اور شیخ فرید الدین عطّار نیشاپوری تک پہنچتا تھا۔

خانِ آرزو کی عربی اور فارسی کی تعلیم بہت چھوٹی عمر میں شروع ہو گئی تھی۔ وہ بلا کے ذہین اور طبّاع تھے۔ ایامِ طفلی میں انھوں نے نو دس سالہ مرزا نعیم شاگردِ مُلّا شیدا کے شعر

رُو سپید آمدم از غیب و شدم نامہ سیاہ
من دریں خانہ سحر آمدم و شب رفتم

پر اعتراض کیا تھا کہ الفاظِ شب و سحر میں تضاد نہیں ہے۔ دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیئے

من دریں غمکدہ روز آمدم و شب رفتم

نعیم نے یہ ترمیم منظور کر کے اس کی ذہانت کی بے حد تعریف کی۔ شاعری میں اُن کے اُستاد میر عبدالصمد سخن اور میر غلام علی احسنؔ تھے۔

خانِ آرزو اوائلِ عہدِ فرخ سیر میں بہ تلاشِ معاش دہلی آئے یہاں انھیں سرخوش، بیدل اور ناجی سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ جب ناجی گوالیار کی دیوانی پر مامور ہوئے تو خانِ آرزو کو بھی گوالیار کے محکمہ سائر میں ملازمت مل گئی مگر وہ زیادہ دیر تک برسرِ کار نہ رہ سکے۔ کیونکہ سید برادران نے فرخ سیر کے قتل کے بعد اپنے آدمیوں کو روزگار بہم پہنچانے کی غرض سے بہت سے سرکاری ملازم (بشمولِ خانِ آرزو) موقوف کر دیئے تھے۔

اس کے بعد خانِ آرزو ۱۷۱۹ء میں دوبارہ دہلی آئے اور یہیں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ انھوں نے یہاں مقیم ہو جانے پر اپنی علمی اور ادبی سرگرمیاں بڑے گرمجوشانہ طریق سے شروع کر دیں جو اُن کے سی و ہفت سالہ مدتِ سکونت کے اختتام تک برابر جاری رہیں۔ دہلی میں اُن کو حُسنِ اتفاق سے رائے زیاں آنند رام مخلص جیسا بارسوخ دوست اور شاگرد مل گیا۔ یہ بادشاہ محمد شاہ کے دربار میں نواب قمر الدین خاں وزیرِ اعظم کا وکیل تھا۔ اُس نے خانِ آرزو کو بادشاہ سے جاگیر (منصب ہفت صدی) اور خطاب استعداد خاں دلانے کے علاوہ خود بھی ان کی مالی امداد کی۔ خانِ آرزو بحیثیت منصب دار دو سال تک صبح و شام دربار میں حاضر ہوتے رہے لیکن آگے چل کر بادشاہ کی کم التفاتی کے باعث یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ دہلی میں آنند رام مخلص کے علاوہ اُن کے گہرے دوست خواجہ محمد عاقل، خواجہ ناصر عندلیب اور میر شمس الدین فقیر از اول تا آخر حقِ دوستی ادا کرتے رہے۔ اُن کے تعلقات جن سربرآوردہ ارکینِ سلطنت سے تھے اُن میں امیر الامرا صمصام الدولہ خانِ دوراں سپہ سالار، اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خاں وزیرِ اعظم، نواب امیر خاں انجام، نواب اغر خاں دیوان صوبہ دار کشمیر، نواب اخلاص خاں وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مؤتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں شوستری بادشاہ محمد شاہ کی جلوت کے جلیس اور خلوت کے انیس تھے۔ انھوں نے ۱۷۳۴ء میں خانِ آرزو کو اپنی مصاحبت میں لے کر افکارِ دنیوی سے نجات دلا دی۔ یہ مصاحبت چھ سال یعنی مؤتمن الدولہ کی وفات تک برقرار رہی۔ اس زمانے میں دہلی پر بڑی خوفناک آفتیں آئیں مثلاً نادر شاہ کا حملہ، اہلِ دہلی کا قتلِ عام، اہلِ ثروت سے خطیر رقوم تاوان کی بجز وصولی، خزانۂ شاہی پر غنیم کا قبضہ، امرا و عمائد کی تذلیل وغیرہ وغیرہ، لیکن خان آرزو اس پُرآشوب دور میں بھی تصانیف کا انبار لگانے میں مصروف رہے۔ اس وقت اُن کے کمالِ شاعری اور تحقیق و تدقیق کی شہرت کا آفتاب خطِ نصف النہار پر تھا اور وہ ہندوستان میں فارسی کے شاعرِ اعظم اور سراج الشعرا اور سراج المحققین والمدققین کے القاب سے یاد کیے جاتے تھے۔ اکثر کہنہ مشق شعرا اپنے دیوان اُن کے پاس لاتے اور حکّ و اصلاح کی درخواست کرتے تھے اور اُن کے شاگردوں کی تعداد دہلی اور اُس کے مضافات کے علاوہ دور افتادہ شہروں اور قصبوں تک بھی پہنچی ہوئی تھی۔

خانِ آرزو ہر مہینے کی پندرھویں تاریخ کو اپنے مکان واقع صدر بازار میں بڑے اہتمام سے مشاعرے اور مراختے منعقد کیا کرتے تھے جن میں تمام برگزیدہ ہندوستانی اور ایرانی شعرا کی شرکت ہوتی تھی۔

مؤتمن الدولہ کی وفات کے بعد اُن کے بڑے بیٹے نجم الدولہ مرزا محمد شوستری نے خانِ آرزو کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا جس کی رقم (ڈیڑھ سو روپے) انھیں ماہ بماہ ملتی رہتی تھی بادشاہ محمد شاہ نے ان کو جو جاگیر نواحِ گوالیار میں دی تھی اُس کا خاتمہ مرہٹہ گردی نے کبھی کا کر دیا تھا۔

جب شیخ محمد علی حزیں اصفہانی نے اُس نہایت عمدہ سلوک کے باوجود جو بادشاہ، اُمرا اور عوام کی طرف سے ظہور میں آیا ہند اور اہلِ ہند کے متعلق ہجویہ اشعار لکھے تو خانِ آرزو نے شیخ کے دیوان سے بہت سے معیوب اشعار برآمد کر کے اُن پر اعتراضات وارد کئے اور پھر اُن کو یکجا کر کے ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع کر دیا۔ بعض اعتراضات میر شمس الدین فقیر نے حدائق البلاغۃ اور اکثر و بیشتر نواب علی قلی خاں والہ داغستانی نے تذکرہ ریاض الشعرا میں داخل کر لئے۔ والہ نے ریاض الشعرا کا نسخہ اصفہان بھیج دیا تاکہ اصفہانیوں کو اپنے شاعرِ اعظم اور فاضلِ جلیل کی درگت کا علم ہو جائے۔

۱۷۵۰ء میں نجم الدولہ کے بنگش پٹھانوں سے لڑتے ہوئے مارے جانے پر اُن کے چھوٹے بھائی اور شوستری خاندان کے آخری فرد نواب رشید خاں سالار جنگ جانشین ہوئے۔ سالار جنگ نے خانِ آرزو کا وظیفہ جاری رکھنے کے علاوہ انہیں معاش کی طرف سے ذرا بھی تنگ نہیں ہونے دیا۔

۱۷۵۴ء میں محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ کی معزولی پر عالمگیر ثانی بادشاہ ہوا۔ اس کے منظورِ نظر درباری بڑے منافق اور سازشی تھے۔ ان کی خطرناک روش دیکھ کر سالار جنگ نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لکھنؤ میں اُن کی بہن بہو بیگم شجاع الدولہ کی اہلیہ تھیں۔ جب سالار جنگ اپنے متعلقین اور متوسلین کے ساتھ لکھنؤ چلنے لگے تو انھوں نے خانِ آرزو کی

درخواست پر انھیں ان کے آبائی وطن اجودھیا میں باقی زندگی بسر کرنے کی اجازت دے دی۔

اُس زمانے میں لکھنؤ ارباب کمال کا کعبہ تھا۔ چنانچہ دُور دُور سے عُلما، فُضلا اور شُعرا اس کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے۔ سالار جنگ نے شجاع الدولہ سے بھی خانِ آرزو کا وظیفہ تین سو روپے ماہانہ مقرر کرادیا تھا۔ خانِ آرزو وطن جاری ہوجانے پر اجودھیا سے لکھنؤ آگئے اور ابھی چند ہی ماہ وظیفہ وصول کر رہے تھے کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کا وقت آپہنچا۔ اُن کی وفات ۷۰ سال کی عمر میں ۲۶ جنوری ۱۷۵۶ء کو ہوئی۔ سالار جنگ نے اُن کی نعش پہلے لکھنؤ میں بطور امانت سپردِ خاک کرائی اور پھر وصیت کے مطابق میر محمد حسن کی نگرانی میں دہلی بھیجدی۔ میر محمد حسن خانِ آرزو کے بھانجے اور میر محمد حسن مصنّف مجمع النفائس(؟) کمالات الشعراء کے والد تھے۔ خانِ آرزو نے دریائے جمنا کے کنارے دہلی کی ایک آبادی وکیل پورہ نامی میں رائے رایان آنند رام مخلص کے "رنگ محل" کے پاس اپنا ذاتی مکان تعمیر کرالیا تھا۔ اُن کی نعش اسی مکان میں دفن ہوئی۔

انھیں دہلی سے بڑی محبت اور روحانی نسبت تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس شہر کے لئے اپنی تصانیف میں جابجا الفاظ "شاہجہاں آباد حضرتِ دہلی" استعمال کئے ہیں اور ایک غزل ایک قطعہ اور ایک رُباعی میں اُس کی تعریف کی ہے۔ رُباعی کے آخری دو مصرعے جن میں غالباً شیخ محمد علی حزیں اصفہانی سے خطاب ہے، یہ ہیں:-

با دہلیٔ ما مسنج اصفاہان را
کاں نصفِ جہان واِیں جہان آبادست

اگرچہ خانِ آرزو تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کے معترف و مدّاح تھے لیکن انھیں ایرانیوں میں نشاپوری، وحشی، وحشت بیاضی، فغانی، ظہوری، کمال خجندی، سنائی، زلالی، سلیم اور آثر شیرازی اور ہندوستانیوں میں سالم کشمیری اور غنی کشمیری سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ لغت میں وہ فرہنگِ جہانگیری اور فرہنگ رشیدی سے پہلے کی کُتبِ لُغت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ علم بیان میں خود اُن کی کتاب سے پہلے کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ سنسکرت اور فارسی میں توافق لسانیں اُن سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیا تھا۔ علم بیان اور علم معانی اُن کی روش مجتہدانہ تھی۔ نقد و نظر میں اُن کا قول قولِ فیصل سمجھا جاتا تھا۔ شعر نگاری میں وہ مُلّایانہ تکلفات باردہ سے اجتناب کرتے اور صرف نفسِ مضمون کی وضاحت اور اُس کے حُسن و قبح سے سروکار رکھتے تھے۔

اب خانِ آرزو کی تصانیف کا اجمالی ذکر آتا ہے۔

۱۔ دیوانِ آرزو ۔ یہ جُملہ اصنافِ سُخن پر حاوی ہے۔ اس میں خانِ آرزو نے اپنی اُستادی پر کئی جگہ تفاخر کیا ہے۔ ایک شعر جس میں خُود کو ہندوستان کا شاعرِ اعظم سمجھ کر ایران کے ملک الشعرا کو دعا دی ہے یہ ہے:

چو طوطی ام چمن سبز ہند را بلبل
زمن دعا برسد عندلیب ایران را

۲۔ دیوانِ آرزو درجواب دیوانِ آثر شیرازی ۔ آثر شیرازی (وفات [illegible]) ایران میں بڑا تازہ گو شاعر مانا جاتا تھا۔ جب اُس کا دیوان ہندوستان آیا تو پہلے خانِ آرزو کے پیرو مُرشد شاہ گلشن نے اس کا جواب لکھا۔ پھر خانِ آرزو نے خامہ فرسائی کی اور چند ہی ماہ میں اُس کا جواب لکھ ڈالا۔ شاہ گلشن خانِ آرزو کے جوابی دیوان کو آثر کے دیوان پر ترجیح دیتے ہوئے دونوں میں دس اور پندرہ کا فرق بتاتے تھے۔

۳۔ دیوانِ آرزو درجوابِ دیوان فُغانی

۴۔ دیوانِ آرزو درجوابِ دیوانِ سلیم

۵۔ دیوانِ آرزو درجوابِ کمالِ خجندی ۔ یہ دیوان ردیف دال سے آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ خانِ آرزو نے اس کا آغاز اپنی وفات سے تھوڑی ہی مدت پہلے کیا تھا۔

۶۔ مثنوی سوز و ساز ۔ یہ مثنوی زلالی کی مثنوی محمود و ایاز کے جواب میں لکھی گئی۔

۷۔ مثنوی جوش و خروش ۔ یہ نوعی کی سوز و گداز کا جواب ہے۔

۸۔ مثنوی مہر و ماہ ۔ یہ مثنوی ایسی بحر میں ہے جو عام طور سے مثنوی نگاری کے لئے مستعمل نہیں ہوتی۔ خانِ آرزو اس کے متعلق لکھتے ہیں ؎

اول نہر بہشت است ایں   کاوردم زفلک بزمیں

۹۔ مثنوی عبرت فسانہ ۔ یہ سلیم کی مثنوی قضا و قدر کے جواب میں ہے۔ مگر نامکمل رہ گئی۔

۱۰۔ ایک نامکمل مثنوی حکیم سنائی غزنوی کی مثنوی حدیقۃ الحقیقہ کی بحر میں۔

۱۱۔ عالم آب ۔ یہ ظہوری کے ساقی نامہ کا جواب ہے۔

۱۲۔ سراج اللغتہ ۔ یہ ایک ضخیم محققانہ فرہنگ ہے جس میں الفاظ و محاورات و مصطلحات کی تحقیق بڑی تدقیق کے ساتھ کی گئی ہے۔ شعرائے متقدمین کا مطالعہ کرنے کے لئے سراج اللغتہ کے بغیر چارہ نہیں۔ اس

فرہنگ کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع کے اغلاط پر سیر حاصل بحث کر کے ان کی تصحیح کی گئی ہے۔ رائے ٹیک چند بہار سراج اللغتہ پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ انھوں نے خان آرزو سے اجازت لے کر اس کے اکثر مندرجات بہار عجم میں داخل کر لئے۔ جرمن مستشرق بلاخمین نے لکھا ہے کہ اگر یورپ میں برہانِ قاطع کا لاطینی ایڈیشن خانِ آرزو کی تصحیحات کے ساتھ شائع ہوتا تو وہاں کے علما برہان کے اغلاط سے ناواقف نہ رہتے اور چند در چند مغالطوں میں مبتلا نہ ہوتے۔ خان آرزو سراج اللغتہ میں جا بجا فارسی اور سنسکرت الفاظ کا توافق دکھاتے نہیں تھکتے۔ اُن کا قول ہے کہ ان دونوں زبانوں میں توافق کی مثالیں حدِ حساب سے خارج ہیں۔

۱۳۔ چراغ ہدایت۔ یہ لغت ایک علیحدہ کتاب اور بقولِ خانِ آرزو سراج اللغتہ کا دوسرا دفتر ہے۔ اس میں جامی کے بعد آنے والے مستعمل الفاظ و اصطلاحات درج ہیں جو فرہنگ جہانگیری، مجمع الفرس سروری اور برہان قاطع میں نہیں ملتے

۱۴۔ غرائب اللغات یا نوادر الالفاظ۔ اس کا مدوّن عبدالواسع ہانسوی تھا۔ خان آرزو نے اس میں ترمیم، تصحیح اور اضافہ کر کے اس کا نام نوادر الالفاظ رکھا۔ اس میں ہندی یعنی زبانِ ریختہ کے الفاظ درج ہیں جن کے معنی فارسی میں بیان کئے گئے ہیں۔

۱۵۔ عطیۂ کبریٰ۔ اس کا موضوع علم بیان ہے۔ خانِ آرزو لکھتے ہیں کہ علم بدیع پر تو حدائق السحر، حدائق الحقائق، مجمع الصنائع وغیرہ کتابیں موجود تھیں لیکن علم بیان پر کوئی رسالہ نہیں پایا جاتا تھا۔ نظر برآں میں نے یہ کتاب لکھی کہ مشتاقانِ فن اس شعبے میں مہارت حاصل کر کے محاسن شعری سمجھنے پر بخوبی قادر ہو جائیں۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ عطیۂ کبریٰ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

۱۶۔ موہبتِ عظمےٰ۔ یہ بھی بقول خانِ آرزو علم معانی پر پہلی کتاب ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شعرائے متاخرین نے بڑے دقیق اور بعید الفہم استعارے استعمال کئے ہیں جن کا حسن و قبح علم معانی میں دستگاہ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں نے ۳۵ سال تک شعرائے متاخرین کا کلام دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے۔

۱۷۔ مثمر۔ یہ خانِ آرزو کا بڑا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اسی کی بنا پر کہا گیا تھا کہ انھوں نے فارسی کو عربی مرتبے تک پہنچا دیا۔ فارسی میں علم لسان اور علم اصواتِ حروف پر کوئی کتاب نہ تھی۔ خانِ آرزو نے امام جلال الدین السیوطی کی عربی کتاب مزہر کے مقابلے میں مثمر لکھی۔ اس کتاب کی ۱۴ فصلیں ہیں جنہیں اصلیں کہا گیا ہے۔ یہ کتاب خانِ آرزو ہی لکھ سکتے تھے۔ کیونکہ اُن کے زمانے کے ایرانی فضلا میں سنسکرت الفاظ کی ساخت اور معانی سے بے خبری کے باعث فارسی اور سنسکرت الفاظ کا توافق دریافت کرنے کی اہلیت نہیں تھی اور ہندوستان میں بھی کوئی شخص اُن کی طرح مدتِ مدید تک اس قسم کی تحقیق و تدقیق کر کے مطلوبہ لیاقت پیدا نہ کر سکا۔ مثمر میں اور بھی بڑی فکر انگیز اور غور طلب بحثیں آئی ہیں مثلاً کیا اہل زبان سے زبان کے استعمال میں غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ کیا ہندوستانی فارسی زبان دانی میں اتنی مہارت پیدا کر سکتے ہیں کہ انہیں اہلِ زبان کا ہمسر مان لیا جائے۔ کیا ہندوستانیوں نے فارسی زبان میں جو اجتہاد کئے ہیں، وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔

۱۸۔ سراجِ منیر۔ شاہجہانی عہد کے جلیل القدر فاضل، شاعر اور نثار ابوالبرکات مُلّا منیر لاہوری نے اپنی کتاب کارنامہ میں عرفی، طالب ظہوری اور زلالی کے بعض اشعار پر اعتراضات کئے تھے۔ سراجِ منیر اُن کا رد ہے۔ اس میں خانِ آرزو نے بڑی مدلل بحث کر کے منیر کے ہر اعتراض کا شافی جواب دیا ہے۔

۱۹۔ دادِ سخن۔ یہ ایک محاکمہ ہے۔ مُلّا شیدا نے قدسی کے ایک قصیدے پر اسی قصیدے کی زمین میں قصیدہ لکھ کر اعتراضات وارد کئے تھے۔ بعد ازاں ابوالبرکات مُلّا منیر لاہوری نے ان دونوں قصیدوں کی بحر و قوافی میں قصیدہ لکھ کر قدسی کے اشعار اور شیدا کے اعتراضات کا جائزہ لیا۔ خانِ آرزو نے دادِ سخن میں اس بحث پر مزید بحث کر کے محاکمہ کیا ہے۔

۲۰۔ تنبیہ الغافلین۔ اس کتاب میں خانِ آرزو نے شیخ محمد علی حزیں اصفہانی کے بہت سے اشعار معیوب قرار دیئے ہیں۔ اعتراضات ان نوعیتوں کے ہیں: ایسے الفاظ و تراکیب کا استعمال جو مستند اساتذہ کے کلام میں نہیں ہیں۔ مثلاً آتش بدستار بستن، آب رفتہ در اباغ آمدن وغیرہ؛ غلط بندشیں جن سے اشعار میں اہمال پیدا ہو جاتا ہے عروضی لغزشیں، مصرعوں میں فقدانِ ربط۔

۲۱۔ خیابان۔ یہ گلستان سعدی کی شرح ہے۔ اس میں متن کی تشریح کے علاوہ میر نور اللہ احراری اور ملا سعد جیسے شارحوں کی شرح پر انتقاد بھی ہے۔

۲۲۔ شگوفہ زار۔ یہ نظامی گنجوی کے سکندر نامہ کی شرح ہے۔

اس میں بھی اگلے شارحوں کی شرحیں زیر بحث لائی گئی ہیں۔

۲۳۔ شرح قصائد عرفی۔ اس میں اشعار کا مفہوم بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور ابوالبرکات ملا منیر لاہوری اور دوسرے شارحوں کے اعتراضات رد کیے گئے ہیں۔

۲۴۔ شرح گل کشتی۔ ایرانی شاعر میر عبدالعالی نجات نے پہلوانی اور کشتی کے فن پر ایک مثنوی لکھی تھی جو کثیر التعداد فنی اصطلاحوں کی وجہ سے بعید الفہم تھی خان آرزو نے شرح لکھ کر یہ دشواری رفع کر دی۔

۲۵۔ سراج وہاج۔ یہ خواجہ حافظ شیرازی کے ایک شعر پر شعرا کی بحث اور خان آرزو کے محاکمے سے متعلق ہے۔

۲۶۔ آداب عشق۔ اس رسالے کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔

۲۷۔ معیار الافکار۔ اس میں فارسی زبان کے قواعد درج ہیں۔

۲۸۔ پیام شوق۔ یہ خان آرزو کے رقعات کا مجموعہ ہے۔

۲۹۔ گلزار خیال۔ اس میں فصل بہار اور ہولی کی کیفیت رنگین عبارت میں بیان کی گئی ہے۔

۳۰۔ شرح مختصر المعانی۔ تفتازانی نے تلخیص کے تیسرے باب کی شرح لکھی تھی۔ یہ اس شرح کی شرح ہے۔

۳۱۔ مجمع النفائس۔ یہ ضخیم تذکرۃ الشعرا ہے جس میں ۱۷۳۵ شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے عمدہ اقتباسات درج ہیں۔ اس تذکرے کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ خان آرزو نے جا بجا بحث و تحیص اور نقد و نظر کے علاوہ بعض ایسے مسائل پر بھی اظہار رائے کیا ہے جو فارسی زبان اور فارسی ادب کے اہم پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اس میں کہیں کہیں دلچسپ حکایات بھی ملتی ہیں جن سے اُن کے کردار کا مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ضخامت اور انواع و اقسام معلومات کا خزینہ ہونے کے لحاظ سے مجمع النفائس ایک ادبی سائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔
خان آرزو نے ایران اور ہندوستان کے چند بڑے بڑے شاعروں کے بعض اشعار میں جو ترمیمیں کی ہیں وہ بھی یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

۳۲۔ زوائد الفوائد۔ یہ ایک مصدر نامہ ہے جس میں فارسی کے غیر معروف اور فراموش مصادر کے معانی اور مشتقات درج ہیں۔
اب غزل، قصیدہ، مثنوی اور نثر کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

اشعار از غزلیات

داغِ تردّدِ دل دیوانہ ایم ما
پروانۂ چراغِ پری خانہ ایم ما
کیفیتِ شراب نگاہیم ہمچو موج
اِلتا طراز لغزشِ مستانہ ایم ما

ہر گہہ عرق ازاں گلِ رخسار می چکد
آئینۂ فرنگ زگلزار می چکد
آیہ بروے کار من آورد گریہ ام
ابرِ بہار از در و دیوار می چکد

تصرفست بدل حسن شوخ و شنگِ ترا
زکعبہ باج ستانی بود فرنگِ ترا
گرہے زبندِ قباے خود بکشا بگشت چمن درآ
بہوا فشاں سرِ زلف را حوصلہ بدشتِ ختن درا

این ذرّۂ ناچیز زصد دشت فزونست
کونین تواں گشت مگر دل نتواں شد
آوازۂ من آرزو از فیض سکوتست
بالید بہ آں رنگ خموشی کہ زباں شد

اشعار از قصیدۂ نعتیہ

باشد از عکس ریاحیں عالمِ دیگر در آب
بیضۂ الوان نوردز است ہر گوہر در آب
بسکہ رنگِ تازہ گلہاے بہاری ریختند
چترِ طاؤس است گوئی برگِ نیلوفر در آب

اس سے آگے اشعار لکھ کر قصیدے میں غزل داخل کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

مصرعۂ بحر طویل موج از یاد ش رود
گوش ماہی بشنود ایں نو غزل را گر در آب

غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے:۔

نیست باکم گر فتند از شعرِ تر دفتر در آب
تا قیامت شستہ کے گردد خطِ ساغر در آب
دارم آرام آرزو از اشکِ طوفاں جوشِ خود
از پرِ ماہیست بالینم بزیرِ سر در آب

پھر فخریہ اشعار لکھتے ہیں :-

ریختم طرحِ تازہ فکرِ من زشعرِ تر در آب
ہمچو نیلوفر کشادم یک چمن دفتر در آب
آب داری بسکہ از تیغِ زبانم می چکد
غرق شد از انفعالِ حرفِ من گوہر در آب
آفریں بر من کہ از رطب اللسانیہائے خویش
ریختم رنگِ بہشت از نعتِ پیغمبر در آب

اشعار از مثنوی

قصے کے خاص کردار یعنی شاہزادے کے حسن کا بیان جن اشعار میں کیا ہے اُن میں سے چند یہ ہیں :-

سفید از عشق او چشمِ صباحت
نمک در زخم از حُسنش ملاحت
نگاہ گرم اُو سر جوشِ مستی
امام مذہبِ آتش پرستی
رخِ اُو نو بہارِ لالہ رنگی
خطِ او مصحفِ خطِ فرنگی
تغافل سایہ پرورد نگاہش
ہجومِ نازہا گردِ سپاہش

نثر

"وحق تحقیق آنست کہ زبانِ معتبرِ فارسی زبانِ اُردوے بادشاہیست کہ بعد اختلاطِ فرق وجماعات قرار یافتہ۔ لہٰذا در شعرِ فصحا ونثرِ بلغا زبانِ دیگراں نیست و اگر احیاناً باشد بسببِ قلّتِ حکمِ عدم دارد و آنچہ مقرر شدہ فصیح وبلیغ کہ از ہر شہر والکہ باشد بداں تکلّم نماید و بزبانِ مُلکِ خود مخلوط نہ سازد . . . . پس بہ تحقیق پیوست کہ افصح زبانہائے فارسی زبانِ اُردوست وزبانِ خاصۂ ہر مُلک در شعر و انشا منظور نیست۔ ازیں جاست کہ شاعر از ہر مُلک کہ باشد مثلاً خاقانی از شروان ونظامی از گنجہ وسنائی از غزنیں وخسرو از دہلی بہماں زبانِ مقررہ حرف زند و آں نیست مگر زبانِ اُردو ۔"

خانِ آرزو نے جہاں کلیم کو اپنا ہم زبان کہا ہے وہاں وہ اپنے زمانے کے بھی شاکی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:-

سخنوران دگر سرمہ بر زرد خوردند ۔۔۔۔۔ مگر کلیم کہ امروز ہم زبانِ منست

رابطے نماندہ است در اوراقِ دوجہاں
جُزوے زبانِ ما بخدا سخت ابتراست

شاعری میں خانِ آرزو کی طرز اُن کے تمام محبوب شعرا کی طرزوں کا مرکب تھی جس میں اُن کا ذاتی اندازِ سخن طرازی صاف جھلکتا نظر آتا تھا۔ اگر جواب گوئی داخلِ کمالات سمجھ لی جائے تو بے مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کمال میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

گو عہدِ مغولِ متاخرین میں ملک الشعرا کا عُہدہ خالی رہا لیکن اُن کے معتقد اور مدّاح کیا ہندوستانی اور کیا ایرانی اُنھیں غیر سرکاری ملک الشعرا سمجھتے تھے۔ وہ خود ایک جگہ بیان کرتے ہیں کہ آج کل ہندوستان میں کوئی شاعر اُستادِ کامل نہیں ہے۔ میرے دوستوں نے مجھے بجبر مرتبۂ اُستادی دے دیا ہے۔

وہ فرہنگ نویسی اور الفاظ واصطلاحات کی تحقیق و تدقیق میں یگانۂ روزگار تھے۔ سراج اللغۃ ہر دو دفتر کے منظرِ عام پر آنے کے بعد پہلی فرہنگیں طاق پر رکھ دی گئیں۔ بالفاظ دیگر سراج اللغۃ ناسخ اللغات قرار پائی۔

خانِ آرزو کے زمانے میں فارسی علمِ لسان اور علمِ اصواتِ حروف کا وجود نہ تھا۔ انھوں نے ان علموں کی اساس رکھی اور ہندی یعنی سنسکرت اور فارسی الفاظ میں توافق دریافت کرکے تمام ایرانی اور ہندوستانی اربابِ تحقیق پر اپنی فوقیت ثابت کر دی۔ ان کو اس دریافت پر بجا فخر تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "حق آنست کہ تا الیوم ہیچ کس بدریافتِ توافق زبان ہندی وفارسی بہ آں ہمہ کثرتِ اہلِ لغت چہ فارسی وچہ ہندی ودیگر محققان مہتدی نہ شدہ اِلّا فقیر آرزو" وہ ویدک، ہخامنشی عہد کی فارسی، اوستائی اور پہلوی سے ناواقف تھے اور انہیں قدیم آریائی زبانوں کی تقسیم کا بھی علم نہ تھا۔ تاہم انھوں نے فارسی بعد از اسلام اور سنسکرت کے الفاظ میں توافق دریافت کرکے اُس کی اقسام بیان کردیں۔

علمِ بیان اور علمِ معانی میں اُن کی تصانیف نقشِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انتقاد میں اُن کو نابغۃ الناقدین کہنا غلط نہ ہوگا۔ اُن کے محاکموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑے نکتہ رس اور دقیقہ سنج تھے اور اُن کا استدلال بکسر منطقیانہ ہوتا تھا۔

شارح کی حیثیت سے اُن میں اور پیشہ ور معلّموں میں زمین وآسمان

(باقی ص ۱۸ پر)

دائرہ

روز کی مانند پھر
چاند اندھا ہو گیا
کرتے کرتے رقص تارے تھک گئے
طنز میں ڈوبی ہنسی کا اژدہا
آسماں کے خوں بھرے ہونٹوں پہ لہرانے لگا
اور تھوڑی دیر میں
چوس لیں گی
کانپتی، سوکھی زبانیں، جسم کی
ایک اک رگ کا لہو
اور تھوڑی دیر میں
ذہن کی آئینہ جھیل
سوکھے پتوں، سرد لاشوں
مار و افعی کے بساندے زہر سے اٹ جائیگی
دیکھتے ہی دیکھتے
آتشیں بھن
بحرانِ زیست پر
بابِ دوزخ کی طرح وا ہو گیا
جلتے خوابوں کی مہک موتیا کلیوں کا رنگ
جلتی آنکھوں پر رکھی ٹھنڈی سی گلابی انگلیاں
نوعمر پریوں کے سنہرے بال و پر
آگ پر رکھا ہوا کافور بن کر رہ گئے
وقت کے خاموش ہاتھ
ہانپتے لمحات کی آری لئے
زندگی کے پیڑ تک پھر آ گئے
پھر وہی خونیں ڈرامہ، پھر وہی بیکار کھیل
رس بھری شاخوں بھرے پیڑوں کا خوں پیتی ہوئی آکاس بیل



غزلیں



اک سایہ دوسرے کے مقابل نہیں رہا
یا درد اب رہا نہیں یا دل نہیں رہا
جینا پڑا ہے تجھ سے بچھڑ کر بھی جب ہمیں
اب مرحلہ بھی موت کا مشکل نہیں رہا
پھرتے ہیں کب سے سر کو ہتھیلی پہ رکھ کے ہم
کیا شہر بھر میں اب کوئی قاتل نہیں رہا
پھر کیوں ہے درمیان میں یک صحرا فاصلہ
جب کوئی جسم و روح میں حائل نہیں رہا
کس کس عذاب سے نہ گزرنا پڑا اسے
وہ جو ترے خیال سے غافل نہیں رہا
روئیں گے یاد کر کے ہمیں کل یہ اہلِ بزم
اک بادہ خوار، رونقِ محفل نہیں رہا
کہنی پڑی زمینِ اسد میں غزل اریب
گو میں طرح میں کہنے کا قائل نہیں رہا

○

پل بھر تری نگاہ جو ہم پر ٹھہر گئی!
آیت ہمارے سینے میں جیسے اتر گئی
وہ دن گئے کہ کرتی قیامت بھی انتظار
ہم پر تمہارے ہوتے قیامت گزر گئی
نظارۂ بہار میں گم تھی ہر اک نظر
وہ بوئے خوش بدن ادھر آئی ادھر گئی
اے تہمتِ حیات بتا کیا کریں اسے؟
اکثر ہماری موت ہی رستے میں مر گئی
بیٹھے ہیں کب سے راہ میں آنکھیں بچھائے ہم
سنتے ہیں راتوں رات وہ بنتِ سحر گئی
کس بادہ خوارِ مست کے ہاتھوں سے زندگی
چھوٹی مثالِ جام کہ ہر سُو بکھر گئی
پوچھیں اریب ہی سے کہ ویرانیٔ جہاں
نکلی ہمارے گھر سے تو پھر کس کے گھر گئی

سلیمان اریب

زندگی کی کتاب

شاہدہ یوسف



اپنی زندگی تو ہمیشہ سے جدید افسانوں جیسی رہی، جس میں نہ کوئی خاص پلاٹ تھے اور نہ کرداروں کی واضح تصویریں، جس زاویے سے دیکھیے، بے ربطی کا گمان گذرتا ہے جس طرح شعور کی رو ان افسانوں کے تانے بانے بنتی ہے اسی طرح زندگی کو بھی وہ مکمل بے ربطی اور انتشار سے بچائے رکھتی ہے۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک خوبصورت افسانے کا مواد پنہاں ہوتا ہے۔ شاید یہ بات ٹھیک ہی ہے، کبھی کوئی خاص کہانی پڑھتے وقت، کبھی کسی غزل کا کوئی گہرا شعر سن کر اور کبھی محض اخباروں کی سرخیاں پڑھتے ہوئے مجھے بھی ایسا محسوس ہوا کہ میرے دل کی خلش بھی لائق اظہار ہے، میرے پاس بھی کچھ کہنے کو ہے۔ کچھ لکھنے کو ہے، جسے کچھ لوگ افسانہ، کچھ لوگ حقیقت سمجھیں گے لیکن اصل بات تو شاید سطروں کے درمیان چھپی رہتی ہے جو نہ مکمل افسانہ ہوتی ہے اور نہ مکمل حقیقت۔

اصل اور نقل کی بات بھی کتنی عجیب ہے۔ کہیں پڑھا ہے کہ سائنسدانوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کر لیا ہے جس کے ذریعے وہ دلوں کے حقیقی راز جان لیتے ہیں، بلا کچھ بتائے یا بغیر بولے وہ حافظے اور شعور کی ان لہروں کو ایک نہایت ذکی الحس پلیٹ پر منعکس کر لیتے ہیں جو گذشتہ واقعات یا آئندہ کے منصوبے کو چھپائے رہتی ہیں، کیا پتہ دنیا اس قدر ترقی کر جائے کہ اہم موقعوں پر ہم ایک دوسرے سے بذریعہ زبان گفتگو کرنا ہی بند کر دیں، ہر شخص کے ہاتھوں میں گفت و شنید کے وقت سائنسی آلے کا کوئی ترقی یافتہ موڈل ہو، کوئی بات بھلی لگے تو لب و رخسار کے بجائے ان ہی آلوں کو چومیں اور پیار کریں، اگر کبھی ایسا ہوا تو آدمی اپنا وقار اور بھرم کھو دے گا، وہ اس نقلی پن کے لیے بھی ترسے گا جو تہذیب کا عطیہ، آرزوؤں کا تحفہ ہے، دنیا میں پھر نہ کوئی محبت کا دعویدار پیدا ہوگا اور نہ شعر و ادب کے ایوان میں اتنی روشنی رہے گی، ماہرین نفسیات کی لکھی ہوئی موٹی موٹی کتابیں کباڑیوں کے یہاں بطور خشت نرم، یا ایندھن کیلئے سیر کے حساب سے بکا کریں گی، رحم دل لوگ انہیں خرید کر غربا میں تقسیم کریں گے۔ تاکہ انہیں جلا جلا کر سردی کی طویل راتوں میں روشنی اور حرارت حاصل کریں، کہا جا سکتا ہے کہ بھلا ایسے ترقی یافتہ زمانے میں غربا اور بے گھر لوگ کہاں نظر آئیں گے جو ایسی مدد کے خواہاں ہوں گے، لیکن کون جانے آگے کیا ہوگا . . . . کیونکہ اس زمانے میں تو آسائش کے تمام وسائل کے موجود رہتے ہوئے بھی ہر شخص انسانیت کا دلدادہ لیکن انسانوں سے بیگانہ ہے۔ جس طرح ہر تمدن میں کچھ بڑی خوبیاں اور کچھ نمایاں خامیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی کچھ کھرا پن اور کچھ کھوٹ ملے جلے ہوتے ہیں۔ جنہیں ان کے حقیقی پس منظر میں سمجھنا ہی حق شناسی کا تقاضہ ہے، انہیں الگ الگ دیکھنے کی کوشش آدمیوں کو سمجھنے کا غیر انسانی طریقۂ تفہیم ہے، جس طرح اسکیمونسل کے دل و دماغ کو تجربہ گاہ کی معتدل فضا میں نہیں سمجھا جا سکتا ہے، بلکہ انہیں برف زدہ علاقوں سے باہر لانے کے بجائے تجربہ گاہوں کو وہاں لے جانا ہوتا ہے، اسی طرح ہر آدمی اپنے اپنے تاریک غاروں یا گپھوں میں پناہ گزین ہے، اسے وہیں جا کر سمجھنا ہوگا۔ جس عذاب کے تصور کو ہم جہنم سمجھتے ہیں اسی کشت تصور کو برف کے غاروں میں رہنے والے اپنی جنت کا علاقہ بتاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی شخص کے جنت اور جہنم کا تصور ہو کہ بھیانک اور شیریں

خوابوں کا سبھی کچھ اس کے اپنے اندر سے جنم لیتے ہیں، اور پھر سینے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس لئے مجھے پتہ نہیں کہ اصلیت سے کیا مراد لی جائے۔

ہر کین پہلے ایک چھوٹا موٹا سا واقعہ سنئے جن دنوں میں لکھنؤ میں پڑھتی تھی اور تواریخ کی لکچرر شیلا سرواستو ہمیں قرونِ وسطیٰ کی ہندوستان کی تاریخ پڑھاتی تھیں، ناک نقشہ ترشا ہوا اور تیکھا، رنگ سانولا، قد درمیانہ سے کچھ اونچا، لمبے سیاہ بال، بادامی شکل کی سیاہی مائل آنکھیں پھر اُن کا مجموعی تاثر ایسا تھا جیسے امریتا شیرگل کی صلاح سے صانع قدرت نے یہ مجسمہ تیار کر کے روح پھونکی ہو، عجیب دلکشی تھی چہرے میں، کیسی کیف آگیں نرمی تھی شخصیت میں، میں جو خاص طور سے اس دور کی تاریخ میں اتنی کمزور ہوں تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کا چہرہ تکتے رہنے سے کب فرصت ملتی کہ لکچر سنتی علم کی پیاس سے کہیں زیادہ حسنِ لطیف کی پیاس سے سینہ پھنک رہا تھا جب وہ کلاس میں مجھ سے کوئی سوال پوچھ بیٹھتیں تو غبی سے غبی لڑکیاں اُلٹے سیدھے جواب دے دیتیں، میری حالت البتہ قابلِ دید ہوتی، اول تو سوال ہی سمجھ میں نہیں آتا اور اگر آ بھی جاتا تو اپنی جہالت اور اُن کی توجہ سے اس قدر شرما جاتی کہ زبان ہی گنگ ہو جاتی، اور پھر اُن کی شفقت آمیز تنبیہ سن کر چپکے سے بیٹھ جاتی، اپنے لامتناہی خیالوں میں گم ہو جاتی، دوسری لڑکیاں میری طرف یوں دیکھتیں جیسے میں جان بوجھ کر انجان بن جاتی ہوں یا مجھے مس سرواستو سے جیسے کوئی کد ہو۔

ایک روز وہ کلاس سے باہر برآمدے میں ملیں تو میں نے آداب کیا اور معافی مانگی، وہ مسکرائیں اور بڑے پیارے بولیں "میں نے تو سنا تھا کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں حساب میں کمزور ہوتے ہیں، تعجب ہے کہ تم تاریخ سے اتنی بیزار ہو بات آخر کیا ہے" میں بھلا انھیں کیا جواب دیتی کہ میرا دھیان کہاں رہتا ہے "آپ اتنی اچھی اُردو کیسے بول لیتی ہیں۔" میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور پھر انھوں نے اُردو کلچر اور شاعری سے اپنی خاندانی وابستگی کا ذکر چھیڑ دیا، انھوں نے بتایا کہ کس طرح اُن کے والد صاحب اپنی موت سے چند مہینے پہلے اپنے دیوان کی اشاعت کے لئے فکرمند رہتے تھے اُن کی اُردو کی ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جس میں چند قلمی کتابیں بھی تھیں، انہیں قلمی کتابوں میں مس سرواستو کے دادا منشی شیو پرشاد سرواستو کی غیر مطبوعہ فارسی مثنوی بھی تھی، اور پھر ان کتابوں کے ضائع ہونے کا مرثیہ، غرضکہ اپنا تہذیبی پس منظر بتانے کے بعد انھوں نے بڑی محبت سے کہا اگر تمہیں تاریخ کے مضمون میں کچھ مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف میرے گھر چلی آنا میں تو تمہیں ایک بار اور بھی کلاس میں کہہ چکی۔

جب امتحان سر پر آگیا تو ہمت کر کے ایک دن بلا اطلاع ان کے گھر پہنچ گئی امین آباد پارک کے آس پاس ایک تنگ گلی سے ہوتے ہوئے احاطے میں داخل ہو کر جب اُن کے بنگلے کے پاس پہنچی تو یکایک اُن کا کوئی خاندانی ملازم سامنے آکر سوالیہ نشان بن گیا "مس شیلا گھر پر ہیں"، وہ میرا سوال سُن کر کچھ گڑبڑا گیا اور ٹھہرنے کا اشارہ کر کے پھرتی سے گھر کے اندر چلا گیا اب جو غور کرتی ہوں تو اندر سے رونے پیٹنے کی دبی دبی سی آوازیں کھڑکیوں سے باہر آرہی تھیں، یا اللہ میں کس بے موقع گھڑی میں یہاں آنکلی ہوں، میں یہی سوچ رہی تھی کہ وہ دوبارا نمودار ہوا۔ اب گھر سے تمام آوازیں آنی بند ہو چکی تھیں، اس کے پیچھے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کی دیوی جی مسکراتے ہوئے باہر آئیں اور مجھے اندر آنے کو کہا میں چپ چاپ پیچھے پیچھے ہو لی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری موجودگی نے سبھوں کو چند وقفوں کے لئے اپنے غم کو چھپانے پر مجبور کر دیا ہے۔

ہندوستانی وضع کے ایک ڈرائنگ روم میں جہاں ایک صوفہ اور چند کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں مجھے بیٹھنے کو کہا اور وہ میرا نام پوچھ کر آنگن کی طرف چلی گئیں، صورت سے وہ کماری سرواستو کی ماں معلوم ہوتی تھیں۔ گو کہ اُن کے چہرے پر سنجیدہ ذہانت اور مقناطیسی آنکھیں نہیں تھیں، ایک بے کیف سا متناسب چہرہ تھا جس پر طمانیت لاد دی گئی ہو، البتہ تہذیبی رشتہ کافی واضح تھا۔

مس شیلا کھلے بالوں کو سنوارتے ہوئے ایک نہایت چور چار ساڑھی میں داخل ہوئیں تو میں کھڑی ہو گئی، میری آنکھوں نے جیسے ہی اُن کے چہرے کا اُڑتا ہوا جائزہ لیا، اُن کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے نظر آئے اور آنکھیں بھی کچھ موٹی موٹی سی لگیں، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اِن جیسی قابل سمجھدار اور خوبصورت آنکھوں والی استاد کبھی روتی بھی ہوں گی۔ مگر حقیقت حال سامنے تھی، انھوں نے دیر تک ضروری سوالات اور اُنہیں تیار کرنے کے طریقے اور درسی کتابوں کے اہم بابوں کو نوٹ کرایا اور بیچ بیچ میں اِدھر اُدھر کی باتیں بھی پوچھتی رہیں۔ میں جب اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اُٹھنے لگی تو رہا نہ گیا

"میں کیسی بے وقوف لڑکی ہوں یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اس لئے آپ معاف کیجئے گا اگر میرا سوال اُلٹ پلٹ لگے۔ لیکن سچ کہتی ہوں

کہ اس وقت مجھے اکبرِ اعظم کے طریقۂ حکومت کو سمجھنے سے زیادہ یہ جاننے کی بے چینی ہے کہ آپ کی آنکھیں سوجی ہوئی کیوں ہیں؟"

وہ جیسے پریشان سی ہوگئیں اور بات کاٹتے ہوئے کہا "ایسی باتیں بڑوں سے نہیں پوچھا کرتے۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے میں بھی تاریخ کے سوال کے جواب میں بس یہی لکھ کر چلی آؤں گی کہ ایسی باتیں چھوٹوں سے نہیں پوچھا کرتے"

وہ اس بار مسکرا دیں اور مجھے اُٹھ کر بے اختیار گلے سے لگا لیا، اس غیر متوقع ردِ عمل کے لئے میں ٹھیک سے تیار بھی نہیں تھی، وہ میری نظروں میں دُور آسمانوں کی دیوی تھیں۔ یک لخت آدمیت کی فطری سطح پر آگئیں، اُن کے جسم کی گرمی، ہاتھوں کی نرم گرفت، اور سانسوں کی آمد و رفت سے ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی، کیوں کہ اس دوری، اس خلیج کو کسی طوفان کی ایک ہی یورش نے پاٹ دیا تھا میں فوراً سمجھ نہ پائی، اس وقت تو بس ایک خوشبو تھی جو ہر طرف پھیل گئی تھی اور میری رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ نہ جانے ایک قطرہ کہاں سے ڈھلک کر میرے ہاتھوں پر بھی آگرا۔

دوسرے دن وہ مجھے حسبِ وعدہ حضرت گنج کے ایک مقبول رستوران کی بالائی منزل پر ملیں، گو یا میں اُن کی مہمان تھی اور وہ میری بزرگ میزبان، اس روز دوری کی کئی دیواریں دیکھتے ہی دیکھتے گر گئیں۔ وہ اپنے باپ کی چہیتی بیٹی تھیں اور ان تین بھائیوں میں ایک ہی لڑکی، باپ کا سایہ کم عمری ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ بھائیوں کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ غرضکہ گھنٹہ بھر میں اپنی مختصر روداد اور گزشتہ دن کے واقعات سُنا کر خاموش ہوگئیں، اُن کی سنجیدگی اور بزرگی کا رعب تو کچھ کم ہوا لیکن اُن کے دل کے تہہ خانوں کی روشنی سے دیدہ و دل جیسے منور ہوگئے، میں اُس روشنی کو اب تک اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہوں کہ وہ خواب اور حقیقت کا عجیب دل آویز سنگم ہے، وہ روشنی میری شخصیت کا اب بھی ایک تہائی جزو ہے گو کہ کتنے ہی چھوٹے موٹے چراغ میرے سینے تک آتے آتے بجھ گئے ہونگے کتنے ہی دیئے میں نے ان چراغوں کے استقبال کے وقت جلائے ہوں گے۔ اس واقعہ کے بعد ہم لوگ کتنی بار ملے کبھی رستورانوں میں، کبھی اُن کے گھر پر اور کبھی کبھی وہ میرے ہاسٹل کے کمرے میں آجاتیں ہم دونوں کے ملنے جلنے پر عجیب و غریب چہ میگوئیاں بھی ہوئیں لیکن نہ مجھے پرواہ تھی اور نہ اُنہیں، ہم دونوں دُنیا جہان کی باتیں کرتے اور ایک عجیب سی قربت محسوس کرتے لیکن ہم دونوں کو معلوم تھا، کہ مستقل جدائی کے دن قریب ہیں۔

کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے، مجھے لکھنؤ چھوڑے ہوئے چار سال ہو چکے تھے میں ان دنوں دلی میں تھی۔ جہاں دن میں دفتری ملازمت اور شام میں پڑھائی میں مشغول رہتی تھی۔ تین کمروں کا ایک بوسیدہ سا مکان ... یا گنج میں کرائے پر لے رکھا تھا اور ایک بوڑھی باورچن تھی جو کھانا پکانے کے علاوہ بازار سے سودا لانے کا بھی کام کرتی تھی اور رات بھر کھانستی رہتی تھی۔ لیکن رشتہ داروں میں مشہور ہوگیا تھا کہ دلی میں اپنے مکان میں رہتی ہوں نتیجہ کے طور پر مہمانوں کا تانتا تقریباً سال بھر بندھا رہتا تھا جنہیں زندگی بھر نہ دیکھا وہ رشتے کی خالہ نکلیں اور سرحد پار جاتے ہوئے یا آتے ہوئے دو دن ٹھہرے بغیر نہیں گذرتیں، وہ تو یہ کہیئے کہ مالک مکان نہایت اچھی بھلی خاتون تھیں کہ انھیں چھوڑ کر "ورکنگ گرلز ہوسٹل" میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ ایک صبح کیا دیکھتی ہوں کہ میری رشتے کی دو بھتیجیاں جو الہ آباد میں اسکول کے آخری درجوں میں پڑھتی تھیں میرا پتہ پوچھتے پوچھتے پہنچ گئیں۔ معلوم ہوا کہ دلی گھومنے کا پروگرام ہے، یہاں تک تو قابلِ برداشت ظلم تھا لیکن انہیں ضد تھی کہ میں دفتر گول کرکے اُنہیں قطب مینار کی اونچائی سے لے کر لال قلعہ کی کھائی تک سبھی کچھ دکھا دُوں، مجھے تاریخ کے ان ڈھکوسلوں سے زیادہ دلچسپی نہیں، ہاں ان انسانوں سے ضرور دلچسپی ہے جو ان تاریخی عمارتوں کی زیارت کے لئے جمع ہوتے ہیں، وہ کیا ڈھونڈ رہے ہیں، وہ کیوں آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں میں منڈلا رہے ہیں، اسے جاننے کے لئے البتہ متجسس رہتی ہوں غرضکہ چار و ناچار اپنے اپنے زاویۂ نگاہ لے کر ہم لوگ دلی کی بسوں میں دن بھر دھنستے اور بہ مشکل تمام باہر نکلتے رہے، جب شام ہو رہی تھی اس وقت ہم لوگ نظام الدین پہنچے، وہاں غالب کا مزار اور ہمایوں کا مقبرہ دیکھنا قرار پایا تھا، غالب کے مزار پر غیر ملکی یا اپنے ملک کے سیاح بھی شاذ ہی آتے تھے۔ ہاں ہمایوں کے مقبرے کو دیکھنے کبھی بھولے بھٹکے اپنے ملک کے لوگ بھی آجا[illegible] حالانکہ فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے یہ عمارت تاج محل کی پیش رو ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ متناسب بھی ہے۔ جس وقت ہم لوگ مقبرے کے احاطے میں داخل ہوئے تو مسٹر اور مسز جیمس ٹہل ٹہل کر ہر زاویے سے

اس کے تعمیری پہلوؤں کا معائنہ کر رہے تھے۔ میں ان دنوں لندن جانے کے ارادے سے کھیل رہی تھی اور جن لوگوں پر لندن باشی ہونے کا گمان گذرتا تھا۔ ان سے بے تکلف یوں باتیں کرنے لگی تھی جیسے وہ لوگ میرے ہونے والے ہم سائے ہوں چنانچہ مشرق کی روایتی جھجک اور کم آمیزی کے رویے کو خیرباد کہہ کر میں نے "گڈ ایوننگ" کہا اور تھوڑی ہی دیر میں ہمایوں کے عہد اور اس کی زندگی کے موٹے موٹے واقعات پر میری تعارفی تقریریں جاری ہوگئیں، درمیان گفتگو پتہ چلا کہ وہ دونوں دراصل امریکی تھے اور نیویارک سے ٹوکیو جاتے ہوئے یورپ کے علاوہ مشہور ایشائی شہروں کی زیارت بھی کرتے جا رہے تھے، انہیں اسی طرف سے واپس امریکہ پہنچ جانا تھا، مسز جیمس کو سخت تعجب تھا کہ مسز ہمایوں آئی مین ہز ایکسلنسی دی کوئن نے کیوں اتنا شاندار اور پُرامقبرہ اپنے "سیٹ ہزبنڈ" کے لئے بنوایا جبکہ وہ برقع میں رہتی ہوں گی" میں نے بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور انہیں بتایا کہ کس طرح رانیوں اور شہزادیوں کے احکام صادر ہوا کرتے تھے اور کس طرح قدیم ہندوستان میں رانیاں ملک کا نظم و نسق سنبھالتی تھیں اور میدان جنگ میں مردوں کے مقابلے میں لڑتی تھیں، ملکہ رضیہ سے لے کر رانی جھانسی تک کی شہسواریوں کی داستانیں، اُن کی زندگی کے دوسرے اہم واقعات اس طرح سنا ڈالے جیسے تاریخ میرے گھر کی لونڈی رہی ہو (ہائے شیلا سرواستو کی تنبیہیں!) مسز جیمس میری طول بیانی کو تاریخ دانی سمجھ کر اس قدر مرعوب ہوئیں کہ مجھ سے تفصیلی ملاقات کی خواہاں ہوئیں۔ اُن کے تپاک سے میں بھی پسیج گئی میری بھتیجیوں کو دیکھ کر از راہ محبت پوچھا۔

"کیا یہ آپ کی لڑکیاں ہیں؟" "جی نہیں" اور پھر یک لخت خاموشی کے پیش نظر انھیں فوراً احساس ہوگیا کہ اس قدر بڑی بڑی لڑکیوں کی اس عمر میں ماں ہونا میرا کارنامہ نہیں ہوسکتا تھا، پھر انھوں نے جیسے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

" آپ تو اتنی قابل لڑکی ہیں۔ آپ کو شادی کے بندھنوں میں گرفتار کرنا کسی غیر معمولی آدمی ہی کا کام ہوسکتا ہے۔

"ابھی تک تو ان بلاؤں سے محفوظ ہوں"

مسٹر جیمس کافی پُرمذاق آدمی نکلے، وہ مسکراتے ہوئے بولے یہ تو خبر نہیں کہ میں بلاؤں میں پھنسا کہ نہیں لیکن یہ خبر ہے کہ انھیں بھی قابو میں لانے کے لئے بے شمار ترکیبیں کرنی پڑتی تھیں" ہم تینوں قہقہہ لگا کر ہنسے اور پھر مسز جیمز نے اپنے شوہر سے کچھ کانا پھوسی کرنے کے بعد مجھے اطلاع کہا "ہم کل صبح کو بنک وغیرہ جائیں گے اور بارہ بجے تک ہوٹل لوٹیں گے، کیوں نہیں آپ صبح دس بجے آجاتی ہیں، اگر آپ کو کوئی کام نہ ہو، تاکہ میں آپ کی دلچسپ باتیں کچھ اور سن سکوں پھر ہم لوگ ساتھ ہی لنچ کھائیں گے۔"

میں نے ان کا پتہ لیا اور وعدہ ملاقات کرکے بھتیجیوں کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔ جہاں دوسروں کے لئے پورا دن گنوایا ہے۔ وہاں اپنے تجسس کی تسلی کے لئے آدھا دن اور سہی، کتنے دوستانہ مراسم تھے اُن کے آپس میں میں یہی سوچتی رہی، عمر بھی دونوں کی ایک ہی جیسی لگی بلکہ شاید مسٹر جیمس کچھ چھوٹے ہی ہوں دونوں کا قد نکلتا ہوا تھا اور ادھیڑ عمر والا موٹاپا بڑھ رہا تھا۔

میں جب مسز جیمس سے ملنے جن پتھ ہوٹل پہنچی تو وہ نیچے لاؤنج میں اتر کر میرا انتظار کر رہی تھیں، بڑے تپاک سے ملیں اور مجھے دوسرے فلور پر اپنے کمرے میں لے گئیں، وہیں کمرے میں کافی فوراً بعد آگئی، میں نے محسوس کیا کہ کسی ہم جنس سے کھل کر باتیں کرنے کے لئے بیقرار تھیں۔ یہاں آکر انہیں زیادہ تر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو انہیں ذریعہ آمدنی سمجھتے تھے اور چاپلوسی کی باتیں کرتے تھے، انھوں نے ولیم جیمس کو جنہیں وہ پیار سے بل کہتی تھیں خواہ مخواہ ادھر اُدھر بھیج دیا تھا اس لئے کہ انہیں خیال تھا کہیں میں پہلی ہی ملاقات میں غیر ملکی مردوں سے گھل مل کر ملنا شاید نہ پسند کروں اور ان کی دعوت کو ممکن ہے ٹال جاؤں،

"مجھے تم کیتھی کہو میرا نام پیدائش کے بعد کیتھلین نشلز رکھا گیا تھا"

میں حیرت زدہ ہوئی کہ پچاس برس کی عورت مجھے اپنا ہم جولی کیوں سمجھ رہی ہے اور مسز جیمس کہنے لگیں کیا برائی ہے، "آپ مجھے بانو کہیئے حالانکہ میرا پیدائشی نام کچھ اور ہے لیکن گھر میں سب لوگ یہی پکارتے ہیں۔"

"معاف کرنا بانو میں نے تمہیں شادی شدہ سمجھا یہ میری غلطی تھی لیکن مشرق میں ایسی بالغ لڑکیاں کم ہی ملیں جو شادی شدہ نہ ہوں اور پھر اتنی بڑی لڑکیوں کو . . . . "

"جانے بھی دیجئے ایسی کیا بات ہوئی شادی شدہ ہونا کوئی توہین تھوڑے ہی ہے"، اور پھر یہاں کے رسم و رواج، کم سنی کی

شادیوں کی قدیم روایت، نئی روشنی کی لڑکیوں کی خاموش بغاوت اور بہت سے سماجی مسائل، پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی، میں اپنی طبیعت کے مطابق کھل کر باتیں کرتی رہی اور کھود کھود کر ان کے ملک اور ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھتی رہی، وہ کچھ دیر خاموش رہتیں پھر اپنے متعلق کچھ مواد فراہم کر دیتیں، یہ سلسلہ کوئی دو گھنٹے جاری رہا اور مسٹر جیمس کے آنے کا وقت قریب آ گیا لیکن وہ میرے ایک سرسری سوال کا نہ جانے کیوں تفصیل سے جواب دینے پر مصر تھیں۔ جیسے میں نے کوئی دکھتی رگ چھو دیا ہو۔

"بانو! تم شاید ہی سمجھ سکو کہ میرے ملک میں لگ بھگ ایک چوتھائی شادیاں کیوں تلخیوں کا بار برداشت نہیں کر سکتیں۔ اور پھر ایک تجربے کی ناکامی کے بعد دوسرے تجربے کی ہمت کیسے پڑتی ہے خود میری اپنی زندگی بھی سامنے ہے۔ میں چالیس سے کہیں اوپر نکل چکی ہوں اور بل جو میرا تیرا شوہر ہے۔ تقریباً میرا ہم عمر ہے، اس نے صرف ایک اور شادی کی تھی۔ تمہاری نگاہ میں یقیناً یہ باتیں عجیب سی ہوں گی۔ . . ."

"شکریہ، ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ہم خواہ مرد ہوں یا عورتیں اگر ہم سچی زندگیاں ایک دوسرے کے آگے پیش کریں تو تعلقات کی عمارت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی، دو چار اینٹیں تو ضرور کھسک جائیں گی۔ عجیب بدقسمتی ہے کہ مسرت سچائیوں میں کم ہی ملتی ہے جو لوگ سچائیوں میں مسرت تلاش کرتے ہیں وہ پھر ان جھوٹے اور نقلی رشتوں سے بلند ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ مجھے مقدس کتابوں ہی میں ملے ہیں۔ اب دیکھو تم سے مل کر جو مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے تو شاید اس لئے کہ میں تم کو اچھی طرح نہیں جانتی معاف کرنا میرے طریقہ فکر کو، شاید اس کی وجہ سے میری مسرتیں غارت ہو جاتی ہیں" میں حیران ہو رہی تھی کہ انہیں کیا تکلیف ہے! اب دیکھو بل بڑا بھلا آدمی ہے، زندہ دل بھی ہے، اور گرم جوش بھی، میں اسے دس برسوں سے جانتی ہوں اور پانچ برسوں سے وہ میرا شوہر ہے لیکن ان پانچ برسوں میں میں نے جب بھی "پرائیوٹ آئی" کے ذریعے اس کی سرگرمیوں پر رپورٹ طلب کی تو وہ کسی نہ کسی غیر عورت کے گھر آتا جاتا نکلا۔"

"پرائیوٹ آئی" کیا دھیان گیان کا کوئی عمل ہے؟ معاف کیجئے گا میں سمجھی نہیں۔"

"نہیں بانو۔ یہ وہ پیشہ ور ایجنسیاں ہیں جن کے ذریعے ان کی طے شدہ فیس ادا کر کے کسی آدمی کے چال چلن پر ایک ہفتہ ایک مہینہ یا کسی مقررہ مدت تک کی رپورٹ حاصل کی جا سکتی ہے، وہ اس آدمی کا پورا روزنامچہ دے دیتے ہیں۔ میرے ملک میں لوگوں کو اصلی حقیقت جاننے کا خبط ہے، اسی لئے تو قلب کا دورہ بھی زیادہ پڑتا ہے اور لوگوں کے وصیت نامے بنک کے "لاکرز" میں بند رہتے ہیں تاکہ دلوں کے حقیقی جذبات کا قریبی احباب تو کیا، اپنے بال بچوں تک کو پتہ نہ چلے، ہر آدمی کا وکیل الگ، ڈاکٹر الگ،"

ابھی کیتھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دروازے پر نرم سی دستک ہوئی اور مسٹر جیمس مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور آتے ہی مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور میرا ہاتھ ابھی تھامے ہوئے تھے کہ پوچھا۔

"ہنی، تم نے صرف باتوں میں اس دلچسپ مہمان کو پھنسائے رکھا کہ کچھ خاطر تواضع بھی کی۔"

"ڈارلنگ، تم نے غالباً کافی کی خالی پیالیاں ابھی نہیں دیکھی ہیں . . . ویسے تمہارا خیال ٹھیک ہے اگر انتظام پہلے سے نہ کر لیتی تو ان کی باتوں میں پڑ کر تکلفات کو بھول جانا تعجب کی بات نہ تھی۔ اب تم ان سے کچھ دیر باتیں کرو میں فوراً تیار ہو جاتی ہوں لنچ پر چلنے کے لئے . . . ."

یہ کہہ کر کیتھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈریسنگ ٹیبل سے کچھ سامان اٹھا کر اور الماری سے استری کئے ہوئے کپڑے نکال کر غسل خانے کے اندر چلی گئی۔

میں ابھی کیتھی کے انکشافات میں گم رہنے کے موڈ میں تھی لیکن مسٹر جیمس کی غیر معمولی توجہ اور مسکراتی ہوئی آنکھوں نے ان کی باتوں کو توجہ سے سننے کے لئے مجبور کر دیا اور محض ہوں ہاں کئے جانا ممکن نظر نہ آیا،

"میں بھی تم سے گفتگو کرنے کے لئے اتنا ہی بے چین تھا جس قدر کیتھی، لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ زیادہ حقدار ہے حالانکہ اس کا حق ہم جنس ہونے کے ناطے مجھ سے پہلے ہو سکتا ہے۔ مجھ سے زیادہ نہیں۔" . . .

"بے شک، بے شک،" میں بے خیالی میں بول گئی۔ ویسے میرا مطلب محض گفتگو کو جاری رکھنا تھا۔

یں بھی کتنا گنوار ہوں، میں نے اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا، مجھے تم بل کہنا ہمیشہ ہر موقع پر"

میں نے کیتھی کو بانو پکارنے کو کہا ہے، آپ بھی بانو کہہ سکتے ہیں"

"بہت خوب بانو، اب بتاؤ تمہارا پورا نام کیا ہے۔"

"بانو میرے نام سے ماخوذ نہیں ہے ویسے میرا پورا نام ثریا جبیں ہے"

"کیا ہی پیارا نام ہے تمہارا، کاش ایسے نام میرے ملک میں بھی رکھے جاتے لیکن وہاں ایسا دلکش حسن بھی تو نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ معاف کرنا میں یہاں کے طور طریقے سے بخوبی واقف نہیں اگر میری کوئی بات بھلی نہ لگے تو بلا تکلف ٹوک دینا"

"آپ کی باتیں تو دلچسپ ہیں لیکن تھوڑا خلاف واقعہ نظر آتی ہیں۔ ۔ ۔ مثلاً مجھے یقین نہیں آتا کہ وہاں حسن میں دلکشی نہیں ہوتی ہوگی"

"ہاں ہوتی تو ہے لیکن افزائش حسن کے کارخانوں کی بڑھی ہوئی تعداد اور ان کا روز افزوں منافع شک و شبہ میں ڈال دیتے ہیں"

"ہمارے ہاں بھی افزائش حسن کی صنعت موجود ہے۔ لیکن غربت کے باعث گھریلو طریقے زیادہ عام ہیں۔ ان صنعتوں میں یہاں بھی اضافہ ہو رہا ہے، ساری دنیا ایک ہی رستے پر چل رہی ہے۔ بل، بس رفتار کا فرق ہے"

"لیکن بانو ڈیر، میرے ملک میں نقلی بالوں سے لے کر نقلی گالوں کی وہ گرم بازاری ہے کہ خود میرے ملک کے نوجوان اپنے ماحول سے بیزار ہوگئے ہیں، محبت کرو، جنگ نہ کرو، ان کا محبوب نعرہ ہے، میں ان باتوں میں اپنے نوجوانوں کا ہم خیال ہوں، میں دراصل روحانی طور پر اپنے ہم عمر مرد عورتوں سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جس سے تم ہو" وہ مجھے خواہ مخواہ متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس لئے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"بہت خوب تم وہاں کیا کام کرتے ہو بل اگر ایسی بات پوچھنا غلط نہ ہو"

"ضرور کیوں نہیں، میں نیویارک کی ایک اشتہاری ایجنسی کا وائس پریذیڈنٹ ہوں اور کیتھی ایک غیر سرکاری اسکول میں استانی ہیں، وہ چونکہ وقت سے پہلے ہی گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتی ہوں تو ہم دونوں نے طے کیا کہ ذرا دنیا کو دیکھ آئیں۔ ہم لوگوں نے گو کہ اپنی ٹکٹوں کا الگ بندوبست کیا ہے، ہم لوگ غالباً ذرا ضرورت سے زیادہ ایک دوسرے کے معاملات میں بے دخل ہیں، ہر وقت خیال رہتا ہے کہ حساب کتاب صاف رہے۔ ۔ ۔ ۔ معاف کرنا میں بھی کیسی بے رنگ اور غیر دلچسپ باتیں کرنے لگا، مجھے کم از کم تمہاری خوشبوؤں میں بسی ہوئی موجودگی کا احساس رہنا چاہئے۔"

"میں خود خطرناک حد تک جویائے حقیقت ہوں اور اس تلاش میں سرگرداں رہتی ہوں، تمہاری باتیں بالکل غیر دلچسپ نہیں ہیں چکنی چپڑی باتوں میں کیا رکھا ہے۔"

"ڈیر، تم اتنی ہی سنجیدہ ہو جتنی خوبصورت، تم سمجھو کہ میں تمہاری ہی جیسی ہستی کی واقعی دل سے قدر کرتا ہوں، مگر تم سے اس طرح کی کھل کر باتیں نہ ہو سکیں گی کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں کے ساتھ تم کل آگرہ چلو، ہم لوگ ٹرین سے جا رہے ہیں؟"

"نہیں بل ممکن نہیں ہوگا اس پیش کش کا شکریہ، میری بھتیجیاں مجھ سے ملنے یہاں آئی ہوئی ہیں اور پھر میں دفتر سے آج بھی اس لئے غیر حاضر ہوں کہ تم دونوں سے ملنے کا اشتیاق تھا"

اتنے میں غسل خانے کا دروازہ کھلا اور کیتھی یہ کہتی ہوئی باہر آئی

"دیکھا بل یہ لڑکی کتنی پیاری باتیں کرتی ہے، اسے امریکہ کے بارے میں بھی کہیں زیادہ پتہ ہے جتنا ہم دونوں کو ملا کر بھی یہاں کے بارے میں خبر نہیں۔"

"ہنی، لیکن تمہاری اس پیاری لڑکی نے میرا دل توڑ کر رکھ دیا، اسے میں نے آگرے چلنے کو کہا تو صاف ٹال گئی"

"میں اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ اسے امریکی حالات کا پتہ ہے، بھلا جان بوجھ کر امریکی مردوں پر کون اعتبار کرے گا"

اور پھر ہم تینوں ہنس پڑے اور اٹھ کر لنچ کے لئے روانہ ہوگئے

اس واقعے کے کوئی تین مہینوں بعد کیتھی کا ایک لمبا چوڑا خط آیا، مجھے کچھ تعجب ہوا کہ بل بہانہ بازی کرکے بنکاک میں ٹھہر گیا تھا، کہتا تھا کہ بیمار محسوس کرتا ہوں، وہ بعد میں ٹوکیو۔ اکیلے ہی پہنچا وہاں ہفتوں ڈٹا رہا اور لاس اینجلس ہوتا ہوا اس وقت نیویارک پہنچا جب کیتھی اسکول میں اپنے کام پر جانے لگی تھی، ان شکر رنجیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ اور دونوں کے وکیل معاملات کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے، آخر میں کیتھی نے لکھا تھا کہ اگر میں نیویارک آؤں

تو ضرور اس سے ملوں بلکہ اگر وقت پر اطلاع مل جائے تو وہ ہوائی اڈے پر استقبال کرکے ہفتہ دس روز کے قیام کا بندوبست کر دیگی

مجھے خط پاکر بہت خوشی ہوئی لیکن اپنی غربت اور بے بسی سے اُسے بے خبر دیکھ کر کافی حیرت ہوئی، وہ سمجھتی تھی کہ اتنے دور دراز کا سفر صرف میرے ارادے کا منتظر ہے اور وہ بھی ہوائی جہاز سے، بہرحال شکریے کا ایک نفیس سا خط لکھ کر سپرد ڈاک کر دیا اور جیسے سارے واقعات کو بھول گئی۔

دو مہینوں کی بات ہے کہ گولڈ اسٹائن برگ اور پارک نام کی قانونی کمپنی کا خط نیویارک سے مجھے یکایک موصول ہوا، میں نے پہلے سمجھا کہ کیمی شاید اس کمپنی میں ملازم ہوگئی ہے یا بل ان دنوں اس سے منسلک ہے اور مجھے خط لکھنے کا اب جاکر خیال آیا ہے، لیکن خط کھول کر پڑھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی، لکھا تھا کہ مس کیتھلین شلز جس نے غالباً چوتھی بار پھر یہ نام اختیار کر لیا تھا، اچانک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے تین ماہ قبل اس دنیا سے گذر گئی۔ مجھے اس خبر سے سخت اذیت پہنچی۔ اسی کمپنی نے اس کے وصیت نامے کی ایک تصدیق شدہ نقل بھی بھیجی تھی اور مجھ سے پوچھا تھا کہ اٹھارہ سو ڈالر کی جو رقم اس نے میرے نام چھوڑی ہے اُسے کیا کیا جائے اور اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی شناخت وغیرہ کے کاغذات بھیجوں، میں یہ سب پڑھ کر ہکا بکا رہ گئی، میں اس کی معصوم کشادہ دلی کو سمجھ نہ پائی تھی لیکن اس نامۂ وفا کو سمجھنا زیادہ آسان تھا، ازراہِ تجسس میں نے اسی قانونی کمپنی سے جب دریافت کیا کہ یہ مسٹر لی کاک کون بزرگ ہیں جن کے نام اپنے بال بچوں کے رہتے ہوئے اس نے اپنی بیشتر جائداد جس کا تخمینہ لگ بھگ دس ہزار ڈالر ہے، چھوڑی ہے، پہلے شوہر سے اپنی دو لڑکیوں کو دو ہزار ڈالر اور اپنے لڑکے کو جو دوسرے شوہر سے تھا محض تین ہزار ڈالر دیا تھا، کمپنی کا جواب آیا کہ ان حضرت کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے جو پتہ وصیت نامے میں درج ہے وہ آج سے بیس برس قبل کا ہے۔ اس کے تین سابق شوہروں میں سے آخری دو زندہ ہیں لیکن انھیں مطلق علم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ وہ مس شلز کے اسکول کے یا کالج کے ساتھی ہوں گے، مس شلز کی ضعیف العمر خادمہ کو جن کے لئے تمام کپڑے فرنیچر اور متفرقات اُس نے چھوڑے ہیں یاد آتا ہے کہ اُس نام کے ایک شخص سے اس کی دوستی رہی تھی لیکن انہیں موٹر کے حادثے میں انتقال ہوئے لگ بھگ بیس سال گذر چکے ہیں، جب کہ وصیت نامے کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اسے مرتب کئے صرف دو برس گذرے ہیں، بہرحال مسٹر لی کاک کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے۔

کیسی عجیب دنیا ہے، میں ہفتوں سوچتی رہی، اُس کی ہر بات یاد آتی رہی اس ملمع اس نقلی پن کے پیچھے کیسے کیسے معصوم اور نازک جذبات چھپے پڑے ہیں اس کا تجزیہ کرتی رہی میں سوچتی تھی کہ کیوں نہ اس رقم کو جو اُس نے میرے نام چھوڑی ہے اس کے بال بچوں کے حوالے کر دوں وہی اصلی حقدار ہیں، شاید کمپنی کے پوچھنے کا بھی یہی مقصد ہو، پھر خود ہی توجیہہ کرتی۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خوب سمجھ بوجھ کر ایسا کیا ہے، انکار کرنے سے اس کی روح کو نہ تکلیف پہنچے، آخر اس کا مطلب کیا تھا؟ کیا وہ اس بات سے خوش ہوئی کہ میں نے اُس کے آوارہ شوہر بل کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا کیا وہ ساری باتیں کواڑ کی اوٹ سے سن رہی تھی، کان لگا کر اپنی سانس روک کر؟ اور میں نے تو بل سے خط لکھ کر پوچھا بھی نہیں کہ آخر کیوں وہ دونوں علیحدہ ہوگئے، پتہ نہیں کس کی زیادتی تھی؟ ممکن ہے بنکاک پہنچتے پہنچتے کوئی جھگڑا ہو گیا ہو جس میں بل کا کوئی قصور نہ ہو، اور پھر سب سے زیادہ یہ بات کہ آخر مسٹر لی کاک کون بزرگ ہیں، اگر کیتھی کو اتنی محبت تھی تو اس نے اُن سے شادی کیوں نہ کی ایکبار تو کر دیکھتی، شاید سکھی رہتی بچاری . . . . میں انہیں الجھنوں میں گرفتار تھی کہ مسز سکینہ کا الہ آباد سے خط آیا، شیلا سریواستوا اب تین پیارے بچوں کی ماں تھیں۔ مسز سکینہ بنتے وقت ہی تو وہ اتنا روئی دھوئی تھیں، وہ مجھ سے عمر میں مشکل سے چار پانچ سال بڑی ہوں گی اور جب سے ہم دونوں جدا ہوئے تھے خط وکتابت اکثر ہوتی رہتی تھی۔ لیکن پھر ملنا نصیب نہ ہوا تھا حالانکہ انھوں نے ہمیشہ مجھے بلایا، میرا گھر تو اس لائق نہ تھا کہ انہیں دعوت دیتی اس لئے کہ سکینہ صاحب جو گھر کے بھی کافی خوش حال تھے، خدا کے فضل سے یوپی سول سروس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ موٹر، سوٹر، چپراسی، بیرا غرضکہ خوش حالی کے بہت سے اور مظاہر، یہی غنیمت تھا کہ ہم دونوں کے تعلقات برقرار تھے چنانچہ اب کے میں نے خط پاتے ہی دفتر سے چھٹی لی اور اپنے ساتھ تمام جذباتی مسائل لئے الہ آباد پہنچ گئی۔ پہلی بار سکینہ صاحب کو بہ نفس نفیس دیکھنے کا اتفاق ہوا، مسز سکینہ اب تک تین بچوں کی ماں نہیں معلوم ہوتی تھیں جسم اب قدرے گداز

تھا اور نہ وہی جلد کی رنگت، وہی مقناطیسی آنکھیں، اور شگفتہ سنجیدگی، سکینہ صاحب، جیسا کہ خطوط میں پڑھتی تھی، نہایت خوش مزاج خوب رو اور نرم سی شخصیت کے مالک تھے، اور اخلاق برتنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی

موقع ملتے ہی ہم دونوں ایک کنج تنہائی میں بیٹھ گئے اور میں نے مس شلز کا قصہ چھیڑ دیا، سارے واقعات تفصیل سے سنائے اور اپنے سوالات دہرائے۔

"بانو تم ویسی ہی پگلی کی پگلی ہو، تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اس نے اٹھارہ سو ڈالر کی رقم اس لئے چھوڑی ہے کہ تم اگر پیسے کی تنگی کی وجہ سے یوروپ، امریکہ نہیں دیکھ سکتیں تو اس رقم سے جا کر دیکھ لو اور اس کی قبر پر دو پھول چڑھا دو، گویا ہوائی جہاز کا کرایہ اور راستے کا خرچ ہے، اس نے تمہارے شکریے کے خط میں تمہاری مجبوری کو محسوس کر لیا ہوگا"

مس شلز اور مسٹر لی کاک کے رشتے کو ہم دونوں ٹھیک سے نہ سمجھ پائے، شاید انھوں نے بیس برسوں تک ایک دوسرے کی خبر نہ لی ہو شاید جان بوجھ کر کینتھی نے اپنے مثالی دوست کے نام علامتی طور پر یہ جائداد چھوڑی ہو۔ شاید اسے ان کی موت پر یقین کرنے کو دل نہ چاہا، شاید اسے پتہ ہو کہ وہ مرا نہیں ہے، اس کے دل میں اسی طرح زندہ ہے، پتہ نہیں کیا واقعہ تھا، کیا یہ بھی دلی جذبات کے اظہار کا ڈھنگ طریقہ ہے؟ ہم دونوں دیر تک اس معمہ کو حل کرتے رہے اور پھر جذبات سے مغلوب ہو کر خاموش ہو گئے۔

مجھے وہ دن یاد آ گیا جب شیلا دیدی نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تھا اور روئی دھوئی تھیں۔

"سچ سچ بتائیے دیدی سکینہ صاحب تو اتنے بھلے آدمی ہیں آپ کا رونا دھونا کتنا غیر مناسب تھا آپ کتنی خوش قسمت ہیں۔۔۔"

"بانو" ان کی آواز بھرا گئی اور انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، جیسے انھیں سہارے کی ضرورت ہو۔

"ارے بانو میں نے کب کہا تھا کہ میں خوش قسمت نہیں ہوں یا ہوں۔ یہ بات قسمت وسمت کی نہیں ہے، تم نے کاش ان سپنوں کے محل کو دیکھا ہوتا جو کہیں بھی نہیں تھا، جو بس میرے من کے اندر تھا اور اگر ہوتا ہے تو صرف وہیں ہوتا ہے اس کے رہتے ہوئے میں ایک انجان کے حوالے ہو رہی تھی جو میرے جسم کو ٹٹول کر تو دیکھ سکے گا لیکن میرے من تک، میری روح تک شاید پہنچ نہ پائے گا، پر میری بات کون سمجھتا ماں تو سمجھیں میں خوشی میں آنسو بہا رہی ہوں، تمہارے سکینہ صاحب تو میری اپنی ہی بتائی شرط پر پورے اترتے تھے۔ میں تو بن بتائے، بن کہے خوابوں کی موت پر رو رہی تھی۔ اور میری بے بسی کی صدا پر گھر کے باقی لوگ یونہی رسماً چیخ دپکار کر رہے تھے، مجھے بانو سب کچھ ملا ہے لیکن من کا وہ مرلی کب جدا ہوتا ہے"

میں نے دیکھا کہ ان کی خوبصورت گہری آنکھیں ڈبڈبا گئیں ان کے ہونٹ کانپ گئے۔

اس دنیا میں کیا سچ ہے کیا جھوٹ، کیا اصل کیا نقل، میں ان باتوں کے بارے میں کیا لکھوں کیا نہ لکھوں مجھے خود پتہ نہیں ہے بار میں نے اپنی زندگی کی کتاب آپ کے سامنے ضرور پیش کر دی ہے۔

بقیہ: خان آرزو کی حیات اور تصانیف

کا ذوق تھا۔ انھوں نے اپنی شرحوں میں متنوں کے معانی اور مطالب بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ ان کی ادبی خوبیاں بھی بڑی وضاحت سے نمایاں کر دیں تاکہ علم دوست لوگ اصل کتابوں کے محاسن سے بطریق احسن آگاہ ہو جائیں۔ بلاخمین کا قول ہے کہ ہندوستان نے خان آرزو جیسا کوئی اور شارح پیدا نہیں کیا۔

تذکرہ نگاری میں ان کی روش دوسرے تذکرہ نگاروں سے بالکل الگ تھی۔ مجمع النفائس پر اظہار رائے کرتے ہوئے میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں: "ایں کتاب دریں ایام بفقیر رسید۔ در جمع اشعار آبدار وانتخاب روادین اہتمام عظیم بکار برده حقا کہ فتاوائے اشعار متاخرین است۔ در ضمن عبارات صاف و بے تکلف لطائف و تعبیرات تازہ باجزِ فوائد مندرج ساختہ۔ ازیں سبب کتاب اورا کیفیتے خاص بہم رسیدہ"

میں نے خان آرزو کے متعلق اس مقالے کے آغاز میں جو کہا تھا وہی اختتام پر کہتا ہوں کہ خسرو اور فیضی کے ناموں کے ساتھ جس تیسرے شخص کا نام لیا جا سکتا ہے وہ خان آرزو ہیں۔

قاضی نذر الاسلام اور قومی یکجہتی

عرش ملسیانی



قاضی نذر الاسلام

قاضی نذرالاسلام بنگالی کے مشہور شاعر ہیں اور اہلِ بنگال انھیں محبت سے صرف نذرل کہتے ہیں۔ یہ ۲۴ مئی ۱۸۹۹ء کو موجودہ مغربی بنگال کے ضلع بردوان کے گاؤں چرلیا میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں انھیں لوک گیت لکھنے کا شوق ہوا۔ پندرہ سال کی عمر میں ہی اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ معمولی تعلیم تھی۔ ایک ریلوے گارڈ کے کوارٹر میں گھریلو ملازم ہو گئے۔ پھر روٹی کی دکان پر کام کیا۔ تعلیم ادھوری رہ گئی۔ تھوڑی بہت فارسی بھی پڑھی۔ معاشی تنگیوں پر قابو پانے کے لئے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس کمپنی کا نام بنگالی ڈبل کمپنی تھا۔ بعد میں اس کا نام ۴۹ بنگالی رجمنٹ ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کام انھوں نے حبُ الوطنی کے جذبے سے کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ فوجی ٹریننگ ملک کو آزاد کرانے کے کام آئے گی۔

مارچ ۱۹۲۰ء میں بنگالی رجمنٹ ٹوٹ گئی اور حوالدار قاضی نذرالاسلام کلکتہ واپس آ گئے یہیں سے اُن کی قابلِ رشک ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴۲ سے وہ ایک مجذوبانہ کیفیت میں مبتلا ہو کر خاموش ہیں تیئس سال کی ادبی زندگی میں انھوں نے کیا نہیں لکھا۔ وہ ایک عظیم صحافی بھی رہے۔ اُن کے شعلہ بار اداریے اس قدر مقبول ہوئے کہ انگریزی حکومت اُن کے اخباروں کو ضبط کرتی رہی۔ اس زمانے میں اس طوفانی ادیب اور شاعر نے اتنا کچھ لکھا کہ اس کی مثال بہت کم ملے گی۔ اُن کی مطبوعہ تصانیف میں بیس مجموعے نظم کے ہیں، تین منظوم ترجمے (حافظ، پارہ عم، رباعیاتِ عمر خیام) دو مجموعہ ہائے نظم نوجوانوں کے لئے، تین ناول اور تین افسانوں کے مجموعے، تین ڈراموں کے مجموعے، پانچ مجموعے انشائیوں کے اور بچوں کے لئے نظموں کے گیارہ مجموعے ہیں۔

نذرل عام طور پر ایک باغی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اُن کا سیاسی اور سماجی شعور کسی کا تتبع نہیں کرتا۔ اُن کی اُٹھان کچھ اس شان کی تھی کہ ٹیگور ایسے بزرگ اور محترم شاعر نے اُن کے ہفتہ وار اخبار "دھوم کیتو" کے اجراء کے موقعے پر اُنھیں یوں دعائے خیر دی تھی۔

"تیزی سے آؤ، آؤ، آؤ۔ تاریکی پر آگ کا پل بناؤ۔ اُن منحوس دلوں کے مینار پر فتح مندی کا جھنڈا لہراؤ۔ گھپ اندھیری رات کے ماتھے پر بدبختی کا ٹیکا لگاؤ۔ اپنے بہادرانہ عزم سے نیم بے ہوش لوگوں کو خواب سے بیدار کرو"، نذرل بڑے مقبول اور مشہور صحافی اور شاعر تھے۔ نذرل وطن کی غلامی کو کلنک سمجھتے تھے۔ وہ آزادی کے لئے بہت بیقرار تھے یہاں تک کہ گاندھی اور ٹیگور کی عزت کرنے کے باوجود وہ اپنے نظریات میں اُن سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں تھے۔ وہ ہندو مسلم اور ہندوستان کی دوسری فرقوں میں مکمل اتحاد کے حامی تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ہندو مالا اور ہندو تمدن کے سمبالزم سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔

انھوں نے ایک نظم "آنندمئی آگمن" (مسرت کی دیوی کی آمد پر) اپنے اخبار کے ایک شمارے میں شائع کی۔ اس کی بناء پر یہ گرفتار کر لئے

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے قاضی نذر الاسلام پر ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ راقم نے کیا ہے۔ یہ مضمون اسی سے مرتب کیا گیا ہے۔

عرش ملسیانی

گئے۔ "مسرت کی دیوی درگا" کا ہی ایک نام ہے جس کی پرستش بنگالی ہندوؤں کا سب سے بڑا تیوہار ہے۔ نظم میں دیوی سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ اپنے پرستاروں کے دلوں سے مکر و فریب اور بزدلی کو مٹا دے اور ایک طوفانی اور دیوانہ رقص کرتی ہوئی اترے۔ اپنے فرزندوں کا خون مانگے تاکہ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، میر قاسم اور رانی جھانسی کے مقاصد پورے ہوں۔ نذرل پر سٹریشن کا مقدمہ چلا اور انھیں ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ نذرل نے اس وقت اپنی صفائی میں نہایت متین اور پُر وقار انداز سے ایک کتابچہ "راج بندر زبان بندی" کے نام سے شائع کیا۔ رابندرناتھ ٹیگور نے نذرل کو اتنی محبت اور عزت کی نظر سے دیکھا کہ اپنا ایک رقص ڈرامہ نذرل کے نام سے معنون کیا۔

نذرل کی نظموں میں رام، کرشن، بدھ، شیو کا تانڈو ناچ، درگا کا رقص، پرس رام، وشوامتر، دُرداسام (وہیمی) جمدگنی، وشنو کا چکر اور مہان سنگھ، شیو کی کھڑتال، ترسُول اور نرسنگھا، گنگوتری، گنگا، راہو، کیتو، ہسمندر منتھن، راسکی ناگ، بلرام، بھرگو، اور اسی قسم کے ہندو نام اکثر ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی صورِ اسرافیل، خالد، غازی کمال پاشا، اور بہت سی اسلامی اصطلاحیں بھی ملتی ہیں۔ وہ ریاکار مذہبی رہنماؤں پنڈتوں اور مولویوں کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ وہ صحیح قومیت کا اظہار ہے خود اس کی زندگی قومی یک جہتی کی مثال ہے۔

نذرل نے ایک سنجیدہ نظم ستیہ منتر کے عنوان سے لکھی۔

"تمہاری کتابوں کے احکام جل جائیں صرف خدا کے حکم جاری رہیں عیسٰے، بدھ، کرشن، محمد اور رام سمجھتے تھے کہ انسان کیا اور اس کی قیمت کیا ہے۔ انھوں نے اُن کو اپنے دل میں جگہ دی جن سے انسان نفرت کرتے تھے۔ اب گاندھی وہی گیت گا رہا ہے۔ تم انسان کے دشمن ہو تمہاری آنکھوں نے ابھی اس دانائی کو نہیں دیکھا۔ اس خدائے مطلق کے احکام جاری ہونے دو۔

نذرل بنیادی طور پر محبِ وطن تھے۔ وہ ہر مذہبی تعصب سے بالا تھے۔ انھوں نے قومی تحریک کو اپنی تحریروں سے سرگرمی بخشی۔ اُن کی مشہور نظم چرخے کے عنوان سے ہے جسے انھوں نے خود گا کر گاندھی جی کو سنایا تھا۔

"گھوم
گھوم او میرے محبوب چرخے گھوم
تیرے پہیوں کی آواز میں میں سوراج کی آمد کا مژدہ سن رہا ہوں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے گھومتے ہوئے پہیوں سے دور کہیں سوراج کے شہر کا دروازہ کھل رہا ہے اور اب اس میں مزید تاخیر نہیں ہوگی۔ ہندوستان کی تقدیر کا سورج نکل آیا ہے اور غم و اندوہ کی رات ختم ہوئی"

لیکن قومی تصویر محض نظریاتی نہیں تھی۔ نذرل کو سماجی مکر و فریب اور تعصب کا خود اپنی زندگی کے واقعات سے تجربہ ہوا تھا اس کے نتیجے کے طور پر اس نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور ذات پات کی حرام زدگی ہے۔

"یہ سب ذات پات کے نام پر بدمعاشی ہے
تم ذات پات کے تاجر یہ جوا کھیل رہے ہو۔ تم کہتے ہو کہ اگر میں تمہیں چھوؤں تو تم نیست ہو جاؤ گے لیکن ذات بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا نہیں جو کھو جائے گا!"

یہاں ذات پات سے مراد قومی علیحدگی ہے اور وہ قومی علیحدگی کے بڑے دشمن تھے۔

۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ نذرل پر ان کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے ان سے متعلق گن بانی میں متعدد مضامین لکھے اور نظمیں بھی لکھیں۔ جو بعد میں بھی مناشا (کا نئے دار تھوہر) نامی کتاب میں شائع ہوئیں۔ آرٹیکل بھی بعد میں جمع کر کے "رُدرا منگل" نامی کتاب میں شائع ہوئے۔

عالمی لٹریچر پر ایک آرٹیکل میں نذرل نے دُنیا کے فن کاروں کے رجحانات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ انھیں تین جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) رومانی ادیب (۲) وہ ادیب جو انسانی درد اور تکلیف کو محسوس تو کرتے ہیں مگر اس کے خلاف آواز نہیں اُٹھا سکتے۔ (۳) گورکی کی طرح کے ادیب جو عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ نذرل آخری گروہ کو ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ اُن کے سامنے بھی سر جھکاتے ہیں جنہوں نے فکر کی گہرائیوں سے لازوال ادب پیدا کیا ہے۔

مسٹر ابراہیم خاں ایک مشہور ادیب اور ماہر تعلیم تھے۔ ان کے اور نذرالاسلام کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ شائع ہو چکی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدامت پرست مسلمانوں کے حلقے کس طرح نذرل

کو خود میں شامل کرنا چاہتے تھے اور نذرل پر اُن کا کیا اثر ہوا۔

مسٹر ابراہیم خاں نے لکھا کہ اسلام بڑا ترقی پسندانہ مذہب ہے اور نذرل سے کہا کہ وہ باغیانہ رجحان طبیعت کو چھوڑ کر مسلمانوں کو اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کریں۔ انھوں نے نذرل سے کہا کہ اُن کا وہی مقام ہوگا جو مولانا جلال الدین رومی کا ہے۔ نذرل کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔ انھوں نے لکھا کہ وہ اسلام کی صحیح تعلیمات کے قائل ہیں۔ وہ فرقہ پرستی کے بندھنوں میں نہیں رہ سکتے۔ نہ اُن کا یہ یقین ہے کہ مسلمانوں کو کسی دھاکے سے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد ان کا ایمان ہے اور وہ اپنے آرٹ کے ذریعے سے اس کی تکمیل کی کوشش کریں گے۔ نہ صرف اس کی بلکہ اہلِ ملک کی بہبود اور آزادی کی بھی۔ اس طرح جو راستہ انھوں نے اپنے لیے مقرر کیا تھا وہ اس سے نہیں بھٹکے۔

نذرل اپنی تحریروں کے ابتدائی دَور ہی میں ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں اور بودھوں میں اتحاد اور عالمگیر اخوت کے علمبردار تھے۔ ''نو یگ'' کے لیے جو آرٹیکل انھوں نے لکھے اور یگ بانی میں شائع ہوئے اُن میں سے بیشتر قومی یک جہتی کی تلقین کرتے ہیں اور مظلوموں اور پسماندہ لوگوں کو بیداری کا درس دیتے ہیں۔ نذرل بڑے حسّاس شاعر ہیں۔ فطرت باغیانہ تھی۔ لیکن سماجی حقائق بھی پیشِ نظر رہتے تھے۔ ''لوکمانیہ تلک کے ماتم میں کلکتہ کا ایک سین ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہونے اور مرحوم کے مقاصد کے حصول کے لئے ایک دعوت ہے۔ چھوت چھات کے خلاف اور دلت جاتیوں کی تعصب پنہائی سے متعلق ان کے مضامین قومی جد و جہد اور بیداری کے آئینہ دار ہیں۔

وہ ہندو مسلمان اور ہندوستان کے دُوسرے فرقوں کو بیداری کا درس دیتے ہیں تو کوئی تمیز نہیں کرتے ان کا نعرہ انقلاب سب کے لئے ہے۔

''انقلاب کا دیوتا تمہارے سروں پر کھڑا ہے۔ وہ بار بار واپس آیا ہے اور ایک نئے دور کا پیغام لایا ہے، لیکن ہم نہیں جاگے اس دفعہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔''

نذرل بہت بڑے جلسوں میں اپنے گیت اور نظمیں گا کر سناتے تھے۔ وہ موسیقی کے اچھے ماہر تھے تو اس سلسلے میں بھی انھوں نے قومی یکجہتی کو فروغ دیا ہے۔ بعض اوقات بحور و اوزان کے عدم توازن سے اُن کے گیتوں میں بڑی جان آگئی ہے۔ موسیقی اُن کے اندر سے اس طرح بہتی تھی جیسے کسی فوارے سے اور حیرت انگیز سروں کے امتزاج میں تشکیل پذیر ہوتی تھیں، اور بعض ایسی بھی تھیں جنہیں نذرل نے دوسری قسم کے رقص اور گیتوں سے لیا تھا۔ اُن کے گیتوں میں دھرپد خیال ٹھمری اور دوسرے کلاسیکل اسٹائل اسی مناسبت سے ہیں جس طرح بھجن، غزل، کیرتن، بال اور بھٹیال ہیں یہ اسٹائل اٹھارہویں صدی کے گویے رام پرشاد کا تھا جو عوام کے دلوں میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی محبت کا مظہر تھا۔ نذرل نے عربی اور فارسی دُھنیں بھی بڑے سلیقے سے استعمال کی تھیں۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح متروک دھنوں کو دوبارہ اختیار کیا اور عام طور پر رائج دھنوں کے امتزاج سے نئی دُھنیں بنائیں۔ یہ دُھنیں مختلف طبقے کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق موسیقی کا ایک بسیط اظہار ہیں۔ بنگالی موسیقی فکر انگیزی سے خالی نہیں ہے۔ وہ اسٹائل یا تال ظاہر کرنے کے لیے محض لفظوں پر ہی قناعت نہیں کرتی۔ بلکہ اس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کوئی پیغام ہو خواہ اس میں خدا، ملک، بیوی، مرد عورت کی محبت ہو اور کوئی اسی طرح کا جذبہ۔ نذرالاسلام کی موسیقی بہت سی حیثیتوں سے شاندار ہے۔ مادرِ وطن کی محبت اور اخوت، اس کے اہم موضوعات میں سے ہے۔ نذرل مادرِ وطن کے درد و کرب کو جو غیر ملکی غلامی کی وجہ سے تھا بہت محسوس کرتے تھے۔ لیکن ان سب سے افضل اُن کا یہ خواب تھا۔

''اے مادرِ وطن میں نے خواب میں دیکھا۔ تم رانیوں کی رانی ہو۔
اے نئے ہندوستان! تیری تعریف کے گانے دُنیا بھر میں گونجتے ہیں''

نذرل کے حب وطن کے گانوں میں تمام متعلقہ پہلو ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد اُن میں بہت اہم ہے۔

''ہندو اور مسلمان دو بھائی ہیں بھارت کی آنکھ کی دو پتلیاں۔ وہ ایک ہی باغ کے دو درخت ہیں۔ ایک دیودار اور ایک کدم''

نذرل کے اسلامی گیت، اسلام کے قدیم جلال و جمال کی صدائے بازگشت ہیں جو انسانی بہبود اور مساوات میں مضمر ہے۔ ان میں اگر کہیں احیا کا جذبہ ہے تو اس کی بنیاد پہلی جنگِ عظیم کے بعد مسلم ممالک میں نئی زندگی پانے کی تحریکیں ہیں۔ نذرل کی انسان دوستی مسلم ممالک کے احیاء میں کسی مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں تھی۔ ''ذوالفقار'' کے عنوان سے ایک نظم کی ابتدا یوں ہے۔

''روحِ اسلام کی مشعل چاروں طرف روشن ہے۔
تم کو اگر اس کی خبر نہیں تو یہ تمہارا کام ہے کہ بیدار ہو اور اپنی زندگی کی

شمع کو روشن کرو۔

ترکی، غازی مصطفےٰ کمال کے ساتھ بیدار ہو گیا اور ترقی کے بام پر پہنچ گیا۔

ایران کی ویران سرزمین کو رضا شاہ پہلوی نے بیدار کر دیا ہے۔

مصر اپنی غلامی کو بھول چکا ہے اور زغلول پاشا نے اسے نئی زندگی بخشی ہے۔"

نذرل کے گیتوں میں متعدد گیت ایسے ہیں جو سیاست سماج اور مذہب پر بھرپور طنز ہیں۔ نذرل نے ۱۹۴۱ء کے ابتدائی مہینوں میں اپنی تقریروں میں "الوداع" کی طرف اشارے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ان میں ایک صوفیانہ گونج تھی۔ انہوں نے ایک بار یہ بھی کہا کہ ادب سے وابستہ سامعین اب مایوس ہو جائیں۔ کیونکہ انھوں نے تصوف کی چاشنی چکھ لی ہے۔ ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے کچھ اس انداز کی تقریر کی کہ وہ ایک لیڈر یا شاعر بننے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے وہ تو محبت کے پیامبر تھے۔ ان کا یہ پیام موثر ثابت نہیں ہوا اس لئے وہ الوداع کہنے پر مجبور ہیں۔"

۹ جولائی ۱۹۴۲ء کو وہ کلکتہ ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام کر رہے تھے کہ ان کی زبان بند ہو گئی۔ یہ قدرت کی ضرب کاری تھی جو اس نے ایک طوفانی اور مضطرب روح پر لگائی۔ نانبائی کی دوکان پر ملازم رہ کر حوالدار بننے والا قاضی نذر الاسلام ایک عظیم شاعر اور ادیب بنا اور اس نے اپنے باغیانہ رجحان طبع کے باوجود قومی یک جہتی کے لئے بہت کچھ لکھا۔ وہ انگریز کے عہد کا شاعر ہے۔ اس وقت کے ہندو مسلم فسادات کو دیکھ کر اس پر کیا گذرتی تھی اور وہ کیا سوچتا تھا۔ اس کی مشہور نظم "ہندو مسلم لڑائی" میں ملاحظہ فرمایئے۔

"حوصلہ رکھو! حوصلہ رکھو! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ہندوستان زندہ ہو گیا ہے قبرستان اور قبرستان زندہ ہو گئے ہیں۔ جو دائمی موت کے سزا یافتہ تھے۔ شدتِ درد سے بیدار ہو گئے ہیں۔

خالد اپنی تلوار چلا رہا ہے

ارجن نے اپنی کمان تان لی ہے

ہندوستان جاگ اٹھا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہاتھوں میں لاٹھیاں لے لی ہیں۔

ایک، دوسرے کی ضرب سے ہندو مر رہے ہیں۔ مسلمان مر رہے ہیں

جو مر رہے وہ زندہ ہیں

ایسی موت باعثِ شرم نہیں ہوتی

وہ لڑ رہے ہیں کیوں کہ اُن کی توانائی جوشش پر ہے۔

ہتھیاروں کی لڑائی سے وہ ایک دوسرے کو پہچاننے لگتے ہیں

آج اس کا امتحان کہ کون طاقت ور ہے

کون کل کی لڑائی میں مریں گے

اور کون مرنے کے خواہش مند ہیں

آؤ اور نیم زندہ آدمیوں کے گلے سے زندگی کی چیخ سنو

امرت جلد ملے گا کیونکہ زہر ختم ہو چکا ہے۔

منتقل کرتے جاؤ

کافر ختم ہو گئے اور اس کے ساتھ یوں بھی

اب طاقتور ہندو مسلم ظہور میں آئیں گے۔

تم بیدار ہو گئے ہو اور خدا بھی

اس کی مشین چل پڑی ہے۔

آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد اور استاد زور آزمائی کر رہے ہیں۔

وقت ضرب پر ضرب لگا رہا ہے تاکہ بزدل ہندوستانی نڈر ہو جائے وقت دیکھ رہا ہے کہ معمولی سی ضرب سے بندھی ہوئی مٹھی یا کلائی ٹوٹتی ہے کہ نہیں اور یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ کون سخت ضرب لگا کر لڑائی جیتتا ہے اور کون سا جنرل اس فرضی لڑائی میں غصہ میں نہیں آتا۔

یہ نام نہاد ہیرو کون ہے جو خون کے چند قطرے دیکھ کر مٹائی یا پیوندوں سے بھری دلق کے نیچے لیٹ جاتا ہے تلوار کو ایک طرف پھینک کر اپنے آپ پر سیاہی مل لیتا ہے اور بیہودہ طور سے بڑبڑا رہا ہے۔ خدا رکھے! کیا یہ نامرد آنے والے انقلاب میں رہنمائی کریں گے۔ جب طوفان یا آندھی آئے گی وہ لوگ کیا کر سکیں گے جن کے دماغ محض چیخ کی آواز سے گھومنے لگے ہیں۔

خدا امتحان لے رہا ہے۔

خون کے سمندر کو تیر کر کون پار کر سکتا ہے

تمہارے اپنے ہی حملوں نے تمہارے مندروں اور مسجدوں کو مسمار

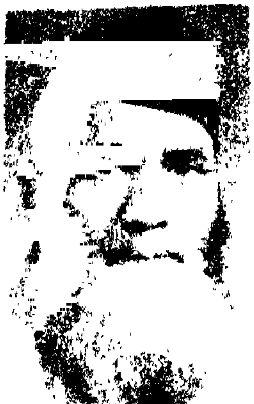
کردیا ہے جن کی بنیادیں ایک غلام قوم کے آلودہ ہاتھوں نے رکھی تھیں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا ان لوگوں کی عبادت گاہوں کو مٹا رہا ہے
جو دوسروں کے غلام ہیں۔
شہدا، آزاد ہاتھوں سے پاک کردہ مٹی سے قربانی کی عبادت گاہ
بنائیں گے۔
کیا کلس گر پڑے ہیں
اس طرح تمہاری نیند ختم ہو گئی
کون کس کو مارتا ہے یہ معمہ ابھی حل نہیں ہوا
تاریکی ابھی دور نہیں ہوئی۔
وہ نہیں جانتے کہ تاریکی میں وہ اپنوں کو ہی دشمن سمجھ کر مارتے ہیں
سورج طلوع ہوگا۔ انتشار ختم ہو جائے گا منظر صاف ہو جائے گا
رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔
اور وہ دیکھیں گے کہ انھوں نے بند دروازوں کے پیچھے اپنے ہی
بھائیوں کو مار ڈالا ہے۔
ترسول اور تلوار نے ہندوستان کی تقدیر ہی کو کاٹ کے رکھ دیا ہے۔
وہ ڈنڈے جنہوں نے مسجدوں کو توڑ ڈالا ہے اور مندروں کے
کلسوں کو بکھیر دیا ہے کل دشمن کے قلعے کو توڑ پھوڑ دیں گے۔ اس
صبح کو بھائی بھائی آپس میں نہیں لڑیں گے۔
وہ اپنوں ہی میں اپنے دشمن کو پہچان لیں گے۔
انھیں لڑنے دو کم سے کم یہ جاگ تو اٹھے ہیں
فتح مندی کا جھنڈا لہراؤ
اگر تمہاری دم کو آگ لگا دی گئی ہے
تو اس سے سونے کی لنکا کو جلا دو

یہ نظم ۱۹۴۲ء سے پہلے کی ہے۔ غیر ملکی غلامی میں جب ہم جکڑے ہوئے تھے۔ نذرل ابھی بقید حیات ہیں لیکن ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ختم ہو چکے ہیں۔ گو ان کی تخلیقات زندہ و پائندہ رہیں گی۔ آج وہ باہوش ہوتے تو ملک کو آزاد دیکھ کر فتح مندی کے گیت گاتے۔

بقیہ: کشمیر کا احیاء نو

لیا۔ یہ تھیٹر کشمیری تھیٹر کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ ابھی تک یہ تھیٹر ۱۵ ڈرامے وادی بھر میں پیش کر چکا ہے اور ڈراما مقابلوں میں کئی انعام حاصل کر چکا ہے کشمیر کی مقبول عام لوک کہانی "اکنندن" کو ڈرامائی صورت میں پیش کرکے اس تھیٹر نے ہمارے دیہی عوام میں بے حد مقبولیت حاصل کی اور شہر میں آکر جدید طرز کے ڈرامے "بی تی چھوپن" "پزایز" اور "تقدیر" پیش کرکے پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تھیٹر فن ڈراما کے سبھی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا اور اداکاری، روپ رنگ، روشنی اور حقیقت پسندانہ دلکش سیٹ بنانے پر بڑی محنت صرف کرتا ہے۔ اگر یہ تھیٹر اپنی کوشش اور جدوجہد برابر جاری رکھے تو یہ جلد ہی پیشہ ورانہ صورت اختیار کر سکتا ہے اور ملک کے دوسرے قابل پیشہ ور ڈراما کلبوں کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس تھیٹر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے فن کار خود تجربہ کار موسیقار ہونے کے علاوہ اداکار بھی ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ہماری دیہی زندگی کی صحیح عکاسی اور ترجمانی ہوتی ہے۔ جن میں سماجی طنز کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ پچھلے پانچ برسوں میں ہماری ریاست میں ایک سو کے قریب ڈرامے کھیلے گئے۔ جن میں ۷۰ ڈرامے مقابلوں میں پیش ہوئے۔ ہماری ریاست کے زنانہ کالجوں میں بھی ہر سال دو چار ڈرامے اردو، ہندی، اور کشمیری میں کھیلے جاتے ہیں اور ایسے ڈراموں کی تعداد ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ جموں میں اردو اور ہندی میں ڈرامے کھیلے جاتے ہیں ان میں وہ ڈرامے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو پہلے دلی اور دوسرے شہروں میں اسٹیج ہو کر کامیاب ثابت ہو چکے ہیں۔ ان میں "کانچن رنگ" "زمانہ" "اساڑھ کا ایک دن" "ڈیڑھ روٹی اور میٹی" قابل ذکر ہیں۔ پچھلے چند برسوں سے جموں میں ڈوگری اور پنجابی ڈرامے بھی کھیلے جانے لگے ہیں۔ جن میں نماگراز دیھری بسرو پنج ہویان راہو وان قابل ذکر ہیں لیکن ڈوگری ڈرامے کی تحریک نے ابھی کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی ہے۔

غزلیں



زندگی، منزلِ موہوم کو پانے کی لگن
موت کہتے ہیں جسے، جہدِ مسلسل کی تھکن

کیا ہے یہ کیفیتِ موسمِ گُل پیراہن
نہ کہیں بادِ بہاری، نہ کہیں بوئے سمن

یوں فروزاں نظر آتی ہے محبت کی کرن
جیسے اک گھور اندھیرے میں چراغِ روشن

ہم جو آئے ہیں گلستاں سے جھٹک کر دامن
کیا پریشاں نظر آتی ہے نسیمِ گلشن

جسمِ آدم پہ ہے زرتار لباسِ اخلاص
آدمیت ہے مگر لاشۂ بے گور و کفن

کیا کسی آرزوئے شوق نے دم توڑ دیا
آج محسوس رگِ جاں ہے جو ہلکی سی چبھن

نگہِ دوست کی بیگانہ روی کے صدقے
ان دنوں میری وفا کو ہے تلاشِ دشمن

ہم سا بربادِ بہاراں بھی نہ ہوگا کوئی
نہ کوئی شاخِ نشیمن نہ قفس ہے نہ چمن

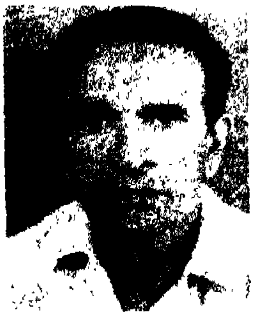
کیا تماشائے نظر ہیں یہ ترے دیوانے
کبھی نمناک نگاہی، کبھی ابرو کی شکن

ہم سے کچھ رسمِ تعلق ہی نہیں ہے نہ سہی
پھر بھی بیگانۂ احساسِ تعلق تو نہ بن

ہم کہ بیگانۂ اربابِ جہاں ہیں اخترؔ
نہ کوئی دوست زمانے میں نہ کوئی دشمن

علیم اختر

آج کل دہلی



کچھ پھول تیرے پیار کے گلشن سے آئے ہیں
کچھ اڑ کے میری شاخِ نشیمن سے آئے ہیں

میرے وطن کی چاندنی، میرے چمن کے پھول
کیا کیا خیال اک تیری چلمن سے آئے ہیں

اُٹھی گھٹا تو ساغر و مینا سجا گئی
برسی، تو پھر خیال ترے چمن سے آئے ہیں

افسردہ دل کی دھڑکنیں، تنہائیوں کے گیت
میرے نصیب میں ترے آنگن سے آئے ہیں

کوئے وفا میں خیر سے پھر کس کا ذکر ہے؟
رو کر ابھی تو دوست کے مدفن سے آئے ہیں

نکلے ہیں بے شعور لٹا کر دل و دماغ
ہم، صاف بچ کے کوچۂ رہزن سے آئے ہیں

بگڑے ہوئے سے آج یہ تیور ہیں کس لئے؟
مل کر حضور کیا مرے دشمن سے آئے ہیں

ہم آنسوؤں سے قطع تعلق کریں بھی کیوں
افسرؔ ہمارے ساتھ یہ بچپن سے آئے ہیں

افسر آذری



جسم کی خاک کو جب تج کے میں نکلا گھر سے
دیکھتے رہ گئے سب لوگ مجھے ششدر سے

میری خلوت تری آواز کا اک سایا ہے
جس میں پھرتے ہیں تری یاد کے کچھ پیکر سے

کھلکھلا کر یہ ہر اک شخص سے ملتے ہوئے لوگ
غم کے چپ چاپ سمندر ہیں یہی اندر سے

ہم تری یاد کو سینے میں چھپا تو لیتے
یہ جھلس جائے گی۔ خاموش ہیں ہم اس ڈر سے

میں وہ دھرتی ہوں جو صدیوں سے ہے پیاسی لیکن
تو وہ بادل ہے پلٹ جاتا ہے جو بن برسے

آزاد گلاٹی

کشمیر کا احیاءِ نو

کشمیری ادب

غلام نبی فراق

۱۹۴۷ء کا سال کشمیری ادب کے لئے ہمیشہ غیر معمولی اہمیت کا حامل رہے گا۔ کیونکہ یہی وہ سال ہے جب ریاست میں شخصی حکومت کا خاتمہ ہوا اور کشمیر میں صدیوں بعد ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جسے عوامی تعاون حاصل تھا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب اور تاریخی واقعہ تھا جس نے زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی۔ ہم کشمیری ادب کو اس تبدیلی سے الگ نہیں کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ کیوں کہ اس سال سے پہلے جو کشمیری ادب کی حالت تھی، وہ اس سال کے بعد یکایک بدل گئی۔ آزادی اور نئی زندگی کی امنگوں کو سینے میں لئے بہت سارے نئے کشمیری ادیبوں شاعروں اور افسانہ نگاروں نے کشمیری زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔

کشمیری زبان کی ترقی میں جو سب سے بڑی رکاوٹ حائل تھی وہ تھا اس کا ناقص رسم الخط۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اس زبان کا اپنا رسم الخط ہی نہیں تھا۔ اس رکاوٹ کو دُور کرنے کے لئے عوامی حکومت نے ایک کمیٹی قائم کی۔ جس نے کشمیری زبان کے لئے ایک ایسا رسم الخط تیار کیا، جو اس کی اپنی جینیس اور نزاکت کا حامل تھا۔ بعد میں اس رسم الخط کو اور بھی آسان بنایا گیا۔ نئے رسم الخط کی بدولت لوگ کشمیری زبان کو آسانی کے ساتھ پڑھنے اور لکھنے لگے اور اس طرح سے کشمیری زبان کی نشو و نما میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ بھی دور ہو گئی۔ اس نئے رسم الخط میں طالب علموں کے لئے تاریخ میں پہلی بار درسی کتابیں تیار کی گئیں۔ اب کشمیری زبان کی حالت یکسر بدل گئی تھا اور یہ اسکولوں میں بھی پہنچ گئی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ریاستی سرکار کی طرف سے ایک کلچرل اکادمی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ اس اہم ادارے نے اپنے قیام کے بعد سے آج تک کشمیری علم و ادب کو بڑھاوا دینے کے لئے، ایسے متعدد اقدام کئے ہیں، جو قابلِ ستائش ہیں اور جن کی بدولت کشمیری علم و ادب کو ترقی و ترویج حاصل ہوئی ہے۔

اکادمی کی طرف سے اردو ہندی اور ڈوگری کے علاوہ کشمیری زبان میں لکھی گئی پرانی معیاری کتابوں کو نقد و ترتیب کے بعد نئے رسم الخط میں چھاپا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اکادمی ہر سال جدید ادب کی بہترین تخلیقات کو بھی ادبی حلقوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اکادمی ایک معیاری کشمیری ڈکشنری پر کئی برسوں سے کام کر رہی ہے، جس کی اشاعت مستقبل قریب میں متوقع ہے۔ اس ادارے کی طرف سے ادیبوں کو اپنی کتابیں چھاپنے کے لئے نقد امداد بھی دی جاتی ہے۔ آج تک کئی شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نویسوں اور ادیبوں نے اس امداد سے اپنی کتابوں کو چھاپا ہے۔ اس کے علاوہ اکادمی ہر سال بہترین کتابوں پر نقد انعام بھی

دیتی ہے۔ اکادمی ایک دو ماہی رسالہ "شیرازہ" بھی شائع کرتی ہے۔ ادارے کی طرف سے ہر سال ریاست کے مختلف حصّوں میں ثقافتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ مشاعرے اور مذاکرے بھی ہوتے رہتے ہیں جن سے کشمیری ادب کے فروغ میں مدد ملتی ہے۔

جموں و کشمیر یونی ورسٹی کا قیام بھی آزادی کے بعد ہی عمل میں لایا گیا۔ کشمیری زبان کی تاریخ میں پہلی بار درس و تدریس اور امتحانات کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے چنانچہ پچھلے چند برسوں میں یہاں کے بیسیوں طالب علموں نے کشمیری میں پروفیشینسی ہائی پروفیشینسی اور آنرز امتحانوں میں شمولیت کی اور یونی ورسٹی سے سندیں حاصل کیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیری زبان میں نثری ادب نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر اب حالت کافی حد تک بدل چکی ہے۔ آج ہماری زبان میں نظم کے ساتھ ساتھ نثر بھی ترقی کے مرحلے برابر طے کر رہی ہے۔ آج کشمیری ادب میں متعدد نثر نگار ایسے ہیں جو اپنی سعیٔ پیہم سے کشمیری نثر کو مالا مال کر رہے ہیں۔ کشمیری زبان میں آج معیاری افسانوں کی کمی نہیں ہے۔ ہمارے ایک مشہور جدید افسانہ نگار اختر محی الدین کو ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اُن کی مشہور کتاب "ست سنگر" پر قومی انعام بھی مل چکا ہے۔ کشمیری زبان میں دوسری زبانوں کی اچھی اچھی تخلیقات کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔ ان میں ٹیگور، مولیئر، ابسن اور شیکسپیر کے ڈرامے الف لیلیٰ، حاجی بابا اور دوسری کئی کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں ۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیری زبان میں تنقیدی ادب نہ ہونے کے برابر تھا، وہاں اب تنقیدی ادب کی تخلیق پر بھی خاطر خواہ توجہ کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ارسطو کی مشہور پوئیٹیکا کا کشمیری ترجمہ بھی اس حقیقت کا ایک اہم ثبوت ہے۔

شاعری کے میدان میں بھی ایک عظیم تبدیلی رُونما ہو چکی ہے۔ اس حقیقت سے کسی شخص کو انکار نہیں کہ کشمیری شاعروں میں آزاد، مہجور اور زندہ کول نے نئے نئے تجربے کئے تھے۔ اِن تینوں بزرگ شاعروں نے کشمیری زبان کو ایک توانائی بخشی تھی۔ مگر کشمیری شاعری کا دائرہ پھر بھی بہت تنگ تھا اس میں وہ رنگا رنگی اور وسعت نہیں آئی تھی، جس کا نظارہ ہم آج کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد شاعروں کی ایک نئی نسل نے کشمیری زبان میں نئے نئے تجربے کئے جن سے اس شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہوا۔ ایک طرف شاعر نے موضوع کی تلاش میں نکلا اور دوسری طرف اس نے نئی اصناف، نئی ہئیتوں پر بھی توجہ دی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہی کشمیری شاعروں کو بلینک ورس، فری ورس، سانٹ، ڈرامائی تنہا کلامی، قطعہ اور رباعی گیت وغیرہ کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ہاں ایسی نظمیں غزلیں بھی تخلیق ہوئیں۔ جن کی مثال پرانے کشمیری ادب میں ملنا محال ہے۔ جدید کشمیری نظم بہت آگے نکل چکی ہے۔ آج کشمیری شاعر بات کہتے ہوئے تھکتا نہیں۔ بلکہ مزید کچھ کہنے کا خواہاں رہتا ہے۔ اس کا ذہن تہہ دار اور پہلودار حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار بھی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خود زندگی کا غم بھی ہے اُسے احساس ہے کہ اس کے قاری ان پڑھ نہیں، بلکہ وہ ذہنِ رسا رکھتے ہیں۔ اس کا ماحول پرانے زمانے کے ماحول سے مختلف ہے۔ آج کے شاعروں میں میر غلام رسول نازکی، دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، چمن لال چمن، مکھن لال بیکس، مظفر عازم، امین کامل، فاضل کشمیری اور نور محمد روشن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کالجوں اور اسکولوں کی طرف سے آئے دنوں جو علمی اور ادبی میگزین شائع ہوتے رہتے ہیں، اُن میں کشمیری سیکشن بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ایسے سیکشن کو ہم جلدی میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے ـــــــــــــــــــ

کہ یہ میگزین اس شوق اور دلچسپی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو ہماری نسل کو اپنی مادری زبان سے ہے۔ ہماری نئی نسل اپنی مادری زبان کے ساتھ بے اعتنائی نہیں برتتی جو یہاں کے عام پڑھے لکھے لوگوں میں آزادی سے پہلے نظر آتی تھی۔ موجودہ نسل کو اپنی زبان پر بجا ناز ہے۔ وہ ہمیشہ اس سے اپنا رشتہ استوار رکھتی اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ وہ جانتی ہے، اس کی اپنی ترقی کا راز اُن کی زبان کی ترقی میں پوشیدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ریڈیو کشمیر کے تذکرے کے بغیر یہ مختصر سا جائزہ نامکمل رہے گا۔ ریڈیو کشمیر کا قیام بھی آزادی کے بعد ہی عمل میں لایا گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ریڈیو کشمیر نے کشمیری زبان کی ترقی کے لیے صحت مند رول ادا کیا ہے۔ اس نے اپنی نشریات سے جہاں کشمیری بولنے والوں کے مذاق کو شائستہ بنایا ہے۔ وہاں اُن کے ذوقِ جمال کی تربیت میں بھی اس اسٹیشن نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس اسٹیشن کی طرف سے وقت وقت پر مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ ریڈیو کشمیر نے ادبی پروگراموں کے ذریعے شاعروں، افسانہ نگاروں نقادوں اور عوام کے مابین ایک رابطہ پیدا کیا ہے وقت وقت پر کشمیری ڈرامے بھی اسٹیج کئے جاتے ہیں۔ اس طرح سے کشمیری ادب کے احیاء میں ریڈیو

کشمیر نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اور ادا کر رہا ہے۔

ڈراما ——— ایم۔ ایل۔ کیمو

کہتے ہیں ڈراما آئینہ ہے۔ اس میں قوم اپنی اصل صورت دیکھ سکتی ہے لیکن ہماری ریاست میں ڈراما کو آئینہ بننے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کشمیری ڈراما کا ابھی تک اپنا کوئی منفرد کردار اور کوئی ہئیت بننے نہیں پائی۔ ڈرامے کھیلے تو جاتے ہیں لیکن بہت کم۔ لوگ ڈراما دیکھنے کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ڈراما ایک تحریک نہیں بننے پایا۔ ہاں ریاست میں اس وقت ڈراما تحریک بننے کے لئے تجرباتی دور سے گزر رہا ہے۔ تجربوں کے طور پر ریاست میں المیہ، طربیہ، اوپیرا، بیلے اور لوک ناٹکوں کی روایت پر مبنی ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔

ریاست میں فن کلچر اور زبان کی اکادمی کے قیام کے بعد ڈراموں کے مقابلوں کا جو پروگرام شروع ہوا اُس سے ڈرامے کھیلنے اور لکھنے کی سرگرم تحریک ملی۔ اِن مقابلوں کے انعقاد سے پہلے ریاست میں، سال بھر میں، ایک آدھ ڈراما کھیلا جاتا ہے۔

ڈراموں کا یہ مقابلہ موسم سرما میں جموں میں اور موسم گرما میں سرینگر میں منعقد ہوتا ہے۔ اس مقابلے میں ہر منظور شدہ ڈرامے کو کھیلنے کے لیے شوقیہ کلبوں کو اکادمی کی طرف سے تین تین سو روپے کی مالی امداد دی جاتی ہے۔ مقابلے میں اوّل اور دوسرا درجہ پانے والے ڈرامے کو ایک ہزار اور سات سو روپے کا بالترتیب نقد انعام دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہترین اداکاری پر ایک ایک سو روپے کے پانچ انعام بھی دیئے جاتے ہیں۔ ان مقابلوں میں حصّہ لینے والے کلبوں کی تعداد آئے سال بڑھتی جا رہی ہے۔ جو کلب اس مقابلے میں آئے سال حصّہ لیتے ہیں، اُن کی صلاحیت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ پروڈکشن اور اداکاری کا معیار بھی اونچا ہو رہا ہے۔ اب ہماری ریاست کے شوقیہ کلبوں کا معیار ملک کے کسی شوقیہ کلب سے کم نہیں ہے۔ ڈرامے کی ترقی اور ڈرامے کو پوری سہولت اور تکنیکی قابلیت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے ایک اچھے تھیٹر ہال کا ہونا ناگزیر ہے۔ سری نگر میں ۱۹۶۱ء میں ٹیگور ہال کی تعمیر مکمل ہوئی۔ یہ ریاست بھر میں جدید قسم کا واحد تھیٹر ہال ہے۔ اس کے بننے سے ریاست میں اچھے ڈرامے کھیلنے کی دیرینہ ضرورت پوری ہوئی ہے۔ امید ہے آیندہ دو برس میں جموں میں بھی ایک جدید قسم کا تھیٹر ہال تعمیر کیا جائے گا۔

ڈراما کی تحریک کو تب تک کامیاب قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ علاقائی ڈراما کوئی اپنا کردار اور ہئیت اختیار نہ کرے۔ ہماری علاقائی زبانوں میں اب بھی ڈراما نگار رہنے گنے ہیں۔ ابھی تک کشمیری زبان میں اسٹیج پر کھیلے جا سکنے والے محض دس بارہ ڈرامے ہی لکھے گئے ہیں۔ بہر حال جو ڈرامے پچھلے چند برسوں میں لکھے گئے انھیں بڑی ہی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا۔ ہمارے قابل اور تجربہ کار ڈراما نگاروں میں علی محمد لون، پشکر بھان، سوم ناتھ سادھو اور محمد سبحان اللہ بھگت ہیں۔ انھوں نے کشمیری زبان میں مندرجہ ذیل پورے وقت کے ڈرامے لکھے ہیں۔ سوئیاں، تقدیر ساز، گرینڈ ریہرسل "پزاپز" "تیچھو بٹن" اور تقدیر۔ ان ڈراموں سے نہ صرف کشمیری ادب کو بڑھاوا ملا۔ بلکہ کشمیری میں اسٹیج پر کھیلے جا سکنے والے ڈراموں کی کمی بھی کسی حد تک پوری ہوئی۔

پرانے وقتوں سے صوبہ کشمیر میں لوک ناٹک کی روایت چلی آ رہی ہے جسے بھانڈ جیشن کہتے ہیں۔ یہ جیشن آج کل بھی وادی میں مختلف مقامات پر مقامی بھانڈ پیش کرتے ہیں۔ کشمیر میں کچھ ڈراما نگاروں نے بھانڈ جیشن کی صورت میں بھی کچھ ڈرامے لکھے اور پیش کئے ہیں۔ ان ڈراموں کے موضوع نئے تھے۔ لیکن ہیئت روایتی تھی۔ ان میں اکنگام کے بھگتوں کا، "مانگے"، اور نونو اور ہمالیہ بانڈہ تھیٹر کا پاہو قابل ذکر ہے۔ ان ڈراموں میں لوک ناٹک کے دوسرے پہلوؤں یعنی موسیقی، رقص، گیت مسخراپن اور دوسرے لوازمات کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے ان ناٹکوں کو شہری اور دیہی لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ ان کی کامیابی سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ بھانڈ جیشن کا فارم مزاحیہ اور طنزیہ ڈرامے لکھنے اور کھیلنے کے لیے بہت مقبول ہو سکتا ہے۔

ڈرامے کی تاریخ میں ایسا ہمیشہ ہوا ہے کہ جب کوئی روایت فرسودہ ہو گئی تو اُسے توڑ کر نئے نئے تجربے کئے گئے۔ اور نئی تحریک نے جنم لیا اسی طرح صوبہ کشمیر میں اکنگام کے بھگتوں نے، جن کا موروثی پیشہ بھانڈ جیشن کرنا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں اپنی پارٹی کو منظم تھیٹر کی شکل دی اور وادی بھر میں، گاؤں گاؤں گھوم کر اپنے ڈرامے پیش کئے۔ اس تھیٹر نے پانڈ پاتھر کی سبھی خصوصیات کو لے کر جدید ڈرامے کے روپ میں پیش کرنا شروع

(باقی صفحہ [illegible] پر)

وقت

سید آل رسول

وقت کی گود میں پلتے ہیں ہزاروں لمحے
کوئی خوشیوں کا پیمبر کوئی غم کا قاصد
سازِ پُر شوق کی جھنکار سناتا ہے کوئی
رنج و آلام کے انبار لگاتا ہے کوئی
ایک لمحہ کہ جو سینے میں چراغاں کر دے
ایک لمحہ جو خیالات میں طوفاں بھر دے
ایک لمحہ کہ بہاروں کی خبر دیتا ہے
ایک لمحہ کہ فقط دردِ جگر دیتا ہے
ایک پل ہاتھ میں اک جام لئے آتا ہے
ایک پل کاوشِ بے نام لئے آتا ہے
ایک لمحہ جو تمناؤں کا ساحل لائے
ایک پل جس کی کبھی کوئی نہ منزل آئے
رنگ اور نسل کی تفریق مٹاتا اک پل
جذبۂ نفرت و وحشت کو جگاتا اک پل
ایک پل جبر و تشدد کو ہوا دیتا ہے
ایک پل ظلم کے عنصر کو مٹا دیتا ہے
نوعِ انساں کی ترقی کی نشانی کوئی
نسلِ آدم کی تباہی کی کہانی کوئی
وقت رکتا نہیں چپ چاپ گذر جاتا ہے
مہر ہر اک ورقِ زیست پہ کر جاتا ہے
وقت کے سیکڑوں پہلو ہیں ہزاروں رخ ہیں
کیسے معلوم ہے کل کیا ہو، کہاں ہو، کب ہو؟

رباعیات

جلال ملیح آبادی

حسنِ رُخِ رنگیں کے سوا، اور بھی ہے
لعلِ لبِ شیریں کے سوا، اور بھی ہے
باظرف ہو انساں، تو محبت اے دوست!
جذبات کی تسکیں کے سوا، اور بھی ہے

یہ حسن یہ طلعت یہ لطافت توبہ
یہ پھول سے مکھڑے کی ملاحت توبہ
پیراہنِ سادہ میں شفق تابئِ حسن
سر تا بہ قدم چمپئی رنگت توبہ

ماتھے پہ کرن سی اِک دمک جاتی ہے
اک چاندنی مکھڑے پہ چھٹک جاتی ہے
یہ نرگسی آنکھیں، یہ تبسم کی شراب
آنکھوں میں گلابی سے چھلک جاتی ہے

پھر آب کے بہار چھو رہی ہے دل کو
یادِ رُخِ یار چھو رہی ہے دل کو
وہ دُور کہیں، بول رہی ہے کوئل
احساس کی دھار چھو رہی ہے دل کو

اٹھی وہ گھٹا سُرمئی موسم آیا
دیکھے وہ چمن چمپئی موسم آیا
اک شاہدِ رشکِ گُل کہاں سے لاؤں
اے ہم نفسو! اگرئی موسم آیا

ہم دونوں

رتن سنگھ کلیم

ملا کرتے تھے چھپ چھپ کر کبھی راتوں کو ہم دونوں
ترستے ہیں اب اُن اگلی ملاقاتوں کو ہم دونوں

مبارک یاد کہہ کر چاند بھی جب مسکراتا تھا
کہاں سے لائیں، اب اُن چاندنی راتوں کو ہم دونوں

وہ آنسو جن کے آنکھوں سے تڑپ کر بہ نکلتے تھے
ذرا کھل کر نہ کہہ سکتے تھے جن باتوں کو ہم دونوں

اُنہیں بابِ اثر کا راستہ معلوم ہے شاید
نہ بھولیں اُن دعاؤں اُن مناجاتوں کو ہم دونوں

دھڑکتے دل خدا معلوم کیا کہتے تھے آپس میں
مگر سنتے تھے بے سمجھے بھی اُن باتوں کو ہم دونوں

نہ بھولا ہے نہ بھولے گا قلق ایامِ ہجراں کا
تڑپتے لوٹتے رہتے تھے جب راتوں کو ہم دونوں

کلیم ایسی گھٹا اُٹھے کہ دن کو رات ہو جائے
فلک پر ڈھونڈتے ہیں روز برساتوں کو ہم دونوں

کلامِ عارف

پر ایک نظر

حمیدہ سلطان

نواب زین العابدین خاں عارفؔ، نواب غلام حسین خاں مسرور کے بڑے بیٹے اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے تھے۔ شعر و ادب کا ذوق عارف کو نانا اور باپ سے ورثے میں ملا تھا، خصوصاً معروف اپنے وقت کے ممتاز شعراء میں تھے۔ فنِ شعر سے معروف کو عشق تھا ایک اُردو دیوان کے علاوہ نواب صاحب موصوف نے مثنوی موسوم بہ تسبیح زمرد اپنی تصنیف چھوڑی ہے، اس میں پانچ سو شعر حسن سبز قبا کی مدح میں لکھے ہیں۔ اس مثنوی کی ترتیب میں التزاماً سبزی کا ذکر ہے ایسے ذی علم نانا کی گود میں عارف نے آنکھ کھولی پھر غالب جیسے شہبازِ سخن سے استفادہ کیا۔ اس لئے اپنے ہمعصر شعراء میں (عارف) کو ممتاز درجہ ملا۔ میں اب کچھ تذکروں کا حوالہ دوں گی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عارف بڑے پائے کے شاعر تھے۔

اُردو شعراء کے تذکرے اور عارف

تذکرہ شعرائے ہند مولفہ (۱۸۴۷ء) میں مولوی کریم الدین، عارف کے متعلق لکھتے ہیں: "عارف تخلص۔ نام نواب زین العابدین خاں۔ خواہر زادہ نواب اسد اللہ خاں۔ مرزا نوشہ غالب کے ابتداء میں میاں نصیر سے شعر کہنا سیکھا اور اُس کے ہی طور پر ایک دیوان بھی لکھا۔ مگر بعد آنے نواب اسد اللہ خاں مذکور کے اکبر آباد سے نصیر سے اصلاح لینا چھوڑ کر ان کی خدمت میں رہنا شروع کیا، انہوں نے اپنے ڈھنگ پر اُن کو کتب فارسی کی تعلیم اور اصلاح شعر کی دی۔ چنانچہ بہت دنوں بعد ایک دیوان مسمیٰ "مطلع مہر سعادت"، انہوں نے فراہم کیا۔ اس میں قصائد اور قطعات، غزلیں اور مدحتیں اور ترجیع بند، مخمس اور مسدس، معشر وغیرہ بہت موجود ہیں۔ میں نے بھی وہ دیوان دیکھا ہے۔ اس کو کلیات کہنا چاہیے حقیقت میں یہ شاعر بڑے رتبے کا ذی قدر قابل ولائق تحسین و آفرین ہے۔ فارسی میں بڑی دستِ قدرت ہے۔ جن ایام میں میرے چھاپے خانے میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ یہی شاعر[1] میر مجلس اور میر مشاعرہ مقرر تھا اور اس کے اشعار "گلدستہ' نازنیناں" نے بھی مندرج کیے ہیں۔ اب ان ایام میں بہ سبب حدت ذہن اور تیزی سخن سوکھ کر شل کانٹا ہو گیا ہے، بہت دبلا پتلا ہے، لانبا قد ہے، داڑھی بھر کر نہیں نکلی، ٹھوڑی بھری کچھ بال ہیں۔ خلق اس کا بہت اچھا ہے۔ اگر کوئی اس سے ملاقات کرے۔ بہت حظ اٹھائے، فی البدیہہ کہنے کا بھی درق ہے، تاریخ کہنے میں بہت اچھی قدرت رکھتا ہے، مادہ بھی اچھا نکالتا ہے، چنانچہ میری کتاب "گلدستہ نازنیناں" کے تمام پر دو تاریخیں اُس نے لکھی ہیں۔ ایک اُردو دوسری فارسی ایک مصرع اُردو سے کیا اچھی تاریخ نکالی ہے، وہ یہ ہے۔

"کہو، گلدستہ رگلزار جنت"

اس مصرعے سے اس کتاب کے اتمام کی تاریخ نکلتی ہے اور اس کا جوہر سخن دریافت ہوتا ہے۔ غرضکہ شعر کہنے میں قدرت اس نے پائی ہے کہ کوئی غزل بجز ساتھ اور اشی شعر کے پر مضامین رنگارنگ میں نہیں کہتا اور سب اچھی، پر مضمون نئے انداز پر ہوتے ہیں۔ نواب

---

[1] عارف بڑی خوش اسلوبی سے مشاعرے کا انتظام کرتے تھے۔

[2] دیکھیے آخری شمع مصنفہ مرزا فرحت اللہ بیگ میں عارف کا سراپا

یاءالدین خاں بہادر سے کمال ارتباط اور صحبت اس کو رہتی ہے، چونکہ دونوں صاحب معیشت سے فارغ اور نواب زادے ہیں، باہم شعر وسخن کا چرچا اور صحبت رہتے ہیں اس سال میں ۱۲۶۳ھ سے عمر اس کی قریب تیس برس یہ اشعار شاعر مذکور ہیں جو مشاعرے میں میرے مکان پر پڑھے تھے۔ واضح ہو کہ یہ[1] مشاعرہ میرے مکان پر چودھویں تاریخ رجب ۱۲۶۱ھ میں شروع ہوا، اس سال درمیانی ماہ ذی قعدہ کے بہ سبب بدویانتی و نااتفاقی شرکاء کے جو مطبع کے شریکوں نے مجھ سے کی تھی، موقوف ہوا۔

جائے پیدائش اور وطن عارف کا شاہجہاں آباد ہے، لڑکپن سے آج تک یہیں رہے، کہیں کا سفر نہیں کیا۔ مکان ان کا لال کنویں پر ہے جو مدرسے کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی شعر بھی اچھے کہتے ہیں۔ تذکرہ گلستان سخن مولفہ ۱۲۷۱ھ میں تحریر ہے "عارف تخلص نام زین العابدین خاں خلف رشید جناب غلام حسین خاں مسرور، شاگرد مرزا اسداللہ خاں غالب غفر اللہ تعالیٰ زبان اردو کو ہم پلہ فارسی مضامین شعر کو ہم پایہ حکمت کر دیا تھا۔ رنگینی سخن سے کاغذ ہمرنگ گل اور دل پذیری کلام سے قلم منقار بلبل، اصناف سخن پر قدرت اور انواع کلام پر اقتدار، غزل صحرائے شوخی کا غزال، قصیدہ گلشن متانت کا نہال، مخمس جس میں کلام کے واسطے حواس، رباعی مانند عناصر اربعہ پیکر سخن کی اساس۔ ۱۲۶۸ھ میں رخت سفر باندھ گلشن جناں کی طرف راہی ہوا، میر حسن تسکین کی تاریخ وفات بعینہ اس بلبل باغ جنت کی تاریخ ہے تماشائی تذکرہ اس مقامات کی سیر سے ان مقدمات سے مطلع ہو چکے ہیں کاش عارف کے احوال میں تجاہل عارفانہ کو کام نہ فرمائیں، دیوان ضخیم اس سے یادگار رہے،،

آثار الصنادید مولفہ ۱۲۶۳ھ میں سر سید مرحوم فرماتے ہیں

"نواب زین العابدین خاں بہادر، عارف تخلص، بلبل چمنستان سخنوری، طوطی شکرستان معنی پروری، خلف الرشید نواب غلام حسین خاں مسرور، ابن شرف الدولہ نواب فیض اللہ بیگ، خان بہادر سہراب جنگ نے مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں مشق سخن بہم پہنچائی ہے۔ اور تحقیق علمی اور تفتیش محاورات انہی کی خدمت فیض منقبت میں کی ہے اور فی الحقیقت اس فن میں وہ کمال حاصل کیا ہے، کہ شعرائے زمانہ قدیم یعنی میر و سودا قائم و کلیم اگر اس زمانے میں ہوتے بیشک اس زبدۂ کمال کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرتے، کمال کی علامت اس سے زیادہ کیا ہوگی۔ کہ شاگرد پر استاد کو ناز ہے۔ اور کیوں نہ ہو، ان وضع جدید نے اسلاف کی کہنہ طرزوں کو آب عرق سے دھو دیا اب وہ روزگار ہے کہ ہر سمت میں علم و کمال و ہنر اس صاحب علم کا بلند ہے"[2] غرضیکہ مولوی کریم الدین ہوں یا صاحب گلستان سخن اور سر سید ان سب نے ہی عارف کے کمال فن کی دل کھول کر داد دی ہے، اتنا ضرور ہے کہ اس زمانے کے رواج کی طرح عارف کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا ہے، بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ جواں مرگ عارف پر غالب کا اثر کافی تھا اور ان کی فطری صلاحیت کو غالب کی تربیت نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ وہ خوشگو اور خوش فکر شاعر تھے اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو یقیناً علم و ادب کی دنیا میں ان کا نام اور بھی چمکتا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ جتنا انہوں نے اپنا اردو فارسی کلام چھوڑا وہ بھی شہر آشوب کی دستبرد کی نذر ہو گیا موجودہ دیوان بھی اگر ان کے عزیز دوست نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں نہ لکھواتے تو صرف ہم لوگوں کے لئے عارف کا نام ہی رہ جاتا اور کلام غائب ہو جاتا۔ ان کے دیوان کو تذکروں میں ضخیم کہا گیا ہے تو خیال ہے کہ موجودہ دیوان جتنا ہی کلام عارف کا ضائع ہو گیا۔

عارف کی شاعرانہ قابلیت پر اس سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ ان کے شاگرد فن شعر میں اپنے زمانہ میں استاد تسلیم کئے گئے، نواب سعیدالدین احمد خاں طالب خلف اصغر جناب نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں نے دیوان عارف کے دیباچے میں لکھا ہے کہ عارف مرحوم کو خط نسخ لکھنے کا شوق ہوا تو یہ میر جلال الدین خوشنویس (جو اپنے وقت میں خط نسخ لکھنے میں یاقوت ثانی تھے) استاد بہادر شاہ کے پاس حاضر ہوئے استدعا کی کہ زمرۂ شاگردان میں داخل کیا جاؤں جسن اتفاق سے ادھر اس وقت عارف کی خوش کلامی کا شہرہ تھا۔ ادھر میر صاحب کے دونوں صاحبزادوں نواب مرزا صاحب ظہیر اور امراؤ مرزا صاحب کو شاعری کا شوق تھا ایک اچھے استاد کی تلاش تھی۔ میر صاحب کو یہ موقع اچھا ملا۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں تم کو یوں شاگرد نہیں کرتا۔ ہاں مبادلہ کرتا ہوں۔ میں تم کو خط نسخ کی اصلاح دوں اس کے اصول بتاؤں تم میرے لڑکوں کو شاعری کے رموز بتاؤ اور اس کے نکات سمجھاؤ عارف نے منظور کر لیا۔ اور یہ معاملہ طے ہو گیا۔ عارف نے خط نسخ کی

---

[1] دیکھیے مشاعرہ آخری شمع فرحت اللہ بیگ
[2] میں نے مضمون کی طوالت کو مختصر کر کے درج کیا ہے۔

ایسی مشق کی کہ ایک سال کے اندر اُستاد نے اصلاح دینی چھوڑ دی اور سند خوشنویسی لکھدی،

جیسا کہ میں اپنے ایک مقالے دیوان عارف کے نسخے، میں لکھا ہے کہ عارف نے غالب کے ڈھنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے، اس سے وہ کامیاب رہے، اُن کی ایک غزل اور ایک مخمس غالب کی غزلوں پر میں پیش کر رہی ہوں۔

سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
ہمنشیں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو

ایک صحرائے جنوں میں آپ کیجئے سلطنت
چلیئے ایسے شہر جس میں مرزباں کوئی نہ ہو

آپ ہی حاکم رہیں اور آپ ہی محکوم ہوں
دوسرا اپنے سوا زنہار واں کوئی نہ ہو

خضر تک آنے نہ پاوے کیجئے وہ بند وبست
نام کو بآنکہ اس جا پاسباں کوئی نہ ہو۔

کیجئے آراستہ گر محفل عشرت فزا
مہتم اپنے سوا اس کا بھی واں کوئی نہ ہو

تندئ مے سے رہے ساغر کو گردش خود بخود
میکدے ہوں سینکڑوں پیر مغاں کوئی نہ ہو

لال مت سمجھو زبانِ شمع کو خامش ہے یہ
بات یہ کس سے کرے جب ہم زباں کوئی نہ ہو

ہیں میرے گلہائے داغ سینہ تو داری صبا
یہ وہ گلشن ہے کہ جس کا باغباں کوئی نہ ہو

مرئیے اس حسرت میں گر قاتل نہ ہاتھ آوے کہیں
روئیے اپنے پہ خود گر نوحہ خواں کوئی نہ ہو

بیچ میں پڑ اس کے تو ہی اے آہ حزیں
صلح کیوں کر ہوئے جب تک درمیاں کوئی نہ ہو

شکوہ کس سے کیجئے خالق کی مرضی ہے یہی
نکتہ چیں پیدا ہوں لاکھوں نکتہ داں کوئی نہ ہو

ہاں خدا تو دیکھتا ہے لاکھ چھپ کر روئیے
وہ جگہ لاؤں کہاں سے میں جہاں کوئی نہ ہو

پھر تلک قاتل تو قاتل موت بھی آتی نہیں
کس کو دیجے جان جب خواہانِ جاں کوئی نہ ہو

مانے گر کوئی نصیحت عارفِ دلخستہ کی
بھول کر بھی والۂ آتش رخاں کوئی نہ ہو

مدت ہوئی ہے عیش کا ساماں کئے ہوئے
روشن چراغ مدسے شبستاں کئے ہوئے
مدت ہوئی ہے حجرہ گلستاں کئے ہوئے
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

صورت یہی ہے تو کوئی دم میں ہوا ہے دم
اب زندگی سے ایسے نہایت خفا ہے دم
پھر پاس ننگ و نام سے گھبرا گیا ہے دم
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

کیا کہیئے کیا شفیق ہمارا ہوا ہے عشق
ہر دم ہمارے واسطے راحت فزا ہے عشق
گویا کہ بیشکار لبِ دل رہا ہے عشق
پھر پرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر تار ساز شکوۂ دلدار ہے نفس
پھر پیرہن میں حوصلہ کے خار ہے نفس
پھر داغ شعلہ خیزئ اظہار ہے نفس
پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

نکلے نکلے کوچۂ قاتل میں آرزو!
کیا کیا ہے اپنے اس دل بسمل میں آرزو
اک جنگجو کے ملنے کی ہے دل میں آرزو
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

معلوم کیا کرے کوئی اس رنج سخت کو
تاب و تواں کی کھو دے بیخ درخت کو
برباد کرکے صبر کے سامان و رخت کو

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

بند گراں ہے عاشقِ ناکام پر ہوس
اندیشہ طائر اور قفس دام پر ہوس
قانع نہیں نامہ و پیغام پر ہوس
مانگے ہے پھر کسو کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

اک یارِ دل نواز کو تاکے ہے پھر نگاہ
اندازِ جاں گداز کو تاکے ہے پھر نگاہ
اک چشمِ فتنہ ساز کو تاکے ہے پھر نگاہ
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

گو وہ سدا بغل میں عدو کے پڑے رہیں
پیویں ہم اپنے گھونٹ لہو کے پڑے رہیں
پیاسے وہاں پڑے رہیں سبو کے پڑے رہیں
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

چاہوں ازل کا آوے اگر میرے ہات دن
آخر ہوں زندگی کے بہ صبر و ثبات دن
کٹ جائیں ایک وضع پہ ہفتے کے سات دن
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

عارف میں پاکے بوئے دلِ آغوشِ اشک سے
بھرتا ہوں جامِ چشم کو سر جوشِ اشک سے
آتی ہے یہ صدا لبِ خاموشِ اشک سے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

حضرت غالب کو مخاطب کرکے عارف نے تین قطعے کہے ہیں پہلے قطعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے عارف کی یہ شکایت غالب سے کی ۔ مرزا غالب کو اُن کی غیبت میں عارف بُرا کہتے ہیں ۔ اپنی صفائی میں عارف نے یہ قطعہ کہا ہے ۔

قبلۂ جان و دل ترا فدوی ∴ تجھ کو کہوے بُرا یہ طاقت ہے
اسد اللہ نام ہے تیرا ∴ اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے
وردِ نام بزرگ کا تیرے ∴ اس میں کچھ شک نہیں عبادت ہے
مجھ کو زیبا ہے جتنا ناز کروں ∴ مجھ پہ جب یہ تری عنایت ہے
نظرِ منشئ فلک کی مجھے ∴ کچھ نہ پروا ہے کچھ نہ حاجت ہے
عرض کرتا ہوں شکوۂ حساد ∴ گرچہ میری خلاف عادت ہے
وہ سب میں بیان کرتا ہوں ∴ اُن کی جس وجہ یہ شرارت ہے
فیضِ صحبت سے تیری تیرا غلام ∴ جو بدل قائل[۱] امامت ہے
نیرؔ و محو ہیں میرے دشمن ∴ آسماں کی انہیں نیابت ہے
بات اُن کی لگی ہے پتھر سی ∴ دل میں اُن کے زبس قساوت ہے
اُن کی کیا کیا صفت کروں تحریر ∴ ایک آفت ہے اک قیامت ہے
ایک جلتا ہے اشک سے دائم ∴ بسکہ نفرت[۲] اسے نہایت ہے
دوسرا محو کینہ جوئی ہے ∴ یہ ہمیشہ سے اس کی عادت ہے
زور کرتے ہیں ناتوانوں پر ∴ زور ہے گر یہی شجاعت ہے
ہیں یہ سارے جہان کے جھوٹے ∴ قول میں اُن کے کب صداقت ہے

پھر ایک قطعہ اور حضرتِ غالب کو مخاطب کرکے کہا ہے ۔

بدیع مطا جو کرتا ہوں میں آج کچھ رقم ∴ آوے پسند حضرتِ غالب تو واہ واہ

۱؎ عارف پہ غالب کا اثر غالب تھا اس لیے اکثر تذکرہ نویسوں نے اُن کو شیعہ لکھ دیا ہے حالانکہ وہ صرف خوش عقیدہ سنی تھے ۔ تعزیہ داری ، مجلسیں کرنا خاندان لوہارو میں عام تھا جب تک ریاست باقی رہی تیرہ دن تک باقاعدہ محرم میں مجلس ہوتی تھی جس میں نواب روزانہ خود مع اپنے خاندان کے شرکت کرتے تھے ۔ نذر نیاز کے لیے ایک پیر صاحب الگ تعینات تھے اور ایک گاؤں کی آمدنی پورے سال کی اہلِ بیت کے نذر کے لیے وقف تھی ۔

۲؎ غالب نے عارف کی وفات پر جو مرثیہ کیا ہے ، اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیرؔ سے لڑائی

حالانکہ یہ لڑائی بعد میں ایسی محبت میں تبدیل ہوئی کہ عارف کی وفات کے بعد نواب ضیاء الدین احمد نیرؔ رخشاں نے اپنی لاڈلی بیٹی معظم زمانی بیگم کی شادی عارف کے بڑے صاحبزادے باقر علی خاں سے کی ۔

آتے ہیں اس طرح کے نکتے جو فکر میں ؛ یہ رنگ طبع کا میری ہوتا ہے گاہ گاہ

ایک قطعہ عارف کسی مشاعرے کی شرکت کے بعد رنگِ محفل بنانے کے لیے حضرت غالب کو مخاطب کرکے کہا ہے۔

قطعہ

کیا کروں عرض قبلۂ حاجات ؛ تھا عجب رنگِ محفلِ انشا
حال دوشینہ کیا کروں تحریر ؛ رات تھی یا شخص کور سواد
شمع روشن نظر نہ آتی تھی ؛ ایک اندھیر تھا جو حد سے زیاد
تھی سخن کی کساد بازاری ؛ کیسی دادِ سخن کی تھی بیداد
خام گویوں کی جب بندھی یہ ہوا ؛ فکر بالغ کلام ہے برباد
بات ہی جن کو کر نہیں آتی ؛ زعم میں اپنے ہوگئے استاد
میں نے ہی رات کو پڑھی تھی غزل ؛ لاکے اول زباں پہ یا استاد
تھا اثر وہ کلام شیریں کا ؛ بند جس سے ہوئے لب حساد
کیوں مری خلدِ طبع سے نکلی ؛ مجھ کو افسوس ہے یہ حور نژاد
اُن کی گل گشت کے نہیں قابل ؛ خار زار و خرابۂ الحاد
کب یہ آب و ہوا موافق ہو ؛ سرمہ جس جائے ہے گا گرد کساد
روح مرزا دبیرؔ ہووے خجل ؛ گر کہوں کچھ بقدر استعداد
اس کی منزل پہ خود ہوں دانستہ ؛ ہوں، ازل سے زلیس میں لطف نہاد

عارف کی وفات کے بعد غالب زندہ تو تھے لیکن زیست سے بیزار تھے۔ اُن کی زندگی عارف کے دونوں خورد سال بچے تھے۔ غالب کے زیرِ سایہ وہ دونوں بچے پروان چڑھے غالب نے خود مشکلیں اٹھائیں لیکن ان دونوں بچوں کا دل میلا نہ ہونے دیا۔ باقر علی خاں کامل کے ہاں جب بچی تولد ہوئی تو مرزا غالب نے خوش ہوکر ایک قطعہ کہا۔

بہ من ز مقدم فرزندِ مرزا باقر ؛ سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت
چو مقصد شد متعلق بہ گفتن تاریخ ؛ طریق تعمیہ رزید و جان غالب گفت[1]

عارف کی فارسی غزل

گویند مرد خوار بود با گریستن ؛ رفت آبروئے چشم من از نا گریستن
امروز نقد عیش چرا می دہی بکف ؛ از عقل نیست دائم فردا گریستن
محو است در تصور حسن تو چشم من ؛ دیگر چہ کار ماند مرا با گریستن
سر زد برون زکلبۂ من سیل اشک من ؛ پنہاں نماند راز ز تنہا گریستن
رحم آیدش بہ بے اثری ہائے گریہ ام ؛ ضائع نگشت در دل شبہا گریستن
ساقی مگر بخم گلوئش فشردہ ؛ کاغاز کرد شیشۂ صہبا گریستن
رانند سوئے باغ جناں گر ز کوئے دوست ؛ باید بزیر سایۂ طوبیٰ گریستن
سنت بود بچشم من از روز ؛ زیں راہ کردہ دوست تماشا گریستن
پنہاں بزیر چادر آب است روئے من ؛ نازم بہ پردہ داری بیدا گریستن
من خستہ تن بہ بستر و بستر بحال من ؛ دارد بچشم صورت دیبا گریستن
بر یکدو قطرہ نیز قناعت کنم کنوں ؛ رفت آنکہ بود دجلہ و دریا گریستن
بے شست و شوئی گر نظر پاک کے شود ؛ فرض است در وصال تو برما گریستن

ترسم بگردن تو بود خون عالمی
عارف نگہدار خدارا گریستن

متفرق اشعار

کیوں دشمنی کے غم میں رہیں کرکے دوستی ؛ بیگانہ وار ملتے ہیں ہر آشنا سے ہم
انسان ہوکے منتِ حیواں اٹھائیے ؛ بچتے پھرے ہیں سایۂ بالِ ہما سے ہم
کیا کہیں ہم کہ غمِ عشق میں کیا کھاتے ہیں ؛ کوئی دن اور ہیں دنیا کی ہوا کھاتے ہیں
تم سے مشہور رہوا میں تو ہوئے تم مجھ سے ؛ نامور آپ ہیں تو بندہ بھی گمنام نہیں
لوگ ہم سے بھی اڑا دیں تو اڑا دیں عارف ؛ طرز یہ خاص ابھی تک تو کہیں عام نہیں
دوہرے ہوئے جو شرم سے وہ پیچ و تاب میں ؛ حُسن اُن کا ہوگیا ہے دوبالا حجاب میں
غصے میں اُن کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش ؛ کیا شب کو ہم نے لطف اٹھائے عتاب میں
تمہیں کھنچوا کے بلانا ہمیں منظور نہیں ؛ ورنہ یہ جذبۂ عشق سے کچھ دور نہیں
شکوۂ جور و ستم شیوۂ الطاف و کرم ؛ میرا معمول نہیں آپ کا دستور نہیں
جو تری ہے طرز دلکش وہ کسی ثانی میں ؛ دہر میں ہونے کو عارف یوں سخنور اور ہیں
اب کوئے یار میں ترا شاید گذر نہیں ؛ پہلی سی بات تجھ میں نسیم سحر نہیں
کیجئے ہے دل میں عارف عالم بالا کی سیر ؛ اب تو کچھ اس خاکداں میں دل بہت گھبرائے ہے
اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں ؛ خط لیکے ہم ہی جاتے ہیں گو نامہ بر نہیں
اٹھتا قدم جو آگے کو اب راہبر نہیں ؛ پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں

---

[1] یہ قطعہ محمد سلطان بیگم کی تاریخ ولادت ہے جن کو پیارے مرزا صاحب کبھی جیون بیگ کبھی چینیا بیگم کہتے تھے۔ محمد سلطان بیگم کی شادی مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں خلف اکبر نواب شہاب الدین ثاقب سے ہوئی تھی۔ محمد سلطان بیگم کی وفات ۲۹ مارچ ۱۹۹۰ء کو ہوئی۔ اپنی درگاہ نظام الدین میں والد مرحوم کی پائنتی آسودۂ خواب ہیں۔

ہو اور آپ کو عالم میں نہ رسوا کیجئے : آپ ہو لیتے میرے یا مجھے اپنا کیجئے
ئے یار کی جانب ہمیں معلوم نہیں : شوق میں چاروں طرف کیونکر نہ سجدہ کیجئے
ں کو سونپوں جو نہ میں تجھ کو خدا کو سونپوں : اور عالم میں کیجئے کس کا بھروسہ کیجئے
رکے لیتے ہی ہے تم غم میں پڑے ہو عارف : اور کیا کیا وہ ابھی کرتے ہیں دیکھا کیجئے
ھے عالم میں ہیں صابر کہیں انساں ہم سے : کبھی شکوہ بھی سُنا گردشِ دوراں ہم سے
نتے ہیں شکل کو ہم دیکھ کے اس کی عارف : مانگتا ہے جو ہمارا کوئی دیواں ہم سے
[illegible] کوئی کیا عارف : نہ وہ چنگیز نہ وہ شوکتِ چنگیز رہی
نہ سا دیکھے جبریل کو جس جا عارف : شک نہیں وہ ہی درِ آلِ عبا ہوتا ہے
جہاں سے دوشِ عزیزاں پہ بار ہو کے چلے : یہ سوئے ملکِ عدم شرمسار ہو کے چلے
ہوتا سلوک برہمن و شیخ میں اگر : کتنی قریب دیر سے کعبے کی راہ تھی
آنکھوں کی راہ وہ میرے دل میں اتر گئے : کیا جلد مل گئی انھیں آسان راہ دل
لیسی وہ کیا جگہ تھی کہ کرتے بت اس میں جا : کعبے ہو گیا تھا انہیں اشتباہ دل
آجائے تو جو سامنے اسے غیرتِ بہار : ہو جائے دفعتاً مرے سینے کا داغ گل

عارف خوش عقیدہ مسلمان تھے۔ انہوں نے بزرگانِ دین کی شان میں سلام اور منقبت کہے ہیں۔ ایک منقبت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہا ہے۔

ابزد جاں آفریں کو کر کے کہتا ہوں گواہ : گر نہ تیرا عشق ہو مجھ کو تو میرا رو سیاہ
لائقِ تختِ خلافت تھی ازل سے تیری ذات : تجھ کو ارزانی ہو یہ اے بادشاہ دیں پناہ
ہے لقب فاروق تیرا فرق تو نے کر دیا : حق و باطل میں نہ رکھا تو نے باقی اشتباہ
تیرے امر و نہی نے صورت بدل دی دہر کی : جس جگہ تھا میکدہ اس جا بنی ہے خانقاہ
کیا شجاعت کا ترے اوصاف ہو مجھ سے رقم : دیکھ کر شیر خدا کہتے ہیں تجھ کو واہ واہ
تیرے دارالعدل میں پھر کیوں ہو خلقت کا ہجوم : کس پہ ہوتا ہے ستم جو آئے کوئی دادخواہ

سیدنا امام حسین اور آلِ عبا کی شان میں بطرز منقبت عارف نے کہا :

رتبہ ہے جو مجرئی آلِ عبا کے واسطے : فخر کرتے گر یہ ہوتا انبیاء کے واسطے
وحدتِ روحانی شبیر و پیغمبر کو دیکھ : ہو گئی گویا شہادت مصطفےٰ کے واسطے
قرض میرے دل سے یہ غم لے گیا روح القدس : دیکھے لاکھوں مصطفےٰ اور مرتضےٰ کے واسطے
قاضیٔ گردوں کی چادر چھین لائے جبرئیل : زینب و کلثوم ہیں حیراں ردا کے واسطے
باپ جس کا ساقیٔ کوثر خدا کی شان ہے : اور وہ پانی کے لئے ترسے خدا کے واسطے
چرخِ اطلس لائے اطلس لے علم دار حسین : شقہ گر منظور ہو تجھ کو لوا کے واسطے
ناتواں ہے عابد بیمار لے روح الامیں : شاخ سدرہ کا مگر لائے عصا کے واسطے
مشک چھلنی ہو گئی تیروں سے سقائے حرم : کب بچا پانی امام دوسرا کے واسطے

صبر کہتے ہیں جسے ہے اک تری عادت کا نام : ہے رضا تیرے لئے اور تو رضا کے واسطے
ہو چکی پیغمبری خیر الورا پر اختتام : کس کو ہوگا جو ہوا ہے مصطفےٰ کے واسطے
شکر للہ ہوں عزاداروں میں تیرے کرخ رو : خون روتا ہوں شہید کربلا کے واسطے
رات دن کھاتا ہوں میں عارف غم آلِ نبی : دل جگر معدہ بنا ہے اس غذا کے واسطے

سرورِ عالم کے لئے نعت کہی ہے ـــ

رتبے میں خطۂ دہلی نہیں کچھ عرش سے کم : یعنی موجود ہے اس جا پہ ترا نقشِ قدم
خالقِ ارض و سماوات سے بہ عجز و نیاز : چرخ نے رو کے کیا عرض بصد درد و الم
اب زیارت ہے اس کی مجھے ہر وقت نصیب : چشم سے میری نہ اوجھل ہو کبھی یہ اک دم

حضرت مولانا فخر صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو نواب احمد بخش خاں کے پیر تھے اور سارا خاندان لوہارو ان کا مرید تھا۔[1] اُن کے لئے چار صفحے کی منقبت دیوان میں موجود ہے۔ اس کا پہلا مصرع ہے۔

سلطان بحر و بر ہے جو تیرا فقیر ہے : آقا جہان کا ہے جو تیرا غلام ہے

خواجہ بختیار الدین کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے منقبت کہی ہے۔

ہوئی پھر انجمن عرس قطبِ ربانی : بہ بست و ہفتم ماہ جمادی الاثانی
صلائے عام ہے اس بزم میں کہ تو آئے : سعادتِ ابدی کی ہے یاں فراوانی

اس کے علاوہ قدسی کی فارسی نعت پہ دل و جاں باد فدایت کہ عجب خوش لقبی، پر تخمس اور سرورِ دو عالم کے لئے دیوان کے آخر میں فارسی میں سلام، حضرت علی کی شان میں منقبت سیدنا امام حسین کے لئے کئی سلام و منقبت ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے لئے چار قصیدے، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے لئے ایک قصیدہ اُردو اور ایک فارسی میں، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے لئے قصیدہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دیوانِ عارف کا ایک بڑا حصہ شہر آشوب کی دستبرد کی نذر ہو گیا اور موجودہ دیوان میں اغلباً عارف کا آدھا کلام ہو گا۔

---

[1] : یہ روایت خاندانِ لوہارو میں مشہور ہے کہ نواب احمد بخش خاں کو ۱۴ سال کے سن سے مولانا فخر صاحب جن کے نواب صاحب ۱۱ سال کی عمر سے مرید ہو گئے تھے، "آیئے والیٔ میوات" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ گویا والیٔ مہر کا فروز پور ملنے کی ان بزرگ نے پیشین گوئی فرما دی تھی۔ حضرت مولانا فخر صاحب کی میں ایک برگزیدہ بزرگ حضرت شاہ ثنار الدین صاحب کی ذاتِ اقدس سے فیض کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ افسوس ان کا انتقال فروری ۱۹۶۷ء میں ہو گیا۔



ایک سال

غلام نبی خیال

گذشتہ سال اسی روز اپنے دل دھڑکے
روش روش پہ مسرت کے پھول خنداں تھے
دلوں پہ اوسِ محبت کی تم نے چھڑکی تھی
سیاہیٔ شبِ ہجراں کا داغ دھویا تھا
یہی وہ دن ہے کہ وعدوں کے جام کھنکے تھے
یہی وہ دن ہے کہ باندھا تھا تم نے عہدِ وفا
تمہاری یاد مگر آج دل کو چھیڑ گئی

پڑھے تھے گیت جو اُلفت کے اک برس پہلے
چھنک اُٹھی تھی اُمنگوں کی مرمریں پایل
مہک اُٹھا تھا تمنا کی نزہتوں کا شباب
کیا تھا تم نے بصد ناز پیار کا اقرار
حدیثِ دردِ وفا اتنی جلدی بھول گئیں

مری عروسِ تمنا! مری رفیقِ سفر
تمہارے چہرے سے شاداب ہیں مری نظریں
بدن کہ نور کی کرنوں کا سیم گوں پیکر
رُخِ صبیح و نگاہِ خمار آلود
تم آج بھی مری راتوں کی تیرہ بختی میں
سجا رہی ہو امیدوں کے خواب زاروں کو
میں سوچتا ہوں کہ یہ میرا دامنِ صد چاک
تہی ہوا بھی مگر ہاں کبھی تہی نہ رہا

گئے برس مرے سینے میں دھڑکنوں کی ترنگ
ہزار بار نہیں لاکھ بار تم نے سُنی:
دلِ حزیں سر رہی جس میں آرزو کی خلش
تمہاری یادوں کی رعنائیاں سمیٹے رہا
یہی وہ دل ہے کہ اب آرزو کا دشمن ہے
اُمنگ زخم رسیدہ تو زخمِ صد چاک

میں سینچتا ہی رہا خونِ دل سے باغِ خیال
خزانِ ہجر تلے آرزوئے صبحِ وصال
تمہارے پیار بھرے خط میں دیکھتا ہی رہا
جگر کے داغ، نظر کی اُمنگ، دل کی خلش
بہت ہی محوِ تماشا ان آتشیں فانوں میں
تمہاری یاد مگر آج دل کو چھیڑ گئی

امیراللہ شاہین

اُردو ناول کے عظیم کردار



اُردو ناول کی عمر کچھ زیادہ نہیں یہی کوئی ایک صدی کی بات ہے۔ اس کم سنی کے باوجود ہمارے ناول کی اٹھان نے ادب سے پیمانِ وفا باندھے ہیں اور اس ایفائے عہد کے لیے کچھ ایسے جیتے جاگتے کردار دیئے ہیں جو ہماری معاشرتی تبدیلیوں اور سیاسی و معاشی حالات کا انعکاس لیے ہوئے ہیں۔

۱۹ویں صدی میں جب نذیر احمد ایک "پرابلم سیریز" ترتیب دے رہے تھے تو گویا وہ اسی سیاسی شکست و ریخت کی ترجمانی کر رہے تھے جس سے اُن دنوں ہمارا معاشرہ دوچار تھا۔ طالستائی، رچرڈسن اور بنیان کے طرز پر لکھے گئے ان اصلاحی ناولوں میں پامیلا کے سے کردار تھے جس پر فیلڈنگ کو بجا طور پر اعتراض تھا کہ ایسے ناسازگار حالات میں عصمت کی پاسبانی کس طرح ممکن ہوئی۔ نذیر احمد خود کو اس دُگدے میں بھی نہ ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ کردار کو یہ اجازت ہی کب دینا چاہتے تھے کہ وہ تنہا ہو کر کسی آزمائش میں پڑ جائے۔ "پاسبانِ عقل" کے سخت پہرے میں بھلا کیوں کر کسی کردار کے جوہر کھلتے۔ نتیجے میں اُن کو یک رُخہ ہونا ہی تھا۔ اسی سے گمان گزرتا ہے کہ نذیر احمد اپنے کرداروں کے دوسرے رُخ سے واقف نہیں یا اُن کی نفسیات سے بے خبر ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ جانتے بوجھتے دوسرے رُخ کو دبا جاتے۔ اس کے باوجود ان کے چند کردار انھیں بے دست و پا چھوڑ کر نمایاں طور پر سامنے آئے ہیں اور اپنا نقشِ دوام چھوڑ گئے ہیں۔ قاری اُن سے مانوس ہے۔ شاکی ڈپٹی کلکٹر کا کردار "ابن الوقت" کے "تقشف زدہ" ماحول میں شعلے کی لپک ہے جس میں وہ نسل نظر آتی ہے، جو انگریزوں کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے۔ انگریزی رعونت اور سرکاری کل پرزوں کی بدعنوانیوں کے ساتھ ساتھ "خان بہادروں" اور "رائے صاحبوں" کا بچپن بھی گھٹنوں چلتا نظر آتا ہے جسے آزادی کے خیالوں سے بیر تھا اور جنھیں غلامی میں آسودگی حاصل تھی!

مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار ایک خاص ٹائپ کا حامل ہے وہ نہ جغرافیائی حدود کا گرفتار ہے اور نہ کسی خاص عہد کا پابند۔ وہ شعلہ مشتعل، ضرور ہے مگر دُور رس اثرات رکھتا ہے۔ اس میں سنسنی خیزی کی جگہ دلآویزی ہے۔ گو چند ہی گوشے سامنے آتے ہیں تاہم جو کچھ سامنے آیا ہے ایک خاص مزاج کو بے نقاب کرتا ہے۔ کس طرح کم سواد لوگ پیچ دار باتوں اور لفاظی سے اپنی ظاہرداری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیلتے ہیں اور پھر کس آسانی سے اس فریب کا پردہ یکلخت چاک بھی ہو جاتا ہے۔ اس میں نذیر احمد کی انفرادیت کی چھوٹ ہے۔ ہمارے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی کوئی تاریخ ظاہر دار بیگ کے کردار سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

توبۃالنصوح میں جہاں اصلاح کی گھٹائیں اور اخلاق کے بادل یوں بسیرا کئے ہیں کہ شیطان کا کہیں گزر نہیں۔ لب تشنۂ تقریر نہیں رہتے۔ دماغ معطل اور عقل دنگ رہ جاتی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ کیفیات ابھرتی ہی نہیں یا جذبات کے سوتے خشک ہو گئے۔ وہیں سلیم کلیم اور نعیمہ کے کرداروں سے کبھی کبھی کوندے بھی لپکتے ہیں اور ظاہر دار بیگ کا کردار یوں جگمگا اٹھتا ہے گویا فضا میں کوئی پھلجھڑی چھوٹی کوئی انار چلا یا کوئی تارا ٹوٹا:

روشنی کی یہ لکیر مستقبل کے ان امکانات کی طرف واضح اشارے کرتی ہے۔ جو اپنی آمد کے لئے بے قرار خود کو ظاہر کرنے کے لئے کسی بہانے کی تلاش میں ہیں۔ سرشار کی صورت میں یہ بہانہ ہاتھ آتا ہے۔ سرشار اپنی والہانہ شیفتگی سے دُنیائے ادب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ان کی لاطائل نویسی ہمارے کام کی نہیں۔ فسانہ آزاد کا بے ربط پلاٹ ہماری مشکل میں اضافہ کرتا ہے۔ سرشار کا وسیع مطالعہ و مشاہدہ اور ان کا رواں دواں اسلوب بھی ہماری اُلجھنوں میں کمی کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ گو ولایتی میمیں، رُوسی میڈیا اور دیسی مہ وشانِ سیم تن کی برق پاشی بھی بھلا دینے کی چیز نہیں باوجودیکہ سرشار کی چشم تصور ان کے اندرون کو نہ ٹٹول سکی اور وہ اُن کے خیالی نقشے بنا کر چپ بیٹھ رہے تاہم وہ ایک شغلہ چھوڑ گئے۔ ان مولوی صاحب کی صورت میں جنہوں نے "عقل بڑی یا بھینس" کے استفتاء پر فتویٰ دیا تھا کہ " گو ان بڑی جو دودھ دیتی ہے" وہ سرائے والی بھلائے نہیں بھولتی جس نے دعوتِ نظارہ دے کر اوسان ہی خطا نہ کئے، وہ دُرگت بھی بنائی کہ غریب کچھ دیر کے لئے "اے او گیدی نہ ہوئی مری قرولی" کا نعرہ مستانہ بھی بھول گیا۔ وہ گل بدن بھی ناقابلِ فراموش ہے جس نے "بوالہوس" سے اس شرط پر پنکھا جھلوایا تھا کہ پنکھا تو ہلائیں تاہم نظر بھر کر نہ دیکھیں اور پھر اس عجیب و غریب شرط کے بعد ہی ستم ظریف نے جیب کی نقدی بھی گنوائی تھی اور جوتے بھی لگائے تھے، شاید وعدہ شکن پر! ہمایوں فر اور سپہر آرا کی مہتابیوں سے جلوہ طرازیاں اور نگاہوں کی ساقی گری کے مناظر مجسم ہو کر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں مگر یہ سب رنگین مناظر ہی رہتے ہیں کردار نہیں بن پاتے۔ واقعات کے اس جنگل میں بھانت بھانت کے کردار ناول کو چڑیا گھر بنا دیتے ہیں اس کے باوجود نواب آزاد خوجی اور اللہ رکھی کا رکھ رکھاؤ آنکھوں میں کھُب جاتا ہے۔

اللہ رکھی کا حسن آنکھوں کو روشن کرے نہ کرے اس کا الھڑپن اور اُچھلنا تمام توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ کسی بازاری شنغل اور گھر گرہستن دونوں سے مختلف ہے۔ اس میں نہ بیگمات کی سی شرافت ہے نہ خانگیوں کی رذالت اور یہ درمیانی حیثیت اُسے عجوبۂ روزگار بنائے ہوئے ہے۔ وہ ایسی جنس ہے جو نہ ابھی بازار میں آئی ہے نہ گھر کے اندر رہی ہے۔ حویلی کے ارد گرد منڈلاتی دروازے پر کھڑی ہے۔ اس چڑھتی اور پھیلتی بیل سے "گھر کی بار آور ڈالیاں" خوف زدہ ہیں۔ محلے کے لونڈے کنکریں مارنے پر تلے ہیں خود حویلی والوں کو اس بیری پر سنتروں کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اسی کارن ان کے قدموں کا وہ ارتعاش صاف پہچانا جاتا ہے جو چاہتا ہے کہ وہ بھی کسی "لغزش مستانہ" کی مجرم ٹھہرے۔ اللہ رکھی کا یہ ایک کردار اپنی برق پاشی اور فتنہ گری کے سبب با ہر بھیتر ادنیٰ و اعلیٰ نہ جانے کتنے طبقوں اور شخصیتوں کو بیک وقت متاثر کر رہا ہے۔ سرشار نے ایک کردار سے نہ جانے کتنے دلوں کے سکون برباد کئے ہیں۔

نواب آزاد کا کردار ایک ایسے انسان کا کردار ہے جو جتنا قدیم ہے اتنا ہی جدید بھی ہے۔ اُسے قدیم و جدید کا سنگم کہنا غلط نہ ہوگا۔ وہ ماضی سے وابستہ ہونے کے باوجود ماضی کا گرفتار نہیں، جدید کا دلدادہ ضرور ہے۔ جدیدیت کا خانہ زاد نہیں۔ وہ حسن کی حشر خیزیوں سے لطف بھی لیتا ہے اور عمل کی خوبی رکھتا ہے خوٹ کے ہاتھ اور ضلع جگت کی گھات سے وقوف اُسے الف لیلوی ہیرو بھی بنا دیتا ہے۔ اس عیب کے ساتھ وہ حسن بھی آگیا ہے جو ہماری داستانوں کی جان ہے یعنی سرتا پا راستی سراپا عمل! آزاد کا کردار ترجمان ہے اس بات کا کہ اب اعلیٰ اقدار سے وہ پہلا جیسا معاملہ نہیں رہا ہے۔ اب روایت کے ساتھ جدیدیت کی لے تیز سے تیز تر ہو چکی ہے۔ گو ابھی معاشرے میں قدامت سے کلیتہً آزادی کی خواہش نہیں پائی جاتی اور جدیدیت کو اپنانے کی اس خواہش کے پہلو بہ پہلو پرانی معاشرت

نا رکھ رکھاؤ بھی باقی ہے۔ آزاد میں یہ فرق معاشرے کے جائز مطالبوں سے آیا ہے۔ زمانے کی بدلتی ہوئی کروٹوں سے ہر لحظہ باخبر رہنا اور ہر دم کوئی مثبت پروگرام پیش نظر رکھنا یہ ہے کائنات میں اصل ترقی کا راز۔ اٹھتے ہوئے طوفانوں کے سامنے بے حس و حرکت کھڑے ہو جانا نہ ہوشمندی ہے اور نہ ہی خود کو طوفانی موجوں کے حوالے کر دینا جرأت مندی سنگلاخ چٹانیں سیلِ بے کراں سے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں یا خس و خاشاک کی مانند بہہ جاتی ہیں۔ جوابی طوفان بن کر اٹھ کھڑا ہونا ہی طوفان بلاخیز کا موثر جواب ہو سکتا ہے۔ آزاد میں اتنی سکت تو نہیں ہے البتہ وہ اس بے حسی پر دل گرفتہ ضرور ہے جس کا سچا مرقع خوجی کا کردار ہے۔

خوجی ایک طرف مظلومیت کا مظہر ہے دوسری طرف بے عملی کا جواز ساتھ ہی بے حسی کا نمونہ بھی ہے۔ اور دوسروں کے سہارے جینے والوں کا ترجمان بھی؛ اس میں زعم باطل بھی ہے اور خود فریبی بھی۔ یہ پندار بے جا اسے زمین کا گز بنائے ہوئے ہے۔ وہ ہر بہادر سے ٹکرانے کا الوکھا عزم لئے پھرتا ہے جس میں اس کے ولولے کا نہیں حماقت اور بوالعجبی کا دخل ہے۔ اُسے اپنے جسم ناتواں کا بڑا غلط اندازہ ہے ڈینگتا ہے اور اکڑتا ہے۔ اس کے پاس وہ ذہن نہیں جس سے اپنی اوقات کا پاس کرے۔ اس میں ایک ایسے مظلوم کی نفسیات کام کر رہی ہے جو ہر نئے حادثے پر تجزیہ و تدارک کی فکر کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی پر اُتر آئے۔ اُس میں آفاقیت ہے ہر ملک و قوم کے دورِ انحطاط میں کچھ ایسی ذہنیت پروان چڑھتی ہے جو سانحہ پر بے ساختہ چلاتی ہے "وقت خراب ہے ورنہ بتاتا" ان چند لفظوں میں جو احساس محرومی کام کر رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اسی حسرت میں اس قبیل کے لوگ زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ خوجی اور سروانٹز کے سانکو پانزا میں بڑی خاندانی مشابہت ہے اس کے باوجود خوجی میں اپنی ایک انفرادیت بھی ہے۔ اس کے یہاں عقل کا گذر نہیں سانکو عقل رکھتے ہوئے امید موہوم کا شکار ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے صحیح احساس کیا کہ "خوجی ڈکنس کے پکوک کے ساتھی سام ویلر سے کافی مشابہ ہے" سرشار کے بعد شرر کا نام لینا بے جا نہ ہوگا۔ اُن کی شعلہ بیانیوں سے ہمیں سروکار نہیں۔ اہلِ نظر نے "فردوس بریں" اور اس کے تین محکم ستونوں کو بار بار خراج ادا کیا ہے جنہوں نے اپنی خلاقی سے ایک طلسم اٹھا کھڑا کیا تاہم "فلورا فلورنڈا" محتاجِ توجہ ہے۔ فلورا کی معصومیت اور پادری پولاجیس کی شیطنت چاہے بھلائی جا سکے۔ ہیلن کا شوخ و شنگ ہر دم مسکراتا ہوا چہرہ بھلائے نہیں بھولتا۔ فلورا اور ہیلن کی ملاقاتوں میں خوش مذاقی اور فقرے بازی دو مختلف الخیال اور بالکل مختلف ماحول کی پروردہ سکھیوں کی بڑی سچی ترجمانی ہے۔ خصوصاً ہیلن کی شوخ ادائی تو گھر کر لیتی ہے۔ بالکل ابتدا میں ایسے چونچال کردار کا پایا جانا اُردو ناول کے روشن مستقبل کی غمازی کر رہا ہے۔ جہاں کلیسا کے بہت سے راز افشا ہوتے ہیں وہیں فن کار کی اس جرأت پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ جو بعد کے ادوار میں آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والے قلم کاروں کے بہت کام آئی۔ جنگِ آزادی کے دوران جو شعور پریم چند کے کئی کرداروں میں جھلکتا ہے شرر سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کو یہ شعور اپنے جن پیش رووں سے ورثے میں ملا ان میں شرر کا نام سرِ فہرست آئے گا۔ یہاں شرر نے ہنستے ہنستے وہ بات کہہ دی ہے جس کے اظہار کی جرأت زبانوں کو مدتوں بعد بھی نہ ہو۔ شرر سے بہتوں نے اکتسابِ نور کیا ہوگا جس کا سبب شرر کی عظمت نہیں ادب کی تہی دامنی تھی۔ لیکن شرر سے رسوا تک آتے آتے ادب کا مقدر بدل گیا، اور قدرت بھی۔

نذیر احمد سے رسوا تک معاشرہ بڑے کٹھن دور سے گذرا ہے۔ نذیر احمد کے وقتوں کی دلی میں ہریالی قابلِ نفریں تھی۔ رسوا کے لکھنؤ میں امراؤ قابلِ صد آفریں ہے۔ معاشرے کا یہ فرق ملاحظہ ہو اب طوائفوں کے بالاخانے "شرفا" کے لئے درس گاہیں ہیں۔ کل تک جو درسِ عبرت تھیں آج وہی اپنی رسوائی کے ہوتے ہوئے، درسِ حیات دینے چلی ہیں۔ خانم کا بالاخانہ ایک سنہری جال ہے جس میں مثلہ و مطربہ اور مے گسار اپنا اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ جس میں کھاگھوں کو گھاس بنا کر نواڑی پلنگوں کی ریشمی ڈوریوں سے

باندھ دیا جاتا ہے۔ کریمو اور فیفو کے سے بدمعاش اس کاروبار کی رونق بڑھانے کے لئے پیچھے پھرتے ہیں۔ بسم اللہ کے تریاچریتر کا کوئی توڑ نہیں وہ مولوی کو ننگی کا ناچ نچاتی پھونگل پھونگل دوڑاتی ہے۔ نواب زادوں اور ان کے ساختہ پرداختہ حسنو کے سے بدقماش سے بڑے ڈرامائی انداز میں سونے کے کڑے ہتھیالیتی ہے۔ خورشید لاکھ جتن کرنے پر بھی بیواڑے کے زمیندار کی لڑکی ہی رہتی ہے۔ اسے بیوائی کا فن ہے آتی نہیں۔ اسی لئے وہ اس ماحول سے پیچھا چھڑالیتی ہے۔

امراؤ جان بھی اس ماحول سے بیزار ہے مگر اس میں نکل جاتے کی سکت نہیں۔ وہ اس ماحول پر کڑھنے کے باوجود اس سے نباہ بھی کرتی ہے اور کبھی کبھی اس کا لازمی جزو بھی نظر آتی ہے۔ امراؤ کا کردار ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو نہ پوری طرح گرہستن ہے نہ طوائف اس کے باوجود وہ اس منزل سے کوسوں دور نکل آئی ہے جہاں ہم نے اللہ رکھی کو کھڑے دیکھا ہے۔ وہ ہریالی سے قریب ہے مگر اس کی طرح رستا ہوا ناسور نہیں۔ طبیعت کی سلامت روی اسے دل تنگ بھی رکھتی ہے۔ اس کی اپنی شخصیت کا جادو بہت سوں پر اثر کرتا ہے بعض حالات میں وہ خود نرگسیت کا شکار نظر آتی ہے۔ معاشرتی لحاظ سے وہ ہریالی سے مختلف ہے۔ رسوا کو اس کی وآشنائی پر ناز ہے اور بے جھجک اعتراف کی جرأت بھی! محسوس ہوتا ہے کہ ہریالی پر نکھار آیا ہے تو وہ امراؤ بن گئی ہے۔ اب سوسائٹی کا بڑا حصہ اسے قدر و منزلت دے چکا ہے۔ گو معاشرہ بالکل گیا گذرا اب بھی نہیں ہے۔ اب بھی اکبر علی کے مکان کی عورتیں اس پر لعن طعن کرتی ہیں۔ اس سے امراؤ کی ٹھہری ہوئی زندگی میں اضطراب کی لہریں اٹھتی ہیں۔ لیکن یہ عورتیں بھی دورنگی کا شکار ہیں۔ وہ اپنی آغوش سے ایسی نسل اٹھا رہی ہیں جو خود اپنے بڑوں کی چھینیوں سے تعلقات زن و شو قائم کرتی ہے۔ یہی عورتیں "میاں" کے "لڈن کی ماں" سے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس ناجائز تعلق سے جس لڈن نے جنم لیا ہے، انھیں نہیں معلوم کہ کل وہ اپنی ماں کا بدلہ لے سکتا ہے اور حرم کے تقدس کو پامال بھی کر سکتا ہے۔ اردو ادب کے بعد کے ادوار میں اس کی صدائے بازگشت سنی جا سکتی ہے۔ ان عورتوں کی آواز مخالفت نہ صرف پست ہے بلکہ آوازہ بغاوت گلوں میں گھٹ گیا ہے۔ یہی وہ دبی دبی بغاوت ہے جو ابھی گئودان کی مالتی میں نظر آئی ہے۔ پریم چند نے مالتی کے روپ میں اس ردعمل کی پیکر تراشی کی ہے جو ہندوستانی سماج میں برسوں کے بند غلامی کو توڑ کر باہر آگیا ہے۔ مالتی اس سے مکمل گلوخلاصی ہی حاصل نہیں کرتی بلکہ وہ اپنی جیسی عورتوں کے لئے دعوت عمل بھی بنتی ہے۔ مالتی بظاہر ایک چنچل لڑکی ہے تاہم وہ ایک ذمہ دار عورت بھی ہے۔ اس کا دامن پھیلا ہوا ہے مگر داغ دار نہیں۔ یہ ناتراشیدہ ہیرا اپنی لطافتوں کے ساتھ کچھ کثافتیں بھی رکھتا ہے۔ جن کے تدارک کے لئے پریم چند اسے پروفیسر مہتا سے ملاتے ہیں۔ مہتا روشن خیال، مساوات مرد و زن کے حامی ہیں مگر عورتوں کا دائرہ کار محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں خطوط پر وہ مالتی کو ڈھالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف مالتی مہتا کی خامیوں کا مداوا ہے۔ وہ مہتا کی بے راہ رویوں پر اپنی سوجھ بوجھ کے پہرے بٹھا دیتی ہے۔ یہ دونوں مل کر معاشرے کے دشمنوں کو وہ سبق دیتے ہیں جو دھنیا اور ہوری کے بس کی بات نہ تھی۔

ہوری گئودان کا مرکزی کردار ہے۔ ہمارے ادب کا وہ زندہ جاوید عوامی کردار جو ہم میں سے اکثر کا ہر روز کا مشاہدہ ہے۔ یہ کچھ کے دلوں کی دھڑکن اور کچھ کا اپنا وجود ہے۔ وہ ایک درماندہ کسان ہے۔ اس پر ایک پورے کنبے کا بار ہے۔ دوسری طرف اس کے اپنے خاندان کے چند باغی عناصر ہیں جو اس کی ضرورت سے زیادہ شرافت اور حد سے سوا بھلمنساہت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کی بیوی دھنیا اور لڑکا گوبر دھن اس مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ گوبر باپ کی "دیالوتا" سے تنگ آکر اس کی ہر قسم کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے جب کہ اس کی بیوی دھنیا اپنے نصیبوں کو کوستی، لڑتی جھگڑتی اور شوہر کی مان مریادا کی خاطر اس سے من بھی جاتی ہے۔ ہوری مہاجنوں کے مکر و فن سے خوب واقف ہے۔ پھر بھی ان کا دم بھرتا ہے اس لئے کہ

اس کی فطرت میں جبلی ہے۔ اس کی سرشت میں بغاوت کا کوئی عنصر نہیں اس لئے بھی کہ اس نے جب سے آنکھ کھولی ہے خود کو ایسی ہی مظلومی و محکومی میں گھرا پایا ہے۔ اس کی جہاندیدگی اور وقت سے پہلے پیرانہ سالی نے اسے باور کرادیا ہے کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر حماقت محض ہے۔ پریم چند کی ژرف بینی نے ایک ایک جز سے پردہ ہٹایا ہے وہ گاؤں کے مظلوم کسان کی بڑی کامیاب عکاسی ہے۔ انھوں نے بالخصوص چیخوف سے کرداروں کے تجزیے کا فن اور اس سے پیدا ہونے والی انسان دوستی کی فضا کو جزو طبیعت بنا کر اپنے کرداروں میں وہی رُوح بھر دی ہے۔ ہوری کی اس درد مندی کا جواز اس کا یتیم و یسیر بچپن ہے۔

دھنیا اس سے مختلف ہے۔ ہوری میں جتنا دھیماپن ہے دھنیا میں اسی تناسب سے سخت گیری ہے۔ وہ پتی کے لئے لاجونتی ضرور ہے مگر دُنیا زمانے کے لئے شیرنی ہے۔ دھنیا کے شعلہ جوالہ کردار کے آگے ہوری ٹمٹماتا چراغ نظر آتا ہے جو بھڑکتا ضرور ہے مگر جلد ہی بے نور بھی ہو جاتا ہے۔ ہوری کا کردار قاری کو بے بسی اور گھٹن کا احساس دلاتا ہے۔ دھنیا کا کردار قارئین کی پوری ہمدردیاں حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے۔ ہوری دُکھ درد بانٹ لینے کا قایل ہے دھنیا اس ماحول سے ساز کرنے کو تیار نہیں۔ وہ پنچوں کے فیصلے کو ٹھکراتی ہے ہوری سلیا چمارن تک کو شرن دیتا ہے۔ دونوں میں دانتا کلکل ہوتی ہے۔ اور پھر دونوں روٹھتے رہے من بھی جاتے ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بڑی گنجائش ہے۔ ہوری اس پر کڑھتا ہے کہ وہ اُسے آسائش نہ دے سکا۔ دھنیا مردوں کی کٹھورتا پر انھیں نامرد کا طعنہ دیتی ہے مگر شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اس کے لئے وہ اپنے پران تجنے کو تیار رہتی ہے۔ پریم چند کا قلم فن کی نزاکتوں سے بڑی کامیابی سے عہدہ برآ ہوا ہے۔

ہوری ایک مظلوم ہے جو بڑی پامردی کے ساتھ زندگی کی تلخ کامیوں سے نبرد آزما ہے۔ اس کا ذہن فرار کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی اس کا وہ یقین جو انسانیت کے تئیں ہے شکستہ نہیں ہوتا

دھنیا اس سے ایک قدم آگے ہے۔ وہ اس سماج سے متصادم ہے وہ اپنی پیہم شکستوں پر لمحہ بھر کے لئے بھی ہراساں نہیں ہے بلکہ اس کے وجود میں اضافہ ہی نظر آتا ہے۔ وہ گوبر دھن کی شکل میں ایک سماج باغی بیٹے کو جنم دے کر سماج کے ٹھیکہ داروں کو مستقبل کی یہ چیتاونی بھی دیتی ہے کہ اب کوئی دل بے رحم کسی فلاکت زدہ سے من مانی نہ کرا سکے گا جو اس بات کی علامت بھی ہے، بہت مدھم ہے میں سہی، کہ اب معاشی ناہمواری اور اخلاقی پستی کسی حد پر کہیں نہ رُکے گی۔

پریم چند عملی آدمی تھے ان کا آدرش واد ڈاکٹر مہتا کا ایک مثبت کردار پیش کرتا ہے جو جہالت کا دشمن ہے اور معروف نیکیوں کا علمبردار ہے۔ اس کی برائیوں پر مالتی کی دلآویز شخصیت کے پہرے ہیں۔ تاہم یہ پہرے رچرڈسن کی پامیلا اور نذیر احمد کی تمثیلوں سے مختلف ہیں۔ پریم چند کے ان دل کش پیکروں میں تجربے و مشاہدے اور تجزیہ و تحلیل کی وسیع کائنات ہے، فن کا رچاؤ ہے، تصویروں کے مختلف رنگ درج ہیں۔ مالتی اور مہتا سے اس مقصد کی تکمیل ہوتی ہے جو پریم چند کے پیش نظر تھا اور یہی ان کرداروں کی عظمت کا راز بھی ہے۔





غزلیں

صاف میرا ہے، اگر عکس تمہارا ہوتا
گرد آلود نہ آئینے کا چہرہ ہوتا

یوں بھی اچھا ہے، مگر اور بھی اچھا ہوتا
اُس کے دل میں جو وفاؤں کا اُجالا ہوتا

آنکھ پر لاکھ حجابوں کا نہ پہرہ ہوتا
وہ جو آیا تھا مرے گھر تو اکیلا ہوتا

میں ہی میں اُس کو نظر آتا ہر اک ذرّے میں
کاش نزدیک سے اُس نے مجھے دیکھا ہوتا

ذہن کا بوجھ، لگا ہوں کی خلش سانس کی پھانس
وقت سوغات میں یہ سب تو نہ لایا ہوتا

لوگ مرتے ہیں روز جنم لیتے ہیں
یہ نہ ہوتا تو کوئی اور تماشہ ہوتا

چاشنی لب کی ترے اور ترے رُخ کی مٹھاس
تلخیٔ وقت نے انکو بھی تو چکھا ہوتا

اے فضا موت یہاں اتنی نہ مہنگی ہوتی
ورنہ جینے کے لئے کوئی بہانہ ہوتا

فضا کوثری

ہزار مہر بہ لب لاکھ آبدیدہ سہی
حیات پھر بھی ہے نعمت ستم رسیدہ سہی

نگاہِ دوست نہیں ہے کہ تاب لا نہ سکوں
مزاجِ وقت کشیدہ ہے تو کشیدہ سہی

نکل تو آئی ہے تسکینِ دل کی گنجائش
یقین چشمِ کرم وہم آفریدہ سہی

وہ سر اُٹھا بھی تو سکتا ہے کل محل پاکر
کسی کے آگے کوئی آج سر خمیدہ سہی

گلِ فسردہ بھی رکھتا ہے کچھ ادائے کشش
بظاہر آئینۂ رونق پریدہ سہی

ہے زندگی کے تقاضوں پہ بھی نگاہِ عشق
مہکتی زلفوں کے سائے میں آرمیدہ سہی

نہیں ہیں اہلِ ہوس کی طرح دریدہ دہن
بھری بہار میں گل پیرہن دریدہ سہی

رہِ حیات میں پھر بھی کسے قرار آمر
کوئی ہزار نشیب و فراز دیدہ سہی

محمد حسین آمر

ہمسفر یار کی منزل نہ رہی اب دشوار
ہوگئے تیرے قدم عشق کی راہوں کا وقار

کون سمجھے گا یہ رنگین حقیقت جس کو
غم کا افسانہ بناتے ہیں مرے لیل و نہار

چند کلیوں کے لئے جذبۂ تخریبِ چمن
باغباں اتنی تو محدود نہ کر فکرِ بہار

ہائے یہ خونِ شہیداں جو کبھی مٹ نہ سکا
ایک خاموش گواہی ہے یہی رنگِ بہار

ہر نشاں جس پہ ٹھہرتا ہوں صدا آتی ہے
تیری منزل یہ نہیں رہروِ ہستی ہشیار

ظلمتِ شب سے نہ گھبرا کہ یقین ہے مجھ کو
یہ اندھیرے ہی تو ہوتے ہیں سحر کے آثار

سوچتا ہوں کہ ہر اک گام پہ یہ تلخیٔ زیست
میرا احساس ہے یا طولِ غمِ لیل و نہار

فیصلہ ہو نہ سکا اور نہ ہوگا سلمان
وہ تبسم تھا کہ چٹکی ہوئی کلیوں کا نکھار

سلمان شمسی



ایک خواب

اظہر افسر

کردار:

شوہر

بیوی

نوجوان لڑکا

ایک بچہ

ایک بچی

ایک خوبصورت سجا سجایا کمرہ، درمیان میں مسہری ہے۔ مچھردان اٹھا ہوا ہے، شوہر اِس طرف، بیوی اُس طرف مُنہ کئے ہے، دونوں سوئے ہیں، دیوار پر گھڑی لگی ہے، جس میں دو بجنے میں چند ہی سیکنڈ باقی ہیں، کمرے میں ہلکی نیلی روشنی ہے، ایسی کہ ہر چیز نظر آرہی ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے تو گھڑی دو بجاتی ہے — اور —

(بیوی چیخ مار کر اُٹھ بیٹھتی ہے)

شوہر: ہوں — بیگم — (پلٹ کر بیوی کی طرف دیکھتا ہے)

بیوی: تم کہاں ہو — تم کہاں ہو؟

شوہر: کیا بات ہے، میں یہاں ہوں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔

بیوی: میرے قریب آئیے، میرے قریب آئیے۔

شوہر: ڈر گئی ہو کیا؟

بیوی: ہاں: میں ڈر گئی ہوں، بہت بری طرح ڈر گئی ہوں، ذرا اپنا ہاتھ لائیے

شوہر: (اُٹھ بیٹھتا ہے) اور اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے) — لو۔

بیوی: یہاں رکھئے میرے دل کے پاس —

شوہر: (ہاتھ رکھتا ہے) تمہارا دل تو بہت بری طرح دھڑک رہا ہے

بیوی: میرا دل بہت زور سے دھڑک رہا ہے نا۔

شوہر: تم ڈر گئی ہو۔

بیوی: سچ مچ میں ڈر گئی ہوں۔

شوہر: (اُٹھتے ہوئے) ٹھہرو میں روشنی جلاتا ہوں۔

بیوی: (کندھا پکڑ لیتی ہے)۔ نہیں، نہیں خدا کے لئے روشنی مت کرو، ایسا ہی رہنے دو — اندھیرا ہی رہنے دو —

شوہر: تمہارے بال بکھرے ہوئے ہیں، تم پسینے پسینے ہو رہی ہو، تمہاری سانس زور زور سے چل رہی ہے — کیا بات ہے — کوئی خواب دیکھا ہے کیا۔

بیوی: ہاں — خواب دیکھا ہے ایک بھیانک خواب،

شوہر: (ہنستا ہے)

بیوی: آپ ہنس رہے ہیں

شوہر: بیگم، تم کیسی باتیں کر رہی ہو، — دراصل تم خواب دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ اور اب تک ڈر رہی ہوئی ہو۔ چھوڑو ان فضول خیالات کو۔ آؤ میں تمہیں ایک مزیدار قصہ سناؤں۔

بیوی: جو قصہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے بعد میں اب اور کوئی قصہ سننا نہیں چاہتی۔

شوھر: پانی پیوگی — ؟

بیوی: ہاں —

(شوہر ایک طرف رکھی ہوئی صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلتا اور بیوی کو دیتا ہے۔ بیوی پانی غٹاغٹ پی جاتی ہے — اور لمبا سانس لیتی ہے)

شوھر: تمہارا دل اب تک دھڑک رہا ہے۔ بیگم اپنے آپ کو سنبھالو، بیسیوں آفتوں اور پریشانیوں میں تم نے مجھے دلاسا دیا ہے، سنبھالا ہے۔ تم تو بڑی ہمت والی ہو۔ اب خود ہی ہلکان ہوئی جا رہی ہو، ایسی بھی کیا بے ہمتی۔ تم ہی تو کہتی تھیں۔ انسان کو چٹان کی طرح مضبوط ہونا چاہئے۔ اور اب خود ہی موم ہوئی جا رہی ہو، اور وہ بھی ایک خواب کی وجہ سے۔ بھلا خواب کی بھی کوئی اہمیت ہے۔

بیوی: (لمبا سانس لیتی ہے)

شوھر: ہم دن رات خواب دیکھتے ہیں۔ اچھے بُرے رنگین سہانے، یہ بھی ایک خواب تھا۔

بیوی: ہاں خواب تھا مگر بے حد ڈراؤنا — ایسا دہشت ناک کہ میں کہہ نہیں سکتی۔

شوھر: ٹھہرو میں پھونکتا ہوں

بیوی: خدا کے لئے کچھ پڑھو۔ اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔

شوھر: میں پڑھتا ہوں (منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا اور بیوی پر پھونکتا ہے)

بیوی: اُف

شوھر: اب بتاؤ کیا دیکھا تم نے، ہماری شادی کو چار سال گذر چکے ہیں، میں نے تمہیں آج تک اس طرح ڈرا ہوا نہیں دیکھا۔ کیا دیکھا تم نے آخر خواب میں۔

بیوی: آپ سن سکیں گے؟

شوھر: لو بھلا تم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہو تو کیا میں تم سے سن بھی نہیں سکوں گا۔ — دیکھو ایسا ہے کھانے پینے میں کوئی بے احتیاطی ہو جائے تو ایسے خواب نظر آیا کرتے ہیں۔ تم نے کوئی ثقیل چیز رات میں کھائی ہوگی۔

بیوی: آپ کے ہی ساتھ تو کھایا ہے جو کچھ کھایا ہے۔ میں نے رات کوئی ثقیل چیز نہیں کھائی۔ آپ سمجھتے ہیں ہاضمہ کی خرابی کی وجہ سے میں نے یہ سب کچھ دیکھا۔

شوھر: آخر کیا دیکھا تم نے —

بیوی: میں نے دیکھا۔ میں نے دیکھا یہ صوفے، پلنگ، میزیں، یہ کرسیاں، یہ سازو سامان کچھ بھی نہیں ہے، ریڈیو نہیں ہے۔ پنکھا نہیں ہے، سلائی کی مشین نہیں ہے، استری نہیں ہے الماریاں نہیں ہیں۔ آرائش و زیبائش کا کوئی سامان نہیں ہے۔

شوھر: کچھ نہیں ہے؟

بیوی: کچھ نہیں۔

شوھر: (ایک لمبا سانس لیتا ہے) کوئی بات نہیں، گھر میں چوری ہو جاتی ہے۔ پل بھر میں ساری زندگی کی کمائی لُٹ جاتی ہے۔

بیوی: یہ گھر بھی نہیں ہے،

شوھر: ہاں ہاں ایک آن میں آگ لگ جاتی ہے، خود اپنے گھر کو آپ جلتا ہوا دیکھنا پڑتا ہے۔

بیوی: ایک کچی دیواروں والا گھر ہے، گز بھر کا دالان ہے۔

شوھر: آدمی ایسی جگہ بھی گزارا کرتے ہیں۔

بیوی: دالان میں ایک طرف بنِ قلعی کے جھوٹے برتن پڑے ہوئے ہیں۔

شوھر: بعض بد سلیقہ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں

بیوی: ایک کونے میں میلے کپڑوں کا ڈھیر ہے۔ لوٹا اوندھا پڑا ہے گلاس سے پانی بہہ بہہ کر اُن چار بچوں تک پہنچ رہا ہے جن کے بدن پر کوئی کپڑا نہیں ہے۔

شوھر: بچے؟

بیوی: ہاں بچے۔ سوکھے دبلے، پتلے، جن کے گال ہی نہیں پیٹ بھی پچکے ہوئے ہیں۔ ہاتھ پاؤں ایسے جیسے کاڈیوں سے بنائے ہوئے ہوں، اُن سے پیچھے دو چھوٹی چھوٹی بچیاں میلے بچارے پھٹے اکڑوں بیٹھی ہیں، اُن کے پاس . . . .

شوھر: اُن کے پاس؟

بیوی: اُن کے پاس ہی دو بچے کھڑے ہیں جن کے بدن پر کپڑے

تو ہیں مگر جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے ۔ اور سب سے پیچھے ایک نوجوان لڑکا کھڑا ہے جس کے گال کبھی سرخ ہوں گے مگر اب سیاہی مائل ہیں۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں کپڑے میلے اور کہنیوں اور ٹخنوں کو ڈھکنے سے مجبور

شوہر: توبہ توبہ

بیوی: میں نے ایک بچے سے پوچھا تم کون ہو اس نے کہا

بچے کی آواز: (اسٹیج کے باہر سے سنائی دیتی ہے) مجھ سے پوچھتی ہو میں کون ہوں؟

بچی کی آواز: (" " ") مجھ سے پوچھو میں کون ہوں۔

بیوی: پھر ہر ایک پکارنے لگا، مجھ سے پوچھو میں کون ہوں

بچہ: میں تمہارا بچہ ہوں

بچی: میں تمہاری بچی ہوں

لڑکا: میں تمہارا لڑکا ہوں

بچی: میں تمہاری لڑکی ہوں

بیوی: سب سے آخر میں اس مدقوق لڑکے نے جو سب سے بڑا تھا کہا . . . . .

نوجوان لڑکا (اسی طرح آواز اسٹیج سے باہر سے سنائی دیتی ہے) میں تمہارا سب سے پہلا بیٹا ہوں، میں اسکول سے نکال دیا گیا ہوں دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنا تو دور رہا میں باہر تک نہیں نکل سکتا، سب میری حالت اور کپڑوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان میرے چھوٹے بھائی بہنوں کو دیکھ رہی ہو . ان کے پاس کتابیں نہیں ہیں۔ چھ مہینے سے یہ فیس نہیں دے سکے ہیں ان کا بھی وہی حال ہوگا جو میرا ہوا ہے، ہم میں سے کسی کے پاس کوئی ڈھنگ کا کپڑا نہیں ہے۔ ہم سب نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے،

شوہر: (ہر باہر کی جانب دیکھ رہا ہے) اُف -

نوجوان لڑکا: (دائیں جانب سے آواز آتی ہے) ادھر دیکھو یہ تمہارا تازہ ترین بچہ ہے،

(دائیں جانب سے کسی شیرخوار کے بلک بلک کر رونے کی آواز سنائی دیتی ہے)

نوجوان لڑکا: یہ تمہاری آٹھویں اولاد ہے۔

بیوی: سب کے رونے اور چلّانے کی آوازیں بڑھنے لگیں، میں نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اتنے میں گھر کے ادھ کھلے دروازے میں آپ نظر آئے۔

شوہر: میں؟

بیوی: ہاں، مگر خدا بہتر جانتا ہے میں آپ کو نہیں دیکھ سکی، آپ کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی، آنکھیں باہر نکل پڑتی تھیں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے، آپ ننگے سر ایک نہایت میلی کچیلی شیروانی پہنے کھڑے تھے۔ اور شیروانی سے بھی زیادہ میلا آپ کا پاجامہ تھا، جوتا پیر میں تھا مگر ایسا کہ بائیں پیر کا پنجہ جوتے سے باہر نظر آ رہا تھا، آپ نے میرے آگے اپنی بند مٹھیاں پھیلا دیں۔

شوہر: پھر ——

بیوی: میں نے لپک کر دونوں ہاتھ تھام لئے . . . .

شوہر: پھر ——

بیوی: آپ نے میری طرف دیکھ کر اپنی بند مٹھیاں کھول دیں۔

شوہر: کیا تھا میرے ہاتھوں میں۔

بیوی: کیا تھا ——؟

شوہر: ہاں ہاں کیا تھا میرے ہاتھوں میں ——

بیوی: آپ کے ہاتھ خالی تھے، بالکل خالی، آپ لڑکھڑانے لگے، میں نے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی، یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میری ناک کی نتھ وزنی ہوتی جا رہی ہے، وزنی ہوتی جا رہی ہے، اس قدر وزنی کہ میرا سنبھلنا بھی مشکل ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ جیسے کئی کیلو وزن کی کوئی چیز میری ناک سے بندھی ہے۔ میں تڑپ رہی ہوں، چیخ رہی ہوں، چلا رہی ہوں۔

شوہر: (اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔) میں سمجھ گیا، میں سمجھ گیا رقیہ، سچ سچ تمہاری نتھ بوجھل سے بوجھل ہوتی چلی جائے گی۔ اگر میں کچھ نہ سمجھوں، کچھ نہ سوچوں۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ لیکن رقیہ میں تمہارے اس خواب کو حقیقت نہیں بننے دوں گا۔ کبھی نہ ہونے دوں گا۔ (شوہر دائیں جانب چلنے لگتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

نئی کتابیں

امیر خسرو : مصنف :- علی عباس حسینی - مطبوعہ پنجابی پستک بھنڈار دہلی ۱۹۶۸ء، **صفحات ۱۷۶ - قیمت تین روپے ۵۰ پیسے**

امیر خسرو ہمارے ادب اور فن کی رنگا رنگ شخصیت ہیں اُن کے قصے، پہیلیاں، لطیفے اور اشعار اُن کی اور اُن کے دور کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے جو ملک کے مشہور اور مستند افسانہ نگار ہیں، امیر خسرو کی رنگین شخصیت کو پوری رنگینی کے ساتھ "فلمی ڈھنگ کے اس ڈرامے" میں پیش کیا ہے۔ مقدمہ میں اُن کا یہ بیان خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

"امیر خسرو سے متعلق یہ کہانی نہ کوئی تاریخی چیز ہے اور نہ کوئی تحقیقی مقالہ یہ اُن کہانیوں کا ایک گلدستہ ہے جو اُن کے سلسلے میں عام طور پر مشہور ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کو ایک سلسلے میں گوندھنے اور دلچسپ بنانے کے لئے میں نے خود بھی رنگ آمیزی کی ہے۔ اس کی تکنیک ڈراما یا موجودہ افسانے سے الگ ہے۔ یہ اس ڈھنگ پر لکھی گئی ہے جس میں فلمی کہانیوں کو فلمانے کے پہلے تحریری صورت دی جاتی ہے۔"

اس بیان میں حسینی صاحب نے اس ڈرامے کو پرکھنے کے لئے گویا ایک میزان وضع کی ہے اور تبصرہ نگار کا کام اسی نسبت سے اور دشوار ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامے کو اسٹیج ڈرامے یا افسانہ کے معیار پر جانچنے کے بجائے فلم سینریو کے معیار پر پرکھنا چاہئے۔ ہر سین یا شاٹ چھوٹا ہے۔ شروع کے مختلف مناظر بکھرے بکھرے سے ہیں لیکن بعد کو اُن میں سے ہر منظر ربط و آہنگ اختیار کر لیتا ہے۔ کہانی کی دلچسپی اور رنگینی میں کوئی شبہ نہیں اور حسینی صاحب نے اس واقعہ کو مشاق قصہ گو کی طرح بیان کیا ہے۔ مکالموں کی زبان پر لطف اور متنوع ہے البتہ سینریو کی ہدایات نہ ہونے کی وجہ سے بعض غیر ضروری مکالمے بھی شامل ہو گئے ہیں جس سے مکالمے کی ڈرامائیت مجروح ہو گئی ہے۔

سب سے دلچسپ اور دلنواز کردار مراری کا ہے، جو اپنی بیٹی کی شادی کے بہانے ایک گاڑی سونا امیر خسرو کی بیٹی کے جہیز کے لئے

وصول کر لیتا ہے۔ پھر معصوم اور دلکش شخصیت مہر افروز کی ہے جو امیر خسرو کی سرمدی محبت کے نشے میں جان دے دیتی ہے۔ ارکلیک مہر افروز کے جسم کا طلب گار تھا اور مہر افروز کی روح خسرو کی محبت سے سرشار تھی۔ جسمانی اور روحانی محبت کی اس کش مکش کا خاتمہ مہر افروز کی خودکشی پر ہوتا ہے اور عین اسی وقت جب امیر درد سے بے قرار مہر افروز کی قبر سے لپٹ رو رو کر گا رہے تھے۔

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دو دو بھئے اک انگ

خسرو کے پیر و مرشد اور روحانی پیشوا حضرت نظام الدین اولیا کی آواز گویا ڈرامے کے مرکزی تصور کو دو جملوں میں بیان کر دیتی ہے۔

"مٹی میں دبے ہوئے مٹنے والے حسن کو نہ ڈھونڈھو۔ اپنے دل میں دلستاں جمال کو دیکھو۔ وہی امر ہے۔ وہی غیر فانی ہے۔ یہ تمہارا دردِ جدائی بھی اسی حسن لازوال کا جلوہ ہے اٹھو اور اسی کی روشنی میں دنیا کو دکھ درد بھول جانے کا طریقہ بتاؤ۔"

آخری جملہ شاید ناصحانہ سا ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود ڈراما ایک پر اثر انجام تک پہنچتا ہے۔ حسینی صاحب نے مختلف تاثر پاروں کے ذریعے خسرو کے دور کی تہذیبی جھلکیوں کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تاثر کی لطافت اور پیش کش کی رنگینی کی بنا پر یہ ڈراما یقیناً قابلِ قدر ہے۔ اب تک ہماری کسی ادبی شخصیت پر کوئی ایسا دلچسپ اور پُر اثر ڈراما نہیں لکھا گیا ہے ——— **محمد حسن**

"نیلے مرام" حسین محمد اسلم عظیم آبادی کے افسانوں رپورتاژ اور انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں چھ افسانے ایک رپورتاژ اور دو انشائیے ہیں جیسا کہ مختار الدین احمد صاحب کے تعارف سے ظاہر ہوتا ہے، افسانے مصنف کی طالب علمی کے عہد کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے اُن کے مطالعے سے مصنف کے ذہنی ارتقاء اور سفر کی جھلک مل سکتی ہے۔ آج جب افسانہ ہیئت، تکنیک، موضوع اور اظہار کے اعتبار سے بنیادی تبدیلیوں کے مراحل سے گذر چکا ہے۔ ان افسانوں کی محض تاریخی اہمیت رہ جاتی ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں اسلم عظیم آبادی کا رپورتاژ "نقش قدم" مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ اُردو میں رپورتاژوں اور سفرناموں کی کمی کو دیکھتے

ہوئے اس کتاب کی قدر و اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ تخلیق اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہاں مصنف نے سیدھا سادھا اور غیر مرصع اسلوب اختیار کیا ہے جو موضوع کے عین مطابق ہے۔ اس رپورتاژ کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں بعض مفید تاریخی و ثقافتی معلومات بھی اکٹھا کر دیئے گئے ہیں۔

دونوں انشائیے اُردو ادب کی دو مشہور شخصیتوں اختر اورینوی اور کلیم الدین احمد سے متعلق ہیں۔ مصنف نے ان دونوں شخصیتوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مخصوص شاعرانہ اسلوب میں انھوں نے دونوں کے خاکے مرتب کئے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کتابت، طباعت غنیمت اور قیمت ساڑھے چار روپئے ہے۔

کتاب مکتبہ اُردو، ودیاپیٹھ، پٹنہ ۴ سے مل سکتی ہے۔

(بدیع الزماں)

غبارِ رنگ (مجموعہ کلام) اندر سروپ دت ناداں

یہ پہلا مجموعہ ہے۔ ناداں صاحب کی ۶۰ غزلیات کا، جسے قصرِ اُردو، اُردو بازار دہلی نے شائع کیا ہے۔

ناداں صاحب دُنیائے شاعری میں نسبتاً نو وارد ہیں۔ لیکن اُن کی غزلیات پختگی کی ایک واضح چھاپ لئے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر اُن کی شاعری ردِ عمل کی شاعری ہے۔ ناموافق حالات نے اُن کے کلام میں یاسیت کا عنصر شامل کر دیا ہے لیکن وہ مزاجی نہیں۔ وہ ماضی کو متاعِ عزیز تو سمجھتے ہیں لیکن نظر حال اور مستقبل پر رکھتے ہیں۔ وہ امید و حوصلہ کی تلقین کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے کہیں کہیں اُن کا لب و لہجہ بلند آہنگ ہوگیا ہے۔ لہجے کی یہ بلند آہنگی اس اعتبار سے فطری بھی ہے کہ وہ ایسے شخص کے مزاج کا حصہ ہے جس نے تقسیمِ ملک کے ہنگامے میں اپنا سب کچھ گنوایا ہے۔ لیکن جسے وہ سب کچھ ابھی میسر نہیں آیا۔ اُن کے ماضی کے نقوش ایک کسک کی صورت میں اُن کے کلام میں جابجا نمایاں ہیں۔ کرب کا ایک احساس اُن کے بیشتر کلام میں پایا جاتا ہے۔ اُن کا یہ احساس جہاں ذاتی ہے وہاں آفاقی بھی ہے۔

اُن کے موضوعات غزل کے مروج موضوعات ہیں۔ تاہم انھوں نے ان موضوعات کو اپنے اندازِ فکر کے مطابق اپنانے کی کوشش کی ہے جن جذبات کی ترجمانی — ناداں صاحب نے اپنے اشعار میں کی ہے، وہ ہمارے آپ کے سب کے سانجھے ہیں۔ اُن کے اشعار میں مختلف عوامل کے زیرِ اثر پیدا ہوئی بے چینی، بے بسی، بے حسی اور تنہائی کا احساس کا اظہار بڑی شدت کے ساتھ ہوا ہے۔ تاہم یہ عوامل اُنہیں بے دست و پا نہیں کر پاتے۔ وہ زندگی کے اداشناس ہیں۔ وہ دلِ درد مند رکھتے ہیں۔ لیکن مسکرانے کی خواہش اُن کے مزاج کا حصہ اور خاصا ہے۔ وہ ہر حال میں زندگی کو سر اور بسر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

اُن کے اشعار کی زبان سادہ و سہل اور بیان راست ہے۔

غبارِ رنگ کا دیباچہ ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے۔ نیز اس میں ایک مختصر مضمون ظفر ادیب کا شامل ہے۔

۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی لکھائی چھپائی معقول، سرورق دیدہ زیب ہے اور قیمت تین روپے ہے (ادارہ)

مہاتما گاندھی: مصنف: صفدر حسین۔ ناشر: پارس پبلیکیشنز جام باغ حیدرآباد (آندھرا) صفحات ۱۵۴۔ قیمت: تین روپے

صفدر حسین کی کتاب 'مہاتما گاندھی' ایک کتاب کارآمد ہے اور بڑی محنت سے لکھی گئی ہے جس پہلو کو بھی لیا گیا ہے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبان اور اندازِ بیان بھی دلکش ہے لیکن اس کتاب میں اگر کوئی خامی ہے تو وہ ہے جذبۂ عقیدت مندی کی زیادتی۔ اگر مقصد محض یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے تو یہ کتاب اپنے مشن میں کامیاب ہے لیکن چونکہ مہاتما گاندھی تاریخ میں اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کر چکے ہیں، جو ہمارے خراج ہائے عقیدت سے مستغنی ہے۔ لہٰذا سنجیدہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب شاید بچوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی ہے جنہیں مہاتما گاندھی کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ شاید اسی لئے اس کتاب میں واقعات اور محرکات کو سہل اور عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور ایسی بحثوں سے اجتناب کیا گیا ہے جو اختلافی نوعیت کی ہو سکتی تھیں مثلاً یہ کہ مہاتما گاندھی نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کو نظرانداز کر کے جواہر لال نہرو کو اپنا جانشین کیوں نامزد کیا۔ یا یہ کہ سبھاش چندر بوس اور مہاتما گاندھی کے درمیان کیا اختلافات تھے۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں فاضل مصنف بالغ قاریوں کا بھی لحاظ رکھیں گے۔ اور اس کتاب کو زیادہ سیر حاصل اور غیر جذباتی بنانے کی کوشش کریں گے۔

(مہدی عباس حسینی)

عورت

زندگی کا سرچشمہ...



عورت خدا کی عظیم ترین تخلیق ہے، اپنی عملی دنیا میں اس کا مقام اعلیٰ ترین ہے۔

مہاتما گاندھی




10 سالہ ڈیفنس
ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ
شرح سود 5 فی صد سالانہ ہوگی۔
12 سالہ نیشنل
ڈیفنس سرٹیفکیٹ
180 روپے
ٹیکس سے بری۔
6.66 فی صد سالانہ
سادہ سود
یا
5 فی صد سالانہ سود مرکب
میعاد پوری ہونے پر
10 سالہ قومی
بچت سرٹیفکیٹ
100 روپے کی رقم
180 روپے ہو جاتی ہے۔
8 فی صد سالانہ سود سادہ اور
6.05 فی صد سالانہ سود
ٹیکس بہت کم شرح پر دینا
پڑتا ہے۔
محتاط بچت کیجئے
ٹیکس سے بری
معقول آمدنی بڑھایئے۔
براہ مہربانی مزید جانکاری اپنے قریب ترین
ڈاک گھر سے حاصل کریں۔
قومی بچت آرگنائزیشن

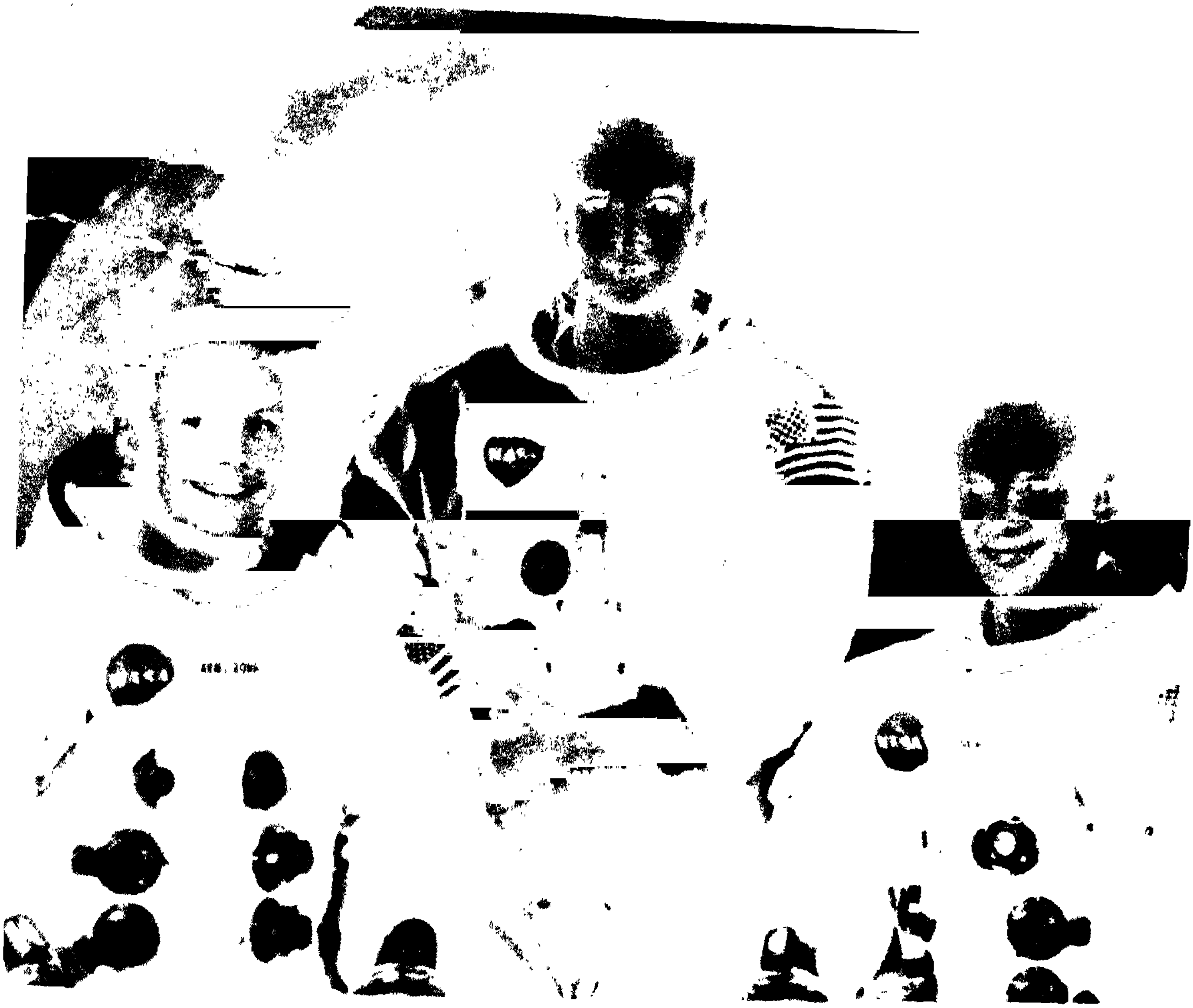
dawp 69/160



ہندوستان کے نئے صدرِ جمہوریہ

شری وی وی گری کا جنم ۱۰ اگست ۱۸۹۴ء کو برہم پور میں ہوا۔ آپ نے تعلیم کی تکمیل آئرلینڈ کی نیشنل یونی ورسٹی میں کی۔ کئی برس تک ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے کام کیا اور متعدد ٹریڈ یونینوں کے صدر و سکریٹری رہے آپ نے متعدد عالمی کانفرنسوں میں ہندوستان کے محنت کشوں کی نمائندگی کی۔ کئی برس تک مرکزی قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں مرکزی وزیر محنت بنے۔ ________ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک اتر پردیش، ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک کیرالہ اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک میسور کے گورنر رہے۔ آپ ۱۳ مئی ۱۹۶۷ء کو ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ بنے اور ۲۰ اگست ۱۹۶۹ء کو ہندوستان کے صدر جمہوریہ چنے گئے۔

۲۴ اگست ۱۹۶۹ء کو شری وی۔ وی گری نے صدرِ جمہوریۂ ہند کے عہدے کا حلف اٹھایا



چاند پر اُترنے والے پہلے انسان

دائیں سے بائیں : ———— نیل آرم اسٹرانگ ، ایڈون ایلڈرن

بیچ میں ———— مائیکل کولنز کھڑے ہیں جو اپنے رفیقوں کے انتظار میں چاند کے چکر لگا رہے تھے - اِن تینوں کا سالِ پیدائش ۱۹۳۰ء ہے

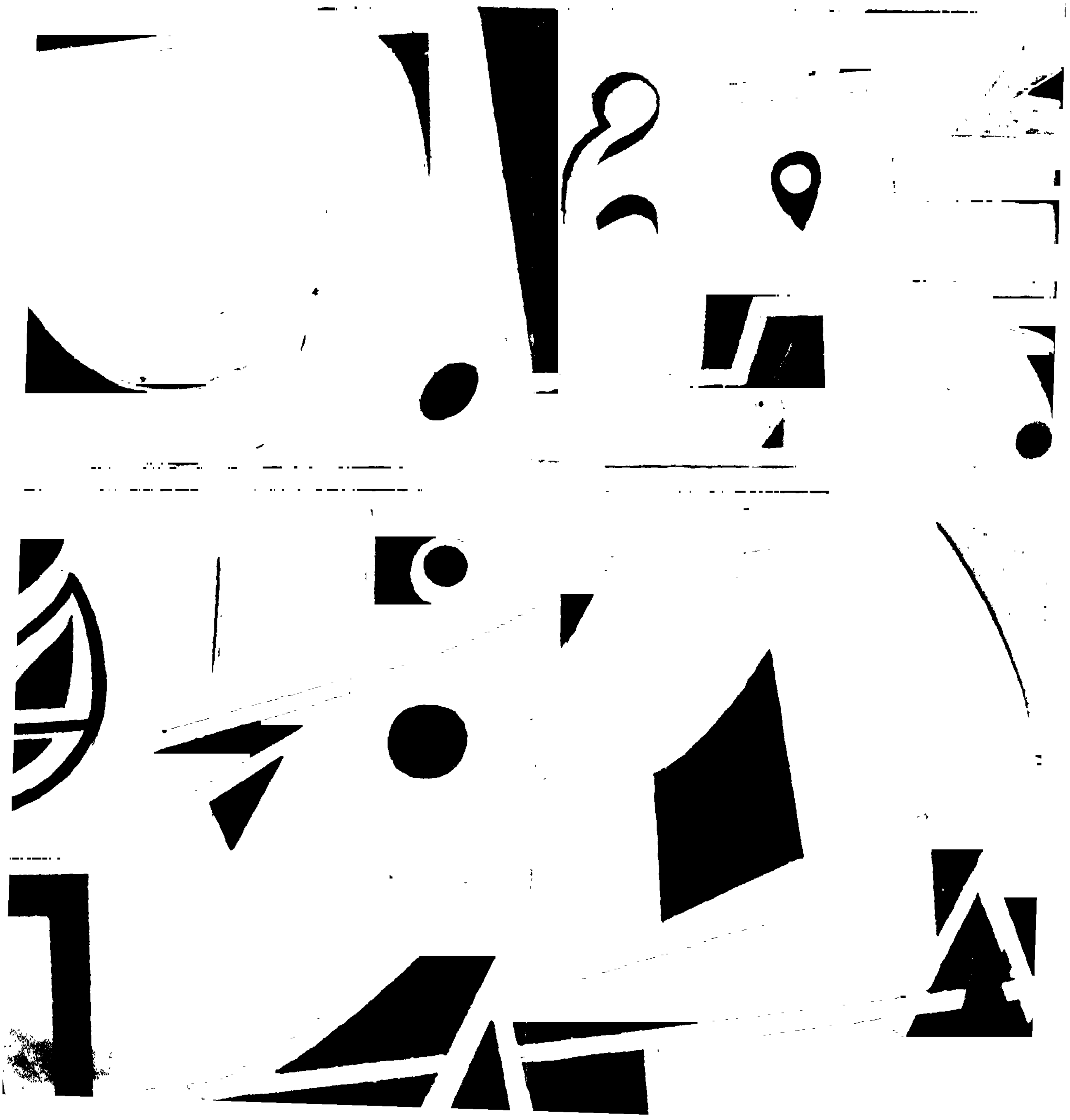
Vol. 28 No. 2 AJKAL (**Monthly**) September 1969

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by the Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.

Regd. No. D-509

دسمبر ۱۹۶۹ء

۶۰ پیسے





۳۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو نئی دہلی میں انٹر پارلیمنٹری یونین کا ۵۷ واں اجلاس منعقد ہوا جس میں ۶۲ ممالک کے ۶۰۰ مندوبین نے شرکت کی
یہ پہلا موقع ہے کہ یہ کانفرنس ہندوستان میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے کیا۔

شرکائے کانفرنس



آجکل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۸ ——— شمارہ ۵
دسمبر ۱۹۶۹ء
اگرہائن وپوس شک سمت ۱۸۹۱

ترتیب

سرورق ـ گورچرن اروڑہ

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر "آجکل" پبلیکیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

انسانی حقوق کے تحفظ کا اعلان ایک تاریخی اعلان ہے جس نے انسان کو محض ایک انسان کی حیثیت سے اہمیت دی ہے اور مذہب جنس، نسل یا زبان کی بنیاد پر کسی انسان کو کمتر اور کسی کو اعلیٰ و افضل تسلیم نہیں کیا ہے ایسے امتیازات کا نہ کوئی عقلی جواز ہے اور نہ سائنسی۔ مگر اس کے باوجود مذہب، رنگ اور نسل کے نام پر دُنیا میں بڑے کشت و خون ہوتے ہیں اور اب بھی نسلِ انسانی ان توہمات اور تعصبات کا شکار ہے۔

اقوام متحدہ نے اپنے قیام کے فوراً بعد ہی اس اہم مسئلے کی طرف توجہ کی اور ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اس اعلانیے کو اتفاق رائے سے منظور کر کے انسانی تاریخ کے باب میں ایک زریں باب کا اضافہ کیا۔

اس اعلان نامے میں ۳۰ دفعات ہیں۔ جن میں شخصی، تہذیبی، سماجی، شہری، معاشی اور سیاسی حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے، رہوڈیشیا جنوبی افریقہ اور پرتگال جیسے چند ملکوں کے سوا دُنیا کے تمام ممالک نے نہ صرف اعلان نامے کو منظور کیا ہے بلکہ اس پر صدق دل سے عامل ہیں۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ادارہ اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تھا جس کا مقصد امن کی بنیاد پر ایک عالمی نظام قائم کرنا ہے، مختلف قوموں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانا اور رواداری اور بھائی چارے کو فروغ دینا ہے۔ اپنے قیام کے بعد سے اس ادارے نے امن عالم کے سلسلے میں بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی ساری دنیا کی امیدوں کا مرکز یہی ادارہ ہے۔

یوم اقوام متحدہ کے موقع پر اپنی نشری تقریر میں صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے باہمی رواداری بلند نظری اور اعلیٰ انسانی اقدار پر زور دیا اور کہا کہ ہم سب بڑی آزمائشوں اور دشواریوں کے دور سے گزر رہے ہیں اور ہمیں انسانی مسائل سے انسانیت کے انداز میں نپٹنا ہوگا۔ آپ نے مزید کہا کہ دنیا کے اکثر ممالک میں تبدیلیوں کی ہوا چل رہی ہے اور پرانے زمانے کی راضی بہ رضا رہنے کی ذہنیت کی جگہ یہ نیا یقین ابھر رہا ہے کہ غربت ایک ایسا مرض ہے جس کا علاج کیا جا سکتا ہے آپ نے انتباہ دیا کہ چاند تک پہنچنے کی دوڑ جیت جانا اور سب کے لئے بہتر زندگی کی دوڑ ہار جانا ہمارے لئے ایک المیہ ہوگی۔

دنیا میں امن، خوشی اور خوشحالی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ادارہ اقوام متحدہ دنیا کے سبھی ملکوں کے لئے ایک بہتر معیارِ زندگی کے حصول میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے۔

جناب اجمل خاں صاحب (ممبر پارلیمنٹ) کا ۱۸ اکتوبر کو نئی دہلی میں انتقال ہو گیا موصوف ایک بالغ نظر سیاسی کارکن اور بلند پایہ ادیب تھے۔

اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت سے ہوا۔ ملک کی آزادی کی لڑائی میں آپ نے قید و بند کی سختیاں بھی جھیلی تھیں۔ بعد میں اُن کا رابطہ مولانا ابوالکلام آزاد سے قائم ہوا جو اُن کی زندگی تک قائم رہا۔

آپ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں صرف چند ہی شائع ہوئی ہیں آپ نے گیتا اور جپ جی کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

آپ نے ۷۲ سال کی عمر پائی (سن پیدائش ۱۸۹) اور درگاہ نظام الدین کے قریب سپردِ خاک کئے گئے۔

ادارہ اس غم میں ان کے پسماندگان سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

داستاں کہتے کہتے...

علی جوّاد زیدی

میں نے وہ لمحے دیکھے ہیں جب علی عباس حسینی کی کوئی نئی کتاب ختم ہوتی تھی۔ مدّتوں کی محنت ٹھکانے لگتی اور مہینوں بلکہ برسوں کی تخلیقی کاوشیں تکمیل کا لباس پہنتی تھیں۔ حسینی کے چہرے پر ایک خلاّقانہ اطمینان اور فاتحانہ تبسم ہوتا تھا۔ اس مسرت میں اُن کا بہت قریبی حلقہ بھی اپنی بساط بھر شریک ہولیا کرتا تھا۔ میں ایک طویل مدت تک اس قریبی حلقے کا ایک رکن رہا ہوں اور ان لمحاتِ مسرت میں شریک۔ آج خود حسینی کی زندگی کی کتاب ختم ہوگئی ہے اور گرد وپیش کی ساری فضا ایک عظیم محرومی اور مایوسی کے کرب میں ڈوب گئی ہے۔

میں کانپتے ہاتھوں سے اس کتابِ زندگی کے اوراق ادھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہوں۔ نقوش دھندلے ہوتے جارہے ہیں کیوں کہ بار بار آنکھوں میں آنسو چھلکے آرہے ہیں۔ کافی دنوں سے دل کی کمزوری یا زود حسی کا یہی عالم ہے کہ پڑھتے وقت اکثر آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔

علی عباس حسینی کی زندگی ایک بھرپور زندگی تھی، فتوحات اور شکستوں سے لبریز زندگی، مسرتوں اور المیوں سے ہم کنار زندگی۔ انھوں نے اس زندگی سے اطمینان ومسرت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا اور وہ جب کبھی اپنے ماضی پر نظر کرتے ہوں گے تو انہیں پچھتانے یا افسوس کرنے کا خیال بھی نہ آتا ہوگا۔ پھر بھی اُن کی زندگی ایک تخلیق کار مصنف کی زندگی تھی جو مسلسل جدوجہد میں گزرتی ہے اور مصالحتوں سے زیادہ تصادم اور سکون سے زیادہ خلش کی نذر ہوتی ہے۔ مسلسل تلاش، مسلسل دریافت، مسلسل تجربہ، مسلسل کاوش، مسلسل اظہار، مسلسل انکار اور مشروط اقرار کے کتنے ہی رواں دواں لمحوں کو یہ زندگی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ادیب کی زندگی کسی بادشاہ، کسی امیرِ کبیر، کسی کروڑپتی صنعت کار کی زندگی نہیں ہے جو یک رُخے پن سے گزر جانے کو کامیابی سمجھے۔ ادیب کی زندگی کا اُتار چڑھاؤ ہی اُسے عظمتِ جاوید عطا کرتا ہے۔

علی عباس حسینی اتر پردیش کے مشرقی اضلاع کے ایک دُور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ مشرقی اضلاع کی بھی ایک کہانی ہے۔ اِن اضلاع نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اس کی پاداش میں اُن پر بیرونی سامراج نے ترقی کی تمام راہیں بند کردی تھیں۔ سڑکیں، نہریں، ریلیں، جنہوں نے مغربی اضلاع کی اقتصادیات کو نسبتاً بہتر بنا دیا تھا وہ اس حصہ اتر پردیش میں گویا تھیں ہی نہیں۔ ویسے میرٹھ کے آس پاس ہی پہلی جنگ آزادی کی آگ بھڑکی لیکن پاداش میں بھگتنا پڑا مشرقی اضلاع کو زیادہ۔ اس میں ایک طرف مغربی اضلاع کے حوصلۂ عمل وترقی کا بھی دخل ہے۔ پورب والے اس پاداش کے بوجھ تلے دب کے انحطاط اور بے عملی کا شکار ہوگئے، لیکن دلوں میں بارود بھری تھی۔ ذرا گرمی دکھانے سے دھماکا ہوجاتا تھا۔ سن بیالیس میں بھی یہی ہوا اور اس بار بھی پورب اور بلیا کا بھگتان پورے علاقے کو بھگتنا پڑا۔ آزادی کے بعد تو حالت بدلی ہے لیکن آزادی کے پہلے یہاں ہر طرف غریبی اور افلاس کا دور دورہ تھا۔ کسانوں کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی ہی زمینداروں کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ چھوٹی چھوٹی زمینداریاں تھیں۔ گھر کے کام مشکل سے چلتے تھے۔

لیکن ٹھاٹھ باٹ رئیسانہ تھے۔ اصراف اور نمائش تو اہم وصف تھے جو زمیندار طبقے میں عام تھے۔ یہ تصویر بالکل ہی ایک رخی نہیں تھی۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا، آڑے وقت کام آنا، مخالفت میں ثابت قدمی کا اظہار کرنا آن پر جان دیدینا اور کمزوروں اور زیر دستوں کی مدد کرنا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ گاؤں کا ایک مختصر معاشرہ تھا جو کئی اعتبار سے خود کفیل تھا۔ گاؤوں میں رقابت بھی ہوتی تھی لیکن بھائی چارہ بھی تھا۔ ہفتہ وار بازاروں میں، میلوں ٹھیلوں، شادیوں اور غموں میں لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ کبڈیاں ہوتیں، کشتیاں ٹھنتیں، کجری اور برہے کے مقابلے ہوتے، چوپال میں خوش گپیاں ہوتیں، مقدمہ بازیاں بھی عام تھیں اور کھیت کھلیان کے معاملوں میں کبھی کبھی سر بھی پھوٹ جایا کرتے تھے۔ ضلع غازی پور بھی اسی ماحول کا ایک حصہ تھا اور اس کا گاؤں پارہ بھی۔ اس گاؤں سے میری بہت سی قرابت داریاں تھیں اور ہمارے یہاں سے آمدورفت رہا کرتی تھی۔ اعظم گڑھ اور غازی پور میں فاصلہ ہی کتنا تھا۔ دونوں ہی مشرقی اضلاع کے حدود میں داخل تھے۔ اور تقریباً سبھی صفات و عیوب مشترک تھے۔

پارہ، غازی پور اسٹیشن سے بہت دور نہیں تھا لیکن عرصے تک پختہ سڑک بھی نہیں تھی۔ لوگ پیدل، پالکی گھوڑے سے یا یکے سے سفر کرتے تھے۔ تانگے جیسی نازک چیز اس اوبڑ کھابڑ سڑک پر نہیں چلتی تھی۔ موٹر کار کا تو ذکر ہی نہیں۔ نہ گاؤں میں ڈاک خانہ تھا، نہ تھانہ تھا نہ تحصیل تھی۔ غالباً باقاعدہ اسکول بھی نہیں تھا۔ لیکن زمینداروں میں علم و ادب کے چرچے تھے اور یہیں کئی افراد صاحبانِ علم و قلم بھی رہ چکے تھے۔ پھر قریب ہی نونہرہ اور زنگی پور جیسی علم نواز بستیاں تھیں۔ اسی گاؤں کے ایک زمیندار گھرانے میں علی عباس حسینی نے ۳ فروری ۱۸۹۹ء کو آنکھ کھولی۔ والد مولوی سید محمد صالح صاحب فارغ التحصیل عالم تھے۔ چچا مولوی سید محمد اسحاق الحسینی عرف راجے میاں بھی اچھا علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے اور اخبارات میں اکثر قومی مسائل پر مضامین لکھا کرتے تھے۔ بعد میں انہیں کی صاحبزادی سے حسینی کی پہلی شادی بھی ہوئی۔

پیدا تو ہوئے مولویوں کے گھرانے میں، لیکن مولوی ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ابتدا میں شرفا کے گھرانوں کے عام رواج کے مطابق حسینی نے گھر ہی پر عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ دس برس کے سن میں ابھی "جامع عباسی" اور "گلستاں" ختم کی تھی کہ پارہ سے پٹنہ چلے گئے۔ وہاں عربی کے مدرسۂ سلیمانیہ میں نام لکھا گیا۔ "شرائع" پڑھ رہے تھے کہ انگریزی تعلیم دلوانے کا فیصلہ ہوا اور محمڈن اسکول میں داخل کر دیئے گئے لیکن اگلے ہی سال صحت کی خرابی کی بنا پر گھر واپس آئے اور غازی پور کے جرمن مشن اسکول میں داخل ہوئے۔ کچھ دنوں بورڈنگ میں رہے۔ پھر اپنے گاؤں چلے آئے اور وہاں سے روزانہ سات میل پیدل چل کر شہر غازی پور جاتے اور شام کو واپس آکر گاؤں میں کرکٹ کھیلتے۔ دو برس تک یہ تگ و دو جاری رہی اور والد نے یہ فیصلہ کیا کہ غازی پور میں رہ کر تعلیم اچھی نہیں ہو سکتی اس لئے گھر سے دور الٰہ آباد بھیج دیئے گئے۔ وہاں سے ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ آئے۔ ۱۹۱۷ء میں ایف اے اور ۱۹۱۹ء میں بی اے علی الترتیب کرسچین اور کیننگ کالجوں سے پاس کیا۔ کچھ دنوں کے لئے علی گڑھ بھی گئے اور وہاں ایم اے اور ال ال بی میں داخلہ بھی لیا۔ وہاں ملیریا کا حملہ ہوا اور یہ تعلیم ناتمام چھوڑ کر گھر چلے آئے۔ اور پھر ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ کالج الٰہ آباد میں داخل ہو کر ۱۹۲۱ء میں ال ٹی کی ڈگری اور اسی سال گورنمنٹ کالج رائے بریلی میں انگریزی اور تاریخ کے اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہوئے پھر ۱۹۲۴ء میں پرائیوٹ طور پر ایم اے کیا۔

پٹنہ کے نواب زادہ محمد مہدی کے خاندان سے ان کی قرابت قریبی تھی۔ راجے میاں کا قیام بھی پٹنہ ہی میں تھا۔ حسینی کی زندگی کا یہ ابتدائی زمانہ جاگیردارانہ اور مذہبی ماحول میں گزرا۔ لیکن پارہ کے مقابلے میں یہاں انگریزی اثرات زیادہ تھے۔ نواب زادہ کے اہل خاندان انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے اور وہاں ایک محتاط آزاد خیالی کی فضا پیدا ہو چلی تھی۔ بے فکری، آرام و آسائش اور وسیع النظری کی اس فضا میں اچھے لباس، اچھے کھانے اور کتابوں، بالخصوص افسانوی ادب کے مطالعے کا شوق

بیدار ہوا۔

پٹنہ میں علمی اور ادبی ماحول بھی تھا۔ شاد عظیم آبادی کے نغمے گونج رہے تھے اور جمیل مظہری کی شاعری نئی پہنائیوں کی تلاش میں آگے بڑھ رہی تھی۔ دوسرے صاحبانِ علم و ادب بھی تھے جن میں سے اکثر نواب زادہ محمد مہدی کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ان سے ملاقاتوں میں تخلیقی جذبے نے کروٹ لی مگر راہِ اظہار لکھنؤ آنے کے پہلے نہ ملی۔

حسینی کے والد سید محمد صالح صاحب عربی و فارسی کے عالم تو تھے ہی، فارسی اور ادب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور اُن کے کتب خانے میں مذہبی کتابوں کے علاوہ شرر اور طبیب کے ناول بھی تھے۔ میر حسن اور سیر شکوہ آبادی کی مثنویاں بھی تھیں اور انیس و دبیر وغیرہ کے مرثیے بھی۔ یہی نہیں بلکہ دیوانِ چرکین اور واسوخت امانت کو بھی ایک گوشے میں جگہ دیدی گئی تھی جتنی ان میں کچھ تو پٹنہ میں نواب زادہ کے کتب خانہ ہی سے چکھ چکے تھے۔ باقی انھوں نے یہاں پڑھ ڈالیں۔ گویا غازی پور ہی کے زمانہ قیام میں ان کی رسائی نامبردہ کتابوں کے علاوہ الف لیلہ، شاہنامہ، باغ و بہار تک تھی اور بیسیوں دیوان بھی چاٹ ڈالے تھے۔ پھر نونہرہ میں ایک عزیز کے یہاں اسکاٹ اور رینالڈس کے ناولوں کا ایک پورا بکس مل گیا۔ رینالڈس کی "مسٹری آف دی کورٹ آف لنڈن" وغیرہ ہاتھ لگیں تو پوری پوری راتیں، اقراری طور پر، لالٹین کی روشنی میں پڑھنے میں گزاریں"۔ پھر کرسچین کالج لکھنؤ میں پہنچ کر رسٹی ون سن، ڈکنس اور تھیکرے کے ناول پڑھ ڈالے اور پھر تو یہ عالم ہوا کہ رطب و یابس جو ناول بھی ہاتھ لگتا اسے ختم کئے بغیر دم نہ لیتے۔ ناول بینی کا شوق گویا فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے حسینی سے شہادت کی بنا پر لکھا ہے۔

" طالب علمی کے زمانے میں بھی ناول پڑھنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ دس سال بھر میں اتنے ناول پڑھ ڈالتے تھے، جتنے میں نے عمر بھر میں نہیں پڑھے ہوں گے۔ شاید ہی کوئی ایسا ناول نگار ہو، جس کے ناول انگریزی زبان میں مل سکتے ہوں اور علی عباس حسینی نے اُن کو پڑھ نہ ڈالا ہو۔"

پاکستان سے قبل اس دور کا لکھنؤ علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ صفی، عزیز، ثاقب، محشر، یگانہ، اور چکبست جیسے شاعر، سید جالب، ممتاز حسین عثمانی، ظفر الملک جیسے صحافی، مرزا رسوا اور عبد الحلیم شرر کی قامت کے ادیب موجود تھے۔ علماء کا تو یہ گہوارہ ہی تھا۔ اس فضا میں حسینی کا ذوقِ تخلیق ابھرتا ہی گیا۔ اور اُن کے اتھاہ مطالعے سے اس ذوق پر نکھار آتا گیا۔ یہ تھا اُن کی افسانوی زندگی کا ادبی پس منظر۔

اس میں حسینی کے ذوقِ شعری کو بھی شامل کر لیجئے۔ انہیں شروع ہی سے شاعری سے دلچسپی تھی۔ زنگی پور، پارہ، نونہرہ، گنگولی، غازی پور، پٹنہ، لکھنؤ، الہ آباد سبھی جگہ انہیں شاعروں سے سابقہ پڑا اور اُن کے مطالعے میں شعراء کے دواوین رہے، فرصت کے اوقات میں شعر سننا اور پڑھنا اور مشاعروں میں شرکت آخر تک اُن کے محبوب مشاغل رہے اور اس صنف شاعری کا حق ایک تفصیلی کتاب لکھ کر انھوں نے آخر عمر میں ادا کیا۔ یہ کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے لیکن میں نے اس کو مسودے کی شکل میں دیکھا تھا۔ اس سے حسینی کی وسعتِ نظر اور تنوعِ مطالعے کا اور ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

علی عباس حسینی ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ میں آئے اور یہاں مسعود حسن رضوی ادیب کی صحبت ملی۔ انہوں نے حسینی کو اُردو میں کچھ لکھنے پر آمادہ کیا اور ۱۹۱۸ء میں حسینی نے اپنا پہلا افسانہ لکھا۔ لیکن یہ افسانہ لکھنؤ میں نہیں بلکہ پٹنہ میں لکھا گیا جہاں وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے۔ یہ افسانہ اس چیلنج پر لکھا گیا تھا کہ پریم چند جیسے افسانے نہیں لکھے جا سکتے۔ یہ افسانہ ایک ہی نشست میں لکھ کر ختم ہوا لیکن چھپنے کو نہ بھیجا گیا۔ سب سے پہلا افسانہ ستمبر ۱۹۲۰ء میں "جذب کامل" کے عنوان سے "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا اور پہلی کہانی اسی رسالے میں تقریباً سات برس بعد شائع ہوئی۔

ساتھیوں نے پہلی کہانی "پژمردہ کلیاں" کی بڑی تعریف کی تو کچھ اور لکھنے کی تحریک ہوئی اور ۱۹۱۹ء کی گرمیوں کی چھٹیوں میں پارہ کی تخلیق انگیز دیہاتی فضا میں حسینی کا پہلا رومانی ناول "سر سید احمد پاشا" تخلیق و تکمیل کی منزلوں سے گذرا۔ یہ ناول بھارگو بک ڈپو، لکھنؤ سے ۲۳-۱۹۲۲ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد سے اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس وقت تک حسینی کے افسانوں کے

سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) رفیق تنہائی (۲) باسی پھول (۳) میلہ گھومنی (۴) آئی سی۔ ایس (۵) کچھ ہنسی نہیں ہے (۶) ہمارا گاؤں اور (۷) پھولوں کی چھڑی (ہندی)

ان کے علاوہ کوئی ساٹھ کے قریب افسانے ایسے ہیں جو اب تک کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے ہیں اور مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ حسینی کے افسانوں کی مجموعی تعداد کوئی سوا دو سو کے قریب تو یقیناً ہوگی۔ حسینی نے اب سے چار برس پہلے لکھا تھا کہ اُن کے افسانوں کے دو مجموعے سندھ اکادمی کراچی شائع کر رہی ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ مجموعے شائع ہوئے یا نہیں۔ ایک درجن کے قریب افسانوں کے ترجمے انگریزی میں ہندوستان اسٹینڈرڈ (کلکتہ) اور یوجنا (دلی) میں شائع ہوئے اور تقریباً بیس کے قریب افسانے ہندی میں۔ "سر سید احمد پاشا" کے علاوہ "ندیا کنارے" اور "شاید کہ بہار آئی" دو ناول بھی لکھے ہیں۔ موخر الذکر کا ہندی ترجمہ "کومل کلیاں" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

ان کے علاوہ ایک ناول اور ہے جو انہوں نے لکھ کر ایک نواب صاحب کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ غالباً اس کا نام "انوکھی رانی" ہے۔ وہ اس کے حقوق مالکانہ سے دست بردار ہوگئے تھے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ناول انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح دو کتابیں ڈاکٹر حفیظ سید کے لئے لکھیں۔ ان میں ایک اشوک (زیا اشوک اعظم) ہے۔ اس کا ایک ایک حرف حسینی کا لکھا ہوا ہے۔ حفیظ سید کو ان باتوں کا جو معاوضہ ملا وہ انہوں نے پورا حسینی کے حوالہ کر دیا۔ منوہر لال زتشی کی کتاب کبیر کی تصنیف میں بھی ان کا مصنفانہ تعاون شامل تھا، کیوں کہ منوہر لال زتشی نے خود بھی کافی حصہ لکھا ہے اور آخری نظر انہوں نے ہی ڈالی ہے۔ کچھ نصاب کی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد فلمی دنیا میں جانے کا خیال ہوا۔ اسی خیال سے بمبئی گئے۔ بڑی مشکلوں سے سہراب مودی سے تیمور لنگ کی کہانی کا دس ہزار میں سودا ہوا لیکن دس ہزار کی رقم میں کل پانچ ہزار انہیں مل پائے اور فلم آج تک مکمل نہ ہو پائی۔ پھر فلمستان [illegible] کرجی نے بلایا لیکن معاملہ نہ ہو سکا۔ ایک بار ریٹائر ہونے سے پہلے نخشب جارچوی کے طلبیدہ بمبئی گئے تھے لیکن وہ کہانی بھی فلمائی نہ جا سکی۔ دس پندرہ کہانیوں کے خاکے، اور نامکمل مکمل مسودے اب بھی موجود ہیں۔ اور ان میں سے کچھ میں نے حسینی کی زبان سے سنے بھی ہیں۔

"نورتن" کے نام سے ایک ایکٹ کے ڈرامے بھی لکھے [illegible] ان کا مقصد یہ تھا کہ اسکول اور کالجوں میں کھیلے جائیں [illegible] شائع ہو چکا ہے۔ حال میں امیر خسرو کے نام سے بھی ایک ڈرامہ شائع ہوا ہے۔

تنقیدی مضامین، تبصرے اور مقدمے بھی کافی لکھے [illegible] اُن کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ "ناول کی تاریخ و تنقید" ہے۔ بہت دنوں تک یہ اپنے موضوع پر واحد کتاب تھی۔ اس کی تاریخی اور تنقیدی اہمیت اب بھی باقی ہے۔ اس پر نظر ثانی کرنے کا ارادہ تھا۔ معلوم نہیں کہ یہ ارادہ شرمندۂ تکمیل بھی ہوا یا نہیں۔ دراصل علی عباس حسینی کے یہاں دوسرے مواقع کے علاوہ، اخراجات کی زائیدہ معاشی ضروریات بھی تھیں اس لئے وہ ایسے کاموں کی طرف بار بار جھک پڑتے تھے۔ جس سے نقد اور جلد پیسے مل سکیں۔ دوسروں کے نام سے جو کتابیں لکھیں وہ بھی ایسی ہی ضروریات کے ماتحت لکھی گئی تھیں۔

حسینی کا آخری تنقیدی کارنامہ ایک بے نام مگر ضخیم [illegible] ہے۔ اس میں حسینی نے اُن تمام اعتراضات کا تفصیلی جواب [illegible] ہے جو اُردو شاعری پر وقتاً فوقتاً کئے گئے ہیں۔ کتاب شروع ہوئی تھی۔ کلیم الدین احمد کے چند غیر رسمی اعتراضات کو پڑھ کر لیکن [illegible] اس کا دائرہ بڑھ گیا۔ موجودہ حالت میں یہ اردو شاعری کا ایک تفصیلی تبصرہ اور تجزیہ بن گئی ہے۔ ابھی حال میں اس کے بعض اجزا "صبح نو" پٹنہ اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوئے ہیں، لیکن پوری کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

حسینی کی تخلیقی راہ کی ایک بڑی رکاوٹ اُن کی سرکاری

صورت بھی تھی۔ وہ ذاتی طور سے ہمیشہ نیشنلسٹ اور مسلم لیگ کی سیاست کے مخالف رہے۔ نجی صحبتوں میں وہ اپنے مسلم لیگی دوستوں سے زوردار بحثیں کرتے تھے اور قوم پرور سیاست میں کافی دور تک چلے جاتے تھے۔ چنانچہ انگریزی سیاست کے خلاف دو چار مضمون انہوں نے فرضی نام سے اخبار سرفراز میں لکھے تھے۔ اس زمانہ میں مدیر سرفراز خواجہ اسرار اللہ اسعد کو تھا۔ بعد میں خواجہ اسعد سے ان بن ہوگئی تو صحافتی اصولوں کی پروا کئے بغیر خواجہ اسعد نے ان کی اصل تحریریں برطانوی سی۔ آئی۔ ڈی کے حوالے کر دیں اور حسینی عتاب میں آگئے۔ دوڑ دھوپ کے بعد ملازمت تو بچ گئی لیکن ان کا ایک دور افتادہ مقام پر کر دیا گیا۔ ملازمت کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسینی نے کچھ افسانے ممتاز حسین کے نام سے بھی لکھے ہیں۔ (... ان کا طرت تھا) ایسی کہانیوں میں "بختیارک کا نسخہ" بھی ہے۔ بعض اوقات حسینی اپنی قوم پروری میں کافی دلیری کا اظہار کرتے تھے۔ جب میں قید فرنگ میں تھا تو حسینی نے مجھے ایک تفصیلی خط لکھا اور ایک دوست کی وساطت سے جیل میں بھجوا دیا۔ یہ دوسری جنگ کا زمانہ تھا۔ اگر یہ خط کہیں جیل حکام کے ہاتھ لگ جاتا تو حسینی کی ملازمت پر بن آتی۔ قومی کاموں میں چندے بھی دیدیا کرتے تھے۔ جب ۱۹۴۲ء میں نیشنل ہیرالڈ سے ضمانت طلب ہوئی تو حسینی نے اس کے لئے چندہ دیا۔ درآنحالیکہ وہ سرکاری ملازم تھے۔

حسینی نے ۱۸ جولائی ۱۹۲۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۵۴ء تک چونتیس برس سرکاری ملازمت میں گزارے۔ یوں کہئے کہ ایک جگ بیت گیا۔ ملازمت کی پابندیوں نے بہت سی تخلیقی قوتوں کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر بھی حسینی نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ اگر ملازمت نہ ہوتی تب بھی حسینی انتہا پسندوں میں نہ پائے جاتے۔ وہ طبیعت و مزاج کے اعتبار سے خالص ... پسند تھے۔ ان کے افسانوں پر گاندھیائی فلسفوں کی چھاپ ہے لیکن وہ سو فیصدی گاندھیائی بھی نہیں تھے۔ ان میں سوشلزم کے اثرات بھی پائے جاتے تھے۔ سائنسی طور سے نہیں بلکہ جذباتی ... ترقی پسند تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں کچھ دنوں ... لیکن انجمن کی کج رویوں اور انتہا پسندوں پر ٹوکتے بھی رہے اور بالآخر اس سے کنارہ کش بھی ہوگئے۔ حسینی کے کچھ افسانے (اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی) "نیا ادب" میں بھی چھپے تھے۔ یہ تعلقات دوستانہ کا نتیجہ تھے ورنہ حسینی کا یہ عقیدہ تھا اور انہوں نے سند کے طور پر لکھ بھی دیا ہے کہ

"فن سیاسی پروپیگنڈے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ کسی خاص سانچے میں ڈھلنے کی۔ وہ تو صانع قدرت کی طرح نئے نئے ڈھانچوں کی خود تخلیق کرتا ہے۔"

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ زندگی کی ترجمانی کے منصب سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں۔ اپنے بارے میں خود یہ رائے دی ہے۔

"میں افسانوں کو زندگی کا ترجمان بنانے کا قائل ہوں۔ بھوک ہو یا جنس، زندگی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ ایک کے پیٹ سے تمدن و تہذیب یعنی سیاست نکلتی ہے، دوسرے کے بطن سے اس سیاست کے برتنے والے ہم انسان .... اس لئے جب بھی زندگی کی مرقع کشی کی جائے گی، زندگی اور جنس کی جھلک اُن میں ضرور آئے گی ..... میں نے خود بھی سیاسی کہانیاں لکھی ہیں اور جنس کے موضوع پر بھی لکھا ہے... لیکن ہر جگہ اس کا خیال رکھا ہے کہ نظریات کے ہاتھوں فن کا خون نہ ہونے پائے۔"

جب علی عباس حسینی نے افسانہ نویسی شروع کی تو اس میدان میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کچھ ہی پہلے وارد ہوئے تھے۔ اس ورثے میں بہت زیادہ جان نہیں تھی کیونکہ خود پریم چند اس وقت تک مبتدی تھے اور اُن کے یہاں وہ عروج فن و فکر ابھی بلوغ کی ابتدائی منزلوں میں تھا جو بعد میں اُن کے افسانوی ادب کا طرۂ امتیاز بنا۔ اس لئے حسینی، پریم چند سے متاثر بھی تھے اور پہلو بہ پہلو مدارج ارتقا بھی طے کر رہے تھے۔ شروع میں اُن کے یہاں رومانوی ماحول بہت زیادہ نمایاں تھا لیکن اس کے ساتھ مشاہدہ اور ادراک میں ایک بے ریا سادگی اور

ہمہ گیری بھی تھی جو انھیں زندگی سے قریب رکھتی تھی۔ البتہ، اُن کی گہری انسان دوستی اور اصلاح پسندی بعض اوقات انھیں ایک خاص اخلاقی نصب العین کے تعاقب میں رواں دواں رکھتی تھی۔ بعد میں جب شخصی اور ذہنی کرب زیادہ اُجاگر ہوا اور سماجی اور عوامی مسائل کے پس منظر میں وہ اپنے کرداروں کی سیرت اور اپنے پلاٹ کو دیکھنے لگے تب اُن کے یہاں تیکھا پن بڑھ گیا اور اُن کے کرداروں میں آفاقیت بھی آگئی لیکن ایک "نصب العینیت" باقی رہی جو بعض اوقات جذباتیت کی حدوں میں بھی پہنچ جاتی تھی۔ یہ تفصیلی تنقید کا محل نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہا جائے گا کہ اُنھوں نے انیسویں صدی کے اقدار کی آغوش میں پرورش پانے کے باوجود بیسویں صدی کے اقدار کو بھی لبیک کہی اور بقول غالب ہر راہرو کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کی کوشش بھی کی۔ یہ کوشش بھی کم کارنامہ نہیں ہے لیکن اس سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔

گذشتہ نصف صدی میں افسانہ کی تکنیک اور اسلوب ان گنت تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے لیکن حسینی کے افسانے ہر زمانے اور ہر دور میں مقبول رہے ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے رفتار زمانہ اور مزاج عصر کو پہچان کر ہر قدم آگے بڑھایا ہے۔ اُن کے ناقدین اور معترفین میں ملّائے مکتب سے لے کر ترقی پسند اور جدیدیت دوست تک سبھی رہے ہیں۔ اس سے بھی اُن کے فن کی استواری اور پہلوداری نمایاں ہے۔ ہندوستانی دیہاتوں کی تہ در تہ شخصیت کو جن لوگوں نے پوری فنکارانہ ہمدردی سے اُجاگر کیا ہے، اُن میں پریم چند کے ساتھ ساتھ علی عباس حسینی کا نام بھی لیا جائے گا۔ پریم چند کا قلم آزاد اور حسینی کا محبوس تھا، اس لئے جہاں پریم چند سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں پر ایک وطنی مجاہد کی حیثیت سے بھرپور چوٹیں کرتے تھے حسینی کے یہاں دور کی اشاریت، اصلاح پسندی کا رُخ اختیار کرلیتی تھی۔ فی الحقیقت یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ دونوں ہی کی مشترکہ مساعی نے ملک کا حوصلہ بلند رکھا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا ولولہ دیا۔ دونوں نے مشترک خامیوں اور جماعتی کمزوریوں پر وار کیا دونوں ہی نے رِستے ہوئے ناسور اور سڑے گلے زخم سے بندھی ہوئی ریشمی پٹی ہٹائی۔ دونوں نے وسیع النظری، اتحاد اور امداد باہمی کو قومی زندگی کے تانے بانے میں بننا چاہا لیکن اس اتحاد کے باوجود دونوں الگ الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کے یہاں سیاسی اور نظریاتی رنگ گہرا ہے، اُن کا تاریخی احساس زیادہ سائنسی ہے، لیکن اس حد تک اُن پر مشروطیت غالب ہے جیسی کے یہاں ایک نظریہ نہیں بلکہ کئی نظریوں کی جھلک ہے جو کبھی تو امتزاج کا رنگ اختیار کرلیتی ہے، اور کبھی حسینی کی انفرادی پسند اور ناپسند کا۔ حسینی زندگی کے زیادہ عام پہلوؤں پر، بالخصوص جنسی ناآسودگی اور بے راہ روی یا سماجی و اخلاقی کوتاہیوں پر زیادہ کڑی نظر رکھتے ہیں۔ تکنیک اور پلاٹ کی تکمیل میں وہ خلاقانہ صناعی دکھاتے ہیں اور عینیت اور مثالیت تک کو افسانوی صداقت کی سطح پر کھینچ لاتے ہیں۔ سب سے زیادہ نمایاں اُن کے افسانوں کی ادبی چاشنی ہے۔ جو اُن کہانیوں میں بھی نمایاں ہوتی ہے جو جدید رجحانات کی حامل ہیں۔ اُن کے حقیقت پسندانہ افسانوں کا ادبی ماحول خاصے کی چیز ہے۔ جو حسینی کے افسانوی اسلوب کا جزو لاینفک ہے۔ حسینی کے کرداروں میں سبھی طبقوں اور جماعتوں کے افراد ہیں۔ ہر عمر اور ہر ذوق کے افراد ہیں، لیکن فنی دیانت نے ان سب کرداروں میں جان ڈال دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب میں نے اس صدی کی تیسری دہائی میں اُن کے افسانے پڑھے، اُس وقت بھی اُن میں جاذبیت پائی اور آج بھی اُن کی معنویت تازہ ہے۔ اچھا فن سدا بہار ہے۔

حسینی کی یہ خصوصیت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقریباً مرتے دم تک انھوں نے ہاتھ سے قلم نہیں چھوڑا۔ قلم بدست مرنے والا اُس مجاہد سے کم نہیں جو مرتے دم تک قومی پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا۔ حسینی مرے نہیں ہیں، بلکہ داستان کہتے کہتے سو گئے ہیں اور ہر محبت کرنے والے کے قدموں کی چاپ سُن کر جاگ جایا کریں گے۔

غزلیں

روشن صدیقی

یہ فیضانِ چشمِ کرم دیکھتے ہیں
حوادث کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں

وہ راحت پرستی، کہ ہے ننگِ ہستی
ترے دردمندوں میں کم دیکھتے ہیں

زمانے کی نیرنگیوں کا گِلا کیا
تری وضع داری کو ہم دیکھتے ہیں

جنھیں شوقِ منزل لئے جا رہا ہے
وہ کب راہ کے پیچ و خم دیکھتے ہیں

تخیل سے اعلیٰ تصور سے برتر
یہ کس کی جھلک ہے جو ہم دیکھتے ہیں

نہ موجِ گریزاں، نہ آغوشِ ساحل
بس اک جلوۂ یم بہ یم دیکھتے ہیں

حجاباتِ کون و مکاں سے گزر کر
انھیں لاکھ پردوں میں ہم دیکھتے ہیں

ہم اہلِ محبت، وہ صاحب نظر ہیں
خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں

عجب ماجرا ہے کہ واعظ کو اکثر
ہر راہ بیت الصنم دیکھتے ہیں

روشن، ہم تو اُس شوخ کی جستجو میں
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں!

فرصتِ شب، تری زلفوں کی کہانی مانگے
یہ کہانی مری آشفتہ بیانی مانگے

دوست کہتا ہوں جو سمجھو تو بجا کہتا ہوں
دوستی بھی تو کوئی دشمنِ جانی مانگے

حرمِ عشق ہے خلوت کدۂ حسنِ سکوت
مقتل، بت خانۂ الفاظ و معانی مانگے

ہم نشیں، چشمِ زلیخا کے لئے خواب کہاں
مسندِ گل، شبِ زنداں کی کہانی مانگے

یہ تری چشمِ سخن گو کا اشارہ تو نہیں
خامشی، حوصلۂ شوخ بیانی مانگے

زندگی محوِ طوافِ رسن و دار و صلیب
کون شمشاد و صنوبر سے جوانی مانگے

جسے دل کہتے ہیں، اشکوں میں جو ڈھل جاتا ہے
وہ قیامت ہو کہ طوفاں بھی نہ پانی مانگے

داغِ دل کاش کبھی زینتِ داماں ہو روشن
حسنِ معصوم محبت کی نشانی مانگے

شاید ہے کوئی چارۂ غم ہائے نہاں اور
ہے حرفِ تسلی دلِ نازک پہ گراں اور

پینے کا سلیقہ ہو تو ہے لطفِ مکرّر
خود ساقیٔ محفل کو ہے اصرار کہ ہاں اور

دل خون ہوا ہے تو فغاں آتی ہے لب تک
باقی ہے ابھی مرحلۂ ترکِ فغاں اور

پروردۂ آغوشِ چمن یوں تو ہیں دونوں
کانٹوں کی زباں اور ہے پھولوں کی زباں اور

جو بات ہے لب پہ وہ عطائے ازلی ہے
دل اور ہمارا ہے، ندائے دوست زباں اور

کہہ دوں سرِ محفل شبِ فرقت کی کہانی
لاؤں تری آنکھوں کے لئے خوابِ گراں اور

اے خضر! چلو منزلِ جاناں کی خبر
آتا ہے وہ اک قافلۂ گم شدگاں

کھلتے ہی رہے، بندِ قبائے گل و
بڑھتا ہی رہا سایۂ دامانِ خزا

دیکھو جسے، اک مہرِ خموشی ہے
اس شہر میں ہے اہلِ محبت کی

لاریب کہ پاکیزگیٔ ذوق روا
افکارِ تغزل کو ملا حسنِ بیا

غبارِ کارواں

صالحہ عابد حسین

ہم نے اردو کے ادیبوں اور شعراء سے گزارش کی ہے کہ وہ ہمیں یہ لکھ بھیجیں کہ اُن کی شخصیت کی تعمیر میں کون سے عناصر کارفرما رہے ہیں اور وہ کن افراد، واقعات یا کتابوں سے متاثر ہوئے۔ "غبارِ کارواں" کے عنوان سے اس سلسلے کا پہلا مضمون اس شمارے میں شامل ہے۔ (ایڈیٹر)

آج کل کہا جاتا ہے کہ بچے کی ذہنی نشوونما پر اس کی پیدائش سے پہلے ہی … کے خیالات کا اثر پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بات کس حد تک … ہے یہ تو ماہرین نفسیات ہی بتا سکتے ہیں لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ … کہ بچہ ماں باپ کی خاص طور پر ماں کی شخصیت اور … تربیت سے بھی زیادہ قبول کرتا ہے جو وہ اسے دیتے یا دینا … اور اس کے نقوش اتنے گہرے اور پائیدار ہوتے ہیں جن کے … نتائج سے زندگی بھر وہ دوچار ہوتا رہتا ہے۔ ماں کے پاؤں … یوں ہی نہیں پنہاں ہو سکتی ہیں کہ یہ ماں ہی ہے جو بچے کی زندگی …

… (اور اس میں ذہنی نشوونما بھی آجاتی ہے) سب سے گہرا … پڑا؟ اس سوال کا بلا ذہنی پہلا اور بے اختیار جواب یہ … میری ماں مشتاق فاطمہ مرحومہ کی ہے۔ یوں تو عام طور پر ہر … خصوصاً اپنی ماں سے متاثر ہوتا ہے، اور یہ بھی حقیقت … (الا ماشاءاللہ) عام طور پر ہر شریف انسان اپنی ماں کو بہت اونچا … ہے لیکن میں جب اپنی والدہ کے بارے میں جذباتی تعلق سے قطع نظر … سوچتی ہوں تو بھی وہ ایک بلند اور غیر معمولی شخصیت کے روپ میں … وہ چار سال کی تھیں اس وقت ان کی والدہ فوت ہو گئی تھیں … آدمی تھے جن کو گھر بال بچوں سے کچھ زیادہ تعلق نہ تھا اسی … ان کی تمام تربیت اور نگرانی دادا دادی نے کی اور اسی طرح قدرت نے … لاثانی انسان کی تربیت سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا جس کو …

دنیا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام سے جانتی ہے۔ میں بلا خوف و تردید کہہ سکتی ہوں کہ ان کی پوتی میں وہ ساری بنیادی خوبیاں موجود تھیں جنہوں نے حالی کی شخصیت کو بے مثال بنا دیا ہے۔ وہ اپنے گھرانے کی پہلی پڑھی لکھی لڑکی تھیں جس کی تعلیم میں مولانا حالی نے خود دلچسپیاں لی تھی۔ اگرچہ آج کل کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں سے ان کا کیا مقابلہ، لیکن اگر علم کا مقصد اخلاقی قدروں کو پرکھنے، انسان کو روح کی گہرائی میں اتار لینا ہے، اگر اس سے انسان کی ذاتی صفات اجاگر ہوتی ہیں اگر اس کی بدولت انسان درد دل کی نعمت سے فیضیاب ہو سکتا ہے اور خدمت، ایثار، صبر اور محبت کی بیش بہا اور کمیاب جواہر سے اس کی جھولی بھر جاتی ہے یا بھر سکتی ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ میری والدہ نے اپنے بہت محدود علم سے لامحدود فائدے حاصل کئے تھے۔ وہ اپنی اولاد کی تہذیب، نگرانی اور اخلاقی تعلیم میں ہمیشہ یہ چیز پیش نظر رکھتی تھیں کہ وہ دنیاوی کامیابی، دولت، شہرت پا سکیں یا نہ پا سکیں، اچھے، سچے، باعمل انسان ضرور بنیں۔ خوش قسمتی سے ان کو شوہر بھی وہ ملا جو خاندان بھر کا ہیرا کہا جاتا تھا اور جس کی شرافت اور نیکی ہی کا نہیں قابلیت، ذہانت اور قومی خدمات کا بھی دور دور شہرہ تھا۔ یعنی سید خواجہ غلام الثقلین اور ان کی بیوی میں جو گہری اور سچی رفاقت تھی میں سمجھتی ہوں کہ اس کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کا گہرا اثر قبول کیا ہوگا لیکن والد عین جوانی میں اپنے سب کام ادھورے اور ننھے ننھے بچے چھوڑ کر خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ میں اس وقت پورے دو سال کی بھی نہ تھی اس لئے میں نہ ان کی ذہنی صلاحیتوں سے فیضیاب ہو سکی اور نہ ان کی تعلیم و تربیت کی نعمت پا سکی۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی ان کا نام، ان کا ذکر ان کی ذہانت اور قابلیت کا شہرہ ہر کسی کی زبان سے سنا۔ اپنی ماں، پھوپھیوں

اور چچاؤں کو ان کے ذکر کے ساتھ آنسوؤں کا دریا بہاتے پایا ان کی تصنیف کردہ کتابیں اور ان کی وسیع لائبریری (جو انمول کتابوں سے بھری پڑی تھی) دیکھی اور غیر شعوری طور پر ان سب کا گہرا اثر قبول کیا اور میرے کچے ذہن میں ایک آئیڈیل انسان کا جو تصور کسی گوشے میں پلتا بڑھتا رہا وہ والد کے خیالی ہیولے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ (اگر خوش قسمتی سے اپنے شوہر میں مجھے وہ بہت سی ذہنی دماغی خوبیاں اور شخصیت کی وہ سادگی نہ ملی ہوتی جو میرے آبا میاں کی خصوصیات تھیں تو کیا ہوتا ؟؟) جوں جوں میری عمر بڑھتی رہی یہ احساس شدت پکڑتا گیا کہ مجھے اس بڑے انسان کی بیٹی کہلانے کے لائق بننا ہے والدہ کی شخصیت اور صفات اور والد کے تصور کا میرے ذہن نے کتنا گہرا اثر قبول کیا اس کو صرف میں محسوس کر سکتی ہوں، بیان نہیں کر سکتی

ایک اور شخصیت میرے بڑے چچا خواجہ غلام الحسنین کی ہے جس نے میرے مذہبی عقیدوں اور اسلام کے تصور پر بہت اثر چھوڑا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم دین تھے جنھوں نے اسلام کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس کی روح کو سمجھ کر اس کی صحیح تعلیم دینے کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا لیکن ان کا دامن ایسی تنگ نظری اور تعصب سے پاک تھا جو عام طور پر مذہبی لوگوں میں پایا جاتا ہے ساتھ ہی وہ توہمات سطحی مذہبی رسوم غلط عقیدوں اور اوہام کا جو جال مذہب کے گرد پھیلا ہے اس کے بڑے مخالف تھے اور انہیں اسلام کی صحیح تعلیم کے منافی سمجھتے تھے اپنے خاندان کے بچوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس کرانے کی انھوں نے ہمیشہ کوشش کی میرے بڑے بھائی سیدین صاحب نے ان ہی سے عربی اور مذہبی تعلیم کا درس لیا تھا ان کے کردار میں ایک سچے عالم ایک مرد فقیر ایک با خدا انسان کا ایسا دلکش جلوہ نظر آتا تھا جو اسلام کے ابتدائی دور کے بعض سچے عالموں اور خادموں کا طرۂ امتیاز تھا اور جن کو خاصانِ خدا کا رتبہ ملا تھا۔ مجھے لوگ آئیڈیل پرست کہتے ہیں۔ میری کہانیوں اور ناولوں کی سب سے بڑی خامی بعض نقاد (اور نکتہ چین) یہ بتاتے ہیں کہ میرے بعض کردار " آئیڈیل " ہوتے ہیں جن میں وہ صفات نظر آتی ہیں جو اس دنیا میں نہیں ہوتیں۔ شاید بد قسمتی سے انھیں وہ ماحول اور وہ شخصیتیں نہیں ملیں (یا انھوں نے ان کو پوری طرح پہچانا نہیں) جو مجھے خوش نصیبی سے ملی تھیں اور جن میں میں نے وہ بنیادی خوبیاں اور اعلیٰ قدریں بڑے حسن و امتزاج کے ساتھ سموئی پائی تھیں جن کی ناقص سی جھلک انہیں میرے کرداروں میں نظر آتی ہے اور وہ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ بھلا ایسے لوگ ہوتے کہاں ہیں ؟

بچپن سے میرے دل میں اعلیٰ تعلیم پانے کی تمنا تھی اپنے ابا میاں اور بھائی جان کی طرح خوب پڑھوں گی ڈگریاں لوں گی ڈاکٹر بنوں گی اس میں یہ جذبہ پنہاں تھا کہ اپنی بیمار رہنے والی اماں کا علاج کروں گی یہ خواب پورے نہ ہوئے۔ ہاں ایک دوسرے میدان میں اپنے باپ کی ذہنی رفاقت اور روحانی شاگردی قدرت نے ... کی تھی۔

لیکن یہ سب تو سوچنے سے خیال میں آتا ہے حقیقت میں ... صلاحیت کو پرکھا اور میری ذہنی نشو و نما میں نمایاں حصہ لے کر مجھے ... وہ میرے بھائی خواجہ غلام السیدین ہیں وہ پیدائشی معلم ہیں جن کی ... سب سے بڑی مسرت اور مقصد یہ رہا ہے کہ بچوں کو تعلیم کا شوق ... کی پیاس پیدا کریں اور ان کی قدرتی صلاحیتوں کو ابھرنے اور پنپنے کا ... اور ہمت افزائی کریں۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں ان کی سب سے پہلی ... علم ہوں۔ مطالعے کا شوق تو مجھے ورثہ میں ملا تھا (اور سارا گھر طرح طرح کی ... سے بھرا پڑا تھا) جن کتابوں کا کچھ بھی حصہ سمجھ میں آجاتا وہ بس ... لیکن بھائی جان نے صحیح قسم کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کیا اور اچھی اچھی لا کر دیں۔ انگریزی کتابیں پڑھنے ہی کی قابلیت نہ تھی سمجھنے کی صلاحیت ... سے ہوتی مگر انہوں نے ہمیشہ مجھے ابھارا کہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر میں ... کتابیں پڑھتی رہوں چنانچہ مجھے یہ چاٹ بھی لگ گئی اور اس طرح انگریزی اور اس کے ذریعے دوسری زبانوں کی بعض بلند پایہ کتابوں سے ... شناسائی ہوئی۔ وہ شروع سے میری لکھی اوندھی سیدھی چیزوں ... مشورہ دیتے اور زبان ٹھیک کرتے تھے اور بقول ... ان کے مذاق ... انہوں نے مجھے ادیب بنا دیا۔ تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں میری جو ... پہلی کہانی رسالہ نور جہاں میں چھپی وہ انہیں کی سنائی ایک انگریزی کہانی تھی۔ برسوں تک میری کوئی کہانی کوئی مضمون ان کی اصلاح کے بغیر ... نہیں ہوا۔ اب کہ وہ اتنے مصروف اور میں اتنی مشہور ہوں اب بھی ... چیز لکھتی ہوں تو اکثر مدت تک وہ اس انتظار میں پڑی رہتی ہے کہ وہ پڑھ ... کریں یا صاد کر دیں۔

جی ہاں یہ بات کوئی عورت خصوصاً فنکار عورت کم ہی مانتی ... اس کا اعتراف ہے کہ میری ذہنی نشو و نما میں جن شخصیتوں کا اثر پڑا ان میں ... شوہر ڈاکٹر عابد حسین بھی ہیں۔ انیس سال کی عمر میں میری ان سے شادی ... ذہن اس وقت کچا، تعلیم ناقص، تجربہ محدود تھا۔ گذشتہ پینتیس سال میں میں نے، میرے فن نے میرے خیالات نے ان سے کتنا اثر لیا ہے ... لمبی داستان ہے جس کو بیان کرنا آسان نہیں۔ میں بہت زود نویس ...

نی ورثے ہے یہ جنم سر کبھی ہے اور خامی بھی۔

میرے والد مرحوم بھی بہت زود نویس تھے اور یہی صفت بھائی جان بھی ہے۔ آمد ہمیں قدرت سے ودیعت ہوئی ہے اور میں اسے اپنی بڑی خوبی ی تھی۔ ساتھ ہی میری تحریر میں جذباتی شدت پسندی اور زور بیان کی خامیاں رہی بھی تھیں، عابد صاحب سے دھیرے دھیرے غیر شعوری طور پر میں نے یکھا کہ جذبات اور احساسات کو کس طرح متوازن کیا جاتا ہے آمد کے دھارے س طرح بند باندھ کر اسے فن کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور میں نے سیکھا رنلزم اور ادب دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ناول اور افسانہ ادب کا وہ روپ ، جو وقت کے دھارے کے ساتھ نہیں بہتا بلکہ وقت کو اپنے اندر سمیٹ ا ہے سنجیدہ مطالعے اور کلاسکی ادب کے شوق نے بھی انھیں کی وجہ سے ود نما پائی جس کا گہرا اثر میرے ذہن اور فن پر پڑا میرے شعری ادب کے ذوق بھی ان کی وجہ سے وسعت پیدا ہوئی کہ پہلے میں شاعروں میں بس حالی اقبال را نیس کے سوا کسی کے کلام کو اہمیت ہی نہ دیتی تھی اور یہاں غالب جن سے یپن سے ہی جانے کیسے اور کیوں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ برسوں تک انھوں نے ری کہانیوں اور مضمونوں کی زبان درست کی ہے آج جب وہ میرے پچاس فحے کے مضمون یا پانسو صفحے کے ناول کا ایک جملہ کاٹے بغیر اسے پاس کر دیتے یں تو مجھے شک ہوتا ہے کہ انھیں پوری طرح دیکھنے کی فرصت نہیں ملی شکایت دتی ہے کہ آپ توجہ ہی نہیں کرتے اب۔ دل ابتک یہ نہیں مانتا کہ ان کی شاگرد ی زبان کو اب اصلاح کی ضرورت نہیں رہی۔

ان محبوب زندہ شخصیتوں کے علاوہ کچھ عظیم فن کار ہیں جن کا اثر بالواسطہ میری ذہنی نشوونما نے قبول کیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ جس ہستی نے مجھے متاثر کیا وہ حالی کی ہے جن کی نثر کی تصانیف کی ہر سطر اور نظم کا ہر ہر شعر میں لڑکپن ہی میں پڑھ چکی تھی اور آج تک پڑھتی رہتی ہوں۔ ان کی تصانیف میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں اور اخلاقی تعلیم کی جو روح ہے وہ میرے ذہن و دماغ میں اتر گئی ہے۔ دوسری طرف ان کے انداز بیان کی سادگی اور خلوص نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

پھر اردو کا عظیم شاعر انیس جس کا نام پیدا ہوتے ہی کان میں پڑنا شروع ہو گیا تھا انیس کے کلام کا بے پناہ حسن اور فن کا کمال اور وہ اخلاقی تعلیم اور اعلیٰ قدریں (جن کی مرقع کشی انہوں نے ہزاروں رنگ میں کی ہے) ہمیشہ میرے دل کے تاروں کو چھوتی اور روح کو وجد میں لاتی رہی ہیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگا کہ اس عظیم فنکار کا میرے فن پر کوئی اثر پڑا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ میرے روحانی استاد ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں میرے ذہن اور فن دونوں نے ان کے اثرات ضرور قبول کئے ہوں گے۔

اقبال کا کلام جب منہ سے پورے بول بھی نہ نکلتے تھے تب سے زبانی یاد کرایا گیا تھا اور پھر جب ذرا پڑھنا آیا تو بچے کی تمنا سے لیکر شکوہ و جواب شکوہ سے گنبد، ساقی نامہ، مسجد قرطبہ تک تو نو عمری ہی میں پہونچ چکی تھی اور پھر جب جوں جوں عمر عقل اور مطالعہ بڑھا ذہن میں پختگی آئی تو ان کے اور زیادہ بلند پایہ کلام نے دماغ اور دل پہ گہرے اثرات چھوڑے۔

ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات لیکن بعض باتوں میں مجھے اقبال سے اختلاف ہے ان کی نثر کی تصانیف میں نے بہت کم پڑھی ہے اور اس کے بغیر اقبال کے کلام کی گہرائی اور صحیح روح تک پہنچنا مشکل ہے۔ ان کا فارسی کلام بھی پورا نہیں پڑھا لیکن جتنا پڑھا ہے اس نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا ہے اقبال کے کلام کی گہرائی، وسعت اور عظمت کچھ اس طرح دماغ میں رچ بس گئی ہے کہ میں نے غالب تک پر چھ سات مضامین لکھے ہیں انیس پر کتنے ہی مضمون لکھے اور حال ہی میں پانسو صفحے کی ایک کتاب مکمل کی ہے حالی پر بہت کچھ لکھا ہے مگر اقبال پر (دو تین ریڈیو کی تقریروں کو چھوڑ کر) لکھنے کی ہمت آج تک نہیں ہوئی یہ آج تک سب سے بڑا اعتراف ہے ان کی عظمت کا لیکن اقبال کے کلام نے بہت بچپن ہی سے میری ذہنی نشوونما پر اثر ڈالا ہے اس میں مجھے ذرا بھی شک نہیں۔

منشی پریم چند ان ادیبوں میں ہیں جنھوں نے میرے ذہن اور فن پر براہ راست اثر ڈالا ہے میں بارہ سال کی ہوں گی جب سب سے پہلے ان کی پریم پچیسی اور پریم بتیسی پڑھی اسی زمانہ میں سبدین صاحب نے ہمارے لئے یہ کھیل ایجاد کیا تھا کہ وہ پریم چند کی بعض کہانیاں پڑھ کر سناتے اور ادھوری چھوڑ دیتے اور ہم سے پورا کرنے کے لئے کہتے ۔ چنانچہ میں نے ان ادھوری کہانیوں کو پورا بھی کیا ہے لیکن میں نے کبھی شعوری طور پر پریم چند کی نقالی کرنے کی کوشش نہیں کی۔

یہ ممکن بھی نہ تھا کہ ان کا خاص میدان سیاسی جدوجہد تھا اور ان کے پلاٹ دیہاتی زندگی کے محور کے گرد گھومتے ہیں جبکہ میری کہانیاں قصباتی ماحول اور گھریلو زندگی کی عکاسی اور معاشرتی انقلاب کی آئینہ داری کرتی جاتی تھیں ہاں پریم چند کا فنی خلوص گہری اور سچی جذبات نگاری اور جیتی جاگتی کردار نگاری کا جو ان کے ناولوں کی جان ہے ضرور میرے ذہن نے اثر قبول کیا ہے۔ جب بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میرے ناول پریم چند کے ناولوں سے مشابہ ہوتے ہیں تو اس کا مطلب میں یہ سمجھتی ہوں (انسان بر خود غلط ہوتا) کہ انہیں میرے کرداروں میں بھی وہی جیتی جاگتی زندگی اور میرے فن میں وہی

(بقیہ ص۱۰)

اُردو اخبارات میں ہندی الفاظ

خالد مرزا ، سیف تاش مرزا

اردو زبان کا جنم اور فروغ ہندوستان کی سرزمین میں ہوا ہے بہت سی زبانوں کے اجزاء کے میل ملاپ کا نتیجہ ہے اس کا لغت دوسری زبانوں سے نئے نئے الفاظ لیتا رہا۔ رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے: "ہر طرح کے الفاظ جو اردو کی اصل سے میل کھاتے ہیں ضرور داخل ہونے چاہئیں۔ خواہ وہ انگریزی ہوں خواہ فارسی ہوں یا سنسکرت۔ صرف یہی ایک طریقہ زبان اردو کی ... اور اس کی ترقی کا ہے۔ اس طرح وہ ایک اعلیٰ درجہ کی زبان ... ہندوستان کی عام زبان بن سکے گی" اس کا ایک سرچشمہ ہمیشہ ... رہا ہے۔ اُردو اور ہندی میں جو اپنی بنیاد میں ایک ہیں بہت سے مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں جو دونوں میں یکساں استعمال ... یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ اُردو کے ہیں یا ہندی کے۔ ہندی سے الفاظ مستعار لینے کا رُجحان کبھی تیز ہوجاتا ہے اور کبھی سست لیکن ہمیشہ جاری رہا۔ اگر میر امن کے "باغ و بہار" "گنج خوبی" یا نظیر اکبر آبادی یا حالی کی شاعری کو زبان کے معیار سے دیکھیں تو اُن کی زبان نہایت آسان اور عام فہم پائیں گے ... ہندی کے کافی الفاظ موجود ہیں۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے اس قسم کے ادب کو اپنے ایک مضمون میں "ٹھیٹھ ادب" کا نام دیا۔ اس سلسلے میں آپ لکھتے ہیں: "اس ٹھیٹھ ادب کے الفاظ اسمات کی تہوں میں گہرے اُترتے جاتے ہیں۔ ان میں برسوں کی روایتیں بھری ہوتی ہیں۔ اس کے گیتوں اور مثلوں وغیرہ میں ہندوستانی سماج کے گہرے جذبات ادا ہوتے ہیں۔ یہ ہندو اور مسلم کلچروں کے سنگم پر بنا ہے اور اس میں دونوں کے ادا کرنے کی طاقت ہے۔ یہ فارسی اور عربی لفظوں کو اسی رواداری سے قبول کرتا ہے جیسے سنسکرت کے لفظوں کو اور گانوں کے لئے اُردو اس کی بالکل محتاج ہے۔"[1] لیکن ہماری بحث اس قسم کے ادب سے نہیں ہے جن میں ہندی الفاظ کے ساتھ ہندی کی کہاوتیں ضرب الامثال ہیں بلکہ صرف اُردو اخبارات کی زبان سے ہے جس میں آخری بیس پچیس سال کے دوران کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ پہلے ان کے صفحوں پر آج کل کے مقابلہ میں ہندی الفاظ کم استعمال ہوتے تھے (یہاں اور آئندہ لفظ "ہندی" سے ہندی اور سنسکرت دونوں کے الفاظ سمجھے جائیں جو ہندی زبان کے ذریعے سے اُردو میں آئے یا آتے ہیں)۔

پہلے یہ عام طور پر ہندی کے عام فہم اسمائے صفات ہوتے تھے لیکن بیسویں صدی سے شروع سے نئے قسم کے ہندی الفاظ بھی آنے لگے جن میں جدوجہد آزادی کے دور کی پوری طرح عکاسی ملتی ہے۔ ان کو ہم سیاسی اصطلاحات بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً سماج، سوراج۔

---

[1] حیات اللہ انصاری "ٹھیٹھ اُردو" ۔ اُردو ادب جنوری اپریل سنہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۰۵

سودیشی راج (انگریزی راج، برطانوی راج) نیتا، دیش بھگت، دیش بھگتی، اہنسا، سامراج، بلیدان، ستیہ گرہ وغیرہ۔

آزاد ہندوستان میں ہندی الفاظ کا اُردو میں آنا نہ صرف باقاعدہ رہا بلکہ تیز بھی ہو گیا۔ بول چال کی زبان، فلموں اور اُردو افسانوں کی زبان میں کافی ہندی الفاظ نے مستقل طور پر اپنی جگہ بنالی۔ اس کی بڑی وجہوں میں سے دو یہ کہی جا سکتی ہیں کہ ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہوا اور دوسری طرف خود اُردو دانوں کی خواہش رہی کہ اپنی زبان کو آسان اور عام فہم بنایا جائے۔ ہندی الفاظ کو مستعار لینے کا رجحان اُردو اخبارات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اب نہ صرف عام فہم بول چال کے ہندی الفاظ آ رہے ہیں بلکہ سیاسی اور سماجی زندگی سے متعلق اصطلاحات بھی جو آزاد ملک کے بعد بدلے ہوئے حالات کا عکس پیش کر رہی ہیں۔ کبھی کبھی اُردو گرامر پر ہندی کی چھاپ بھی نظر آتی ہے لیکن ہندی کی سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق اصطلاحات، ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی تک اُردو اخبارات کی زبان میں استعمال نہیں ہوتی ہیں۔ راقم الحروف نے ہندوستان کے مختلف جگہوں سے شائع ہونے والے اُردو کے قابلِ ذکر پینتیس[35] کے قریب اخبار دیکھے اور مثالیں جمع کیں۔ یہاں ان مثالوں سے کام لیا جائے گا۔ کوئی بھی مثال اس وقت تک نہیں دی گئی جب تک وہ کئی بار، تین چار اخباروں کے صفحوں پر نہ ملتی ہو۔ اس مضمون کو مختصر بنانے کی غرض سے عام طور پر مثالیں بغیر تاریخ کے دی گئی ہیں۔ تاریخ ایسی صورت میں لکھی گئی ہے جب یہ محسوس کیا گیا ہے کہ فلاں مثال سے قارئین کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ حوالوں کے اخبار کے نام کے بعد کی تشریح یوں ہے۔ ۶۰ ,۵ ,۳ ,۲ صفحہ دو، تاریخ تین[5] مہینہ مئی، سال سنہ ۱۹۶۰ء۔ اگر ۲ کی جگہ ع ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مثال "ایڈیٹوریل" سے لی گئی ہے۔ ہمارے پاس موجود مثالوں سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں ہندی الفاظ لینے کا رجحان اُردو کے ہر ایک اخبار میں پایا جاتا ہے۔ البتہ ان میں یہ بات ایک جیسی نہیں ہے۔ مثلاً "ابن الوقت (حیدرآباد)" مسلمان" (مدراس) دعوت (دہلی) میں ہندی ... "ندیم" (بھوپال) سیاست (حیدرآباد) ہماری زبان" (علی گڑھ) میں نسبتاً زیادہ ہیں۔ یہاں "ملاپ" "پرتاپ"، "تیج"، پردیپ یا ہماچل پردیش کے "کیلاش" جیسے شائع ہونے والے اخباروں سے مثالیں نہیں دی گئی ہیں جن میں ہندی الفاظ زیادہ ملتے ہیں۔

ملک میں واقع ہونے والی باتوں سے متعلق ہندی اصطلاحیں اور الفاظ

زبان جو بذاتِ خود سوسائٹی کی پیداوار ہے سماج سے الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے وہ تبدیلیاں جو سماج میں رونما ہوتی ہیں۔ اُن کا زبان پر اثر ہونا قدرتی بات ہے۔ شاید ہی دنیا کی کوئی ایسی زبان ہو جس کا لغت موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تبدیلیوں سے اثر پذیر نہ ہو۔ زبان میں جو بھی نئی نئی باتیں آتی ہیں وہ سب سے پہلے تحریری شکل میں اخباروں کے صفحوں پر ملتی ہیں۔ کئی الفاظ یا اصطلاحیں تھوڑی مدت کے بعد متروک ہو جاتی ہیں، جیسے کہ اُردو میں "ہز ہائینس"، "راج پرکھ"، "سر"، "وائسرائے"، "لاٹ صاحب"، "چیف کمشنر راج" وغیرہ دوسری دیر پا ہوتی ہیں۔

تقسیمِ ملک کے بعد اُردو اخباروں میں نکاس، مشرنار تھی نکاسی اپنی جگہ لے لیتے ہیں۔ لفظ "راج" جو اُردو میں آزادی سے پہلے کبھی کبھی استعمال ہوتا تھا آج کل بہت مستعمل ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں اس طرح کے مرکب الفاظ ملتے ہیں، گورنر راج، کانگرس راج، ظلم و تشدد کا راج، "جہالت کا راج"، "کمیونسٹوں کا راج" ہمارا اپنا راج"، "ساہوکاروں کا راج"، "پنچایت راج"۔ راج گدی، بدیشی راج۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ لفظ اُردو میں چل گیا۔

پہلے اُردو میں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے لئے ایوانِ عام (دارالعوام) "ایوان بالا" لکھا جاتا تھا۔ مثلاً سردار لیدیو سنگھ دارالعوام کے لئے منتخب ہو گئے۔ (قومی آواز-۵۲-۲-۱۷) ایوانِ بالا میں بحث" (الجمعیۃ ۴۹-۸-۲۱) لیکن اب سب اخبار ہندی اصطلاحیں لیتے ہیں۔ اس طرح مختلف سرکاری عہدیداروں اور پروگراموں وغیرہ کے نام جو ہندی میں پڑھتے ہیں۔ عام طور پر انھیں اُردو اخباروں میں بغیر ترجمہ کے جوں کا توں لے لیا جاتا ہے۔ راشٹرپتی، آکاشوانی، پردھان منتری، راشٹرپتی، راجیہ منتری، ساہتیہ سمارو ہ، ودھان پریشد۔ گنتر منتر پریشد۔ ضلع پریشد۔ ودھان سبھا۔ راشٹرپتی بھون۔ راج بھون۔ وگیان بھون۔ پنچایت سمتی۔ سیوا انکیتن پنچالک

(آر ایس ایس کے چیف سنچالک مسٹر گولوالکر نے کہا۔ جرس ۶۹،۱۱،۸)
پردھان (ہندو مہا سبھا کے پردھان نے اطلاع دی ہے۔ قومی آواز ۵۲-۴-۲۱) نیشنل اسکول، وششٹ میڈل (انہوں نے مسلح افواج کے افسروں کو وششٹ میڈل عطا کیا۔ روزنامہ خلافت ۶۹-۴-۲۶-۴) گاندھی سمارک ندھی، سبھاش جینتی، گاندھی شتابدی، یوجنا (دو سال ہو گئے، ہماری یوجنا نہیں بنی۔ جرس ۶۹-۱-۷-۷)

اس طرح اگر کسی پارٹی یا تحریک کا نام ہندی میں ہو تو عام طور پر وہ بھی اُردو اخباروں میں ایسے ہی لیا جاتا ہے یا کبھی جزوی ترجمے کے ساتھ ـــ پرگتی شیل۔ ودھایک دل، سمیکت (سن یکت) ودھایک دل، پرانتیہ رکشک دل۔ بھارت سیوک سماج، گرام سیوک سماج۔ گرام رکشا (رکشا) سمتی گئو اندولن۔ گئو ہتیا، ناری سدھار سدن، کل ہند سماج وادی یووک سبھا، ہندی سمتی، اور کبھی گئو کشی، گرام دان تحریک۔ گئو رکشا کمیٹی وغیرہ

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اُوپر دی ہوئی مثالیں جو دو یا تین الفاظ پر مشتمل ہیں، انہیں ایک واحد یونٹ سمجھنا چاہیئے جن کا ایک ہی مفہوم ہے، اس لیئے انہیں ایک خاص قسم کی اصطلاحیں سمجھنا ضروری ہے۔ اُن کے الگ حصے اُردو میں ابھی تک زیادہ تر مستعمل نہیں ہیں۔ مثلاً بھون۔ ہتیا۔ پرگتی، رکشا، سنچالک، پردھان، سمتی جیسے الفاظ کے ساتھ جو اُوپر کی مثالوں میں ہیں، اُردو میں دوسرے مرکب الفاظ نہیں بنتے ہیں یعنی اس طرح کے الفاظ "راج" جیسے لفظ کی طرح ابھی تک مستعمل نہیں ہوسکے ان کے مقابلہ میں نیچے دیئے ہوئے الفاظ جو اصطلاحیں ہوگئی ہیں زیادہ مستعمل ہیں" راجدھانی" "بدیشی" "دھرنا" "بھارت" "بھارتی" "سامراج" "مرن برت" "دھڑے بندی" "سمجھوتہ" "آدرش" "سدھار" "گھیراؤ" "دل بدلی" "نیتا"

ہندی بول چال کے مزید نئے الفاظ

ہندی کے بہت سے الفاظ اُردو میں تقسیم ملک سے پہلے ہی اس کے جز بن گئے تھے، مثلاً بھروسہ، ان پڑھ۔ دھیان۔ انمول۔ ہڑپ۔ ٹھکر اجالا۔ پرچار۔ کرن۔ اداس، سندر، انگنت جیسے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے تھے اور اُردو کے مختلف لغات میں درج ہیں۔

فیروز اللغات جو ۱۹۴۰ء کے آس پاس کی اُردو زبان کی عکاسی کرتا ہے، اس کو دیکھنے کے بعد ہمارا یہ خیال ہے کہ وہ صرف اُردو ہی کا لغت نہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ "ہندوستانی" کا بھی لغت ہے، اس میں بہت سے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ شامل ہیں، جو شاید ہی اس زمانے میں اُردو میں، خاص کر فصیح اُردو میں کثرت سے مستعمل تھے مثلاً پُتر (بیٹا)، سوگ، دیا، لگان، اجاگر، جاگرن، دھرم، ریت، کرتوت، پتر (خط) لیکن اس کے باوجود "گیت کار" شانت "بھیانک پن تا" نواسی، چناؤ۔ گراوٹ "من گھڑت، پوجاری راجدھانی، چیتاونی، جنتا، بھارتی، اتھک، وچار، دھارا، اُوٹ ارب پتی، جیسے اور دوسرے الفاظ جو ہمیں اُردو اخباروں کے صفحوں پر ملے ہیں، وہ فیروز اللغات میں درج نہیں کیئے گئے، اور چھاپ (اثر) کلاکار (فن کار)، دَل (پارٹی) میلہ (فیسٹی ول) کے الفاظ دیئے تو گئے ہیں اور ہر ایک کے چار پانچ مطالب ہیں۔ مثلاً کلاکار کے لیئے یہ لکھا ہے مکار، فریبی، دغاباز، شور مچانے والا۔ فسادی۔ لیکن الفاظ کے وہ معانی جو ہم نے بریکیٹ میں دیا، لغت میں غیر موجود ہیں۔
"ہمارے بچوں پر انگریزی تہذیب کی چھاپ ہے (ندیم ۶۸-۳-۱۱-۷)
اس دَل کے اندر اختلاف رونما ہوگئے " (روزنامہ آزاد ۶۹-۱۲-۲۱-۴)

اب اس قسم کے الفاظ اُردو اخبارات میں دھیرے دھیرے آرہے ہیں اور پہلے سے اُردو میں رائج لیکن کم مستعمل ہندی الفاظ کے ساتھ زور پکڑتے جارہے ہیں۔ نیچے دی ہوئی مثالیں اُردو اخباروں کے صفحات میں آج کل کافی ملنے لگی ہیں۔ جیسے کرتا دھرتا۔ کام کاج۔ میل ملاپ۔ چھان بین۔ روک تھام۔ میل جول۔ گٹھ جوڑ۔ سوچ بچار۔ ٹال مٹول۔ بندھن۔ نیاپن۔ پاگل پن۔ ہٹ دھرمی۔ گمبھیر۔ پونجی۔ جھگڑالو کھوج۔ جنم بھومی۔ پکوان۔ اڑان۔ لوک ناچ۔ اکتا۔ بیاج۔ لاگت۔ ٹھیک ٹھاک
نوجی گٹھ جوڑ کی بیٹھک (افکار ۶۶-۷-۲۹-۳)

فیروز اللغات میں ہندی کے کافی الفاظ کے ساتھ لفظ "ہندو"

۱۔ اخبار "افکار" (بھوپال) میں اسی کی بنیاد پر بنی دوسری اصطلاح ملی۔ "نراج" (نراج پھیلانے کا پروگرام بنایا جارہا ہے ۵۷-۹-۲۲-۱)

بھی لکھا ہے۔ یعنی یہ لفظ ہندوؤں سے متعلق استعمال ہوتے تھے اور ہندوؤں کے مذہب اور کلچر کی عکاسی کرتے تھے۔ اب اس قسم کے بہت سے الفاظ سے وہ تہذیبی یا مذہبی رنگ نکل چکا ہے۔ مثالیں: "قوم ۳۰ جنوری کو ان شہیدوں کو شردھانجلی پیش کرے گی" (آزاد ہند ۲۵-۱-۷۶ء، ۳) "ہر یوتو کی حکومت کو امریکہ کی آشیرواد حاصل ہے" (سیاست ۱۵-۱-۷۹ء) "اس بات کی خوشی ہر سچائی کے پجاری کو ہونی چاہئے" (ندیم ۲۶-۱۰-۵۴، ۳) لیکن ابھی یہ کہنا کہ ایسے سب الفاظ اس طرح کے ہوتے ہیں بے محل ہوگا۔ ہندی کے کئی الفاظ تب استعمال ہوتے ہیں جب بات ہندوؤں یا ان کے رسم و رواج، دھرم، رہن سہن، تہواروں کے بارے میں ہو، یا کسی ہندو کی کہی ہوئی بات کا اقتباس پیش کیا جاتا ہو۔ مثلاً ہندو دھارمک کتابیں، سمادھی، پاٹھ، ارتھی کا جلوس، تیرتھ استھان، تیرتھ یاترا، سوگیہ، سوکھیاش، ہندی کے پرچارک، کرشن اوتسو وغیرہ۔

کبھی کبھی ہندی کے دیش، دھرتی، آتما، اُجالا، جنم بھومی، اُپدیش، دیر، سپوت، آدرش جیسے الفاظ کی مدد سے انداز میں زور پیدا ہوتا ہے۔ مثالیں: "گاندھی جی کے اُپدیش خاص اہمیت رکھتے ہیں" (غازی ۲۸-۸-۱۵-۷۹) "مادر وطن کے بہادر سپوتوں نے جان و مال کی قربانیاں کیں" (ندیم ۵۷-۸-۱۵، ۱۰) "کو اتنے مشہور ویر شری موہن رانا ڈے (آج ۴۹، ۲۳ء) وہ اپنے آپ کو اس دھرتی سے لال نہیں سمجھتے ہیں" (تاید ۴۹-۱۲-۱۵، ۲) "ہمارے راشٹر پتا انہیں ... ایک دن کے ہاتھوں ... ہو گئے" (... ۵۹-۸-۱۵، ۲) "دیوالی ہماری آتما کے جوت بھی جگا سکتی ہے" (ندیم ۲۶-۱۰-۵۵ء) "ہم ان اصولوں کو اپنا آدرش بنائے ہوئے ہیں" (افکار ۹-۵-۱۲ء) اگر ان الفاظ کی جگہ اردو کے دوسرے الفاظ لکھیں تو ان جملوں کے معنی تو وہی رہیں گے لیکن اسلوب میں ضرور فرق آجائے گا۔ اس طرح ان اشعار اور گیتوں میں جو کبھی کبھی اردو اخبارات میں آجاتے ہیں یہی بات پائی جاتی ہے۔ ان میں حسب ذیل سندر، پرمعنی اور پرکشش الفاظ ملتے ہیں۔ جیسے پاپ، ویر، سنت، سنگھرش، پریت، رتو، آشا، پون، دھن، دیپ، امرت (امرت آس، امرت پیاس) روپ، اوتار، ریت، پریم وغیرہ۔ البتہ گیتوں میں ہندی الفاظ کا استعمال پہلے ہی سے رائج ہے۔

بعض اوقات کسی بات یا مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اردو اخبار ہندی کا لفظ لیتے ہیں۔ لیکن اس بات یا مفہوم کو ادا کرنے والے دوسرے مستعمل الفاظ کی جگہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ۔ اس کے نتیجہ میں دو الفاظ ایک ہی بات کا اظہار کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کے بیچ حرف ربط "اور" آجاتا ہے اور کم موقعوں پر حرف ربط "و" آتا ہے۔ یا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ مثالیں: امن اور شانتی (امن اور شانتی ہماری دوستی کی بنیاد ہے" غازی ۷۸-۸-۱۵، ۲) پریم اور محبت؛ "پھوٹ اور انتشار"؛ یکایک اور اچانک "(یکایک اور اچانک انہوں نے اپنا دورہ ختم کر دیا۔ روزانہ ہند ۵-۶-۱۱، ۱)" اصول اور سدھانت"، "کٹھن اور دشوار" (یہ سب کٹھن اور دشوار مسئلہ ہے۔ اردو ٹائمز ...) "آدرش اور نصب العین" (یہ بات اخبار سیاست کا آدرش اور نصب العین ہے سیاست ۵۹-۸-۱۵، ۱) "متبرک اور پوتر" (جس چیز پر ان کی نظر پڑتی وہ متبرک اور پوتر ہو جاتی ہے۔ اردو ٹائمز ۶۴-۳-۱۲، ۸) سود بیاج"، "شادی بیاہ"، "ظلم و ہتیاچار"، "امن و شانتی"۔ (یہ سب فیروز اللغات میں نہیں) اس دوہرے استعمال کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ اردو کے ایک نامور نقاد نے یہ کہا "جب میں کچھ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں تو میں ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھتا ہوں کہ میری زبان عام فہم ہو۔ اس لئے جب میں اردو کا کوئی لفظ استعمال کرتا ہوں جو میرے خیال میں مشکل ہے تو اس کے آگے میں ہندی یا انگریزی کا اسی مفہوم کا عام لفظ بھی لکھتا ہوں"۔ کسی حد تک یہ بات قابل قبول ہے۔ خاص طور پر جب اس طرح کا جملہ ہو: "راج گدی یا تخت پر بیٹھنے والے" (سیاست ۶۸-۸-۱۵، ۴) اس کے علاوہ یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دو مختلف الفاظ استعمال کرنے سے شاید اس مفہوم پر زیادہ زور دینا منظور ہے جب ان دونوں کے بیچ حرف ربط "اور" ہے (کٹھنائیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔" (آزاد ہند ۹-۶-۷۰، ۱) اگر ان دو الفاظ کے بیچ میں حرف ربط "و"

ہو یا کوئی بھی نہ ہو تب اسلوب کی ایک نئی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے "سوگ و ماتم کے عالم میں (ندیم ۶۰-۱۱-۲۰ ء) ان دو مثالوں میں یہ فرق ضرور ہے کہ "سوگ و ماتم" کو ہم ایک یونٹ ایک ہی لفظ "گفت و شنید" کی طرح دیکھتے ہیں اور "کھٹنائیاں اور دشواریاں" کو ہم الگ الگ حصہ کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔

قواعد کی بنیاد پر نئے الفاظ بنانے کا رجحان جاری ہے "سجانا" سے "سجاوٹ" کی طرز پر نئے اسم پیدا ہو گئے "چناؤ" "گھیراؤ" "پتھراؤ" حالانکہ "پتھرنا" کوئی مصدر نہیں ہے، غالباً انگریزی Stoning کا ترجمہ ہے "سجاوٹ" کی طرز پر گراوٹ بنا ہے (اخلاقی گراوٹ کا ثبوت یہ ہے۔ ندیم ۶۸-۱۲-۲۹-۶) اگر پہلے کسی سیاسی نظریہ کو ادا کرنے کے لئے "ازم" (مارکسزم) یا سابقہ "یت" (اشتراکیت) لگایا جاتا تھا جیسا کہ دعوت "(دہلی) آج کل بھی کرتا ہے۔ آخری دنوں میں ہندی کا سابقہ "واد" بھی کئی اخباروں میں آنے لگا۔ "مادّواد کی شکست یقینی ہے" (نیا آدم ۹-۲-۹-۷) اگرچہ اصطلاح سابقہ "یت" کی مدد سے بن بھی جائے تو یہ الفاظ اردو کے صوتیاتی نظام کے مطابق نہیں ہوگی۔ مادیت اردو میں عجیب نہیں۔

مصدر "سدھنا" اور اسی سے بنا اسم "سدھار" جو پہلے ہندی میں ہی استعمال ہوا۔ آج کل اردو میں بھی "اصلاح" کی جگہ "اصلاح کرنا" اکثر ملنے لگا ہے۔

اردو اخبارات میں ہندی کے دخیل الفاظ کے بارے میں چرچا کرتے وقت کئی باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اوپر دیئے ہوئے ہندی کے سب کے سب الفاظ اردو میں پہلے سے مستعمل الفاظ کی جگہیں لے کر کثرت سے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ ہاں "پرچار" "راجدھانی" "پتھراؤ" جیسے لفظوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان مفہوموں کو ادا کرنے والے اردو کے ہر ایک اخبار میں ملتے ہیں لیکن ایسی بات "ویر" "کلاکار" "بیٹھک" "لگان" جیسے الفاظ کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ نہیں لے سکے۔ اس کے علاوہ ان مفہوموں کو ظاہر کرنے کے لئے اردو میں پہلے سے ہی اپنے الفاظ موجود ہیں اور دوسری زبانوں سے بھی آئے ہیں۔ جیسے "ہیرو" "ایکٹر" "نیشن" "ٹیکس"۔ اور یہ کہنا کہ ان میں سے کسی قسم کے الفاظ اردو میں چل جائیں گے یا زبان کی باریکیوں کو ادا کرنے کے لئے ساتھ ساتھ مستعمل ہوں گے" اس وقت بے محل ہے۔

مہذب اللغات (جو کئی جلدوں میں ہے) سنہ ۱۹۶۰ء سے لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ ہندوستان میں اردو کی سب سے آخری اور نئی ڈکشنری ہے اور آزاد ہندوستان میں سب سے پہلی بھی ہے جو صرف حروف "ا۔ب۔پ" پر مشتمل ہے۔ اس قسم کی ڈکشنریوں کی ضرورت میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی پہلی تین جلدیں نظر سے گذریں جو صرف حروف "ا۔ب۔پ" پر مشتمل ہیں ایک بدیشی ہوتے ہوئے اس کے بارے میں اپنی کوئی قطعی رائے دینا دانشمندی کی بات نہیں ہوگی، لیکن پھر بھی اس ڈکشنری کی ایک کوتاہی کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانے کی جرأت کرتا ہوں۔ آزاد ہندوستان میں اردو کے لغات میں کافی اضافہ ہوا ہے اور ہر روز نئے نئے الفاظ اور اصطلاحیں اردو کو مالا مال کرتی ہیں۔ میرے خیال میں اس میں ان اہم تبدیلیوں کی عکاسی پوری طرح نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ مضمون صرف ہندی الفاظ سے متعلق ہے اس لئے ہندی ہی کے چند الفاظ پیش خدمت ہیں جو مہذب اللغات میں موجود نہیں ہیں۔ اگنت آشیرواد۔ ایکتا، پرچار، الوٹ، اتھک پریم، بھارتی۔ پجاری، ارب پتی (ارب ہے) بیاج، امن و شانتی (امن و امان ہے) پونجی، آشا اور اس لغت میں اجالا، ٹال مٹول اڑان، پتھراؤ، اجاگر، بیاہ، انیڑھ جیسے الفاظ شامل تو ہیں لیکن غیر فصیح اور بدیسی تاجروں کی زبان "قرار دیئے گئے" ہیں۔

عام فہم ہندی الفاظ کو اردو اخباروں میں لینے سے صحافتی زبان کا دامن اور وسیع ہو گیا ہے لیکن ہندی الفاظ مستعار لینے کے عمل میں مختلف اخباروں میں یکسانیت نہیں ہے۔ اس معاملہ میں کوئی واضح اور ٹھوس پالیسی اپنائی نہیں گئی۔ اردو میں معیار بندی کا کام، جس کی ضرورت اردو داں طبقہ میں شدت سے محسوس ہو رہی ہے، شاید اس خامی کو دور کر سکتا ہے۔

آخر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو اخبارات میں ہندی الفاظ کا استعمال کافی زور پکڑ گیا ہے۔ ایک طرف پہلے سے دخیل الفاظ زیادہ استعمال ہونے لگے اور دوسری طرف سے ہندی کے نئے نئے الفاظ آنے لگے۔ اگر آزادی کے دور کو دو حصوں میں تقسیم کردیں تو یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ دوسرے حصے میں پہلے کے مقابلے میں ہندی الفاظ آنے کا رجحان زیادہ تیز ہے مثلاً ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء کے دوران کی "سیاست" "افکار" "الجمعیۃ" "آزاد ہند" "قومی آواز" اور دوسرے اخباروں کی فائلیں دیکھی گئیں، ان میں ہندی کے نئے الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں — اور سیاسی اور سماجی زندگی سے متعلق اصطلاحیں ۱۹۵۰ء کے بعد سے ملتی ہیں۔ اور وہ بھی کم تعداد میں۔ اس سے یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ مستقبل میں بھی اُردو اپنے لغت میں اضافہ کرنے کے لیے سب سے پہلے ہندی سے الفاظ لیتا رہے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے مطابق بچے ایک زبان کی حیثیت سے ہندی پڑھتے ہیں۔ اور جب وہ بچے جن کی مادری زبان اُردو ہے، اپنی زبان میں لکھیں گے یا بات کریں گے تو وہ شاید [illegible] کی جگہ [illegible] ازم کا لاینفک جُزہے [illegible] کا "اوش" لفظ استعمال کریں گے [illegible] زبان پر بھی پڑنا قدرتی بات ہوگی۔

بقیہ: غبارِ کارواں

خلوص اور زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی نظر آتی ہوگی جو پریم چند کا طرۂ امتیاز ہے اور اسی لحاظ سے وہ پیچ پنچ میرے روحانی استاد ہیں۔

لیکن جس ادبی شخصیت کا سب سے گہرا پائیدار اثر میری ذہنی نشوونما پر پڑا وہ میرے محترم بزرگ مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میرے فن اور زبان پر مولانا کے انداز تحریر کی ذرا سی بھی چھاپ محسوس نہیں ہوتی لیکن میرے دل اور دماغ کو اپنے وسیع معنوں میں ان کی شخصیت اور فن دونوں نے بہت متاثر کیا ہے۔

یوں تو میں نے قریب قریب ان کی سبھی تصانیف پڑھی ہیں جنہوں نے بہ اعتبار خاص مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ لیکن ان کی جس تصنیف نے میرے دل میں ان کی عظمت و لسبوں کی سی پیدا کردی وہ تفسیر سورۂ فاتحہ اور ترجمان القرآن ہے۔ پھر انکی دلکش پُر وقار شخصیت ان کی دلنشیں باتیں ان کے دل کا درد اور عالی ظرفی اور سچی عالمانہ شان ان کی محبت اور خلوص (جن کا اظہار بہت کم ہوتا مگر سمجھنے والا خود بخود محسوس کرلیتا تھا) ان سب کا ملا جلا اثر میں نے اس قدر قبول کیا جسے زمانہ کا ہاتھ مٹا نہیں سکتا۔

پھر بہت سی کتابیں ہیں جنھوں نے میری ذہنی نشوونما میں مدد دی ہے۔ ان میں بعض بڑی معمولی سی کتابیں بھی ہیں جیسے گودڑ کا لال جو اس دور کی ایک بہت کم پڑھی لکھی خاتون نے داستان کے انداز میں لکھی تھی یہ صرف میں جانتی ہوں کہ میری زندگی کے بعض پہلوؤں پر اس ناول نے کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ بنگلہ کے ناول جن میں سرت چندر چٹرجی اور ٹیگور کے بعض ناول شامل ہیں جن سے میں ترجموں کے ذریعے روشناس ہوئی اس لسٹ میں آتے ہیں جنہوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی کے بعض مصنف ہیں جیسے جین آسٹن، جین آئر اور ڈکنس یا وہ مصنف جن سے میں انگریزی ترجموں کی بدولت واقف ہوئی جیسے ٹالسٹائے اور ترگنیف ان کی تصانیف کو میں نے بار بار پڑھا ہے، پڑھتی رہتی ہوں مگر دل سیر نہیں ہوتا لیکن سب سے زیادہ جس کتاب نے میری ذہنی نشوونما پر اثر ڈالا وہ مولانا آزاد کی عظیم تصنیف — ترجمان القرآن ہے جس کا تذکرہ میں اوپر کرچکی ہوں اسی کی بدولت مذہب کی سچی روح کو سمجھنے کی لگن میرے دل میں لگی اور اسلام کی روح اور صحیح تعلیم کو تھوڑا بہت سمجھ پائی۔ اسی کی بدولت میں نے دوسرے مذہبوں کا احترام کرنا سیکھا اور ان کو سمجھنے کی کوشش کی — اسلام کی عظمت کا راز کیا ہے اور علم و عقل کا کتنا گہرا رشتہ اس نے انسانی زندگی سے بتایا ہے اور فرد کی زندگی میں یہ تعلیم کس طرح کام آسکتی ہے یہ میں نے اسی کی بدولت جانا۔

یہ ہے ایک مختصر اور مہمل سا خاکہ ان خیالات کا جو اپنے دل کو ٹٹول کر میں نے مرتب کیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انسان پر، خاص کر فنکار پر (جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے بہت زیادہ حساس ہوتا ہے) اور اس کے ذہن اور فن پر اتنے لاتعداد اثرات شب و روز پڑتے رہتے ہیں جنہیں کوئی نہ وہ ناپ سکتا ہے نہ تول سکتا ہے۔

✱✱✱✱✱✱✱✱✱✱✱

زندگی اور موت



چین جاتا رہا صبر رخصت ہوا
زندگی، زندگی کو ترسنے لگی
لختِ دل نوکِ مژگاں پہ آنے لگے
خون بہتا رہا دم اکھڑتا رہا
پھر بھی انسان نے ہار مانی نہیں
یاد آئے مذاہب کے پیغام سب
یہ جہاں عارضی وہ جہاں جاوداں
زندگی موت ہے، موت ہے زندگی
صرف دو دن ہے انساں کو رہنا یہاں
زندگی سے مگر سب کو الفت رہی
زیست دھوکا سہی ایک سپنا سہی
زندگی پھر بھی پیاری ہے ہر حال میں
زندگی نیش ہے تو نہیں اس کا غم
زندگی زہر اگر ہے تو کیا فکر ہے :
زہر پی کے انسان جیتا رہا
عزم نے یہ کہا مجھ کو للکار کے
یاں ہے مر مر کے جینے میں مردانگی
عزم کی یہ صدا جب کہ دل نے سُنی
دل نے پُرزور لہجے میں تائید کی
زندگی ہنس پڑی اور موت گھبرا گئی

[illegible]



تین نظمیں

مظفر عازم

ترجمہ: حکیم منظور

جل' دل حسن تھا اور حسین تھا
میں خود کو کھو بیٹھا، میرا دل برمایا
میں تو اپنی جان پہ کھیلا، دام لگایا
سیٹی بجائی'
سیٹی دل برمانے والی اور مدھر سی
'جل' (اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا)
دام میں آیا
دام میں آکے ہوش سنبھالا
ہوش میں آکے تڑپا پھڑکا
اور اس کے سارے پر ٹوٹے
جب سے میرا دل بے کل ہے
یہ مجھ سے کیا بھول ہوئی ہے

('جل' ایک کشمیری پرندے کا نام ہے۔)

(۲)

امن، محبت، بھائی چارہ
ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم اک گلشن میں پہنچے
اور وہاں دل کھول کے گائے گیت رسیلے
کون یہ جانے
کیا اُس گلشن کے مالی بھی سُن پائے
گیت ہمارے
کیونکہ چمن میں شور بپا تھا
توپ و تفنگ و سازِ حرب کا !

(۳)

(بائیں) پسلی کے نیچے سے
(خدا) اک مشتِ خاک کُریدی
(حوّا کی تخلیق تھا اُس مٹی کا مصرف)
(اُ)س کا خلا ابتک باقی ہے،
(ت)ب سے اُس کو پاٹ رہا ہوں
لیکن اب تک سرگرداں ہوں

صالحہ بیگم

چشم بددور

ہندوستان کے قدیم بت تراش پہلے بت کے مختلف عضو بناتے تھے اور آنکھیں آخر میں۔ دستور کے مطابق آنکھیں کاڑھنے کے قبل بت تراش ایک معین وقت مراقبہ اور نیتوں ملن، پوجا میں گزارتے تھے اور اس کام کی تکمیل کے بعد بت کی چشم کشائی کے لیے ایک الگ پوجا ہوتی۔ یہ رسم اسی یقین پر مبنی تھی کہ بچہ اپنی ماں کے شکم میں ہر عضو کو تو حرکت میں لا سکتا ہے لیکن آنکھیں صرف پیدائش کے بعد ہی کھولتا ہے۔ یعنی انسانی اعضا میں یہ سب سے آخر میں حرکت میں آتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ عقیدہ تھا کہ آنکھوں کی غیر معمولی اہمیت ہے اور ان میں لامعلوم طاقتیں پنہاں ہیں۔ بت تراشی میں بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

آنکھوں کی طاقت سے کم و بیش ہم سبھی واقف ہیں۔ یہ دھمکی بھی دے سکتی ہیں اور ذلیل بھی کر سکتی ہیں۔ ان کی پھنکار سانپ سے زیادہ دہشت ناک ہے اور ضرب لوہے سے زیادہ سخت۔ انہیں اضطراب بھی ہے اور خوشی بھی، غم بھی ہے اور ہراس بھی۔ یہی وجہ ہے کہ آنکھیں شاعر کے تخیل کا مرکز رہی ہیں۔ میر کی 'نیم باز' آنکھیں شاد کی ویران آنکھیں، اور جلیل کی ترستی آنکھیں۔ ایک چیز کے تین الگ الگ زاویے ہیں۔ ایسے زاویے اور بھی ہیں۔ قہر آلود آنکھیں اور مسحور آنکھیں، سوالیہ آنکھیں اور متلاشی آنکھیں، چبھتی آنکھیں اور بد آنکھیں۔ یعنی آنکھوں کی جتنی قسمیں تصور کی گئی ہیں۔ ان میں کچھ اچھی ہیں اور کچھ بری بھی، کچھ روح پرور اور کچھ دلشکن۔ لیکن یہ امر حیرت ناک ہے کہ صرف چشم بد ہی ہمارے خیالوں پر چھائی ہے اور ہماری روزمرہ زندگی پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

نظر بد پر یقین نہ تو حالیہ ہے اور نہ اتفاقیہ۔ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس عقیدہ کی بنیاد اس وقت پڑی جب انسان نے ہوش سنبھالا۔ مصر کی قدیم روایات کے مطابق سارے دیوتاؤں کا باپ پتاہ تھا اور اس نے دوسرے دیوتاؤں کو اپنی آنکھوں سے پیدا کیا تھا اور انسان کو اپنے منہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ جو آنکھوں سے پیدا ہوئے وہ طاقت ور ہیں بہ نسبت ان کے جو منہ سے پیدا کیے گئے۔ سترھویں صدی کا ایک مصنف پکوک (Pococ'ke) جو مصریات کا ماہر تھا اپنے سفرنامہ میں مصریوں کے چشم بد کے عقیدہ پر تفصیلی نگاہ ڈالی ہے۔ پکوک کے مطابق مصری جادوگری پر اور خصوصاً چشم بد پر، یقین رکھتے تھے اور ان کے پاس اس مضمون پر متعدد کتابیں تھیں۔ نظر بد سے بچنے کے لئے مختلف طریقے رائج تھے۔ ان میں گنڈے اور تعویز کا استعمال، آگ پر نمک چھڑکنا، اور دیواروں پر خوفناک شکلیں بنا نامقبول طریقے تھے۔ پہلی صدی کے یونانی مورخ پلینی نے مغربی ایشیا کے رہنے والے طرابلی اور الیاری قوموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں کچھ ایسے جادوگر تھے جو صرف نظروں ہی سے جان سلب کر لیتے تھے اس لئے ایک جادوگر کی قہر آلود نظریں موت کا پیش خیمہ سمجھی جاتی تھی۔ پلینی نے ہندوستان

میں بھی چشم بد پر اعتقاد بہت گہرا پایا۔ اٹلی میں لوگ ایک خوفناک شکل کا دیوتا 'منیا' کی تصویر یا بت بنا کر دروازوں کے سامنے لٹکا دیتے تھے۔ نظر بد سے محفوظ رہنے کا یہ طریقہ قدیم اسیریا کے رواج سے مشابہ تھا۔ وہاں بھی لوگ کثرت سے ڈراؤنے دیوتاؤں کے بت اور دہشت ناک شکلیں بنا کر گھر کے سامنے کسی نمایاں جگہ پر رکھتے تھے۔

پروفیسر رمیں کے مطابق جزیرہ مین (Isle of Man) کے باشندے کبھی صحت مند ہونے کا اعتراف نہیں کرتے تھے چونکہ ان کو یقین تھا کہ اگر وہ اپنے کو صحت مند ظاہر کریں تو بد روحیں ان پر جھپٹ پڑیں گی اور وہ چشم بد کے فوراً شکار ہو جائیں گے۔ مراقش میں عوام قہر الٰہی اور آفتوں سے اتنا خائف نہیں ہوتے تھے جتنا بدنظر سے۔ اس زمانے کے ایک مصنف کے مطابق شہر میں دو تہائی موتوں کی وجہ نظر بد تھی۔

ترکستان میں گاؤں کے رہنے والے اکثر اپنے گھروں کی دیواروں پر اور خصوصاً داخل ہونے کے دروازوں پر قرآن شریف کی آیتیں تحریر کرتے تھے تاکہ اس کے مکین نظر بد سے محفوظ رہیں۔ چین، جاپان، روس اور دیگر ممالک کے ادب میں اور وہاں کے تمدن میں چشم بد کا اکثر حوالہ ملتا ہے۔

مذہبی کتابوں میں بھی نظر بد کا تذکرہ ہے۔ انجیل کے پرانے عہد نامہ میں چشم بد سے بچنے کی تاکید ہے۔ نیا عہد نامہ میں متی کی انجیل (سورۂ ۲۰) میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ ——————— کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال سے جو چاہوں سو کروں۔ یا تو اس لئے کہ میں نیک ہوں ——— قرآن پاک میں نظر بد کا حوالہ سورۂ یوسف میں ملتا ہے۔ آیت ۶۶ میں حضرت یعقوب کی زبان سے کہا گیا ہے: "اور کہا اے میرے بیٹو ایک دروازہ سے (قاہرہ میں) مت داخل ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا"۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت یعقوب نہیں چاہتے تھے کہ لوگ بہت سے بھائیوں کو ایک ساتھ قاہرہ میں داخل ہوتے دیکھیں چونکہ اس سے انکو بری نظر لگنے کا اندیشہ تھا۔ ولی الدین عبداللہ نے اپنی مرتب کردہ کتاب مشکوٰۃ المصابیح (حصہ دوئم) میں یہ واقعہ لکھا ہے۔

"اسما بنت عمیس بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے رسول کریم سے کہا کہ یا رسول اللہ جعفر کا خاندان چشم بد کے اثرات سے تباہ ہو رہا ہے۔ کیا میں اس اثر کو زائل کرنے کی تدبیر کروں۔ رسول کریم نے فرمایا: بیشک چونکہ دنیا میں کوئی چیز اگر تقدیر کے آڑے آ سکتی ہے تو وہ چشم بد ہے۔"

یہ بات شروع سے تسلیم کی گئی ہے کہ انسانی جذبہ کا اظہار جتنا پر اثر آنکھوں سے ہو سکتا ہے جسم کے کسی دوسرے عضو سے نہیں ہو سکتا۔

رنگین کہانیاں سنا دیتی ہیں
کہنے کو خموش ہیں تمہاری آنکھیں

آنکھیں دل کا آئینہ ہیں۔ محبت اور نفرت، خوشی اور غم جیسے جذبوں کا فوری اثر آنکھوں پر پڑتا ہے اور اس طرح ہر جذبہ کی خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ ہو، آنکھوں کے ذریعہ صحیح ترجمانی ہو جاتی ہے۔ ہمارے لئے موجودہ علوم نے آنکھوں کی طاقت کی تشریح کر دی ہے لیکن قدیم انسان کے لئے آلۂ بصارت کی غیر معمولی طاقتیں انتہائی پیچیدہ معمہ تھیں۔ یہ وہ معجزہ تھا جو اس کی سمجھ سے بالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ پاگل پن، اندرونی امراض، بے وقت موت جیسے غیر معمولی واقعوں سے دوچار ہوا اس نے جھٹ ان کو چشم بد سے موسوم کیا۔ دھیرے دھیرے یہ یقین گہرا اور عام ہوتا گیا اور چشم بد کے انسداد کے لئے مختلف طریقے اپنائے گئے۔ روم میں بدنظری کو قانوناً جرم قرار دیا گیا اور ایسے ملزم کو جس پر بدنظری کا جرم ثابت ہو جائے، قید بامشقت تا زندگی کی سزا مقرر کی گئی۔ پولینڈ میں بھی حکومت نے ایسے لوگوں تو ملک سے نکال دینے کی سزا تجویز کی۔ یونانیوں نے اپنی زبان میں ایک خاص لفظ باسکینوس آنکھوں کی لامعلوم طاقتوں کو بیان کرنے کے لئے رائج کیا اور اس کے برے اثرات کے ازالے کے لئے کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ستر ہویں صدی میں لوین (Lowin) کے ایک راہب نے اپنی ایک تصنیف میں بدنظر کی وضاحت اس طرح کی: "یہ ایک ایسی طاقت ہے جو شیطان سے دوستی کر کے ملتی ہے" اسی

صدی کا دوسرا مصنف فرنانڈ نے بھی چشم بد پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ انگلستان کی ملکہ الزابتھ اوّل کے زمانہ میں بھی جبکہ انسان ذہنی ترقی کر رہا تھا اور مادّی ترقی کے نئے نئے دروازے کھل رہے تھے، بدنظری پر عقیدہ بدستور قائم تھا۔ دستاویزی ثبوت سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ لوگوں کو اسی جرم میں پھانسی دی گئی کہ وہ بدنظری سے مویشیوں میں بیماری پھیلا رہے تھے۔ ہندوستان میں مغل بادشاہ چشم بد پر یقین رکھتے تھے۔ اور خصوصاً تاجپوشی یلغار وغیرہ کے موقع پر اس امر پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ مغلیہ خاندان کا دوسرا تاجدار ہمایوں اپنی بدقسمتی کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس زمانے میں عام خیال تھا کہ اس کے شیر شاہ سے شکست کھانے اور ہندوستان کے تخت سے دست بردار ہونے کی ایک بڑی وجہ چشم بد کا اثر تھا۔

بعد کی صدیوں میں اس عقیدہ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اس عقیدہ کی بنیاد دقیانوسیت پر ہے اور تعلیم، مادّی ترقی اور تمدنی بلندی سے اس عقیدہ کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ غیر ترقی یافتہ قوموں میں یہ عقیدہ تو مستحکم ہے ہی لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں بھی نظرِ بد پر یقین قائم ہے۔ پچھلے ایک سو پچاس برسوں میں مغربی ممالک میں چشمِ بد پر عقیدہ بہت نمایاں رہا ہے۔ اور ہر طبقہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ اوروں کے علاوہ روم کے بعض پوپ کے متعلق یہ عام خیال تھا کہ ان کی نظریں بڑا اثر رکھتی تھیں۔ انگلستان کے شاعر لارڈ بائرن، فرانس کے شہنشاہ نپولین سوم اور موسیقار جیاکس فینک اور اسپین کے بادشاہ الفانسو تیرہ (۱۳) بھی بدچشم خیال کیے جاتے تھے۔ امریکہ میں آج بھی ہلال نما تعویذ کی کثرت سے مانگ ہے۔ موجودہ گریس، ہنگری اور آئرلینڈ میں اگر بچے کے متعلق شبہ ہو کہ اس پر نظرِ بد کا اثر پڑا ہے یا اس کی عقل یا خوبصورتی کی تعریف کی گئی ہے تو دیہاتی مائیں بچوں پر فوراً تھوکتی ہیں۔ جنوبی امریکہ اور مغربی ایشیا میں نظرِ بد پر عقیدہ بدستور قائم ہے۔

ہندوستان کی رسومات سے بھری فضا میں نظرِ بد پر یقین کو پھلنے اور پھولنے کا خوب موقع ملا۔ مذہب ہو یا تمدن، شہری فضا ہو یا دیہاتی ماحول، مادیت ہو یا روحانیت کوئی شعبہ اس یقین سے خالی نہیں۔ ہندوؤں کے مذہبی روایات کے متعلق شیو دیوتا کی ایک تیسری آنکھ تھی جو اپنی نظر سے دنیا کو تہہ و بالا کر سکتی تھی۔ شیو دیوتا نے اس آنکھ سے ایک بار کام دیوتا کو جلا کر خاک کر دیا۔ یہ تیسری آنکھ پیشانی کے بیچ میں دونوں بھوؤں کے ذرا اوپر تھی۔ ہندو عورتیں بندی اور مرد تلک اسی جگہ لگاتے تھے۔ آسام کے انگامی ناگا اس جگہ کو دوسروں کی نظرِ بد سے چھپانے کے لیے ایک پتے سے ڈھک لیتے ہیں۔ مقدس کتاب اتھروید جلد نمبر ۱۹ میں بُری نظر یا کو درشتی کی قسمیں اور اس کے انسداد کے نسخے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ چندن کی لکڑی جادو ٹونا کی کاٹ ہے۔ کالا بدنظر سے پیدا ہوئی بیماریوں کو دور رکھتی ہے۔ سونے، چاندی اور لوہے سے بنے تعویذ پہننے والوں پر نظرِ بد کا اثر نہیں ہوتا۔

ان مذہبی روایات کے مطابق دیوی اور دیوتا بھی نظرِ بد سے بری نہیں۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں جب انہوں نے اس کی طاقت ایک دوسرے یا انسان پر استعمال کی۔ انسان کی بے انتہا دولت اور خوبصورتی اس کی بے پایاں خوشی دیوتاؤں کے حسد کا موجب بنی۔ مندر میں دیوتا کی آرتی تقریباً روزانہ ہوتی ہے لیکن آرتی کی رسم بالخصوص اس وقت ہوتی ہے جب دیوتاؤں کو جلوس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے اور ان پر ہزاروں کی نظریں پڑتی ہیں۔

عام عقیدہ کے مطابق نظرِ بد کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل اکتسابی اور دوسری پیدائشی۔ اوّل قسم کا تعلق دماغ سے ہے یعنی یہ جان بوجھ کر کسی خاص مقصد یا جذبہ کے تحت استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم پیدائشی ہونے کے سبب قدرتی ہوتی ہے۔ یہ زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہے۔ ہندوستانی عوام دوسری قسم پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ جوتشیوں کے خیال میں جو بچے منحوس گھڑی میں پیدا ہوتے ہیں ان کی نظرِ بد قدرتی ہوتی ہے۔ اس لیے تعویذ اور گنڈے تیار کرتے وقت بچے کے پیدا ہونے کی صحیح تاریخ اور وقت ضرور معلوم کرتے ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس عقیدہ کی تہہ میں لالچ

تنا ہے۔ کانا آنکھ والوں کو دیکھ کر ضرور آنکھوں کی تمنا کرتا ہے۔ بانجھ عورت دُوسری عورت کے بچّوں کو دیکھ کر قدرتاً خوش نہیں ہوتی۔ بدصورت انسان خوبصورت شکل کو للچائی نظروں سے دیکھتا ہے۔ غریب بہت خوشحال کو دیکھ کر اُس کی دولت کی ضرور تمنا کرتا ہے۔ شادی کے موقع پر غلّہ اور پیسہ نچھاور کرنا اور دُولہا کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے سہرا باندھنا، چہرے پر کالا داغ لگانا ہماری کچھ رسُومات ہیں جن کا مقصد صرف نظرِ بد کا انسداد ہے۔

جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں کی شادی کے وقت دلہا دلہن کے سر پر ایک زیور رکھا جاتا ہے یہ سنہرے کاغذ میں لپٹا ہوا زیور نئے جوڑے کو چشمِ بد سے محفوظ رکھتا ہے۔ عام یقین کے مطابق جواں، خوبصورت اور حاملہ عورتیں نظرِ بد کی خصوصاً شکار ہوتی ہیں۔ اگر کسی بہو پر نظرِ بد کا گمان ہو تو پھر اس کی زندگی محال ہو جاتی ہے۔ والدین اپنے بچّوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے کئی ترکیبیں کرتے ہیں۔ حقیر دام پر کسی رشتہ دار کے ہاتھ بیچ دینا، اُسے پھٹے کپڑے پہنانا یا لڑکے کو لڑکی کا اور لڑکی کو لڑکے کا لباس پہنانا عام رواج ہے۔ بچّوں کو نفرت آمیز یا گندے نام سے پکارا جائے تو نظرِ بد کا اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے لڑکوں کو کوڑیا، کھدیڑن، گھسیٹا، دکھیا، پھینگا، جھینگر، بھیکو، بلاکی، نتھو اور لڑکی کو اندھری تنکوڑیا۔ دھوریا پھیا وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مدھیہ پردیش، مدراس، اور چھوٹا ناگپور کے کچھ علاقوں میں اس عقیدہ کا گہرا اثر ہے۔ پیداوار خراب ہو، گائے دودھ نہیں دے یا بچہ بیمار ہو تو فوراً اُسے نظرِ بد سے منسوب کیا جاتا ہے اس سے بچنے کے لئے گھر کی دیواروں پر خوفناک شکلیں بنانا گھر کے سامنے یا کھیت کے وسط میں جوتے یا جھاڑو ٹانگنا، مویشیوں کے سر پر سیندور لگانا مقبول رواج ہیں۔ دہلی جیسے شہر میں بھی زیرِ تعمیر مکانوں کے سامنے والے رُخ پر رنگوں سے بنی ڈراونی شکلیں اکثر ٹنگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ کہیں اس مکان کو نظر نہ لگ جائے۔

ہندوستان کی ملی جلی تہذیب جتنا اس عقیدے میں نمایاں ہے۔ شاید زندگی کے کسی اور شعبہ میں نہیں چشمِ بد سے بچنے کی ایک ہی طرح کی رسومات ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں پائی جاتی ہیں۔ تعویذ اور گنڈے پر ایک ہندو کو اتنا ہی یقین ہے جتنا ایک مسلمان کو اور ملک کے اکثر علاقوں میں ہندوؤں کو مسلمان سے لی گئی تعویذ پر اتنا ہی اعتقاد ہے جتنا مُسلمانوں کو پنڈتوں سے لی ہوئی تعویذ پر۔ امام ضامن کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کو پہننے والا نظرِ بد سے دُور رہے۔ قبائلی عیسائی صلیب پہن کر اپنے کو ہر آفت سے محفوظ سمجھتے ہیں۔

عوام نے چشمِ بد سے بچنے کے جو طریقے اپنائے اس کی تین قسمیں ہیں۔ اوّل وہ جن کا مقصد بُرے اثرات کو اپنی طرف رجوع کر کے اُن کو زائل کرنا ہوتا ہے۔ انہیں دیواروں پر نقش تحریر، گھر کے سامنے جوتے ٹانگنا مندروں اور رتھوں پر خوفناک شکلیں بنانا، مرچ جلانا، شادی کے موقع پر سہرا باندھنا مقبول طریقے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو تعویذ گنڈے وغیرہ کی شکل میں جسم کے مختلف حصّوں میں پہنی جاتی ہے عقیدے کے مطابق اُن کو پہننے والے پر نظرِ بد کے اثرات نہیں ہوتے۔ تیسری قسم مذہبی کتابوں سے لی ہوئی آیتیں اور منتر وغیرہ ہیں جو مختلف طریقوں سے استعمال ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنی رسومات، زندگی کے مختلف شعبے اور روزمرہ زندگی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کم و بیش اس عقیدہ کا اثر ہماری زندگی کے ہر موقع پر پڑتا ہے اور کبھی کبھی قسمت کے دھارے کو بھی موڑ دیتا ہے۔

کھِلنا کم کم کل نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم بازی سے
(میرؔ)

آفت کی سفیدی ہے قیامت کی سیاہی
نیرنگِ دو عالم مجھے دکھلا گئیں آنکھیں
(امیر مینائیؔ)

دیکھو تو چشمِ یار کی جادُو نگاہیاں
ہر اِک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے
(حسرتؔ موہانی)

نہ اور کھول ابھی نیم باز آنکھوں کو
ترے نثار یہ جادو ابھی جگائے جا
(فراقؔ گورکھپوری)



بنگال کا ایک قدیم تاریخی مقام

پانڈوا

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

مغربی بنگال کے ایک قدیم تاریخی مقام پانڈوا میں ہر سال جو میلا لگتا ہے اُسے "پیر کا میلا" یا "پیر میلا" کہتے ہیں چونکہ یہاں ایک صوفی کا مزار ہے اس میلے کی وجہ سے پانڈوا کا یہ محلہ "میلا تلا" یعنی میلے کی جگہ کہلاتا ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں ہندو اور مسلمان اس میلے میں جاتے ہیں خرید و فروخت کرتے ہیں اور ساتھ ہی صوفی کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔

بنگال کے چپے چپے پر سینکڑوں صوفیوں اور پیروں کے مزار ہیں۔ یہاں چند غازیوں کے مزار بھی ہیں جہاں ہندو اور مسلمان دونوں جاتے ہیں۔ چند مقامات کے نام بھی ان غازیوں کے نام سے وابستہ ہیں حالانکہ اب کئی نام اس طرح بگڑ گئے ہیں کہ اس کا پتا لگانا مشکل ہے کہ موجودہ نام کیوں کر پڑا ہے مثلاً چینی کلکتہ کے مقام گوڑیاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر، وہ موڑ جہاں سے ایک سڑک سونارپور کی طرف چلی گئی ہے اکا موجودہ نام بنگالی تلفظ کے مطابق "کمل گاچھی" ہے جو لفظ "کمال غازی" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کمال غازی کا یہاں مزار ہے اور اس مزار پر اب بھی علاقہ کے عقیدتمند ہندو مسلمان اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

تاریخ بنگال میں مزید ایسے غازیوں کا ذکر ہے اور اب بھی ان کے درگاہ اور مزار ہیں جہاں ہندو بھی جاتے ہیں اور احترام کرتے ہیں۔

پانڈوا — ضلع ہگلی، مغربی بنگال کا ایک ایسا قدیم تاریخی مقام ہے جس کی تاریخ کا ہمیں علم نہیں ہے۔ چند عالموں کے مطابق پانڈوا کا قدیم نام "پانڑو Panro" بسنت پور" Basant Pur ہے۔ شری ناگیندر ناتھ باسو رقمطراز ہیں کہ راجا "آدی سور" کے بعد پال راجاؤں نے گوڑ پر فتح پائی اور آدی سور کا بیٹا "پاہو سور" نے اس علاقے میں آکر اپنی سلطنت قائم کی اور یہ سلطنت "پانڈوا کہلائی" نیز پانڈوا اس سلطنت کا پایہ تخت قرار پایا۔ لیکن روایت یہ ہے کہ گوتم بدھ کے چچا امرتادن کے ایک بیٹے کا نام "پانڈوسکا" تھا۔ جو پانڈو راجا خاندان کا بانی ہے اور جس نے یہاں حکومت قائم کی تھی۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ مغربی بنگال میں پانڈوا نامی دو قدیم آبادیاں ہیں۔ ایک ضلع مالدہ میں اور ایک ہمارا یہ پانڈوا جو ضلع ہگلی میں واقع ہے۔ دونوں قدیم ہونے کے علاوہ تاریخی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔ آج کل ضلع ہگلی کا پانڈوا، چھوٹا پانڈوا کہلاتا ہے اور ضلع مالدہ کا پانڈوا،

بڑا پانڈوا، شری بنئے گھوش نے بالکل سچا لکھا ہے کہ "مغربی بنگال کے مسلمانوں کی تاریخ کی نشانیاں ضلع ہگلی کے پانڈوا، تروینی اور سپت گرام میں بہت سی ہیں اور سب ملا کر ضلع ہگلی کا یہ پورا علاقہ بنگال کے مسلمانوں کا ایک میوزیم بنا ہوا ہے۔"

آپ پانڈوا کے کسی بوڑھے سے دریافت کیجئے۔ ہر بوڑھا بڑی عقیدت سے پیر شاہ صوفی کا ذکر کرے گا چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان وہ آپ سے پیر کی کرامات کی سینکڑوں باتیں نہایت دلچسپی اور عقیدت سے بیان کرے گا۔ ایسی باتیں جن پر آپ مشکل سے یقین کریں گے۔ مثلاً مجھے ایک بوڑھے نے بتایا کہ شاہ صوفی کی درگاہ میں جو تالاب ہے، اُس میں پہلے بڑے بڑے مگرمچھ رہتے تھے۔ عورتیں جو شاہ صوفی کے مزار پر آکر گود بھرنے کی منت مانگتی تھیں اور یہ وعدہ کرتی تھیں کہ لڑکا ہونے پر وہ اُس لڑکے کو شاہ صوفی کی نذر کر دیں گی، ان کی گود ضرور بھرتی تھی۔ ماں بننے کے بعد مائیں پہلے بچے کو لے کر یہاں آتیں اور تین بار شاہ صوفی کو یاد کر کے بچے کو تالاب کے پانی میں چھوڑ دیتیں۔ کچھ دیر بعد ایک مگرمچھ آتا اور وہ بچے کو لے جاتا۔ ماں تالاب کے گھاٹ پر بیٹھی شاہ صوفی کو یاد کرتی رہتی کوئی گھنٹہ بھر بعد پھر وہی مگرمچھ نظر آتا جو اُس بچے کو واپس لے آتا اور بچے کے گلے میں پھولوں کا ہار ہوتا یعنی شاہ صوفی نے بچے کو دعا دی ہے۔ لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اس تالاب میں نہانے سے تمام امراض دور ہو جاتے ہیں، اور گناہ دھل جاتے ہیں۔ اس طرح کی سینکڑوں باتیں آپ پانڈوا کے بڑے بوڑھوں کی زبانی آج بھی سن سکتے ہیں۔ لیکن بوڑھے آخر کار ایک ٹھنڈی سانس لے کر افسوس سے کہیں گے کہ صاحب لوگوں نے اس تالاب کو ناپاک کر دیا ہے۔ اب نہ تالاب کے پانی میں وہ خوبیاں ہیں اور نہ وہ مگرمچھ۔

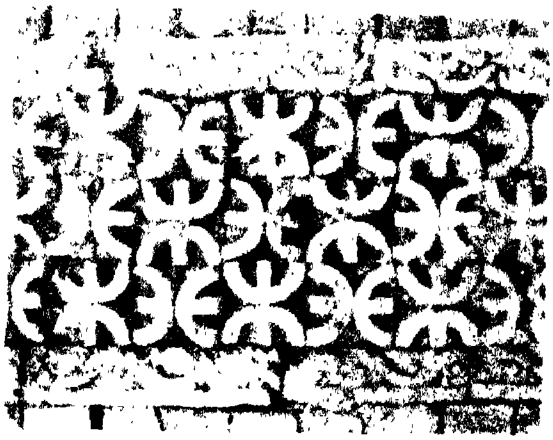
پانڈوا — ہوڑہ (کلکتہ) سے صرف ۴۲ میل کی دُوری پر ہے اور لوکل ٹرین سے کوئی ۱½ گھنٹے کا سفر ہے۔ پانڈوا میں اب دیکھنے کے لائق جو تاریخی عمارات ہیں اور جنہیں دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں وہ ہیں پانڈو راجا کا راج محل، پانڈوا کا مینار، شاہ صوفی کا مزار اور وہاں کی مسجد۔ حکومتِ ہند نے تاریخی مقامات کے تحفظ کے تحت یہاں کی ذمہ داری قبول کی ہے اور اب یہاں حکومت کے نگراں مقرر ہیں۔ کون جانے کس پانڈو راجا نے یہ عالی شان راج محل بنوایا تھا جسے آج لوگ ۲۲ دروازے کا محل کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے دروازوں کی تعداد ۲۲ ہے۔ حالانکہ اب ایک دروازہ بھی مکمل طور پر صحیح سلامت نہیں ہے۔ لیکن اینٹوں اور پتھروں پر مشتمل یہ کھنڈر زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ کسی زمانے میں اُن کی کیا شان رہی ہوگی۔ کون



پانڈوا کے راج محل کا ایک حصہ

جانے وہ کون سا پانڈو راجا تھا جس کے شاہی تخت کا پتھر اب بھی عمارت کے درمیانی حصے میں موجود ہے۔ اس ۲۲ دروازہ محل کی دیواروں کی چوڑائی ۱۶ تا ۱۸، اینٹوں کی ہے اور صحن کے درمیانی حصے میں دو ستونوں کے قطار تھے جو اب سب کے سب ٹوٹے پڑے ہیں۔ کئی ستون جو کالے پتھروں کے ہیں اب محل کے ایک کونے میں جما کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ چند ایک اب بھی اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ کالے پتھروں کے ان ستونوں کو ایک دوسرے کو لوہے کے ذریعے جوڑا گیا تھا۔ لوہے کی کیل ستونوں کے درمیانی حصے میں ہیں۔ یہ بڑے بڑے کالے کالے بہترین پتھر

نہ معلوم کہاں سے لائے گئے تھے۔ ان ستونوں کے نقش و نگار، گل بوٹے اور مندر کی گھنٹیاں وغیرہ ہند و فنِ تعمیر اور تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ عمارت کی تعمیر میں جن اینٹوں کا استعمال ہوا اور اس سے جو کاریگری کی گئی ہے وہ خالص بنگال کی کاریگری ہے۔ بنگال کا مشہور ٹراکوٹا آرٹ کے جو نقش و نگار ان اینٹوں سے بنائے گئے ہیں وہ بنگال کے ان نامعلوم عظیم فن کاروں کی یاد کو تازہ کر دیتے ہیں اور دیکھنے



پانڈوا کی دیوار وں پر مشہور آرٹ ٹراکوٹا کا کام

والا چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ فنِ تعمیر میں گل بوٹوں کا کام قدیم اور قبل تاریخ کے دور ہی سے مختلف ممالک میں ہوتا رہا ہے۔ کنول کے پھول تو مصر کی قدیم عمارات میں بھی پائے گئے ہیں اور زمانہ ماقبل تاریخ میں بھی ایسے گل بوٹوں کی کاریگری کو مصر، روم اور ہندوستان اہمیت حاصل رہی ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بنگال میں اینٹوں سے مندر اور محل بنانے والوں نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا اور اس کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔

شاہی محل سے چند قدم پر پانڈوا کا مشہور مینار ہے۔ اس مینار کو اب لوگ شاہ صوفی کا مینار کہتے ہیں لیکن گمان غالب ہے کہ یہ مینار شاہ صوفی کے دور سے بہت زیادہ قدیم ہے اور اس کی تعمیر بھی پانڈوا کے ہندو راجاؤں میں سے کسی نے کی ہوگی۔ مینار کے دروازے



پانڈوا کا مشہور مینار شاہ صوفی کا مینار

پر بھی بالکل وہی ستون ہیں اور وہی نقش و نگار ہیں، جو اس سے قبل ہم شاہی محل میں دیکھ آئے ہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل کرافورڈ رقمطراز ہیں کہ "پانڈوا کا یہ مینار بنگال میں گچ کاری کا سب سے قدیم نمونہ ہے"۔ تاریخ بنگال کے مطابق بنگال کے ہندو راجے طلوعِ آفتاب کو دیکھنے اور آفتاب کا خیر مقدم کرنے یا پوجا کرنے کے لئے ایسے اونچے اونچے مینار تعمیر کیا کرتے تھے۔ پانڈوا کے ہندو راجاؤں نے پانڈوا کے قریب ایک مندر کے اطراف کئی مینار تعمیر کئے تھے جن میں سے مسلم دورِ حکومت کے بعد صرف یہی ایک مینار رہ گیا ہے جسے آج شاہ صوفی کا مینار کہا جاتا ہے۔ لیکن ایسٹ ایشیا سوسائٹی کے مسٹر بلانج مین کی رائے ہے کہ یہ مینار مؤذن کے اذان دینے کے کام آتا رہا ہے بہرحال اگر یہ مینار شاہ صوفی نے تعمیر کیا ہو تب بھی انہوں نے اس کی تعمیر میں راج محل کے ستونوں اور اینٹوں کو استعمال کیا ہے۔ پانڈوا کا یہ مینار جو دہلی کے قطب مینار سے مطابقت رکھتا ہے اب ۱۲۷ فٹ بلند ہے لیکن کہتے ہیں کہ اس کی اصل بلندی ۱۲۵ فٹ تھی اور ۱۸۸۵ء کے زلزلے میں اس کا کچھ حصہ زمین میں دھنس گیا ہے۔ اس پانچ منزلہ مینار پر چڑھنے کے لئے ۱۶۱ سیڑھیاں ہیں۔

اس کے بعد شاہ صوفی کا مقبرہ اور تالاب ہے جہاں آج

بھی سیکڑوں عقیدت مند زیارت کرنے جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے پانڈوا مشہور رہے۔ مزار کا ذکر کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ شاہ صوفی اور اُن کے کارناموں پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ شاہ صوفی کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ اُن کی تاریخی اہمیت کیا ہے؟ — یہ تمام باتیں آج تک دُھندلکے میں ہیں۔ لیکن مختلف حکایات اور روایتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت پوشیدہ ہوگی، لہٰذا اس سلسلے میں مروجہ داستانوں اور روایتوں کو نقل کرتا ہوں۔

محمد انعام الحق مصنف بنگلہ تصنیف "بنگال پر صوفی اثر" رقمطراز ہیں: "غالباً اتنی بھاری تعداد میں بنگال کے اس حصے میں درویشوں کی آمد کی وجہ سے یہاں آج مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ بنگال کے سب سے قدیم درویش و صوفی اس علاقے (بنگال) میں آتے رہے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں اور بارہویں صدی میں بھی کئی صوفی و درویش اس علاقے میں اسلام کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر سینی کمار چیٹرجی کا بھی یہی خیال ہے۔ ہاں چند واقعات ایسے بھی ہیں کہ صوفیوں کے بھیس میں مسلم بادشاہوں نے جاسوسوں کو بھی بھیجا ہے۔ ڈاکٹر چیٹرجی اور مسٹر ٹیل جیسے عالم، محقق، اور تاریخ داں اس بات پر متفق ہیں کہ دہلی کے چند مسلم سلطان ایسے رہے ہیں جنہوں نے دہلی سے اپنے کسی جاسوس کو درویش یا صوفی کے بھیس میں بنگال کے کسی ہندو راجا یا بڑے زمیندار کے علاقے میں جاسوسی کرنے اور ہندو راجا کی طاقت کا سراغ لگانے کے لئے بھیجا۔ یہ نام نہاد درویش جاسوسی کرتے اور ہندو راجا کے دربار نیز فوج کا حال معلوم کرتے پھر موقع کی تلاش میں رہتے کہ کس طرح ریاست میں کوئی ہنگامہ برپا کیا جائے۔ پھر کوئی بہانہ گھڑ کے وہ شاہ دہلی کے دربار میں جاتے اور بادشاہ اس بہانے بھاری فوج روانہ کرکے اس چھوٹے راجا یا زمیندار پر حملہ کر دیتا اور جاسوس کی مدد سے جو پہلے ہی سے جال پھیلائے رکھتا تھا۔ شاہی فوج بڑی آسانی سے راجا کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی۔ اس طرح کئی چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستوں کو دہلی کے بادشاہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔"

مذکورہ حالات کی روشنی میں اب اُن داستانوں پر غور کریں جو شاہ صوفی کے سلسلے میں مشہور ہیں۔ پہلی کہانی میں نے پانڈوا کے کئی بوڑھوں نیز عالم صاحب جو وہاں کے میلے کے منتظم ہیں کی زبانی سنی ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یہاں پانڈون نامی ایک راجا تھا جس کے راج میں قربانی ممنوع تھی۔ ایک بار ایک شخص نے اپنے بیٹے کے "اَن پراسن" (وہ رسم جو بچے کو پہلی بار کھانا کھلانے کے سلسلے میں ادا کی جاتی ہے) میں لوگوں کی دعوت کی اور ایک بچھڑے کی قربانی کی۔ اس بات کی خبر پاکر راجا غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور اس نے اُس شخص کو یہ سزا دی کہ اُس کے سامنے اس کے ننھے بچے کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ غریب باپ کسی طرح بھاگ کر دہلی آگیا اور شاہ دہلی کے دربار میں انصاف کے لئے فریاد کی۔ تب شاہ دہلی جس کا نام داستان کے مطابق فیروز شاہ ہے، نے اپنے بھائی کے بیٹے شاہ صوفی کو بہت بڑی فوج دے کر پانڈوا فتح کرنے کے لئے روانہ کر دیا، لیکن جنگ میں شاہ صوفی کے ہزاروں سپاہی مارے گئے اور اُن کی جیت کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس موقع پر جب شاہ صوفی شکست کے قریب تھے۔ ایک مقامی گوالا جس کا نام شری بنئے گھوش (مصنف بنگلہ تصنیف "مغربی بنگال کا کلچر") کے مطابق نگر گھوش ہے، شاہ صوفی کے پاس گیا اور اس نے بتایا کہ مہاند (یہ مقام پانڈوا سے ۵، ۶ میل کے فاصلے پر ہے اور اب بھی وہاں قدیم شیوجی کا مندر ہے جو اُس مشہور تالاب کے کنارے ہے) کے راجا کا جو تالاب ہے اُس تالاب میں دیوتا رہتے ہیں۔ اور اس کے پانی میں یہ خوبی ہے کہ مردے زندہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے راجا کی فوج کا کوئی سپاہی مرتا ہی نہیں ہے۔ کیونکہ راجا اس تالاب کے پانی کو استعمال میں لا رہا ہے، لہٰذا اگر شاہ صوفی فتح پانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے مہاند کے اس تالاب کے پانی کو ناپاک کرنا ہوگا۔ شاہ صوفی نے نگر گھوش کو مالا مال کر دیا اور اُس نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر نگر گھوش بھیس بدل کر گیا اور اس تالاب پر نہاتے ہوئے ایک غوطہ لگایا اور کسی طرح تالاب کا پانی ناپاک کر دیا اور دیوتا تالاب سے رخصت ہو گئے۔ پانی کا اثر جاتا رہا۔ راجا کے سپاہیوں نے نگر گھوش کو گرفتار کر لیا جو ایک سادھو کے لباس میں تھا۔ کہتے ہیں کہ شاہ صوفی نے نگر گھوش کو چند کرامات

سکھائی تھیں لہذا جب نگ گھوش کو گرفتار کر کے راجا کے دربار میں لایا گیا تو وہ ایک پرندہ بن کر اڑ گیا۔ راجا کے تیر اندازوں نے اسے تیر کا نشانہ بنا ڈالا اور نگ گھوش مر گیا۔ خیر نگ گھوش تو جان سے گیا لیکن چونکہ تالاب کا پانی ناپاک ہو چکا تھا لہذا شاہ صوفی کے لئے راستہ صاف ہو گیا اور وہ لڑائی جیت گئے۔ اور پھر انہوں نے پانڈوا کا مشہور مینار تعمیر کیا۔ یہ پانڈو راجا کی وہ داستان ہے جو نہایت مشہور ہے اور جسے چند بنگالی مسلم شعرا نے بھی قلم بند کیا ہے مثلاً شانتی پور کے محی الدین آستاگر کا "پانڈوا گیھا" یعنی پانڈوا کا قصہ اس سے ملتے جلتے ایک دو واقعات اور مشہور ہیں۔

جناب محمد انعام الحق مصنف "بنگال میں صوفی ازم" کے مطابق شاہ صوفی کا نام شاہ صفی الدین شہید رحمۃ ہے اور آپ "برخور دار" نامی دہلی کے کسی امیر کے بیٹے تھے۔ نیز وہ جلال الدین فیروز شاہ (۱۲۹۰ء تا ۱۲۹۵ء) کے بھتیجے تھے۔ ضلع ہگلی کے گاؤں مہاناد (یہ مقام پانڈوا سے تقریباً ۵ میل ہے) میں ایک راجا بنام پانڈو کی حکومت تھی۔ تب وہ وہاں مقیم تھے اور یہیں ان کے بیٹا پیدا ہوا۔ کسی بات سے راجہ ناراض ہو گیا اور اس نے صوفی کے بیٹے کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد صوفی دہلی گئے اور فریاد کی اور اپنے ماموں جلال الدین شاہ دہلی سے فوج لے کر اپنے بیٹے کا بدلہ لینے کے لئے وہ پانڈو روانہ ہوئے۔ صوفی خود بھی اس جنگ میں شہید ہو گئے لیکن مسلمانوں نے ظفر خان کو سپہ سالار بنا کر جنگ جاری رکھی اور آخر کار پانڈوا پر قبضہ کر لیا۔ انہیں شاہ صوفی کا مزار آج بھی پانڈوا میں ہے۔

ان داستانوں میں کتنی حکایت ہے اور کتنی سچائی، کہنا محال ہے چونکہ شاہ صوفی کا ذکر کسی نامور مورخ نے نہیں کیا ہے اور تمام روایتیں محض داستانیں ہی ہیں۔ چونکہ ہر داستان میں شاہ صوفی کا شاہ دہلی سلطان فیروز شاہ سے کوئی نہ کوئی رشتہ بتایا گیا ہے لہذا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ان میں کسی نہ کسی قسم کی کوئی قرابت مندی ہو۔

لیکن آج بھی پانڈوا میں ہزاروں لوگ اس گمنام ہندو راجا کا ۲۲ دروازہ راج محل کا کھنڈر، شاہ صوفی کا مینار، مزار، تالاب اور پانڈوا کی قدیم مسجد دیکھنے جاتے ہیں۔ عقیدت مند شاہ صوفی کے مزار پر پھول چڑھاتے اور منتیں مانگتے ہیں خوب دھوم دھام سے میلا لگتا ہے اور ایک ماہ تک یہ میلا لگا رہتا ہے۔ مسلمان تالاب میں وضو کرنے کے بعد مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں۔ مزار نہایت ہی عالی شان ہے۔ گھاٹ کے کنارے ایک مسافر خانہ ہے۔ مزار کے پیچھے دو کالے پتھر ہیں جن پر عربی میں کچھ کندہ ہے (میں عربی سے ناواقف ہوں اور ان کتبوں کی تصاویر لینے کی مزار والوں نے اجازت نہیں دی) میرا خیال ہے کہ اگر راج محلوں کے اطراف کے قدیم تالابوں کو خشک کر کے کھدائی کی جائے تو اس زمانے کی بہت سی ایسی چیزیں مل سکتی ہیں جس سے پانڈوا کی قدیم تاریخ پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

شاہ صوفی کے مینار سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر یہاں سب سے قدیم مسجد ہے جسے پڑھے لکھے لوگ "غازی مسجد" کہتے ہیں لیکن عام طور پر جسے جنات کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اب یہ مسجد ویران



پانڈوا کی قدیم مسجد یعنی غازی مسجد عرف جنات کی مسجد

اور شکستہ حالت میں ہے۔



اظہار رامپوری

ہوا سوزِ دروں سے جل کے دل خاک
چلو اچھا ہوا خس کم جہاں پاک
[illegible] بیٹھے مرا دامن ہے کیوں چاک
بس اللہ دے توفیقِ ادراک
حیات و موت کا اب کیا ہمیں باک
محبت نے یہ قصہ کر دیا پاک
جنوں ہے شوقِ تعمیرِ نشیمن
مری تقدیر میں خس ہے نہ خاشاک
تمنا دل کو ہے اس شعلہ رو کی
کہاں جلوہ کہاں اک ذرۂ خاک
نظر میں برہمی لب پر تبسم
وہ کر دیتے رہے ہیں زہر و تریاک
مٹا ڈالا وفا میں دل کو اظہارؔ
جنوں میں لاکھ کا گھر کر لیا خاک

ناظر انصاری جلگانوی

معدنِ فکر و تدبر کے گہر بھی دیکھو
عیب ہی دیکھتے رہتے ہو ہنر بھی دیکھو
حسن تو دیکھ چکے حسنِ نظر بھی دیکھو
اے مسیحا نفسو! زخمِ جگر بھی دیکھو
ایک ہی رخ پہ نظر اس کے نہ ڈالو ہرگز
زندگانی کو بعنوانِ دگر بھی دیکھو
کیوں ہراساں ہو مرے ہم سفرو ظلمت سے
شب کی آغوش میں تنویرِ سحر بھی دیکھو
تم تو امواجِ حوادث ہی سے ڈر جاتے ہو
ظلمتِ بحر میں تخلیقِ گہر بھی دیکھو
شومیٔ بخت کے شاکی نہ رہو اے ناظرؔ
دستِ محنت کا زمانے میں ثمر بھی دیکھو

ہوش عظیم آبادی

اب تک تو اعترافِ شکست نظر نہیں
کل کیا کریں گے آپ کے جلوے خبر نہیں
اے زندگی ہوشؔ! یہ قسمت کی بات ہے
میں گھر کا ہو رہا ہوں مگر میرا گھر نہیں
صیاد کے خلوص نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں وہی مگر وہ غمِ بال و پر نہیں
بے ساختہ کسی سے یہ تصادم نگاہ کا
ہے مختصر سی بات مگر مختصر نہیں
رونا ہے تا بہ عمر تو اشکوں کی قید کیا
اس پر نہ جائیو کہ مری چشم تر نہیں
مدت ہوئی کہ ہوشؔ زمانہ بدل گیا
اب درخورِ نگاہ یہ جنسِ ہنر نہیں



کاظم مظفر پوری

دیئے پھر آنسوؤں کے جل رہے ہیں طاقِ مژگاں
زمانہ دم بخود ہے پھر مرے جشنِ چراغاں
میں اپنی آستیں سے اپنے آنسو خشک تو کر لوں
مگر ڈر ہے کہ الزام آ نہ جائے تیرے داماں
مرے پتوار کی عظمت سے دریا خوب واقف ہے
طمانچوں کے نشاں ہیں آج بھی رخسارِ طوفاں
حقارت سے ہمیں دیکھو نہ ہرگز اے چمن والو
ہمارا بھی نشیمن تھا کبھی شاخِ گلستاں
عجب انداز سے پھر یاد تیری جاگ اٹھی ہے
ہنسی بھی لب پہ ہے آنسو بھی ہیں دامانِ مژگاں
جسے پڑھ پڑھ کے کاظمؔ ہر مفکر نقشِ حیرت ہے
لکھی ہے عشق نے تاریخ اک خاکِ بیاباں



محسن کاکوروی

غلام احمد فرقت

ایک ایسا شاعر جس نے زندگی بھر نہ کسی عورت سے عشق کیا ہو، نہ کسی کی بہو بیٹیوں کو نگاہ اٹھا کر دیکھا ہو اگر آپ مجھ جیسے رند مشرب انسان سے کہیں کہ اس پر ایک مضمون لکھ دو تو وہ مضمون بہ اعتبار جاذبیت اور کشش کسی کے شجرۂ نسب سے زیادہ حیثیت نہ رکھے گا جسے پڑھنے کے لیے اگر آپ کسی کو پیسے بھی دیں تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ حضور! ہم زندگی سے لاکھ بیزار سہی مگر اتنے بھی بیزار نہیں۔

فقرا اور ادبا کے بارے میں میں ایک عرصہ تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ یہ دو علاحدہ علاحدہ الفاظ ہیں مگر اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اپنی رائے بدلنا پڑی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ دونوں الفاظ بڑی حد تک ہم معنی اور ایک ہی چیز کے دو نام ہیں چنانچہ ولی دکنی سے لے کر موجودہ دور تک اگر آپ نظر دوڑائیں تو آپ کو [illegible] محسوس ہوگا کہ اردو میں جتنے بڑے بڑے ادیب گذرے ہیں ان میں سے چند کو چھوڑ کر سارے کے سارے فقرا اور مفلوک الحال تھے۔ ان میں کچھ ایسے شعرا اور ادیب تھے جن کی بیویوں نے ان کی بیکاری سے تنگ آکر انہیں گھر سے نکال دیا تھا اور انہوں نے پیشہ حبیب اللہ سمجھ کر فقیری اختیار کر لی اور کچھ جن کی فقیری نہیں چل پائی انہوں نے ادب اور شاعری میں آکر پناہ لی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کی بیشتر بستیاں انہی شعرا، ادبا اور فقیروں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ چونکہ فقرا اور درویش زیادہ تر گوشہ نشین ہوتے ہیں اور ان مقامات پر رہتے ہیں جہاں آبادی کم ہو اسی لئے ہندوستان کے بہت سے قصبات فقرا، ادبا اور علما کی وجہ سے مشہور ہیں۔ مثلاً اتر پردیش میں کاکوری، امیٹھی، سندیلہ، بجنور، ردولی، جگور، خیرآباد، بارہ، موہان، گوپامئو، بلگرام وغیرہ وغیرہ۔ کچھ قصبات اپنے طبیبوں، درویشوں اور شاعروں کی وجہ سے مشہور ہیں اور کچھ اپنی بعض اشیا یا اپنے باشندوں کے خصوصی کردار کے تحت زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ مثلاً ملیح آباد اپنے آموں اور پٹھانوں کے علاوہ حضرت فقیر محمد گویا، جوش ملیح آبادی اور عبدالرزاق ملیح آبادی کے سبب ایک خاص شہرت کا مالک ہے۔ دیوا شریف حضرت حاجی وارث علی شاہ اور بیدم شاہ وارثی کے علاوہ اپنے میلے کے لئے مشہور ہے۔ اسی طرح کاکوری حضرت تراب علی شاہ قلندر، حضرت محمد کاظم قلندر، حضرت نور قلندر، سعدی کاکوری، محسن کاکوروی اور نادر کاکوروی، کے علاوہ اپنے کبابوں اور [illegible] ڈکیتی کے لئے مشہور رہے۔ مگر شروع سے آخر تک ان تمام بستیوں اور قصبات میں آپ کو ایک چیز ضرور مشترک ملے گی اور وہ ہیں وہاں کے ادیب اور درویش۔ کاکوری کو ان تمام قصبات پر ان معنوں میں بھی ایک خاص فوقیت حاصل ہے کہ یہاں تکیہ شریف کے جو سجادہ نشین گذرے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر بلند پایہ شاعر بھی ہیں مثلاً شاہ تراب علی قلندر جو تراب تخلص

تھے اور جن کے دوہے، گیت اور نظمیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس سرزمین کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ سیاسی ڈکیتی میں بھی جو لوگ شریک تھے ان میں اشفاق اللہ خاں شہید، رام پرشاد بسمل، سمت ناتھ گپت، سچندر ناتھ سانیال جیسے شاعر، ادیب اور صحافی شریک تھے جو ملکی سیاست میں ایک خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ تمام قصبات اپنے اپنے شعراء ادباء اور علماء کی یادگار رہنا کر اپنے علمی اور ادبی جواہر پاروں کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اُردو کے نعت گو شعراء میں جو مقام علامہ محسن کاکوروی کو حاصل ہے وہ کسی نعت گو کو نصیب نہ ہو سکا۔ اور بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی باطنی لطافتوں اور خوبیوں میں میر درد دہلوی مرحوم کے صحیح سجادہ نشین تھے۔ باوجود ایک ممتاز وکیل ہونے کے انہوں نے کبھی کسی جھوٹے مقدمہ کی وکالت نہیں کی۔

میری نانی صاحبہ (جو اُن کی حقیقی بھانجی تھیں) نے اُن کے بارے میں ایک ایسی روایت بیان کی کہ ایک کمزوری جو ہر شادی شدہ مرد سے عبارت ہے وہ اُن میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی یعنی یہ کہ وہ دنیا میں اگر کسی سے ڈرتے تھے تو وہ اُن کی زوجہ محترمہ تھیں مگر وہ اس معاملے میں قابلِ معافی تھے۔ کیونکہ کسی شوہر کو آج تک ایسی بیوی میسر نہیں ہوئی جو اپنے شوہر کی صلاحیت کا احترام کرتی چنانچہ بڑے بڑے شوہروں کو آج تک راقم الحروف نے اپنی بیوی کے سامنے سوالیہ جملہ کا نشان ہی بنا ہوا دیکھا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں جب ملک میں ایک زبردست انتشار پیدا ہوا اور بڑے بڑے شرفاء، ادباء اور ذی علم حضرات کو اپنی عزت و آبرو بچانے کی خاطر مع اہل و عیال ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا تو علامہ محسن کاکوروی جو اُن دنوں آگرہ میں پریکٹس کرتے تھے مجبور ہو گئے، اور اپنے اہل و عیال کو لے کر اپنے وطن مالوف کاکوری کا رُخ کیا۔ اس زمانے میں چونکہ سڑکیں غیر محفوظ تھیں اور ذرائع آمد و رفت میں وہ سہولتیں نہ تھیں جو آجکل لوگوں کو حاصل ہیں۔ اس لئے بیل گاڑیوں پر یہ اپنے اہل و عیال کو لیکر کاکوری روانہ ہوئے۔ اسی زمانہ میں اُن کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی اور بیوی زچہ خانہ میں ہی تھیں کہ اُن کو یہ سفر اختیار کرنا پڑا۔

میرے حقیقی ماموں جو علامہ محسن کے انتقال کے وقت کاکوری مڈل اسکول کی کسی ابتدائی جماعت میں پڑھتے تھے اُن کا بیان ہے کہ اچھے بابا مرحوم (علامہ محسن) کو پتنگ بازی سے بڑی دلچسپی تھی اور گرمیوں کی چھٹیوں میں جب کچہریاں بند ہو جاتیں تو وہ دس پانچ دن کے لئے کاکوری ضرور آتے۔ اُن کی آمد کی خبر سن کر محلے کے بچے مارے خوشی کے بغلیں بجانے لگتے کیونکہ وہ گھر اور محلے کے تمام لڑکوں کو دو دو آنے پیسے، ایک ایک ڈور کا گولا اور دو دو پتنگ دیتے جب کوئی اعتراض کرتا تو فرماتے کہ پتنگ بازی سے آنکھ کی بینائی بڑھتی ہے۔ پتنگ لڑاتے وقت بچوں سے کہتے کہ ڈور پر درود شریف پڑھ کر پتنگ اُڑایا کرو جتنی بار درود شریف پڑھو گے اُتنے ہی پیچ کاٹو گے۔ اگر کسی لڑکے کی پتنگ کٹ گئی تو کہتے کہ معلوم ہوتا ہے فریق مخالف نے کٹنے والے سے زیادہ بار درود پڑھا تھا اس لئے پتنگ کٹ گئی یہ بھی عجیب بات ہے کہ اُردو ادب میں بعض مشاہیر سخن ایسے گذرے ہیں جن کو پتنگ بازی کا بے حد شوق تھا چنانچہ مولانا حسرت موہانی مرحوم جب بھی اپنے وطن موہان جاتے تو ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنے بچپن کی یاد میں پتنگ ضرور اُڑاتے اور یہی روایت علامہ بیخود دہلوی کے بارے میں مشہور ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ فقراء ادباء اور شعراء میں ہمیشہ سے مفلسی و ناداری میں ایک جنس مشترک رہی ہے۔ چنانچہ حضرت محسن کاکوروی نے وکالت کے پیشہ میں اگرچہ لاکھوں کمائے مگر خیرات میں اسے صرف کر کے ایک روحانی کیف محسوس کرتے رہے اور شاہی میں فقیری کے مزے لوٹتے رہے۔ مرنے سے بارہ چودہ سال قبل مشہور ہے کہ کسی موکل نے ان پر جادو کر دیا تھا جس سے اُن کی حلق سے پوری آواز نکلنا بند ہو گئی تھی چنانچہ اُن کو وکالت کا پیشہ ترک کر دینا پڑا۔

پوری بستی میں وہ "اچھے بابا" کے نام سے مشہور تھے اور سیکڑوں بیواؤں یتیموں اور مسکینوں میں مٹھی بھر بھر کر روپے اور گنیاں تقسیم کرتے رہے۔ اُن کی بیوی حساب سے اس درجہ نابلد تھیں کہ گنتی تک نہ جانتی تھیں اس لئے وہ محتاجوں کو بجائے گن کر روپیہ دینے کے مٹھیاں بھر بھر کر روپے تقسیم کرتی تھیں۔ حضرت محسن کی ساری زندگی دولت کو ہاتھ کا میل سمجھتے گذری

اچھا ہوا وہ اس ہورڈنگ کے دور میں نہیں پیدا ہوئے ورنہ ان کو سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ ان کے یہاں (۱۷) سترہ بچے ہوئے جن میں کل چار اولادیں زندہ رہیں۔ لڑکوں میں علامہ نور الحسن نیر بی اے ایل ایل بی اور مولوی انوار الحسن علوی بی اے ایل ایل بی اور دو لڑکیاں تھیں۔

جہاں تک اُن کے کلام کا تعلق ہے وہ شروع سے آخر تک حمد و نعت میں رچا بسا ہے اور قصائد اور مثنوی دونوں میں انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ انہیں پڑھئے اور سر دھنیے۔ اُردو شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں بڑے بڑے متقی اور صوفی شعرا نے شیخ اور محتسب کا مذاق اڑایا ہے حتیٰ کہ میر درد جیسے صوفی اور خدا پرست شاعر تک کو بھی کہنا پڑا۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اردو شعراء شیب و شباب زیادہ میں اب تک کبھی کبھی بیٹھی آہیں اور پھیکے نالے اپنے اپنے کلام میں پیش کر چکے ہیں مگر اس میں علامہ محسن کاکوروی کے اس شعر کا آج تک جواب نہ ہو سکا۔

حالت نہ پوچھئے مرے شیب و شباب کی
دو کروٹیں ہیں عالمِ غفلت میں خواب کی

جناب حسرت نے عمر جاوداں حاصل کرلی اور شعرائے کرام محبوب کو یاد کرنے کی غرض سے عمر جاوداں کے طالب رہے مگر علامہ محسن کاکوروی نے عمر جاوداں کی طلب کے ساتھ ایک ایسی شرط لگا دی کہ شب فراق اور شامِ انتظار دونوں کے جنازے نکل گئے۔ فرماتے ہیں۔

شبِ فراق نہ ہو تیرا انتظار نہ ہو
تو ہم بھی فکر کریں عمرِ جاوداں کیلئے

علامہ محسن کا ایک مشہور قصیدہ نعتِ رسول میں ہے جس کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے۔

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

اس کے بعد تشبیب میں متھرا، گوکل، کنھیا اور گوپیوں کا ذکر ہے اور گریز تک اسی قسم کے اشعار کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے۔ اس کی تشبیب کے کچھ اشعار آپ بھی سنتے چلئے۔

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ عمل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

دیر کا ترسا بچہ ہے برق لے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لئے آگ میں جل

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

دیکھئے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دلِ گوپیوں کا ہے بیکل

راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اب کے میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

تہ و بالا کئے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل

شاہدِ کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگٹ
چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کا جل
جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمل

قصیدے میں مذکورہ بالا تشبیب کے اشعار پڑھ کر کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی نعتیہ قصیدے کے تشبیب کے اشعار ہو سکتے ہیں کیونکہ اس میں متھرا، گوکل، کنہیا اور گوپیوں اور ہندوؤں کے اُن میلے ٹھیلوں کا ذکر ہے، جن کا براہِ راست تعلق ہندو مذہب اور اس کے رسم و رواج سے ہے اور اردو ادب میں شاید یہ پہلا اور آخری قصیدہ ہے جس میں بجائے محبوب کے سراپے یا بہار کی آمد نظم کرنے کے حضرت محسن نے اپنی مذہبی رواداری اور تمام مذاہب کے یکساں احترام کا ثبوت دیا ہے۔ اور سب سے زیادہ عجیب چیز جو اس سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہند کے ان میلے ٹھیلوں اور بہاروں کا انہوں نے نہایت عمیق مشاہدہ کیا ہے۔ بڑھوا منگل اس منگل کو کہتے ہیں جس میں مہابیرجی کے پجاری اور عقیدت مند دُور دُور سے آتے ہیں اور مہابیرجی کے مندروں میں جا کر اپنی دلی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس تشبیب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اسلامی تصوف اور ہندی تخیل کا ایک سنگم نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ

"جو لوگ سری کرشن کی داستانِ عشق اور اس رومانی فضا سے آشنا ہیں جو اُن کے وجود سے برج کے علاقہ میں موجود تھی، وہ اس کی تاثیر کو خوب محسوس کرتے ہوں گے۔ ہمارے ناقدین نے ہماری عام شاعری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ہندوستان میں رہ کر بھی ہمارے شاعروں کا تخیل عرب کے بے برگ و گیاہ صحراؤں اور ایران کے "نغمہ زار، سبزہ زار و جوئبار" میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ وہی تشبیہات استعارات اور تلمیحات جو متقدمین شعرائے فارس کے یہاں عام ہیں، وہی ان کا ورثہ ہیں، لیکن چونکہ ان کا تعلق براہِ راست ایران کی سرزمین، تاریخ یا خاص ایرانی تہذیب و معاشرت سے ہے، اس لئے ہندستانی شاعری کو بے مزہ بنا دیتے ہیں۔ سری کرشن کی داستانِ حیات رومان و محبت کی کہانی ہے لیکن اس میں ابتذال رکاکت، اور سوقیانہ حالات و واقعات کا شائبہ نہیں بلکہ ہر جگہ خلوص و عقیدت، مذہبیت اور احترام کی جھلک زیادہ ہے، چونکہ ہندوستانی عام طور پر اس قصہ سے واقف ہیں، اور بعض رسمیں اور تہوار ابھی تک اُن پرانے واقعات کی یاد تازہ کرنے کے لئے منائے جاتے ہیں، اس لئے تشبیب میں ان کے ذکر سے رومانی فضا پیدا ہو گئی ہے جو اثر سے لبریز ہے۔ کسی اور مضمون سے یہ کیفیت یا تشبیب میں یہ زور پیدا کرنا مشکل ہے۔"

مضمون کے اعتبار سے اس قصیدے اور محسن کی شاعری کے دوسرے کارناموں کو پرکھئے تو ان میں سب سے ممتاز صنف جدت کی نظر آئے گی۔ ہماری شاعری بالعموم تقلیدی ہے اور ہمارے شاعر تقلیدی آرٹسٹ۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ غرض ہر صنف کے مخصوص مضامین پیدا ہو گئے تھے۔ بقول حالی یہی ہزار بار کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں تھیں جو ہمارے شاعروں کے لئے سرمایہ افتخار بنی ہوئی تھیں۔ محسن کے معاصرین بھی اس رسمی اور تقلیدی شاعری کے چکر سے آزاد نہ ہوئے۔ اس لئے ان کے یہاں ہجر و وصال کی داستانیں، شکوے شکایتیں، خاص خاص حکایتیں، گل و بلبل کے مضامین، مے و مینا کی گردش سے پرانے زمانے کی یادگاروں کا ایک عجائب خانہ نظر آتا ہے جو رفتہ رفتہ اصلیت سے دور اور ابتذال و رکاکت سے قریب تر آ گیا، لیکن محسن نے اپنے دامن کو اپنے ہی پھولوں سے بھرا ہے۔ محسن نے اپنے عقیدے میں جو نرالی تشبیب لکھی ہے آپ کو اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملے گی۔ ذوق اور سودا قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ لیکن اُن کی کسی تشبیب میں ایسی جدت اور زور نہیں، یہ مضامین تشبیہات استعارات اور خیالات جو خالص ہندوستانی فضا کی پیداوار ہیں، محسن ہی کا حصہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسن کی پاکیزہ طبیعت عوام کی پامال شاہراہ سے بچ کر اپنا راستہ الگ بنانا چاہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سرزمینِ نعت میں اپنی جدت پسندی سے رنگ رنگ کے پھول کا ایک گلزار کھلایا ہے۔

علامہ محسن نے کوئی دنیاوی عشق کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر "فغانِ

محسن" کے عنوان سے جو مثنوی اُن کی کلیات میں ہے، وہ اور اس پر جو نوٹ ہے، وہ قابلِ غور ہے۔ وہ نوٹ حسبِ ذیل ہے۔

"یہ مثنوی سچی ہمدردی اور پرانی محبت کا فوٹو ہے۔ حضرت محسن کے ایک دوست پر سرکاری معاملے میں گرفت ہوئی جس میں اندیشہ تھا کہ اُن کی عزت و آبرو میں فرق آئے۔ حضرت محسن اپنے دوست کی پریشانی و اضطراب کا صدمہ نہ اُٹھا سکے، بیمار ہو گئے، جب خدا کے فضل سے وہ معاملہ رفت و گزشت ہو گیا۔ حضرت محسن کو بھی صحت ہو گئی، بعد صحت یہ مثنوی لکھی تھی جو نظرِ ثانی سے محروم رہی۔"

مگر اس پوری مثنوی سے اگر آخری دو شعر نکال کر اُسے کوئی ایسا شخص پڑھے، جسے مذکورہ بالا واقعہ کا علم نہ ہو تو وہ کسی قیمت پر یہ باور کرنے کو تیار نہ ہوگا کہ حضرت محسن نے کسی دوسرے سے عشق کیا ہی نہیں۔

فغانِ محسن

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا ÷ تڑپنے لگا دل اُچھلنے لگا
زمیں تک مرے آنسو آنے لگے ÷ فلک تک مرے نالے جانے لگے
جگر میں تپش لب پہ شیوہ ہے کیوں ÷ مجھے آپ ہی آپ اُلجھن ہے کیوں
مری چشمِ تر کا یہ کیا حال ہے ÷ کہ دامن سے تا آستیں لال ہے
مرا رنگ فق ہوتا جاتا ہے کیوں ÷ بدن خود بخود سنسناتا ہے کیوں
سبب کیا جو میں سر کو دھننے لگا ÷ ہوا کیا کہ میں تنکے چننے لگا
ہنسی میں مرے آنسو بہنے لگے ÷ مجھے لوگ سودائی کہنے لگے
نیا راگ لاتی مری بے کسی ÷ چھٹا دیس جنگلے کی دھن ہو گئی
مرے منہ پہ زردی سی کیوں چھا گئی ÷ چمن میں مرے کیوں خزاں آ گئی
پسینے بھی دیکھے نکلتے ہوئے ÷ ہے گھبراہٹ اتنی مجھے کس لئے
کراہی اپنے ہاتھوں اُٹھائے چلا ÷ کھلے بند میں قید خانے چلا
چمن سے مجھے شوقِ صحرا ہوا ÷ نئے رنگ کا مجھ کو سودا ہوا
خزاں آئے تو دل کو کھٹکا نہیں ÷ بہار آئے تو مجھ کو پروا نہیں
طبیب آئیں بالیں پہ تو دم گھٹیں ÷ مری نبض دیکھیں تو نبضیں چھٹیں
کوئی فصد لے یاں اثر تک نہ ہو ÷ کوئی پچھنے دے یاں خبر تک نہ ہو
عجب طرح کا ہے یہ دیوانہ پن ÷ نہ شوقِ خموشی نہ ذوقِ سخن
اگر بے محل گفتگو کی تھی ÷ ملا نطق کو خلعتِ سوسنی
خموشی ہوئی گر بجائے سخن ÷ ملا نالہ کو سرمئی پیرہن
جو سوتے میں شب کو رہی بے کلی ÷ تو خوابِ پریشاں سے نیند اُڑ گئی
جو دن کو یہی سوزِ باطن رہا ÷ تو دن بھر مرا کیا بُرا دن رہا
خوش آتی نہیں اب مجھے کوئی شے ÷ نہ دریا نہ گلشن نہ مینا نہ مے
نہیں کوئی ساماں مجھے سازوار ÷ نہ ساقی نہ مطرب نہ فصلِ بہار
کبھی مری کیفیت ایسی نہ تھی ÷ یہ شورش یہ سوزش یہ گرمی نہ تھی
نہ ایسی کبھی بے قراری ہوئی ÷ نہ مجھ پر غشی ایسی طاری ہوئی
نہ آنکھوں کے پردے گلابی ہوئے ÷ نہ تارِ آنسوؤں کے شہابی ہوئے
گھڑی بھر میں میں ہو گیا گرد برد ÷ ستم ہے غضب ہے کلیجہ کا درد
نہ کیا کیا ہوس زندگانی کی تھی ÷ مگر موت آئی جوانی ہی تھی
کوئی دم میں دم ہی نکلتا ہے آج ÷ کلیجا کوئی میرا ملتا ہے آج
چلی آتی ہیں ہچکیاں دم بدم ÷ مجھے یاد کرتے ہیں اہلِ عدم
اندھیرا مری آنکھوں میں چھا گیا ÷ جبیں پر بھی دیکھو عرق آ گیا
تڑپنے مجھے دو نہ بولو ذرا ÷ مرے ہاتھ اور پاؤں کھولو ذرا
نہ للہ مجھ کو سنبھالے کوئی ÷ مرے منہ میں پانی نہ ڈالے کوئی
میرے فاتحہ کو نہ آئے کوئی ÷ جنازہ نہ میرا اُٹھائے کوئی
میں کس واسطے خاطر آزار ہوں ÷ کسی کے دل و دوش کا بار ہوں
ہو آنکھوں سے آبِ رواں موجزن ÷ اُسی میں نہاؤں وہی ہو کفن
وضو کر کے محسن نہ پھیریں مجھے ÷ فرشتوں سے کہہ دو نہ گھیریں مجھے
سمجھتا نہیں میں حساب و کتاب ÷ یہ لکھتا ہوں ایک مختصر سا جواب
نہ میں نے کیا کچھ نہ جانا کبھی ÷ مگر سجدۂ آستانِ نبی
خطا بخش بر بوالہ کبریا ÷ حبیبِ خدا اشرفِ انبیاء
زا سمائے آورد زامید و بیم ÷ شفیعٔ مطاعٔ نبیٔ کریم

کشمیر میں فنونِ لطیفہ کا احیاءِ نو

سنگیت

علی محمد لون

بات میرے لڑکپن کی ہے۔ سب سے پرانی بات۔ نمائش گاہ کے ہال میں زندہ ناچ گانے والی ایک ٹولی آئی تھی۔ اس میں شامل ایک کشمیری گانے والی نے مہجور کشمیری کی اُس زمانے کی مشہور غزل گائی تھی۔

"باغِ نشاط کے گلو ناز کران کران ودلو"

سب تماشائیوں کو حیرت ہوئی تھی، بے حد خوشی ہوئی تھی اور اس حیرت اور مسرت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ زندہ ناچ گانے والی پارٹی نے بہت پیسے کمائے۔ اور اب جب ہم اپنے ریڈیو اسٹیشن سے ملک کی مشہور گلوکارہ آشا بھونسلے کی زبان سے رسول میر کی غزل 'لاس وطن سے چھوسوال، سنتے ہیں تو ہمیں مسرت تو ہوتی ہے تاہم اس میں حیرت کا کوئی شائبہ شامل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ آج کان کشمیری غزل سے آشنا ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی بہت مقبول ہوئی ہے۔ فلمی سنگیت کی بے پناہ مقبولیت کے ساتھ ساتھ مقامی موسیقی بھی بہت مقبول ہو چکی ہے۔ اس کا اندازہ اس فرمائشی پروگرام سے ہوتا ہے، جو مقامی ریڈیو سے ہر روز صبح نشر کیا جاتا ہے اس میں کشمیری موسیقی کے شوقین بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتے ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی کے ساتھ ساتھ ریڈیو کی بدولت مقامی لوک سنگیت اور کلاسیکی موسیقی بھی اپنی محدود دُنیا سے نکل کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہے۔ کم از کم یہ بات لوک سنگیت کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے بعض خاص تہواروں اور تقریبات کی یہ چیز اب ہم سب کی میراث بن چکی ہے۔ اس طرح صوفیانہ کلام بھی اپنی سابقہ محدود محفلوں سے نکل کر ہمارا مشترکہ تہذیبی سرمایہ بن چکا ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ آج سے ۲۰۔۲۲ سال ادھر گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی مقامی موسیقی میں یہ انقلاب سا کیوں آگیا؛ بات سیدھی سی ہے۔ آزادی کے بعد جہاں زندگی کے تقریباً سبھی شعبوں میں ایک خاموش انقلاب ظہور میں آرہا ہے، وہاں بالکل اسی طرح ہماری تمدنی زندگی بھی اس خاموش انقلاب سے دوچار ہو رہی ہے۔ مادی اور معاشی ترقی تب تک اَدھوری ہے اور انسانی ضروریات کے لئے نامکمل جب تک کہ اسی ترقی کے ساتھ ساتھ تمدن کے شعبوں میں بھی ترقی نہ ہو۔ اس شعور اور احساس کی بدولت جہاں معاشی اور مادی شعبوں میں ترقی کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، وہاں تمدنی ترقی پر بھی کما حقہٗ توجہ دی جا رہی ہے۔ مقامی ریڈیو اسٹیشن کا قیام اس سلسلے میں پہلا قدم تھا۔ ریڈیو کی نشریات میں موسیقی کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مختلف اوقات میں، چھوٹے چھوٹے موزوں وقفوں کے بعد موسیقی کی نشریات نے ہر ایک سننے والے کو یہ احساس بخشا ہے کہ ہماری موسیقی بھی پُر اثر ہے، پُر درد ہے پُر مسرت ہے اور اس سے ہمیں جسمانی اور روحانی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ لوک سنگیت اور کلاسیکی موسیقی کی باقاعدہ نشریات کے علاوہ ہلکی پھلکی موسیقی یعنی کشمیری غزل "وچن" "دلون ورودف وغیرہ میں جو نئے تجربے مقامی ریڈیو اسٹیشن نے کئے ہیں، ان کی وجہ سے اس موسیقی میں زندگی کی نئی روح آگئی ہے۔

مقامی ریڈیو کے قیام کے کوئی نو سال بعد ریاست میں فنون تمدن اور زبانوں سے متعلق اکادمی کا قیام دوسرا اہم قدم تھا جس نے مقامی سنگیت کی آبیاری اور ہمت افزائی کا فرض انجام دیا۔ اکادمی نہ صرف بڑے بڑے کنسرٹوں کا اہتمام کرتی ہے بلکہ بچوں اور نوجوانوں میں موسیقی کا

ن پیدا کرنے کے لیے انعامی مقابلوں کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ اس کے
ہ ریاست میں جتنے بھی غیر سرکاری ادارے موسیقی کی تعلیم دیتے ہیں
ی مالی امداد بھی اکادمی نے اپنے فرائض میں شامل کر لیا ہے۔ اکادمی
سال کئی محفلوں کا انتظام کراتی ہے۔ ان میں لوک سنگیت کے علاوہ ملکی
لی موسیقی، ہندوستانی کلاسیکی سنگیت اور صوفیانہ کلام کے ماہر فنکاروں
پنا فن پیش کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ اہم کام
ہے کہ لوگوں میں ہندوستانی کلاسیکی سنگیت کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے
غرض سے بڑے استادوں کو اپنے فن کے مظاہرے کی دعوت دی
تی ہے۔ سرینگر کا ٹیگور میموریل ہال ہو یا سیاحوں کے مرکز کا ہال۔ ایسی
فلوں میں لوگ بڑے شوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور اُستادوں کے
ن سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اس طرح دھیرے دھیرے کلاسیکی موسیقی میں
بھی لوگوں کی دلچسپی بڑھنے لگی ہے۔

موسیقی کے سالانہ مقابلوں میں سینکڑوں بچے اور نوجوان حصہ لیتے ہیں اور ہر سال اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مقابلوں میں امتیازی پوزیشن پانے والوں کو نقد انعاموں کے علاوہ اسناد بھی دی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس شوق کی آبیاری کی جاتی ہے۔ اکادمی نے حال ہی میں ایسے لائق اور مستحق اُمیدواروں کو وظیفے دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے، جو ریاست کے باہر بعض اعلیٰ تربیتی اداروں میں ڈپلوما اور ڈگری کورس لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ رقص اور موسیقی کے علاوہ سنگیت کے اداروں میں بھی ایسے اُمیدواروں کو ہر سال تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اکادمی کی طرف سے پچھلے چار برسوں میں ایک انسٹی ٹیوٹ بھی کام کر رہا ہے جس میں مصوری اور رقص کے علاوہ سنگیت کی تعلیم اور تربیت کا انتظام بھی موجود ہے اس کام کو پورا کرنے کے لیے ماہرین فن کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ موسیقی کے شعبے میں گانے کے علاوہ مختلف ساز بجانے کی تربیت بھی دی جاتی ہے جن میں طبلہ، ستار، سنتور وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں صوفیانہ موسیقی کی ایک شاخ بھی کام کر رہی ہے۔ لیکن تجربے سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ لوگ ادھر کچھ زیادہ متوجہ نہیں ہوتے۔ کشمیر کی کلاسیکی موسیقی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اب اس کی بقا کے کام کو بھی بڑی سنجیدگی سے ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے ہم عصر ماہرینِ فن کی ریکارڈنگ محفوظ کر لی گئی ہے۔ لیکن ان اُستادوں کے بعد اس میدان کے لئے مزید فن کاروں کو پیدا کرنے کا کام ابھی کچھ ڈھنگ سے نہیں ہوا۔ ہماری بہت بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہماری یہ شاندار تمدنی وراثت ہم سے چھن جائے۔ مقامی ریڈیو اس سلسلے میں اپنے فرض ادا کر رہا ہے۔ لیکن ریاست کی اکادمی کو اس ضمن میں ٹھوس اقدام کرنے چاہئیں۔ کوتوسر گم کے نام پر اکادمی نے صوفیانہ موسیقی کی جو نوٹیشن شائع کی ہے، وہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن اس سے بھی کام بنتا نہیں۔ نوجوان فن کاروں کو اس موسیقی کی طرف راغب کرنے کے لیے مناسب سہولتوں مثلاً موجودہ اُستادوں کی خدمات حاصل کرنے کے علاوہ وظیفوں، مفت کتابوں اور سازوں کا انتظام کیا جانا چاہیئے۔ یہ ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ لوگ موسیقی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی دلچسپی نہ لیں۔ ہمارے پچھلے ۲۲ سال کے تجربے نے ہمیں دکھایا ہے کہ جہاں جہاں مناسب سہولیات ہیں، موزوں ماحول ہے اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے وہاں ترقی ہوئی ہے۔ آج یہ صورت ہے کہ موسیقی کے اداروں میں اور طالبات کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ موسیقی کی محفلوں میں لوگ شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ گھر گھر موسیقی کے چرچے ہیں۔ لوگ اپنی تمدنی وراثت پر نازاں ہیں اور اُسے آگے بڑھانے اور اُسے نئے آفاق سے روشناس کرانے کا جذبہ بھی ہے۔ خدا کرے یہ جذبہ سلامت رہے اور وہ دن بھی آئے جب ملک کے دوسرے حصوں کی طرح اس حصے میں بھی ایسے موسیقار پیدا ہوں جو اپنے فن سے ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمانی کریں۔

بالآخر ہم کامیاب ہوئے

فرحت قمر

ہماری صحت ماشاءاللہ اچھی خاصی تھی۔ بچپن میں گھر کے دودھ پر پلے تھے اور مکھن سبزی کی طرح کھایا تھا۔ لیکن جب ہم جوان ہوئے اور کالج جانے لگے تو ہم نے دیکھا کہ آس پاس کے لوگوں کے، ساتھیوں کے چہرے اُداس اور بے رونق ہیں۔ فٹ بال کے میدان میں اکثر کھلاڑیوں کی ننگی ٹانگیں یوں لگتیں جیسے ہوسٹل کے چوکیدار آغا کا افغانی ڈنڈا۔ سڑکوں اور بازاروں میں بھی زندگی کو بغور دیکھا تو اُداسی کو زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت پایا۔ ان لوگوں کے درمیان ہم اپنے کو ایسا سمجھتے تھے جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ شہر میں تو صحت کا اسٹینڈرڈ ہی یہ تھا کہ بدن دُبلا پتلا ہو۔ عادتاً ہم نے اس مسئلہ کے دوسرے رُخ پر بھی غور کیا اور سمجھا کہ شہر میں رہنے کے لئے صحت مند ہونا ضروری بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ شہر کا دھول، دھوئیں اور شور سے بھرا ماحول صحت مند لوگوں کے مزاج کے مطابق ہے بھی نہیں اور پھر کوئی صحت مند آدمی دن بھر بیٹھ کر دفتری کام کر بھی کیسے سکتا ہے۔ صحت مند لوگ تو جسمانی طور پر مستعد ہوتے ہیں۔ اِدھر اُدھر گھومنا دوڑ دھوپ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر دفتروں میں اچھی صحت کے آدمی کام کریں تو سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دورے کے وقت اکثر اپنی کرسی سے غائب ہی دکھائی دیں۔ دفتری کام کے لئے سست ہونا ضروری سا ہے۔ عمرانیات میں پڑھا وہ معمول کہ وقت کی ضرورتوں کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف پہلو تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں، اس طرح بالکل سمجھ میں آگیا اور ہم مطمئن سے ہو گئے۔

لیکن یہ اطمینان صرف مردوں کی طرف سے ہوا۔ اِدھر اُدھر گھومی۔ عورتوں کے سُرخ سرخ رخسار اور تروتازہ چہرے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صحت ابھی اس صنف میں کافی موجود ہے۔ ان ہوتے واقعات کی بات سوچی تو کئی منظر ذہن میں اُبھر آئے — بچوں کو اسکول اور شوہروں کو کام پر بھیج کر عورتیں مکان کے پچھلے حصوں میں بیٹھی گپ شپ کر رہی ہیں۔ گلی سے گذرنے والے سے گول گپے اور پھلوں کی چاٹ لے کر کھا رہی ہیں۔ جذبات کے کھنچاؤ کو آنسوؤں کے ذریعے نکال رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ — ہم نے تھوڑے مشاہدہ کے مطابق یہ تھیوری بنائی کہ عورتوں کی زندگی میں وہ ذہنی کشمکش، وہ اعصابی تناؤ بہت کم ہے۔ جو مردوں کی زندگی میں ہوتا ہے اور اسی لئے اُن کی صحت مردوں کے مقابلہ بہتر رہتی ہے۔ لیکن ایک دن ہماری ساری اسٹڈی پر پانی پھر گیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے ایک دوست ہیں جن کے والد ماجد کسی دوسرے ملک میں ملازمت کرتے ہیں۔ اور جن کی تعلیمی سرگرمیوں کی خبر لینے، جمع فیس معلوم کرنے یا یہ پوچھنے کہ کیا اس ماہ امتحان کے سلسلہ میں پچاس روپیہ واقعی لے سدھار رہے ہیں، کبھی کبھی اُن کی ماں کالج آتی تھیں۔ اتفاق کی بات تھی کہ ہمارے یار ہم کو پہلو میں لئے ہمیشہ وہاں ملتے جہاں کالج کے پُرانے بوڑھوں کے سائبان

نلے ایک قریبی دیہات کا شخص ایک کالے ساس پان میں (جو کسی زمانے میں ایلومنیم کا رہا ہوگا) صبح سے شام تک بقول مولانا آزاد "سیال حلوہ" بنا بنا کر طلبا کو پلایا کرتا تھا۔ اور جہاں پڑی ہوئی کرسیوں پر ہم بیٹھتے کم اور جھولتے زیادہ تھے اور جس کو ہم اپنی عزت اپنے آپ بنائے رکھنے کے لئے "کینٹین" کہا کرتے تھے۔ اکثر اس جگہ ہم نے اس ادھیڑ عمر کی سرخ رو عورت کو بارہا دیکھا۔ ایک دن کسی ضرورت سے (اب آپ سے کیا چھپائیں فیس کے پیسے پورے کرنے کے لئے ادھار مانگنے کے لئے) ہم اپنے یار کے گھر علی الصباح پہنچے۔ ایک عورت دروازے سے باہر "کھانا بنانے کا کارخانہ" چالو کر رہی تھی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس عورت کی پشت ہماری طرف تھی اس لئے ہم بنا اس سے بولے اندر داخل ہوئے (نوکروں سے ویسے بھی ہم کم بولتے ہیں کیونکہ ہمارے ایک کالے انگریز چچا نے بچپن میں ہم کو ایسا نہ کرنے کی سخت ہدایت کی تھی) اندر پہونچکر ہم نے اپنے یار سے عرض مدعا کی تو اس نے آواز دی "ممی" اور ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس کی ممی آئیں۔ وہ تو وہی بوڑھی سی عورت تھی جو باہر کھڑی تھی۔ ہم نے سوچا صبح صبح آنکھیں نیند کی وجہ سے بوجھل ہونگی لیکن آنکھیں ملنے کے باوجود اس کی عمر اتنی ہی رہی اور وہ ہمارے یار کی وہ ماں نہ بن سکیں جن کو ہم کالج میں دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت تو ہم پیسے لے کر وہاں سے چلے آئے لیکن دماغی الجھن کو دور کرنے کے لئے فیس جمع کراتے ہی اپنے ساتھی سے اپنی بجائے حاضری بولنے کی ہدایت کر کے ہم سیدھے ان کی رہائش گاہ کی طرف ہو لئے۔ اتفاق سے وہ گھر سے باہر نکل رہی تھیں اور نہ جانے کیسے ان کی عمر کوئی دس بارہ سال گھٹ چکی تھی۔

سوال اور بھی ٹیڑھا ہو گیا اور دماغ میں کنکھجورے کی طرح جم کر رہ گیا۔ ہم نے اس پر ریسرچ کرنے کی ٹھانی لیکن سوال عورتوں کا تھا۔ لوگوں سے سنا تھا کہ عورتوں سے عمر کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن ایک دن یہ مشکل حل ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے دوست کے گھر تھے اور گھر میں سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا۔ ہم نے فرمائش کی "یار آج تو گھر کی بنی ہوئی چیزیں کھانے کو طبیعت کر رہی ہے"۔ اور تلاش شروع ہو گئی۔ ایک کمرے میں ایک شیشہ والی میز پر بہت سی شیشیاں ڈبے دیکھ کر ہم نے پوچھا

"یار تیرے ڈیڈی کیا دواؤں کے ایجنٹ ہیں؟"

"کیوں؟"

"یہ سب ڈبے شیشیاں کیسی ہیں؟"

وہ ہمارے گنوارپن پر ہنسا اور بولا — "ابے یہ تو ممی کے میک اپ کا سامان ہے۔" اس دن ہمیں پتہ چلا کہ عورتوں کے چہرے کی سرخی کا راز کیا ہے۔ دراصل ہم گاؤں سے آئے تھے اور ہم کو اپنے گھر میں اس قسم کے تجربات نہیں ملے تھے۔ بہرحال ایک بھرم دور ہوا اور انسانی زندگی کی حقیقت ہمارے سامنے بالکل واضح ہو گئی کہ آج کے دور میں صحت مند کوئی نہیں۔

غور و فکر کی تلیا میں غوطے کھا کر جب ہم نکلے تو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ گھر کے دودھ اور سبزی کی طرح کھائے گئے مکھن سے بنی یہ صحت ایک خصوصی رعایت ہے ایک "SPECIAL PRIVILEGE" ہے جو ماحول کے مطابق نہیں۔ بس اسی دن سے ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب اپنی صحت کو خراب کر کے دوسروں کی طرح ہو جائیں گے لیکن غور طلب سوال یہ تھا کہ صحت خراب کیسے کی جائے؟ کالج کے ڈاکٹر سے خدا کو حاضر ناظر جان کر پوری سنجیدگی سے یہ سنجیدہ بات پوچھی تو جواب دینے کی بجائے انہوں نے ایسی نظروں سے ہمیں دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں "دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا" اور اس کے بعد کسی سے پوچھنے کی نہ ہمت ہوئی اور نہ ہم نے ضرورت سمجھی۔ ہم نے اپنی ہی ذہانت سے ایک حل نکالا۔ آج ہر وہ شخص جو کوئی بھی طبی مشورہ دینے کے اہل یا نا اہل تھا صحت بنانے کے سلسلے میں جو کچھ بھی کہتا آیا تھا ہم اس کے خلاف کرنا شروع کریں گے۔

پروگرام شروع ہو گیا۔

ہم نے صبح کی سیر بند کرنی چاہی لیکن سویرے اٹھنے کی عادت اتنی پختہ تھی کہ آنکھ ایک بار اپنے وقت پر کھل جاتی تو پھر نہ لگتی۔ پلنگ پر بیکار کبھی نہ لیٹا جاتا تھا اور اگر سیر کو جاتے تو مقصد فوت ہوتا تھا۔ ہم نے ایک سمجھوتہ کیا کہ سیر کو جائیں گے لیکن شہر کی گلیوں کی۔ گلیوں میں صبح صبح سینکڑوں کھانا بنانے کے کارخانے، دھواں اگلتے رہتے ہیں اور وہاں کی آب و ہوا میں آکسیجن سے زیادہ کاربن بھر جاتا ہے۔ اپنی صحت کمزور کرنے کے لئے ہم نے ہر صبح اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ شام کو بھی کھیلنے کے بجائے

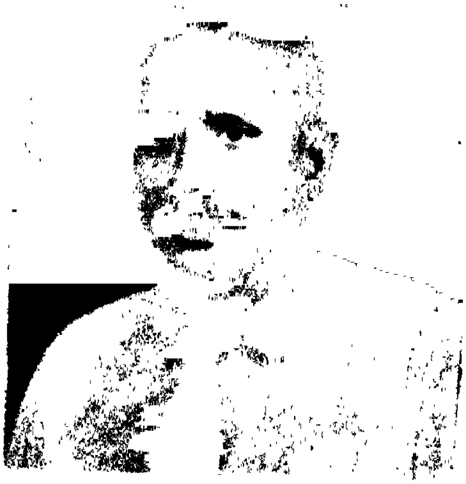
بازاروں میں گھومنا شروع کر دیا کیونکہ بھیڑ کی وجہ سے وہاں کبھی کاربن کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ٹہلنے کی بجائے فوراً سو جانا اور صبح ناشتے میں دودھ کی بجائے چائے پینا شروع کر دیا۔ پھل تو پہلے ہی اس لئے بند کر چکے تھے کہ اُن سے خون تو کھلنے کے بعد بڑھتا ہے لیکن کھانے سے پہلے اس سے زیادہ خون دام چکاتے وقت خشک ہو جاتا ہے۔

ایک ماہ گذر گیا لیکن صحت ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ہم نے اور ترکیبیں سوچیں۔ چائے کی مقدار بڑھا دی اور زیادہ سے زیادہ اسٹرانگ پینے لگے۔ سگریٹ کی عادت بھی ڈالی۔ ان سب سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا تو ہم نے سوچا کہ کوئی بنیادی ترکیب ڈھونڈنی چاہئے۔ بزرگوں سے سنا تھا کہ رات کو دیر تک جاگنا اور صبح کو دیر تک سونا صحت کے لیے مضر ہے۔ اس نسخہ کو آزمایا تو ایک ہفتہ میں ہی تسلی بخش نتیجہ نکلا صبح کو اُٹھنے کی عادت ختم ہو گئی اور زیادہ نہ سہی تو صبح کو دو تین گھنٹوں تک تو چہرہ پھیکا رہنے ہی لگا۔ تین ماہ تک ہم نے اس تیر بہدف نسخہ کو جاری رکھا اور خدا خدا کر کے چہرے کی سرخی کم ہوئی۔ لیکن صحت تو اب بھی بہت اچھی تھی یعنی کہ ہم جوان تھے۔ تھے چہرا بھرا بھرا اور جسم سڈول سا تھا۔ کچھ اور کیا جاسکے ؟ اور ہم کو وہ کہانی یاد آگئی جو مکتب میں سنی تھی کہ ایک حکیم عرب گیا تو اُس کی دوکان پر کوئی مریض ہی نہ آیا۔ سال بھر اسی طرح گذر گیا تو حکیم نے بور ہو کر بوریا بستر گول کیا اور اپنے وطن بغداد پہنچ گیا۔ لوگوں نے واپسی کی وجہ پوچھی تو بتایا عرب والے جب بھوک لگتی ہے تب کھاتے ہیں اور ذرا سی بھوک رہ جاتی ہے تو کھانا بند کر دیتے ہیں۔ وہ مارا" کہتے ہوئے ہم نے فی الفور اس پر عمل شروع کیا اور وقت بے وقت بغیر بھوک کے کھانے لگے۔ جو بھی ملتا جب بھی ملتا معدہ کے لطری پر دشت یعنی ڈکار کی پروا کئے بغیر ڈکار جاتے۔ ڈکار کو ہم ایسا سمجھتے تھے جیسے آئے دن کی ہڑتال کے نعرے لگا رہے ہیں اور جن کی طرف دھیان دینا بیکار سا ہو۔ غرض کہ چائے کبھی خالی نہ پیتے اور ہوٹل کے ان ساتھیوں کی دال پی جاتے جو اتنے ماڈرن ہو چکے تھے کہ دال ہضم نہیں کر سکتے تھے۔

دو سال یونہی گذر گئے۔ ساتھ چھوٹا ملازمت لگی تب بھی ہم نے اپنا پروگرام جاری رکھا کیوں کہ دفتر میں ہم نے زندگی کی حقیقت کو اور بھی بے نقاب دیکھا اور کام کرنے کے لیے سست و مجہول ہونا ضروری سمجھا۔ ہم نے ایک ایسا ہوٹل ڈھونڈا جو روٹیاں گن کر دام نہیں لگاتا تھا بلکہ خوراک کے حساب پر پیٹ بھر کر کھلاتا تھا۔ ایک سال تک ہم نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے سلسلے میں اس ہوٹل میں محنت کی تو ہم بھی اپنے کو دوسروں کی طرح پانے لگے اور پھر ظاہر ہے کہ اس ہوٹل میں کھانا کھانا بیکار تھا۔

اب ہم ایک ایسے ہوٹل میں کھاتے ہیں جو گن کر روٹیوں کے دام لگاتا ہے اور ہم دو روٹی سے زیادہ نہیں کھاتے۔ ایک اور فائدہ بھی اس ہوٹل میں ہے کہ ایک وقت کے ناغہ کے بھی پیسے کاٹ دیتا ہے اور ہم چونکہ ہر دوسرے تیسرے دن بغیر کھانا کھائے رہتے ہیں، بہتے کیا میں رہنا پڑتا ہے، اس لئے مزے میں ہیں۔ تین سال کی مسلسل جد و جہد سے ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ وزن کافی گھٹ گیا ہے اور جسم دُبلا ہوتے ہوتے موجودہ زمانے کی نوجوان نسل کے "سینکیا اسٹینڈرڈ" تک پہونچ چکا ہے۔ اب ہم اپنے کو سماج میں اجنبی نہیں پاتے۔ جیسے سب کا چہرہ اداس ہے ویسے ہی ہمارا ہے، جیسے بس پکڑنے کے سلسلے میں سب کا دم پھولتا ہے۔ اسی طرح ہمارا بھی حال ہے جس طرح سب صبح سے دوپہر تک معدہ کی گیس کی زیادتی کی وجہ سے جسم میں سستی اور آنکھوں میں بھاری پن کا احساس کرتے ہیں اسی طرح ہم کو بھی محسوس ہوتا ہے اور جس طرح شام کی سیر کے نام پر لوگ اپنے آنگن کے چھ سات چکر لگا لیتے ہیں، اسی طرح ہم بھی اپنے جسم کو گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی کھوئی صحت کا افسوس ہوتا ہے تو ہم اپنے کو تسلی دے لیتے ہیں کہ اپنے علم و عزم محکم کے سہارے اپنی صحت گنوا کر ہم انسانی کردار کی اس بلندی تک جا پہنچے ہیں جہاں آج ہم اپنے کو دوسروں سے برتر نہیں سمجھتے بس یہ سوچتے ہیں کہ اس معیار سے گر کر اور اپنے گاؤں جا کر کیا کریں گے۔

دیوان تاراچند



بیکراں سکون

لابھ سنگھ دو سال کے بعد اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ بارش ابھی تک پوری طرح بند نہیں ہوئی تھی۔ شاہی مقبروں سے ہوتی ہوئی سڑک نکودر سے نواں پنڈ شونکیاں کو جاتی تھی۔ تیرہ سال پہلے وہ اسی سڑک سے ہو کر آریہ ہائی اسکول نکودر پڑھنے جایا کرتا تھا۔ سڑک کسی جوان بیوہ کے جذبات کی مانند سنسان اور اداس تھی۔ چلتے چلتے لابھ سنگھ رک گیا۔ اس نے قمیص کے اندر ایک کرتی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی جیب میں اس نے ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم سی رکھی تھی۔ یہ رقم وہ اپنے تایازاد بھائی ہردیال کے لیے لایا تھا۔ ہردیال گاؤں میں کپڑے کی دکان کرتا تھا۔ اس نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر کرتی کی جیب ٹٹولی۔ روپے بدستور جیب میں موجود تھے۔ لابھ سنگھ اپنی اس بے وقوفی پر ہنسا۔ پھر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ موسم سرما کی راتوں کو نو دس بجے بھی آدھی رات معلوم ہوتے ہیں۔ چلتے چلتے وہ سوچنے لگا کہ آخر ہردیال کو کیا اشد ضرورت پڑی کہ اسے تار دے کر دہلی سے گاؤں آنے کو کہا اور ڈیڑھ ہزار روپے بھی طلب کئے۔ وہ یہ عقدہ نہ سلجھا سکا۔

ہردیال اور وہ ہم عمر تھے۔ بچپن ہی سے دونوں میں سگے بھائیوں سے زیادہ پیار تھا۔ انتہا درجے کی الفت تھی۔ ہردیال چونکہ پڑھائی میں کمزور تھا۔ اس لئے اس نے آٹھویں جماعت پاس کر کے سکول چھوڑ دیا اپنے باپ کے ساتھ بزازی کی دکان پر بیٹھ گیا۔ لابھ سنگھ نے تعلیم جاری رکھی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا دونوں بھائیوں میں محبت قائم رہی۔ رشتہ داری سے دوستی بڑھ چڑھ کر تھی۔

بس کے اڈے سے ڈیڑھ میل کی دوری پر نہنگوں کا گوردوارہ بنا ہوا تھا۔ گوردوارے کے قریب پہنچ کر لابھ سنگھ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کیونکہ اسے ایک بھولا ہوا واقعہ یاد آگیا۔ کئی برس پہلے کی بات تھی وہ اور ہردیال آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ سکول سے واپس لوٹتے ہوئے کبھی کبھار گوردوارے میں سستانے ٹھہر جاتے۔ شام کے وقت نہنگ بھنگ رگڑاتے۔ اس میں بادام، مصری، الائچی، سونف، خدلعبا نے اس میں کیا کیا چیزیں ملاتے تھے۔ سب اشیاء یک جا کر کے اس میں کیوڑے کے عرق کی چند بوندیں ڈالتے۔ پھر نعرہ حق لگا کر ٹھنڈائی سب نہنگوں میں بانٹتے۔ سوٹنے میں جس سے وہ بھنگ رگڑتے تھے چھوٹے چھوٹے گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔ جب سوٹا کونڈے میں زور سے چلتا تو گھنگرو ایک رقص انگیز ترنم پیدا کرتے جس کو سن کر بھنگ کے سب رسیا خوشی سے جھوم جاتے۔ نہنگوں کا جتھے دار بلوبا سنگھ ان دونوں بھائیوں کو بھی ٹھنڈائی کا ایک ایک گلاس دیتا اور ساتھ ہی ساتھ پیلے دانت نکال کر مخاطب ہو کر کہتا: اوے منڈیو۔ بابے کی ٹھنڈائی جنت کی سیر کرواتی ہے۔ تم بھی ایک ایک گھونٹ چکھ لو۔ پھر دیکھنا آج کا پڑھا ہوا سبق کتنی جلدی یاد ہوتا ہے۔

لابھ سنگھ اور ہردیال نے جب نہنگوں کو دنیا و مافیہا سے یوں بے فکر اور بے نیاز پایا تو ایک دن دونوں نے دیوی تالاب پر بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ وہ بھی نہنگوں میں شامل ہو جائیں گے۔ پڑھائی

میں سوائے مغز پچی کے اور کچھ نہ تھا انہوں نے تحصیلدار تو بننا ہی نہ تھا۔ دوسرے دن سکول جانے کی بجائے وہ گوردوارے کی جانب چل پڑے۔ جب وہ وہاں پہونچے۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ گوردوارے کے صحن میں نہنگوں کی دو ٹولیوں میں ڈٹ کر خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ دونوں اطراف سے نیزوں، کلہاڑیوں، اور برچھیوں کا کھلا استعمال ہو رہا ہے۔ لوگ احاطے کے باہر نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ احاطے کے اندر جاکر صلح کرانے کا حوصلہ کسی آدمی میں نہ تھا۔ نہنگوں کے بلند نعرے سُن کر بڑے بڑے دل گُردہ والوں کا دل دہل رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر دونوں بھائی اپنے گاؤں کو لوٹ گئے۔ اس کے بعد پھر انہوں نے گوردوارے کی ٹھنڈائی نہ لی۔

لابھ سنگھ نے سوچا کہ اگر اس دن نہنگوں میں لڑائی نہ ہوتی۔ تو خدا جانے نہنگ بننے کے بعد اس کا کیا حشر ہوتا۔ اس خیال کے آتے ہی لابھ سنگھ نے جسم میں جھرجھری محسوس کی۔ گوردوارے کے دربار صاحب والے کمرے میں روشنی تھی۔ شاید وہاں کا گرنتھی پاٹھ کر رہا تھا۔

ان کا گاؤں نواں پنڈ شونکیاں ایک ٹیلے پر بسا ہوا ہے۔ ہردیال کا مکان اس ٹیلے کی چوٹی پر واقع تھا۔ دُور ہی سے لابھ سنگھ نے اس کی بیٹھک میں روشنی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ روشنی کا مطلب یہ تھا کہ ہردیال اتنی رات گئے بھی اس کا انتظار کر رہا ہے۔

ٹیلے کی تلہٹی میں لابھ سنگھ نے بہت سی نئی دکانیں دیکھیں۔ نیا گاؤں میں ایک دوسرا بازار بس گیا تھا۔ چاند کی چاندنی میں اس نے دکانوں کے سائن بورڈ پڑھے۔ ایک دکان ڈرائی کلینگ کی تھی، دوسری ریڈیو اور بجلی کے سامان کی۔ دو تین ہیر کٹنگ سیلون بنے ہوئے تھے۔ دو سال کے عرصے میں اپنے آبائی گاؤں میں اتنی تبدیلی دیکھ کر لابھ سنگھ کا سینہ مارے خوشی کے چوڑا ہو گیا۔ بجلی کی دکان کے بازو میں ہوٹل نوبہار دیکھا۔ اس ہوٹل کے سامنے سے پکی سیڑھیاں ٹیلے کے اُوپر کی طرف جاتی تھیں۔ سیڑھیاں دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے لابھ سنگھ تھکاوٹ، سردی اور لمبے سفر کی بدمزگی کو بھول گیا۔ اس کے خواب و خیال میں کبھی نہ آیا تھا کہ نواں پنڈ شونکیاں تھوڑے عرصے میں اتنی ترقی کرے گا۔

ٹیلے کی سیڑھیاں سو کے قریب تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے لابھ سنگھ کا دم پھولنے لگا۔ مگر گاؤں آنے کی خوشی میں اُس نے اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ مکان پر پہنچ کر اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں اُجالا نمودار ہوا۔ پھر دروازہ کھلا۔ اُس کو ہردیال کی والدہ نظر آئی۔ لابھ سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ تائی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے درازئ عمر کی دعا دی۔ پھر دونوں دالان کی جانب چلے۔

ہردیال بستر پر دراز تھا۔ سامنے میز پر لیمپ جل رہا تھا۔ کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ سوائے ایک کھڑکی کے جو دالان کی طرف کھلتی تھی۔ لابھ سنگھ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مسکرا کر ہردیال کو نمستے کہا۔

ہردیال کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کھانسی نے اس کے منہ کے الفاظ کو باہر نکلنے نہ دیا۔ دو منٹ کے وقفے کے بعد ہردیال سنبھل کر بولا "لابھے بھیا تم نے اچھا کیا کہ آگئے۔ میں تمہارے انتظار میں بستر پر لیٹا لیٹا خدا جانے کیا سوچ رہا تھا۔"

"کیا معاملہ ہے کہ مجھے تار دے کر یہاں بلایا ہے۔ میں تو گھبرا گیا تھا! اور ساتھ . . . . "

اس نے ابھی فقرہ پورا بھی نہیں کیا تھا۔ کہ ہردیال نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا "سب سے پہلے تم گرم پانی سے منہ ہاتھ دھولو" کھانا تیار ہے، کھالو۔ پھر آرام سے بیٹھ کر ہم باتیں کریں گے۔ تمام رات ہماری ہے" لابھ سنگھ کو ہردیال سے پتہ چلا کہ اس کی بیوی بچے بھگواڑہ گئے ہوئے تھے۔ گھر میں وہ اور اس کی بوڑھی والدہ کے سوا کوئی اور دوسرا نہ تھا۔

"تائی تھالی میں مکئی کی گرم گرم روٹیاں اور کٹورے میں سرسوں کا ساگ لائی۔ ساگ سے دھواں نکل رہا تھا۔ مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ لابھ سنگھ کا من بھاتا کھاجا تھا۔ کھانا کھاتے کھاتے لابھ سنگھ نے ہردیال سے پوچھا "تم نے کب کھانا کھایا؟"

"میں رات کے وقت کھانا نہیں کھاتا۔ صرف ڈبل روٹی کے دو

"بیڑے اور بغیر دودھ کی چائے پیتا ہوں۔"

"کیوں"

"پچھلے سال سے مجھے دمے کا موذی مرض ہو گیا ہے۔ بہتیرے حکیموں، ویدوں اور ڈاکٹروں کا علاج کروایا ہے مگر کسی کی دوا سے افاقہ نہیں ہوا بلکہ بیماری بڑھتی جا رہی ہے۔ اب تو لابھ سنگھ یوں جان پڑتا ہے کہ صحت کے ساتھ ساتھ اندوختہ بھی ختم ہونے کو ہے۔"

"تمہیں آس نہیں چھوڑنا چاہئے۔ پھر تمہاری عمر پینتیس کی بھی نہ ہوگی۔ آج کل سائنس نے ہر بیماری کا علاج ڈھونڈ لیا۔ تم میرے ساتھ دلی چلو میں وہاں تمہارا علاج کرواؤں گا۔"

"ہوں۔ علاج۔ اب میرا کیا علاج ہوگا۔ . . . خیر چھوڑو اس علاج ولاج کی باتوں کو۔ میں نے تمہیں ایک بات بتانے کے لئے یہاں بلایا ہے اپنی چارپائی میرے نزدیک کھسکا لو۔ مجھ سے بلند آواز میں بولا نہیں جاتا۔ ہاں ذرا اٹھ کے دیکھو کہ ماں سو گئی ہے یا جاگ رہی ہے۔ بیچاری کو بڑھاپے میں بھی آرام نہیں۔ اس کی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دو۔ سردی بڑے زور کی پڑ رہی ہے۔"

لابھ سنگھ نے اپنی چارپائی ہردیال کے نزدیک کر دی۔ اس نے کوٹھڑی میں جھانک کر دیکھا۔ تائی دنیا دھیانا کو بھول ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے لابھ سنگھ چارپائی پر دراز ہو گیا۔ ہردیال کو کھانسی نے پھر تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بیچارے ہردیال کا کھانسی کے مارے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنی جگہ سے باہر نکلتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے لابھ سنگھ کو آتش دان پر پڑی ہوئی دوا کی شیشی اٹھانے کو کہا۔

دوا کی گولی پانی سے نگل کر ہردیال آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "لابھ سنگھ تو میرا چچازاد بھائی ہی نہیں بلکہ میرے بچپن کا جگری یار ہے۔ جگری یار سے کوئی بھید چھپایا نہیں جاتا۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی ماحول میں پروان چڑھے۔ میں نے آج تک ایک بات تجھ سے چھپائی ہے کیونکہ وہ میری ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ اب جبکہ مجھے اپنا انت نظر آ رہا ہے۔ میں نے تمہیں تار دے کر دلی سے اپنے پاس بلایا ہے۔ تاکہ اس جہان سے کوچ کرنے سے پہلے تمہیں تمام حالات سے آگاہ کر دوں۔"

لابھ سنگھ ہمہ تن گوش ہو کر ہردیال کی بات سننے لگا

ہردیال نے اپنے جسم کو لحاف سے اچھی طرح لپیٹا۔ دو تین بار کھانس کر گلا صاف کیا۔ کھانسی نے اس میں کرب کی سی حالت پیدا کر رکھی تھی۔ لابھ سنگھ کو مخاطب کر کے وہ بولا "ہاں میں کہہ رہا تھا کہ اب میری زندگی کی منزل قریب آ گئی ہے۔ سفر ختم کرنے سے پہلے میں ایک مشکل کام کو نپٹانا چاہتا ہوں۔ تمہیں شاید اس بات کا پتہ نہیں کہ تمہاری بھابی نرملا کی بدکلامی، شکی مزاج، کرخت پن اور بے پروائی نے ہم دونوں میں ہزاروں میلوں کا فاصلہ پیدا کر دیا ہے۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ وہ ضد، حقارت اور زبان کے کڑواپن کو ترک کر کے میرے ساتھ پیار اور عزت سے پیش آئے مگر اس کا ہر قدم میرے خلاف اٹھتا ہے۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ کس مٹی کی بنی ہوئی ہے اور وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ اس نے میری محبت اور پیار کو جان بوجھ کر ہمیشہ ٹھکرایا ہے۔ میں نے منت سماجت کر کے اسے سیدھے راستے پر لانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے میری ایک نہ مانی۔ وہ میرے نزدیک آنے سے اس طرح بدکتی ہے گویا میں کسی چھوت کی بیماری کا مریض ہوں اور میرے نزدیک آنے سے وہ بھی کسی مرض میں مبتلا ہو جائے گی۔ میں نے جب کبھی پیار بھری بات کہی اس نے فوراً ناک بھوں چڑھا کر طعنہ دے دیا کہ دنیا میں جب اور بھی خوبصورت عورتیں موجود ہیں تو مجھ نصیبوں جلی سے تم کیا حاصل کرنا چاہتے ہو۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ میری نظر میں سوائے اس کے اور کوئی عورت نہیں ٹھہر سکتی لیکن وہ شکی مزاج عورت ہمیشہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ لابھ سنگھ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ہم بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ اب حالات یہ ہیں کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہی پاگل پن کا بھوت سر پر سوار ہو جاتا ہے۔"

لابھ سنگھ نے گردن اونچی کی، چند لمحوں کے لئے ہردیال کے چہرے پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ وہاں یاس اور حسرت کے سوا اس نے کچھ نہ دیکھا۔ اسے ہردیال کا چہرہ سوکھا اور اجڑا ہوا کھیت نظر آنے لگا۔

"دیالے تمہارے تین بچے ہیں۔ . . . " لابھ سنگھ آہستہ

...س سکا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ لاجھ سنگھ۔ مگر بات نہ بھولنا۔ بچے کتوں [illegible] کے بھی ہوتے ہیں۔ کیا کبھی تم نے ان میں محبت کی پاسبانی دیکھی مگر بچے ہر موسم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔"

"نہیں۔"

"یہی حال ہمارا ہے۔ کئی سال اسی تگ و دو میں اور ذہنی کوفت میں گزر گئے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح نرملا کی روح کا میری روح کے ساتھ ملاپ ہو۔ وہ اپنی ڈگر چھوڑ کر نئے اور خوشگوار ماحول کو اپنائے مگر اس کوشش کے عوض اس نے جھڑکیاں طعنے اور گالیاں [illegible]۔"

"[illegible] سب نفرت انگیز ہے [illegible]" لاجھ سنگھ نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"کافی عرصے کی بات ہے ایک دن میں کندن سے جس کا مکان ہمارے [illegible] پڑھنے کے لئے لایا۔ میری [illegible] فوٹو رکھے ہوئے [illegible] وہ فوٹو دیکھ [illegible] میں نے وہ [illegible] اور اپنی [illegible] اپنے شوہر کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔"

"[illegible] دیکھ لئے ہوں گے۔"

"[illegible] رنجش کی بنیاد وہی فوٹو تھے۔ اس کے پوچھنے [illegible] قسمیں کھائیں [illegible] واسطہ دیا کہ میرا ان فوٹوؤں سے [illegible] سے لئے ہیں جو رسالے سے برآمد ہوئی ہیں۔ [illegible] سخت نے میری ایک نہ سنی۔ بلکہ فرضی قصے اور کہانیاں میرے [illegible] ساتھ منسلک کر دیں۔"

"کیا اس دوران میں تم کبھی نرملا کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آئے؟"

"میں اور سخت کلامی سے پیش آؤں۔ لاجھ سنگھ تم میری طبیعت سے [illegible] طرح واقف ہو۔ مجھے کبھی طیش نہیں آتا۔"

"آگے چلو۔"

"ہمارے درمیان نفرت کی خلیج حائل ہو گئی۔ گھر میں دونوں وقت کھانا پینا مشکل ہو گیا۔ میں تو ایک طرف رہا نرملا۔ اماں اور بچوں کے ساتھ بدسلوکی کے ساتھ پیش آنے لگی۔ . . . ." کہتے کہتے ہردیال پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دمہ کی وجہ سے اس نے چارپائی پر اکڑوں ہو کر اپنی دونوں پسلیوں کو دبایا۔ لاجھ سنگھ نے دوا کی شیشی اٹھا کر ہردیال کو گولی دی۔ گولی کھاتے ہی ہردیال کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔

"اگر یہ گولی نہ ہوتی۔ تو تم مجھے زندہ نہ دیکھتے۔ اسی گولی کے سہارے سانس چل رہی ہے۔" ہردیال پھر چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد بولنے لگا۔

"لاجھ سنگھ بلاوجہ اس عورت نے میری زندگی اجیرن کر دی۔"

"کیا فقط فوٹو دیکھ کر نرملا پر دہشت طاری ہو گئی یا اور بھی واقعات ہوئے؟"

"کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ مگر شکی مزاج انسان پر کو پرندہ سمجھتا ہے اور رسی کو سانپ۔ اس نے میرے خلاف کئی ہی من گھڑت قصے کہانیاں بنا کر گاؤں والوں اور رشتہ داروں کے درمیان نشر کیں۔ لاجھ سنگھ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کپڑے کی دکان پر ہر کس و ناکس کپڑا خریدنے آتا ہے۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا درگا داس پٹواری کی سب سے بڑی بیٹی پاروتی میری دکان پر دوپٹہ خریدنے آئی۔ کسی بات پر ہم دونوں ہنس رہے تھے کہ نرملا وہاں سے گزری۔ میری طرف اس نے ٹیڑھی نظر سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے گھر کو لوٹ گئی۔ رات کو جب میں گھر گیا تو وہاں مکمل طور پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اندھیرے کی وجہ پوچھی اس نے جواب دیئے بغیر چیخنا چلانا شروع کیا۔ اپنے سر کے بال نوچ ڈالے بیلن اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ میں شور مچائے بنا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ خون سے میرا چہرہ اور کپڑے سرخ ہو گئے۔ مگر میں نے زبان تک نہ ہلائی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے مجھے جوتیوں سے پیٹنا شروع کیا۔ میں جوتیاں کھا رہا تھا مگر صبر و تحمل کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں زندہ انسان نہیں۔ بلکہ بے زبان گائے کے بچھڑے ہوں جو لاٹھیاں کھا کر بھی صدائے احتجاج پیدا نہیں کرتے میری خاموشی اس کے غصے کو ہوا دے رہی تھی۔ محلے کے سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے نرملا کو بہت سمجھایا مگر اس پر رتی بھر اثر نہ ہوا۔"

"تم نے اس بربادی کا ذکر مجھ سے کبھی نہیں کیا۔"

" ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میاں بیوی کے درمیان جھگڑے خود بخود پرورش پاتے ہیں، وقت گذرنے پر خود ہی کافور ہو جاتے ہیں۔
" سنگھ میں انسان ہوں کہاں تک روزانہ بے عزتی برداشت کرتا، میں ان حالات میں آوارہ ہو گیا۔ سکون کی تلاش میں میں مارا مارا پھرا۔ جن لوگوں کے سائے سے میں کبھی دور بھاگتا تھا اب اُن کی قربت حاصل کرنے لگا؟

ناچاقی اور فساد کا بچوں پر بُرا اثر پڑا ہوگا!"

لازمی پڑنا تھا۔ اُن کی تعلیم ختم ہو گئی۔ بڑا لڑکا کیسا لاتی ہڈیوں کا پنجر نظر آتا ہے۔ وٹو کی نظر کمزور ہو گئی۔ چھوٹی لڑکی تین سال کی ہے مگر اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ بچوں کی پرورش کی ذمہ داری ماں پر ہوتی ہے، باپ پر نہیں۔ باپ روپے کما کر گھر لاتا ہے۔ ماں اُن کا پالن پوسن کرتی ہے۔ جب ماں اپنے آپ کو ماں نہیں سمجھتی تو پھر بچوں کا خدا حافظ۔ انہیں حالات میں میں نے درگا داس کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ ہمارے گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف تھا اس کی بیوی نے کئی مرتبہ نرملا کو سمجھایا کہ اگر اسی طرح طعنہ بازی رہی تو گرہستی تباہ ہو جائے گی اس نے اپنی ہٹ دھرمی نہ چھوڑی بلکہ مجھ پر ان گنت تہمتیں لگائیں جن کا وجود تک نہ تھا جس جگہ انسان کو سکون شانتی ملتی ہے وہ وہیں کا ہو جاتا ہے۔ درگا داس کی بیٹھک میں جا کر مجھے چین اور آرام ملتا تھا۔ مجھے اپنے مکان پر گئے ہوئے دنوں بیت جاتے۔ بچے دکان پر یا درگا داس کی بیٹھک پر آ کے مجھے ملتے۔ رو دھو کے چلے جاتے۔ میں اُن کو گھر کے واسطے خاطر خواہ خرچ دیتا رہتا!"

" نرملا نے گھر سے غیر حاضر رہنے کے سلسلے میں تمہیں کچھ نہیں کہا؟"

" ہوں۔ اس پر جب غصے کا دورہ پڑتا دکان پر مجھے بے تحاشا گالیاں دیتی۔ پھر تھک ہار کر واپس لوٹ جاتی۔ بازار والے لوگ چونکہ اُس کی عادت سے واقف ہو چکے تھے لہٰذا اس کی گالیوں میں دخل انداز نہ ہوتے تھے۔

اس جھگڑے کے سلسلے میں کیا تم نے نرملا کے والدین کو کچھ لکھا تھا؟"

میں نے سب پاپڑ بیل لئے مگر فیصلہ کسی صورت میں نہ ہوا بلکہ اُلٹا اثر ہونے لگا۔ نرملا کو گھر سے میری غیر حاضری کی رتی برابر پروا نہ تھی۔ بلکہ بچوں کو پیٹتی ہوئی چلا چلا کر کہتی۔ کُتے کی اولاد کتا ہی ہوتی ہے۔ جہاں تمہارا باپ بھاگ گیا وہاں تم بھی بھاگ جاؤ۔ میرا تو بھگوان مالک ہے۔ میں اُن کی شرن مانگتی ہوں۔

" یہ معاملہ سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔" بھائی اس کا حل کیا ہے؟"

" موت، یا میں مر جاؤں یا نرملا مر جائے۔ لابھ سنگھ جو لوگ گھر والوں سے خواہ مخواہ جھگڑتے ہیں اُن کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں اور کسی دوسرے کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اُلٹا اپنی سر ناجائز بات منوانے پر در پے رہتے ہیں، اپنے آپ کو معصوم اور درست گردانتے ہوئے بھگوان کی مدد اور سہارا چاہتے ہیں، اُن کا ایسا سوچنا غلط ہوتا ہے وہ خود کو اندھیرے اور دھوکے میں رکھتے ہیں وہ لاکھ کوشش کریں وہ کسی طور پر چین حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ دن بدن چڑچڑا پن اُن کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اُن کو ہر وقت بڑبڑانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ بسا اوقات غصے کے مارے اُن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔"

ہردیال کی باتیں سُن کر لابھ سنگھ سہم گیا۔

" چونکہ درگا داس کے گھر میرا آنا جانا میرے معمول میں داخل ہو گیا تھا لہٰذا پاروتی اور میرے درمیان فاصلہ کم سے کم تر ہو گیا اس کو دیکھنے سے میرے دل کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہفتے میں ایک دو بار ندی کے کنارے جو مندر بنا ہوا ہے وہاں پوجا کرنے کے بہانے ہم ایک دوسرے کو ملا کرتے۔ اُداسی دُور ہو جاتی۔

" کیا درگا داس کو ان خفیہ ملاقاتوں کا علم تھا؟"

" شاید نہیں "

" کسی دوسرے شخص کو؟"

" میں کہہ نہیں سکتا "

" آگ راکھ کے اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ کوئی چنگاری ظاہر نہ ہوئی۔"

" یوں ہی سمجھ لو "

تمہیں اپنے بچوں کا خیال تو آنا چاہیے تھا کہ اُن کے ہوتے
ہوئے تم کون سے راستے پر گامزن ہو۔"

" بیوی کے فوت ہونے پر خاوند دوسری شادی کر لیتا ہے"

" معاف کرنا میں تمہاری اس منطق کو سمجھنے سے عاری ہوں"

" میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ مجھے بات ختم کرنے دو۔ پانچ
ہینے ہوئے درگا داس کی ہیضے کی وجہ سے موت ہو گئی۔ اُس کی آخری
رسمیں ادا کرنے کا تمام خرچ میں نے اپنی گرہ سے کیا۔ درگا داس مرنے
سے پہلے ہی پاروتی کی سگائی مہت پور والے آڑھتی دھنی رام کے بیٹے
رج لال کے ساتھ کر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد پاروتی نے
نی ماں کی منت سماجت کی، کہ اس کی سگائی منسوخ کر دی جائے
نکہ وہ نہیں چاہتی کہ شادی کے بندھنوں میں پڑے۔ اُس کی ماں
نے مجھے رو رو کر سب حالات بتائے۔ اگر پاروتی کی سگائی ٹوٹ گئی تو
گاؤں اور رشتہ داروں میں اُن کی بے حد بدنامی ہوگی۔ اس لئے میں
روتی کو سمجھاؤں کہ انکار سے باز آئے۔ سگائی کے ٹوٹنے سے بدنامی
نہیں جگ ہنسائی بھی ہوگی اور گناہِ عظیم بھی ہوگا۔

" تم نے پاروتی کو شادی کرنے پر آمادہ کر لیا۔"

" ہاں۔ بلکہ بہت غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ
ری بیماری کی وجہ سے اس کی شادی ہونا ضروری ہے۔ مجھے کچھ
نہیں۔ میری صحت کب جواب دے جائے۔

" تمہیں ایسا کرتے ہوئے پاروتی کے جذبات کا بھی خیال نہیں آیا

" بے حد خیال ہے بلکہ وہ میری رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔
روتی نے مجھ سے پوچھا کہ جب میں نے اس کے ساتھ دلوں کا سودا کیا
کیا اب میں اپنی آنکھوں سے اس کی بارات چڑھتی دیکھ سکوں گا۔
بڈ باجے کی دھنیں سُن کر میرے کان بہرے نہ ہونگے، تھوڑے سے
مل کے بعد میں نے اُس کو جواب دیا کہ کیا اپنے اُن عزیزوں اور رشتہ
روں اور دوستوں کو جن کے ساتھ ہم نے مزے سے دن بتائے
یں۔ اُن کے مرجانے پر اپنے دل پر جبر کر کے اُنہیں سپردِ آگ
یں کرتے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اُن کو راکھ بنتے نہیں دیکھتے۔ کیا
اپنے اُنہیں ہاتھوں سے جن سے ہم اُن کی بلائیں لیتے ہیں، سپردِ خاک نہیں
کرتے۔ میری دلیل سُن کر پاروتی چپ ہو گئی۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ
بیماری کی وجہ سے میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں چراغِ سحر
ہوں۔ کچھ پتہ نہیں کب بجھ جاؤں"۔

" پاروتی نے کچھ اور کہا ہوگا۔"

" ہاں کہا تھا کہ اگر میری تمنا اور خوشی یہی ہے کہ وہ شادی کر لے
تو وہ یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہے لابھ سنگھ پاروتی کی شادی بڑے
اطمینان کے ساتھ ہوگی۔ تمہیں یہ سُن کر حیرانی ہوگی کہ مجھے اس کی شادی
میں پانچ ہزار روپے کی رقم خرچ کرنا ہے"

یہ سنتے ہی لابھ سنگھ نے کرتی کے اندر ہاتھ ڈالکر روپوں کو
نکالا اُن کو ہردیال کو دیتے ہوئے بولا" شاید یہ رقم بھی تم نے پاروتی
کے بیاہ کے لئے منگوائی ہوگی۔"

روپوں کو دیکھ کر ہردیال کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس کے
چہرے پر روشنی اور تازگی پھیل گئی۔

" تم روپے لے آئے۔ شاباش میرے شیر۔ اب میری پاروتی کی
شادی سات روز کے بعد بڑی دھوم دھام سے ہوگی۔ جالندھر سے
پولیس کا بینڈ آکر برات کو خوش آمدید کہے گا۔ میری پاروتی . . .
کہتے کہتے ہردیال کی آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار بہنے لگا۔ ساتھ ہی کھانسی
نے زور پکڑا۔

" اور تم"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد ہردیال نے جواب دیا۔ پاروتی
کی شادی کے بعد میں اپنے گھر کے سوگوار ماحول میں پھر سے داخل ہو جاؤں
گا۔ جب تک سانس چلے گی۔ نرملا کی بے نقط گالیاں جھڑکیاں اور
طعنے سنوں گا۔"

لابھ سنگھ نے ہردیال کے چہرے پر جہاں بے رونق اور
اداسی رقص کر رہی تھی ایک بیکراں سکون دیکھا۔

نئی کتابیں

تذکرہ ، از مولانا ابوالکلام آزاد - مرتب : مالک رام
پبلشرز : ساہتیہ اکیڈمی ، رابندر بھون نئی دہلی - قیمت : پندرہ روپے مجلد
ضخامت : ۱۶ + ۴۴۲ صفحات - ۸/۲۲×۲۲

تذکرہ مولانا آزاد کی مشہور تصنیف ہے. دراصل یہ کئی تصنیفات کا مجموعہ ہے. جب انھیں حکومت بنگال نے ۱۹۱۶ء میں حدود بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اور رانچی میں انھیں نظر بند کر دیا تو وہ یہاں ۱۹۲۰ء تک رہے۔

اُن کے رانچی کے قیام کے دوران اُن کے ایک دوست فضل الدین احمد مرزا نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی سوانح عمری قلم بند کریں۔ کافی لیت و لعل کے بعد انھوں نے یہ درخواست منظور کر لی اور اپنے ایک بزرگ شیخ جمال الدین (ہم عصر بادشاہ اکبر) کے حالات سے آغاز کیا۔ تذکرہ دراصل انھیں شیخ جمال الدین کو محیط ہے. لیکن اس میں اکبری عہد کی تاریخ، سید محمد جونپوری کی تحریک، اسلامی فقہ، اسلام میں اصلاحی تحریکوں اور نفس مذہب سے متعلق اتنی تفصیلی بحث ہے کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔

مولانا آزاد نے یہ کتاب جس پریشانی میں لکھی اس کا اندازہ اُس سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مستقر اور کتاب خانے سے دور جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو کچھ لکھتے اسے ساتھ کے ساتھ فضل الدین احمد مرزا کو بھیج دیتے۔ پورا مسودہ کبھی اُن کے سامنے نہیں رہا۔ یہی سبب ہے کہ قاری کو بعض اوقات اُلجھن محسوس ہونے لگتی ہے۔ مزید براں یہ اس دور کی تحریر ہے جب الہلال کا طرز تحریر ان پر حاوی تھا یعنی عبارت عربی، فارسی الفاظ اور ترکیبوں سے بوجھل، لمبے لمبے فقرے حاشیہ در حاشیہ تحریریں۔

ایسی کتاب کو مرتب کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لئے نہ صرف عربی فارسی پر قدرت ضروری تھی بلکہ اسلامی علوم کی مختلف شاخوں کا وسیع علم بھی لازم تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ مالک رام ایسے ہمہ جہت ادیب اس سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

انھوں نے متن کی تصحیح کی ہے جس میں ان کے سامنے مولانا آزاد کا ذاتی نسخہ رہا ہے۔ پوری کتاب میں موزوں اوقاف لگا دیئے گئے ہیں جن سے عبارت کا سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ کتاب میں عربی، فارسی اور اردو اشعار کثرت سے آئے ہیں اور یہ مولانا آزاد کے طرز نگارش کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کا حافظہ بہت قوی اور مطالعہ وسیع تھا۔ لکھتے ہوئے جب موقعے کی مناسبت سے کوئی شعر انھیں یاد آتا تو وہ اُسے بلا تکلف اضافہ کر دیتے۔ مالک رام صاحب نے ان تمام اشعار اور عبارتوں کی تخریج کی ہے اور مکمل حوالے دے دیئے ہیں؛ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر کس شاعر کا ہے۔ جہاں کہیں اصل سے اختلاف ہے اس کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ کتاب میں جہاں کہیں قرآن کی آیتوں یا حدیثوں کا متن دیا ہے۔ مرتب نے ان کا حوالہ اور اردو میں ترجمہ دے دیا ہے۔

چونکہ کتاب متنوع مضامین کا مجموعہ ہے اس لئے اس میں سینکڑوں تاریخی اشخاص اور علمائے اسلام کے نام آئے ہیں۔ ان سب کے سوانح بہ اختصار حواشی میں قلم بند کر دیئے ہیں۔ یہ بجائے خود اتنا بڑا کام تھا کہ اس کے لئے وسیع مطالعہ اور محنت کی ضرورت تھی۔ مرتب کی کاوش اور محنت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے حواشی کی ترتیب کے لئے جن اُردو فارسی اور عربی کتابوں سے مدد لی، ان کی فہرست چودہ صفحوں میں آگئی ہے اور تعداد تین سو کے قریب ہے۔

ان معنوی خوبیوں کے علاوہ کتاب ظاہری حسن کے لحاظ سے بھی مثالی ہے۔ کتابت، طباعت، تجلید، ہر ایک چیز اس پایے کی ہے کہ ساہتیہ اکیڈمی اس پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

عیارِ غالب: مرتبہ:- مالک رام۔ ناشر: علمی مجلس دہلی۔
قیمت:- سات روپے ستر پیسے

یہ کتاب دراصل سہ ماہی رسالہ "تحریر" کا غالب نمبر ہے۔ جو کتابی صورت میں شائع ہوا ہے اور رسالے کی دو اشاعتوں کا حامل ہے۔ اس میں بڑے قابلِ قدر مضامین شامل ہیں۔ جن میں ڈاکٹر نرندر ناتھ دگ کا مضمون "غالب ایک نفسیاتی مطالعہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس مضمون کے مصنف نفسیاتی امراض کے معالج خصوصی ہیں۔ انہوں نے غالب کے کلام سے اس کی شخصیت کے باب میں نتائج اخذ کئے ہیں۔ اِس رُخ سے یہ غالب کا پہلا مطالعہ ہے۔

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا مضمون "غالب کا نعتیہ کلام" نعت گوئی کی ابتدائی تاریخ کو محیط ہے۔ غالب کی مثنوی معراج کا اس میں تفصیلی جائزہ ہے اور آخر میں قدسی کی مشہور نعت پر غالب کی بے مثال تضمین بھی درج ہے۔

سید محمد حسین رضوی نے غالب کی تاریخ ولادت کے باب میں ایک بحث کا آغاز کیا ہے۔ اور ۱۲۱۲ ہجری کے بجائے ۱۲۱۱ھ ہجری ثابت کیا ہے۔ لیکن یہ کلیاتِ فارسی طبع دوم میں مندرج نزا ثبچے کی مدد سے ہے۔ حالانکہ خود غالب نے ایک جگہ نہیں کئی جگہ اپنی تاریخ ولادت ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۱۷۹۷ عیسوی لکھی ہے بعض معلوماتی ہے اور قابلِ مطالعہ سید مسعود حسن رضوی فراق گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالجلیل اور دوسرے لکھنے والوں کے مضامین بھی معیاری اور دلچسپ ہیں۔ یہ کتاب غالبیات میں بہت اچھا اضافہ ہے کتاب $\frac{18\times22}{8}$ تقطیع کے ۲۷۲ صفحوں پر مشتمل ہے اور مجلد ہے۔

(عرش ملسیانی)

صبح و شام (افسانے) مصنف: ل۔ احمد اکبر آبادی

گو کتاب کے عنوان کے نیچے 'افسانے' لکھا ہوا ہے لیکن ۲۲ اندراجات میں زیادہ سے زیادہ صرف دس ہی افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ آٹھ (۸) انشائیوں کی صنف میں شامل کیے جا سکتے ہیں اور باقی ماندہ چار (۴) مخلوط قسم کی تحریریں ہیں۔ خود مصنف کے الفاظ میں یہ کتاب اُن تحریروں پر مشتمل ہے جو سن ۲۳ء کے بعد لکھی گئی تھیں۔ سب مضامین اور افسانے مختلف سماجی موضوعات پر ہیں۔ ان میں ہندو مسلم مذاہب کا باہمی تعصب اور تنگ نظری، کانگرس اور مسلم لیگ سیاسیات، مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی پسماندگی۔ مرد کے مقابلے میں عورت کی بے بسی اور اس کا ایثار وغیرہ اہم ہیں۔ مصنف کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ مغربی مدارسِ فکر سے بھی واقف ہیں۔ ازدواج اور عشق کے موضوع پر مصنف کی جدت پسندی تیس برس گذرنے کے بعد بھی شگفتہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ باقی خیالات پر ایک خاص عہد سن ۳۵ اور ۴۰ کے درمیان کی مہر لگی ہوئی ہے۔ پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس دور کی یہ کتاب عکاسی کرتی ہے۔ وہ بہت پیچھے رہ چکا ہے۔

تمام تحریروں پر مقصدیت حاوی ہے۔ مصنف نے اپنے خیالات کی تبلیغ کے لئے پلاٹ کو "بنیاد" کے طور پر استعمال کیا ہے کئی جگہ یہ بنیاد نہایت کمزور ثابت ہوتی ہے جگہ جگہ حالی اور اقبال کی "ملیت" کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ کہیں کہیں قومیت کا دباؤ ہے۔ بطور مجموعی افسانے دلچسپ ہیں۔ خاص کر "کامیابی کی قیمت" "نزاعِ کفر و ایمان" "گندم" اور "ایثار" قابلِ ذکر ہیں۔ طنزیہ مضامین میں "جنت کے اوقات" سب سے بہترین ہے: "قربانی کا بکرا" بھی اچھا ہے۔ باقی غنیمت ہیں۔ "میں اور میرا ضمیر" نہ افسانہ ہے نہ انشائیہ" "ذہنی" کا طنز کچھ اثر انگیز نہیں۔ کہیں کہیں مغربیت بار گزرتی ہے۔ مثلاً "زلیخائے جدید" میں قاہرہ کا ذکر ہے۔ وہاں ایک دن میں ہیرو پچاس گنی کے سگریٹ خریدتا ہے۔ گنی کوئی سکہ نہیں صرف انگلستان میں ۲۱ شلنگ کو گنی کہا جاتا ہے۔ قاہرہ میں گنی کہاں سے آئی؟

مضامین اور افسانوں کی فہرست کے فوراً بعد مصنف نے پانچ صفحوں کی ۱۴۳ "اہم غلطیوں" کی ایک فہرست مرتب کی ہے ان اہم غلطیوں کے علاوہ بھی بہت سی غلطیاں اس کتاب میں موجود ہیں جو کتابت اور کاپیوں کی تصحیح کی طرف سے لاپرواہی برتنے کا نتیجہ ہیں۔ کتاب کا گیٹ اپ اچھا ہے۔ ۲۴۴ صفحات کی اس کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے۔ ناشر انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کلکتہ

(نریندر لوتھر)



یونٹوں میں سرمایہ لگانا آسان ہے



یونٹ ٹرسٹ آپ کی محنت کی کمائی کو آپ کے فائدے کے لئے کام میں لاتا ہے۔

1 یونٹوں پر ٹیکس سے بری منافع ملتا ہے۔ (-/1000 روپے تک)
2 ضرورت پڑنے پر آپ انہیں آسانی سے بھنا سکتے ہیں۔
3 یونٹ خرید کر آپ ملک کی خدمت کرتے اور معقول منافع حاصل کرتے ہیں۔
4 16000 ڈاک گھروں یا بڑے بڑے بنکوں کی 7000 شاخوں میں سے کہیں بھی آپ یونٹ بڑے آسانی کے ساتھ خرید سکتے ہیں۔ آپ ہمیں براہ راست لکھیں یا مزید جانکاری ہمارے ایجنٹوں یا منظور شدہ دلالوں سے حاصل کریں۔

یونٹوں میں لگائے سرمائے پر ہمیشہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔

یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا

بمبئی ۔ کلکتہ ۔ دہلی ۔ مدراس

davp 69/300

آج کل دہلی



ار کو نئی دہلی میں بچوں کے بین الاقوامی میلے کا انعقاد ہوا جس میں بہت سے غیر ممالک نے حصہ لیا اس میلے کا افتتاح وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کیا

بر کو وزیراعظم نے جزائر ہائے لکادیپ، منی کائے اور امن دیوی کا دورہ کیا جہاں اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کلپنی جزیرے کے باشندے اُن کا سواگت کر رہے ہیں





رومانیہ کے صدر نکولائی چیوسیسکو اور وزیراعظم جارجی مورر ایک ہفتہ کے دورے پر ہندوستان تشریف لائے۔ پالم ہوائی اڈے پر صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری اور وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ان کا استقبال کیا۔
(بائیں سے دائیں) شریمتی سرسوتی بائی گری، شری وی وی گری، شری اور شریمتی چیوسیسکو۔

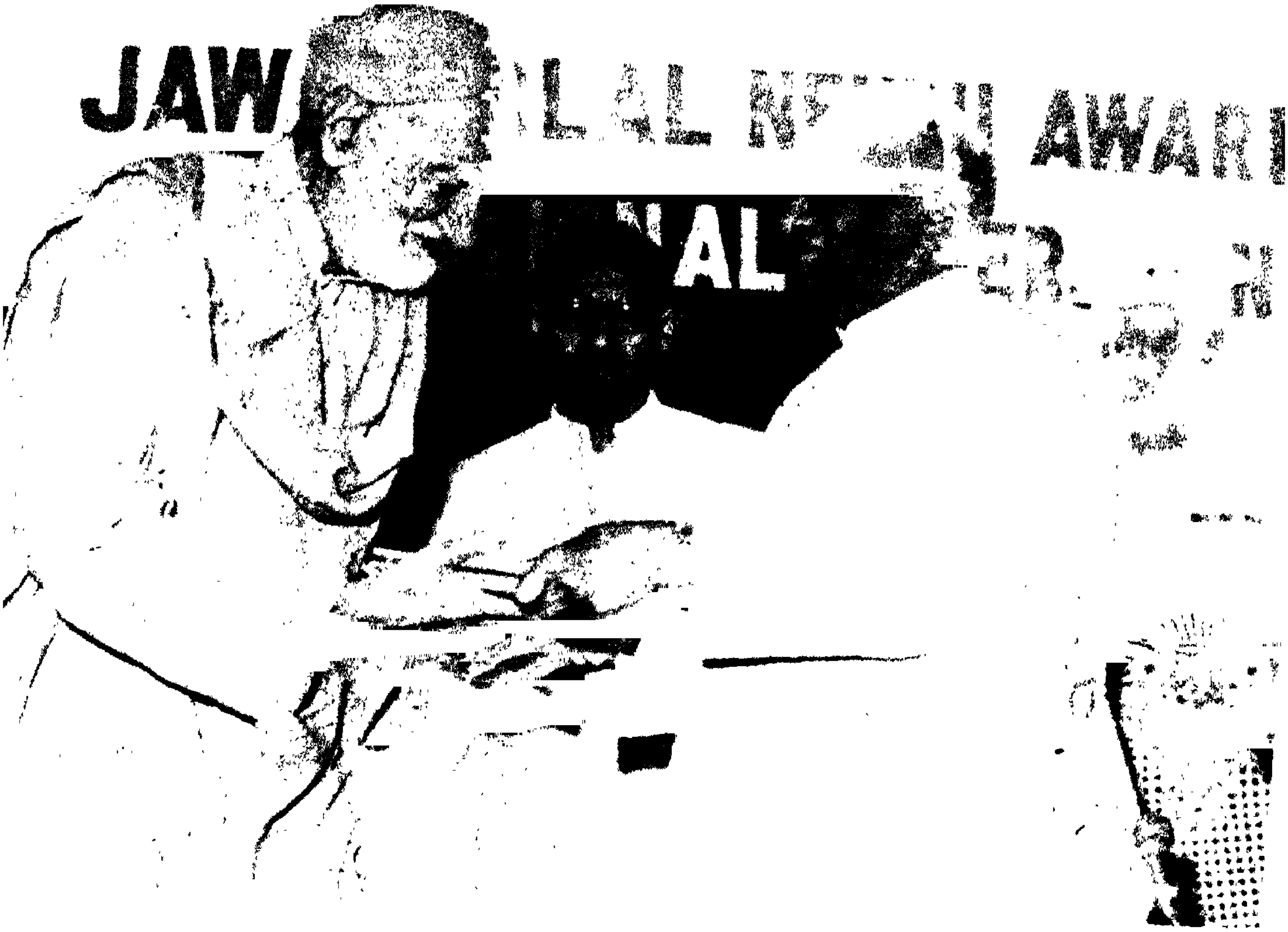
Vol. 28 No. 5 AJKAL (Monthly) December 1969

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by the Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd. No D-509

آجکل

جنوری ۱۹۷۰ء

۶۰ پیسے



۱۵ نومبر ۱۹۶۹ء کو صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے نہرو میوزیم نئی دہلی میں منعقدہ ایک شاندار تقریب میں خان عبدالغفار خاں کو بین اقوامی مفاہمت کا جواہر لال نہرو ایوارڈ دیا۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے کا ہے اس سے پہلے یہ ایوارڈ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل او تھانٹ اور امریکہ کے ممتاز نیگرو رہنما مارٹن کنگ لوتھر (مرحوم) کو دیا جاچکا ہے۔

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماهنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۸ —— شمارہ ۶

جنوری ۱۹۷۰ء
پوس ماگھ شک سمت ۱۸۹۱

ترتیب

سرورق : گورچرن اروڑہ
پشت پر : یوم جمہوریہ کی پریڈ

مضامین اور ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

"یوم جمہوریہ" کا دن ہر سال ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہمارے ملک کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ اس لحاظ سے ہم پر یہ خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے افعال و اعمال کے ذریعے دنیا کے سامنے ایک ایسا نمونہ پیش کریں جس سے دنیا میں جمہوریت کا اعتبار بڑھے۔ ملک میں مختلف انتشار پسند جماعتوں اور گروہوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوری نظام اور طریقۂ زندگی کی جڑیں استوار ہو چکی ہیں۔ اس کی ان گنت مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

ہندوستان میں مختلف لسانی اور نسلی گروہ کے لوگ آباد ہیں لہٰذا اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہو بھی نہیں سکتا کہ ملک کی بھلائی اور بہتری کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو فیصلے کئے جائیں وہ عوام کی مرضی سے کئے جائیں۔ اس میں کسی قسم کے جبر یا زبردستی کو دخل نہ ہونا چاہئے۔

ملک سیاسی غلامی سے آزاد ہو گیا ہے مگر ابھی تک عوام کی اکثریت معاشی بدحالی کا شکار ہے، آزادی کے بعد اناج کی زیادہ پیداوار، تعلیم، صحت، صنعتی ترقی اور روزگار جیسے قومی زندگی کے لئے اہمیت رکھنے والے تقریباً تمام مسائل پر توجہ کی گئی ہے اور خامیوں اور ناکامیوں کے باوجود گزشتہ ۲۰، ۲۲ برسوں میں صورت حال بہت بہتر ہوئی ہے لیکن ابھی وہ منزل بہت دور ہے جب آزادی کی برکتیں ملک کے ہر فرد و بشر کو حاصل ہوں، اس سلسلے میں حکومت کی حالیہ پالیسیوں نے امید و اعتماد کی ایک نئی فضا پیدا کی ہے اور عوام میں ایک نیا جذبہ پیدا کیا ہے جو ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے فال نیک ہے۔

ہمارے رہنماؤں نے اپنی قربانیوں سے ملک کے سامنے ایک روشن مثال قائم کی۔ اب اس کو سنبھالنے، سنوارنے اور آگے بڑھانے کی ذمہ داری ہماری ہے۔ یوم جمہوریہ کے دن، ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہئے کہ اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے ہم کس حد تک آمادہ ہیں۔

گزشتہ برس ہم نے آج کل کے کئی خصوصی نمبر شائع کئے جنہیں عام طور پر پسند کیا گیا خصوصاً جدید ہندوستانی شاعری نمبر" کو جس طرح سراہا گیا اس سے ہماری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہر سال ہم اپنے طور پر کوئی موضوع طے کر کے اگست کا خصوصی نمبر شائع کرتے رہے ہیں اس بار آپ ہمیں لکھئے کہ ہم کس موضوع پر خصوصی نمبر شائع کریں۔

گزشتہ دنوں میں آج کل کی بکری میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور ہندوستان کے متعدد شہروں میں ہماری ایجنسیاں قائم ہوئی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنجیدہ رسائل کے پڑھنے والوں کی کمی کا جو عام احساس پایا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے مگر اس کے باوجود یہ بھی درست ہے کہ علمی و ادبی رسائل پڑھنے والوں کی تعداد پھر بھی کم ہے۔

جب ہم اردو کے سلسلہ میں کوئی بات کہتے ہیں تو دو کروڑ سے زائد وہ افراد ہمارے پیش نظر ہوتے ہیں جن کی مادری زبان (۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق) اردو ہے۔ اور عالم یہ ہے کہ اردو کی ادبی کتابیں پانچ سو کی تعداد میں چھپتی ہیں اور وہ بھی دو تین سو سے زائد نہیں بکتیں۔ اور یہ خریداری بھی زیادہ تر لائبریریاں کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے اگست ۱۹۶۸ء کے اردو نمبر میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا مگر بات جہاں تھی وہیں ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اردو کی انجمنیں اور کارکن ان تمام مسائل کا جائزہ لیں جو اردو کتابوں اور رسائل کی بکری کے راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں۔

فضا ابن فیضی

نیا سال

وقت کے اجلے دریچوں پہ نئے سال کا پھول
نزہت و تازگی و حسن کا گہوارہ ہے
اپنے آذر کا گل اندام صنم پارہ ہے
شاخ پر جیسے ہنسے کوئی تر و تازہ گلاب
طاق میں جیسے جلے کوئی سنہرا فانوس
جیسے صبحوں کے افق پر کوئی تارا چمکے
جس طرح چاند کوئی تاج محل میں اُترے

جس طرح آئینہ خانے میں سنوارے خود کو
کوئی ہنستا ہوا پیکر، کوئی ذی روح صنم
اپنی تخلیقِ گرامی پہ ہو نازاں جیسے
کسی شاعر کا جوان و طرب آہنگ قلم
جس طرح بزمِ سخن میں کوئی شاداب غزل
اپنی رعنائیِ نوخیز کا اظہار کرے
جس طرح دستِ مصور کی بہاریں جنبش
لینوس کے ورقِ سادہ کو گلزار کرے

اس کا ہر لمحہ سبک، پھول کی پتی کی طرح
اس کا ہر جلوہ حسیں، خندۂ گل کی مانند
اس کی ہر صبح میں رخسار کے سونے کی جھلک
اس کی ہر چھاؤں میں غلطیدہ جواں زلفوں کی چھاؤں
اس کی رفتار کے شرمائے ہوئے لوچ میں گم
ابروئے ناز کا خم، نازنیں پلکوں کا جھکاؤ
اُس کے پیکر کے مہکتے ہوئے آہنگ میں جذب
شعر و صہبا کا فسوں، جذبہ و مستی کا رچاؤ

یہ نیا سال — بہاروں کا یہ نوعمر رسول
عشرتِ تازہ کا پیغام لئے آیا ہے
خوشبو و کیف کا انعام لئے آیا ہے
تم "نئے سال" کے گلدستۂ "رعنائی" کو
اپنے گلدانِ تمنا میں سجا کر رکھ لو
اپنی محفل میں یہ فانوس جلا کر رکھ لو
اور یہ گزرے ہوئے سال کا سوکھا ہوا پھول
جس میں خوشبو ہے نہ رنگت نہ لطافت ہے نہ رس
ہے جو خود اپنی ہی خوں گشتہ امیدوں کا قفس
اب اُسے پھینک دو تم لوچ کے گلدانوں سے
جھاڑ دو دامنِ لمحات پہ بیٹھی ہوئی گرد
مانگ لو ایک نیا عیش طرب خانوں سے

میں نے مانا کہ نئے سال کی روشن راہیں
ہیں ابھی حسرت و اندیشہ کے ظلمات میں گم
یہ نئی صبح ہے راتوں کے حجابات میں گم
کتنے ایسے ہیں جو دریا پہ رہیں گے پیاسے
کتنے ایسے ہیں جو قطروں سے نچوڑیں گے فرات
کتنے ایسے ہیں جو سائے میں جلیں گے بیٹھے
دھوپ کتنوں کے لئے چاندنی بن جائیگی

کتنے ایسے ہیں تپائے گی جنہیں اوس کی آنچ
کتنے ایسے ہیں جو شعلوں کو بھی پی جائیں گے
کتنے ایسے ہیں سجائیں گے جو زخموں کی دکان
کتنے ایسے ہیں جو اندوہِ خزاں سے آزاد
کاروبارِ گل و لالہ میں رہیں گے مصروف
کتنے ایسے ہیں جنہیں "نقرۂ و نیلم" کا غرور
عرش و اورنگ سے نیچے نہ اترنے دے گا
کتنے ایسے ہیں کہ افلاس کا جن کے زنگار
اُن کے پہلو کا کوئی زخم نہ بھرنے دے گا
کتنے ایسے ہیں جو باوصفِ چمن پیرہنی
خود کفِ دست پہ شعلوں کی حنا باندھیں گے
کتنے ایسے ہیں جو چھاؤں میں ارمانوں کی
عمرِ خوش مایہ سے پیمانِ وفا باندھیں گے
لیکن اس صورتِ حالات کا شکوا کیسا
زندگی تو انہیں حالات کا مجموعہ ہے
شہد و صبر و سم و تریاق کا آمیزہ ہے
یہ دکھوں، حسرتوں، اندیشوں کی چھائی ہوئی کہر
حزن و مایوسی و محرومی کے پھیلے ہوئے دام
حوصلے ہوں جو طرب خیز تو پھر کچھ بھی نہیں
نشۂ شوق جو ہو تیز تو پھر کچھ بھی نہیں

تم نئے سال کی لائی ہوئی سوغاتوں سے
منتخب اپنے لئے کر لو وہ سوغاتِ جمیل
کہ انھیں ایک قرینے سے جہاں بھی رکھ دو
وہ جگہ ایک حسیں آئینہ خانہ بن جائے
زندگی مرحلۂ کیفِ شبانہ بن جائے
رنگ و نکہت کے جزیروں میں کھلے رختِ سفر
خیر مقدم کرے مستقبلِ زرّیں کی سحر
وقت کے اجلے دریچوں پہ نئے سال کا پھول
نزہت و تازگی و حسن کا گہوارہ ہے
اپنے آذر کا گل اندام صنم پارہ ہے۔



ایس ایم سعید

آزادی کیا ہے

آزادی کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق جو بھی چاہے کر سکتا ہے۔ ہر آدمی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی فطری قوتوں کو جس طرح چاہے بروئے کار لائے اور ایسا کرنے میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ اگر آزادی کے اس تصور کو صحیح مان لیا جائے تو آزادی اور طاقت دونوں مترادف ہو جائیں گے کیوں کہ اس طرح سے آزادی کی اساس سماجی انصاف پر نہ ہو کر طاقت پر ہوگی۔ سماج میں جو آدمی جتنا کمزور ہوگا اس کی آزادی اتنی ہی کمزور ہوگی۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ہر فرد اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کے اعتبار سے فطری طور پر یکساں نہیں ہوتا اس لئے جب آزادی کا تعین طاقت کی بنیاد پر ہوگا تو آزادی کے مختلف مدارج وجود میں آئیں گے، جو ہر فرد میں اس کی طاقت کی کمی یا زیادتی کے لحاظ سے مختلف ہوں گے اور آزادی ایک اضافی چیز ہو جائے گی یہاں تک کہ سماج کے وہ انتہائی طاقتور افراد بھی جن کو تمام سہولتیں اور آزادیاں حاصل ہوں گی وہ بھی پُر اطمینان اور محفوظ زندگی نہ گزار سکیں گے کیوں کہ اُن میں سے ہر ایک کو یہی فکر ہوگی کہ کہیں دوسرا طاقتور شخص اُسے اپنے ماتحت نہ کر لے۔ دوسری طرف سماج کا ایک بڑا حصہ چند طاقتور افراد کی مرضی و خوشی کا تابع ہو کر رہ جائیگا اور ایسی آزادی انھیں چند طاقتور افراد کا غلام بنا دے گی۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں آزادی کی بنیاد حق پر نہ ہو کر طاقت پر ہو، آزادی کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ ایسی آزادی تو ہماری اجتماعی زندگی کے نظام کو درہم برہم اور پورے معاشرہ کے شیرازے کو ہی منتشر کر دیگی۔ اس طرح ہر فرد آزاد رہنے کے لئے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوگا، لیکن اُن میں سے کوئی بھی اس ماحول کو نہ پا سکے گا جس میں وہ اپنی شخصیت کو اپنی فطری صلاحیتوں کے بموجب پروان چڑھا سکے کیوں کہ ان حالات میں آزادی کا کیا سوال کسی کی زندگی کی ہی کوئی ضمانت نہ ہوگی۔ ایسی لامحدود آزادی شاید اُس وقت ممکن ہوتی اگر ہمارے مفاد میں کوئی تضاد نہ ہوتا اور آدمی میں خود غرضی کا عنصر نہ پایا جاتا۔ لیکن صورت یہ ہے کہ مختلف افراد کے مفاد مختلف ہیں اور ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ پورا کر سکے اس لئے سماج کے وہ چند طاقتور افراد جنھیں محض طاقتور ہونے کی وجہ سے آزادی ملے گی اُن میں بھی کشمکش کا ہونا لازمی ہے کیوں کہ اُن میں بھی سب طاقت کے اعتبار سے بالکل برابر نہ ہوں گے اور وہ بھی ایک دوسرے پر اپنے اقتدار کو قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سماج میدانِ جنگ بن کر رہ جائے گا جس میں آزادی کے لئے ایک طرف تو طاقتور اور کمزور افراد کے درمیان اور دوسری طرف خود طاقتور افراد کے بیچ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ چھڑ جائیگی جس کا خاتمہ شاید پورے معاشرے کی تباہی و بربادی کے بعد ہی ہو سکے گا۔ اس طرح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آزادی جسے ہم ہر دور میں انسان کا پیدائشی حق سمجھ کر حکومتوں سے مانگتے رہے ہیں، اس آزادی سے مختلف ہے جس کے معنی "جو چاہو

کرد" سمجھے جاتے ہیں۔

عصرِ حاضر کے مشہور مفکر ہیرالڈ لاسکی کا کہنا ہے کہ "آزادی سے مراد ایک ایسے ماحول کو پیدا کرنا و برقرار رکھنا ہے جس میں انسان کو اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے کا پورا موقع مل سکے۔" درحقیقت آزادی کا مقصد ایسی سہولتوں کو حاصل کرنا ہے جو ہمیں اپنی فطری صلاحیتوں کے بموجب ترقی کرنے اور ایک خوشگوار زندگی کی تعمیر کرنے کے لئے عام طور پر ضروری سمجھی جاتی ہوں۔ اس لئے لاسکی کا کہنا ہے کہ "میری نظر میں آزادی کا مطلب سماجی حالات پر سے اُن پابندیوں کا ختم ہونا ہے جو موجودہ تہذیب میں انسان کی خوشحالی کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہوں۔" حقیقت یہ ہے کہ سچی آزادی پابندیوں میں پنہاں ہوتی ہے لامحدود طریقے پر اپنی قوتوں کو بروئے کار لانے میں نہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہمارا جسم ہمارا دل و دماغ اور ہماری قوتیں ہماری اپنی ملکیت ہیں لیکن ان کو استعمال کرنے کا غیر محدود حق ہمیں نہیں ہوتا ہے۔ سماج کا ایک رکن ہونے کے ناتے ہمیں دوسروں کے مفاد کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اپنی فطری قوتوں کو محض اُس حد تک استعمال کریں گے جس سے دوسرے افراد کی آزادی میں خلل نہ پڑے، ورنہ پھر تو یہ سماجی رشتے ہی ختم ہو جائیں گے، کیونکہ اپنے مفاد اور مفادِ عامہ کے بیچ توازن برقرار رکھنا ہی سماج کی بنیاد ہے۔ ہماری ذہنی اور جسمانی قوتوں کے استعمال پر ایک پابندی ہے اور وہ ہے مفادِ عامہ کی یعنی اگر ہم مفادِ عامہ کو بالکل نظرانداز کر کے من مانے ڈھنگ سے کام کرنے لگیں گے تو ایک طرح کا نراج پیدا ہو جائے گا اور کوئی بھی شخص پرسکون زندگی نہ گزار سکے گا۔ ان حدود یا پابندیوں کو جو ہم مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اپنی فطری قوتوں کے استعمال پر عائد کرنا قبول کرتے ہیں فرائض کہلاتے ہیں۔ لہٰذا اگر سماج میں رہنے والے افراد اپنے سماجی فرائض کو نظرانداز کر دیں گے تو وہ اپنے حقوق سے بھی محروم ہو جائیں گے، کیونکہ حقوق و فرائض لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک باوقار زندگی گزارنے کے لئے اور سماج کے ہر فرد کو اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر فرد پر کچھ ایسی پابندیاں ہوں جو انہیں صرف اس حد تک کام کرنے کی آزادی دیں جو یقیناً اُن کی ترقی کے لئے ضروری ہوں، جو یہ طے کر سکیں کہ ہمیں کون سا کام کرنا چاہئے اور کون سا نہیں، جو یہ بتا سکیں کہ اگرچہ جسمانی قوت ہماری اپنی ملکیت ہے مگر اس کا استعمال دوسرے کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے نہ ہونا چاہئے۔ جو یہ سمجھا سکیں کہ اگرچہ ہمیں اپنے ذہن و زبان پر قدرت حاصل ہے مگر ہمیں اپنی زبان کھولنے کا حق صرف اُس حد تک ہے جس سے دوسروں کی زبان پر پابندی نہ لگنے پائے۔ جو یہ بتا سکیں کہ اگرچہ چلنے پھرنے کی طاقت ہم میں ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جس کسی کے گھر میں چاہیں گھس جائیں۔ مختصر یہ کہ ایسی پابندیوں کا ہونا ضروری ہے جو اُن حدود کو متعین کر سکیں جن کے خلاف عمل کرنا مفادِ عامہ کے لئے مہلک اور سماج کے وجود کے لئے خطرناک ہو۔ اس لئے آزادی کے لئے ضروری ہے کہ ہم پر کچھ پابندیاں ہوں اور جیسا کہ ولوبی کا کہنا ہے کہ "آزادی کا وجود اسی وقت ممکن ہے جب کہ پابندیاں بھی ہوں۔" ہربرٹ سپنسر کا بھی کہنا ہے کہ "ہر آدمی اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لئے آزاد ہے بشرطیکہ وہ کام دوسروں کی آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کے لئے پابندیاں ضروری ہیں تو یہ پابندیاں ہم پر کون لگائے۔ یہ کون طے کرے گا کہ ہمیں کس حد تک کام کرنا چاہئے اور کہاں تک نہیں۔ یہ کون بتائے کہ ہم اپنی ذہنی و جسمانی قوت کا استعمال کہاں تک کریں کہ اس سے دوسرے افراد کی آزادی میں کوئی خلل نہ پڑے۔ ظاہر ہے کہ خود افراد کو اس بات کا حق دینا کہ وہ جہاں تک یہ محسوس کریں کہ اُن کا کام کرنا مفادِ عامہ کے خلاف نہیں ہے وہ کسی کام کو کر سکتے ہیں، ایک بے معنی بات ہوگی۔ کیونکہ آدمی میں بہرحال خود غرضی پائی جاتی ہے اس لئے وہ اپنے مفاد کے لئے اپنے کام کرنے یا اپنی آزادی کی حدود کو وسیع کرتا رہے گا اور سماج میں پھر ایک کشمکش پیدا ہو جائے گا کیونکہ ہر شخص جو چاہے کرے گا اور یہ کہے گا کہ اس کا وہ فعل مفادِ عامہ کے خلاف نہیں ہے۔ اس طرح مفادِ عامہ کی وضاحت کہ وہ کیا ہے ایک نزاعی مسئلہ بن کر رہ جائے گا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ پابندیاں کسی ایسی

طاقت کے ذریعہ لگائی جائیں جو غیر جانبدار ہو اور جس پر عوام کو اعتماد ہو ایسی طاقت ریاست ہی ہو سکتی ہے جس کا مقصد ہی عوام کے لئے ایک خوشگوار زندگی کی تعمیر کرنا ہے۔ ریاست اپنے مقاصد کی تکمیل قانون کے ذریعے کرتی ہے اس لئے قانون ہی وہ طاقت ہے جو ایک ریاست میں رہنے والے تمام افراد کے لئے ایسے ماحول کو پیدا کرتا ہے جو لوگوں کو خاطر خواہ ترقی کرنے کا موقع فراہم کر سکے اور جو کمزور پر سے طاقتور کے ناجائز اقتدار کو ختم کر کے ہر آدمی کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق آزادانہ طور پر زندگی گذارنے کا موقع دیتا ہے۔ جو ہماری فطری قوتوں پر کچھ پابندیاں عائد کر کے سماجی امن کو ممکن بناتا ہے اور جس کے تابع رہ کر ہی ہم اپنے سماجی رشتوں کو مستحکم بناتے ہیں۔ دراصل قانون ہی یہ پابندیاں لگا سکتا ہے کہ ہم کون سا کام کس حد تک کر سکتے ہیں اور ان پابندیوں میں ہی آزادی پوشیدہ ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آزادی کے علمبردار جان لاک نے کہا تھا "جہاں قانون نہیں ہے وہاں آزادی کا وجود ممکن نہیں ہے۔"

قانون اور آزادی کا باہمی رشتہ کیا ہے، اس پر مفکرین میں اختلاف ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قانون سے ہماری آزادی محدود ہوتی ہے۔ جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ آزادی محض قانون کے ذریعہ ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو یقینی ہے کہ ایک ایسے سماج میں جہاں لاقانونیت کا دور دورہ ہو آزادی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہاں ہر آدمی من مانے ڈھنگ سے کام کرے گا۔ قانون جو پابندیاں ہم پر عائد کرتا ہے اس کا مقصد دوسروں کو آزاد رہنے کا موقع دینا ہے۔ وہ قانون جو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ کسی آدمی کو قتل کرنا جرم ہے اور قاتل پھانسی کا مرتکب ہوتا ہے، بظاہر اپنی فطری آزادی پر پابندی عائد کرتا ہے اس کے بموجب ہم اپنے ہاتھ پیر کا استعمال ضرور اس حد تک ہی کر سکتے ہیں جس سے کسی کی جان و مال کو نقصان نہ پہونچے اگر یہ قانون جو ہم پر ایک پابندی لگا کر ہماری آزادی کو محدود بنا دیتا ہے نہ ہوتا تو پھر سماج میں رہنے والوں کی آزادی تو درکنار ان کی زندگی کا ہی کچھ تعین نہ ہوتا۔ اس لئے وہ قانون جو قتل کرنے کو جرم قرار دیتا ہے بظاہر چند افراد کی جسمانی قوت کے استعمال پر پابندی لگا کر سیکڑوں افراد کو زندہ رہنے کا موقع دیتا ہے۔ اس طرح یہ قانون کہ سڑک پر ایک محدود رفتار میں موٹر چلائی جائے بظاہر موٹر چلانے والوں پر پابندی لگاتا ہے، مگر یہ اس پابندی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم سڑک اطمینان سے آجا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین عام طور سے آزادی کو جنم دیتے ہیں۔ اگر قانون ہمیں کسی کام کرنے کو منع کر دے تو ہم اس کام کو نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ ریاست میں رہنے والے تمام افراد کے اعمال کو کنٹرول کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر قانون تحریر و تقریر کی آزادی پر کچھ پابندیاں لگا دے تو ہماری آزادی یقیناً محدود ہو جائے گی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہماری آزادی بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ قانون کس حد تک ویسا کرتا ہے جو ہمارے لئے اور مفاد عامہ کے لئے سودمند اور ضروری سمجھتا ہے۔ اس طرح قانون دو طرح سے ہماری آزادی کو متاثر کرتا ہے۔ ایک طرف تو یہ ہم پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے کہ ہم کسی کو قتل نہ کریں، کسی کی ملکیت پر ناجائز طور پر قبضہ نہ کریں، امن وامان میں مزاحمت نہ کریں وغیرہ ایسی پابندیاں ہیں جو ہمیں کچھ کام کو کرنے سے روکتی ہیں لیکن انہی پابندیوں میں دوسروں کے لئے بہت آزادی پوشیدہ رہتا ہے۔ دوسری طرف قوانین ایسے حالات و ما[حول] کو بھی پیدا کرتے ہیں جن میں ہم زیادہ سے زیادہ آزاد رہ سکیں یعنی ا[پنی] فطری صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں۔ مثال کے طور پر حکومت کی طر[ف] سے تعلیم سے متعلق دی جانے والی سہولتیں، طبی امداد، مزدوری کی [شرح] کو مقرر کرنے والے قوانین کسی نہ کسی طرح سے ہماری آزادی کو م[حدود] کرتے ہیں اور ان کا مقصد بالآخر یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی [کے] مختلف شعبوں میں ترقی کرنے کے لئے ان تمام سہولتوں کو حاصل کر[ے] جو ضروری ہوں۔

آزادی اور قانون کے متعلق دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قانون آ[زادی] کے لئے مضر ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہم پر پابندیاں عائد کرتے ہیں جن[سے] ہماری آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس نظریہ کو پوری طرح [تسلیم] نہیں کیا جا سکتا پھر بھی اس میں صداقت کا کچھ عنصر ضرور ہے [وہ] یہ ہے کہ نہ تو ہر قانون آزادی کا پیدا کرنے والا ہوتا ہے اور نہ [ہی]

ہر قانون کو آزادی کا دشمن کہا جا سکتا ہے۔ ایک قانون ہماری آزادی کے لئے ضروری ہے یا اُس کے لئے مضر، یہ خود اُس قانون کی فطرت پر منحصر ہے اور قانون کی فطرت کا انحصار طرزِ حکومت پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انانیت پسند حکومت کے قوانین عوام کے مفاد کے بجائے حکمراں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں، اور اُسی کی مرضی پر مبنی کرتے ہیں جب کہ جمہوریت میں بننے والے قوانین کے پیچھے عوام کی حمایت شامل ہوتی ہے۔ اسی سبب سے جمہوریت ہی وہ طرزِ حکومت ہے جس میں عوام کی آزادی کو سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے روسو کا کہنا کہ "آزادی ایسے قوانین کی پابندی کا نام ہے جو ہم خود اپنے اوپر عائد کرتے ہیں"۔ اسی طرح گرین کا یہ عقیدہ تھا کہ آدمی اُس وقت آزاد ہوتا ہے جب وہ ایسے قوانین کا تابع ہوتا ہے جنھیں وہ اپنی شخصیت کو مکمل بنانے کی غرض سے مانتا ہوں اور جس میں خود اُس کی مرضی شامل ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے قوانین جن کا مقصد محض حکومت کے مفاد کو پورا کرنا ہوتا ہے آزادی کے لئے بلا شبہ مضر ثابت ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے لاسکی کا کہنا ہے کہ "جو پابندیاں قانون کی شکل میں ہم پر عائد کی جائیں وہ ایسی ہونا چاہئیں جن کی اہمیت وافادیت کو ہماری عقل تسلیم کرنے پر تیار ہو لیکن جہاں آدمی کو ایسے کاموں کو کرنے سے روکا جا رہا ہو جنھیں کرنا وہ اپنی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے ہوں، وہاں یہ پابندیاں آزادی کو سلب کر لیتی ہیں۔" ایک حکومت ایسے قوانین کو وضع کر سکتی ہے جس کا مقصد عوام کی آزادی ہی کو ختم کر دینا ہو۔ مختلف ممالک میں ہونے والی بغاوتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ جب ان ملکوں کی حکومتوں نے ایسے قوانین وضع کرنا شروع کر دیئے جنھیں عوام اپنی آزادی کے لئے خطرناک محسوس کرنے لگے تو انہوں نے اس حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اسی کا تختہ اُلٹ دیا۔ جمہوریت میں بھی ایک ایسی منزل آسکتی ہے، جہاں حکومت کے قوانین عوام کے مزاج کے خلاف ہوں یا جب حکومت عوام کے حقوق میں بے جا مداخلت کرنے لگے۔ حکومت کی بےجا مداخلت اور عوام کی آزادی کے تحفظ کے لئے ہی تقریباً سب ہی جمہوری ممالک کے دستور میں عوام کو کچھ بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں جو حکومت کے ذریعہ بنائے جانے والے قوانین سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس طرح قوانین نہ صرف ایک فرد کی آزادی کا تحفظ دوسروں کی بےجا مداخلت سے کرتے ہیں بلکہ وہ حکومت کی بےجا مداخلت سے بھی عوام کے حقوق کی محافظت کرتے ہیں اس لئے قانون آزادی کے لئے ایک بنیادی شرط ہے۔

آزادی اور قانون کے اس باہمی ربط کا لازمی نتیجہ سماجی مساوات کا قیام ہوتا ہے۔ یہ تو ہم تسلیم کر ہی چکے ہیں کہ بغیر پابندیوں کے آزادی ممکن نہیں اور یہ پابندیاں قانون کی شکل میں لگائی جاتی ہیں۔ ان پابندیوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ جسمانی اعتبار سے کمزور ہیں وہ طاقتور افراد کی ناانصافیوں سے محفوظ رہ سکیں اور اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق بغیر کسی دشواری کے اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکیں۔ دوسرے الفاظ میں قانون کے ذریعہ لگائی جانے والی پابندیاں آزادی کو کسی ایک طبقے کی جاگیر نہ بنا کر اُسے عام انسانوں کے ایک حق کی شکل میں ہر انسان کو دلانا چاہتی ہیں۔ اسی سے مساوات کا جنم ہوتا ہے کیونکہ ہماری فطری قوتوں پر لگائی جانے والی پابندیاں سماج کے ہر فرد کو اس بات کا موقع فراہم کرتی ہیں کہ وہ آزادانہ زندگی گزار سکے۔ اس طرح آزادی و مساوات لازم و ملزوم بن جاتی ہیں۔

اگرچہ جمہوریت کی اساس ہی آزادی اور مساوات پر ہوتی ہے پھر بھی کچھ مفکرین ایسے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ سماج میں آزادی اور مساوات دونوں ساتھ ساتھ ممکن نہیں اور ایک کا وجود دوسرے کے خاتمے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ایک انتہا پسندانہ نظریہ ہے جس کی بُنیاد آزادی اور مساوات کی دی جانے والی غلط تعریفوں پر ہے۔ اگر آزادی اور مساوات کو ہم اُس کے لغوی معنوں کے اعتبار سے مانتے ہیں، تو یقیناً آزادی اور مساوات ایک دوسرے کے لئے خطرناک ہیں۔ اگر آزادی کا مطلب بلا کسی پابندی کے کسی بھی کام کو کرنے کے لئے با اختیار ہونا اور آزاد ہونا ہے تو ایسی صورت میں سماج سے مساوات کا فنا ہو جانا لازمی ہوگا۔ کیونکہ پھر تو چند طاقتور افراد ہی آزاد رہ سکیں گے اور باقی لوگ اُن کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ اسی طرح اگر مساوات کے معنی یہ

لئے جائیں کہ ہر آدمی کو ہر معاملے میں بغیر اس کی صلاحیتوں کے دیکھے ہوئے برابر بنا دیا جائے تو اس سے سماج سے آزادی مفقود ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر برابری کا مطلب یہ لیا جائے کہ ہر آدمی کو کھانے پینے رہن سہن زبان، مذہب، پیشے مختصر یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں یکساں بنا دیا جائے تو اول تو ایسا ممکن ہی نہ ہوگا کیونکہ فطری اعتبار سے ہر شخص ایک سا پیدا نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ اگر قانون طاقت کے ذریعے ہر آدمی کو برابر بنانا بھی چاہے گا تو اس سے آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر مساوات کو اس کے لفظی معنوں میں قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو آزادی فنا ہو جائے گی لیکن آزادی کی طرح مساوات کے بھی کچھ مخصوص معنی ہوتے ہیں۔ مساوات کا مطلب ہے برابر والوں میں برابری؛ یعنی ایک ہی قسم کی صلاحیت رکھنے والے افراد میں مذہب، ذات رنگ، دولت وغیرہ کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ کرتے ہوئے انھیں مساوی حقوق اور سہولتیں دی جائیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ قانون فرد اور فرد کے درمیان کوئی تفریق نہ کرتے ہوئے تمام سہولتیں ہر شخص کو مساویانہ طریقے پر دے اور ان معنوں میں مساوات آزادی کی بنیاد ہے۔ مشہور مفکر لاسکی نے آزادی کے لئے جو شرطیں بتائی ہیں ان میں پہلی شرط یہ ہے کہ سماج میں حقوق خصوصی کا فقدان ہو یعنی ریاست اور قانون کے ذریعے کسی خاص فرد یا طبقے کو مخصوص سہولتیں جانبدارانہ طور پر نہ دی جائیں ورنہ جنھیں زیادہ سہولتیں اور آزادی ہوگی وہ یقیناً برتری حاصل کر لیں گے اور نتیجتاً دوسرے نظر انداز کئے گئے افراد اس مخصوص طبقے کے ہاتھوں میں اپنی زندگی کو سپرد کرنے کے لئے مجبور ہوں گے۔ سماج کے تمام افراد آزاد رہ سکیں اس کے لئے ضروری ہے کہ سماج میں سماجی اور سیاسی مساوات ہو، ورنہ ایسی آزادی جو چند افراد تک محدود ہو درحقیقت آزادی نہ ہوگی۔

ان تمام باتوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آزادی اگرچہ ہمارا بنیادی حق ہے اور یہ ایک انسان ہونے کے ناتے ہمیں ملنا چاہئے مگر اس آزادی کا مطلب من مانے ڈھنگ سے کام کرنا نہیں ہے کیونکہ ایسی آزادی تو انسانیت کش اور سماج دشمن ہوگی۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ آزادی کی اساس پابندیوں پر ہے، ایسی پابندیاں جو دوسروں کو مساویانہ طور پر آزاد رہنے کا موقع دے سکیں اور جن پابندیوں کی بنیاد انصاف پر ہو، ان پابندیوں کا نام قانون ہوتا ہے اس لئے آزاد رہنے اور دوسروں کو آزادانہ زندگی گزارنے کا موقع دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان قوانین کا احترام کریں جو حکومت مفادِ عامہ کے پیش نظر بناتی ہے جب تک ہم اپنے فرائض کو پورا نہ کریں گے اس وقت تک حقیقی معنوں میں آزادی کا تصور ہی ممکن نہ ہوگا۔

ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ آزادی کی جو امانت ہمارے جنگِ آزادی کے شہیدوں نے ہمارے سپرد کی ہے اس کی حفاظت کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے اور آزادی کا وہ حق جو دستور نے بنیادی حقوق کی شکل میں دیا ہے انہیں پانے کے لئے ہمیں کن فرائض کی تکمیل کرنا ہے؟ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ آزادی قانون شکنی کے ذریعہ ممکن نہیں، وہ قانون کا احترام کر کے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہر جائز و ناجائز قانون کو ماننے کے لئے مجبور ہیں۔ ہمیں یقیناً ایسے قوانین کی مخالفت کرنے کا حق حاصل ہے جو ہم مفادِ عامہ کے لئے مضر سمجھتے ہوں۔ مگر ایک جمہوری حکومت میں حکومت کی مخالفت کرنے کے بھی کچھ دستوری طریقے ہوتے ہیں۔ ملک کی سالمیت اور امن و امان کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان دستوری حدود کو نظر انداز کر کے کوئی ایسا طریقہ نہ اپنائیں جس سے ہمارے ملک کے وقار کو کوئی ٹھیس پہنچے۔ ہمارے دستور نے عوام کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں حکومت کے بنانے اور بدلنے کا حق دیا ہے اور جب اتنا اہم ترین حق ہمارے پاس ہے تو پھر ہم قانون شکنی کے راستے کو کیوں اپنائیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ہم ایک آزاد معاشرت کی تشکیل کرنے اور ایک خوشگوار زندگی کے لئے خوشگوار ماحول پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

سالانہ چندہ: ہندوستان میں ۷ روپے، پاکستان میں: ۷ روپے (پاک)
دیگر ممالک سے: ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ: ہندوستان میں: ۶۰ پیسے، پاکستان میں: ۶۰ پیسے (پاک)
دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

سلام مچھلی شہری



گاندھی

ازھی نیا تھے
"بھارت ماں کے" سپنوں کا کومل پریتک
ن کی بدولت جاگی — پہونچی، منزل تک اپنی تحریک
اندھی کیا تھے
بھوکی، پیاسی دھرتی کے ذی ہوش فقیر
ن کی بدولت بے شک ٹوٹی اپنے پیروں کی زنجیر
اندھی کیا تھے
خواب دلِ جمہور کا دلکش ردِّ عمل
مادرِ ہند" کے ویران چہرے پر اک نورانی آنچل

ندھی کیا ہیں
اک حقیقت — جس کو ہم سمجھے ہیں خواب
س کی تعبیر حسیں کی کھوج میں دنیا ہے بے تاب
ندھی کیا ہیں
اس سائنسی دور میں روحانی آواز
یعنی جب ہونے والا ہے ایک سحر کا پھر آغاز
ندھی کیا تھے
ایک حقیقت
ندھی کیا ہیں
ایک خیال
ن اُن کی یاد سے روشن عہدِ ماضی — بزمِ حال —!!

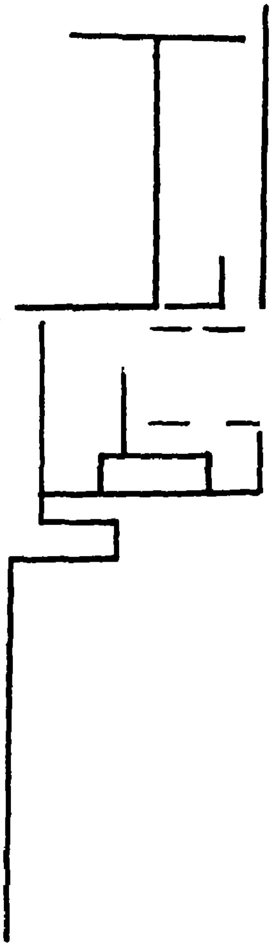


ساجدہ زیدی

کتنا بوجھل ہے یہ احساس کا سارا ماحول
آگہی کتنی گراں بار ہوئی جاتی ہے

پھر نہ آئے کوئی غم خانے کی دیواروں میں
پھر نہ دینا پڑے مجبور وفاؤں کا حساب
منتظر ہوں نہ نگاہیں، کہ کوئی شوخ نظر
پھر اِن آنکھوں میں جگا دے گا کوئی خوابِ جمیل
سانس روکے نہ تمنا، کہ کوئی نرم قدم
دھیرے دھیرے درِ احساس پہ دستک دے گا
چیخ اُٹھے نہ یہ پہلو میں دھڑکتا ہوا دل
پھر کوئی شعلہ بدن روح کی آتش دہکائے
اپنے انجام کا ہی بار اُٹھانا ہوگا
شب کے دامن میں نہ بکھریں کبھی شبنم کے گہر
پھر نہ تھرائیں کبھی پلکوں کے اشکوں کے نجوم
درد پروردہ نگاہوں میں کوئی خواب نہ ہو
غم سے بوجھل دلِ بیتاب بھی بیتاب نہ ہو
پھر نہ رشتہ کہیں ٹوٹے ہوئے دل کا جڑ جائے
گرتی دیواروں سے، پتھرائی ہوئی آنکھوں سے
زرد رخساروں سے، مرجھائی ہوئی کلیوں سے
روزنِ در میں جو پیوست ہیں اِن نظروں سے
اپنی قبروں میں جو زندہ ہیں اِن آوازوں سے
کرب ہی کرب یہ فکر و نظر کی دُنیا
آگ ہی آگ ہے یہ مستیٔ کردار کا دور
ذہن بیدار ہو کیوں، روح طلبگار ہو کیوں ؟
پھوڑ لوں دیدۂ بیدار، بجھا دوں شمعیں
زخم جس طرح سے ہونٹ بھی سی لوں اُسی طور
دُور تک شہرِ جنوں میں کوئی آواز نہ ہو

آج احساس کا یہ بارِ گراں بھی پھینک آؤں
زندگی یوں بھی سبک بار گزر جائے گی





سایہ

بلراج کومل

"گٹر.. گٹر.. گٹر. . . . سال بھر میں دس مکان بدل ڈالے لیکن اس گٹر سے چھٹکارا نہ ملا۔ یہ وہیں کا وہیں رہا" — نرمل نے جھنجھلا کر کہا اور کھڑکی بند کر دی۔
مشکل یہ ہے کہ آپ کو گٹر سے اس قدر دلچسپی ہو گئی ہے کہ آپ اُسے ہر جگہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ اس غلاظت کے لئے میں ذمّہ دار ہوں ؟"

"ایک ڈھنگ سے شاید آپ ہی ہیں کیونکہ آپ کی نگاہ صرف غلاظت پر ہی پڑتی ہے۔ آپ دوسری باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس مکان کو ہی لے لیجئے۔ اس میں کیا نقص ہے کھلا کھلا ہے، ہوادار ہے، دھوپ اچھی طرح آتی ہے، تمام سہولتیں ہیں لیکن آپ ہیں کہ ہر روز کھڑکی کھول دیتے ہیں اور ذرا سی غلاظت سے پریشان ہو کر گٹر گٹر چلانا شروع کر دیتے ہیں" — کلپنا متوازن آواز میں بولتی چلی گئی۔

"میں غلاظت برداشت نہیں کر سکتا"

"تھوڑی بہت تو آپ کو زندگی بھر برداشت کرنی پڑے گی کیونکہ یہ دُنیا آپ کی بنائی ہوئی نہیں ہے اور اس میں میرے اور آپ کے علاوہ بھی بہت سے لوگ رہتے ہیں" — کلپنا نے مسکرا کر کہا۔

"آخر انسان اور حیوان میں کچھ فرق ہے"

"آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جہاں انسان رہتے ہیں وہاں غلاظت ضرور ہو گی۔ مجھے کئی بار محسوس ہوتا ہے کہ آپ غلاظت سے نفرت کرتے کرتے کئی بار انسانوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ میں دن بھر صفائی کرتی رہتی ہوں، لیکن آپ کی تسلی نہیں ہوتی۔ اس دن آپ نے پڑوسی کے بچے کو پیٹ دیا۔ اگر بات بڑھ جاتی تو کیا ہوتا. . . "

"دیکھو کلپنا تم خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہی ہو۔ زندگی گزارنے کا میرا اپنا ڈھنگ میری مجبوری صرف یہ ہے کہ میں صاف ستھرے ماحول میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ شا سے پہلے میں نورتھ اوینیو میں رہا کرتا تھا۔ شادی کے بعد مکان کا مسئلہ اس قدر ٹیڑھا کہ حل ہونے میں آتا ہی نہیں"

کلپنا کمرے کا سامان ترتیب سے لگا رہی تھی، نرمل کی تصویر سے گرد صاف ک ہوئے بولی۔

"لیکن کب تک مکان تبدیل کرتے رہیں گے آپ! خیر چھوڑ یئے قصّہ، وہ بو کیا ہوا جس کا آپ کئی ہفتوں سے ذکر کر رہے ہیں"

"بونس! تم نے بڑے مناسب وقت پر یاد دلایا۔ آج بونس کا اعلان ہو گا اور امید ہے ہمیں تین مہینے کی تنخواہ کے برابر بونس مِل جائے گا" — نرمل کی نرم رو موج کی طرح بہہ رہی تھی۔

"سچ! اگر تین مہینے کی تنخواہ کے برابر بونس مِل جائے تو بڑا مزا آئے گا۔ آ کو معلوم ہے میں کیا کروں گی" — کلپنا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں کیا کروں گا" نرمل نے جواب دیا

"میں بھی جانتی ہوں کہ آپ کیا کریں گے۔ آپ نیا مکان تلاش کریں گے کا کرایہ اُس مکان سے بھی زیادہ ہو گا۔"

"جاننا چاہتی ہو، میں کیا کروں گا"

"نہیں! پہلے میں بتانا چاہتی ہوں کہ میں کیا کروں گی"

"پہلے میری بات سنو۔"

"نہیں پہلے آپ میری بات سنئے "

" پہلے میں کہوں گا۔ تمہیں سننا ہی ہوگا "

" اچھا یہ بات ہے" ۔ کلپنا نے نرمل کے چہرے کا غور سے جائزہ لیا " اچھا مکان پہلے سنا یئے "

"اگر تین مہینے کی تنخواہ کے برابر بونس مل گیا تو میں ایک مہینے کی چھٹی لوں گا اور پورا ایک مہینہ کسی پہاڑ پر گذاروں گا۔ میں اس شہر کی غلاظت سے تنگ آچکا ہوں۔ میں کچھ دن اس غلاظت سے دُور رہنا چاہتا ہوں۔ میں کچھ دن سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔"

" بس ! یہ تو بڑی معمولی بات ہے ۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی ۔ بڑا مزا رہے گا۔ بلکہ پہاڑ کا سفر میری اسکیم میں بالکل فٹ ہوتا ہے ۔لیکن جس غلاظت سے آپ بھاگ کر پہاڑ پر پناہ لینا چاہتے ہیں وہ واپسی پر زیادہ بھیانک بن گئی تو کیا کریں گے آپ ؟

" اس کی فکر تم مت کرو ۔ تم اپنا پروگرام بتاؤ "

" میں دو تین نئی ساڑھیاں خریدوں گی ۔ پہاڑ کے سفر کے لئے ایک نیا کوٹ سلواؤں گی اور کانوں کے لئے نئی بالیاں بنواؤں گی ۔ اور" —— کلپنا کے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔

" مجھے منظور ہے لیکن بالیوں تک اس سے آگے نہیں"

" مجھے بھی منظور ہے بالیوں تک اس سے آگے نہیں "

خاوند اور بیوی ہنسنے لگے اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

نرمل اور کلپنا درمیانہ آمدنی کے اِن جوڑوں میں شمار ہوتے تھے جو شادی کے دسویں یا پندرھویں سال میں اگر یہی گفتگو کرتے تو اس کا انداز اور مواد مختلف ہوتا ۔ خوش قسمتی سے اُن کی شادی کو ابھی ایک ہی برس ہوا تھا اس لئے اُن کی گاڑی ٹھیک پٹڑی پر چل رہی تھی۔ کلپنا ان صحت مند اور خوبصورت عورتوں میں سے تھی جو زندگی سے لطف اندوز ہونے کے فن سے پیدائشی طور پر واقف ہوتی ہیں ۔ اُن کو بھوک خوب لگتی ہے، نیند خوب آتی ہے اور مزاج میں غصہ نہیں ہوتا۔ اور اگر اُن کی جسمانی اور ذہنی خواہشات کی مناسب تسکین ہوتی رہے تو وہ پورے خاندان کو خوشیوں سے بھرپور کردیتی ہیں۔ نرمل جسمانی اور ذہنی لحاظ سے کلپنا کے بالکل الٹ تھا۔ نیند کم آتی تھی اور مزاج میں غصہ تھا نوجوان تھا اس لئے خواہشات کی تسکین کے قابل تھا لیکن اعصاب کی زود حسی کا شکار تھا۔ غلاظت کا وہم اس کے دل و دماغ پر سوار تھا۔ تنخواہ اچھی تھی اس لئے اس وہم کی پرورش کرسکتا تھا۔ شادی ہونے کے بعد ایک سال کے قلیل عرصے میں اس نے دس مکان بدل ڈالے کیونکہ اُن کے گرد و نواح میں غلاظت تھی اور غلاظت اُس کے اعصاب پر سوار تھی۔ شادی کے بعد کلپنا کو نرمل کا یہ وہم عجیب سا لگا لیکن وہ آہستہ آہستہ اس کی عادی ہوگئی۔ قریب قریب ہر روز غلاظت کا موضوع بات چیت میں آجاتا لیکن وہ بڑی خوش اسلوبی سے ہر کٹھن مرحلے کو پار کرجاتی بلکہ اپنے ساتھ نرمل کو بھی بہا کر لے جاتی۔

تین مہینے کے بونس کا اعلان ہوگیا۔ نرمل کو ایک مہینے کی چھٹی مل گئی۔ سکیم کا وہ حصہ جس کا تعلق کلپنا کے ساتھ تھا پورا ہوگیا۔ اُس کو اپنی پسند کی سب چیزیں مل گئیں ۔ اس لئے خاوند اور بیوی اب اس بس میں سفر کر رہے تھے جو اُن کی منزلِ مقصود سے صرف دس میل دور تھی ۔سڑک کے ایک طرف بلند پہاڑ تھے اور دوسری طرف چیل کے جنگلوں کا دور تک پھیلا ہوا سلسلہ۔ جنگلوں کے پار اونچے پہاڑوں کی برف سے لدی ہوی چوٹیاں نظر آرہی تھیں ۔غروب کا وقت تھا اس لئے چوٹیوں پر سورج کا سونا بکھر گیا تھا۔ دونوں بہت مسرور تھے اور اپنی مسرت کا اظہار قہقہوں اور خوش کُن باتوں سے کر رہے تھے۔ اب بس پہاڑوں کے اس حصے سے گذر رہی تھی۔ جہاں کچھ چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے ۔ شام کے وقت یہ گاؤں کھلونوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ مکانوں سے ہلکا ہلکا دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ کہیں کہیں کوئی مبہم سی آواز فضا میں تیر جاتی جو پُرسکون ماحول کو اور بھی پُرسکون بنا دیتی۔ بس کا شور بھی کانوں میں خوشگوار راگنی کی طرح اُتر رہا تھا

" میرا جی چاہتا ہے میں بس سے اُتر جاؤں اور دوڑنے لگوں، دوڑتی جاؤں، میرے بال کھل جائیں اور ہوا میں لہرانے لگیں۔ میں پہاڑ پر چڑھتی جاؤں اور سب سے اونچی چوٹی کو چوم لوں ۔" کلپنا نے اَرمان بھرتے ہوئے کہا۔

" ہر شے صاف ستھری ہے، دُھلی ہوئی ہے، نکھری ہوئی ہے۔ میں تو شہر کی غلاظت سے تنگ آچکا تھا۔ سوچتا ہوں کچھ دن تو سکون سے گزریں گے ۔" —— نرمل بولا۔

" میں اُونچے پربتوں کو باہوں میں لینا چاہتی ہوں ۔" کلپنا نے کہا

" ایک مہینے کی چھٹی گزارنے کے بعد جب میں واپس جاؤں گا تو مکان ایسا تلاش کروں گا جس کے چاروں طرف صفائی ہو۔ غلاظت کا نام نہ ہو "

" غلاظت، صفائی، مکان، اس وقت تو اِن باتوں کا خیال چھوڑ دیجیے ۔"

اِن سے تو میں بچنا چاہتا ہوں۔ ان کا خیال کیسے چھوڑ دوں "

" اگر اُن کا خیال نہیں چھوڑ سکتے تو اُن سے بچ کیسے سکتے ہیں آپ" —— کلپنا نے کہا اور سڑک پر جاتی ہوئی ایک پہاڑی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

—" دیکھئے کتنی پیاری لڑکی ہے۔"

"میں پہاڑ پر پہنچ کر سب سے اچھے ہوٹل میں رہنا چاہتا ہوں"۔ نرمل بولا

"وہ بچہ دیکھئے۔ کیا سرخ و سپید اور گول مٹول ہے اور آنکھیں! دیکھئے بھی۔ آپ تو کچھ بھی نہیں دیکھتے"

بس چلتی رہی

بس فاصلے طے کر کے جب منزل مقصود پر پہنچی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ نرمل نے قلیوں سے اور ہوٹلوں کے ایجنٹوں سے ہوٹلوں کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ ایک ہوٹل کا فیصلہ کرنے کے بعد نرمل اس کے ایجنٹ کے ساتھ ہوٹل کا معائنہ کرنے کے لئے چل دیا۔ کلپنا نے یاد دلایا۔

" اچھی طرح اپنی تسلی کر لیجئے۔ آپ کو صفائی کا وہم رہتا ہے۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ فلش لیٹرین آپ کے لئے خاص طور پر ضروری ہے اور آس پاس کوئی گٹر نہیں ہونا چاہئے۔"

نرمل تھوڑی دیر میں واپس آگیا۔ ہوٹل درمیانہ درجہ کا تھا لیکن نرمل کو پسند آگیا تھا۔ صاف ستھری جگہ پر تھا۔ کمرے سے منسلک فلش لیٹرین تھی اور آس پاس کسی گٹر کے ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سامان اٹھوا کر میاں بیوی ہوٹل کی طرف چل دیئے جو کمرہ انہیں ملا، واقعی بڑا خوبصورت تھا۔ دونوں کو پسند آگیا۔ نرمل کو صفائی کی وجہ سے اور کلپنا کو سلیقے کی وجہ سے۔ دونوں سامان کو ترتیب سے لگا کر جلدی جلدی کپڑے بدل کر تیار ہو گئے اور ہوٹل کے مختصر سے لاؤنج میں چائے پینے کے لئے آگئے۔ چائے پی کر وہ سڑک پر ٹہلنے کے لئے نکل آئے۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد انہوں نے ایک ریستوران میں کھانا کھایا جب وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو نشے سے سرشار تھے۔ نرمل پہاڑ کے نکھرے ستھرے ماحول کے نشے سے اور کلپنا فرحت بخش ہوا، نئی ساڑھی نئے کوٹ، لوگوں کے خوبصورت چہروں اور پر لطف ماحول کے نشے سے۔ دونوں جوان تھے اور خوش تھے۔ دونوں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور اپنے اپنے پلنگ پر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔

"میں نے آج تک ایسی خوبصورت شام نہیں گزاری"۔ کلپنا نے کہا

"میں آج بہت خوش ہوں" نرمل بولا " اور کلپنا تم دنیا کی حسین ترین عورت ہو"

کمرے میں خاموشی تھی۔ ماحول میں سکون تھا۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ دونوں ایک ہی جذبے کے تحت پلنگ چھوڑ کر یکایک لپکے اور ایک دوسرے سے دیوانہ وار لپٹ گئے۔

" سُنئے۔ یہ کیسی آواز ہے"۔ کلپنا بولی

" کسی پہاڑی جھرنے کی آواز ہے"

" لیکن یہ تو بڑے قریب سے آرہی ہے"

" ہاں! یہ تو ہوٹل کے پچھواڑے سے آرہی ہے۔"

" ہوٹل، پہاڑ، سرد رات، پہاڑی جھرنا اور ہم دونوں — دیکھئے میں کوی بن گئی ہوں"

" میں کھڑکی کھول کر پہاڑی جھرنے کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں۔ بڑا خوبصورت منظر ہوگا۔"

" نہیں اس وقت نہیں۔ باہر سردی ہے۔ پھر اس وقت تاریکی میں نظر بھی کیا آئے گا۔"

پہاڑی جھرنے کی آواز ان کے کانوں سے ہوتی ہوئی اُن کے جسموں میں اتر گئی اور پھر اُن کی روحوں میں سرایت کر گئی۔ رات بھر وہ ایک دوسرے کی باہوں میں سوتے رہے۔ پہاڑی جھرنا اُن کے جسموں، اُن کے ذہنوں، ان کی روحوں میں بہتا رہا اور اُن کی زندگیوں کی کثافت کو دھوتا رہا۔ نرمل نیند میں پہاڑی جھرنے سے باتیں کرتا رہا کا اس میں ننھے ننھے پتھر پھینکتا رہا۔ اس کے صاف شفاف پانی کے چھینٹے اڑاتا رہا۔ کلپنا ایک جل پری کی طرح پہاڑی جھرنے کے پانی میں اتر گئی اور دور تک تیرتی چلی گئی۔

صبح ہو گئی۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ نرمل نے کلپنا کو جگایا۔ کپڑے ٹھیک ٹھاک کئے اور دروازہ کھولا۔ ویٹر ناشتہ لے کر آیا تھا۔ دونوں نے ناشتہ کیا ناشتہ کرتے ہوئے بھی وہ پہاڑی جھرنے کی باتیں کرتے رہے۔

نرمل بولا" ناشتہ کرنے کے بعد ہم سیر کے لئے چلیں گے اور پہاڑی جھرنے کا نظارہ کریں گے۔"

کلپنا بولی۔ " میں رات بھر خواب میں جھرنے کے صاف شفاف چاندی جیسے پانی میں نہاتی رہی۔

" میں رات بھر پہاڑی جھرنے کے کنارے بیٹھا ہوا اس میں ننھے ننھے پتھر پھینکتا رہا۔"

" میں نے محسوس کیا کہ میں خود پہاڑی جھرنا بن گئی ہوں"

ناشتہ ختم کر کے دونوں باہر چلنے کی تیاری کرنے میں مصروف ہو گئے۔ نرمل پہلے تیار ہو گیا۔ کلپنا کو تیار ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

" بھئی کھڑکیاں تو کھول دی ہوتیں۔ کوئی تازہ ہوا کا جھونکا آتا۔ کوئی خوبصورت نظارہ

(بقیہ ص ۴۳ پر)

کھجو راہو



یہ حسیں بت کدہ یہ نقش مجاز
اک حریم صفات کہیئے جسے
مجلس حسن و سجدہ گاہ شباب
خلد جنس و حیات کہیئے جسے

یہ صنم خانہ سرور نشاط
وہ جسے "جنت نگاہ" کہیں
عشق کا یہ خانۂ آغوش
وہ جسے ایک حسیں گناہ کہیں

یہ عقائد کا دل نواز طلسم
جس کو یک شہر آرزو" کہیئے
یست کے جلوہ ہائے صورت میں
سن معنیٰ" کی جستجو کہیئے

ندگی کا یہ جلوۂ صد رنگ
رت جلوہ نہیں شباب بھی ہے
حقیقت ہے ماورائے مجاز
وحقیقت خود ایک خواب بھی ہے

ہم یہ رنگ و نور کا پیکر!
دے ایک انجمن ہے کیا کیجئے
ب و گل کا یہ سحر یہ افسوں
رائے سخن ہے کیا کیجئے

را پردۂ نگار حیات

ل دہلی

اک حقیقت بھی ہے مجاز بھی ہے
رقص ذات و صفات کہیئے جسے
راز بھی انکشاف راز بھی ہے

خلوت انس کا یہ لمس لطیف
جیسے شبنم میں پھول کھلتے ہیں
زلف و رُخ کا یہ اختلاط حسیں
جس طرح دونوں وقت ملتے ہیں

دیوتاؤں نے جیسے چھیڑے ہوں
بزم تخلیق کے مقدس ساز
یہ بدن یہ مدن ترنگ یہ ہے
جیسے اک خواب مائل پرواز

آرزو کا یہ شعلۂ سرکش،
جس سے فانوس جل کے رہ جائے
عشق و مستی کی تیز و تند شراب
جس سے شیشہ پگھل کے رہ جائے

جس طرح اَنگ اَنگ کلیوں کا
رنگ و بُو کے فشار سے ٹوٹے
کنج گل کے حسیں دھندلکے میں
جیسے رنگوں کی پھلجھڑی چھوٹے

حسن کی چاندنی کا رقص جمیل
موج دریائے بیکراں کی طرح
جس سے آب رواں کا محرم ہے
پارہ پارہ یہاں بتاں کی طرح

تاک میں ہے جو بوند پانی کی
خم میں رہ کر شراب بنتی ہے
آتش گل سے صورت شبنم
روکش آفتاب بنتی ہے

زندگی کو ہجوم لالہ و گل
اک حسیں کارواں بنانا ہے
عکس پر عکس ہے یہ شیش محل
عکس کو جاوداں بنانا ہے

حسن دنیائے رنگ و بو کے بغیر
شمع بے انجمن ہے کیا کیجئے
"آب و گل کا یہ سحر یہ افسوں
ماورائے سخن ہے کیا کیجئے

رُوح کھنچ کھنچ کے خود ہی آتی ہے
جسم کی سمت بار بار اے دوست
حسن خود آئینہ پہ شیدا ہے
ہے وہی چمن بہار اے دوست
زندگی کا یہ بوسۂ تجدید!
سچ تو یہ ہے کہ غیر فانی ہے
اک نئی رُوح کا فسانہ ہے
اک نئے جسم کی کہانی ہے



تنویر احمد علوی



رشید الدین

کیا آپ نے کبھی شیر دیکھا ہے ؟

ظاہر ہے اس کا جواب اثبات میں ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس قسم کا جواب دینے والوں کی نوے بلکہ پچانوے فی صد تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جنہوں نے کسی سرکس کے پنجرے یا چڑیا گھر کے احاطے میں شیر کو دیکھا ہوگا۔ اگر آپ ایسے لوگوں میں شامل ہیں تو پھر یقیناً آپ نے شیر کو نہیں دیکھا۔ شیر کو دیکھنا ہے تو کسی جنگل میں دیکھنا چاہئے اور وہیں شیر کو آپ اس کے حقیقی روپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ نے کسی جنگل میں شیر کو دیکھا ہوگا اور آپ پر کسی قسم کا خوف غالب نہ ہوا ہوگا تو یقیناً آپ اس کی خوبصورتی، متانت، سنجیدگی، بردباری اور وقار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ہوں گے۔

شیر بڑا خوبصورت، نڈر، پھرتیلا، چوکنا اور ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ اور بردبار جانور ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کا رنگ زرد ہوتا ہے اور جسم پر کالے پٹے ہوتے ہیں مگر سیاہ اور سفید رنگ کے شیر بھی ہوتے ہیں اور یہ زیادہ تر افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ شیر کا جسم چکنا اور چمکدار ہوتا ہے۔ گردن اور کمر خمدار ہوتی ہے کان کھڑے اور چوکنا اور دُم لمبی اور شاندار ہوتی ہے جس کے آخری سرے پر بالوں کا ایک بڑا گچھا ہوتا ہے۔ اس کی چال بڑی پُر وقار اور آہستگی لئے ہوئے ہوتی ہے اس کے پنجے بلی کی طرح ہوتے ہیں اس لئے چلتے وقت کسی قسم کی آواز نہیں ہوتی۔ جب وہ شکار کرتا ہے یا کسی خطرے سے دوچار ہوتا ہے تو اپنے ناخن جو بلی کی طرح پنجوں کے اندر رہتے ہیں، باہر نکال لیتا ہے۔

شیر کی اوسط عمر تیس سال ہوتی ہے۔ ایک صحت مند اور جوان شیر کا وزن چار سو پونڈ اور اوسط لمبائی نو فیٹ ہوتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ چوبیس فیٹ کی اونچائی تک چھلانگ لگا سکتا ہے اور اس کے پنجے کی زد بارہ فیٹ تک ہو سکتی ہے۔

شیر کی نگاہ تیز اور دور بین نہیں ہوتی۔ اس کی قوت شامہ یعنی سونگھنے کی قوت بھی زیادہ نہیں ہوتی البتہ قوت سماعت یعنی سننے کی قوت بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ادھر پتا کھڑکا اور ادھر شیر نے اپنے کان کھڑے کرلئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شکار کے وقت مچان پر گھنٹوں دم سادھے بیٹھنا پڑتا ہے۔ ذرا سی کھڑ دھڑ کی آواز کی کرائی محنت پر پانی پھیر دیتی ہے۔ عام طور پر شیر درخت پر نہیں چڑھتا۔ اس کی وجہ اس کا بھاری تن و توش ہے۔ لیکن بقدر ضرورت وہ بائیس تا چوبیس فیٹ اونچے درخت پر چڑھ سکتا ہے یا دشمن اونچے درخت پر موجود ہو تو لمبی لمبی جستیں بھر کر اُسے ہراساں کر سکتا ہے۔

شیر کی غذا گوشت اور صرف گوشت ہے۔ عام طور پر وہ بیل، سانبھر، نیل گائے، سور اور ہرن کا شکار کرتا ہے۔ ویسے شکار کے وقت دیگر جانور بھی جھپٹ میں آجائیں تو اُن کا شکار کرلیتا ہے۔ بھوک کی حالت میں وہ بندر، مینڈک اور پرندوں کے انڈے بھی کھالیتا ہے۔ مینڈک کا شکار وہ کم گہرے پانی میں کرتا ہے شیر حسب ضرورت ہی شکار کرتا اور کھاتا ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد وہ کسی جانور کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں پڑا سوتا رہتا ہے یا اپنی جائے رہائش پر آرام کرتا ہے۔ ایک جوان شیر کی روزانہ اوسط خوراک بیس پونڈ ہوتی ہے۔

شیر کو اپنے شکار کے لئے کافی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ جنگلی جانور آسانی سے اُس کے ہاتھ نہیں آتے۔ شیر چھپ چھپا کر اور دبے پاؤں آکر اپنے شکار پر حملہ کرتا ہے ہر وقت اپنے شکار کی گردن اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ وہ شکار پر جھپٹتے ہی اُس کی گردن توڑ دیتا ہے اور پھر حلق میں دانت گاڑ کر اُس کا خون پی لیتا ہے۔ پھر وہ اطمینان سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے کہ کوئی خطرے کی بات تو نہیں۔ اس کے بعد شکار پر جم کر بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کی دُم دانتوں سے توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ جسم کے اندر کی الائشیں اسی طرح چھوڑ دیتا ہے اور شکار کو پچھلی ٹانگوں کی طرف

سے کھانا شروع کرتا ہے۔ سیر ہو کر کھانے کے بعد شکار بچ جائے تو اُسے قریب کی جھاڑیوں میں چھپا دیتا ہے اور چشمے کی طرف نکل جاتا ہے۔ پیٹ بھر کر پانی پینے کے بعد کسی درخت کی گھنی چھاؤں میں یا اپنی جائے رہائش پر جا کر سو جاتا ہے۔

گوشت کے بعد اگر شیر کو کوئی چیز مرغوب ہے تو وہ ہے پانی۔ وہ بالعموم دن میں دو مرتبہ ایک بار صبح اور ایک بار شام کو پانی پیتا ہے۔ غیر معمولی حالات میں وہ زیادہ سے زیادہ اڑتالیس گھنٹے پانی کے بغیر رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد پانی پینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ پانی پینے کے علاوہ پانی اسے ٹھنڈک کے لیے عزیز ہوتا ہے۔ شیر پانی میں تیرتا بھی ہے۔ گرما کے زمانے میں وہ اکثر کم گہرے پانی میں بیٹھا رہتا ہے۔

شیر عام طور پر رات میں شکار کرتا ہے۔ مغرب کے بعد وہ شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ بلی کی طرح اندھیرے میں اُسے صاف نظر آتا ہے ہر رات وہ پندرہ تا بیس میل کا راؤنڈ لیتا ہے اور شکار وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنی جائے رہائش پر جو عام طور پر کسی غار یا کھوہ میں واقع ہوتی ہے، واپس آجاتا ہے۔ بعض وقت وہ دن کے وقت بھی شکار کرتا ہے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر صبح اور بعد مغرب کے غذا کھاتا ہے اور اس کے بعد پانی پیتا ہے۔ رات میں ایک شیر جتنا راؤنڈ لیتا ہے اتنے علاقے میں کوئی دوسرا شیر نہیں پایا جاتا۔ اس معاملہ میں شیر بادشاہوں کی روایت پر عمل پیرا معلوم ہوتا ہے جس طرح ایک علاقے میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ اس طرح ایک جنگل میں دو شیر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر اتفاق سے کوئی شیر کسی دوسرے شیر کی سلطنت میں چلا جائے اور دونوں کی مڈبھیڑ ہو جائے تو لڑائی لازمی ہے اور لڑائی میں جس کی جیت ہو جائے وہی اس جنگل کا والی بن جاتا ہے۔ شیر عام طور پر شیرنی کے ساتھ یا پھر اکیلا ہی رہتا ہے جب شیر کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ بھی کسی دوسرے جنگل کی راہ لیتے ہیں۔

شیر فطرتاً تنہائی پسند اور خاموش رہنے والا جانور ہے۔ شور و شغب اور ہنگامے و گڑبڑ سے وہ بہت گھبراتا ہے۔ شیر انسان سے بھی خائف رہتا ہے اور بلا وجہ کبھی کسی انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ دیہاتوں میں عام طور پر انسانوں کو شیر سے واسطہ پڑتا رہتا ہے مگر وہ انسان کو دیکھ کر ہمیشہ ایک طرف کو نکل جاتا ہے اور انھیں راستہ دے دیتا ہے۔ لیکن جب بھی اُسے انسان کی طرف سے خطرہ محسوس ہو تو وہ اس پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس کے پاس شکاری اور غیر شکاری اور حملہ آور اور غیر حملہ آور کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

شیر کسی انسانی حادثہ کی بنا پر آدم خور بن جاتا ہے۔ لیکن جب ایک بار کوئی شیر آدم خور بن جائے تو پھر اس کی یہ عادت اس کی موت کے ساتھ ہی چھوٹ سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ انسان کا خون دیگر جانوروں کے مقابلے میں نمکین ہوتا ہے اور اُس کا گوشت بھی مزے دار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آبادی کے قریب عورتوں، بچوں اور کمزور مردوں کا شکار بہ آسانی کر لیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر بوڑھے شیر بھی جنھیں اُچھلتے پھاندتے جنگلی جانوروں کا شکار کرنا مشکل ہو جاتا ہے، آدم خور بن جاتے ہیں اور رات میں آبادی میں آکر گھروں یا گلیوں میں سوتے ہوئے لوگوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں۔ آدم خور شیر کے شکار کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ جب کبھی اسے اور جہاں کہیں انسان نظر آجائے وہ اُسے اپنا لقمہ بھی بنا لیتا ہے۔

شیر گو جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ ہر وقت چوکنا، چوکس و ہوشیار رہتا ہے۔ اس کے کھڑے ہوئے کان اور اُٹھی ہوئی دُم ہمیشہ خطرے کی متوقع رہتی ہے اور ذرا سا بھی خطرہ محسوس ہونے پر وہ دو تین جستوں میں کافی دور نکل جاتا ہے۔ پھر گھنی گھاس یا جھاڑیوں میں دبک جاتا ہے۔ شیر انسان کے علاوہ جنگلی ہاتھیوں، جنگلی بھینسوں، اور جنگلی کتوں کے غول سے بھی خائف رہتا ہے۔ جنگلی کتے تو اس کی جان کے دشمن ہوتے ہیں اور وہ بھی اُن کی آہٹ سنتے ہی اپنی ساری بُردباری اور وقار چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو جاتا ہے۔ جنگلی ہاتھیوں کی سونڈ اور جنگلی بھینسوں کے سینگوں سے وہ بہت ڈرتا ہے۔

شیر کے لیے افریقہ اور ایشیا، دو براعظم کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ایشیا میں شیر شام، ترکستان، ایران، تبت، چین، کوریا، منچوریا، منگولیا، برما، نیپال اور ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ مقامی حالات اور آب و ہوا کے اثرات کی وجہ سے اُن میں ایک فرق رہ جاتا ہے۔ نیپال دُنیا کی بہترین شکارگاہوں میں سے ایک ہے۔ ہندوستان میں تو تقریباً ہر صوبے میں شیر پائے جاتے ہیں۔ مگر بنگال، گجرات، مدھیہ پردیش، آسام اور میسور وغیرہ میں شیر بکثرت پائے جاتے ہیں اور یہ علاقے شیر کے شکار کے لیے بہت مشہور ہیں۔ ہندوستان میں ہر سال تقریباً ۲۰ فیصد مویشی شیر کی غذا بنتے ہیں۔ کسی جنگل یا علاقے میں شیر کے مستقل طور پر موجود رہنے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) پانی کی کثرت (۲) سایہ دار اور گھنے درخت اور (۳) چرندوں کا وجود یہی وجہ ہے کہ پہاڑی علاقوں اور ریگستانوں میں شیر نہیں پائے جاتے اور میدانی علاقوں اور دریائی وادیوں میں کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جن میدانی علاقوں میں آبادیاں قریب قریب واقع ہوتی ہیں یا جہاں شکاریوں کی کثرت ہوتی ہے یا جنگلی کتے موجود ہوتے ہیں وہاں بھی شیر نہیں پائے جاتے۔

شیرنی تین سال کے بعد بچے دیتی ہے۔ اس کی مدت حمل چار ماہ ہوتی ہے وہ عام طور پر فروری اور مارچ کے مہینوں میں بچے دیتی ہے۔ اس کے بچوں کی تعداد دو تا چھ ہوتی ہے پیدائش کے وقت وہ بلی کے برابر ہوتے ہیں۔ پندرہ بیس دن میں اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ شیر کے بچے بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ تقریباً تین ماہ تک وہ ماں کے دودھ پر رہتے ہیں اس کے بعد ماں کے ساتھ نکل جاتے ہیں اور مارے ہوئے شکار میں اس کے حصہ دار بن

جانے ہیں جب وہ ڈھائی سال کے ہوجاتے ہیں تو خود بھی چھوٹے موٹے شکار کرنے لگتے ہیں۔ پانچ سال کے بعد وہ ایک مکمل شیر بن جاتے ہیں۔ چونکہ شیر بڑے ہونے کے بعد انہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا اور ان کا شیرنی کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا اس لئے بڑے ہونے کے بعد شیرنی کا رویہ بھی ان کے ساتھ سخت ہوجاتا ہے او وہ ماں باپ کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں اور اپنی کہیں الگ دنیا بساتے ہیں۔ اس زمانے میں انہیں اگر کوئی شیرنی مل جائے تو اس کے ساتھ یا پھر اکیلے ہی زندگی گذارنے لگتے ہیں۔ جب شیرنی کے بچے دینے کے دن قریب آتے ہیں تو شیر سے الگ ہوجاتی ہے اور کسی محفوظ جگہ اپنا ٹھکانہ بنالیتی ہے یہ جگہ عام طور پر چٹانوں کی کھوہ یا غار یا گھنی جھاڑیاں ہوتی ہیں۔ شیرنی اپنے بچوں کو جبکہ وہ چھوٹے ہوتے ہیں بہت چاہتی ہے۔ اور جب بھی وہ ان کی سلامتی کے تعلق سے کوئی خطرہ محسوس کرے انھیں فوراً کسی دوسری جگہ منتقل کردیتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو بلی کی طرح منہ میں پکڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہے۔ بچے جب چھوٹے ہوتے ہیں تو انھیں شیر سے بھی بچانا ہوتا ہے کیونکہ بلے کی طرح شیر بھی اپنے چھوٹے بچے کھالیتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بلیوں اور کتیوں کی طرح شیرنی بھی زچگی کے وقت اپنا پہلا بچہ خود کھالیتی ہے مگر اس کے بعد وہ تن من سے ان کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہوجاتی ہے اور ایسے زمانے میں اگر غلطی سے بھی کوئی انسان ادھر چلا جائے تو پھر اس کی جان کی خیر نہیں ہوتی۔ شیرنی اپنے بچوں کی حفاظت کی خاطر فوراً اس پر حملہ کردیتی ہے۔

ہندوستان میں شیر کے شکار کے تین طریقے رائج ہیں

(۱) مچان پر بیٹھ کر (۲) ہانکا کر کے (۳) پیدل تلاش کر کے

ان میں پہلا طریقہ بہت زیادہ عام ہے کیونکہ یہ سب سے محفوظ طریقہ ہے۔ اس طریقۂ شکار میں جہاں بھی شیر کے موجود ہونے کا امکان ہو وہاں کوئی جانور باندھ دیا جاتا ہے اور کسی اونچے درخت پر مچان بنا کر رات میں اس پر بسیرا کیا جاتا ہے اور بندوق وغیرہ بھر کر نشانہ لے لیا جاتا ہے۔ جب شیر اس جانور جسے گارا کہا جاتا ہے کے قریب آتا ہے یا اس پر حملہ آور ہو تو اسے گولی کا نشانہ بنادیا جاتا ہے۔ شیر گارے کے قریب دو وجوہ کی بناء پر آتا ہے۔ ایک تو اسے اس کی بو آتی ہے اور دوسرے گارے کا جانور پریشانی کے عالم میں زور زور سے چیختا رہتا ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر آدم خور شیر کو ہلاک کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہانکے میں مختلف لوگ شیر کو چاروں طرف سے ہانک کر ایک مقررہ جگہ لاتے ہیں جہاں شکاری موجود ہوتا ہے اور پھر اسے گولی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس طریقہ میں لطف بہت آتا ہے اور شکار کا پورا پورا مزہ لوٹا جاسکتا ہے مگر خطرہ بھی درپیش ہوتا ہے۔ شیر ہانکا کرنے والوں میں سے کسی پر اچانک حملہ کرسکتا ہے۔

شیر کے شکار کا تیسرا طریقہ سواری میں بیٹھ کر یا پیدل تلاش کر کے اس کا شکار کرنا ہے۔ یہ طریقہ بھی بے حد دلچسپ اور پرلطف ہوتا ہے مگر اس میں ہانکے سے زیادہ جوکھم ہے۔ اس صورت میں شکاری کو بے حد تجربہ کار، بہادر، باحوصلہ اور حاضر دماغ ہونا چاہئے۔ اس کا شیر سے کسی بھی وقت سامنا ہوسکتا ہے اور آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ شیر اپنے شکاری کو فوراً پہچان لیتا ہے۔ آپ چاہے اسے تلاش کر رہے ہوں یا بازو کے درخت پر حسین پرندوں کو چہچہاتے ہوئے دیکھ رہے ہوں، وہ آپ پر حملہ آور ہوسکتا ہے۔

دیگر جنگلی جانوروں کی طرح اب ہمارے ملک میں شیر کی نسل بھی مفقود ہوتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر علاقوں میں محکمہ جنگلات نے اس کے شکار پر پابندی عائد کردی ہے اور اسے ایک قومی دولت قرار دے دیا گیا ہے۔ مختلف ریاستی حکومتیں شیروں کی نگہداشت کے لئے وسیع پیمانے پر انتظامات کر رہی ہیں۔ شیر کی نسل کے کم ہونے کی بہت سی وجوہ ہیں جن میں جنگلات کا کم ہوجانا، آبادی کا بڑھنا جدید ہتھیاروں کی ایجاد اور چرواہوں کا شیر کے مارے ہوئے اور کل کے کھانے کے لئے چھوڑے ہوئے شکار میں مہلک زہر ملادینا شامل ہے گو حکومت کی جانب سے ایسے شکار پر سخت پابندی عائد ہے مگر جنگل میں چرواہوں کا راج ہوتا ہے۔ قانون کے محافظین کا نہیں — میں نے اپنے مضمون کے شروع میں کہا ہے کہ شیر کو اگر حقیقی معنوں میں دیکھنا ہے تو اسے قدرتی حالت میں جنگل میں دیکھنا چاہئے۔ اب ریاستی حکومتوں نے اس کا بھی بندوبست کردیا ہے اور بعض مقامات پر بنادی گئی ہیں۔ جہاں آپ کسی محفوظ جگہ سے جنگل میں شیر کو آزادانہ گھومتے پھرتے دیکھ سکتے ہیں۔

کیا آپ نے اس طرح شیر دیکھا ہے؟

نذیر رحمانی



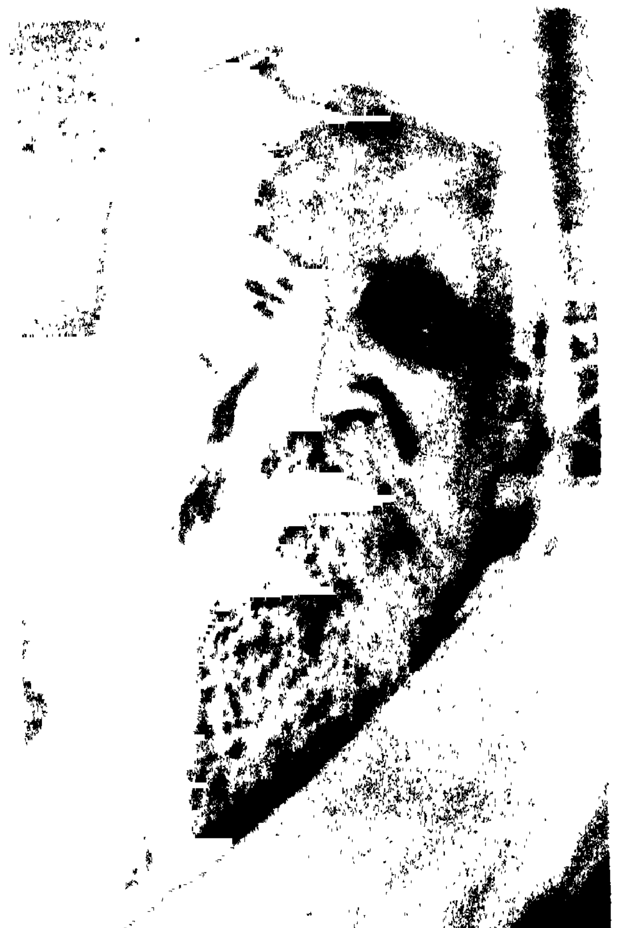
آربندو گھوش

آربندو گھوش ۱۵ اگست ۱۸۷۲ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد شری کے ڈی گھوش ڈاکٹر تھے اور انگریزی تعلیم اور طرزِ معاشرت کے بے حد دلدادہ تھے۔ انہوں نے حصولِ تعلیم کے لئے دو بڑے بیٹوں کے ساتھ اوائل عمر میں آربندو گھوش کو انگلستان بھیج دیا تھا جہاں وہ ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۲ء تک رہے۔

لندن کے دورانِ قیام میں ہی اُنہیں ہندوستان کی آزادی کے مسئلے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کیمبرج میں ہندوستانی مجلس کے ممبر اور کچھ دنوں کے لئے سیکریٹری بھی رہے۔ یہیں اُنہوں نے ملک کی آزادی سے متعلق بڑی پُرجوش تقریریں کی تھیں۔ اسی وجہ سے گھوڑسواری کے امتحان میں ناکامی کو بہانہ بنا کر اُنہیں انڈین سول سروس میں نہیں لیا گیا۔

ہندوستان آنے سے پہلے وہ LOTUS & DAGGER سوسائٹی کے ممبر بن چکے تھے۔ یہ ایک خفیہ انجمن تھی جس کے ممبروں کو یہ حلف اٹھانا پڑتا تھا کہ وہ ملک کی آزادی کے لئے کام کریں گے

وہ فروری ۱۸۹۳ء میں ہندوستان واپس آئے اور آتے ہی انھوں نے "اندو پرکاشش" نامی رسالے میں ہندوستان کی آزادی سے متعلق سات مضامین لکھے جس میں انڈین نیشنل کانگرس کو نئے طریقۂ کار اور نئے نقطۂ نظر کو اپنانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔



انہیں لندن میں ہی مہاراجہ بڑودہ نے ریاست کی اسٹیٹ سروس میں ملازمت دیدی تھی لہٰذا وہ بڑودہ چلے گئے۔

شری آربندو گھوش ان عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے تھے جنہوں نے ہندوستان کی عزت و سربلندی کی آبیاری اپنے خونِ حیات سے کی۔ انہوں نے آزادی کی جوت جلائی اور آزادی چاہنے والے بیسیوں دیوانے ان کے گرد جمع ہوگئے۔ انہوں نے اپنے کردار و عمل سے ایک مثال قائم کی۔ بلاشبہ ایسی ہی ہستیاں آنے والی نسلوں کے لئے مینارۂ نور ثابت ہوتی ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے سیکڑوں مجاہد سر سے کفن باندھے جان ہتھیلی پر رکھے مادرِ وطن کو غلامی سے آزاد کرانے میں لگے ہوئے تھے۔ آزادی کے ان متوالوں اور سرفروشوں کے جوش و خروش سے انگریزوں کا سارا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ آربندو گھوش اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے کہ محض باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ ان کے دل و دماغ میں یہ تصور جاگزیں ہوگیا تھا کہ کاغذی قراردادوں سے مسئلہ حل نہ ہوسکے گا اور انگریز جیسے چالاک اور شاطر حکمراں اس آسانی سے دیش کی سرزمین کو پاک نہ کریں گے۔ مقصد بہرصورت حصول آزادی تھا جس کے لئے آپ نے انقلابی خفیہ انجمن کی بنیاد رکھ دی اور پھر سارے ہندوستان میں ایسی جماعتوں اور انجمنوں کا جال سا بچھ گیا۔ ۱۹۰۲ء میں آپ ایک خفیہ انجمن کے قیام کے سلسلہ میں بنگال پہنچے اس وقت تک انہوں نے مدنا پور میں انقلابی سرگرمیوں کا مرکز قائم کرلیا تھا۔ انہوں نے جانباز کارکنوں کا ایک جتھا بنا لیا جس میں خود ان کے ایک بھائی بریندر کمار گھوش شامل تھے پھر وہ بڑودہ چلے گئے۔ وہ اپنے کارکنوں کو کلکتہ چھوڑ گئے تھے تاکہ وہ آزادی کی مشعل کو بجھنے نہ دیں۔ آپ یہ قطعی اور آخری فیصلہ کر چکے تھے کہ انقلابی سرگرمیوں تنظیموں اور تحریکوں میں اپنے آپ کو پوری طرح جھونک دیں گے تاکہ ہندوستان جلد سے جلد آزاد ہوجائے۔ اگست ۱۹۰۵ء میں آپ نے اپنی شریکِ حیات کو جو خط لکھا تھا اس میں انہوں نے اپنی ذہنی الجھن اور آزادی کی لگن کا واضح طور پر ذکر کرتے ہوئے اپنے مقصد و مطمعِ نظر کی مکمل تصویر پیش کی تھی۔

عین اسی زمانے میں بنگال میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوگیا جس نے آربندو جی کو واپس اپنے صوبہ میں بھجوا دیا اور انہیں اس طوفان میں دھکیل دیا جو بعد میں شروع ہوا۔ ۱۹۰۵ء کی ۱۶ اکتوبر تھی جب بنگال کو بنگالی عوام کی مرضی و منشا کے خلاف دو حصوں میں بانٹا گیا تھا۔ لارڈ کرزن اس وقت ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل تھے اور یہ کام انہی کے فرمان واجب الاذعان سے عمل پذیر ہوا تھا۔ رائے عامہ مشتعل ہوگئی۔ اور دونوں بنگالوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کی فضا نے طوفان و بحران جیسی شکل اختیار کرلی۔ طالب علموں اور عام نوجوانوں پر لرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے۔ انہیں مختلف سزائیں دی گئیں، طرح طرح کی صعوبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا کیا گیا۔ لیکن آزادی کا جو جادو جاگ چکا تھا اس کا اثر زائل ہونے والا نہیں تھا۔ بلکہ اس ظلم و ستم، بربریت، فرعونیت کا نتیجہ غلامی کی زنجیروں کو اور زیادہ کمزور کرنے والا ثابت ہوا۔ سیاسی، صحافی، معاشی اور تمدنی غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں اتھل پتھل واقع ہوگئی۔ سودیشی تحریک کا سیلاب پوری طاقت سے بہہ نکلا۔ دیش کے دوسرے لوگ بھی بنگالیوں کے حق و حمایت میں مارنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ جگہ جگہ تشدد کے واقعات بھی ظہور پذیر ہوئے۔ آربندو نے کلکتہ میں اپنے ورکروں کو پیغام دیا کہ وہ اولوالعزمی اور جواں مردی سے قدم آگے بڑھاتے رہیں اور اس انقلاب کی چنگاری کو ہوا دیں تاکہ منزلِ آزادی قریب سے قریب تر ہوجائے۔

کلکتہ میں ۱۹۰۶ء میں نیشنل کالج قائم ہوا تو وہ اس کے پرنسپل بن کر کلکتہ چلے گئے اور یہاں بپن چندرپال کے ساتھ مل کر مشہور بنگلہ اخبار 'بندے ماترم' میں کام کرنے لگے۔ آربندو گھوش کے مشورے سے یہ اخبار ایک جوائنٹ اسٹاک کمپنی کی صورت میں چلایا جانے لگا۔ اس کے اصل ایڈیٹر تو گھوش ہی تھے مگر ذمہ داری پورے بورڈ کی تھی اگر کبھی ایسی کوئی تحریر شائع ہوتی جو حکومت کی نظروں میں قابلِ مواخذہ ہوتی تو بورڈ کا کوئی ایک ممبر اس کی ذمہ داری قبول کرلیتا اور جیل جانے کے لئے تیار ہوجاتا لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ اور مضامین بڑی ہوشیاری سے لکھے جاتے تھے۔ تاکہ وہ قانونی گرفت میں نہ آسکیں۔ کلکتہ میں دسمبر ۱۹۰۶ء میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں کل ہند کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس میں پہلی بار یہ تجویز پاس کی گئی کہ کانگرس کا منتہائے مقصود ملک

کی آزادی ہے۔ اس قرارداد کو منظور کرانے میں آربندو گھوش نے زیادہ حصہ لیا
جولائی ۱۹۰۷ء میں حکومت نے "بندے ماترم" پر مقدمہ چلایا اور
اس کے اڈیٹر بوس کو تین مہینے کی سزا ہوگئی۔ آربندو پر بھی
مقدمہ چلا مگر وہ بری ہو گئے۔

۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء کو مظفر پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پر قاتلانہ حملہ ہوا
یہ حملہ ڈونڈر نوجوانوں خودی رام بوس اور پرفل چکی نے کیا تھا۔ پرفل
نے خودکشی کر لی اور پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔ خودی رام گرفتار ہوئے۔
اور اُن پر مقدمہ چلایا گیا جس پر انہیں سزا دی گئی۔ اس دوران مئی
۱۹۰۸ء کی ایک صبح کو پولیس نے کلکتہ کے ارد گرد چھاپہ مارا۔ مانک ٹولہ
باغ میں جہاں خفیہ انجمن قائم تھی اور انقلابی سرگرمیوں اور تجویزوں
کی اسکیمیں اور منصوبے تیار کیے جاتے تھے وہاں بھاری مقدار میں دیسی
ساخت کے بم، تلواریں، چھرے اور پستولیں پولیس کو دستیاب ہوئیں
ان سب کو سرکار نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ
بہت سے پُرجوش انقلابی نوجوان بھی گرفتار کر لیے گئے۔ آربندو جی بھی اسی
روز کلکتہ کے ایک دیہات سے گرفتار کر لئے گئے۔ شری آربندو اور دوسرے
پینتیس۳۵ ساتھیوں کا مقدمہ علی پور کے سیشن جج کے سامنے پیش ہوا۔ سیشن
جج اتفاق سے وہی صاحب تھے جو انڈین سول سروس کے امتحان میں
آربندو جی کے ساتھی تھے اور فہرست میں آپ سے بہت نیچے تھے مقدمہ
کی کاروائی اپنی نوعیت کی عجیب تھی حکومت نے آزادی کے ان پرستاروں
کو سخت اور لمبی سزائیں دلوانے کے لیے اپنی ساری مشینری جھونک دی
تھی اس مقدمہ کی روداد جب اخبارات میں شائع ہوتی تھی تو ہزاروں
افراد اسے بڑے اشتیاق و جوش و خروش سے پڑھتے تھے اس مقدمہ
کا عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ وعدہ معاف گواہ کو زیر تفتیش ہی قیدیوں
نے پستول سے مار ڈالا تھا اور دونوں قاتلوں کو موقع پر ہی گرفتار کر لیا
لیا تھا اور پھر انہیں موت کی سزا بھی دیدی گئی۔ سب سے پہلے اُن میں سے
ایک کو پھانسی دی گئی۔ اور اس کی لاش کو اس کے رشتہ داروں کے حوالہ
دیا گیا۔ جیالے جوانوں نے اس شہید آزادی کا جنازہ اس شان و
شوکت سے اٹھایا کہ دشمنوں کے دل دہل گئے۔ عام جنتا کا یہ جوش
وخروش دیکھ کر انگریز حکمراں گھبرا گئے جس کے نتیجے میں دوسرے ساتھی کو
جیل کے اندر پھانسی دے کر وہیں اس کا داہ سنسکار کر دیا تاکہ عام جنتا
میں بے چینی اور ہیجان نہ پھیلے۔ معاملہ یہیں آکر ختم نہیں ہو گیا۔ پبلک پراسیکوٹر
کو دن دہاڑے ہلاک کر دیا گیا۔ اسی طرح کلکتہ ہائی کورٹ کے حدود میں
ایک پولیس انسپکٹر کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ علی پور کورٹ میں اس مقدمہ کی کاروائی
چلتی رہی۔ قانونی بحث و مباحثہ کے بعد جب عدالت کا وقت ختم ہو جاتا تھا
تب قیدیوں کو پولیس گاڑی میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ شری آربندو سب سے
آگے بٹھائے جاتے تھے۔ ایک ایک کر کے سب ہی قیدی گاڑی میں بیٹھ
جایا کرتے تھے۔ وعدہ معاف گواہ کو گاڑی بان اور محافظ پولیس کے درمیان
بٹھایا جاتا تھا۔ جیسے ہی گاڑی جیل خانے کی طرف روانہ ہوتی تھی سب
قیدی ایک ساتھ مل کر گاتے تھے۔

جلدی جلدی لو ہتھیار
آزادی کے لئے ہو تیار

۶ مئی ۱۹۱۹ء کو سیشن جج نے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا۔ سریندر کمار گھوش
اور شری بھاسکر کو سزائے موت دیدی گئی۔ دوسرے حریت پسندوں
کو لمبی لمبی اور سخت سزائیں سنائی گئیں۔ شری آربندو اور اُن کے کچھ ساتھی
رہا کیے گئے۔

شری آربندو دیش کی ان مہان ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے آزادی
کی خاطر اپنا بہت کچھ قربان کیا ہے اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے
ایسا پیغام دیا ہے جس سے ہمیشہ روشنی ملتی رہے گی۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں آپ کو خراج عقیدت
پیش کیا ہے۔ آپ نے اپنے جیل کے قیام میں اور تیرہ تار زندگی میں اپنا بیشتر
وقت گیتا اور اپنشدوں کے مطالعہ اور یوگ میں صرف کیا انھیں جیل کے
گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نور دکھائی دیا جس نے اس کی زندگی کی دھارا کو یکسر
بدل کر رکھ دیا۔ آپ نے ایک اخبار "کرم یوگی" بھی جاری کیا تھا جس میں
آپ نے ہندوستانی وطن پرستی کی اہمیت اور روحانی تجربوں کا اظہار
کیا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض "کرم یوگی" کی زندگی ہی ان کی تسکین
کا باعث نہ بن سکی۔ اور ان کی روح کسی قیمتی لمحہ کی تلاش کے لئے مضطرب اور

(بقیہ ص ۲۹ پر)

(کنڑ کہانی)



شری کانت

صورتیں

باہر کے اندھیرے کو اندر آنے سے روکتی ہوئی ہریکین لالٹین، اس مدھم روشنی میں بھی ابھر کر نظر آتے ہوئے شیاملا کے دلکش خطوط، کھڑکی سے جھانکتی ہوئی کالی رات کا ہے گاہے چمکتی بجلیاں، بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج، اندھیرے کو چیرتی ہوئی گیدڑ کی پکار، بغل والے کمرے سے ابھرتے ہوئے پروفیسر شیر سنگھ کے خراٹے ـــــ یہ تھی ہماری ریسرچ کیمپ کی ایک رات۔

شیاملا کے قریب پہنچ کر میں نے پوچھا "کیا تمہیں اندھیرے سے پیار ہے؟"

بکھی بکھی سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا،

"نہیں تو!ـــ میں، اس بت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

سویرے پجاری نے اس جگہ کی مہیما یوں سنائی تھی:

ماضی میں اس جنگل پر راجہ چولا کا قبضہ تھا۔ وہ جو دکھائی دے رہا ہے، وہ شوالہ اور یہ کنواں اسی نے تعمیر کروائے تھے اور ہر صبح پوجا کے لئے اس مندر میں جانا اس کا معمول تھا۔ ایک دن، جب بادشاہ شیو پوجا کے لئے مندر جا رہا تھا تو اس کی نظر ایک عریاں جل پری پر پڑی جو اس وقت اس کنوئیں پر نہانے میں مگن تھی۔ راجہ اس بے نظیر حسن کی تاب نہ لا سکا، دل دے بیٹھا اور بھگوان کو فراموش کر کے اس نے پوجا کے پھول و صندل اس حسین پری پر چڑھا دیئے۔ بھگوان کا عتاب شاپ بن کر ظاہر ہوئے اور وہ پری پتھر کا بت بن گئی: اور تب ہی سے عورتوں کا کنوئیں کے اس پار جانا منع ہے۔ اگر گئیں تو وہ بھی اسی طرح بت بن جائیں گی۔

اور کنوئیں کے کنارے ایستادہ تھا وہ بت، جل پری جو پتھر بن گئی تھی۔

"بیچاری!" شیاملا کی نظریں اس بت پر گڑی تھیں۔ "آخر اس میں اس کا قصور ہی کیا تھا؟"

شیاملا کا سوال شاید پروفیسر شیر سنگھ کے کانوں تک نہ پہنچ پایا، انھوں نے اپنی چرمی بیگ سے ایک چھوٹی سی ہتھوڑی نکال لی اور جونہی وہ بت کے انگ بجا بجا کر دیکھنے لگے شیاملا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پروفیسر پر جھپٹی، "پلیز سر، ایسا نہ کیجئے۔ مجھے . . . مجھے کچھ ہونے سا لگا ہے!" وہ بے قرار ہو اٹھی۔

پروفیسر کی ہتھوڑی لمحہ بھر کو رکی اور چرمی بیگ میں بند ہو گئی۔ ان کے سگار ٹنگے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا "SE VT IME VT AL"

"اس من گھڑت کہانی پر تمہیں یقین آتا ہے؟" میں نے پوچھا

"نہیں، مجھے اس عورت پر یقین آتا ہے" شیاملا نے کہا۔

سویرا ہوا۔ رات کے خوابوں کو جھٹکتا ہوا جو اٹھا تو سیدھے شیاملا کے پاس پہنچا۔ چائے پی اور جماہی لیتے ہوئے پوچھا "میرے ساتھ مندر چلو گی؟"

"رات بھر نیند نہیں آئی"۔ وہ کہنے لگی۔ اس کا چہرہ سفید تھا اور آنکھیں بجھی بجھی سی۔

"گیدڑ کی چیخوں سے تمہیں تکلیف نہیں ہوتی؟" استفسار کرتے

ہوئے وہ جوانے لگی تو لڑکھڑا گئی، لگا کہ گر پڑے گی۔

"سنبھالو، پلیز!" اس نے التجا کی

"ڈرتے ہو؟" وہ مسکرائی، (طنز اور مایوسی کی ایک انوکھی آمیزش تھی اس مسکراہٹ میں) اور سہارے کے بغیر ہی سنبھل کر آگے بڑھ گئی۔

مجھے اُس کے متناسب کولہے بہت پیارے لگے۔

دراصل رات کو مجھے بھی نیند نہیں آئی تھی۔ لحاف کا کیڑا بنا، بے طرح تلملاتا رہا۔ جی چاہا تھا کہ لگاتار چیختے ہوئے اس گینڈے کو گولی مار دوں اور مسلسل خراٹے بھرتے ہوئے اس پروفیسر کی گردن مروڑ دوں۔

اور جب آنکھ لگی تھی تو خواب میں میں نے اس بت کو آغوش میں لے لیا تھا مگر اس سے پہلے، ایک بار سارے کپڑے اتار کر اس بت کے پاس دوڑا تھا۔

پروفیسر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا بھاری بھرکم ہاتھ شیالا کے شانے پر رکھ دیا اور اپنی بیلون سی توند ہلاتے، سگار چباتے پوچھا،

"Did you get nice sleep my child"

جی چاہا کہ بڈھے کا سرکس نکال دوں۔ شیالا کی عمر کی تو اس کی اپنی بیٹی ہوگی، مگر ابھی جنون نہیں اترا۔

جب وہ وہاں سے ٹلا تو شیالا نے کہا، کتنے اچھے ہیں ہمارے پروفیسر"

جی چاہا کہ کہدوں، " I hate him every inch" —اور کہدوں کہ "رات کو اس کی گردن مروڑ دیتا!" مگر آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

جب میں اور پروفیسر مندر کا ایک چکر لگا آئے تو شیالا بڑی کے بت کے پاس اکڑی ہوئی کھڑی تھی۔ صبح کی نرم دھوپ اس کے گالوں میں سمٹ رہی تھی۔ نہ جانے اس نے اپنے بالوں میں وہ کونسا جنگلی پھول اڑس لیا تھا کہ سر چکرا گیا۔

"آج ان سب کبتوں سے نپٹ لیں گے ہم" اُس نے پروفیسر یا پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "ابتدا اسی مجسمہ سے کریں گے۔"

مجسمہ؟ اس بے ڈھب سے بت کو مجسمہ کہنا مجھے ٹھیک نہ لگا۔ فٹ بال کی مانند بڑا سا سر، مبالغہ کی حد تک ابھرا ہوا سینہ، پھیلے ہوئے کولہے بلا کی تنگڑی عورت رہی ہوگی وہ بڑی بھی۔ یہ خیال کیا آیا، میری نظریں شیالا کی طرف اٹھ گئیں اور نہ جانے اسے میری آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ فوراً اس نے اپنا آنچل کھینچ لیا، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

ایک بار پہلے بھی وہ یونہی شرمائی تھی، ہمارے گاؤں میں۔ چھٹیاں تھیں اور وہ سہیلیوں کے ساتھ ہمارے ہاں آئی ہوئی تھی۔ خوب سیر ہو کر کھایا تھا جی بھر کے کھیلی تھی، تھک گئی تو لیٹ گئی، پھر اٹھ کر جنگلی پھول چنے تھے، پیڑوں پر چڑھی تھی۔ رینگتے سانپ سے ڈر کر چلائی تھی۔ اور ندی کے ٹھنڈے پانی میں پیر لٹکائے اس نے کہا تھا:۔

"اوہ، کتنا حسین ہے ان کا گاؤں! جنت ہے جنت!! اب پھر کالج لوٹ کر وہاں کی لورٹیٹ کیسے سہیں؟"

"کیوں رہی، یہیں پر مستقل رہنے کا انتظام کروا دیں؟" کسی شریر سہیلی نے چھیڑا تھا، سب کی سب ہنس پڑی تھیں اور شیالا کے چہرے پر سرخ گلاب کھل اٹھے تھے۔

جب ماں کو تنہا پا کر میں نے پوچھا تھا، "ماں، اس لڑکی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ذات اور رہتی تو کیا ہوا، ماں؟" میں نے ہر لفظ پر زور ڈالتے ہوئے اونچی آواز میں کہا تھا۔

"آخر تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ پڑھی لکھی سبھی لڑکیاں بداخلاق ہوتی ہیں؟!"

میں خفا ہوا، روٹھا، میں نے دھمکیاں دیں۔ بہت اچھلا کودا بالآخر ٹھنڈا پڑ گیا، خاموش! اچھل اچھل کر رک گئے گیند کی طرح۔

ماں روتی ہے تو میں بھی روتا ہوں۔ ماں کی انگلی کے زخم کا نشان میرے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ جب میں تین چار سال کا تھا تو نہ جانے کس موذی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا کہ ہاتھ پیر سوکھ کر کانٹا بن گئے تھے، اور موت سر پر منڈلانے لگی تھی۔ اس وقت ماں نے نہ جانے اپنی انگلی سے صندل گھس کر وہ کونسا یت لکھا تھا اور مجھے بچا لیا تھا۔

— ماں اٹھ کر گھر میں جھاڑو دیتی ہے، زمین دھوتی ہے،

ے دوہتی ہے، پھر ہمیں گرم گرم دودھ پینے کو دیتی ہے مگر نہادھو کر پوجا
ت کر لینے تک خود ایک بوند پانی تک نہیں پیتی۔ وہ سب سے پہلے جاگتی
ہے اور سب کے بعد سوتی ہے۔ گنگا (گائے) کا بچھڑا جو سب سے سینگیں
ڈاتا ہے، ماں کو دیکھ کر خوشی سے تھدکنے لگتا ہے۔

اں جب اس گھر میں آئی تھی تو گیارہ سال کی تھی، اب اُس
ا عمر پچاس کے قریب ہے۔

ماں نے سبھی مہمانوں کو پرشاد دیا تھا، اُن کے جوڑوں میں
پھول لگائے تھے اور انہیں وہ لوک گیت سکھلائے تھے جو سہاگ رات
سے متعلق تھے۔

اس دن شیاملا نے مجھ سے کہا تھا،

" خوش نصیب ہو تم، جو تمہیں دیوی دیوتا جیسے ماں باپ ملے
ہیں۔ اُن کے خیالات، اُن کا برتاؤ، اُن کا حسن سلوک ۔ ۔ ۔ اوہ،
اُن کی محبت تو پچھلے جنموں کے تپ کا پھل ہے!"

اور میرا جی چاہا تھا کہ کہہ دوں "شیاملا، "I love
you" مگر ماں کی انگلی سامنے آ گئی اور کہنے لگا،

"تپ؟! ۔ ۔ ۔ ۔ اب بھی جب بیٹھا ہوتا ہوں تو لگتا ہے کہ ماں
بغل میں بیٹھی ہے۔ اتنا بڑا ہو گیا ہوں مگر ایک سگریٹ پینے کی ہمت
نہیں ہوتی۔ اور عورتیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو بس ماں ہیں، اور ۔ ۔ ۔ ۔"

میری بات سن کر، شیاملا ہنسی سے دوہری ہو گئی تھی۔ جی
چاہا تھا اس کے بکھرے سے بھیگے سینے پر سر رکھ دوں، ہوا میں لہراتے
ہوئے اس کے آنچل میں منہ چھپاؤں، اس کی پیشانی پر مچلتی زلفوں
سے کھیلوں، مگر ۔ ۔ ۔ ۔

رات۔ چاندنی۔ جنگل۔ کنواں۔ کنوئیں پر نہاتی شیاملا۔ ننگی!
میں نے دوڑ کر اسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔ پھر اسے دیوانہ وار چومنے لگا،
چومتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ وہ بت بن گئی ——— میری آنکھ کھل گئی

مارچ جلا کر میں شیاملا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بے سدھ ہو سو رہی
تھی۔ اس کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔ چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ آخر، سناٹے
کو چیرتی ہوئی گیدڑ کی پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے، میں نے، اسے
چادر ٹھیک سے اڑھا دی۔

صبح کو میں نے اس سے کہا، "شیاملا، تم مندر میں نہ جاؤ۔ میں تمہارے
ساتھ نہیں چلوں گا۔"

"کیوں؟ ڈر لگتا ہے؟ جناب، پتھر تو عورت بنتی ہے! تم مرد
ہو نا، تمہیں کچھ نہیں ہوگا!"

"یہ بات نہیں، شیاملا، تمہارا وہاں جانا مجھے پسند نہیں۔"

"مگر مجھے پسند ہے۔"

"مت جاؤ، شیاملا، مت جاؤ!"

"میں سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو۔" وہ دھیرے دھیرے
بولنے لگی۔ "ہونہہ: ——— اس دنیا میں تو لاکھوں عورتیں ہیں۔ اُن سب
کو چھوڑ کر تم مجھی سے پیار کرو، یوں کہنے کا مجھے حق ہی کیا ہے؟!"

"اب رہنے دو، شیاملا، کبھی اور سہی۔"

مگر نہیں، وہ تو اسی وقت سب کچھ کہہ دینے پر مصر تھی۔ اور اس
کی حالت بھی کچھ عجیب سی ہو رہی تھی ——— سانس اکھڑنے لگی تھی، پیشانی
پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں اور آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

میں سننے پر مجبور ہو گیا۔

اس نے بتایا کہ وہ بیوہ ہے۔ اس کا شوہر ——— اس کے لفظوں
میں ——— شراب پی پی کر مرا تھا، سگریٹ پھونک پھونک کر مرا تھا۔
داو صبح دے دے کر مرا تھا۔ ایک دن جب وہ حد سے زیادہ پی گیا
تھا، اس کی کار راستے سے ہٹ کر ایک کھڈ میں گر گئی اور چور چور ہو گئی۔
پھر شیاملا نے ہمارے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

میں سب سنکر خاموش رہا۔ ایک ——— دو ——— تین ——— چار
نہ جانے کتنے منٹ خاموش رہا۔

شیاملا کی ہچکی سے خاموشی کی برف میں دھماکا سا ہوا۔ وہ پھر
کہنے لگی: "میں جانتی تھی کہ تم میرے ساتھ کنواں پار نہیں کر پاؤ گے
پھر بھی میں نے قدم بڑھایا، یہ جان کر کہ تم مرد ہو۔ اور پھر تو لے گا
تو مجھ پر، پتھر بنوں گی تو میں! مرد چاہے جو بھی کرے، اس کے لئے کوئی
شاپ نہیں! کہیں بھی نہیں، کبھی بھی نہیں! اس بت کی طرح بارش
طوفان اور ٹھنڈ میں ٹھٹھرنے والی تو ہم ہی ہیں!"

شیاملا کے سامنے، میں نے، دفعتاً جیب سے ایک سگار نکال

کر ملا لیا۔

وہ بولی: "پروفیسر کے ڈبے سے سگار اڑانے کی ہمت کر ڈالی تم نے؟ شاباش!"

دھوئیں سے آنکھ اور ناک میں پانی آنے لگا۔ گلے میں خلش اور جلن سی ہوئی تو کھانسنے لگا۔ اس نے منع نہیں کیا۔

اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا، "شیاملا، میں تم سے شادی کروں گا۔"

اس نے ایک ہلکا قہقہہ لگایا، پھر بولی، "کیا تم اپنی ماں کے آگے سگار پینے کی جرأت کر سکو گے؟"

"دیکھو بری عادتیں نہیں ڈالتے۔ یہ سب جسم کو نقصان پہنچاتی ہیں" اُس نے بڑی نرمی سے کہا، "جاؤ، سو جاؤ۔"

رات دیر تک گیدڑ پکارتا ہی رہا اور پروفیسر خراٹے بھرتا رہا۔ اور میں گیدڑ کو گولی نہ مار سکا۔ میں نے بندوق کو ہاتھ ہی کب لگایا ہے؟ میں نے پروفیسر کی گردن بھی نہیں مروڑی، اس خوف سے کہ وہ میری تھیسس نہ لوٹا دے۔ میں بزدل ہوں، کائر ہوں! میں نے یونہی یہ پتلون پہن رکھی ہے۔ مجھے تو چاہئے کہ سیدھے شیاملا کے پاس چلوں اور کہوں، "شیاملا مجھے اپنی ایک ساڑی دے دو"

نہیں، میں اِن حالات کا سامنا کر نہیں پاؤں گا۔ اپنے گرد بنے ہوئے خول کو توڑ کر باہر آنا میرے بس کی بات نہیں۔

باہر کھلی، ٹھنڈی ہوا میں آجانے پر کچھ سکون ملا

پیچھے چوڑیاں چھنکیں، مڑا تو شیاملا تھی

"مجھے بھی نیند نہیں آتی" وہ کہنے لگی: "دماغ میں عجیب سے خیالات منڈلا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ میں ہی وہ جل پری ہوں اور فوراً یہاں سے نہ چلی گئی تو خود ایک بُت بن جاؤں گی۔ جیسے یہ سب کافی نہیں یہ گیدڑ الگ چلائے جا رہا ہے۔"

اب صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے۔ کل کیمپ ختم ہو جائے گا۔ کام تو تقریباً سبھی ختم ہو چکا ہے۔ ہم نے کنوئیں کی، کتبوں کی، بتوں کی بلکہ اطراف و اکناف کے ہر پتھر کی تصویر کھینچ لی ہے، ہر چیز کا ناپ نوٹ کر لیا ہے۔

فرصت ہے، ہم بیٹھے ہیں۔ شیاملا میرے سامنے ہے۔ اور ہمارے درمیان ماں کی اُنگلی ہے، شیاملا کا مرحوم شوہر ہے، پری کا بت ہے۔

شیاملا کی آواز فضا کی منجمد خاموشی کو توڑتی ہے۔

"ریسرچ ختم کرنے کے بعد کیا ارادے ہیں؟"

"اور کیا؟ سنیر سنگھ کو ہاتھ جوڑیں گے اور کسی کالج میں نوکری کر لیں گے!"

"پھر کیا کرو گے؟"

میں خاموش رہا۔ اسی نے بات آگے بڑھائی۔

"میری سنو، پوجا پاٹ میں ماں کا ساتھ دینے والی کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اس سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔ بچپن میں جب بھی ماں 'مرتی' سے ہوتی تو مجھے کپڑے اتار کر ہی اپنے پاس جانے دیتی اور میں دوڑ کر اُس کی باہوں میں سما جاتا۔ جی چاہا کہ پھر سے پتلون اُتار کر ماں کے پاس دوڑ جاؤں۔

کچھ دیر بعد پھر اسی نے سوال کیا، "یہ نہیں پوچھو گے کہ میں کیا کرنا چاہتی ہوں؟"

پھر وہ ہنسی، ایک مردہ ہنسی:

دوسرے دن وہ مندر چلنے کو تیار ہو گئی۔ اس کی ضد کے آگے میری اور پروفیسر کی ایک نہ چلی۔

"تن پاک و صاف ہو اور من میں خلوص اور بھگتی ہو تو ایشور کے درشن کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟" گمبھیر تھی اُس کی آواز: "میں پتھر نہیں بنوں گی، غیر ممکن!"

میں دوڑ کر اس مورت کے پاس پہنچا۔

"تھو!" میں نے اس پر تھوکا، پھر پتھر برسائے۔ جی چاہا کہ رو پڑوں، رو دیا۔

(بقیہ صہ ۳۴ پر)

؎ برہمن غسل کے بعد پوجا پاٹ کرنے تک 'مرتی' سے ہوتے ہیں۔ اس حالت میں اُنہیں چھو لینے کی کسی کو اجازت نہیں ہوتی، مگر کم سن بچے اُنہیں چھو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نرینہ ہوں۔



جدید عربی شاعری

محمود الحسن صدیقی

جدید عربی شاعری کے ارتقائی مرحلوں کا جائزہ لیتے وقت ان تمام بنیادی تبدیلیوں کی طرف ذہن متوجہ ہوجاتا ہے جو اٹھارہویں صدی میں واقع ہورہی تھیں ان تبدیلیوں کو جانے بغیر عربی شاعری کے جدید میلانات کو سمجھنا اور اس سے لطف لینا مشکل ہوگا۔ اٹھارہویں صدی کے خاتمے پر ایک زبردست سیاسی حادثہ نے ان تبدیلیوں کے لئے راہ ہموار کیا اس سے میری مراد ۱۷۹۸ء کے دوران مصر پر نپولین کے قبضہ سے ہے چنانچہ یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ نپولین کے قبضہ سے مشرقِ وسطیٰ کا نیا دَور شروع ہوتا ہے۔

نپولین نے مصر میں المجمع العلمی المصری " کے نام سے ایک اکیڈمی قائم کی اور اس کے کاموں کو ریاضیات، طبیعیات، سیاست اور ادبیات کی شاخوں میں تقسیم کردیا۔ اس علمی انجمن کی صدارت ایک فرانسیسی عالم کے سپرد ہوئی۔ نپولین خود بھی اس کی نگرانی۔ اور کاموں سے دلچسپی لیتا تھا اس کے علاوہ دوسرے بہت سے علماء فرانس سے مصر آئے اور انہوں نے مدارس قائم کئے۔ رسائل کا اجراء عمل میں آیا، مطابع قائم کئے۔ اور کیمیائی تجربہ گاہیں قائم کیں۔ یہ کام انہوں نے جدید خطوط پر شروع کیا اس جدوجہد کے نتیجہ میں مغرب کی علمی اور تحقیقی رُوح کا پودا مصر میں پہلی بار لگایا گیا۔ جدید علوم سے دلچسپی اور اس کی اشاعت کا موثر فریضہ ایک اور شخص نے انجام دیا جس کو تاریخ محمد علی کے نام سے یاد کرتی ہے۔

محمد علی ترک روایات سے خاصی واقفیت رکھتا تھا کیونکہ محمود ثانی نے جو اصلاحی کوششیں ترکی میں کی تھیں، محمد علی کو جاننے اور سمجھنے کا پورا موقع ملا تھا۔ جب وہ مصر پر پوری طرح قابض ہوگیا تو ان اصلاحی اسکیموں کو عملی شکل دینے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ اس نے اپنے طویل دورِ حکومت میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کا شاندار کارنامہ انجام دیا۔ اس دشوار کام میں بہت سے فرانسیسی علماء اور ماہرینِ فن بطور مشاور کے اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سینکڑوں نئے مدارس کھولے گئے جن کے اندر جدید علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ پہلی بار محکمہ تعلیم آزاد ادارے کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ مصری طلباء کو وظائف دیکر بڑی تعداد میں یورپ بھیجا گیا۔ علمی وفود کے تبادلے کی ہمت افزائی کی گئی۔ طباعت کے لئے چھاپہ خانوں کا قیام عمل میں آیا۔ متعدد رسائل و اخباروں کا اجراء ہوا اور ٹیکنیکل کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ اور فرانسیسی تعلیم کے لئے سہولتیں فراہم کی گئیں۔ اس ہمہ گیر علمی جدوجہد کو بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بھی اپنی بساط کے مطابق قوت بہم پہنچائی اس کے بعد پہلی بار عالمگیر جنگ شروع ہوئی۔ اس لڑائی نے مشرقِ وسطیٰ کو سیاسی طور پر مغرب سے قریب تر کردیا۔ مغرب سے اس نئے تعلق کی بنا پر مغربی افکار، رجحانات اور سائنٹفک نتائج کو مشرق میں آنے کا براہِ راست موقع ملا۔ اس سے تجدید کا کام تیز تر ہوگیا۔ مصر اور لبنان میں علمی و تعلیمی سرگرمیوں کو بڑھاوا ملا۔ لبنان کی عیسائی مشنریوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں کو زیادہ سرگرمی سے عملی جامہ پہنایا۔

نپولین کا حملہ محمد علی کی اصلاحی سرگرمیوں اور لبنان کے عیسائی مشنریوں کی تعلیمی کوششوں اور پہلی عالمی جنگ کے نتائج نے مل جل کر اسلامی مشرق کو نشاۃ ثانیہ کی راہ پر لگایا۔ اس سے حیرت انگیز بیداری پیدا ہوئی۔ اس ہمہ گیر بیداری کا ایک اثر ہمیں جدید عربی شاعری کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ اثر براہ راست بھی ہے اور بالواسطہ بھی۔ براہ راست سے میرا مطلب یہ ہے کہ مغرب کے شعری نمونوں

ی تقلید میں لکھنے کا رجحان ابھی حال میں اُبھرا ہے۔ اس سے پہلے عربی شاعری فنی طور پر اپنے قدیم طرز پر قائم رہی اور اس نے ہیئت میں کوئی تبدیلی عرصہ تک قبول نہیں کی۔ البتہ بالواسطہ مغربی ادب کا اثر اس معنی میں ضرور ملتا ہے کہ جدید تہذیبی افکار کے نتیجہ میں جو تبدیلیاں مشرقِ وسطیٰ میں پیدا ہو رہی تھیں اس کو شعرا نے محسوس کیا اور انھیں افکار و احساسات کی ترجمانی کرنے لگے، اس سلسلہ میں محمود سامی البارودی احمد بیک شوقی، حافظ محمد ابراہیم اور جمیل الزہادی کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ بارودی کے اشعار میں ذاتی تجربات کو سمونے کا رجحان ملتا ہے۔ وہ معانی کی صداقت اور حریت فکر کو خاصی اہمیت دیتا ہے اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ شعر و ادب کی نئی فضا کو دیکھ رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اسماعیل جبری کو بھی اونچا مقام حاصل ہے۔ اس نے فرانس میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی تھی وہ نئے رجحانات کا واضح علمبردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزلوں میں صداقت گرمی اور گہرے احساسات کی کارفرمائی ملتی ہے احمد بیک شوقی شروع ہی سے ذہین تھا۔ اعلیٰ تعلیم فرانس میں مکمل کرنے کے بعد دیگر یورپین ملکوں کا سفر کیا

شوقی عرصہ تک عوامی زندگی سے دُور رہا۔ اس لئے اس کی شاعری جدید رجحانات سے خالی رہتی تھی لیکن جب سیاسی تبدیلیوں نے اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تو پھر وہ جدید مسائل سے قریب ہو گیا اور اس کی شاعری مصری زندگی کی ترجمانی کرنے لگی۔ مصر پر انگریزوں کے تسلط سے شوقی کی ذہنی زندگی میں حقیقت پسندی کا رجحان نظر آتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد وہ دربار سے دور ہو کر مصری عوام کی زندگی سے قریب ہو گیا۔ چنانچہ اسپین میں جلا وطنی کے دوران شوقی نے بعض بڑی عمدہ نظمیں لکھیں

شوقی کے فن پر جدید فنی تجربات کا اثر پڑا۔ اس کا تجربہ اس نے اپنے منظوم ڈراموں میں کیا ہے۔ ان پر مغربی ڈراموں کا اثر ہے بلکہ اسی لہجے میں لکھے گئے ہیں ان ڈراموں کے ذریعے نئی صنف کا آغاز ہوا لیکن بدقسمتی سے شوقی کے بعد پھر عرصہ تک کوئی تخلیق اس طرح پیش نہیں ہوئی۔ حال میں ڈاکٹر ابوشادی نے چند ڈرامے لکھے تھے۔ لیکن اس کے بعد کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔ غالباً عربی شاعری کا مزاج، ڈراموں کے لئے موزوں ہی نہیں ہے۔

شوقی کے بالمقابل ابراہیم حافظ جدید رجحانات کا ممتاز ہے۔ حافظ کوئی بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھا کیونکہ اسے کا موقع ہی نہ مل سکا مگر اپنے طور پر اس نے جدید مغربی ادب سے کافی استفادہ ہے۔ مصر کی سیاسی تحریکات سے نہ صرف یہ کہ متاثر تھا بلکہ عملاً حصہ بھی لیتا رہا اور تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے لیڈروں سے گہرے مراسم تھے۔ مفتی محمد عبدہٗ کی شخصیت سے وہ خاصہ متاثر تھا اثر کی بنا پر حافظ نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا اور مشہور لیڈر مصطفیٰ کی قیادت میں بڑی قربانیاں دیں۔ اس اعتبار سے حافظ کو جدید شاعر کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ اس نے قوم پرور اور وطن دوست خیالات و جذبات کو اپنے اشعار کے ذریعہ پیش کیا۔ زیارت نے بہت صحیح لکھا ہے۔ حافظ اپنے ہم عصر شعرا میں اس لئے ممتاز ہے کہ اس نے اپنے ذاتی غم کو سچائی سے بیان کیا ہے اور اپنے قوم کی تمناؤں اور آرزوؤں کو شعر کے قالب میں سمویا ہے۔ اس طرح حافظ جدید مصری زندگی کے ترجمان کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔

جدید شاعری کا مطالعہ کرتے وقت جمیل الزہادی کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ زہادی بچپن سے فلسفہ کی طرف مائل تھا۔ یہ دلچسپی اُن مضامین کے ذریعہ پیدا ہوئی جو مغربی زبانوں سے عربی میں منتقل کئے گئے تھے۔ یہ فلسفیانہ رجحان اُن کی شاعری کے اندر بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے اس کی شاعری پر زبردست تنقیدیں کی ہیں شوقی، حافظ اور زہادی جدید عربی شاعری کے اولین معمار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ اُن کے دور میں عرب سماج مجموعی طور پر پوری طرح صنعتی دور میں داخل نہیں ہوا تھا جس کی بنا پر متوسط طبقے کا وجود بھی نہیں ہو پایا تھا۔ اسی لئے طبقاتی جہد کا باقاعدہ آغاز بھی نظر نہیں آتا تاہم امیر و غریب کے مابین فرق کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ مغرب سے آئے ہوئے علوم نے عقل کی اہمیت، تحقیق و تنقید کا رجحان آزادی و حریت کا تصور، انسانیت اور رواداری کے خیالات کو عام کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ سیاسی بیداری کے نتیجہ میں زبردست قوم پرستانہ تحریکیں اُبھریں جنہوں نے سماج کے نچلے طبقوں کو آزادی کی رُوح سے گرمایا۔ اُن کے اندر سیاسی بیداری پیدا کی،

الوطنی، غلامی سے نفرت کا قومی جذبہ ابھارا اس طرح وہ
ے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہونے لگے۔ استعمار کی انتقامی
یوں نے آزادی کے علمبرداروں کی ہمتوں کو اور بلند کیا اور
ن پر صیہونیت کے غلبہ نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ اس سانحہ
سی طور پر عربوں کو زیادہ ہوشیار اور چوکنا کر دیا۔ مذہبی میدان
تعدد تحریکیں ابھریں۔ ان سب موثرات اور عوامل نے عوام و
ں کو جھنجوڑ کر اور ان کے اندر اسلام کی سادہ تعلیمات سے ایک نئی لگن پیدا
طرح دیکھتے دیکھتے مشرق اوسط مقلی سرگرمیوں کا آماجگاہ بن گیا۔ اس دور
اعری دراصل اسی ہمہ گیر سماجی بیداری اور کشاکش میں پوری طرح شریک
ی ہے۔ اس دوران کئی ادبی انجمنیں قائم ہوئیں جن کا مقصد عربی شاعری کو
بیداری میں شریک کرنا اور اس کی رہنمائی کرنے کے لئے تیار کرنا تھا۔
وہ ایک طرف تو زندگی سے بھرپور ہو اور دوسری طرف عالمی شعر و ادب
بشانہ بشانہ چلنے کے قابل ہو سکے۔ "رابطۃ الادب الحدیث" "اخوۃ العربیۃ"
ر انجمن شباب المسلمین" نے اپنے اپنے دائروں میں اس عظیم الشان مقصد
قابل قدر خدمت انجام دیا ہے۔ ان اداروں سے منسلک رہنے والے
مرا و ادبا ر، جدید دور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین نوجوان تھے۔ انہوں
مغربی شعر و ادب سے عام طور پر استفادہ کیا تھا بالخصوص "رابطۃ الادب
حدیث" سے متعلق رہنے والے شعراء بڑی تعداد میں عرب ملکوں میں پھیلے
ہوئے تھے۔ اس گروہ کے روحانی پیشوا ڈاکٹر احمد زکی ابوشادی تھے اس
روہ کے ممتاز ارکان میں ڈاکٹر ابراہیم ناجی، سحرتی، حیرتی، رفیع فلسطین،
ابراہیم ہاشم الغلالی، عبدالجبار، ذکریا الانصاری، عبدالمنعم الحفاجی، احمد
الفاسی، خلیل جرجس خلیل، عبدالحمید ربیع، احمد الوالمجد عیسی، احمد محمود عرفۃ
جیسے جلیل القدر شعراء تھے۔

ڈاکٹر ابوشادی ۱۹۵۵ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے اندر بلا کی ذہانت
ملباعی اور سوجھ بوجھ تھی اور مغربی تہذیب کا گہرا مطالعہ کر چکے تھے یہی وجہ
ہے کہ ان کی شاعری میں متعدد رجحانات کے اثرات ملتے ہیں۔ بالخصوص
رومانیت کا اثر زیادہ گہرا اور قوی ہے۔ اس لئے وہ رومانی شاعری
کے اولین علمبردار کی حیثیت سے مصر میں معروف رہے ہیں۔ آزادی خواہ وہ
کسی قسم کی ہو ان کے خیالات کا بنیادی عنصر ہے اسی لئے جمہوریت پر
یقین رکھتے تھے اور اس کے قیام کی جدوجہد میں انہیں مصر سے جلاوطن ہونا
پڑا۔ ان کی مشہور نظم "الامیمو اطینہ" مطلق العنانیت اور ہر طرح کی
آمریت کے خلاف شمشیر برہنہ کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کا
ایک شعر ڈاکٹر ابوشادی کے اس گہرے یقین کو ظاہر کرتا ہے جو انھیں
جمہوری اداروں پر تھا مثلاً کہتے ہیں۔

الشعب علی من ارادۃ حاکم - ولوانہ فی بزۃ نبویۃ :-

ترجمہ۔ قوم کی خواہش ایک آمر کے ارادہ پر فوقیت رکھتی ہے۔ چاہے وہ
حاکم نبی کی حیثیت میں ہو۔

ابوشادی کی شاعری رنگ برنگ کے جلووں سے آراستہ ہے۔
انھوں نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ اور مرثیہ
میں قابل قدر اضافے کئے ہیں اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ
پہلے شاعر ہیں جنہوں نے تمثیلی اشعار کہے ہیں۔ اُن کے عقائد میں معنوی
جدت، فکر کی ندرت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ زبان بھی بڑی آسان
مگر خوبصورت استعمال کرتے ہیں۔ جوانی کے کلام میں جذبات کی گرمی،
سپردگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ عمر کے تقاضہ کے ساتھ ساتھ
صوفیانہ رجحانات، حکیمانہ خیالات مرکزی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔
اس طرز کی آواز محمد مہدی الجواہری کی سنائی دیتی ہے۔ یہ عراقی
شاعر وقت کے استحصالی قوتوں سے لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ آزادی
و حریت کا ترانہ گاتا ہے عراقیوں کی افلاس و غربت پر آنسو بہاتا
ہے۔ ان کے اندر معاشی بدحالی کی وجہ سے جو غلامانہ ذہنیت، خوف
اور مسکینی پیدا ہو گئی تھی، اس کے خلاف وہ آواز اٹھاتا ہے۔ اس نے
قدیم فنی روایات کو ملحوظ رکھا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے نفس کی گرمی سے
کلام میں سادگی، بے تکلفی اور جزالت کا جادو پھونک دیا ہے۔ اس
کے برخلاف مصطفےٰ عاصی کا اسلوب غنائی ہے۔ اس کی شاعری میں
پاک و لطیف روح جلوہ گر ہے۔ ایسی لطافت جو اس کی شخصیت کو جانے
بغیر محسوس نہیں کی جا سکتی۔ اس کے اسلوب میں عجیب نغمگی ہے اس کی
موسیقی ایک ایسا سرچشمہ ہے جو ابن زیدون اور شوقی کے
اشعار سے پھوٹتا ہے۔ اس نے قدیم فنی خوبیوں کو بڑی مہارت سے
برتا ہے۔ اس کی شاعری کے بنیادی عناصر حب الوطنی، اسلام دوستی
عربیت اور اسلام پسند رجحانات سے عبارت ہیں۔

ڈاکٹر ابراہیم الناجی جدید رجحانات کی نمائندگی میں قابل احترام خدمات
کر چکے ہیں۔ اُن کی شاعری، ندرت خیال، جدت معانی کے اعتبار سے شہرت

حاصل کر چکی ہے۔ یہ بات اگر صحیح ہے کہ شاعر کی آپ بیتی اس کی شاعری کا اہم جز ہوتی ہے تو ناجی کے بارے میں یہ قول زیادہ صحیح ہے وہ ایک محروم انسان کی زندگی رکھتے تھے جو خوشی و مسرت سے خالی اور رنج و محن سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا بہترین ثبوت ناجی کا وہ مشہور قصیدہ ہے جو "العودۃ" کے نام سے مشہور ہے۔ شاعر کارزارِ حیات میں ایک عرصہ تک مخالفانہ قوتوں سے لڑتا رہا۔ بالآخر تھک کر اپنے وطن لوٹتا ہے وہ حقائقِ حیات سے فرار اختیار کر کے بچپن کی حسین اور معصوم زندگی کی آرزو کرتا ہے۔ وہ اُن فطری مناظر میں پناہ ڈھونڈھتا ہے، جو وطن میں موجود ہیں وہ ایک چھوٹے سے درخت مخاطب ہو کر بڑے والہانہ انداز میں نغمہ سنج ہوتا ہے۔ ؎

رجعت ایک من بعد غربتی ✦ وفی النفس آلام تفیض تواثر

غریب الوطنی کے بعد ترے پاس لوٹ کر آیا ہوں اس حال میں کہ میرے اندر آلام جوش مار رہے ہیں۔

بیسویں صدی میں عرب دنیا ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس دور میں آئے دن کے سیاسی حوادث سے قوم پرست اور وطن دوست خیالات کو بڑی تقویت ملی اور حرکت و زندگی کا دور دورہ ہوا شعراء نے بھی اِن تقاضوں کو محسوس کیا اور اپنی فطری صلاحیتوں کو حریت و استقلال پرور جذبات کی نشو و نما کے لئے وقف کر دیا۔ حجاز میں ابراہیم ہاشم الغلالی، احمد الفاسی، عراق میں عبدالوہاب البیاتی اور فلسطین میں ابراہیم طوقان کے نام خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ ہاشم الغلالی نے فلسطین کی جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور عربوں کے ہر مسئلہ پر تروح پرور نظمیں لکھی ہیں۔ عربیت، اسلام، استقلال سماجی مساوات کے قیام کے لئے فکری محاذ پر بھرپور جدوجہد کی ہے۔ اس نے اپنے اشعار میں ذاتی تجربات کو بھی بیان کیا ہے جو اپنی لطافت اور عمدگی کے لئے مشہور ہیں۔ وہ چھوٹی بحروں میں اکثر گنگناتا ہے۔ احمد الفاسی نے بھی انہیں موضوعات کو اپنی شاعری کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس کے اندر واقعیت اور رمزیت سے کام لیا ہے۔ عراق کے نامور شاعر البیاتی انقلابی افکار کا حامل تھا۔ اس نے نوری السعید کی پالیسیوں سے اختلاف کیا جس کے پاداش میں جلاوطن ہونا پڑا۔ لیکن وہ ا[پنے] خیالات و افکار سے باز نہیں آیا اور برابر اخبارات و رسا[ئل کی] مدد سے اُن کی اشاعت کرتا رہا۔ اس سلسلے میں متعدد رسائ[ل کے] بطور اڈیٹر کے کام بھی کیا۔ اس کا پہلا دیوان "ملائکہ و شیطان" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ دوسرے دو دیوان "اباریق مہ[شمۃ]" "المجد للاطفال والزیتون" ترتیب وار شائع ہوئے۔ اس کی زندگی حرکت [سے] بھری ہوئی تھی۔ اس لئے شاعری میں جدوجہد کی تبلیغ ہے۔ وہ جمود [اور] رجعت کے خلاف لوگوں کے جذبات اُبھارتا ہے۔ سیاسی اقتدار [اور] ظلم پر زبردست چوٹیں کرتا ہے اور انسان کو امید و حرکت پر آمادہ [کرتا] ہے۔ یہی لے طوقان نے بھی چھیڑی ہے اس کے یہاں بھی خیال [اور] جذبات کی گرمی پائی جاتی ہے۔ اس کے خیالات اور جذبات پر مایو[سی کا] سایہ بھی محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ فلسطین کی غلامی نے اس کو بے [چین] کر دیا تھا اور اسی غم میں یہ جواں سال شاعر اس دنیا سے رخصت [ہوا۔] اس کے قصائد "الغدائی"، "الی مرزب السلا..."، "الی الاحرار" آج بھی پڑ[ھنے] والے کو متاثر کرتے ہیں "معین الجمال" اُس کی بہترین غزل ہے۔

جدید سوڈانی شعراء کی صف میں تیجانی نئے فکر کا حامل ہے۔ اس [نے] یہاں کی شاعری میں فنی پختگی عطا کی اور اُسے اپنی ذہانت سے نئے رجحا[نات] مثلاً سماجی مسائل، قومی افکار، اور قومی رنج و الم کا ذریعہ بنا کر اس کی [قدر و] قیمت کو بلند کیا۔ اس طرح اس کی تاثیر کو وسعت عطا کی ہے۔ اس [کے] علاوہ اس نے فطری شاعری کے بعض عمدہ نمونے چھوڑے ہیں "الغز[ل]" "مدینۃ المنثور الجمال"، "ترق فی الصباح" اور "فی انوار القلب" اس [قسم] کی نظمیں ہیں صنفِ غزل میں اس نے بڑے خوبصورت اور اعلیٰ شاہکا[ر] تخلیق کئے ہیں۔ بالخصوص "نعیم الحب"، "الغائم المسحور" اور "الموقف" شہ پارے ہیں۔ "الفقر المجنون" جذبات کی پاکیزگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ تیجانی کے یہاں صوفیانہ رجحانات بھی پائے جاتے ہیں اس نے اپ[نے] خیالات "قلب الفیلسوف" میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے بھی[شہ] مصر و سوڈان کے اتحاد کا خواب دیکھا ہے۔ "فی محراب النیل"، "الزورق الاخضر" میں انہیں خوابوں کو بیان کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ تیجانی کا انتقال صرف ۲۵ سال میں ہو گیا مگر اس مختصر عرصے میں اس نے بہت

ت چھوڑے اور نئے شعراء فیقوری" ، "تاج السر" "جیلی" ، "محی الدین
رسس وغیرہ اسی کے خرمن فکر کے خوشہ چین ہیں۔

حجازی شاعری میں نئے رجحانات کی بات کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ اس نے بھی نئے خیالات اور نئے فنی تجربوں کو اپنایا ہے اس سلسلے میں محمد سرور الصبان کی ذاتی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ ان کا شمار اُن لوگوں میں ہے جو علم دوست اور شعر و ادب کے مربی کہے جاتے ہیں صبان خود بھی شاعری کرتے تھے اور وطن دوست خیالات کو انہوں نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ نئی نسل کے شعراء میں محمد حسن عواد ، حمزۃ شحاتہ ، محمد سعید العامودی ، عبد القدوس الانصاری ، احمد ابراہیم الغزاوی ، عبد الوہاب آشی ، طاہر الزمخشری ، حسن عبد اللہ قریشی اور محمد عامر رمیح وغیرہ ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ بالخصوص محمد حسن عواد ، حمزۃ اشحاتہ اور عامر رمیح کی تخلیقات اعلیٰ شعری خصوصیات کی حامل ہیں۔

عربی شاعری کی روایت رہی ہے کہ اس میں عورتیں بھی قابل قدر حصہ لیتی رہی ہیں۔ اور انھوں نے قیمتی اضافے کئے ہیں۔ اس دور میں بعض شاعرات نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں جمیلۃ العلایلی ، جلیلہ رضا ، فدوی طوقان نازک الملائکۃ اور صفیۃ ابو شادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جمیلۃ کا تو شمار اساتذہ میں ہوتا ہے انہوں نے ہفتہ وار ادبی مجلسوں کے ذریعے جو اُن کے گھر ہی پر منعقد ہوتی تھیں ، شعراء کے لیے مناسب اور ہمت افزا موقع پیدا کیا تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ایسے ماحول میں کرسکیں جہاں مستند نقاد موجود ہوتے تھے۔ یہ خود بھی شعر و ادب کا بڑا ستھرا ، اعلیٰ ، ذوق رکھتی تھیں۔ اُن کی تنقیدی صلاحیتوں کے بڑے بڑے نقاد معترف تھے۔ اس صلاحیت سے انہوں نے اپنے شاگردوں کی رہنمائی کی۔ جمیلۃ کا رجحان بچپن سے ادب کی طرف تھا چنانچہ "مَی" کے مقالات بڑے شوق سے پڑھتی تھیں یہ روحانی رابطہ آئندہ ذاتی تعلقات میں بدل گیا۔ اور اُن سے گہرے مراسم ہوگئے۔ عمر کی رفتار کے ساتھ وہ سنجیدہ اور ٹھوس ادب کی طرف مائل ہوئیں۔ اور فلسفیانہ اعلیٰ پایہ کے ادب سے دلچسپی بڑھ گئی ، اس دوران وہ عالمی شہرت رکھنے والے ادیبوں اور شعراء کے کارناموں سے متعارف ہوئیں اور اُن سے کسب فیض کیا وہ لکھتی ہیں میں نے ٹیگور ، گاندھی ، اقبال اور احمد حسن زیارت کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کی تصنیفات بیحد پسند آئیں ، رفتہ رفتہ انھیں برگزیدہ لوگوں کی ذہنی دُنیا میں رہنے لگی "آگے مزید لکھتی ہیں" میری زندگی کا بڑا حصہ ٹیگور اور گاندھی کی شاگردی میں گذرا۔ ٹیگور کی فکری یونی ورسٹی سے میں نے انسانیت کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ، ایسی انسانیت جس کی راہ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور اپنے خون کو بہایا ہے۔" جمیلۃ شعر کے علاوہ نثر میں بھی لکھتی تھیں۔ "سعادۃ المرأۃ" اُن کی پہلی کتاب ہے مقالات کا مجموعہ "السمات" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اگرچہ وہ تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ بنیادی طور پر شاعرہ تھیں۔ منصورۃ میں "اسرۃ الثقافۃ" کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی جس میں ممتاز شعراء اور ادباء کو دعوت دے کر لیکچر دلواتی تھیں۔ ڈاکٹر ابوشادی کے دو دواوین "الینبوع" اور "اطیاف الربیع" کی اکثر نظمیں اسی انجمن میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی تھیں اسی طرح ڈاکٹر ابراہیم ناجی کے دیوان اسی انجمن میں پڑھے گئے بیشتر قصائد پر مشتمل ہیں ڈاکٹر ذکی مبارک کی کتاب "لیلی المریضۃ" میں کئی مقالات ایسے ہیں جو جمیلۃ کی انجمن میں سنائے گئے تھے۔ جمیلۃ نے اپنا پہلا دیوان "صدی احلامی" ڈاکٹر ابوشادی کے مشورہ سے مرتب کیا وہ لکھتی ہیں "میری شاعرانہ صلاحیت کو تخلیق کی طرف مائل کرنے میں ابوشادی کی حوصلہ افزائی خلیل مطران ، ڈاکٹر ذکی مبارک اور ڈاکٹر ابراہیم ناجی کی قدرشناسی کا بڑا اہم حصہ رہا ہے۔ جمیلۃ کے اشعار میں جذبات کی گرمی خلوص اور بڑی پاکیزگی ملتی ہے وہ آپ بیتی کو کبھی آپ بیتی کی حیثیت سے نہیں پیش کرتیں ان کی مشرقی نسوانیت شرم و حیا کے پردوں میں ہمیشہ چھپی رہتی ہے۔

جلیلہ کے اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد حقائی کے خیال کی توثیق کرنی پڑتی ہے "عرب عورتوں نے ثقافتی ، ادبی ، فنی میدان میں جس جد و جہد کا آغاز کیا ہے اور عائشہ ، تیموریا ، ملک حفنی ناصف اور می نے جو روشن کارنامے انجام دیے وہ تاریخ ادب کا روشن صفحہ ہیں اور جدید

تاریخ مرتب کرنے والی شاعراۃ مثلاً جمیلۃ العلایلی، صفیہ ابو شادی فدوی طوقان اور نازک الملائکۃ کے نام یادگار بن جائیں گے۔ اور جلیلۃ جدید عربی ادب کے آسمان پر بنت الشاطئ، سہیر القلماوی، امینہ السعید، سلوی الحومانی، وداد اسکاکیفی اور دعد ایکالی جیسے ماہ پاروں کے ساتھ ستارہ بن کر چمکے گی۔ فدوی طوقان کی تخلیقات کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔ اس کا دیوان "وحدی مع الایام" عرب قوم کی ایک حسین دھڑکن بن کر رہ گیا ہے۔

فدوی طوقان فلسطین کی نامور شاعرہ ہے اس نے عربوں کی غریب الوطنی، بدنصیبی اور بے بسی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لئے اس کی شاعری اس عظیم انسانی المیہ کی چھاپ ہے، اس کے خوبصورت نغموں سے فلسطینی عربوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے مگر طوقان نے اپنی امید پرور روح سے ان تخلیقات میں امید کی جان ڈال دی ہے وہ فلسطین کی آزادی کا خواب دیکھتی ہے اور پڑھنے والے کو بھی وہی خواب دیکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ …کو اس خواب کی تعبیر کا یقین ہے۔ اس لئے وہ زندگی سے غیر معمولی پیار …تی ہے داخلی تجربات … بیان میں صفیہ ابو شادی کو بھی بڑا ملکہ حاصل …ے وہ ایسے خاندان کی صاحبزادی ہیں جس کے یہاں شعر و ادب خانہ …د کی حیثیت رکھتے ہیں مشہور شاعر و نقاد ابو شادی کی صاحبزادی … اپنے باپ کے ساتھ امریکہ چلی آئی ہیں۔ یہ شعر کہتی ہیں مگر قافیہ …بحر کی پابندی سے آزاد شاعری کی قائل ہیں۔ اُن کا دیوان "اغنیۃ الخالدۃ" کے نام سے طبع ہوا ہے، وہ فطری مناظر کی عکاسی بڑی قابلیت و گہرے مشاہدے سے کرتی ہیں۔ اپنے ذاتی تجربات کو بھی قلم بند کرتی ہیں۔ اس طرح لذت و الم، خوشی و غم کو شعری قالب عطا کرنے کا اُنھیں بڑا موثر انداز ملا ہے۔ انھیں کے نقش قدم پر نازک الملائکۃ بھی گامزن ہیں۔ یہ بھی آزاد شاعری میں معروف ہیں اور اسی فن کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا ہے۔ اُن کے دو دیوان "عاشقۃ اللیل" اور "شظایا و اماد" چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

اس مختصر گفتگو سے یہ بات آسانی سے واضح ہوتی ہے کہ عرب شعراء نے جدید تقاضوں کو سمجھا اس سے متاثر ہوئے اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سعی بلیغ کی۔ وہ ذمہ داری کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات میں سماج کی ترجمانی بلکہ رہنمائی کرتے تھے انھوں نے اچھے تجربات، قومی و ملکی مسائل سیاسی و تہذیبی تبدیلیوں کو محسوس کیا اور اپنے اشعار کے ذریعہ دوسروں تک پہنچایا۔ اس طرح وہ سماج سے قریب ہوئے اور دوسروں کے جذبات و احساسات سے اپنا رشتہ پیدا کیا۔ فنی طور پر انھوں نے پرانی روایتوں سے ہٹ کر بھی جدید روایتیں قائم کیں اور اُن کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ دوسرے ملکوں کے ادیب و شاعر جس ذہنی اور فنی تجربے سے گزر رہے تھے اس میں شریک ہو کر عربی شاعری کو عالمی شعر و ادب سے آنکھیں ملانے کے قابل بنایا۔ اس طرح اس کو اتنا بلند اور وقیع بنا دیا کہ مغربی زبانوں میں ترجموں کی بھرمار ہوگئی۔ اس طرح عربی شاعری آج اپنے فکر و فن کے اعتبار سے کسی بھی زبان کی اچھی شاعری کی ہم پلہ ہوگئی ہے۔

بقیہ: **آسر بندو گھوش**

…یستان تھی۔ ۱۹۱۰ء میں وہ یکایک اور بالکل چپ چاپ کلکتہ سے چلے گئے …و بیش چار پانچ سال تک اُن کی انقلابی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا چندر نگر میں ایک مختصر سے قیام کے بعد آپ پانڈیچری چلے گئے۔ …ں انھوں نے اپنی بقیہ زندگی انتہائی خاموشی اور دھیان میں گزاری …انھوں نے وہ مشہور و معروف آشرم قائم کیا جو دنیا والوں کو آج بھی …و انصاف رواداری اور نیکی کا پیغام دے رہا ہے۔

جس ملک کی آزادی کے لئے انھوں نے زبردست قربانیاں دی تھیں اور قید و بند کی سختیاں جھیلی تھیں۔ وہ اُن کی زندگی میں ہی آزاد ہوگیا اور آزادی کے بعد ملک کو جن اخلاقی اور روحانی قدروں کی ضرورت تھی اس کی ایک عملی درس گاہ قائم کرنے میں اپنی زندگی کے تقریباً ۴۰ سال لگائے۔

۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کو ہندوستان کا یہ نامور سپوت ابدی نیند سوگیا۔

غزلیں



وشوا ناتھ درد

بہت اُکتا گیا ہوں اپنے جی سے
مرا دل بھر گیا ہے ہر کسی سے
نہ جانے کس گلی میں کھو گیا ہوں
میں کٹ کر آپ اپنی زندگی سے
مرا ماضی مری یادیں کہاں ہیں
یہ پوچھوں اب تو کیا پوچھوں کسی سے
نہ جانے کتنے عنواں رشک کرتے
جو اپنی داستاں کہتے کسی سے
جو آئے جس کے جی میں درد کہہ لے
سنوں گا ہر کسی کی میں خوشی سے

راشد قریشی

وہی عالم ہے غم میں جو خوشی میں
عجب دَور آگیا ہے زندگی میں
شعورِ حسن جذبِ عاشقی میں
ہے کتنا ہوش اس دیوانگی میں
عجب ہے وعدۂ فردا کی تاثیر
نکل آتے ہیں آنسو تک خوشی میں
قدم اٹھیں تو اٹھنا بھی سکھائیں
کمالِ رہبری ہے رہبری میں
بھنور میں خود ہی کشتی غرق کر دی
کسے آواز دیتا بے کسی میں
خودی میں صرف اپنی جستجو تھی
دو عالم ہاتھ آئے بے خودی میں
طلب رنگینیوں کی کیا کروں خاک
بلا کی دل کشی ہے سادگی میں
سکوں ہے موت کا پیغام راشد
سکوں ملنا ہے مشکل زندگی میں



میکش بدایونی

تری کافر نگاہی اور کیا ہے
دلوں کی ہے تباہی اور کیا ہے
کسی کی زلف کی آوارہ نکہت
نسیم صبح گاہی اور کیا ہے
سرِ مژگاں ستارہ ایک لرزاں
کسی کی عذر خواہی اور کیا ہے
مرے عجزِ تمنا کا تصدّق!
غرورِ کج کلاہی اور کیا ہے
سمجھتا ہے ہر اک جلوہ کو پردہ
بشر کی کم نگاہی اور کیا ہے

قاسم شبیر نقوی

لوگ اس عالمِ اسباب سے کیا کیا نہ اُٹھے
تیرا غم لے کے جو اُٹھے کبھی رُسوا نہ اُٹھے
ہم تری رہگزرِ غم پہ ٹھہر جاتے ہیں
راہِ ہستی میں جو بارِ غمِ دُنیا نہ اُٹھے
اصل میں بندگیٔ شوق کی معراج یہ ہے
خم ہوا اک بار جہاں پھر سرِ سجدہ نہ اٹھے
میں تو ناواقفِ تہذیبِ محبت سمجھوں
تیری محفل سے اگر کوئی رقیبانہ اُٹھے
اُن کے ہاتھوں میں ہے تشکیلِ نشیمن قاسم
برمحل ہاتھ سے جن کے کوئی تنکا نہ اُٹھے

کاظم علی خاں



کائنات اور اس میں حیات کے امکانات

اس وسیع کائنات میں پھیلے ہوئے بے شمار شمسی نظاموں کے سیاروں یں کیا صرف کرۂ ارض (ہماری زمین) ہی واحد و یکتا ایسا سیارہ ہے جہاں زندگی موجود ہے ؟ اس کائنات میں کرۂ ارض کا انسان تنہا ہے یا دوسرے سیاروں پر بھی کچھ جاندار مخلوقات موجود ہیں؟ یہ ایک ایسا ہم سوال ہے جو عرصے سے انسانی ذہن کو پریشان کرتا رہا ہے اور نسان کے لئے دورِ حاضر میں بھی ایک دلچسپ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب ہم اس سوال کا جواب انسانی علم کی مدد سے دریافت شدہ قائق کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس وسیع کائنات میں پائی جانے والی لاتعداد دنیاؤں میں کہیں ی مخلوق آباد ہے یا نہیں ؟ ہم اس سوال کا جواب دورِ حاضر تک کے یافت شدہ حقائق کی روشنی میں واضح مختصر اور غیر مبہم طور پر یہ دے تے ہیں کہ ابھی ہمیں کرۂ ارض کے علاوہ اس کائنات کی کسی بھی دوسری نیا پر کسی مخلوق کے آباد یا موجود ہونے کی کوئی واضح اور یقینی شہادت ستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ چاند سے انسان جو سنگ ریزے لا چکا ہے ، پر تجربات ہو رہے ہیں۔ تا دمِ تحریر ان میں حیات کے وجود کی تصدیق ہیں ہوسکی ہے دوسرے سیاروں پر زندگی کے موجود ہونے کی بابت س کوئی مضبوط شہادت تو نہیں لیکن کائنات میں حیات کے امکانات محدود شکل میں ضرور موجود ہیں۔ کائنات میں حیات کے امکانات کے کیا حدود ہیں.؟ حقائق، نظریات اور قیاس کی بنیاد پر اس سوال کا دلچسپ جواب دیا جا سکتا ہے۔

زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر کسی انسان جیسی باشعور یا ذہانت میں انسان سے بلند و برتر یا پست و کم تر مخلوق کی موجودگی کا امکان اور اس امکان کی حدوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں دو اہم باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اول تو یہ کہ اس وسیع کائنات میں پائی جانے والی دنیاؤں کی تعداد و نوعیت کیا ہے اور دوسرے وہ کون سے امور یا شرائط ہیں جن کے بغیر حیات کا وجود ممکن نہیں۔ ہمارے موضوع کے لئے یہ دونوں اہم سوال ناگزیر ہیں اور ان کے جوابات ہمارے موضوع کی وضاحت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کائنات میں نہ تو کرۂ ارض یا ہماری زمین اپنے نظام شمسی میں واحد اور تنہا سیارہ ہے اور نہ ہمارا نظامِ شمسی کوئی واحد و یکتا نظام ہے ہمارا شمسی نظام اجسام فلکی کا ایک ایسا خاندان ہے جس میں نو اہم سیاروں، اکتیس ذیلی سیاروں یعنی چاندوں، لاتعداد چھوٹے سیاروں

یاسیارچوں (ASTEROIDS) اور متعدد دمدار سیاروں (COMETS) کو سورج بحیثیت ایک حکمراں نہ صرف روشنی اور حرارت بخشتا رہتا ہے بلکہ اپنی زبردست مقناطیسی کشش سے ان کی گردشوں کو بھی قابو میں رکھتا ہے۔ نظام شمسی کے سیارے اپنے محور پر گردش کرتے ہوئے اپنے اپنے مخصوص مداروں پر سورج کے گرد بھی گردش کرتے رہتے ہیں یہ سیارے اپنے محور پر ایک خاص زاویے میں جھکے بھی رہتے ہیں ان سیاروں کی محوری گردش (۲) مداری گردش اور (۳) اپنے محور پر کسی زاویہ میں جھکے رہنے سے بہ ترتیب یہ تین اہم نتائج نکلتے ہیں (۱) محوری گردش کے باعث ان سیاروں پر دن اور رات ہوتے ہیں۔ مداری گردش اُن کے سال کی گردشوں کا تعین کرتی ہے اور محور پر جھکاؤ سے ان سیاروں پر موسم بدلتے رہتے ہیں ہیں۔ اور زندگی کے لئے سیاروں پر یہ تمام باتیں ہونا ضروری ہیں اس کے علاوہ جس طرح یہ اصل سیارے سورج کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں اسی طرح ہمارے نظام شمسی کے نو (۹) سیاروں میں سے چھ (۶) سیاروں کے پاس مجموعی طور پر اکتیس (۳۱) ماتحت یا ذیلی سیارے (چاند) ہیں جو اپنے اپنے مداروں میں اپنے اپنے سیاروں کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ہماری زمین کے پاس صرف ایک ذیلی سیارہ SUB PLANET) ہے جو ہمارا اور آپ کا جانا پہچانا چاند ہے جب کہ کچھ دوسرے سیاروں کے پاس کئی کئی چاند ہیں۔

جس طرح کرۂ ارض یا ہماری زمین اپنے نظام شمسی میں کوئی واحد و یکتا سیارہ نہیں اسی طرح ہمارا نظام شمسی بھی کائنات (UNIVERSE) میں اکیلا اور تنہا شمسی نظام نہیں۔ اس وسیع کائنات میں ہمارے نظام شمسی کی طرح (اس سے بڑے اور چھوٹے) اور بھی بے شمار شمسی نظام ہیں۔ رات کو آسمان پر نظر آنے والے تیارے (STARS) دراصل کائنات کے اُن لاتعداد شمسی نظاموں کے سورج ہیں جو ہمارے شمسی نظاموں سے اس قدر زیادہ دُور ہیں کہ اُن کے فاصلے عام پیمائش (میل اور کلومیٹر) کے بجائے نوری سال (LIGHT YEAR) کے ذریعے ناپے جاتے ہیں۔

"نوری سال سے مراد وہ فاصلہ ہے جو شعاعِ نور یا روشنی کی کرن ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل یا تین لاکھ کلومیٹر فی سکنڈ کی زبردست رفتار سے ایک سال میں طے کرتی ہے اس حساب سے ہمارے نظام شمسی کا قریب ترین سورج چار نوری سال کے فاصلے پر اور دوسرے بعید شمسی نظام ہم سے بے شمار نوری سال کے فاصلوں پر ہیں۔ اس امر سے کائنات کی بے کراں وسعتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جس طرح متعدد قریبی سیاروں سے مل کر ایک نظام شمسی بنتا ہے اسی طرح بے شمار شمسی نظاموں کے کسی ایک مجموعہ کو کہکشاں (GALAXY) کہتے ہیں ہمارا نظام شمسی جس کہکشاں کا رکن ہے اس میں کم از کم ڈیڑھ لاکھ ملین MILLION (ایک ملین، دس لاکھ) سورج یا شمسی نظام ہیں جس طرح کسی شمسی نظام میں سیارے اپنے ایک مخصوص و متعین مرکز (سورج) کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں اسی طرح کسی کہکشاں میں پائے جانے والے بے شمار شمسی نظام اپنے مخصوص مرکز (GALACTIC CENTRE) کے گرد گھوما کرتے ہیں جس طرح کسی سیارے کی اپنے سورج کے گرد ایک مداری گردش کی مدت سے اس سیارے کے ایک سال کی مدت کا تعین ہوتا ہے اسی طرح کسی کہکشاں میں ایک نظام شمسی کا اپنے مرکزِ کہکشاں کے گرد ایک چکر ایک کائناتی سال (Galatic Year) کہلاتا ہے ہمارا سورج جو اپنے مرکزِ کہکشاں سے تیس (۳۰) ہزار نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ اس مرکز کے گرد تقریباً ڈھائی سو ملین (MILLION) سال میں ایک چکر پورا کرتا ہے اس حساب سے ہماری چار ہزار ملین سال کی زمین کی عمر صرف ۱۵ یا ۱۶ کائناتی سال (COSMIC YEAR) ہے یا دوسرے الفاظ میں ہماری زمین کی مدتِ حیات کے دوران ہمارے شمسی نظام کے سورج نے کہکشاں میں اپنے مرکز کے گرد صرف پندرہ ۱۵ یا سولہ ۱۶ چکر لگائے ہیں۔

جس طرح ہماری کہکشاں میں ہمارا نظام شمسی کوئی اکیلا نظام نہیں اسی طرح اس وسیع و بے کراں کائنات میں ہماری کہکشاں

بھی کوئی تنہا کہکشاں نہیں ۔ اس کائنات میں بے شمار کہکشائیں (GALAXIES) ہیں جن میں لاتعداد شمسی نظام اپنے بے گنتی اور بے شمار ستاروں کے ساتھ حرکت و گردش میں مصروف ہیں۔ اس طرح ہماری زمین اس کائنات کی لاتعداد کہکشاؤں میں سے ایک کہکشاں اور اس ایک کہکشاں میں بے حساب شمسی نظاموں کے ایک شمسی نظام اور اس ایک شمسی نظام کے متعدد سیاروں میں ایک عام سیارہ ہے لیکن اس کی سب سے انوکھی اور حیرتناک شے اس پر پائی جانے والی زندگی ہے جس کی تلاش میں اب ہمیں اس وسیع کائنات کی لاتعداد دنیاؤں کا جائزہ لینا ہے۔

اس وسیع اور بے کراں کائنات میں انسان اور اس کے لم کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے ؟ اس مسئلہ پر مشہور یونانی مفکر افلاطون (PLATO) نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے ۔ افلاطون نے اس بیکراں نات میں انسان اور اس کے علم کی حیثیت کا تعین ایک دلچسپ مثال ، ذریعہ کیا ہے۔ افلاطون کے خیال کے مطابق اس وسیع کائنات ہم (کرۂ ارض کے انسان کی حیثیت سے) کسی غار کے ایسے قیدی یثیت رکھتے ہیں جو اپنے غار (یعنی کرۂ ارض) کے باہر کی دنیا (مراد نات) کے بیرونی حقائق کو اپنے غار کی دیواروں پر پڑنے والے ائے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرے۔ اصل بیرونی حقیقت ، تو شاید ہی ہماری رسائی ہو سکے لیکن اس امر کا امکان ضرور ، کہ ہم ایک دن اپنے قرب و جوار کے دوسرے غاروں کے یوں تک پہنچ جائیں جہاں شاید ہمیں اپنے غار سے مختلف کچھ حقائق کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکتا ہے۔

کائنات کی وسعت اس میں پائے جانے والے سیاروں کی تعداد یت اور اس بے کراں کائنات میں انسان اور اس کے علم کی حیثیت ہ کر اب ان میں حیات کے امکانات کا جائزہ ہم انھیں خصوصیات ت کی بنیاد پر لے سکتے ہیں جو کرۂ ارض یا ہماری زمین پر ملنے والی ، سے بالکل مختلف ہو تو ظاہر ہے کہ ہم اس کے بارے میں کچھ ، نہ کہہ سکیں گے۔

اس کائنات میں حیات کے وجود و امکان کے لئے پہلی بات یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ زندگی کے وجود کا امکان کائنات کے سارے کے سارے سیاروں اور دوسرے فلکی اجسام پر نہیں ہو سکتا کیونکہ زندگی کا نشو و نما نہ تو ناقابلِ بیان و زبردست حدت رکھنے والے ستاروں (سورجوں) پر شدت کی حدت اور حدت کی شدت سے کھولتے ہوئے ابخرات کے بادلوں میں ممکن ہے اور نہ ایسے سیاروں پر ممکن ہے جو اپنے سورج سے اتنی دوری پر ہوں کہ جہاں زندگی کے چراغ کو ٹھنڈا کر دینے والی سردی پڑتی ہو۔ اس طرح کائنات میں پائے جانے والے سیارے ہی زندگی کا مسکن بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان سیاروں میں بھی صرف وہی سیارے زندگی کے لئے مناسب ہیں جن میں نہ بہت زیادہ گرمی ہو اور نہ بہت زیادہ سردی۔ زندگی کا امکان ستاروں (سورجوں) پر تو ممکن ہی نہیں ہے

کسی سیارے پر کسی جاندار مخلوق کی زندگی کے لئے پہلی بات تو یہ ضروری ہے کہ وہ سیارہ اپنے سورج سے ایک مخصوص مقدار میں یکساں اور متوازن طور پر مسلسل گرمی حاصل کرتا رہے ۔ اس امر کے لئے ضروری ہے کہ اپنے سورج کے گرد گردش کرنے میں اس سیارے کا مدار گول یا تقریباً گول ہو اور اس کا سورج دوہرا یا تہرا (DOUBLE or MULTIPLE) نہ ہو۔ (بدقسمتی سے کائنات میں دوہرے اور تہرے سورجوں کی تعداد اسی (۸۰) فی صد ہے اور اکہرے سورج صرف بیس (۲۰) صد ہیں کیونکہ دوہرے اور تہرے سورج کے گرد گردش کرنے والے سیاروں کے مدار میں یکسانیت اور گولائی نہ رہے گی جس کے بغیر زندگی کا امکان نہیں ، ساتھ ہی ساتھ زندگی رکھنے والے سیارے کا اکہرا سورج (SINGLE STAR) روشنی اور گرمی میں تبدیلی رکھنے والا سورج (VARIABLE STAR) بھی نہ ہو بلکہ روشنی اور حرارت میں توازن و یکسانیت رکھنے والا سورج (STABLE ST) ہو۔ (بدقسمتی سے اکہرے سورجوں میں کل دس فی صدی سورج (STABLE STAR) ہی حیات کے لئے موزوں بتائی گئی قسم

کے ہیں جبکہ نوّے (۹۰) فیصد اکہرے سورج (VARIABLE STARS) اور مہلک گیسوں (GASES) کے درمیان زندگی کے پنپنے کا کوئی

حیات کے لئے ناموزوں بتائی جانے والی قسم کے ہیں۔

زندگی رکھنے والے سیارے کو سورج کے گرد اپنی گردش کے دائرے کا النصف قطر (RADIUS) بھی نہ تو بہت زیادہ طویل رکھنا چاہئے اور نہ بہت زیادہ قلیل۔ بلکہ اس نصف قطر کی لمبائی اوسط درجہ کی ہی ہونا چاہئے۔ گویا کسی سیارے کو اپنے سورج سے نہ تو بہت زیادہ دور ہونا چاہئے اور نہ بہت زیادہ قریب۔ بلکہ مناسب اور موزوں فاصلے پر رہنا چاہئے۔ کیونکہ روشنی اور حرارت کی موزوں و مناسب مقدار جو زندگی کے لئے اہم ترین شے ہے کسی سیارے کو اسی وقت ملے گی جب وہ سورج سے اوسط درجے کے مناسب فاصلہ پر ہو۔ ہمارے نظام شمسی کے نو (۹) عدد سیاروں میں سے صرف تین سیارے (۱) زہرہ (VENUS) (۲) زمین (EARTH) اور (۳) مریخ (MARS) ہی زندگی کے متعلق اس شرط کو کسی نہ کسی حد تک پورا کرنے والے بتائے جاتے ہیں اور اُن کے علاوہ ہمارے نظام شمسی کے بقیہ چھ (۶) سیارے اس لحاظ سے زندگی کا مسکن بننے کے اہل نہیں معلوم ہوتے (کائنات میں اس لحاظ سے زندگی کے لئے موزوں سیارے صرف دس فیصدی ہیں جبکہ نوّے ۹۰ فیصد ایسے سیارے ہیں جو اس لحاظ سے زندگی کے لئے ناموزوں ٹھہرتے ہیں)

کسی سیارے پر زندگی کے لئے یہ امر بھی ضروری ہے کہ اس سیارے کی جسامت یا مقدار (MASS) بھی نہ بہت زیادہ ہو اور نہ بہت کم ہو بلکہ اس کی جسامت اوسط درجے کی ہو۔ بہت بڑی جسامت والا سیارہ اول تو سورج ہی کی طرح اپنی شدید حدت کی باعث زندگی کا مسکن بن سکنے کے لئے نااہل ہوگا، دوسرے بڑی جسامت کے باعث یہ اپنی زیادہ اور زبردست مقناطیسی کشش کے سبب سے ہائیڈروجن امونیا اور میتھین (HYDROGEN, AMMONIA & METHANE) جیسی ہلکی مگر زہریلی اور مہلک گیسوں کو بھی خلا میں خارج ہونے سے روکے رہے گا اور ظاہر ہے کہ ان زہریلی

امکان نہیں۔ اس کے برعکس بہت زیادہ کم جسامت کا سیارہ اپنی کمزور مقناطیسی کشش کی مدد سے اپنے کرہ پر ہوا کے اُن عناصر کو بھی نہ روک سکے گا جو زندگی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اوسط درجے کی جسامت والا سیارہ زندگی کے لئے متذکرہ دونوں قسم کے ناموزوں حالات سے پاک ہوگا۔ اوسط جسامت کا ایسا ایک سیارہ ہماری زمین بھی ہے جو اپنی مناسب اور اوسط درجے کی مقناطیسی کشش کے ذریعے زندگی کے لئے ہوا کے ضروری اجزاء (آکسیجن وغیرہ) کو تو اپنے کرے میں روکے رہتی ہے۔ لیکن ہائیڈروجن اور میتھین جیسی ہلکی مگر زہریلی گیسیں زمین کے اوسط درجے کے مقناطیسی کشش کے دائرے سے نکل کر (SPACE) میں غائب ہوجاتی ہیں اور زمین پر زندگی کے لئے سازگار حالات قائم رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے نظام شمسی کے بڑی جسامت والے سیارے مشتری (JUPITER) زحل (SATURN) اور یورانس Uranus وغیرہ اپنی زبردست مقناطیسی کشش کے باعث زندگی کے لئے مہلک امونیا اور میتھین جیسی گیسوں (GASES) میں غرق رہ کر زندگی کے لئے ناموزوں ٹھہرتے ہیں۔ کم جسامت والے اجسام فلکی میں ہمارا چاند اور سیارہ عطارد (MERCURY) اپنی کمزور مقناطیسی کشش کی مدد سے زندگی کے لئے ضروری شے ہوا کو سرے سے اپنے کرہ پر روک ہی نہیں پاتے۔ اسی لئے ہمارے چاند میں ہوا نہیں اور ہوا کے نہ ہونے سے وہاں پانی بھی نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں چاند جیسی بے باد و بے آب دُنیا زندگی کے لئے بے کار دُنیا ہوگی۔

زندگی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی سیارہ اور اس کا سورج اپنی عمر کی اُن ارتقائی و ابتدائی منزلوں سے گذر چکا ہو جو زندگی کے لئے ناموزوں و مناسب نہیں ہوتیں۔ ہماری زمین اپنی چار ہزار ملین (MILLION ایک ملین = دس لاکھ) سالہ عمر کے ابتدائی ایک ہزار ملین سال کے دوران آج کل کے مقابلے میں اپنی سطح اور

دوسرے حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوتے ہوئے بھی بظاہر زندگی کے آثار و وجود سے محروم رہی ہے۔ اس طرح زندگی رکھنے والے سیارے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی عمر کے ارتقا کی ان ابتدائی منزلوں سے گذر چکا ہو، جن کے دوران قدرت زندگی کے وجود و امکان کے لئے حالات کو سازگار بناتی رہتی ہے۔ اس لئے کم عمر ستاروں (سورجوں) کے قریب واقع کم عمر سیاروں پر جو ابھی پیدا ہو رہے ہوں یا جن کو پیدا ہوئے دسیوں یا سیکڑوں ملین سال بھی ہو چکے ہوں زندگی کے آثار و وجود کا امکان نہ ہوگا۔

زندگی کے وجود و امکان کے لئے ان تمام شرائط کو پورا کرنے والے سیاروں کی تعداد و نوعیت کا جائزہ لینا بھی مفید و مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسی جائزے کی مدد سے ہم کائنات میں حیات کے امکانات کے حدود کو سمجھ سکیں گے۔

کسی سیارے پر زندگی کے لئے پہلی ضروری بات یہ بتائی جا چکی ہے کہ اس سیارے کا اپنے سورج کے گرد مدار گول یا تقریباً گول ہو تاکہ اس سیارے کو سال کے دوران برابر یکساں اور متوازن طور پر مناسب حرارت اور روشنی ملتی رہے کیونکہ گرمی اور روشنی کی مناسب اور متوازن مقدار میں کوئی بھی قابل لحاظ تبدیلی اس سیارے پر زندگی کے امکانات کو تاریک کر سکتی ہے لہٰذا زندگی کے لئے کسی سیارے کے مدار کا گول یا تقریباً گول ہونا ضروری ہے لیکن کسی دوہرے اور تہرے سورج (DOUBLE OF MULTIPLE STAR) کے گرد گھومنے والے سیاروں کے مدار کا گول رہنا چونکہ ناممکنات کی حد تک مشکل ہے لہٰذا دوہرے اور تہرے سورجوں کے گرد گردش کرنے والے سیارے شاید زندگی کی نعمت سے محروم ہی رہیں گے اس لحاظ سے اب ہمارے سورج جیسے ہی اکہرے سورجوں (SINGLE STARS) سے قربت رکھنے والے سیاروں پر ہی کسی جاندار مخلوق کے ملنے کا امکان باقی رہ جاتا ہے۔

لیکن ان اکہرے سورجوں کے نزدیک ملنے والے سیاروں کے بھی مدار گول یا تقریباً گول شکل کے ہونا زندگی کے لئے اس بنا پر ضروری ہیں کیونکہ کسی سیارے کے مدار کی گولائی میں ایک چوتھائی (¼) فرق بھی ہو جانے پر اس سیارے کو اپنے سورج سے ملنے والی روشنی اور حرارت میں ایک ہی مداری گردش کے دوران تین گنی تبدیلی ہو جاتی ہے اب اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے جب ہم اس تلخ حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں کہ اس کائنات کے اسّی فی صدی سورج دوہرے یا تہرے سورج ہیں جن کے گرد گردش کرنیوالے سیاروں کا مدار گول نہیں رہ سکتا اور باقی بچے ہوئے صرف بیس (۲۰) فیصدی اکہرے سورجوں کے بھی تمام سیاروں کے مدار کی شکل گول نہیں تو مجبوراً ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ کائنات میں حیات کے امکانات کی حدیں کافی سمٹ کر صرف اکہرے سورجوں سے متعلق گول مدار رکھنے والے سیاروں تک محدود رہ جاتی ہیں جن کی تعداد یقیناً ایسے اجسام فلکی کے مقابلے میں بہت کم ہے اور جن میں حیات کے امکانات معدوم یا تاریک ہیں۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ زندگی کے شرائط کی تعداد و حدود ابھی اور بڑھ کر کائنات میں حیات کے امکانات کو اور بھی محدود کر دیتی ہیں کیونکہ اکہرے سورجوں سے متعلق گول مدار میں گردش کرنے والے سارے کے سارے سیارے اوّل تو مناسب جسامت (MASS) نہ رکھنے کے باعث یا تو زہریلی گیسوں (GASSES) میں غرق رہتے ہیں یا زندگی کے لئے ہوا کے ضروری اجزا ہی اپنے کرہ پر روکے رکھنے میں ناکام رہتے ہیں جن پر دونوں ہی صورتوں میں زندگی ممکن نہیں۔ دوسرے ان اکہرے سورجوں سے متعلق گول مدار والے سیاروں میں سے بہت سے سیارے ابھی اپنی عمر کے ابتدائی دور سے گذر کر اس منزل تک نہیں پہونچے ہوں گے جو زندگی کے لئے موزوں و مناسب ہوا کرتی ہے۔

اس طرح کائنات میں حیات کے امکانات اب اور زیادہ محدود ہو کر صرف اکہرے سورجوں سے متعلق گول مدار میں گھومنے والے موزوں جسامت اور مناسب عمر رکھنے والے سیاروں میں ہی باقی رہ جاتے ہیں لیکن ان اکہرے سورجوں میں بھی بہت سے (نوّے فیصد)

رج ایسے ہیں جن کی حدت اور روشنی میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے ایسے سورجوں VARIABLE STARS کی قوتِ کشش میں بھی تبدیلی رتی رہتی ہے لہٰذا روشنی، حدت اور مقناطیسی کشش میں تبدیلی رکھنے والے سورجوں کی اکہرے سورجوں میں سے نوّے (۹۰) فی صدی تعداد نکال کر باقی بچے ہوئے دس (۱۰) فی صدی اکہرے اور اپنی روشنی و حرارت میں توازن رکھنے والے سورجوں (STABLE STARS) کے گرد ہی گھومنے والے سیاروں میں زندگی کے امکانات باقی رہ جاتے ہیں۔ گویا حیات کی اس شرط نے کائنات کے سیاروں پر حیات کے امکانات کو اور بھی محدود کر دیا ہے۔

زندگی سے متعلق متذکرہ بالا تمام شرائط کو پورا کرنے والے سیاروں میں اب بھی ایک بڑی تعداد میں ایسے سیارے موجود ہیں جن میں زندگی کا امکان نہ ہوگا کیونکہ اِن تمام سیاروں میں صرف دس (۱۰) فی صدی سیاروں کے سورج سے فاصلے حیات کے لئے موزوں اور مناسب حدوں میں رہتے ہیں۔ باقی نوّے فی صدی سیارے یا تو اپنے سورج سے بہت قریب ہیں اور زندگی کے لئے ناقابلِ برداشت حدت رکھتے ہیں یا سورج سے اتنی دور ہیں کہ اُن میں حیات کے لئے موزوں و مناسب حرارت مفقود ہوتی ہے اور اُس میں زندگی کے چراغ کو ٹھنڈا کر دینے والی سردی ہوتی ہے۔ لہٰذا زندگی کی اس شرط نے بھی کائنات میں مسکنِ حیات بن سکنے والے سیاروں کی تعداد کو بہت زیادہ گھٹا دیا ہے۔۔۔ اس طرح زندگی کی ہر نئی شرط کے بڑھنے پر زندگی کا مسکن بن سکنے کے قابل سیاروں کی تعداد گھٹتی چلی جاتی ہے۔ گویا حیات کی شرائط کائنات میں حیات کے امکانات کو کم کرتی جاتی ہیں اور اب زندگی اپنی تمام شرائط کے ساتھ صرف اُنہی سیاروں پر مِل سکتی ہے جو کسی اکہرے اور اپنی روشنی اور حرارت میں مناسب توازن اور یکسانیت رکھنے والے سورج (SINGLE & STABLE STAR) کے گرد اپنی مناسب جسامت اور زندگی کے لئے موزوں عمر کے ساتھ سورج سے مناسب و موزوں فاصلے پر گول یا تقریباً گول شکل کے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ گویا زندگی اپنی پیدائش کے لئے کچھ شرطیں تو ستاروں یا سورجوں سے منوانا چاہتی ہے اور کچھ سیاروں سے۔

ایک اندازے کے مطابق ہماری کہکشاں میں ہر دس لاکھ ستاروں یا سورجوں میں سے صرف ایک سورج کے پاس کسی ایک ایسے سیارے کے ملنے کا امکان ہے جس پر زندگی اپنے ارتقار کی کسی نہ کسی منزل پر مل سکتی ہے جبکہ لاتعداد فلکی اجسام مسکنِ حیات بننے سے محروم ہیں اور اُن میں سے بہت سے تو اس نعمت سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔

اصلیت یہ ہے کہ اس وسیع و بے کراں کائنات میں بے شمار کہکشائیں ہیں اور ہر کہکشاں میں بےحساب ستارے یا سورج ہیں۔ جن کی مدد سے لاتعداد شمسی نظام چل رہے ہیں جن میں ناقابلِ شمار سیارے موجود ہیں صرف اس کہکشاں میں جس کا ایک رکن ہمارا سورج بھی ہے تقریباً ڈیڑھ لاکھ ملین (MILLION) (ایک ملین = دس لاکھ) سورج ہیں جن سے متعلق سیکڑوں ہزاروں ایسے سیارے موجود ہیں جن پر زندگی کی پیدائش ونشو ونما کے امکانات موجود ہوں جب ہماری کہکشاں میں مسکن حیات بننے کے لائق سیاروں کی تعداد اتنی بڑی ہے تو اس وسیع کائنات میں اس حساب سے بے شمار ایسے سیارے موجود ہوں گے جن پر زندگی اپنی تمام بیان کردہ شرائط کے ساتھ جنم لے سکتی ہے لیکن بدقسمتی سے کرۂ ارض کے علاوہ اس کائنات کی کسی بھی دوسری دنیا پر کسی مخلوق کے آباد یا موجود ہونے کی کوئی واضح اور یقینی شہادت ابھی ہمارے پاس موجود نہیں مستقبل اپنے پردے میں اس سلسلے میں ہمارے لئے کن حیرتناک حقائق کو چھپائے ہوئے ہے۔ وہ ہمارے سامنے اسی وقت آسکیں گے جب وقت کے ہاتھ مستقبل کے دبیز پردوں کو موجودہ زمانے اور آنے والے دور کے درمیان سے اٹھا دیں۔

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام!
یہ کہکشاں، یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک (اقبالؔ)

عکسِ آگہی



اونچ نیچ کی تکرار!
ذات پات کے جھگڑے
اس قدر ترقی کے
بعد بھی زمانے میں
دیکھنے کو ملتے ہیں!
کاش ہم سمجھ سکتے
زندگی کی آرائش
آدمی کی پیدائش
اونچ نیچ سے اونچی
ذات پات سے اعلیٰ
خوبیوں کی حامل ہے!
ایشور کہیں اس کو
یا اسے خدا سمجھیں
ہم کہیں اسے فطرت
یا "کوئی نہیں" کہہ کر
دادِ خوش خیالی دیں
جس کے اک اشارے پہ
زندگی کی آرائش!
آدمی کی پیدائش

مدتوں، زمانوں سے
صبح و شام جاری ہے
اس کے سامنے ہر اک
آدمی ہی ہوتا ہے!
زندگی کے ساحل پر
موت کے سفینے میں
جب سوار ہوں گے ہم
آخرت کی منزل سے
ہم کنار ہوں گے ہم
تب ہمارے ہونٹوں پر
ذکر ذات کا تو کیا
نام تک نہیں ہوگا!
اور زندگی کے اس
چند روزہ عرصے میں
ہم سے جو ہوا ہوگا
جو برا بھلا ہوگا
اک کتاب کی صورت
سب لکھا ہوا ہوگا!

حیدر نایاب

بہتات

'آتش و گل، خاک و آب'
ان کے عزمِ مشترک نے وسعتِ گلزار میں
اک نرالے گل کی جب تخلیق کی
اس کے پہلو سے ہوا اک اور گل پھر جلوہ بار
جس نے مغلوبِ تمنا ہو کے پہلے سے کہا
'دیکھ میں تجھ سے حسیں ہوں
آ! مجھے اپنا بنا
تیری آنکھیں پائیں گی مجھ سے نظر کا مدعا
اک سکونِ بیکراں دل کو ترے ہاتھ آئے گا
ہر ادا میری، تجھے بخشے گی پائندہ خوشی
بے خودی اک لذتِ نو سے کرے گی آشنا!"

دو گلوں کے اس وصالِ اولیں میں تھا چھپا
رازِ ہستی کا وجود،
گل سے گل، پھر گل سے گل، پھر گل سے گل
کھل رہے ہیں سلسلہ در سلسلہ،
ان گلوں کے بوجھ سے
تھرتھراتی ہے زمیں
لڑکھڑاتی ہیں بہاریں
فطرتِ تخلیق کا ماتھا عرق آلود ہے،
آتش و گل، خاک و آب
کس قدر مایوس ہیں
دیکھ کر اب یہ بلکتی زندگی کا المیہ!

مى احمد ارشاد



شہید آزادی

حاجی احمد اللہ

حاجی احمد اللہ مرحوم تاریخ کے صفحوں پر بھارت کی پہلی جنگ آزادی کے سلسلہ میں اُبھرے۔ اُن کے معاصرین نے جو کچھ لکھا اس کا تعلق صرف ۱۸۵۷ء کے واقعات سے ہے ۷ جون[1] ۱۸۵۷ء کو پٹنہ کے کمشنر ولیم ٹیلر نے اُن کو معہ اُن کے دو ساتھیوں شاہ احمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو کانفرنس کے بہانے سے اپنی کوٹھی پر طلب کیا اور اس بہانے سے گرفتار کر کے نظر بند کر دیا تھا۔

شاد عظیم آبادی تاریخ بہار مطبوعہ ۱۸۷۶ء صفحہ ۱۲۶ میں تحریر کرتے ہیں۔

"کمشنر نے حکمتِ عملی سے بہت سے اہل شہر کو اپنی کوٹھی پر طلب کیا۔ اس پردہ میں گرفتاری مولوی احمد اللہ صاحب خلف مولوی الٰہی بخش و مولوی واعظ الحق صاحب و شاہ احمد حسین صاحب کی منظور تھی۔

ان لوگوں سے اندیشہ یہ تھا کہ وہابی ہیں اور اپنے مریدوں کو جہاد کی طرف مائل کرتے ہیں۔

پہلے تو کمشنر نے در باب سدِ خلفشار بہت دیر تک تقریر کی۔

قریب شام جب جلسہ برخواست ہونے لگا تو ان تینوں مولویوں سے ٹھہرنے کو کہا گیا۔ کمشنر نے ان سے بیان کیا کہ جب تک یہ خلفشار دفع نہ ہو تب تک آپ لوگوں کا ہمارے پیش نظر رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولوی احمد اللہ صاحب نے سر جھکا کر طوعاً و کرہاً اس حکم کی تعمیل پر رضامندی ظاہر کی۔"

شعلۂ بغاوت بجھ گیا دار و رسن کا قصہ تمام ہوا۔ مگر حاجی مرحوم پر بابِ مصائب بعد واقعات ۱۸۵۷ء کھلا۔

صوبہ شمالی و مغربی سرحد (موجودہ مغربی پاکستان کا علاقہ) میں آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی اور وہاں جان بازوں نے سر و تن کی بازی لگا دی۔ ۱۸۶۴ء میں "ستنہ" میں بغاوت ہوئی جس کا ذکر خود ولیم ٹیلر (کمشنر پٹنہ ۱۸۵۷ء) اپنی کتاب "ہندوستان میں ۳۸ سال" صفحہ ۹۹ میں یہ ایں الفاظ کرتا ہے۔

"۱۸۶۴ء میں ایک غیر متوقع واقعہ کی وجہ سے صوبہ سرحد جاتے ہوئے چند وہابی ستنہ کے مقام پر گرفتار کیے گئے۔"

یہ تو اس انگریز کا بیان ہے جس کا تعلق حکومت سے تھا۔ محمد جعفر

[1] "ہندوستان میں ۳۸ سال" مصنفہ ولیم ٹیلر صفحہ ۲۷۴

تھانیسری جنہوں نے خود اس بغاوت میں حصہ لیا تھا اپنی "آپ بیتی" مطبوعہ نقوش جلد اوّل ۱۹۶۴ء صفحہ ۷۶ میں تحریر کرتے ہیں۔

"اخیر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ سرحدِ مغربی پر ملکِ یاغستان میں خود سرکارِ انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔"

"۱۱ستمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ ایک سوار پولیس متعینہ چوکی پانی پت ضلع کرنال مسمیٰ غزن خان نام ایک ولایتی افغان نے کسی ذریعے سے میرے حال سے واقف ہو کر ایک لمبی چوڑی جھوٹی کیفیت خیر خواہانہ کے ساتھ حضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدوں کے ساتھ سرحد پر ہو رہی ہے ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسری روپے اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔"

الغرض محمد جعفر کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ اس مقام پر لکھتے ہیں۔

"بیٹھک میں تلاشی ہونے لگی اور وہی خط جس کا ڈر تھا سب سے پہلے پولیس کے ہاتھ آیا۔"

حکومت نے اس مقدمہ کی تحقیق کیپٹن پارسن کے حوالے کی۔ اس نے دو قیدیوں محمد رفیع اور محمد تقی کو ملا یا۔ اور ان کی مخبری اور شہادت پر پارسن اُن کے ساتھ پٹنہ آیا اور مولوی یحییٰ علی برادر حاجی احمد اللہؒ، مولوی عبدالرحیم الٰہی بخش اور میاں عبدالغفار کو گرفتار کر کے انبالہ بھیجدیا۔ یہ چاروں محلہ صادق پور عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ اس طرح حاجی احمد اللہ مرحوم بار دوم قیدِ فرنگ میں پہونچے اور اُن کے مصائب شدیدکا آغاز ہوا۔ اس مقام پر ان کے بدترین دشمن ولیم ٹیلر سابق کمشنر پٹنہ جس نے ملازمت سے سبکدوش ہو کر دکالت شروع کر دی تھی۔ کہتا ہے۔

"پٹنہ واپسی کے فوراً بعد ایک دلچسپ اور اہم واقعہ رونما ہوا۔ وہابی لیڈر مولوی احمد اللہ جنھیں میں نے ۱۸۵۷ء میں احتیاطی طور پر گرفتار کر لیا تھا اور جنھیں بعد میں لیفٹننٹ گورنر کی منظوری سے مسٹر سیموئل ایک بے گناہ اور بے ضرر انسان قرار دے چکے تھے۔ اور جنھیں وائسرائے کے سامنے پیش کیا گیا ان پر پٹنہ کے جج مسٹر اینسلے کی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔"

اس مقدمہ میں حاجی احمد اللہ مرحوم کے حق میں پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ مقدمہ کے زمانہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دن جب جج مسٹر اینسلے بگھی گاڑی پر سوار ہو کر کچہری سے واپس جا رہے تھے کہ ایک شخص نے اُن پر قاتلانہ حملہ کر دیا، وار بجائے جج گھوڑے پر پڑا اور وہ شخص گرفتار کیا گیا۔

اس لئے بجائے تخفیفِ جرم پھانسی کی سزا کے ساتھ ساتھ ضبطیٔ مکان اور املاک کا بھی حکم صادر ہوا۔ اس لوٹ میں اشخاص شامل تھے کیپٹن پارسن۔ ٹی رون شا، چارلس ہوورڈ۔

لوٹ کے مال میں سے چارلس ہوورڈ نے فخریہ طور سے حاجی احمد اللہ مرحوم کا ایک چشمہ جس کا شیشہ سبز رنگ کا تھا بطور تحفہ ولیم ٹیلر کو دیا۔ ولیم ٹیلر خود اپنی کتاب "ہندوستان میں ۳۸ سال" صفحہ ۶۸۸ میں ناقل و معترف ہے۔

"ہوورڈ نے از راہِ تکلف مجھے ایک چھوٹا سا تحفہ دیا جو احمد اللہ کا سبز رنگ کا چشمہ تھا۔ اُن کی تمام جائداد نیلام کر دی گئی تھی۔"

جس وقت پھانسی کی سزا تجویز کی گئی حاجی احمد اللہ مرحوم ضعیف ہو چکے تھے اس لئے حکومتِ وقت نے پھانسی کی سزا کو دائم الحبس عبورِ دریائے شور میں تبدیل کر دیا۔ یعنی حاجی احمد اللہ مرحوم جزیرہ انڈمان بھیج دیئے گئے۔ اس مقام پر محمد جعفر تھانیسری کہتے ہیں۔

"محمد شفیع اور عبدالکریم وغیرہ سرکاری گواہ ہو گئے اور اُن کی شہادت پر مولوی احمد اللہ صاحب بہ ماہ مئی ۱۸۶۵ء دائم الحبس عبورِ دریائے شور مع ضبطیٔ جائداد کے سزا یاب ہو کر ہم سے پہلے جون کے مہینے میں داخلِ انڈمان ہو گئے۔"

۱۵ جون ۱۸۶۵ء سے تا نہایت سولہ سال تک حاجی احمد اللہ قیدِ فرنگ میں جزیرہ انڈمان میں رہے اور ۲۱ نومبر ۱۸۸۱ء مطابق ۲۸ محرم ۱۲۹۸ھ شب دوشنبہ کو ایک بجے رات کو اُن کی روح فردوسِ بریں کو پرواز کر گئی۔

سلیمان خمار

قدم قدم پہ غموں کا غبار جیسا ہے
تمہارا شہر تو اک رہگذار جیسا ہے
ہر اک مکان پہ وحشت برس رہی ہے یہاں
ہر اک مکان شکستہ مزار جیسا ہے
تمہاری یاد کو دل میں بسا کے دیکھ لیا
تمہاری یاد کا سایا بھی خار جیسا ہے
اک ایک لمحے کی آنکھوں سے خون ٹپکتا ہے
اک ایک لمحہ طبیعت پہ بار جیسا ہے
میں انتظار تو کرتا نہیں مگر پھر بھی
ہر ایک پل کو ترا انتظار جیسا ہے
خمار سلسلۂ درد بھی طوالت میں
دراز سلسلۂ زلفِ یار جیسا ہے

اطہر احمد کمالی

جرمِ وفا پر اہلِ وفا کو اتنا کیوں تڑپاؤ ہو
خلوتِ دل پر دستک دیکر جانے کہاں چھپ جاؤ ہو
منزل تک کیونکر پہونچو گے ہم سفرو سوچو تو ذرا
راہ کے پیچ و خم جانو ہو، پھر بھی ٹھوکر کھاؤ ہو
آؤ ہو تو ساتھ میں لیکر نغمۂ و نور و نکہت و رنگ
جاؤ ہو تو دل کے نگر کو میر کا گھر کر جاؤ ہو
ترکِ وفا کو مدت گذری اب بھی مگر پروائی کے ساتھ
میٹھا میٹھا درد اُٹھے ہے اور تم یاد آجاؤ ہو
دشمنِ مہر و وفا ہو مانا، لیکن پیارے یہ تو کہو
جب بھی ہمارا نام آئے ہے سوچ میں کیوں پڑ جاؤ ہو
نغمے اور فریاد کی لے تو کب کی ہوئی تبدیل مگر
اطہر صاحب تم تو اب بھی میر کی دُھن میں گاؤ ہو



حامدی کاشمیری

دہر، حیرت گہہ سکوتِ راز
تو کہاں ہے کہیں سے دے آواز
آسماں گر کے آ رہا سر پر
جا کے کھولوں کہاں پہ پرواز
چپ کی دیوار میں ہوا نہ شگاف
سر پٹکتی رہی مری آواز
تپتی راہوں میں کوئی سایہ نہیں
ہے مرے ساتھ اک بہارِ ناز
تھا وہ طوفاں سموم و صرصر کا
میں نے کیوں کر لیئے دریچے باز
آتشِ لمس کو ترستا ہے
حشر خوابیدہ، ترے جسم کا ساز
ایک کوندا فضا میں لپکے ہے
میرا انجام کیا ہے، کیا آغاز
تیرے خوں میں شرر فشاں ہی ہو
میرا سوزِ نفس ہے سنگ گداز
میری جانب سیاہ ہاتھ بڑھے
سائے پتوں کے ہو رہے تھے دراز
ہے ہر اک نقش، نقشِ فریادی
فکرِ غالب کا دیکھئے اعجاز

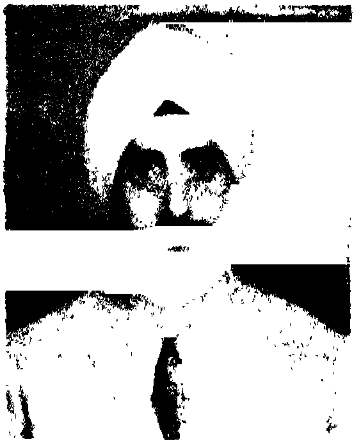
عبدالمتین نیاز

ہم نے جب تک آگہی کی روشنی پائی نہ تھی
زندگی سے اس قدر گہری شناسائی نہ تھی
جسم کے اندر بھی جھانکیں کل نہ تھا اتنا شعور
دور کے نظارے دیکھیں اتنی بینائی نہ تھی
میں کہ بے چہرہ نہ تھا چہرے کے ہوتے دوستو
فلسفوں کی دھند جب تک ذہن پر چھائی نہ تھی
شہر سے تیرے چلا ہوں لیکے یہ سوغات تو
میں جب آیا تھا مرے ہمراہ تنہائی نہ تھی
وقت نے کچھ سوچ کر رنگِ خزاں بکھرا دیا
موسمِ گل کی تمنا لب پہ بھی آئی نہ تھی
میرے زخموں کی طرف پھر تم نے دیکھا کس لیئے
اے مسیحاؤ! اگر تابِ مسیحائی نہ تھی
خواہشوں نے اپنے پیراہن بدل ڈالے نیاز
ورنہ کل تک زندگی میں ایسی رعنائی نہ تھی



پشتو زبان — ایک جائزہ

منوہر سنگھ بترا



پشتو افغانوں کی زبان ہے۔ افغان ایرانیوں کا دیا ہوا نام ہے۔ افغان اپنے آپ کو پشتون یا پختون کہتے ہیں اور اپنی زبان کو پشتو۔ شمال مغرب کی بولی میں اس زبان کو پختو بھی کہا جاتا ہے۔ رگ وید میں اس علاقہ کے لوگوں کے لئے پختہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

افغان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایرانی لفظ ہے اور افغانا سے مشتق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افغانا اسرائیل کے بادشاہ سال کا پوتا تھا اور یہاں کے باشندے اسی کی نسل سے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ افغان "اسواکاسں" سے نکلا ہے جس کا ذکر پرانوں میں کیا گیا ہے۔

ہندوستانی ماہر نجوم ورہ مہتر (چھٹی صدی عیسوی) کی تصانیف میں "اوآگنا" کا لفظ ملتا ہے۔ بعض عالم کہتے ہیں کہ افغان کا ماخذ یہی ہے

پشتو افغان اور صوبہ سرحد شمولہ پاکستان) کے بڑے حصے کی زبان ہے۔ پشتو کا علاقہ یاغستان یا روُح بھی ہے۔ فرشتہ نے روُح کے علاقے کا تعین اس طرح کیا تھا۔ شمال اور جنوب میں سوات باجور سے سوی اور بھکر تک اور شرقاً غرباً حسن ابدال سے کابل تک۔ اس میں قندھار بھی شامل کیا ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ اس پورے علاقے میں صرف پشتو ہی بولی جاتی ہے۔ پشتو کے ساتھ ساتھ بعض دوسری زبانیں بھی رائج ہیں۔ خود پشتو میں تلفظ اور لہجے کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ریورٹی (Reverty) انھیں مشرقی پشتو اور مغربی پشتو قرار دیتا ہے۔ شمال مشرقی علاقے کی پشتو غلزیوں اور آفریدیوں کی زبان ہے اور جنوب مغربی علاقے کی پشتو وزیریوں کی۔

چونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ افغان، افغانا (اسرائیل کے پہلے بادشاہ سال کا پوتا) کی اولاد ہیں اس لئے کچھ دنوں کے لئے لوگوں کو یہ یقین رہا کہ پشتو عبرانی زبان سے نکلی ہے۔ لیکن اب یہ امر طے شدہ ہے کہ اس زبان کا تعلق آریائی خاندان سے ہے۔ کچھ دنوں یہ بات موضوع بحث بنی رہی کہ آریائی خاندان میں اس کا تعلق ہند آریائی زبان سے ہے یا ایرانی زبان سے لیکن بعد میں لسانی ماہروں کی تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اس کا تعلق ایرانی خاندان سے ہے۔ ایرانی زبان کو دو گروہوں، مشرقی اور مغربی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مغربی گروہ کی ممتاز زبان آج کی جدید ایرانی ہے۔ مشرقی گروپ کی سب سے قدیم زبان ژند ہے۔ اسی سے غلچاچ زبانیں نکلی ہیں۔ جو پامیر کے علاقے میں بولی جاتی ہیں۔ بلوچی کا تعلق بھی اس گروپ سے ہے۔ پروفیسر فادرملر نے ۱۸۸۲ء میں پہلی بار یہ دعویٰ کیا کہ پشتو کا

تعلق بھی اسی مشرقی گروپ سے ہے۔ ڈاکٹر ٹرپ نے اپنی کتاب پشتو قواعد (سن تصنیف ۱۸۷۳ء) میں یہ خیال پیش کیا کہ اس زبان کا تعلق ایرانی زبان سے نہیں ہے بلکہ یہ ہند آریائی خاندان سے ہے اور بڑی حد تک سندھی زبان کے قریب ہے۔ بعد کے عالموں پروفیسر ڈان اسپگل اور ڈاکٹر ہورن لے نے اس خیال کی تائید کی۔ لیکن ۱۸۹۰ء میں ڈاکٹر ڈرامس ٹیٹر نے اپنی فاضلانہ تصنیف میں بالکل واضح طور پر ثابت کر دیا کہ پشتو کا تعلق ایرانی زبان کے مشرقی گروپ سے ہے اور یہ ژند یا اس سے بڑی حد تک مشابہ کسی بولی سے نکلی ہے۔ اس زبان نے شمالی اور مغربی ہندوستان کی بولیوں سے بہ کثرت الفاظ لئے ہیں مگر بنیادی طور پر یہ ایرانی خاندان کی زبان ہے۔

اس زبان میں ادب کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زبان کی پہلی تصنیف وہ ہے جس میں یوسف زئیوں کے سوات فتح کرنے کا حال قلم بند کیا گیا تھا۔ مگر اس کتاب کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ ابتدائی زمانہ تصنیف کی جو چند کتابیں ملتی ہیں ان میں خیر البیان بھی ہے جو چار زبانوں عربی، فارسی، ہندی، اور پشتو میں لکھی گئی ہے۔ ابتدائی تصانیف میں پیر روشن بایزید انصاری (سن وفات ۱۵۸۵ء) کی تصانیف بھی شامل ہیں۔ پیر روشن کی تعلیمات کے جواب میں آخون درویزہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب مخزن الاسلام لکھی ہے۔ انہوں نے پچاس سے زائد کتابیں لکھی ہیں جن میں مخزن افغانی کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں زمانہ قدیم سے افغانوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

اولین شاعروں میں مرزا انصاری کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کا کلام صوفیانہ اور عارفانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پشتو کی سب سے پہلی نظم امیر کروڑ نے لکھی تھی جس کا عنوان "ویاڑنہ" ہے اس نظم میں امیر نے اپنی جسمانی طاقت اور شجاعت کا ذکر کیا ہے۔

افغانوں نے شروع ہی سے اپنی زبان کی آبیاری کی طرف خصوصی توجہ کی۔ حالانکہ اس وقت فارسی ایران و افغانستان کے علاوہ برصغیر ہند کی علمی و ادبی و سرکاری زبان تھی۔ مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے عربی کا بھی دور دورہ تھا۔ مگر افغانوں نے پشتو کو ہی اپنایا جو غالباً ان کی قومی حمیت کا تقاضہ بھی تھا۔ جن لوگوں نے ابتدا میں پشتو کو اپنایا وہ ایسے نہ تھے جو فارسی یا عربی سے ناواقف ہوں یا اس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکتے ہوں۔

پشتو کی ابتدائی تصانیف خصوصاً شعری کارناموں میں عشق و محبت کے جذبات کے ساتھ ساتھ جرأت و بے باکی اور بہادری کے ولولہ انگیز واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ پختون شروع سے آزادی پسند تھے اور مغلوں کی برائے نام اطاعت بھی ان کے لئے گراں بار تھی۔ سترھویں صدی میں فتح خاں (یوسف زئی) اور خوشحال خاں (خٹک) کے قومی نغمے پختونوں کے جذبۂ حریت کو ابھار رہے تھے۔

خوش حال خٹک کو ایک عظیم قومی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ خوش حال خاں ۱۶۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد کا نام شہباز خاں تھا۔ والد کی موت کے بعد شاہ جہاں نے انھیں خٹک قبیلے کا سردار تسلیم کر لیا۔ لیکن اورنگ زیب کے عہد میں خوش حال خاں نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ انھیں کچھ دنوں تک مغلوں کی قید میں رہنا پڑا مگر وہ جلد ہی رہا ہو گئے اور اپنی پرجوش قومی نظموں سے اپنے اہل وطن کے دلوں کو گرماتے رہے۔ آپ نے ۸۷ سال کی عمر پائی۔

ملا عبدالرحمان کی تصانیف مذہبی اور صوفیانہ جذبات کی حامل ہیں۔ اور رحمان بابا کو پشتو ادب میں نہایت ممتاز مقام حاصل ہے۔ عبدالحامد نے شاہ تیمور شاہ درانی کے زمانہ حکومت میں کیف آور اشعار کہے ہیں۔ بعض لوگ انہیں افغانستان کا شیخ سعدی کہتے ہیں۔

ابو محمد ہاشم بن زید السروانی البستی "دسالو وژمی" کتاب کے مولف ہیں۔ وہ اور اسعد سوری دونوں سوری بادشاہوں کے درباری شاعر تھے۔

غوریوں کے دربار سے خکار ندوی، تایمنی، ملکیار اور دیگر شاعر متوسل تھے۔ بی بی نانو، سیدال خاں ناصر، مولا پیر محمد، اور میاں جی مشہور شاعر گذرے ہیں۔ ان کے علاوہ بابو جان بابی۔ ملا نور محمد غلجی، ملا یار محمد ہوتک، ملا محمد یونس، محمد ہوتک جس نے "پٹہ خزانہ" کتاب تالیف

کی، ملا زعفران ترکی اور بہا دعناں وغیرہ نے بھی شہرت پائی ہے۔

امیر دوست محمد خاں کے زمانے سے امیر امان اللہ خاں کے دور تک پشتو نے وسعت اور بلندیوں کی طرف قدم بڑھایا۔

اعلیٰ حضرت نادر شاہ اور اُن کے جانشین اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ شاہ افغانستان کے دورِ حکومت میں پشتو کو خاص اہمیت دی جانے لگی اس عرصے میں تین سو سے زیادہ پشتو کتابیں شائع ہوئیں۔ افغانستان کے سب اسکولوں کالجوں میں پشتو پڑھائی جاتی ہے۔ پشتو افغانستان کی قومی زبان بنادی گئی ہے۔ سرکاری کام کاج پشتو اور دری دونوں ہی زبانوں میں ہوتا ہے لیکن ہر سرکاری ملازم کے لیے پشتو سیکھنا لازمی ہے اور اس کے لیے مخاص کورسوں کا بندوبست کیا گیا ہے۔

افغانستان میں کچھ اخبار یں اور رسالے صرف پشتو میں شائع ہوتے ہیں اور باقی کے اخباروں اور رسالوں وغیرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص حد تک پشتو خبریں اور مضامین شامل کریں۔

افغانستان کے نئے آئین کی رُو سے حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ پشتو کی ترقی کے لئے قدم اٹھائے۔

موجودہ شاعروں میں جناب گل پاچا، اُلفت، عبدالرؤف بینوا صدیق اللہ رشتین، شمس الدین مجروح، قیام الدین خادم، عبدالرحمٰن پژواک، محمد ارسلان سلیمی، سعد الدین شپون، عبداللہ بختانی، سلیمان لائق محمد دین ژواک، اور محمد گلاب ننگرہاری بہت مشہور ہیں۔ اُن کے علاوہ جناب عبدالحی حبیبی نے جو کہ افغانستان کے نامور مصنف اور مورخ ہیں پشتو ادب کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

مختصر یہ کہ دیگر زبانوں کی طرح پشتو زبان و ادب نے بھی ترقی کے منازل و مدارج طے کئے ہیں، اور آج پشتو زبان دُنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مقابلے میں کم مایہ نہیں ہے، اور اس کی ترقی کے امکانات بے حد روشن ہیں۔

بقیہ سایہ

دکھائی دیتا۔

نرمل خود ہی کھڑکیاں کھولنے لگا۔

پہلی کھڑکی اس سڑک پر کھلتی تھی جو ہوٹل کے بالکل سامنے سے گزرتی تھی۔ اس وقت سڑک پر سکول کے بچے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ دوسری کھڑکی بغل کے ایک اور ہوٹل کی سمت کھلتی تھی۔ وہاں اس وقت ایک لڑکی کھڑکی سے نیلگوں آسمان کو گھور رہی تھی۔ اب صرف ایک کھڑکی باقی تھی یہ ہوٹل کے پچھواڑے میں کھلتی تھی۔ نرمل کو یقین تھا کہ پہاڑی جھرنا اور اس کے گرد و نواح کا منظر نہایت حسین ہوگا اور اس کے دل و دماغ کو تر و تازہ کر دے گا۔

نرمل نے کھڑکی کھول دی۔

کلپنا سنگار میں مصروف تھی۔ اچانک اس کو ایک عجیب و غریب لیکن جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔

"گٹر۔۔ گ۔۔۔ٹ۔۔ ر۔۔۔۔۔"

اور اس کے بعد کسی کے فرش پر گرنے کی آواز آئی۔ نرمل بیہوش ہو کر گر پڑا تھا کلپنا دوڑ کر کھڑکی کے پاس پہنچی۔ ہوٹل کے عقب میں تھوڑے فاصلے پر غلیظ پانی کا ایک نالا بہہ رہا تھا اور اس کا بھیانک شور ماحول میں پھیلا ہوا تھا۔

کلپنا کے ہونٹوں پر ایک حسین پُر اسرار اور شرارت آمیز مسکراہٹ اُبھری اور پھر اس کے پورے چہرے پر پھیل گئی۔ شوہر کو اٹھا کر اس نے پلنگ پر لٹا دیا اور اس پر لحاف ڈال دیا اور خود اپنے سنگار میں مصروف ہوگئی۔

بقیہ: مورتیں

تبھی ایک کتا وہاں سے گذرا۔ اس نے ٹانگ اُٹھا کر بُت پر پیشاب کر دیا اب شیاملا آئے گی۔ کنوئیں پر نہائے گی اور گیلے کپڑوں میں لپٹی مندر کی طرف جانے لگے گی۔ میں دہاڑیں مار مار کر رونے لگوں گا اور وہ بُت بنی مجھے دیکھتی رہ جائے گی۔

دیکھو، شیاملا دھیرے دھیرے چلی آرہی ہے۔ سامنے وہ ہے، پیچھے پری کا بت ہے اور درمیان میں میں بت بنا کھڑا ہوں۔

(مترجم: محمد شریف الدین)

نئی کتابیں

فارسی ادب بعہد اورنگ زیب

از ڈاکٹر نورالحسن انصاری، استاد زبان وادبیات فارسی دہلی یونی ورسٹی۔

ناشر:- انڈو پرشین سوسائٹی دہلی، صفحات ۶۲۰

قیمت:- سولہ روپے

ہندوستان کے فارسی ادب کو ایرانیوں نے ہمیشہ درجہ دوم کی چیز سمجھا ہے حالانکہ اگر مقامی اور لسانی عصبیت سے بلند ہوکر فارسی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فارسی کا بہترین ادب موجودہ ایران کی محدود سرزمین کے باہر وجود میں آیا۔ رودکی نے سمرقند و بخارا میں اپنے نغمے چھیڑے۔ شاہنامہ کی تکمیل غزنی (افغانستان) میں ہوئی۔ مولانا رومؔ نے قونیہ (ترکی) میں مثنوی معنوی لکھی اور خسرو، بیدل، غالب اور اقبال نے ہندوستان کی سرزمین پر فارسی کی آبیاری کی۔

ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ محمود غزنوی کے بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کی ابتدا ہی میں لاہور فارسی ادب کا مرکز بن گیا تھا اور اس طرح آج سے نو سو سال پہلے ہندوستان کی سرزمین میں فارسی ادب کی جڑیں پختہ ہوچکی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ کشمیر سے راس کماری اور اٹک سے کٹک تک سارا ہندوستان فارسی نغموں سے گونجنے لگا۔ مغل دور میں یہاں کے حکمرانوں نے اس فیاضی سے فارسی شعراء کی سرپرستی فرمائی کہ پورے ایران میں ایک عرصہ تک اوّل درجہ کا شاعر نہ رہا۔

لیکن جب اورنگ زیب تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہوا تو ملکی اور سیاسی حالات بدل چکے تھے۔ اورنگ زیب نے ملک الشعراء کا عہدہ ختم کردیا اور شعراء کو بے پناہ داد و دہش کا سلسلہ بھی منقطع کردیا مگر ہجرت کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ اس عہد تک ہند میں فارسی کی اتنی عظیم روایتیں قائم ہوچکی تھیں کہ فارسی کا ایک عظیم ترین شاعر مرزا عبدالقادر بیدل اسی عہد کی تخلیق ہے۔ الغرض ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ اتنی جاندار اور پائیدار ہے کہ اس کا مطالعہ نہ صرف زبان و ادب کی حیثیت سے ضروری ہے بلکہ ہندوستان کی نو سو سالہ تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے بھی اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ہندوستان کے فارسی ادب کی مکمل تاریخ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔ علامہ شبلی نے شاہجہاں کے دور تک کے شعراء پر بحث کی ہے۔ شمس العلماء عبدالغنی نے غزنوی دور سے اکبر تک کے فارسی ادب پر انگریزی میں دو کتابیں لکھیں۔ اب ڈاکٹر نورالحسن انصاری استاد فارسی، دہلی یونی ورسٹی نے پہلی بار عہد اورنگ زیب کے فارسی ادب کی مکمل تاریخ مرتب کی ہے۔ انہوں نے اس تحقیقی مقالہ پر دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انصاری صاحب نے بڑی تحقیق اور تفصیل سے اس دور کے تمام شاعر، انشا پرداز، داستان نویس، مترجم، مورخ اور دیگر علوم و فنون کے ماہروں کا جائزہ لیا ہے اور سینکڑوں مخطوطات کی چھان بین کرکے اس عہد کے شعری اور نثری ادب کو انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے اورنگ زیب اور اس کے عہد کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ عام مورخین کی بتائی ہوئی تصویر سے مختلف

بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ مثلاً اورنگ زیب نے ملک الشعراء کا عہدہ ختم کر دیا۔ مگر اس کے عہد کے تمام مشہور ادیب اور شاعر سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ شہزادی زیب النساء اور شہزادہ اعظم کی طرف سے بہت سے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے دربار میں موسیقی بند کر دی تھی مگر موسیقی کی نایاب کتاب راگ درپن اسی کے ایک امیر کی تالیف ہے۔ اس عہد کے تمام ہندو مصنفین نے اورنگزیب کی انصاف پسندی اور مذہبی رواداری کو خاص طور پر سراہا ہے۔ بہرحال اس کتاب کے مطالعے سے عہد اورنگزیب کی صحیح اور سچی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اور اس اعتبار سے یہ کتاب تاریخ اور ادب دونوں کے طالب علم کے لئے بہت اہم ہے۔

(محمد یوسف)

بنتِ لمحات

اختر الایمان

ناشر: رخشندہ کتاب گھر۔ بمبئی ۵۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

قیمت: پانچ روپے

بنتِ لمحات، ــ اختر الایمان کی نظموں کا نیا مجموعہ ہے۔ ابتداء میں مصنف کے پیش لفظ سے زاویۂ نگاہ اور نقطۂ نظر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ "یادیں" کے دیباچے کے ساتھ اس پیش لفظ کا مطالعہ کیا جائے تو اس ذہن کے پس منظر اور محرکات کی تصویر مکمل بن جائے، جو ان نظموں کے پیچھے موجود ہے۔

اختر الایمان نے لکھا ہے ـــــ "یہ کھردری، اشتہارات سے پُر، شعار آمیز شاعری، اسی خلوص اور جذبۂ محبت کے تحت وجود میں آئی ہے جو مجھے انسان سے ہے۔"

'بنتِ لمحات' میں چالیس منتخب نظمیں ہیں جو ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک لکھی گئی ہیں۔ "بے تعلقی"۔ "بنتِ لمحات"۔ "اذیت پرست"۔ "ساتویں دن کے بعد"، "سبزہ بیگانہ"، "درد کی حد سے پرے" اور "شیشہ کا آدمی" جیسی خوبصورت نظمیں مجموعے میں شامل ہیں، ان نظموں سے یہ مجموعہ نئی تخلیقی فکر کا ایک سنگِ میل بن جاتا ہے۔

ماضی پسندی ـــــ (یادوں کی روشن اور نیم تاریک دنیا)\
گزرتے ہوئے لمحے ـــ انسان کا خارجی اور داخلی سفر\
'ق' سے شروع ہو کر 'ق' پر ختم ـــ اور اس ایک\
دائرے سے بہت سے دائروں کا وجود ـــ\
وقت کا تصور ـــــ وقت شاعر کی ذات کا حصہ\
تنہائی احساس ـــ گھٹن، الجھنیں، اضطراب، کرب\
ٹریجیڈی ۔ المیہ تجربے\
اور طنز ـــــ 'بنتِ لمحات' کے آئینے پر "وژن" کے

یہ حیاتی شعری تجربے غور و فکر چاہتے ہیں، یہ تجربے شدت سے متاثر بھی کرتے ہیں اور قاری کے حسی تجربوں کے نقش بھی ابھارتے ہیں، اُن کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔

اختر الایمان کی فکر، جذبہ اور حقیقت کی کشمکش میں شدت پیدا کرتی ہے، لمحوں کی روشنی، تاریکی، خوشبو اور لمحوں کے آہنگ کو ابھارتی ہے۔ جذباتی امیجز کی تخلیق کرتی ہے، تنہائی کے احساس کو شدید تر بناتی ہے۔ اصل حقیقت کے تاثرات کو داخلی بیانات سے جذب کر کے تخلیق کے عمل میں شدت پیدا کرتی ہے۔ یادوں کے آئینوں پر ہونٹ رکھتے ہوئے، تلخ اور شیریں یادوں میں سانس لیتے ہوئے، عصری ہیجانات میں گزرتے ہوئے لمحوں سے گہری دلچسپی لیتے ہوئے اور تنہائی کے زہر کو پیتے ہوئے، اختر الایمان جدید اردو شاعری کے ایک مستقل عنوان بن گئے ہیں۔

حسن پسندی اور جمالیاتی شعور، حیاتی اور نفسیاتی کیفیتیں نرگسیت اور اعلیٰ تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو آگے بڑھتے دیکھنے کی تمنا اور شکست و ریخت کے عہد کا شعور مضطرب شخصیت میں المیہ قدروں کا شدید احساس، عقیدت اور محبت کے جذبوں کے ساتھ خوف، وحشت، سراسیمگی اور حیرت کے ملے جلے جذبات ــ ٹریجیڈی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے گہرا طنزیہ آہنگ ــ بنتِ لمحات

کی نظموں میں یہ حقائق متاثر کرتے ہیں۔

اخترالایمان نے وقت کے خارجی تجربوں کو فنکارانہ طور پر جس طرح داخلی اور حسیاتی تجربہ بنا دیا ہے یہی ایک حقیقت انہیں اس عہد کی شاعری کی تاریخ میں زندہ رکھنے کو کافی ہے۔

یادوں کی علامتوں اور آرچ ٹائپس (ARCHETYPES) کے تحت الشعوری اور لاشعوری دباؤ سے اخترالایمان کی شاعری 'نئی وژن' کے ایک اہم ترین رجحان کو پیش کرتی ہے۔ اخترالایمان کی اکثر مختصر نظموں کا داخلی کینوس بھی ہے جو یک بیک پڑھتا محسوس ہوتا ہے اور ایک ساتھ روشنی اور تاریکی کا احساس مختلف انداز سے دلاتا ہے۔

اخترالایمان کی طنزیہ نظموں میں سچائیوں اور شاعر کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کا اثر ایک ساتھ ہوتا ہے۔ ایسی نظموں سے ایک نئے رجحان یا تحریک کے پیدا ہونے کی خبر مل رہی ہے۔ جذباتی ارتعاش (EMOTIONAL VIBRATION) میں فطری توازن ہے۔ تلخیوں کے شدید احساس کا یہ منفرد رجحان بھی توجہ چاہتا ہے: 'قبر' کے آخری ایک مصرعے میں کہانی مکمل ہوجاتی ہے، نقطۂ عروج کے فوراً بعد اختتام کی منزل ہے۔ 'قبر'، اور 'سبزۂ بیگانہ'، اور چند اور نظموں میں (THE VICTIM BLEEDS) کے مناظر ذہن پر نقش ہوجاتے ہیں۔

کتابت اور طباعت عمدہ ہے گیٹ اپ خوبصورت ہے۔ بلاشبہ 'بنتِ لمحات'، نئے ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔

(شکیل الرحمٰن)

غزال (شعری مجموعہ) شاعر۔ کرشن موہن
ناشر: انڈین اکیڈمی۔ ۲۹ نریندر پلیس۔ نئی دہلی
قیمت: سات روپے

کرشن موہن کا پہلا مجموعہ "شبنم شبنم" ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کی خوبصورت کتابت، طباعت اور دیدہ زیب گٹ اپ نے اُردو ادب میں کتابوں کی پیش کش کی ایک نئی اور حسین روایت کا آغاز کیا تھا۔ دو سال کے مختصر عرصے میں کرشن موہن نے اپنا دوسرا مجموعۂ کلام "دلِ ناداں" پیش کیا۔ یہ معانی اور پیکرِ معانی کی رنگارنگی کا دُوسرا نقش تھا۔ اس کے بعد شاعر کے چار اور مجموعے شائع ہوئے۔ تماشائی، نگاہِ ناز، رُوپ رس (ہندی رسم خط میں) اور آہنگِ وطن ان تمام حسن آفرینیوں پر مستزاد ساتواں مجموعہ "غزال" کے نام سے ۱۹۶۸ء کے اوائل میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔

کرشن موہن کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک آواز کی یکسانیت نہیں بلکہ اُن کی شاعری آوازوں کا آرکسٹرا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے، جسے محمود ہاشمی نے "غزال" کے دیباچے میں "اسالیب کی شاعری" کہا ہے۔ ہر شاعر یا ادیب کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی کمزور، بے رنگ اور بے جان ہو یا کتنا ہی توانا، رنگین اور جاندار ہو۔ کرشن موہن کی شاعری کو ایک اسلوب کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اُن کے یہاں رنگوں و آوازوں کا وہ ہجوم وہ ریل پیل اور وہ کثرت ہے کہ وحدت بیں نگاہیں اور لہجے کی یک رنگی تلاش کرنے والا سامعہ مبہوت رہ جاتا ہے۔ اگر کرشن موہن کے یہاں یہ رنگا رنگی نہ ہوتی تو وہ یکساں طور پر منور لکھنوی ایسے روایتِ غزل کے پاسدار اور محمود ہاشمی ایسے جدیدیت کے طرفدار سے دادِ سخن پانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ ممکن ہے کچھ ناقدینِ شعر اس تنوع کو اسلوب کی عدم موجودگی کا نتیجہ اور شاعر کے اپنے لہجے کی تلاش کا المیہ کہیں، لیکن میرے خیال میں یہی کرشن موہن کی کامیابی کا راز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن موہن انیس کے اس شعر کو اپنی شعرگوئی کا اصولِ متعارفہ مان کر چلے ہیں۔

رکاؤ خوب نہیں، طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

اس لیے وہ یہ کہہ کر اپنا ساتواں مجموعہ پیش کر رہے ہیں کہ

اشعارِ کیف خیز و دل افزا کی منتظر
تحسین و آفریں ہے غزل ابتدا کرو

اور اس مجموعے کو پڑھ کر کہیں کہیں مان لینا پڑتا ہے، کہ ؎

محدود اب نہیں ہے غزل ابتدا کرو

کرشن موہن کی شاعری ترسیل کی ناکامی کا المیہ نہیں، بلکہ ترسیل کی کامیابی کا طربیہ ہے۔ کرشن موہن کے یہاں غزل کی روایتی زبان اور عجمیت کی لے بھی اتنی ہی نمایاں ہے جتنی کلاسیکی غزل یا کلاسکیت زدہ غزل میں مل سکتی ہے۔ کرشن موہن کے رنگا رنگ کلام سے مختلف آوازوں، لہجوں، اسالیب اور رنگوں کے شعر پیش کرنا اس تبصرے میں ممکن نہیں لیکن ان تمام رنگوں کے مطالعے اور اُن کے تجزیے سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اس کا ذکر ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کرشن موہن ٹھیٹ اُردو اور بھاشا کی آمیزش کے امکانات ہی کو زیادہ کھنگالیں تو انہیں کے الفاظ میں "مچھلیاں ڈھونڈھتے، موتی بھی میسّر ہوں گے"۔ اُن کے جال میں سات دریاؤں کا مال جمع ہے۔ اگر وہ اس ایک اسلوب پر ہی زیادہ توجہ کریں تو شاید وہ زیادہ سے زیادہ موتی فراہم کرکے اُردو شاعری کو دے سکیں۔

(وحید اختر)

Muslim Political Thought And Activity in India - During The First Half of the Nineteenth Century By Taufiq Ahmed Nizami.

سیاست کو سائنس کہا جاتا ہے مگر یہ کوئی ایسی سائنس نہیں ہے جس کے اصول و قواعد منضبط اور طے شدہ ہوں۔ اس کا تعلق انسان کے ذہن و شعور سے ہے جن میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور ہر طبقے اور ہر فرقے کا رویہ الگ الگ ہوتا ہے اس لیے کسی فرقے یا طبقے یا قوم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے سیاسی اطوار کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ صرف چند مفروضات یا پیش پا افتادہ اصول پر اُن کا جائزہ لینا درست نہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی افکار و خیالات اور سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اُن امور کا غیر جانبدارانہ اور صحیح مطالعہ نہیں کے برابر ہے۔ آزادی سے قبل مسلمانوں کے مسائل سے متعلق کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن اُن میں سے بیشتر کے مصنف انگریز تھے اور اُن کا اپنا سوچنے کا ڈھنگ تھا کیونکہ انہیں تقاضائے جہانبانی کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا تھا۔ کچھ اچھی کتابیں اُردو میں بھی لکھی گئی ہیں لیکن زبان کی وجہ سے اُن کا حلقہ محدود رہا۔

ملک میں مسلمانوں کے سیاسی کردار کے بارے میں اکثریت کے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اُن کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی کردار کے روشن پہلو بہت کم منظر عام پر آسکتے ہیں مسلمانوں نے کس طرح روزِ اوّل ہی سے انگریزی حکومت سے لوہا لیا اور ملک کی آزادی کے لیے کیا کیا قربانیاں کی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان امور کو خصوصاً انگریزی زبان میں، زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیش کیا جائے اس لحاظ سے جناب توفیق احمد نظامی کی زیرِ نظر کتاب ہندی مسلمانوں کے سیاسی افکار و اطوار کے علم میں ایک اہم اضافہ ہے

مصنف نے اپنا جائزہ صرف انیسویں صدی کے پہلے پچاس برسوں تک محدود رکھا ہے جو مسلم سیاست کے نقطۂ نظر سے ایک اہم دور تھا۔ اُن کا جائزہ شاہ ولی اللہ کی تصنیف حجۃ البلاغہ سے شروع ہوتا ہے۔ پھر اُن کے فرزند شاہ عبدالعزیز کے کارنامے اور ان کی مختلف تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد ہندی مسلمانوں کے سیاسی کردار پر ایک خصوصی رنگ چڑھنے لگا جس میں بغاوت، سرکشی، مذہبیت الگ الگ زمانے میں نمایاں ہوئیں۔ وہابی تحریک، سید احمد شہید کا جہاد، شاہ محمد اسمٰعیل شہید کے کارنامے وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ کتاب محض ایک تاریخی دستاویز نہیں ہے بلکہ جہاد اور ہجرت اور انگریزی حکومت کے معاشی حالات پر بھی مختلف پیرائے میں بحث کی گئی ہے۔ اندازِ تحریر شگفتہ ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک کارآمد کتاب ہے جس کا مطالعہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو کرنا چاہیے۔

کتاب کی قیمت دس روپے ہے، اور تھری مینز پبلیکیشنز علی گڑھ سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

(سید آفتاب احمد)


30 لاکھ
عورتیں
غلط
نہیں ہو سکتیں
پچھلے چار برسوں میں 30 لاکھ عورتوں نے اپنی مرضی سے لوپ لگوائے۔
انہیں معلوم ہے کہ لوپ مؤثر ہے - یہ حمل روکنے کا سب سے زیادہ
قابلِ اعتبار طریقہ ہے۔
یہ سادہ ہے۔ لیڈی ڈاکٹر اسے چند ہی منٹوں میں لگا دیتی ہے۔
یہ نکلوایا جا سکتا ہے - جب آپ چاہیں کہ آپ کے دوسرا بچہ ہو تو آپ
لوپ نکلوا سکتی ہیں۔
یہ کارآمد ہے - اگر لوپ آپ کو راس ہے، تو آپ کو کسی اور طریقے کی ضرورت
نہیں۔ لوپ آپ کی جنسی مسرت میں دخل انداز نہیں ہوتا۔
یہ بے ضرر ہے - اس سے کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ تکلیف ہو بھی جائے،
تو اسے آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے۔
محتاط مطالعا و مشاہدے کے بعد ڈاکٹروں نے رائے دی ہے کہ لوپ
عورتوں کے لئے موافق ہے۔ جن عورتوں کو لوپ راس نہیں وہ دوسرے
طریقوں سے اپنے بچوں کی پیدائش
میں وقفہ رکھ سکتی ہیں۔ وہ بچوں کی
تعداد بھی اپنے اختیار میں رکھ سکتی ہیں۔
مزید جانکاری اپنے قریب ترین فیملی پلاننگ
سینٹر سے حاصل کریں۔
فیملی پلاننگ سے متعلق مشورہ اور
خدمت مفت ہے۔
لیڈی ڈاکٹر کا
اعتبار کریں
افواہ کا اعتبار
نہ کریں



انک کی پانچ سویں سالگرہ کی تقریبات کے موقع پر امرتسر میں گرونانک یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ صدر جمہوریہ ہند نے
ومبر ۱۹۶۹ء کو اس یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔
ریں (دائیں سے بائیں) سری اجل سنگھ گورنر تامل ناڈو، سری جی ایس ڈھلوں اسپیکر لوک سبھا، سری ڈی سی پاوٹے گورنر پنجاب، سری گرو
ن فتح سنگھ، سری گورنام سنگھ وزیر اعلیٰ پنجاب۔
انک کی پانچ سویں سالگرہ کے موقع پر ۲۲ نومبر کو دہلی میں ایک بڑا ہی رنگا رنگ اور شاندار جلوس نکالا گیا جس میں لاکھوں افراد نے شرکت کی۔







Vol. 28 No. 6 AJKAL (Monthly) January 1970

Edited and P[illegible]

آجکل

۶۰ پیسے

فروری ۱۹۷۰ء





۱۹۶۸ء کا بھارتیہ گیان پیٹھ انعام ہندی کے عظیم شاعر سمترا نندن پنت کو دیا گیا۔ اُنہیں یہ انعام اُن کی نظموں کے مجموعے "چدمبرا" کے لئے دیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں پنت جی کی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۷ء کے درمیان لکھی گئی نظموں کا انتخاب شامل ہے۔
ملک کا یہ سب سے بڑا ادبی انعام ۱۹ دسمبر کو ایک شاندار تقریب میں وگیان بھون (نئی دہلی) میں صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے دیا۔ درمیان میں سری بی گوپالا ریڈی گورنر یوپی کھڑے ہیں۔

"چدمبرا" کو ۱۹۲۵ء سے ۱۹۶۱ء کے درمیان ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کی تخلیقات میں اعلیٰ ترین تخلیقی اور ادبی شاہکار قرار دیا گیا اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں واگ دیوی کا کانسی کا ایک مجسمہ اور ایک لاکھ روپے کا چیک پیش کیا گیا۔

۶۹ سالہ سمترا نندن پنت ۴۰ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ۲۳ شعری مجموعے ہیں۔

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۲۸ —— شمارہ ۷

فروری ۱۹۷۰ء

ماگھ پھاگن شک سمہ ۱۸۹۱

سرورق، گورچرن اروڑہ

ترتیب

★

سالانہ چندہ ہندوستان میں: سات روپے؛ پاکستان میں: سات روپے (پاک)
دیگر ممالک میں: ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ ہندوستان میں: ۶۰ پیسے؛ پاکستان میں: ۶۰ پیسے (پاک)
دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

نئی دہلی میں سماجی ترقی کی کونسل کی طرف سے منعقدہ ایک سمینار میں تقریر کرتے ہوئے صدرِ جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے فرمایا ہے کہ ہندوستان کے دستور میں ہر شہری کو کام کرنے کا حق اور زندہ رہنے کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن ہم آبادی سے متعلق ایک مناسب اور موزوں پالیسی پر عمل کئے بغیر ہر شخص کی بنیادی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ آپ نے کہا کہ اس مسئلے کو دو طرح سے حل کیا جانا چاہئے۔ مانع حمل طریقوں سے متعلق جو شکوک و اندیشے خصوصی طور سے دیہی آبادی میں پائے جاتے ہیں، انہیں دُور کیا جائے اور نئے شادی شدہ جوڑوں کو خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت اور افادیت سے باخبر کیا جائے اور شادی کی عمر بڑھا دی جائے۔

عالمی ادارۂ خوراک کے سابق ڈائرکٹر جنرل سری بی آر سین نے کہا کہ ادارۂ مذکور کے ایک جائزے کے مطابق ۱۹۸۵ء تک دُنیا کی آبادی میں ایک بلین (۱۰۰ کروڑ) کا اضافہ ہو جائے گا جس میں سے ہندوستان کی آبادی میں ۳۰۰ ملین (۳۰ کروڑ) کا اضافہ ہو جائے گا۔

ملک کی موجودہ صورتِ حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ملک کا ہر فرد خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت کو سمجھے اور ملک کے مسائل کو حل کرنے میں ہاتھ بٹائے۔

کسی ملک کی تعمیر و ترقی میں اس ملک کے باشندوں کی اختراعی صلاحیتیں بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ آزادی کے بعد ملک کی دانش گاہوں، علمی اداروں اور کارخانوں میں تلاش و تحقیق کا عمل جاری ہے اور ان کے نتیجے میں بہت سی ایسی مشینیں یا طریقہ کار دریافت کئے گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے وقت اور پیسے کی بچت خصوصاً غیر ملکی زرمبادلہ کی بچت ہو سکتی ہے۔ حکومت نے ایک ایسا ادارہ قائم کر رکھا ہے جو اس طرح کی تمام اختراعات کی چھان بین کرتا ہے اور جن افراد اور اداروں نے قابلِ تعریف کام کیا ہے انہیں نقد انعامات، اعزاز اور سرٹیفکٹ بھی دیتا ہے۔

۱۷ دسمبر کو ایسی ہی ایک تقریب میں صدرِ جمہوریہ ہند نے ۳۶ اشخاص اور متعدد اداروں کو مختلف قسم کی اختراعات کے لئے انعامات اور اعزازات دیئے۔

---

۲۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو جناب ندرت کانپوری کا کانپور میں انتقال ہو گیا۔ وہ



ایک قادر الکلام، کامل فن اور خوش فکر شاعر تھے۔ انہیں حسرت موہانی کے معاصر جناب سخا شاہجہاں پوری سے شرفِ تلمذ حاصل تھا لیکن وہ اپنے میلانِ طبع کے باعث حسرت اور مومن کے رنگ میں لکھتے رہے۔ اُن کا دیوان "موجِ رنگ" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ ادارہ ان کی موت پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتا ہے۔

علمی اور ادبی حلقوں میں یہ بات نہایت افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ۵ اور ۶ دسمبر کی درمیانی شب کو دہلی میں جناب واقف مرادآبادی کا انتقال ہو گیا۔



سید یعقوب الحسن واقف ۲۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو سنبھل ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ مرحوم اپنے مزاحیہ کلام خصوصاً اپنے مزاحیہ قطعات کی وجہ سے مشاعروں میں بے حد مقبول تھے۔ اپنے اس مخصوص رنگ سے قطع نظر انہیں مرثیہ گوئی، قصیدہ گوئی اور نعت و منقبت سے خاص شغف تھا اور اُنہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کی موت یقیناً ایک سانحہ ہے اور ادارہ اس غم میں اُن کے پسماندگان کا شریک ہے۔

●●



غالب کی انا

عرش ملسیانی

انا انسان کی انتہائے خودی سے پرورش پاتا ہے نفسیاتی طور پر یہ کہنا غلط نہیں کہ ہر شخص میں تھوڑا بہت انا ضرور ہوتا ہے، لیکن کہیں بیدار اور کہیں خفتہ۔ افتخار نسب، غیر معمولی ذہانت یا پیغمبرانہ کمال اس کے موجب ہوتے ہیں پہلے یہ تعلّی یا تفاخر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ان حدوں سے گزرتا ہے تو گردوپیش کے عالم کو ہیچ قرار دیتا ہے کسی کی دل شکنی ہو تو اس کی پروا نہیں کرتا بلکہ شیخ علی حزیں کے قول کے مطابق دل شکنی کو ایک فریضہ قرار دیتا ہے ع

گر دل ایں مخزن کین است کہ مردم دارند
ہر کہ یک دل شکند کعبہ آباد کند

انا کو حسب حال خوراک مل جائے تو اس کا زور کم ہو جاتا ہے البتہ اگر مایوسی اور نامرادی شامل حال رہے تو اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے اردو شعراء میں غالبؔ اور یگانہ ایسے شاعر ہوئے ہیں جو نامرادی کا شکار ہوئے اور ان کے انا نے شدت کی صورت اختیار کی۔

یگانہ کا مطمح نظر یہ تھا ؎

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاس کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

لیکن اپنی تمام تعلّیوں، تفاخر اور انا پسندی کے باوجود انہوں نے شکست کا اعتراف کیا۔ ع

خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

لکھنؤ والوں نے جب اُن کے منصب کو نہ پہچانا تو وہ کہہ گئے ؎

مزارِ یاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے ؛ دُعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

اردو اور فارسی شعراء میں تعلّی اور تفاخر کا رواج عام رہا ہے۔ کچھ لطفِ سخن کی خاطر، کچھ سخن گسترانہ طور پر اور کچھ معاصرانہ چشمک کی وجہ سے یہ دون کی لیتے رہے ہیں۔

غالبؔ اور ذوقؔ کے سہروں کے مقطعے تعلّی کی نمایاں مثال ہیں۔

غالبؔ نے کہا۔

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں ؛ دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

کسی نے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے تصرّف کیا ؎

ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں ؛ دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

تعلّی کی چند اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

سوداؔ۔ سوداؔ کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدّام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

میرؔ۔ طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ اس شعر کے فن میں
یونہیں سوداؔ کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

انیس ۔ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

جوش ملیح آبادی کہاں تصورِ پستی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لاتے نہیں زمینوں کو

دبیر ۔ مشتاق سخن خلق چلی آتی ہے
لو مرثیہ پڑھنے کو دبیر آتا ہے

انشاء ۔ اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے
کیا منہ ہے ارسطو کا کرے چوں مرے آگے

مصحفی ۔ مجنوں منم چرا دگرے رنج می برد
در حصۂ من آمدہ لیلائے شاعری

ناصر علی سرہندی ۔ ایں شوخی غزل گفتن علی از کس نمی آید
بہ ایراں می فرستم تاکہ بنویسد جوابش را

عرفی شیرازی کی انانیت تو ضرب المثل ہے۔ حکیم ابوالفتح کی خدمت میں رہا۔ اس کی موت کے بعد خان خاناں سے وابستہ ہوگیا۔ اس نے عرفی تخلص اس لئے اختیار کیا کہ وہ معزز خاندان سے تھا اور ایران کے اکثر شعراء معمولی خاندانوں سے تھے۔ خاقانی ترجئی تھا۔ فردوسی باغبانی کرتا تھا اور باقر کاشانی خردہ فروش تھا۔ اساتذۂ سلف کا نام بڑی تحقیر سے لیتا تھا۔

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز ÷ بہر چہ غنیمت نشمارند عدم را
روح اللہ ز اعجاز نفس دشمن شان باد ÷ تا من قلم انداز م دگیرند قلم را

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز چہ بود ÷ گر نمی دانست باشد مولد و ماوائے من
دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد ÷ بہ امداد صبا اینک فرستادم بسر ز انش

اس نے بہ یک وقت دو ممدوح نہیں بنائے۔ چنانچہ فخریہ کہتا ہے
یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر
صد شکر کہ تقدیر چنیں راند قلم را

اردو میں نسیم دہلوی اور داغ اپنی زبان پر ناز کرتے رہے اور تعلی آمیز شعر کہتے رہے۔ اب آئیے غالب اور اس کے انا کا جائزہ لیں۔ غالب نے "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری" کی بات کہی۔ ایک قطعے میں اپنے آبا و اجداد پر فخر کیا۔

غالب از خاک پاک تورانیم ÷ لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے ÷ بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک ÷ در تمامے زماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست ÷ مرزبان زادۂ سمرقندیم
ور ز معنی گزار دہ ÷ خود چہ گویم تا چہ و چند یم
ہم بہ تابش ببرق ہمنفسیم ÷ ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
تا شیکے ہست فیروزیم ÷ تا شیکے نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرئیم ÷ ہمہ بر روزگار می خندیم

یہ قطعہ غالب کے نسبی انا کی بہت ہی بدیہی مثال ہے۔ اسی غرور نسب نے غالب کو عمر بھر چین نہ لینے دیا۔ وہ انا کی ان منزلوں پر اڑا کہ اس کے پیش رؤوں میں عرفی کے سوا کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کے ہم عصروں میں تو کہاں ملے گی۔ اپنی بے کسی اور محرومی کا جواز بھی غالب نے شرافتِ نسبی کو قرار دیا۔

ہر آنکہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست
عیارِ بے کسیٔ من شرافتِ نسبی است

غالب نے ساقی سے خطاب کیا ہے تو بھی اپنی عالی نسبی کا ذکر کرکے کہا ہے کہ شراب مرے حوالے کر۔

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم ÷ دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اینک بمن سپار ÷ زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

غالب کلکتے گئے، پنشن میں اضافہ چاہتے تھے وہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ غالب کا انا اور تیز ہوا۔ قتیل کے شاگردوں اور مداحوں سے جھگڑا مول لے لیا۔ جب دیکھا کہ یوں کام نہیں چلے گا تو مثنوی بادِ مخالف لکھی۔ جو بظاہر معذرت مگر دراصل ایک بھرپور طنز ہے۔ سخنورانِ کلکتہ کی تعریف کی ہے۔ اپنا انکسار ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد بلا تکلف کہہ گئے۔

دامن از کف کنم چگونہ رہا ÷ طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روانِ معنی را ÷ آن ظہوری جہانِ معنی را
آنکہ از سر فرازیٔ قلمش ÷ آسمان ساست پرچم علمش
فتنہ گر گفتگوئے اینانم ÷ مستِ لائی سبوئے اینانم

آنکہ مے کردہ ایں موافقت را
چہ شناسد قتیل و واقف را

ہندوستان کے فارسی لکھنے والوں میں، امیر خسرو، ابوالفیض فیضی مرزا عبدالقادر بیدل، ناصر علی سرہندی علی، یہ صفِ اوّل کے لوگ ہیں۔ اُن کے بعد دوسری صف میں ہیں، مولوی غیاث الدین عزت رام پوری، مرزا محمد حسن قتیل دہلوی، احسن اللہ ممتاز، عبدالواسع ہانسوی، ملا محمد اکرام غنیمت کنجاہوی، نورالعین واقف بٹالوی (ثم لاہوری) ان میں سے غالبؔ صرف امیر خسرو دہلوی کو مانتے تھے۔ قتیل و واقف کی شان میں تو آپ ملاحظہ فرما چکے کہ کس بے تکلفی، برجستگی اور بے باکی کے ساتھ انہوں نے کہہ دیا۔

آنکہ مے کردہ ایں موافقت را
چہ شناسد قتیل و واقف را

غالبؔ کے ہم عصروں میں اُن کے پائے کا کوئی شاعر اور ادیب نہ تھا وہ بقول خود مبداءِ فیاض سے اپنی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ فارسی نظم ہر صنفِ سخن میں، فارسی نثر، اردو نظم، اردو نثر سب میں ماہر، الغرض وہ چہار پہلو فن کار تھے، نئی طرز فکر، نئی طرز نگارش اور ترقی پسند ذہنیت لے کر آئے۔ وہ چھٹ بھیّوں کو کس طرح خاطر میں لاتے اُن کا انا کسی طرح بھی بر خود غلط نہیں تھا وہ نئی نسل کے لئے ترقی اور تیز روی کے پیغام بر بھی تھے۔

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

ظریف طبع تھے۔ کبھی ظرافت کے پھول کھلاتے تو بھی ایسی بات کہہ جاتے، جس سے اُن کی افضلیت ظاہر ہو۔ میر مہدی مجروح نے خط میں پوچھا کہ دلی میں وبا کا کیا حال ہے۔ تو جواب میں لکھتے ہیں کہ وبا تھی، مر تو جاتا لیکن وبائے عام میں مرنا گوارا نہیں۔ اللہ رے شانِ پندار کہ مرنا بھی اس وقت چاہتے ہیں جب عام لوگ نہ مر رہے ہوں۔

زمانے نے اُن کو کم پہچانا اور وہ ع

"شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"

الا پتے مر گئے، بادشاہ کے دربار میں بھی رسائی کم تھی۔ ذوق بادشاہ کے اُستاد تھے۔ یوں تو ذوق کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان دینے کو آمادہ تھے، وہ شعر یہ تھا۔

ع اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لیکن مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ جب ذوق کا انتقال ہوا تو غالبؔ نے کہا سٹھیاروں کی زبان بولنے والا مر گیا۔ ایک فارسی قطعے میں ذوق کو مخاطب کرکے کچھ شعر کہے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا انا انھیں آسودہ ذہن نہیں رہنے دیتا تھا۔ وہ احساسِ برتری کا شکار ہو گئے تھے۔ خیریت گزری کہ وہ احساسِ برتری بہت حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔ ذوق کی طرف روئے سخن ہے۔

(۱) فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

(۲) تے درخشد جوہر آئینہ تا باقیست زنگ
صیقلِ آئینہ ام ایں جوہر آں زنگ من است

(۳) راست می گویم من واز راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

سہروں کے حادثے کے بعد جو معذرت لکھی اس میں بھی جگہ جگہ ذوق پر چوٹیں ہیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ اُن کی فارسی دانی کے قائل نہ تھے۔ ایک دن ایک غزل اُن کو سنائی اور کہہ دیا کسی ایرانی کی غزل ہے وہ داد دینے لگے۔ پھر کیا تھا انھیں مخاطب ہو کر یہ مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

مردہ پرست دُنیا کے لئے یہ شعر تازیانۂ عبرت ہے۔ غالبؔ کی نظر میں وسعت تھی، وہ ایجاد پسند تھے اور تقلید کے قائل نہ تھے جب انھیں پتہ چلا کہ کوئی اور شخص اسد تخلص کرتا ہے تو انہوں نے اپنا تخلص اسد سے غالب کر لیا۔

قاطع برہان ۱۸۶۲ء میں چھپی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اس

کے خلاف بہت سے رسالے لکھے گئے۔ مولوی احمد علی نے 'محرق قاطع' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس کے جواب میں تیغ تیز کے نام سے مرزا نے کتاب لکھی۔ دیباچے میں اپنی انانیت کا اظہار یوں کرتے ہیں: "ایک مرد بے مغز مفلوج الذہن، نہ فارسی داں، نہ عربی خواں نے میری نگارش کی تردید چھپوائی ہے" ایک صاحب میاں امین الدین مدرس پٹیالے 'قاطع القاطع' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس کے باب میں لکھتے ہیں۔ "یارب میاں امین الدین کسی بری قوم اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلاتے۔ اور اپنے باب میں لکھتے ہیں۔

"غالب اگر عالم و شاعر نہیں، آخر شرافت اور امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے۔ صاحب عز و شان ہے، عالی خاندان ہے۔ رئیس زادگان سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ خطاب ہے۔"
اپنی شخصیت پر ناز کرنے یا نسب اور دُنیاوی حیثیت پر بپھرنے میں تو غالب یکتا تھے ہی۔ دوسروں کو پاجی تک کہہ گئے، لیکن علو تخیل، پندار مزاج اور آزاد روی میں بھی وہ بے مثال تھے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ایسا آزادہ رو اور آزاد خیال شاعر فریب کار مذہبی دیوانوں کو کب خاطر میں لاسکتا تھا اور فنون لطیفہ سے کب نفرت کرسکتا تھا۔ بے ساختہ کہہ گیا۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابی و سرودی
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودی و نبی را بدرودی

غالب کو اپنے اشعار کی معنویت پر ناز تھا۔ اسے اپنے ایک ایک لفظ کی ماہیت کا احساس تھا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے ؛ جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

فارسی میں کیا کچھ نہیں کہا۔ ہر وقت احساس برتری کا اظہار

در فن سخن دم مزن از عرفی و طالب
ایں آیۂ خاص است کہ بر من شدہ نازل

بیا ورید گر ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

کس زبانِ مرا نمی فہمد ؛ بہ عزیزاں چہ التماس کنم

یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ڈاکٹر بجنوری نے اپنے ممدوح کے دیوان کو الہامی کتاب قرار دیا ہے۔ لیکن خود ممدوح اپنے باب میں کیا کہتا ہے؛

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے
دیوانِ مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اس میں بجنوری کا کیا قصور کہ وہ دیوانِ غالب اور وید مقدس کو ہندستان کی دو الہامی کتابیں کہہ گئے، خود غالب اپنے دیوان کو ایزدی کتاب کہتے ہیں۔ بشرطیکہ شعر و سخن کو دین قرار دیا جائے۔
انا کی اس سے بڑی مثال اور کیا ملے گی کہ جہاں کہیں غالب کو اپنے زمانے سے پہلے کے شعراء سے توارد ہوا ہے تو اس نے اسے بھی اپنی ہی ملکیت ٹھہرایا ہے اور پیشینیوں کو 'دزد' کہا ہے۔ کس معرکے کے دو شعر ہیں، بالخصوص دوسرا شعر

ز رفتگاں بہ یکے گر توارد م رو داد
مداں کہ خوبیِ آرائش غزل بُردست
مبر گمانِ توارد یقیں شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہانخانۂ ازل بُردست

'نہاں خانۂ ازل' کا یہ واحد مالک اُن شعراء کو چور کہتا ہے جن کا مضمون اس نے خود اُڑایا۔ یہ انا پسندی یہ پندار شعر غالب ہی کا حصہ ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوا کہ جب نسبی شرافت کی قدر کم ہوتی تھی، جب تلمیذ الرحمٰن، سے زیادہ سطحی شعراء کا بول بالا تھا۔ جب غالب کو نہ عوام نے پہچانا نہ خواص نے۔ جب وہ پنشن کے لیے مارا مارا پھرا اور کسی کے کان پر جوں نہ رینگی، جب وہ "گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل" کا رونا روتا رہا اور کہتا رہا ؎

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

(باقی ص ۲۷ پر)



غزلیں





(۱)

اب کچھ اداسیوں کے کھلیں گے چمن کہاں
وہ کوئی انجمن ہو تری انجمن کہاں

ہر منظرِ جمیل سے آئے شمیمِ دوست
دیوانگی ہے معجزۂ پیرہن کہاں

کیا کیا نہ تھی فریبِ تمنا میں لذتیں
کم بخت کھو گیا ہے مرا حسنِ ظن کہاں

یادوں میں اک حسین سی تصویر رکھئے
کچھ اور یادگارِ گل و نسترن کہاں

یک گونہ حادثوں کو علاقہ ہے ظرف سے
اک ننگِ کارواں کے لئے راہزن کہاں

تاباں خلوصِ شوق کو ارزاں نہ کیجئے
اس دورِ مصلحت میں وفا کا چلن کہاں

(۲)

غم ہائے روزگار سے دل شاد کیجئے
بیتے ہوئے دنوں کو نہ اب یاد کیجئے

انجامِ عرضِ شوق کا معلوم ہے مگر
چلئے کچھ اور کوششِ برباد کیجئے

دل لذتِ فریب سے محروم ہو گیا
کچھ ہو سکے تو آپ ہی امداد کیجئے

مانا کہ عشق درخورِ بیداد بھی نہیں
کچھ تو خیالِ خاطرِ ناشاد کیجئے

دل میں کھلے گلاب، مژہ پر جلے چراغ
اب کیا بیان درد کی روداد کیجئے

اس بزم میں شراب بھی ہے تشنگی بھی ہے
کیا مقصدِ حیات ہے ارشاد کیجئے

تاباں ملائیں خاک میں کیوں غم کی آبرو
کس نے کہا تھا نالہ و فریاد کیجئے

غلام ربانی تاباں

غم تھا حیاتِ عشق کا حاصل نہیں رہا
کیا رہ گیا ہے اب جو غمِ دل نہیں رہا

وہ دھول اڑ رہی ہے کہ یارو نگاہ میں
محمل تو دور، سایۂ محمل نہیں رہا

کس کو بتائیں کیفِ شہادت ہے کس کا نام
ہیہات کوئی شہر میں قاتل نہیں رہا

نے معرکے کا لطف، نہ رن کا کوئی مزہ
میداں میں کوئی دل کے مقابل نہیں رہا

وہ بزم جس میں جھڑتے تھے پھول ہر زباں سے
اب اس میں کوئی بات کے قابل نہیں رہا

قلبِ جنوں سے مستیٔ آوارگی گئی
پائے جنوں میں ذوقِ سلاسل نہیں رہا

تب ڈوبنے لگے ہیں کنارو تک آ کے لوگ
طوفاں بہ دوش جب کوئی ساحل نہیں رہا

یوں لوگ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں راہ میں
جیسے کوئی تصورِ منزل نہیں رہا

سنتے ہیں ایک شخص کنول نام کا بھی تھا
کوئی پتہ بتائے ہمیں مل نہیں رہا

کنول پرشاد کنول



کشمیری شاعری پر غالب کا اثر

غلام نبی خیال

سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کا کسی دوسرے قلم کار یا ادیب پر اثر کیا معنی رکھتا ہے اور اس کی حقیقت کس طرح نمایاں کی جاسکتی ہے۔ باینے نے ایک بار کہا تھا کہ یہ اثر رفتہ رفتہ دل میں اُترتا جاتا ہے اور بعد میں یا تو دیر تک یا شاعر کے کسی خاص دور میں اس کے اپنے اسلوب اور ہیئت کا جامہ اوڑھ کر ظاہر ہوجاتا ہے۔

گوئٹے نے جب حافظ کو پڑھا تو بلبلِ شیراز کی نغمہ باریاں اس کے دل و دماغ پر اس والہانہ انداز سے چھاگئیں کہ اثر پذیری کے اس خوش گوار عمل میں دیوانِ مغربی کی تخلیق ہوئی اور یہی دیوانِ مغربی بعد میں اقبال کے پیامِ مشرق جیسے شہرۂ آفاق مجموعہ کا باعث بن گیا۔ اثر قبول کرنے کا عمل بعض اوقات اس انداز سے بھی ظہور میں آجاتا ہے۔ کہ خود غالب جب کسی فارسی شاعر کا یہ شعر پڑھتا ہے ؎

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
ہر کہ از بزمِ تو برخاست پریشاں برخاست

تو وہ کہتا ہے ؎

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اسی شعر کو اثر پذیری کی حدود سے نکال کر توارد ہی نہیں بلکہ سرقہ تک کہا جاسکتا ہے۔

ایک شاعر کے دوسرے کا اثر لینا ہی اس تاثر کی قوت اور افادیت کو ثابت نہیں کرتا بلکہ باینے کے مطابق جب یہ اثر دوبارہ کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوجائے تو اس کے وجود کو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ آج اگر کشمیری شاعری میں چند ایسے اشعار بھی نظر آرہے ہیں جن پر غالب کے اندازِ بیان یا تخیل کا گماں ہوتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ یہ شاعری غالب سے متاثر ہوئی ہے۔ پڑھنے کو یوں تو غالب تقریباً سبھی کشمیری شاعروں نے پڑھا ہوگا اور دیوانِ غالب کے صفحات اُلٹنے کے بعد بار بار کہا ہوگا ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن آج تک ہمارا ایسا کوئی سخن ور نہیں گزرا ہے جس کا بھرپور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس اثر کے موجود ہونے کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔

غالب کا ذکر ہی کیا آج تک کشمیر کا کوئی شاعر برصغیر کے کسی شاعر سے پوری طرح متاثر نہیں ہوپایا ہے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے وہ تو یوں سمجھئے کہ مذہبی لحاظ سے ہمارے چند سخن وروں نے اس کی تقلید کی ہے۔ اس لاتعلقی کی کئی وجہیں ہیں جن میں کشمیری کی جغ

ر بندی کو بھی دخل ہے۔اس سلسلے میں اگر تاریخی، لسانی اور تہذیبی پس منظر
زیر بحث لایا جائے تو وہ بجائے خود ایک طویل مقالہ کی شکل اختیار کر سکتا
ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

میرے خیال میں ہمارے شاعروں کے غالب سے متاثر نہ ہونے کا
ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب کو ایک محبوب شاعر اور مشاق استاد کی
حیثیت سے پڑھنے اور سمجھنے میں جس دلچسپی اور انہماک کی ضرورت ہے وہ
انہیں شاید کبھی پیش ہی نہیں آئی اور غالب کے گہرے اور سرور بخش مطالعے
سے کسی حد تک وہ محروم ہی رہے۔نتیجے کے طور پر جب آج کشمیری شاعری
پر غالب کے اثر پر قلم اٹھایا جاتا ہے تو یہ اثر مجھے معشوق کی کمر کی طرح دکھائی
دیتا ہے۔اور میں خود سے سوال کرتا ہوں۔

کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

ٹر زندہ کول یوں تو بہت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں

یتھ اثر کرِ غالبن اکھ شار تیتھ سپدیا اثر
واعظ ہتے کرِ تیر واعظکو منبرس پیٹھ خالی

(اگر واعظ منبر پر اپنے واعظ کے سبھی تیر خالی کر دے پھر بھی سامعین پر اتنا
اثر نہیں ہو سکتا جتنا غالب کا ایک شعر کر سکتا ہے۔)

بہر حال ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بھی صاف نظر
آتی ہے کہ کشمیری زبان کے بالخصوص جدید شعراء کے ذہنی دریچوں میں سے
وہ روشنی ضرور گزری ہے جو غالب کا آفتاب شاعری سالہا سال سے
دنیا کے بے شمار سخن فہموں اور سخن سنجوں کے فکر اور تخیل پر برسا
رہا ہے۔

کشمیر میں فارسی مدتوں تک سلاطین اور حکام کی مادری زبان رہی ہے۔
ایک طویل عرصہ پھیلے ہوئے اس دور میں فارسی زبان کشمیر کی علمی اور ثقافتی
فضاؤں پر اس حد تک حاوی رہی کہ ہر شاعر نے فردوسی، نظامی اور سعدی
حافظ کو دل و جان سے پڑھا اور ان سے خوشہ چینی کر کے کشمیری شاعری کے
دامن کو مالا مال کیا یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری شاعری میں مثنوی داخل ہوئی
اور فارسی زبان کی رزمیہ اور بزمیہ مثنویوں کے تراجم یکے بعد دیگرے کشمیری
شاعری کے سرمایہ میں اضافہ کرتے رہے کلاسیکی فارسی ادب سے حد درجہ
متاثر ہونے کی وجہ سے کشمیری شاعری نے اردو کی طرح بحور و اوزان
بھی فارسی ہی سے لئے اور ہماری شاعری میں مثنوی کے ساتھ ساتھ غزل اور
نظم جیسی اصناف نے بھی جگہ پائی۔ ممکن ہے کہ محمود گامی اور رسول میر کی
نظروں سے غالب کی چند غزلیں گزری ہوں لیکن غالب کی بدقسمتی یہ
تھی کہ وہ خود زندگی میں کبھی مقبول شاعر نہیں بنا اور زمانے کی بے اعتنائی
کے شکار اس شاعر کو محمود اور رسول میر نے بھی حسب توقع نظر انداز ہی
کیا ہوگا۔

غالب کی شاعری کی صدائے بازگشت کشمیر میں سب سے پہلے
اس وقت سنائی دیتی ہے جب ہم مہجور کا یہ شعر پڑھتے ہیں۔

چانہٕ کتھہ مہجور چاوان عارفن آبِ حیات
ما نہ ہنتھ درویش کامل آسہ ہکھ نے حلقہ دار

(مہجور تمہاری باتیں عارفوں کے لئے آب حیات ہیں۔اگر تو پٹواری نہ
ہوتا تو ہم تجھے درویش کامل مانتے۔)

اور ہر ایک کو غالب کا یہ مقطع یاد آجاتا ہے

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مہجور کا ہی ایک اور مشہور شعر ہے

چھُر کرنا نازنین کانسہِ سیود روئے ہا وان
توکہ آب منزہ زون ڈلان ناتھہ یارد

(نازنین کسی کو اچھی طرح سے چہرہ نہیں دکھاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ
پانی میں عکس ماہ ہمیشہ تھرتھراتا رہتا ہے)

اس شعر کا شمار مہجور کے حسین ترین ابیات میں ہوتا ہے۔غالب
کا بھی ایک مصرع ہے

کہ عکس ماہ در آب رواں بجنباند

اور صاف نظر آتا ہے کہ مہجور نے اپنے شعر کا حسن غالب ہی سے مستعار
لیا ہے۔

مہجور نے یہ مصرع کہہ کے بھی ع

داتہ عشقنہ دینہ موجوب حسنہ کس مالس زکوٰۃ

(عشق کے مذہب کے مطابق حسن کے مال پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔)
غالب کے اس شعر سے استفادہ کیا ہے

زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

اور غالبؔ کا شعر پڑھ کر حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

تو صاحبِ نعمتی من مستحقم
زکوٰۃِ حسن دہ حق دارم امشب

عبدالاحد آزادؔ کے سوانحِ حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مطالعہ میں دیوانِ غالبؔ پر کلامِ اقبالؔ کو ترجیح دی ہے۔ ایک غریب کشمیری گھرانے میں پیدا ہونے کے ناتے اور حد درجہ حساس ہوتے ہوئے اُن کے ذہن کی نشو و نما طبقاتی امتیاز سے بھرے ہوئے ماحول میں ہوئی۔ آزاد اتنے پڑھے لکھے نہیں تھے کہ وہ غالبؔ کی نزاکتوں میں ڈوبنے کی فکر کرتے اور اقبال کی اُن ہنگامہ خیز اور جذبات انگیز نظموں سے لطف نہیں لیتے جو انہیں اپنے محسوسات کی ترجمان معلوم ہوئیں۔ پھر بھی کبھی کبھی ایسا گمان ہوتا ہے کہ آزادؔ غالبؔ سے غافل نہیں رہے بلکہ انہوں نے بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر غالبؔ کو اپنے ذہن سے خارج کرنے کی جرأت نہیں کی ہے۔ اُن کے ایک گیت کے دو شعر ہیں ؎

باؔلِ ستہ ہے چھ بے وفا میون امارتس کیاہ کرے
سورہ وُنس محبتس زور تہ زار کیاہ کرے
نیرہ برتسینہ ڈاری ڈاری زندہ یہ پان ماری ماری
تیر کمان چاری چاری میہ شکار کیاہ کرے

(اے سہیلی وہ بے وفا ہے۔ میری محبت اُس پر کوئی اثر نہیں کرتی ہے۔ اس کا پیار تو اب ختم ہو رہا ہے اور میری آہ و زاری سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ میں اپنا سینہ تان کر اور جان بکف ہو کے نکلوں گا۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ وہ شکاری تیر و کمان لے کر کے میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے۔)

اب غالبؔ کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتا ہے ؎

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اور

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

آزاد کے یہاں سے چند مثالیں دینے کے بعد غالبؔ کو اگر کشمیر کی جدید شاعری میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے تو اُسے ایک ایسی مبہم اور موہوم شکل ہی میں تلاش کیا جا سکتا ہے جس کے خط و خال کبھی صاف صاف ہو کے سامنے آجاتے ہیں اور بسا اوقات اُن میں تفصیلات کو دیکھنے اور جانچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

راہیؔ کے اس شعر پر ؎

ہاوسن ہندی حدمتیہ ژھانجاے بارہا
زانہہ تہِ نواند وائی یم افسانہ تے

(میں نے بار بار اپنی تمناؤں کی حدیں تلاش کیں لیکن یہ افسانے کبھی تکمیل کو نہیں پہنچے)

غالبؔ کے اس شعر کی چھاپ اور گہرا تاثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس میں اُس نے ہر شے کو پانے کے بعد بھی ہر شے کو پانے کی تمنا کرتے ہوئے کہا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

البتہ ہماری شاعری میں ایسے بھی متفرقات اور مفردات ملیں گے جن کو پڑھ کے گمان ہوتا ہے کہ شاعر نے غالبؔ کو ضرور پڑھا اور سمجھا ہے اس کے فکر و خیال کی داد دی ہے لیکن اپنے خیال پر اس کے تصوّرات کو حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ مثال کے طور پر غالبؔ کا شعر ہے ؎

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمک داں ہونا

اور کشمیری میں اس شعر کی دھیمی دھیمی صدائے بازگشت اس شعر میں سُنائی دیتی ہے ؎

شوق لاگان چھُ خونِ دل داوس
زانہہ تہِ عاشق کھیا کلک خیرات

(شوق اپنے خونِ دل کو داؤ پر لگا دیتا ہے اور عشاق سر کی خیرات

ل نہیں کرتے۔

کشیر کی شاعری پر غالب کے ہمہ گیر اثر کو ثابت کرنے کے لیے ممکن ہے
لبعض متوقع قسم کی شعری یا اصطلاحی یا تصوری مماثلت کا سہارا لیا جائے
ن اس قسم کے نوادر تو ہر زمانے میں اور ہر شاعری میں پائے جاتے ہیں

خواجہ اکرم دردمند کشیری زبان کا ایک ناخواندہ شاعر گزرا
ہے جس کی علمی استعداد "کریما نام حق" کے صفحات تک ہی محدود تھی
ن کا ایک مصرع ہے ؎

چھُ تقدیر شیشہ تہ تدبیر سنگ
(تقدیر شیشہ ہے اور تدبیر سنگ)

کیسے کہا جا سکتا ہے کہ دردمند نے یہ مصرع جا سر کو پڑھ کر موزوں
ا ہے جس نے کہا تھا ؎

اپنے مٹی کے برتن کو قضا کی آہنی دیوار کے ساتھ مت ٹکراؤ

الب کا ایک مشہور شعر ہے ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

ارے ایک ہم عصر شاعر عارض نے بھی، جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے
شعوری طور پر اور یقیناً غالب سے اثر لیے بغیر دیکھئے اسی خیال کا کتنا
پیارا شعر کہا ہے ؎

خابہ منز ژ سوُوم ژہ دزف تراُوتھ ژہ شاند تھاُوتھ گوم
خاب اوس خالی چشمہ مُژ رادتھ سوُ ژوُر زھیپ دتھ گوم

نے خواب میں اپنے محبوب کو اپنی بانہوں میں سلایا لیکن خواب تو
ب ہی تھا اور جب میں جاگا تو وہ دُزدِ دل دل لے کر کے بھاگ چکا تھا)

غالب اور کشیری شاعری کے تعلق کے پیشِ نظر میں سمجھتا ہوں کہ یہ
مون تشنۂ تکمیل ہی رہے گا جب تک کہ اُن شاعروں کا بھی تھوڑا
ا تذکرہ سامنے نہ آجائے جو کشیری الاصل تھے اور جنہیں غالب کی
گردی کی سعادت حاصل ہوئی۔

سرزمینِ کشمیر سے جتنے بھی سخن ور غالب کے شاگرد ہو گزرے
، بدقسمتی سے اُن کے حالاتِ زندگی اور کلام کے بارے میں مکمل تفصیلات
دستیاب نہیں لہٰذا یہاں پر ایسے صرف تین شاعروں کا ذکر کیا جائیگا۔

کشمیر میں رہنے والے خواجوں کا ایک خاندان جب بسلسلہ تجارت
ڈھاکہ چلا گیا تو اس خاندان میں عبدالغفار اختر جیسا چشم و چراغ پیدا ہوا۔
اختر کو فارسی اور اُردو پر مکمل دسترس حاصل تھی اور دونوں زبانوں میں
شعر کہتے تھے۔ فارسی میں وفا، ریختہ میں نزاکت اور اُردو میں اختر تخلص
تھا۔ اختر نے صرف فارسی کلام پر غالب سے اصلاح لی ہے اُن کے کچھ
اشعار یہ ہیں ؎

گر خضر نے عمر جاودانی پائی
یا آبِ حیات کی نشانی پائی
کیا ناز کرے اُس پہ کہ جب اختر
مرنے کے لیے یہ زندگانی پائی

پنڈت لچھمی نراین مفتوں کے آباو اجداد کشمیر میں اُونچے عہدوں
پر فائز تھے۔ اپنے وطن پر نامساعد حالات کی ستم ظریفی سے عاجز آکر مفتوں
فرخ آباد میں جا کر بس گئے جہاں وہ ترقی کرتے کرتے شہر کے میونسپل
کمشنر بن گئے اور اعزازی مجسٹریٹ کا رتبہ پایا۔ فارسی شاعری میں مہارت
کے علاوہ نستعلیق خط میں بھی جانکاری حاصل کی۔ نمونے کے چند شعر
یوں ہیں ؎

عمر گزری کہ تری راہ میں ہم بیٹھے ہیں
پر ابھی شوق یہ کہتا ہے کہ کم بیٹھے ہیں
کیونکہ بیت الصنم عشق سے اُٹھیں مفتوں
اب تو اللہ کی ہم کھا کے قسم بیٹھے ہیں

نواب سید محمد ذکریا خاں ذکی کشمیر سے جا کر دکن میں آباد ہوئے۔
۱۸۵۷ء کے پُر آشوب زمانے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے
رہے اور سنہ ۱۹۱۰ء میں بدایوں میں وفات پائی۔ دیوانِ ذکی اُن کی
زندگی ہی میں شائع ہوا جس پر غالب کی لکھی ہوئی چند سطور بھی رقم تھیں
ذکی کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

تمکین وضع طرزِ تبسم میں دیکھئے
انداز اس کی شوخیٔ طبعِ سلیم کا
حیف صد حیف ذکی زندگیٔ تلخ تیری
بےکسی کا اگر انجام یہ ہو مر جانا

●●

سوچ

سوچ سے ہوں اس لئے ہیں پاؤں بھاری
ہر قدم سنکوچ جیسے
سوچ میرے پاؤں کی ہو موچ جیسے
سوچ میری انگلیوں میں سوچ میرے بازوؤں میں
سوچ میرے پاؤں میں ہے
سوچ بیداری کی دھوپ اور نیند کی بھی چھاؤں میں ہے
سوچ ہے آنکھوں میں ساری
سوچ ہے پلکوں پہ طاری
سوچ میری بیٹھ میں، کانوں میں سوزاں
سوچ شانوں میں فروزاں
سوچ ہر اک رنگ میں ہے
ذہن و دل ہی میں نہیں یہ جسم کے ہر انگ میں ہے
سوچ میرا جسم جیسے
خود سے بھی انجان سا، ہلکان سا ہوں
نوچتی ہے سوچ ایسے

سوچ تیرا زور اتنا شور اتنا
چھوڑ بھی دے سوچ آخر موت سے بڑھ کر نہیں تو
زیست سے باہر نہیں تو

خود فراموشی کہاں ہے تو کہاں ہے
تیری مدہوشی کہاں ہے
تیری خاموشی کہاں ہے
اے فراموشی، وفاکوشی، ہم آغوشی تری ہے آرزو اب
دل کو تیری جستجو اب
آ بھی جا اب، چھا بھی جا تو
سوچ کر اب کھا بھی جا تو

صادق

آکار



پہاڑوں کی تنہائیاں
خود عذابی کے احساس کا کوئی اظہار
زخموں کی تخلیق سے اس طرح نہ کریں
کہ مسائل کے چہرے بگڑتے بگڑتے
بگڑتے چلے جائیں، لیکن
چٹانوں کے اسرار
عظمت کے کھسکتے ہوئے زاویوں کے لئے
پتھری راستوں کے تراشوں پہ چوکور
بدقسمتی لیپ کر
اپنے گھوڑوں پہ تہذیب کی ہڈیاں لاد دیں

. . اور سارے محقق وہیں
ایک ماقبل تاریخ یگ کا ادھورا شیلا لیکھ
پڑھنے کی کوشش میں یوں ہی
سمندر، سمندر، سمندر پکاریں
اور دیکھیں کہ سارے سمندر وہیں
اُن کے پیروں تلے ریت میں
ڈوبتے ڈوبتے
ڈوبتے جا رہے ہیں مگر
چند تبدیلیاں
جھاگ کے روپ میں
یوں اپھنتی چلی جا رہی ہیں
کہ سوچوں کے پھیلاؤ

چہرے سکڑتے چلے جا رہے ہیں
اور ہزاروں برس قبل کے لوگ
ہاتھوں میں پتھر کے ہتھیار لے کر
کسی غار سے
جوق در جوق نکلے چلے آ رہے ہیں
تمہیں یاد ہے
اُن سے سپنے میں اک دیوتا نے کہا تھا
کہ تم
ایک بے لفظ تاریخ میں کچھ اضافی تصور سجا کر
کسی بھی طرح
اپنے بے آرٹ ذہن کو
ساری انسانیت کی بقا کے لئے
ایک زخمی مقدر بنا کر
ادھورے شیلا لیکھ کی شکل دینا
کہ گزرے زمانوں میں جب کچھ محقق
انہیں ڈھونڈ لیں بھی تو پڑھنے کی کوشش میں
سمندر، سمندر، سمندر پکاریں
اور دیکھیں کہ سارے سمندر وہیں
اُن کے پیروں تلے
ریت میں . . .



افراد



غالب : اسداللہ خاں غالبؔ
مہر : مرزا حاتم علی مہرؔ
کلو : ملازم غالب
مقام : دہلی

(غالب ایک چارپائی پر نصف لیٹے بیٹھے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف دکھائی دیتے ہوں قریب ہی تپائی پر دو گلاس اور دو بوتلیں رکھی دکھائی دے۔ دیوار پر کیلنڈر آویزاں ہو۔ چارپائی کے پاس ایک مونڈھا جس پر خوش نما گدا اور جھالر دار غلاف چڑھا ہوا ہو، رکھا ہو۔ فرش بچھا ہو۔ ایک کونے میں گاؤ تکیہ اور چھوٹا سا قالین بچھا ہوا دکھائی دے۔ مرزا کی چارپائی کے دوسرے رخ ایک اسٹول پر قلم دوات رکھی دکھائی دے کچھ سادہ کاغذ بھی)

کلو : (سامنے حاضر ہو کر) مہر صاحب آئے ہیں

غالب : (چونک کر) ارے کلو تمہاری عمر ساٹھ سے زائد ہونے کو آئی مگر کلام کا طریقہ نہیں آیا۔

کلو : (حیران ہو کر) آخر کیا بات ہو گئی

غالب : لوہا پارس ہو جائے گا۔ سونا کندن ہو جائے گا مگر تم کو تمیز نہ آئے گی۔

کلو : کہاں سے آئے۔ لڑکے بالے۔ بیگم، پوتا، پوتی سب بھرے ہیں مگر آپ نہ شراب سے بچتے ہیں۔ نہ اناپ شناپ سے

غالب (خفا ہوتے ہوئے) یہ اناپ شناپ کیا ہوتی ہے۔

کلو : میں کیا جانوں۔ مگر سنا ہے بڑھاپے میں زہر ہے۔ باہر میاں مہر کھڑے ہیں۔

غالب : کیا مصرع کہا ہے میں تو بھول ہی گیا۔ جاؤ پیشوائی کرو، اور ہمارے صاحب کو لے آؤ

کلو : (جاتے ہوئے) الفاظ بھی مجرے والوں کے استعمال کریں گے

غالب : کیا کہا . . . . (کچھ سمجھ کر) مجرے والے ؟

(کلو باہر دروازے کے چلا جاتا ہے، مہر کو بلانے کے لئے مرزا بولتے رہتے ہیں)

ارے بوڑھے کون اس بدعت کا ہے۔ تو۔ تیرا باپ یا تیرا دادا!
دیکھو بستو . . . . .

مہر : (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) تسلیم! (مگر مرزا اپنا کلام جاری رکھتے ہیں۔) دیکھو مرزا مہر۔ تم گواہ ہو کہ "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری" — یہ تو وقت کے کھیل ہیں جنھوں نے مجھے سان پر رکھ کر اور بھی زنگ آلود کر دیا ہے۔ ایک طرف دنیا کا غم، دوسری جانب امراؤ بیگم کا ستم۔ نہ اندر چین، نہ باہر سکون۔ اسی غم سے نجات کی خاطر کبھی کبھی "سادہ پانی" یا عرق بادہ" لے لیتا ہوں جی بہلا لیتا ہوں۔

مہر : حضرت تسلیم۔ آپ اس وقت سوا نیزہ کا آفتاب کیوں بنے ہوئے ہیں۔

غالب : ابھی کیا کروں۔ یہ منہ چڑھے لوگ۔ غالب کے منہ آتے ہیں اور

بے جا کلام کرتے ہیں۔ کبھی مجرے والا کہتے ہیں۔ کبھی پالی والا۔

کلو: (مونڈھا مہر کے قریب کرتے ہوئے) اے میاں کیوں گنہگار ہوتے ہیں۔ میں نے یہ بات نہ سوچی۔ نہ کہی۔ میں تابعدار۔ سدا کا غلام۔ جیتے جی مر رہا ہوں۔ نمک کھایا ہے۔ جو ایسی بات خیال میں بھی آئی ہو۔

غالب: تم پھر کلام کرنے لگے۔ بات کو طول دینے لگے۔ حالاں کہ تم۔ اور تم بھی (مہر کی طرف) گواہ ہو کہ شراب کو حرام اور ساقیٔ کوثر پہ ایمان رکھتا ہوں۔

مہر: ہاں ابھی کچھ دن ہوئے اس مسئلہ پر آپ نے جو خط مجھے لکھا تھا . . . . . اس میں اپنے مسلک کا یہ شعر لکھا تھا۔

غالب: شعر نہ کہو۔ حقیقت کہو۔ ہاں۔ کیا تھا۔

مہر: بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

غالب: ہاں: علاقۂ محبت ازلی کو برحق مان کر اور پیوندِ غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ مان کر ایک بات کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔

مہر: بیشک۔ مگر اس بات کا یہ محل کیا ہے؟

غالب: لو۔ تم بھی میر کلو کے ہم نشیں، حاشیہ نشیں ہو گئے۔ کیا؟

مہر: اب آپ جو بھی خیال کریں

غالب: خیال کیا۔ یہ مردود ازلی۔ نامراد۔ ناگفتار میر کلو ناہنجار میرے باب میں اول فول بکتا رہتا ہے۔ ہر آئے گئے کے سامنے ذلیل و خوار کرتا ہے۔ خیر۔ ہم تم دوست دیرینہ ہیں۔ تم نے سلام کا جواب نہ پاکر بھی گلہ، شکوہ نہ کیا . . . .

مہر: بخدا۔ میرے تو حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات نہ رہی تھی۔

غالب: اب تو آگئی۔ سبحان اللہ۔ چشم بد دور۔ کیوں نہ ہو۔ اُردو کی راہ کے تو سالک ہو۔ گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی خوب میں کم نہیں۔ مشق شرط ہے۔ اگر کہے جاؤ گے لطف پاؤ گے۔

مہر: عنایت ہے، کرم ہے۔

غالب: خیر۔ اپنا حال سناؤ۔ میں نے سنا تھا کہ تم کہیں کے صدر امین ہو گئے ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر کیوں اکبرآباد میں خانہ نشین ہو۔ اس ہنگامے میں تمہاری صحبت حکام سے کیسی ہے؟

مہر: شکر ہے۔ غنیمت ہے۔

غالب: ہاں یہ تو بتاؤ کہ راجہ بلوان سنگھ کو جو دو ہزار مہینا سرکار انگریزی سے مقرر ہوا تھا۔ اب بھی ملتا ہے یا نہیں؟

مہر: خدا علیم ہے۔ ہندو مسلمان، اہلِ صنعت و حرفہ سب تباہ حال ہیں۔ شرفا کی مٹی پلید۔ غربا بہ مرگ قریب۔ دلی اجڑ گئی۔ لکھنؤ ویران ہو گیا . . . .

غالب: ہائے تم نے کیا بات یاد دلا دی۔ لکھنؤ کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا؟ قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو زیادہ آگہی ہو۔

مہر: لکھنؤ کی بہار پر خزاں نے ڈیرا ڈال دیا ہے۔ نواب اور اُن کے محل، بے محل ہو گئے۔ ڈیرہ دارنیاں ادھر اُدھر اور متوسلین دربدر پھر رہے ہیں۔ مجتہد العصر سے آپ کی مراد کس سے ہے۔ اُن کا پتہ بتایئے۔ تو کچھ عرض کروں۔

غالب: پتا مسکن مبارک کا "کشمیری بازار" سے زیادہ نہیں معلوم ظاہرا اس قدر کافی ہوگا۔

مہر: کوشش کروں گا۔ لیکن عرصہ دراز سے نہ آپ نے مجھے دعا لکھی۔ نہ خیریت منگائی۔ یہ شکوہ نہیں زمانے کا اقتضا ہے۔

غالب: بندہ پرور آج ۵ مارچ ۱۸۵۸ء ہے۔ یاد کرو، لکھ لو، فقیر شکوے سے بُرا نہیں مانتا۔ مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو تمہارا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا۔ اس واسطے خط نہیں لکھا تھا۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس عرصے میں کئی خط بھجوائے اور وہ اُلٹے پھر آئے۔

مہر: کہہ دیجئے۔ سنا تو رہے ہیں۔

غالب: ارے تم شکوہ کاہے کا کرو۔ اپنا گناہ میرے ذمہ دھرتے

ہو۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ کہاں جاتے ہو، نہ وہاں جاکر لکھا کہ کہاں رہتا ہوں؟ آج تم آئے ہو تو دید وادید ہو رہی ہے۔ کہو اپنے وعدے پر صادق ہوں یا نہیں۔

مہر : آپ کی صداقت تو ہر حال میں رہے گی۔

غالب : لغویات۔ بس دردمندوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مرزا تفتہ سے تم فقط ان کے خط نہ لکھنے کے سبب سرگراں ہو میں بھی نہیں جانتا وہ ان دنوں کہاں ہیں۔ آج توکلت علی اللہ سکندرآباد خط بھیجتا ہوں۔ دیکھوں کیا دیکھتا ہوں :۔

مہر : آپ کا فرمانا بجا۔ مگر آپ ہی بتائیے جب راہ و رسم کا یہی ایک بہانہ رہ گیا ہو تو پھر اور کیا کیا جائے۔ نہ مجروح کا علم، نہ مرزا تفتہ کی خبر، نہ شیونرائن کیفیت، نہ آپ کا حال معلوم؟

غالب : میری کیا خیریت وحال، جیسا ہوں تمہارے سامنے ہوں (آواز دے کر) کلو۔ اے کلو۔

کلو : (سامنے حاضر ہوکر) جی حضور

غالب : ذرا بھائی طاقت و توانائی کی دوا لے آؤ۔ تھک گیا ہوں۔ قویٰ جواب دے رہے ہیں۔

کلو : (جاتے ہوئے پھر تپائی پر سے گلاس لے کر) دوا حاضر ہے آپ کی۔

غالب : (تیکھی نظر سے) یہ آپ کی تخصیص کیا ضروری تھی؟ یہاں میرے سوا اور کوئی بیٹھا ہے ناشدنی؟

کلو : (سر جھکاکر) حضور مرزا مہر بھی تو حاضر ہیں۔

غالب : انہیں مہر نہ کہو صدر امین کہو، عہدہ وکالت کی مبارکباد دو اور کہو کہ موکلوں سے کام لیا کیجیے۔ جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں۔ کیا خوب بول چال ہے۔ انداز اچھا۔ روزمرہ صاف، جبشنوں کا استغنا تہ کیا کہوں کیا مزا دے رہا ہے۔ ہاں مرزا مہر تو تم شاکی ہو کہ مرزا علائی خاں کو میں نے جو خط لکھا تھا، اس کی تفصیل سے تم کو بے بہرہ رکھا۔

مہر : شکوہ کیسا اور گلہ کیسا، حق بات تھی۔ عرض کی گئی۔

غالب : میں نے غالباً . . . . . ایک اور خط بھی علائی خاں کو لکھا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا۔

" . . . میری بی بی اور بچوں کو، کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں مجھ سے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بھی یہ سمجھ کر ان لوگوں کے لوہارو جانے کی، اس خواہش کو قبول کیا، میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا، جہاں سے دل اکھڑا چل دیا۔"

مہر : (قطع کلام کرتے ہوئے) آپ کو ایسا نہیں لکھنا چاہیے تھا۔

غالب کیوں بھئی کیوں۔ سولہ برس کی عمر سے بیڑی پڑی ہے بستر برس کی عمر ہونے کو آئی۔ آخر کب تک گلے کا کٹھلا بنائے رکھو گے۔ حد بھی ہے، نہ یار، نہ مددگار، آمدنی مفقود، وسائل محدود کیا مسدود، اس پر بوڑھی تصور کا بوجھ، کہاں تک اٹھاؤں۔ تم کیا جانو۔ افتاد کیسی ہے، زمانہ کا کیا اقتضا ہو گیا ہے؟

مہر : کوئی خاص بات؟

غالب : مرزا یوسف علی خاں سے تو تم واقف ہو گئے؟ وہ آٹھ دس ماہ سے اس شہر میں مقیم ہیں۔

مہر : (حیرت سے) اچھا

غالب : ہاں ایک ہندو امیر کے گھر مکتب کا ساطور کر لیا ہے، میرے ہی مسکن کے پاس ایک مکان کرایہ پر لے لیا ہے۔ اس میں رہتے ہیں۔

مہر : میں اُن سے ملوں گا۔

غالب : اکثر تمہارا ذکر خیر ہوتا ہے۔ دو روز سے "شعاع مہر" کو دیکھ رہے تھے وہ اب ہر وقت یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ رات کو تو پہر ڈیڑھ گھڑی کی نشست روز رہتی ہے۔ ابھی یہیں سے اٹھ کر مکتب کو گئے ہیں۔

مہر : افسوس بھی ہوا، خوشی بھی، افسوس اُن کی مجبوری کا، خوشی آپ کے قرب کی۔

غالب : خیر اس میں خوشی کی کیا بات ہے۔ تم کو سلام کہا کرتے ہیں۔ اور "شعاع مہر" کے مداح و "بیان بخشائیش" کے مشتاق ہیں اُن کو خط بھیجنا ہو تو میرے مکان کا پتہ لکھ دینا۔ یہ بھی تم کو معلوم رہے کہ میرے خط کے سرنامے پر محلے کا نام لکھنا ضروری نہیں، شہر کا نام اور میرا نام۔ قصہ تمام۔ ہاں۔ یار عزیز کے خط پر میرے مکان کے قریب کا پتا ضرور رہے۔

(کچھ یاد کرتے ہوئے) ارے یار مہر۔ یہاں دو خبریں مشہور ہیں۔ اُن کے باب میں تمہاری تصدیق چاہتا ہوں۔

مہر : وہ کون سی ؟

غالب : ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ آگرے میں اشتہار جاری ہوگیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا ہے اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہوگیا . . . .

مہر : اور دوسری ۔

غالب : دوسری یہ کہ جناب اڈمنیسٹن صاحب بہادر، گورنمنٹ کلکتہ کے چیف سکرٹر ۔ اکبر آباد کے لیفٹیننٹ گورنر ہو گئے۔ خبریں دونوں اچھی ہیں خدا کرے سچ ہوں۔ اور سچ ہونا اُن کا تمہارے کہنے پر منحصر ہے۔

مہر : یہ تو حقیقت ہے۔ لیکن اڈمنیسٹن صاحب سے آپ سے کیا تعلق ؟ دشمن قوم کا فرد۔ دشمن ! ۔

غالب : سب درست مگر اڈمنیسٹن صاحب بہادر قدر شناس اور قدر افزا شخص ہیں۔ اُن کو اپنا محسن اور مربی جانتا ہوں۔ کافر نہیں جو احسان نہ مانوں ؟ ۔

مہر : میں نے یہ کب کہا ؟

غالب : اچھا۔ یہ تو بتاؤ۔ کہ "دستنبو" کا چھاپا تمام ہوا۔ اور قصیدہ چھاپ کر ابتدا میں لگا دیا گیا ؟ ۔

مہر : "دستنبو" زیر طبع ہے۔ قصیدہ کا مسودہ منشی شیو نراین کے پاس پہنچ گیا ہے اور انہوں نے اس کا چھاپنا شاید قبول کر لیا ہے۔

غالب : پھر یہ بتاؤ۔ مدت انتظار کب انجام پائے گی ؟ کتابوں کی روانگی کی خبر مجھ کو کب آئے گی ؟ تمہاری فرط توجہ کا سب طرح یقین ہے مگر سیاہ قلم کی پانچوں وصیں بھی بن گئیں ! ۔ جلدوں کا بنانا تو چھاپے کے اختتام پر موقوف ہے ؟

مہر : امید ہے کہ اکتوبر (۱۸۵۸ء) تک یہ کام انجام پا جائے اور چالیس جلدوں کا پشتارا آپ کے پاس آجائے۔

غالب : خوب ہو۔ خدا کرے نثر کی تحریر انجام پا گئی ہو۔ قصیدے سے چھپنے کی نوبت بھی آگئی ہو اور قصیدے کا نثر سے لگانا از راہِ اکرام و اعزاز ہے ورنہ تم واقف ہو کہ نثر میں اور صنعت۔ نظم کا اور انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا یاد رکھنا قصیدے اور "دستنبو" کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے گا۔

مہر : ایسا ہی ہوگا۔

غالب ، ایک کام اور ہے۔

مہر ، وہ کیا ؟

غالب : رائے امید سنگھ کو اندور خط لکھو کہ اب وہ کتابیں تیار ہونے کو آئی ہیں۔ آپ کی خدمت میں کہاں بھیجی جائیں ؟ کیا پتہ لکھا جائے۔ یہ خط جواب طلب ہو جائے گا۔ اور اُن کو جواب لکھنا پڑے گا۔

مہر : تعمیل ارشاد ہوگی اور جیسے ہی جلدیں تیار ہوئیں پانچ سات ارسال کرا دی جائیں گی۔

غالب : نہیں۔ توجہ کی ضرورت ہوگی۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو گے۔ مگر ایسا کچھ کرنا ہے کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ایسا ہو اور منشی شیو نرائن کی قسلی و تحریر کے مطابق ۳۴ جلدیں اور تمہارے قول کے مطابق سات جلدیں [illegible]تی بھی جلد آجائیں۔ تاکہ خاص و عام کو جا بجا جا سکیں۔

مہر : مناسب ہے۔ مگر اب کچھ ارشاد اس کے سوا بھی تو ہو۔

غالب : وہ کیا بھئی ؟

مہر : کچھ واردات قلبی ! کچھ کلام تازہ !!

غالب : میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ انہوں نے لکھ لیا۔

مہر : اُن کا تو گھر ہی لٹ گیا نا ؟۔

غالب : گھر لٹا ، ہزاروں روپے کا کتاب خانہ برباد ہوا۔ اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو ترستا ہوں ۔

مہر : پھر بھی کچھ تو حافظہ میں ہوگا۔

غالب : نہیں بھئی۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر، کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے وہ کاغذ مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔

مہر : غزل کون سی تھی۔

غالب: کیا کروگے ؟ سن لو۔ مرثیہ ہے مرثیہ۔

مہر: پھر عطا ہو۔

غالب: تو یوں سنو۔ مگر شرط یہ ہے کہ رونا نہیں۔ گریہ نہ کرنا۔ عتاب نہ نازل کرنا۔ صبر و شکر سے سننا۔ اور مرضی مولا کا اقرار کرنا۔

غزل یہ ہے۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا ∴ میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ∴ اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے ∴ لے کے دل دلستاں نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ∴ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما ∴ کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ∴ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ∴ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ∴ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

مہر: سبحان اللہ۔ کیا مرصع غزل ہے۔ لیکن مجھ پر عمدہ طنز ہے۔ کیا اور بھی کلام یاد تھا اُسے ؟

غالب: یہ دو شعر خصوصیت سے سنائے تھے۔

ع کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

مہر: اور دوسرا ؟

غالب: (پڑھتے ہیں) ع

دلا، یہ درد و الم ہے تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہ نیم شبی ہے

مہر: خوب، خوب۔ مرزا صاحب: "سحر ہوگی" "خبر ہوگی" کی زمین کا کوئی شعر حافظے میں ہے۔ ؟

غالب: (یاد کرتے ہوئے) ایک شعر سن لو۔

ع تمہارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمہیں رکھوں، تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

مہر: واہ خوب، خوب۔ اُردو کا کیا اچھا اسلوب ہے۔ اور کچھ ؟

غالب: ہاں یاد آیا۔ "کیا کہیے" "بھلا کہیے" کی زمین میں یہاں ایک بار طرح ہوئی تھی مگر بحر اور ہی تھی۔ کچھ شعر سن لو۔ یہی یاد ہیں۔

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے ∴ تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے ∴ کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ ∴ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

مہر: سبحان اللہ۔ خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔

غالب: یہ تم نے کیا کہا ؟ میرا امام گواہ، خدا گواہ، دنیا والوں میں یہ میر کلو گواہ ہیں کہ تم برابر یاد آتے ہو اور شاید یہ شعر خاص تمہارے واسطے ہوا ہے۔

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہتا ہوں۔

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

تم نے اس وقت میرا دل دکھایا۔ سنتا تھا کہ بلکہ یقین تھا کہ مرزا حاتم علی مہر، طرح دار آدمی ہیں۔ اور تمہاری طرح داری کا ذکر "مغل جان" سے بھی سنا تھا۔

مہر: وہ کب ؟

غالب: جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھیں اور اُن میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا۔

مہر: آپ بھی تو اُن کے شیدا تھے ؟

غالب: (قطع کلام کر کے) ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ ربط تھا، اور اکثر "مغل" سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اُس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے تھے۔

مہر: (شرماتے ہوئے) شاعری اور حقیقت میں بُعد ہے۔

غالب: اب شرماؤ نہیں۔ بہرحال، تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ

قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا تھا ؟

مہر: وہ کیوں ؟

غالب: کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔

مہر: کبھی تو رشک آیا ہی ہوگا؟

غالب: ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھنی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ . . .

مہر: تو اب بھی کیا گیا ہے ؟

غالب: اب ؛ ارے جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔

مہر: نہ چھوڑتے، کس نے فرمائش کی تھی ؟

غالب: فرمائش کون کرتا۔ کہتا کون ؟ مگر یہ یاد رکھنا کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ہے۔ ملا۔ حافظ۔ بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا منہ پر داڑھی، سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اس دن سر منڈوایا، لاحول ولا قوۃ، کیا بک رہا ہوں۔

مہر: یہ خوب کہی۔ اور کچھ . . . .

غالب: ہاں اور اسی طرح کھانے میں اناج کھاتا ہی نہیں ہوں، آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے۔ شکر کرتا ہوں اور بس۔

مہر: وضع قطع کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر اناج نہ کھانا تو لاغری، کمزوری کو دعوت دینا ہے۔

غالب: ارے میاں۔ اب عمرِ رواں ہے، سیل رواں ہے۔ جو کچھ ہے بہت ہے۔ نہ مال، نہ دولت، نہ در، نہ گھر، یہ دُنیا سرا ہے اور وہاں کا سفر پیش راہ ہے۔

مہر: آپ نے اِن باتوں میں اپنی اور مغل جان کی رام کہانی اُڑا دی۔

غالب: میں نے گنوا دی یا تم اور کچھ سُننے کے خواہاں ہو؟

مہر: کچھ اور سے کیا مطلب ؟ میرا ان کا کوئی خاص واسطہ نہیں تھا۔ بس دور کی ملاقات تھی، مدارات نہ تھی۔

غالب: ہم سے نہ کہو منہ نہ کھلواؤ۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ "مغل .. نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار جو تم نے اس کے حسن و وصف میں لکھے تھے۔ تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے، مجھ کو دکھائے تھے۔

مہر: ارے یہاں تک رازِ درون بستہ کا انکشاف آپ پر ہو چکا ہے۔ میں نہ سمجھا تھا کہ "مغل جان" کو واقعی مجھ سے اتنی نفرت اور آپ سے الفت ہو جائے گی کہ وہ میرا نوشتہ بھی آپ کو دکھا دیں گی۔

غالب: ہوش کے ناخن لو۔ اس میں شرم کیسی۔ حجاب کیسا ؟

مہر: حجاب کی بات تو ہے۔

غالب: خیر انشاء اللہ تعالیٰ وہ دن بھی آ جائے گا کہ ہم تم باہم بیٹھیں گے اور باتیں کریں گے۔ قلم بے کار ہو چکا ہوگا۔ ہاتھ بھی قلم ہو چکا ہوگا۔ بس زبان بر سرِ گفتار آئے گی۔

مہر: مرزا صاحب۔ اب یہ سب نہ ہوگا۔ آپ ہی نے تو کہا تھا۔

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

اب یہاں کیا دھرا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ یہ فکر غلط ہے۔ اگرچہ کچھ ہے تو بدیں نمط ہے۔ بس یہی میرا جواب ہے۔

غالب: ایں۔ کیا ناراض ہو گئے ؟ بھئی میں تو تمہارے استاد اور اپنے دوست صادق الورا ناسخ مرحوم کا ہم خیال ہوں اور اس شعر کا مبلغ۔

خدا سے میں بھی چاہوں از رہ مہر
فروغ میرزا حاتم علی مہر

مہر: وہ بہار اب خزاں رسیدہ ہو گئی، نہ عشق رہا، نہ محبوب، اب تو صرف غمِ عشق باقی رہ گیا ہے۔

غالب: (حیران ہو کر) تم کیا کہنا چاہتے ہو، متوحش نہ کرو۔

مہر: حیرت ہے بیں یوسف علی خاں عزیز نے نامۂ غم افزا آپ کو

روانہ کراچکا ہوں۔ پھر یہ بے تعلقی ؟

لب : کیسا نامۂ غم افزا بھائی ؟ میں قطعی لاعلم ہوں۔

مہر : مغل جان سے گفتگو اور باہم اختلاط کا وقت ختم ہو چکا۔ وہ اس دُنیا میں نہ رہی۔

لب : ہائے یہ کب ؟ سانحہ۔ شہر آشوب۔ حادثہ۔ واقعہ فاجعہ۔

مہر : اس لئے تو میں نے حسرت تقیر کا شعر پڑھا تھا۔ مغل جان مری اور میرے گھر مری۔

لب : واللہ۔ اس سانحہ سے میں لاعلم تھا۔ یوسف علی خاں نے میرے سامنے اس کا اور تمہارا معاملہ بیان ضرور کیا تھا مگر وہ اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت کی داستان تھی۔ سخت اور رنج کمال ہوا۔

مہر : صرف رنج ہی نہیں۔ دل کی دُنیا کی تباہی بھی کہئے۔

لب : (سمجھانے کے انداز میں) خیر سنو صاحب۔ شعراء میں فردوسی فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے فردوسی ہو جائے اور فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری ہو جائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہوئے۔

مہر : مرزا صاحب میں نہ فردوسی ہوں۔ نہ حسن بصری۔ مجنوں تو بے ریا تھا۔

الب : یہ تمہاری نادانی ہے۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوق تمہارے گھر میں مری۔

مہر : اب جو چاہے کہئے۔

الب : تم بھی جو چاہو کہو۔ میں یہی کہوں گا کہ مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا تھا۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی۔ کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں۔ مغفرت کرے۔

مہر : (نظر ملاتے ہوئے) یہ کب کا قصہ ہے۔

غالب : چالیس بیالیس برس پہلے کا یہ واقعہ ہے۔ باآں کہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔ اس فن سے میں بے گانہ محض ہو گیا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔

مہر : میرا بھی یہی عقیدہ ہے۔

غالب : جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔ سعدی کا شعر ہے۔

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی
عشق محمدؐ بس است و آل محمدؐ

اللہ بس ماسویٰ ہوس

مہر : آپ کا فرمانا بجا، درست۔ مگر حضرت آپ ہی نے تو کہا تھا کہ۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

غالب : لیکن اب یہ شعر پڑھا کرو

یارب وہ نہ سمجھیں گے نہ سمجھیں ہیں میری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مہر : لیکن میں اب سوا اس کے کیا کہوں ؟ — کہ

مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

غالب : ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ۔ مزے اُڑاؤ۔ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔

مہر : کس میں یارا ہے جو آپ کا تتبع کرے۔

غالب : بھئی میرا تو اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے، جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ، اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی، منّا جان سہی۔

مہر : یہ تو بوالہوسوں کا شعار ہوا۔

غالب : بھائی سنو جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر

مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے، وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردین کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ۔

مہر: یہ خیالات آپ کو مبارک۔ آپ کا کیا۔ آپ کبھی غالب ہیں کبھی مغلوب۔

غالب: چہ معنی دارد؟

مہر: اور کیا۔ آپ نے علائی خاں کو نہیں لکھا تھا کہ "اپنا نام بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔"

غالب: (ہنس کر) بھائی۔ تم تو ہندی کی چندی نکالتے ہو۔ غالب کہو، مغلوب کہو، میں نے جو سوچا، کہا۔ جو خیال میں آیا، سُنا دیا۔ میں نے تو یہ بھی کہا تھا۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

مہر: خیر حضرت۔ میرا مدعا یہ نہ تھا۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ اُف پہر دن ہوئے آیا تھا۔ باتوں میں دوپہر ڈھل گئی اب اجازت مرحمت فرمایئے۔

غالب: اچھا۔ جاؤ۔ رخصت۔ نواب محمد علی خاں، عبدالوہاب، مرزا تفتہ، منشی عبداللطیف اور منشی شیو نراین جو جو ملے سب کو حسب ما وجب کرنا۔ دعا دینا، دعا کہنا اور دعا کی فرمائش کرنا۔ ●●

جواب طلب امور کے لیے مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجیے۔

بقیہ غالب کا انا

غالب ایک زندہ اور پائندہ شاعر ہے۔ اُس کی محرومیوں نے اس کے انا میں شدت اور کرب کا اضافہ کر دیا اور کبھی کبھی شاعری کو الہام کے درجے تک پہنچا دیا۔ اور وہ بے اختیار کہنے لگا۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

اُس کی نظروں میں معمولی شاعر یا کم ظرف افراد تو ایک طرف یہ کائنات کی کائنات ہیچ تھی جبھی تو اُس نے مستی میں جھوم کر یہ غزل کہی ہوگی جس کا مطلع ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

شعرالعجم میں سعدی کے باب میں ایک حکایت درج ہے۔

"ایک دفعہ لوگوں کی صحبت سے تنگ آکر بیت المقدس کے صحرا میں بادیہ نوردی شروع کی۔ اتفاق سے عیسائیوں نے پکڑ لیا اور طرابلس میں خندق کھودنے کے کام پر لگا دیا۔ بہت پریشان ہوئے مگر مجبور تھے۔ اتفاق سے ایک قدیم دوست اُدھر سے گزرا۔ پوچھا خیر ہے۔ فرمایا۔

ہمے گریختم از مردماں بہ کوہ و بہ دشت
کہ از خدائے نبودم بہ دیگرے پرداخت
قیاس کن کہ چہ حالت بود دریں ساعت
کہ با طویلۂ نامردم ببایدساخت

یعنی جو شخص آدمیوں سے بھاگتا پھرتا تھا جب جانوروں میں پھنس جائے تو اُس کی کیا حالت ہوگی۔"

یہی حال غالب کا تھا، وہ بھی جانوروں میں پھنس گیا تھا اگر ارد گرد آدمی تھے تو کثرت سے مردم آزار۔ اس لئے اس کی انانیت اس سے یہ لافانی شعر کہلوا گئی، جو اُس دور کی نہیں ہر دور کی تصویر ہے اور انا کی غیر مبہم مثال۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

بنگلہ شاعری پر غالب کا اثر

انل برن گنگولی

مرزا غالب ۱۸۲۷ء میں کلکتہ روانہ ہوئے۔ یہ سفر پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں تھا۔ اس سفر کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

غالب غالباً اُردو کے پہلے شاعر ہیں جس نے اس زمانے میں اتنا دُور دراز سفر کیا جب سفر کرنا واقعی ایک بے حد مشکل کام تھا۔ اس امر سے بھی اُن کی مہم جوئی اور اندازِ طبیعت کا پتہ چلتا تھا۔ پٹنہ سے انہوں نے کشتیوں کے ذریعے سفر کیا تھا اور پہلے مرشد آباد پہونچے۔ ۲ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ میں وارد ہوئے۔

کلکتہ اس زمانے میں کوئی بہت بڑا شہر نہیں تھا۔ شمالی اور مرکزی علاقے میں نئے نئے مکانات بن گئے تھے اور لوگ آکر بس رہے تھے۔ غالب نے شملہ بازار کے علاقے میں دس روپے کرائے پر ایک مکان لیا اور جلد ہی یہاں کے بعض اکابرین سے اُن کے تعلقات استوار ہو گئے۔

حیدر اور ٹیپو سلطان کے خاندان کے لوگ ٹالی گنج کے علاقے میں رہتے تھے اور اُن کے ارد گرد اُردو اور فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اس طرح راجہ رام موہن رائے اور اُن کے دوستوں کا بھی ایک حلقہ تھا جو اُردو اور فارسی کا اچھا مذاق رکھتا تھا۔ شمالی کلکتہ کے سودا بازار کے علاقے میں راجہ رادھو کانتو دیو بھی اپنے علمی مذاق کے لئے معروف تھے۔ جوڑا سنکو کا ٹیگور خاندان بھی اُردو اور فارسی کا شغف رکھتا تھا۔ اور مہاکوی رابندر ناتھ ٹیگور کے دادا دوارکا ناتھ ٹیگور اُردو اور فارسی کے بڑے اچھے عالم تھے اور انہوں نے اُردو میں شعر بھی کہے ہیں۔ قرینہ اغلب ہے کہ دوارکا ناتھ ٹیگور اور راجہ رام موہن رائے کی غالب سے ملاقاتیں ہوئی ہونگی۔ ان لوگوں کے علاوہ راجہ کالی کرشن ٹیگور، جگن ناتھ پرشاد ملک، ہری ہر دت، راجہ رام بوس، دوندر ناتھ ٹیگور، اور پیارے چند مترا بھی تھے۔ جو فارسی اور اُردو میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور باذوق لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ کلکتے میں غالب کو ایسے دوست اور قدر دان بھی ملے جن سے ساری زندگی کے لئے تعلقات قائم ہو گئے۔ ان لوگوں میں محمد علی طباطبائی، مولوی سراج الدین احمد، بشیر الدین، خواجہ فخر الدین اور عبدالغفور خاں نساخ قابلِ ذکر ہیں۔

یہیں غالب نے کلکتہ ڈلی پر اپنا ۱۲ شعر کا مشہور قطعہ کہا تھا جو "مرقع دلکشا" میں بھی شائع ہوا تھا۔ جس کے مؤلف مشہور مفکر راجندر لال مترا تھے۔

۱۸۳۷ء سے پہلے فارسی تقریباً سارے ہندوستان کی سرکاری

نیز تہذیبی زبان تھی۔ فارسی کے واسطے سے اردو تک رسائی آسان تھی اس لئے بنگال کے ایسے پڑھے لکھے خاندان جن کی مادری زبان بنگلہ تھی مگر جو فارسی سے واقف تھے مرزا غالب کے فارسی اور اردو کلام سے محظوظ ہو سکتے تھے لہٰذا مرزا غالب کے افکار و خیالات نے بنگلہ زبان کے بعض شاعروں کو متاثر کیا۔ ایسے شعراء میں انیسویں صدی کے دو شاعر سب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایشور چندر گپتا اور دوسرے کرشن چندر مجمدار ہیں۔

ایشور چندر گپتا اپنی نوجوانی کے زمانے میں مرزا غالب سے بھی مل چکے تھے اور ان کی شعر و سخن کی محفلوں میں شریک بھی ہوتے رہتے تھے۔ بنگلہ ادب میں انہیں "گپتا کافی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے خصوصی طور پر غالب کے طرزِ اظہار کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ایک مشہور نظم جس کا پہلا مصرع ہے۔ "بیبیاں تولی (چل) جان، لب جان کری" ان کا یہ تجربہ بنگلہ ادب میں کافی مشہور رہا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک بنگلہ شاعری روایات کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ایشور گپتا پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ان روایات کو توڑا اور بنگلہ شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ انہوں نے ایسے ان گنت اشعار اور بہت سی ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں غالب کی شوخی اور ظرافت ہے اس کے علاوہ انہوں نے غالب کے بہت سے اشعار کا بنگلہ میں ترجمہ کیا ہے۔

کرشن چندر مجمدار نے زیادہ تر غالب کی فارسی شاعری سے استفادہ کیا ہے۔ مجمدار کا ایک شعری مجموعہ ہے جس کا نام "سد بھاباستک" ہے۔ اس مجموعے میں جو کلام شامل ہے اس پر غالب کی فارسی شاعری کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ انہوں نے غالب کے بہت سے فارسی اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔

غالب ٹیہاکوی رابندر ناتھ ٹیگور کے محبوب شاعر تھے۔ ان کے والد اور دادا غالب سے مل چکے تھے ٹیگور کی ایک نظم کا عنوان "ہوری کھیلا" ہے۔ اس نظم پر غالب کے اسٹائل کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ ٹیگور نے ایسے بہت سے شعر لکھے ہیں جن میں غالب کی شوخی اور ظرافت ہے۔ اس طرح کے اشعار ان کے مجموعۂ کلام "گیتکا" میں شامل ہیں۔

زندہ شاعروں میں قاضی نذرالاسلام کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی شاعری کے بہت سے علائم اور استعارے کو بنگلہ شاعری میں متعارف کیا ہے اور انہوں نے پہلی بار اردو فارسی کی ہیئت کو بنگلہ میں روشناس کرایا ہے۔

نذرل کی شاعری میں جا بجا غالب کا تفکر، گہرائی اور وسیع مشاہدہ نظر آتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کا منتخب کلام بنگلہ میں شائع کیا جائے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو یہ کام حسن و خوبی سے انجام دے سکیں۔ صحیح معنوں میں غالب کی قدر یہی ہوگی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ بڑے حلقے میں روشناس کرایا جائے۔ ●●

غزل

انیس امام

(نذرِ غالب)

خود ہی عنوانِ وفا ہیں خود ہی اک افسانہ ہم ✽ داد چاہیں بھی تو کس سے اے دلِ دیوانہ ہم
قیدِ ہستی سے نہیں رکھتے کبھی یارانہ ہم ✽ بزمِ امکاں میں ہیں مثلِ شعلۂ کاشانہ ہم
کیا کریں اے دوستو ذکرِ مے و میخانہ ہم ✽ بھر رہے ہیں خونِ دل سے عمر کا پیمانہ ہم
دوریٔ منزل سے گھبراتے نہیں اہلِ جنوں ✽ آبلوں کو جانتے ہیں راہ کا نذرانہ ہم
تیرگی اک رہگزارِ منزلِ انوار ہے ✽ رات سے رکھتے نہیں اس کے سوا یارانہ ہم
آسماں کیا ہے بجز اک پردۂ ذاتِ ازل ✽ اوج پر ہیں صورتِ خاکِ پرِ پروانہ ہم
[illegible] ساکنانِ دہر کی جاتی نہیں ✽ تیغِ قاتل سے کبھی الجھے نہ بیباکانہ ہم
دردِ تنہائی کا شکوہ کیا کریں اپنوں سے بھی ✽ اپنی یکتائی کے باعث ہو گئے بیگانہ ہم

قرض پر دار و مدارِ زندگی ٹھہرا انیس
اس فقیری میں کریں کیا عزۂ شاہانہ ہم

شیش محل

بدیع الزماں

ٹرین کے رکنے پر بلرام نے ایک ہاتھ میں رسّی سے بندھا ہوا بستر سنبھالا اور دوسرے ہاتھ میں ٹین کا بکس۔ بستر کی رسّی سے ٹین کا ایک اور ڈبہ لٹک رہا تھا۔ اس کی بیوی کے دونوں ہاتھ بھی پھنسے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں گھی کا لوٹا تھا جو ایک موٹے کپڑے میں بندھا ہوا تھا، دوسرے ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھری تھی جس میں باندھ کر وہ اپنے کپڑے لتّے لائی تھی۔ ڈبے میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ ہر آدمی سب سے پہلے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دھکم دھکا میں بلرام کی بیوی کے ہاتھ سے گھی کا لوٹا چھوٹ کر گر پڑا۔

بلرام نے بڑی مشکل سے بستر کی رسّی کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسایا۔ بڑھ کر گھی کا لوٹا اٹھایا۔ لوٹا بیوی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا ــــ "کہہ رہے تھے اتنا سامان ساتھ نہ لو۔ بیٹے کے گھر ہی تو جا رہے ہیں۔ کوئی سمدھیانے تو جا نہیں رہے ہیں۔"

"ہو گیا کہتی۔ گھر سے آئے اور پوتوں کے لئے کچھ بھی نہیں لائے۔" بلرام کی بیوی نے جیسے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"وہ تو جاڑے کی وجہ سے گھی جم گیا تھا۔ ورنہ ابھی سارا گھی گو بہ ہو گیا ہوتا۔" بلرام بولا۔

پلیٹ فارم سے اتر کر بلرام نے اپنا بستر اور ٹین کا بکس زمین پر رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اسٹیشن کا ایک جائزہ لیا۔ ہر طرف لوگوں کی ریل پیل دکھائی دے رہی تھی۔ بجلی کی روشنی میں اسٹیشن قیمتی نگینوں کی طرح جگمگا رہا تھا۔ سچ مچ دلّی کا اسٹیشن بہت بڑا ہے۔ اتنی بھیڑ تو کیول جنکشن پر بھی نہیں ہوتی۔ ہاں ہاوڑہ کا اسٹیشن دلّی سے بھی بڑا ہوگا۔ بلرام کو برسوں پرانی بات یاد آگئی۔ تب انل کتنا چھوٹا تھا۔ اس کا پیٹ خراب رہتا تھا۔ لکھی سرائے سے لے کر پٹنہ تک کے ڈاکٹروں کو دکھا چکا تھا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ لوگوں نے صلاح دی کہ کلکتے لے جاؤ۔ وہاں بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ اس طرح انل کو لے کر وہ کلکتے پہنچا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹر کی دوا سے انل بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں انل کی کتنی ہی تصویریں دبی پڑی تھیں۔ کلکتے کا خیال آتے ہی ایک جانی پہچانی تصویر ابھر کر سامنے آگئی۔

اس کی بیوی ایک ہاتھ میں گٹھری اور دوسرے ہاتھ میں گھی کا لوٹا لئے اس کا منہ تک رہی تھی۔

"انل کے گھر کیسے چلیں گے" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"چلو چلتے ہیں۔" بلرام جیسے چونک کر بولا

اس نے بستر اور ٹین کا بکس دونوں ہاتھوں میں سنبھالا اور آگے چلنے لگا۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر بلرام نے ایک قلی سے پوچھا ــــ "بھائی ونے نگر جانے کے لئے اس وقت کون بس چلے گی؟" قلی نے اسے غور سے دیکھ کر جواب دیا ــــ "معلوم ہوتا ہے پہلی بار یہاں آئے ہو۔ بھور میں بس کہاں ملتی ہے۔ ٹیکسی کر لو یا اسکوٹر۔ اسکوٹر میں پیسے کم لگیں گے۔" قلی یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

بلرام سوچنے لگا۔ اچھا ہوتا انل کو پہلے سے خبر کر دیتے۔ وہ اسٹیشن آجاتا تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن دلی آنے کا فیصلہ بھی تو یکایک کیا تھا اُس نے۔ انل کو دلی میں رہتے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ وہ بار بار دلی آنے کو لکھتا بھی تھا لیکن کہاں ملکی سرائے اور کہاں دلی۔ یہ بھی سوچا تھا کہ اچانک انل کے گھر پہونچے گا تو وہ اور بھی زیادہ خوش ہو جائے گا۔ دلی آنے کا خیال اچانک ہی دل میں آیا۔ ڈاک گھر کے بڑے بابو کا سالا پچھلے سال ۲۶ جنوری کے موقع پر دلی گیا تھا۔ اس نے ۲۶ جنوری کی دھوم دھام اور تزک بھڑک کی بہت تعریف کی تھی۔

اس روز وہ ملا تو کہنے لگا " بلرام بابو، اس بار ۲۶ جنوری جاکر ضرور دیکھئے۔ آپ کا لڑکا تو دلی میں رہتا ہے۔ آپ کو کس بات کی تکلیف ہوگی؟"

انل نے بھی چھبیس جنوری کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی تھیں کس طرح راشٹرپتی فوج کی سلامی لیتے ہیں۔ ہوائی جہاز بالکل سر کے پاس سے اُڑتے ہوئے گزرتے ہیں۔ کس طرح ہوائی جہاز اپنے رنگین دھوئیں سے ترنگے جھنڈے بناتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اس روز دلی دلہن کی طرح سجتی ہے۔ لوگ دُور دور سے چھبیس جنوری دیکھنے کو نکلتے ہیں۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ چھبیس جنوری دیکھنے ضرور جائے گا۔ انل کو دیکھ بھی لے گا۔ اس سے ملے ہوئے تو دو برس ہو چکے تھے۔ دوسرے روز وہ اپنی بیوی کے ساتھ دلی کی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

سڑک کے اس پار ٹیکسیاں اور اسکوٹر رکشے کھڑے تھے۔ ایک اسکوٹر رکشے والے کے پاس پہونچ کر اس نے پوچھا — " ونے نگر چلو گے؟"

چلوں گا کیوں نہیں۔ پانچ روپے لگیں گے۔"

پانچ روپے کی بات سُن کر بلرام کچھ چونکا۔ انل نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ دلی میں ٹیکسی اور اسکوٹر رکشے کا کرایہ میٹر کے حساب سے دیا جاتا ہے۔

" تمہارے اسکوٹر میں میٹر نہیں ہے کیا؟" اس نے پوچھا

" میٹر خراب ہو گیا ہے۔ میٹر میں بھی اس سے کم نہیں بنتے۔"

بلرام نے سوچا کہ اب بحث کرنا بے کار ہے لیکن اسے یقین تھا کہ پانچ روپے بہت زیادہ ہیں۔ اتنے روپے میں تو ستر اسّی میل کا سفر کیا جا سکتا ہے۔

بلرام اور اُس کی بیوی اسکوٹر رکشے میں بیٹھ گئے۔

جب وہ انل کے گھر پہونچے تو ابھی پوری طرح سویرا نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی ایک طرح کے کوارٹروں کی قطاریں دھندلکے سے آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

انل اور اس کے بچے ابھی سو رہے تھے۔ دستک کی آواز سے انل کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھ کر چونک اٹھا۔

" ارے بابو جی آپ! کوئی چٹھی بھی نہیں لکھی " اس نے بلرام اور پھر ماں کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔

- چٹھی لکھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ یکایک ہی سوچا کہ دلّی چلنا ہے۔"

انل نے اپنے پتا کو غور سے دیکھا۔ ان کا لباس اور پہناوا بالکل ویسا ہی تو تھا جیسا وہ ہمیشہ دیکھتا آیا تھا۔ دھوتی اور قمیص اور اس کے اوپر کمر تک کا کھلے کالر کا کوٹ۔ انل کی نگاہیں ماضی کے لیے دُور تک پھیلے ہوئے راستے پر پھیلتی ہوئی چلی گئیں۔ بلرام اسے ہر جگہ اسی لباس میں کھڑا دکھائی دیا۔ پھر بھی انل کو عجیب سا لگا جو بات بلرام کے لیے اس قدر فطری تھی۔ وہی بات اسے کچھ غیر فطری اور بے موقع سی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ بالکنی میں گیا۔ نیچے جھانک کر دیکھا تھا تو ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ دھندلکے کی ایک پرت ابھی کوارٹروں پر چڑھی ہوئی تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ اور دن کی کہاگہمی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور کمرے کے اندر آ گیا۔

بلرام اور اس کی بیوی اب تک کھڑے تھے۔ دونوں کمرے کی ہر چیز کو حیرت سے اور خوش ہو ہو کر دیکھ رہے تھے۔ سرمئی رنگ کا صوفہ سیٹ اور اسی رنگ کی دری فرش پر بچھی ہوئی تھی۔ بیچ میں چمکتی ہوئی شیشے کی میز۔ کمرے کے دو کونوں میں لال رنگ کے گدّے منڈھے ہوئے موڑھے۔ دیوار پر خوبصورت سی گھڑی لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف دیوار سے لگی ہوئی کھانے کی لمبی میز تھی جس پر سفید پلاسٹک کا کور پڑا تھا۔ میز کے تینوں طرف چھوٹی چھوٹی بغیر بازو والی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایسا سجا ہوا کمرہ ملکی سرائے میں شاید ہی کسی کے یہاں ہو۔ بلرام کے دل میں غرور کی ایک ترنگ اٹھی

زندگی بھر وہ جو سپنا دیکھتا آیا تھا۔ وہ ایسی ہی زندگی کا سپنا تو تھا۔ اس کا انل سچ مچ بڑی شاندار زندگی گزار رہا ہے۔

" بابوجی بیٹھئے نا" آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں ؟" انل نے کہا

بلرام صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ہی اس کی بیوی بھی بیٹھ گئی۔ ماں کے ہاتھ میں لوٹا دیکھ کر انل نے پوچھا۔

" اس میں کیا ہے ماں ؟" لائیے میں اسے رکھ دوں ۔"

" تھوڑا سا خالص گھی لائی ہوں تم لوگوں کے لئے۔ رام پیاری گوالن تو تجھے یاد ہوگی نا۔ وہی جو روز دودھ لے کر آتی ہے۔ اسی سے منگوایا تھا تجھے بہت یاد کرتی ہے۔ ہمیشہ پوچھتی ہے تیرے بارے میں ۔"

" اور اس میں تھوڑے سے پیٹھے ہیں بچوں کے لئے" " بلرام کی بیوی نے بستر کی رسّی میں بندھے ہوئے ڈبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" اچھا !! اچھا !" انل نے مسکراتے ہوئے اور بستر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ بابوجی سفر کے لئے ایک ہولڈال رکھنا اچھا رہتا ہے۔ بستر گندا نہیں ہوتا۔"

" ہاں بیٹا تو ٹھیک کہتا ہے۔ پھر ہولڈال خریدنے کا وقت ہی نہیں ملا"

" گھر کا سب حال تو ٹھیک ہے نا ؟" انل نے پوچھا۔

" ہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ محلے سرائے میں لوگ تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ اپنے بڑے بابو ہیں نا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان کا ایک بھتیجا بی۔ اے پاس ہے۔ اس کی نوکری کے لئے کہا ہے۔"

" جو ہو سکے گا کروں گا۔ پر نوکری کا معاملہ آج کل بہت ٹیڑھا ہے اور دلّی میں ڈیڑھ دو سو روپے کی نوکری سے کام بھی کیا بنے گا" انل نے معمولی دلچسپی دکھاتے ہوئے کہا۔

" لائیے میں بستر اور بکس برآمدے میں رکھ دوں ۔ ڈرائینگ روم میں یہ چیزیں اچھی نہیں لگتیں ۔" یہ کہتے ہوئے انل بستر اور بکس اٹھاکر کمرے کے باہر چلا گیا۔

بلرام سوچنے لگا۔ انل ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ اس کا میلا کچیلا بستر اور ٹین کا پرانا بکس اس کمرے میں ویسا ہی لگتا ہے۔ جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ انل ماں کے ہاتھ سے گھی کا لوٹا لے جانا بھول گیا تھا۔ وہ اب تک لوٹے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی تھی۔

" اسے بھی برامدے میں لے جاکر رکھ دو نا" بلرام نے کہا۔

" ہوا آئے گی تو لے جائے گی " وہ بولی۔

بلرام چپ ہو گیا۔

انل ابھی لوٹا نہیں تھا۔ شاید وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کی بیوی شاید جاگ گئی تھی کیونکہ دوسرے کمرے سے کھسر پھسر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

بلرام کو اب کمرے کے ماحول میں نئے پن کے ساتھ ساتھ اجنبی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ سامنے دو تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں ایک میں انل اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ چھوٹا بچہ انل کی گود میں تھا اس کی شکل انل سے بہت ملتی تھی۔ بلرام کو لگا جیسے وہ خود انل کو گود میں لئے کھڑا ہے۔ ننھا انل اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اس نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔

" دیکھو انل کی ماں۔ بچپن میں انل ایسا ہی لگتا تھا نا "

" ایک دم انل لگتا ہے " اس کی بیوی نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دوسری تصویر میں انل کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ یہ شاید دفتر کا گروپ فوٹو تھا ۔ بائیں طرف دیوار پر انل کے سسر کی تصویر ٹنگی تھی۔ داہنی طرف کی دیوار میں بیچ میں ایک اور تصویر تھی جس میں طوفان زدہ سمندر کا منظر دکھایا گیا تھا اور پس منظر میں پہاڑوں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا سب تصویریں دیکھ لینے کے بعد بلرام کو ایک کمی کا احساس ہوا۔ اس کی یا اس کی پتنی کی وہاں کوئی تصویر نہیں تھی۔ اس احساس نے کمرے کے اجنبی پن کو اور بڑھا دیا۔ انل کا اب تک پتہ نہیں تھا۔ اس نے اٹھ کر بالکنی کا دروازہ کھولا اور وہاں کھڑا ہو کر باہر کی طرف دیکھنے لگا سامنے کوارٹروں میں ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ سڑک پر بچے کتابوں کا تھیلا گلے میں لٹکائے اسکول جا رہے تھے۔ بلرام کے من میں پھر اسکول جاتا ہوا بالک انل سر اٹھانے

انل کی تعلیم کے لیئے اس نے کتنی مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ زندگی کا سارا
لکہ بچا ورکر کے ہی وہ انل کو اس قابل بنا سکا ہے۔ اُسے گجا دھر بابو
بات یاد آگئی۔ انل نے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا۔ گجا دھر بابو اُس
ت پوسٹ ماسٹر تھے اور اُسے بہت عزیز رکھتے تھے ایک گجا دھر بابو
ا جو بھی پوسٹ ماسٹر آتا اُسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ گجا دھر بابو نے
ا تھا۔ " انل نے مڈل پاس کر لیا ہے۔ اُسے پوسٹ مین بنوائے دیتا
وں" بلرام کو گجا دھر بابو کی یہ بات بہت بُری لگی تھی۔ وہ تو انل کو
ونچی سے اونچی تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ خواہ اس میں اسے کتنی ہی مصیبتوں
اسامنا کرنا پڑے۔ اس نے گجا دھر بابو کو جواب دیا تھا۔ " بڑے
ابو میں انل کو اونچی تعلیم دلوانا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ بھی میری
لرح چٹھیاں بانٹ کر گزارہ کرے۔"

" تمہارا تو دماغ خراب ہے میں تو تمہارے ہی بھلے کے لیئے
ہتا تھا" گجا دھر بابو ہنس کر بولے تھے۔

بالکنی میں کھڑے کھڑے اُسے کتنی پرانی بات یاد آئی تھی۔
وقت کا پہیہ کتنی تیزی سے آگے بڑھ چکا تھا۔ پیچھے چھوٹا ہوا راستہ
جس کے ایک سرے پر اس کا دو کوٹھریوں والا کھپریل مکان تھا لالٹین
کی ٹمٹماتی مٹیالی روشنی تھی اور اس روشنی میں کتابوں سے الجھتا ہوا
اُس کا انل تھا۔ اور دوسرے سرے پر انل کا شاندار فلیٹ تھا جہاں
وہ خود اپنے گوشت پوست کے ساتھ کھڑا تھا۔ اگر اُس دن اس نے
گجا دھر بابو کی بات مان لی ہوتی تو کیا آج انل اتنا بڑا افسر بن سکتا
تھا۔ اب جو لوگ اس کی اتنی عزت کرتے ہیں کیا یہ عزت اُسے تب
حاصل ہو سکتی تھی۔ گجا دھر بابو نے خود کتنی بڑی بھول کی۔ اُن کے لڑکے
نے جب میٹرک پاس کیا تو آگے پڑھانے کے بجائے اُسے پوسٹ
آفس میں کلرک رکھوا دیا۔ باپ بیٹے دونوں نکھی سرائے میں فرد،
رہتے ہیں۔ انل اس سے بچھڑ سا گیا ہے لیکن یہ سکھ کیا کم ہے کہ اُس
کا بیٹا ایک بڑا افسر ہے۔

" بابو جی آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ اندر بیٹھئے نا۔ بالکنی
میں اس طرح کھڑا ہونا اچھا نہیں لگتا۔" انل بالکنی میں آ کر کہہ رہا تھا۔

بلرام نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ اُس کا بالکنی
میں کھڑا ہونا کس طرح ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

وہ اندر آگیا۔ انل نے جھٹ سے بالکنی کا دروازہ بند کر دیا۔
اور کہنے لگا۔

" بابو جی آپ تھک گئے ہوں گے۔ نہا لیجئے۔ ایک بات یہ ہے
بابو جی کہ آپ کا یہ کوٹ یہاں اچھا نہیں لگتا۔ آپ کوٹ کی جگہ
اونی چادر اوڑھ لیں تو زیادہ اچھا ہو۔ میں اپنی اونی چادر دے دیتا
ہوں۔"

بلرام کو دھکا سا لگا۔ وہ جس لباس کو پچھلے چالیس سال سے
پہنتا آیا ہے، وہ کبھی اعتراض کا سبب بھی بن سکتا ہے، یہ خیال اُس
کے دل میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اُسے زیادہ دکھ اس بات پر ہو رہا تھا
کہ خود اس کا بیٹا اس کے لباس پر اعتراض کر رہا تھا اسے یکایک
محسوس ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کے گھر نہیں آیا ہے بلکہ کسی ایسی جگہ پہنچ
گیا ہے جہاں کی ہر چیز اس کے لیے نئی اور اجنبی ہے۔ لیکن اس نے
اس احساس کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا۔ انل شاید ٹھیک ہی
کہتا ہو۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ گھر بیٹے کا ہی سہی لیکن اس کے
طور طریقوں کا لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا۔

اسی عرصہ میں انل نے ایک اونی چادر لا کر اس کے پاس رکھ
دی تھی۔ انل کی بیوی بھی اب کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے ساس
سسر کے پاؤں چھو کر پرنام کیا اور دروازے سے لگ کر
کھڑی ہو گئی۔

بلرام یہ محسوس کیئے بغیر نہ رہ سکا کہ اُس کی بہو میں بھی اب
تبدیلی آچکی ہے۔ پہلے جب کبھی اس کے پاس آتی تو گھونگھٹ ضرور
نکالتی تھی لیکن اس بار اس نے ایسا نہیں کیا۔

یکایک بلرام کی نظر انل کے بڑے لڑکے پر پڑی جو ماں کے
پیچھے کھڑا خاموشی سے نئے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا۔

" ارے یہ گلو ہے! اتنا بڑا ہو گیا۔" بلرام نے بڑھ کر اُسے
گود میں لینا چاہا لیکن وہ اپنی ماں سے چمٹ گیا۔

"ارے یہ تیرے بابا ہیں نا۔ تو بھول گیا؟" انل بولا۔

بلرام کو وہ بچپن میں بابا ہی کہتا تھا۔ دو سال پہلے جب انل دو ماہ کی رخصت لے کر گھر گیا تھا تو وہ اپنے دادا سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ رات میں وہ اس کے ساتھ ہی سوتا تھا۔ لیکن دو سال کے عرصہ میں وہ اسے بالکل بھول چکا تھا۔

اب بلرام کی بیوی گلّو کو اس کی ماں سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اس کا کندھا پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"آجا بیٹے۔ دیکھ میں تیرے لئے کتنی چیزیں لائی ہوں۔ لیکن گلّو کسی طرح اس کے پاس آنے کو تیار نہیں ہو رہا تھا۔ دادی نے اپنی طرف اسے زور سے کھینچنا چاہا تو وہ چلا اٹھا۔

"تمہارے ہاتھ میں کوئلے کا چورا لگا ہوا ہے۔ ہمارے ہاتھ گندے ہو جائیں گے۔"

بلرام کی بیوی کا ہاتھ اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ انل اور اس کی بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بلرام بھی ہنسنے لگا۔ گلّو نے بات تو ٹھیک ہی کہی تھی۔ اس کے اور اس کی بیوی کے ہاتھ اور کپڑے انجن کے دھوئیں اور کوئلے کی سیاہی سے اَٹے ہوئے تھے لیکن ہنستے ہوئے بھی اسے اپنی ہنسی کہیں سے کھوکھلی اور بے موقع محسوس ہوئی۔

"آپ لوگ اب نہا لیجئے یا ہاتھ منہ دھو لیجئے اتنے میں چائے تیار ہو جاتی ہے۔" انل نے کہا۔

بلرام اٹھ کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کمرے دو ہی ہیں لیکن ہر چیز صاف ستھری اور چمکتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

چائے کے دوران ۲۶ جنوری کا ذکر بھی چھڑ گیا انل نے بتایا کہ پاس کے بغیر بہت دقت ہوتی ہے۔ پہلے سے اسے معلوم ہوتا تو وہ پاس حاصل کرنے کی کوشش کرتا لیکن اتنے کم وقت میں اب یہ ممکن نہ تھا۔ بلرام کو یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ اس کا بیٹا افسر ضرور ہے لیکن وہ اتنا بڑا افسر نہیں ہے کہ ۲۶ جنوری کا پاس اسے مل سکے۔

چائے کے بعد انل دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ برآمدے میں ایک پلنگ بچھا دیا گیا تھا۔ بلرام کی بیوی اس پر جا کر لیٹ گئی۔

بلرام بہت دیر تک بیٹھا کمرے کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا رہا۔ اکتاہٹ کا احساس اس پر حاوی ہونے لگا تھا۔ اس نے سوچا کچھ دیر آس پاس گھوم لیا جائے۔

اس نے اٹھ کر باہر کا دروازہ کھولا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ باہر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کوارٹر کے سامنے کا میدان بالکل سنسان پڑا تھا۔ میدان کے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ کچھ دوری پر خاصہ بڑا بازار تھا۔

وہ بازار میں بہت دیر تک گھومتا رہا وہاں سے لوٹا تو دیکھا کہ نیچے کے کوارٹر کے برآمدے میں ایک بوڑھا آدمی کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ بلرام کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور پاس کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا — "آپ انل بابو کے یہاں آیا ہے نا؟"

"جی ہاں میں انل کا پتا ہوں۔"

"آپ انل بابو کا پتا ہے۔ بہت اچھا۔ انل بابو فرسٹ کلاس آدمی ہے۔ ہم اسے بہت چاہتا ہے۔ آپ بھی ریٹائر ہو گیا ہے میرا مافک؟"

"جی نہیں، میری نوکری ابھی دو سال اور ہے۔"

"آپ کس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہے؟"

"پوسٹ آفس میں"

"بہت اچھا، بہت اچھا۔ ہم ریلوے میں کام کرتا تھا۔ دونوں ڈیپارٹمنٹ ایک مافک ہے۔ آپ کیا کام کرتا ہے؟"

"میں پوسٹ مین ہوں"

"پوسٹ مین؟ پوسٹ مین؟ یعنی کہ چٹھی بانٹتا ہے آپ؟ بہت اچھا، بہت اچھا۔"

بوڑھا بنگالی یکایک چپ ہو گیا۔ بلرام کچھ دیر اس انتظار میں رہا کہ بات چیت آگے بڑھے گی۔ لیکن اسے خاموش دیکھ کر وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب جاتا ہے بہت اچھا۔ پھر ملے گا" بلرام کو کرسی سے اُٹھتے دیکھ کر وہ بولا۔

بلرام نے زینہ چڑھتے ہوئے دیکھا کہ نیچے کے کوارٹر کا دروازہ کھلا تھا اور اس کمرے میں بھی ویسا ہی صوفہ سیٹ رکھا تھا جیسا کہ انل کے کمرے میں تھا۔ اُسے انل کی بیوی اس وقت اسی کمرے میں بیٹھی دکھائی دی۔ اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ انل کی بیوی کی نگاہیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔

وہ اوپر پہونچا تو اس کی بیوی سو کر اُٹھ چکی تھی۔ کھانا کھا کر وہ بھی صوفے پر ایک چادر ڈال کر پڑ رہا۔ اور جب اٹھا تو شام ہو چکی تھی۔ اور انل دفتر سے آچکا تھا۔

رات کے کھانے پر انل بولا۔ "بابوجی آپ کے لئے پوسٹ مین کی نوکری کرنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک کیوں نہیں ہے ؟" بلرام نے چونک کر کہا: "اٹھاون سال کا ہونے میں ابھی تو دو سال رہتے ہیں۔ لوگ تو اس کے بعد بھی نوکری کرنا چاہتے ہیں۔"

آپ کی نوکری ایسی نہیں ہے بابوجی۔ گھر گھر گھوم کر آپ کا چھٹی بانٹنا اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا" ؟ کیا تجھے چھٹیاں بانٹنی پڑتی ہیں" بلرام کو غصہ آگیا تھا۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں بابوجی۔ نوکری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پنشن آپ کو ملے گی ہی۔ ہر مہینے میں بھی کچھ روپے بھیج دوں گا۔ آپ لوگ چاہیں تو یہاں بھی رہ سکتے ہیں"۔ انل کے لہجے میں بڑی عاجزی تھی۔

بلرام چپ ہو گیا انل کے عاجزی بھرے لہجے نے اس کے غصے کو جیسے ٹھنڈا کر دیا۔ گلو جو بہت دھیان سے دونوں کی بات چیت سن رہا تھا یکایک بول پڑا۔

"بابا پوسٹ مین، بابا پوسٹ مین، چھٹی بانٹتے ہیں" یہ کہہ کر وہ تالیاں بجانے لگا۔

"چپ بھی رہ سور" انل نے اُسے ڈانٹا۔

بلرام چپ بیٹھا رہا۔ اُسے یکایک کُن مَن کی یاد نے آگھیرا تھا — کُن مَن — اس کے پڑوسی کا پوتا۔ اس کی تنہائی کا ساتھی۔ سویرے جب وہ کھاٹ پر ہی ہوتا کن من اس کی چھاتی پر آدھمکتا۔ اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتا۔ اس کے گالوں پر اُگی ہوئی داڑھی کو چھو کر اپنی توتلی زبان میں کہتا —" دَدا والی گلے ہے"۔

کن من کتنا اُداس ہوگا۔ اپنے گھر والوں سے برابر پوچھتا ہوگا — ددا کب آئیں گے ؟"

رات میں لیٹے لیٹے بہت دیر تک بلرام سویرے سے شام تک کی باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ واقعات کا دھارا جیسے ایک ہی سمت بہہ رہا تھا ایسی سمت میں جو اس کی خواہش کے مطابق نہیں تھا تمام واقعات جیسے مل کر ایک درد بھری کہانی کا رُوپ لے رہے تھے سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر میں طوفان زدہ سمندر کی موجیں اُوپر اُٹھ رہی تھیں وہ بہت دیر تک سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں کو دیکھتا رہا اُسے لگا کہ وہ زندگی بھر طوفان کے تھپیڑوں سے گزرتا رہا ہے لیکن پہلے ہر تھپیڑے سے گزرتے ہوئے جیسے چاندی کا ایک چمکتا ہوا تارا اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ آج چمکتا ہوا وہ تارا کسی اونچے پہاڑ کی اوٹ میں چھپ گیا ہے اور وہ اندر سے خود کو لُٹا ہوا سا محسوس کر رہا ہے نامعلوم طریقے سے یہ احساس اس کی رُوح میں سرایت کرتا جا رہا تھا کہ انل کی دُنیا بالکل الگ تھی۔ وہ اس کی دُنیا کا حصہ نہیں تھی۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ بلرام نے اپنی بیوی سے کہا: "تمہیں برلا مندر اور لال قلعہ دکھا دوں۔"

انل بولا— بابوجی آپ دوپہر تک لوٹ آئیں گے نا۔ میں نے اپنے دوستوں کو چائے پر بلایا ہے۔ اُن سے آپ کو ملانا چاہتا"

"میرا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ آگیا تو مِل لوں گا۔ میرا انتظار نہ کر

(باقی ص ۳۹ پر)

اُردو کے چند

مسیحی شعراء



ڈی اے ہیریسن قربان

اُردو زبان کسی ایک مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی سب اس زبان کی ترقی و توسیع دینے اُس کے ادب کو سنوارنے اور مالا مال کرنے میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ زبان ہندوستان کے کسی ایک خطے میں محدود نہیں۔ بنگال سے بمبئی اور کشمیر سے کنیا کماری تک کی سرزمین نے اُردو شاعروں اور ادیبوں کو جنم دیا ہے اور اُن کی تخلیقات کی نقادوں اور سخن فہموں نے قدر دانی کی ہے۔ چنانچہ میدانِ سخن میں دیگر شعراء اور ادیبوں کے بدوش ہندی مسیحی شعراء اور ادیب بھی گامزن رہے ہیں۔ لیکن یہ ان کی بدقسمتی رہی کہ اہلِ ادب کی نظریں اُن کے کمال کی جانب متوجہ نہ ہو سکیں۔ حالانکہ تذکرہ نویسوں نے یورپین شعراء کے فن کا تو اعتراف کیا مگر ہندی مسیحی شعراء و ادیبوں کی طرف سے تغافل سے کام لیا۔

اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو شاید یہ کہ ہندی مسیحوں کے بارے میں اہلِ ادب اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ عیسائی اُردو زبان پر خاطر خواہ دسترس نہیں رکھتے۔ حضرت نادر مرحوم نے اوّل اوّل جب علامہ عشرت لکھنوی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ عیسائی اُردو نہیں جانتے (بحوالہ رسالہ زندگی دہلی جولائی ۱۹۶۳ء) کچھ اس قسم کے واقعات راقم الحروف کے ساتھ بھی پیش آ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مسیحی شعراء فنی صلاحیت رکھنے کے باوجود کاملانِ فن سے استفادہ نہ کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم ہند سے قبل نوّے فی صد مسیحی طلباء کی مادری زبان اُردو تھی۔ اُن کی مذہبی کتابیں، نمازیں، دعائیں، عبادتیں، رسومات سب اُردو زبان میں ادا کے جاتے رہے ہیں۔ دوسری جانب مسیحی جماعت میں عموماً ادبی ذوق کا فقدان رہا جس کے باعث مسیحی شعراء اور ادیبوں کی خاطر خواہ قدر دانی نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں احساس کمتری پیدا ہو گیا اور اس جذبے کے ماتحت انہوں نے منظرِ عام پر آنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس کو ایک خاص حلقے تک ہی محدود رکھا۔ اچھی استعداد رکھنے اور فن کار ہونے کے باوجود وہ مقامی مشاعروں تک سے دامن بچاتے رہے۔

ایک اور مشکل جو اُن کی راہ میں حائل رہی، یہ تھی کہ اُن کا موضوعِ سخن صرف مذہب اور مذہبیات کی حدود میں رہا۔ مثلاً توصیف حضرت عیسیٰ علیہ السلام، واقعات ولادت حضرت مسیح۔ توصیف حضرت بی بی مریم واقعات "مناظرِ صلیب اور صلیبی موت و قربانی۔ دوبارہ زندہ ہونا، عید قیامت وغیرہ۔ یہ موضوعات ایسے ہیں جن کو قبولیت عام کا شرف حاصل ہونا مشکل امر تھا حالانکہ اُردو ادب میں مذہبی شاعری کا فقدان نہیں رہا ہے۔ مذہبیات میں شاعر اپنے تخیلات اور زبان کے زور سے نئے نئے گل کھلا سکتا ہے۔ شاندار تخلیق کر سکتا ہے۔ مسیحی شعراء نے

ایک ہی مضمون کو نئے نئے ڈھنگ سے باندھا ہے لیکن انہوں نے کبھی محض مسیحی رسالوں سے آگے قدم نہیں بڑھایا جن کی اشاعت محدود تھی اور ادبی حلقوں میں اُن کی باریابی کا کوئی سلسلہ نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ مسیحی فن کاروں کو پبلشر نہ مل سکے۔ ان کا کلام اُن کی بیاضوں میں ہی دم توڑتا رہا۔ کوئی مسیحی شاعر صاحبِ دیوان نہ ہو سکا۔ بقول نادرؔ مرحوم میرا دیوان میرے ساتھ مر جائے گا اور اس طرح میں دہری موت مروں گا۔

اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کہ مسیحی شعراء اور ادیبوں کو ادبی حلقوں سے روشناس کرایا جائے اور اُن کی تخلیقات کی قدر کی جائے۔

ہم چند مسیحی شعراء کو روشناس کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

اشعار مسیحی رسالوں سے انتخاب کر کے ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں۔ اور قدر دانوں کو اُن کی جانب متوجہ ہونے کے لئے دعوتِ عمل دیتے ہیں کہ وہ گوشۂ گمنامی میں پڑے ان فنکاروں کو اہلِ ذوق کے سامنے پیش کریں جن شعراء کے حالات مجھے دستیاب ہو سکے انہیں اس مضمون میں شامل کیا گیا ہے۔

ابو الخیال جان البرٹ پال نادرؔ شاہجہاں پوری

۲۶ فروری ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ مختلف مقامات پر مدرس اور ہیڈ ماسٹری کے فرائض انجام دیئے۔ ابتدائے شعور سے طبیعت شعر و شاعری کی جانب راغب ہوئی اور شعر موزوں کرنے لگے۔ ابتداء میں فارسی میں شعر کہے اور پروفیسر الٰہی بخش صاحب قرنؔ نیازی سے اصلاح لی۔ بعد ازاں اردو میں طبع آزمائی کی اور خواجہ محمد عبد المعروف صاحب عشرتؔ لکھنوی کے ممتاز شاعروں میں شریک ہوئے۔ آپ نے ۱۲ مئی ۱۹۶۳ء کو انتقال کیا۔ آپ نے متعدد شاگرد چھوڑے ہیں۔

آپ کا کلام مسیحی اور غیر مسیحی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ کلام نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ غزلوں میں روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ زبان شگفتہ اور شستہ ہے۔ آپ کو ابو الخیال کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ مکمل دیوان موجود ہے لیکن بدقسمتی سے زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ ضرورت ہے کہ اس کو منظرِ عام پر لایا جائے۔

نمونہ کلام :۔

درد لا دو ندیمو اگر مل سکے ✢ کچھ تو دل کے لئے کچھ جگر کے لئے
منہ کھول کے کچھ مانگیں یہ کام نہیں کرتے ✢ ہم شانِ کریمی کو بدنام نہیں کرتے
لاکھ غمزے دکھلائے گی دُنیا ✢ ہاتھ تیرے نہ آئے گی دُنیا
جیتے جی اُٹھ سکا نہ اس در سے ✢ سر پہ احسان ہے ناتوانی کا
قدرداں ہی کوئی نہیں نادرؔ ✢ کیا نتیجہ گہر فشانی کا

۲- پادری اے۔ آر۔ بیلی شفاؔ لکھنوی

آپ ۱۸۸۶ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے یہ وہ وقت تھا کہ جب لکھنؤ میں گھر گھر شاعری کا چرچا تھا۔ چنانچہ آپ کو بھی شوق پیدا ہوا اور شعر کہنے لگے۔ ابتداء میں حضرت فلکؔ سے رجوع کیا بعد میں حضرت عطاؔ بدایونی، وسیمؔ خیرآبادی اور دلؔ شاہجہاں پوری سے فیض حاصل کیا۔ آخر میں جناب افضل علی خاں بہادر خلف حضرت رشیدؔ لکھنوی سے تلمذ حاصل ہوا اور استادی کا مرتبہ پایا۔ ریاست شیرکوٹ کی سرکار سے افسر الشعراء کا اعزاز عطا ہوا۔ نثر میں بھی قلم کا زور دکھایا۔ رسالہ دلیس، ہنکاری، اور روشنی کے ایڈیٹر رہے۔ کئی تصنیفات آپ کی یادگار ہیں۔ فغانِ ہند المعروف سیلابِ عظیم مثنوی خونِ ناحق، قوم کی فریاد، قصہ ہری درس منظوم اور چند ڈرامے غیر طبع ہیں۔

آپ کے شاگردوں میں وحشیؔ برنوی۔ ذاکرؔ میرٹھی، ناصرؔ ملکوانی وغیرہ اہم ہیں۔ آپ کے خلف رشید حضرت رضاؔ لکھنوی نے بھی اُستادی کا مرتبہ حاصل کیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو دہلی ریلوے اسٹیشن پر حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ آپ کی وفات پر متعدد شعراء نے عقیدت کے پھول چڑھائے۔

نمونۂ کلام

وہ کیوں نقاب کا گوشہ اٹھائے جاتے ہیں
کہ پائے ہوش میرے ڈگمگائے جاتے ہیں
جفا و جور کے ایام رنج آگیں کو
بھلا رہا ہوں مگر کب بھلائے جاتے ہیں

تیری صلیب ہے عیسیٰ کلید فطرت کی
تیری صلیب ہے آقا سبیل جنت کی

تیری صلیب ہے مولا شبیہ الفت کی
تیری صلیب ہے گویا دلیل رحمت کی

(۳) پادری ایس ایس ریحانی لکھنوی۔

۱۹۱۲ء میں مرکزِ شعر و سخن سرزمین لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آج کل حیدرآباد دکن میں قیام ہے۔ وہاں "زندگی کا نور" ادارے کے ڈائرکٹر ہیں۔ اُردو ادب پر عبور حاصل ہے اور فارسی ادب کا بھی گہرا مطالعہ ہے۔ آثر لکھنوی سے تلمذ ہے۔ کہنہ مشق شاعر ہیں اور خود اُستادی کا درجہ رکھتے ہیں۔



بیشتر کلام غزلیات کی صورت میں ہے ایک مجموعہ غزلیات "موجِ گل" شائع ہو چکا ہے جس کو ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ علاوہ ازیں دو گلدستے "رنگ زار" اور "نوائے ازل" مرتب کئے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں چند مسیحی شعراء کا منتخب کلام ہے۔

اُردو ادب کی خدمت ان کا مشغلہ ہے۔ مسیحی شعراء کو منظرِ عام پر لانے کے اور ادبی حلقوں میں اُن کو روشناس کرانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ آپ کا کلام نہایت صاف سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔ زبان میں لکھنؤ کی نزاکت اور گھلاوٹ ہے۔ بحریں مترنم اور رواں ہیں۔ لکھنؤ اسکول کی خصوصیات کلام میں نمایاں ہیں۔ طبیعت کو تصوف سے شغف ہے۔ میدانِ نثر کے بھی شہسوار ہیں۔

نمونۂ کلام: جو رنگ شیخ و برہمن قریب سے دیکھا
تو دُور سے حرم و دیر کو سلام کیا

ہماری خاک بھی اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئی
ہمیشہ آپ کے دامن کا احترام کیا

عزمِ منزل جب ہے دل میں
لب پر کیوں ہے رہبر رہبر

کافر نظر آیا نہ مسلماں نظر آیا
انساں میرے آئینہ میں انسان نظر آیا

ہیں سنگ و خشت ایک زمانے سے منتظر
تعمیر کر حیات کے عنواں نئے نئے

جوشِ عصیاں دریا دریا ؛ اشکِ ندامت گوہر گوہر

نہیں دشوار اے واعظ حرم کا راستہ ملنا
مگر انساں کے دل کا راستہ مشکل سے ملتا ہے

۴۔ ڈاکٹر سیموئیل وکٹر سمعن طالب شاہ آبادی

۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں شوقِ سخن پیدا ہوا اور جماعت ہشتم تک پہنچتے پہنچتے جولانیٔ طبع رنگ دکھلانے لگی۔ اُردو اور فارسی کے جید عالم ہیں۔ فارسی کی تعلیم ایران جاکر حاصل کی اور



طہران یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسلامیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور امریکہ میں ہارٹفرڈ یونیورسٹی سے اسلامیات میں ایم اے پاس کیا۔ اس وقت ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ایسوسی ایٹ ڈائرکٹر ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کا سہ ماہی مجلہ آپ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ہر قسم کے صنفِ شاعری میں طبیعت کی جولانی گل کھلاتی ہے۔ حضرت بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے خاص شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شعر نہایت بلیغ کہتے ہیں۔ زبان صاف اور شستہ

ہے۔ نثر نگاری میں یکتائے قلم ہیں

نمونۂ کلام: بت خانہ و کعبہ کے پابند ہیں فرزانے
ہر قید سے مذہب کی آزاد ہیں دیوانے
ٹوٹے ہوئے دل کیا ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے
کچھ عشق کی تفسیریں کچھ عشق کے افسانے
باغِ عدن میں ہے نہ وہ دشتِ ختن میں ہے
وہ بو جو ناصرت کے گلِ یاسمن میں ہے
اے ناصرت کے چاند اے مریم کے نورِ چشم
پوشیدہ آفتاب تیری ہر کرن میں ہے

(۵) سیموئیل ڈانیل شوق جالندھری

پنجاب کے موضع ستارپور میں پیدا ہوئے۔ اس مناسبت سے ابتداء میں نام کے آگے ستارپوری لکھتے تھے بعد میں شوق جالندھری لکھنے لگے۔ آج کل رائے پور (مدھیہ پردیش) میں مقیم ہیں۔ وہاں کاسٹس میموریل سنٹر میں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز ہیں۔ نہایت خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ کلام میں فصاحت و بلاغت ہے۔ بعض اشعار قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ مشاعروں میں بہت کامیاب رہتے ہیں۔ زبان میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ جناب شمیم کرہانی سے تلمذ ہے۔



دعا دیتے نہ گر جامِ شہادت پی کے دشمن کو
سرِ مقتل تیرے جانباز پہچانے کہاں جاتے
کب آکے ان کا تیر لگا جب رہا نہ خون
شرمندہ ہیں کہ خاطرِ مہماں نہ کر سکے
گونجے تو جہاں کیسے اناالحق کی صدا سے
منصور کوئی آج سرِ دار نہیں ہے
یہ مانا آج چھونے جا رہا ہے مہرِ تاباں کو
مگر انسان پہنچنے میں لگے گی دیر انساں کو
جاگ اٹھے نہ فتنۂ محشر
غم کے ماروں کو نیند آتی ہے

(۶) بیتاب ستارپوری

پنجاب کے موضع ستارپور کے رہنے والے ہیں۔ مسیحی جماعت کے بہت مقبول شاعر ہیں۔ حضرت محو جالندھری سے شرفِ تلمذ ہے۔ کلام نہایت پاکیزہ اور شستہ ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔ بائبل مقدس کے بعض حقائق کو بڑی حسن و خوبی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ایک مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے جس کا ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا۔

نمونۂ کلام: اس واسطے کہ زیست میں کچھ کشمکش ہے
ہم نے ہر ایک موج کو طوفاں بنا دیا
جو تو پیار کرتا نہ اہلِ جہاں کو ٭ جہاں کو تیرا نام پیارا نہ ہوتا
جامۂ انسانیت میں مجسم الفت سادگی
کون دیتا ایسا مشکل امتحاں تیرے بغیر
آ دیکھ میں ہوں حیرتِ آئینہ کا جواب
پتھرا گئی ہے آنکھ تیرے انتظار میں

(۷) عمانوئیل جوزف انور اجمیری

۳ دسمبر ۱۹۲۷ء بمقام اجمیر پیدا ہوئے۔ ذریعہ معاش ریلوے کی ملازمت ہے اور سابرمتی میں قیام ہے۔ زمانۂ طالب علمی سے شعر و سخن کا شوق ہوا اور طبع آزمائی کرنے لگے۔ اس طرح شاعری کی عمر بیس پچیس برس ہوتی ہے۔ موضوعِ سخن زیادہ تر نظمیں ہیں۔ غزلیں معیاری ہوتی ہیں۔

کلام میں روانی ہے۔ زبان صاف ہے۔ اکثر ہندی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں درد پایا جاتا ہے اور ناکامی و مایوسی جھلکتی ہے۔ شوق مطالعہ ہے اور اوقاتِ فرصت میں کتب بینی مشغلہ ہے۔

نمونہ کلام:- نینوں کے آنچل میں اپنی شردھا کے کچھ پھول چڑھائے
آج تمہاری یاد نے من میں چھپکے چھپکے دیپ جلائے
ظلمتِ شب سے بھی ہو سکتی ہے تاشیدِ سحر
کچھ اجالے بھی تہہ شام نکل سکتے ہیں
زندگی دھوپ چھاؤں میں کٹ بھی گئی
ناپتے رہ گئے ہم تو پرچھائیاں

(۸) ۔ی۔ اے۔ میرین قرباںؔ

راقم الحروف ۱۲ مارچ ۱۹۱۹ء میں ضلع مرادآباد میں پیدا ہوا۔ زمانہ طالب علمی سے شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا اور مقامی مشاعرہ میں شرکت کرنے لگا۔ اسی وقت نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوا اور بچوں کے مختلف رسالوں میں لکھنے لگا۔ تحصیل علم کے بعد مصروفیات و فکرِ روزگار نے اس شوق پر ضرب لگائی اور مدت تک قلم سے بے نیازی رہی۔ جب ذرا سکون نصیب ہوا تو رئیس الشعراء جناب محبوب علی خاں اخترؔ فیروزآبادی کا شاگرد ہو۔ آپ کی وفات کے بعد کسی سے مشورہ سخن نہ کیا۔ اب عرصۂ دراز کے بعد استادِ زماں علامہ بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی کی نظر کرم کا شرف حاصل ہے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ بیشتر کلام نعتیہ ہے۔ متعدد افسانے اور ڈرامے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ڈرامہ ترجمہ غلام انڈروکلس و شیر (برنارڈ شا) شائع ہو چکا ہے۔ چند مسودے برائے اشاعت تیار ہیں۔ اردو فارسی کے استاد کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز ہوا۔ فی الحال انگریزی ادب کا استاد ہوں۔ انگریزی اور اردو ادب میں ایم اے اور الہ آباد سے فارسی کا امتحان اعلیٰ کامل پاس کیا ہے۔ اس وقت مغربی بنگال میں قیام ہے۔

نمونہ کلام:- چھوڑ کر عرشِ بریں وہ آگیا
عشق میں ہوتی ہیں یوں دلداریاں

طور پر جو ہو چکی تھی واردات
دار پر رنگیں حکایت ہو گئی
تم نے نقابِ رُخ تو اُٹھائی ہزار بار
ہم امتیاز روئے درخشاں نہ کر سکے
ہر ایک شے میں جلوہ اسی کا ملے گا
نگاہوں سے پردہ اُٹھا کر تو دیکھو

(۹) ایف سردار مسیح رُوزؔ امرتسری

۲۶ دسمبر ۱۹۱۵ء کو شہر امرتسر میں پیدا ہوئے۔ محکمہ پولیس میں ملازم ہیں۔ شعر و سخن کا شوق رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ فصیح الملک حضرت الیاس داس صاحب رسا لکھنوی جن کا سلسلہ حضرت مصحفی سے ملتا ہے سے تلمذ ہے۔ نہایت زود نویس و بسیار گو شاعر ہیں بعض موقعوں پر زبان گنجلک نظر آتی ہے۔ مگر اشعار اچھے کہتے ہیں۔ کلام بیشتر نعتیہ ہے۔ ہر قسم کے اصنافِ سخن میں زورِ قلم دکھاتے ہیں۔ مسیحی رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا ہے۔ کلام روایتی ہے نئے نئے قافیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

نمونہ کلام
گرے تھے جو عدن میں تری آنکھوں سے اے انساں
درخشاں ہو گئے آنسو نجومِ آسماں ہو کر
نہیں گلشن ہے یہ دُنیا ہے یہ جنگل ہے یہ صحرا
سمجھ کے جس کے کانٹوں کو گل و گلزار بیٹھے ہیں

(۱۰) جیکب ڈین شاد

۱۹۱۶ء میں موضع نیگس آباد ضلع شیخوپورہ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ کالج سے بی اے پاس کیا۔ دوسری جنگِ



عظیم میں افریقہ اور مصر
وغیرہ ممالک میں فوجی
خدمات انجام دیں۔ آجکل
ہماچل پردیش میں مقام
چمبہ ڈسٹرکٹ انڈسٹریز
آفس میں ملازم ہیں۔
ابتدائے شعور سے شعرو
شاعری کا آغاز ہوا۔
حضرت ہری داس رسا
کے شاگردوں کے حلقے
میں شامل ہوئے۔ شاعری کی محرک آپ کی ناکام محبت ہے جس کی وجہ
سے کلام آپ بیتی کا مظہر ہے اور ایک خاص قسم کے درد کا حامل ہے

نمونہ کلام

خوں میری حسرتوں کا ہو گیا تو کیا عجب
عاشقی میں کس کے دل کی آرزو بر آئی ہے
شاکی ہو جو کسی کا نہ ایسا دہاں ملے
یارب نہ زندگی میں مجھے وہ زباں ملے
بہزاد کو حیرت ہے مانی کو تحیّر ہے
اے شاد یہ کس بت کی تصویر بنا ڈالی

(۱۱) بی۔ ایس۔ جارج۔ جارج

آپ کی پیدائش راولپنڈی (پاکستان) میں ہوئی۔ اس کے
بعد دہلی میں قیام ہوا وہیں تحصیل
علم کیا۔ فارسی میں بھی خاصی
دسترس رکھتے ہیں۔ حضرت
عباسی اجمیری سے تلمذ ہے اور
مسیحی رسالوں میں آپ کا کلام
شائع ہوتا ہے۔ کلام صاف
اور نکھرا اور ستھرا ہوتا ہے۔
مستقل طور پر آبو پہاڑ (راجستھان)



میں اقامت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام

رہ گئی ہے ایک قصہ بن کے میری زندگی
کر دیا قسمت نے افسانہ در افسانہ مجھے
وارفتگانِ عشق کی وحشت نوازیاں
منزل کو چوم چوم کے پھر لوٹ آئے ہیں
جو ہوگی موت کی تکلیف ایک دن ہوگی
یہ زندگی تو مگر ایک درد پیہم ہے

(۱۲) ای۔ ایکس۔ فالس خستہ بریلوی

۸ جنوری ۱۹۰۷ میں پیدا ہوئے۔ مراد آباد پارکر ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے اس وقت حضرت مولوی ظفر حسین عاصی جیسے قابل و شفیق استاد سے بہرہ ور ہوئے۔ عاصی صاحب کی ترغیب سے میدانِ سخن میں قدم رکھا اور عاصی صاحب کے وسیع حلقہ شاگرداں میں شریک ہو گئے۔ غزل، رباعی، قصیدہ سب میں زورِ طبع دکھایا ہے۔ زبان عموماً صاف اور عام فہم ہے۔

زمیں سلام کرے آسماں سلام کرے
مسیح پاک کو سارا جہاں سلام کرے

۱۳۔ جے۔ ایس۔ فانی اکبر آبادی

مسیحی جماعت کے ممتاز شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے حضرت ابوالخیال نادر شاہجہانپوری کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ہیں ہر قسم کے اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں نعتیہ، غیر نعتیہ وطنی غرضکہ ہر قسم کا کلام موجود ہے جو اکثر رسالوں میں شائع ہوتا ہے کلام میں تخیل کی بلند پروازی کے نمونے بھی ملتے ہیں اور فصاحت و بلاغت بھی

نمونۂ کلام

کیا قیامت ہے یہ زمیں والے
چاند تاروں کی بات کرتے ہیں
چراغِ فکرِ کہن بجھ چلے تو کیا غم ہے
شعورِ نو کے لئے آفتاب لایا ہوں



قیمتی کھلونے



سلطان اختر

غزل

بارش کے ساتھ ساتھ ہی طوفاں کا قہر بھی
میری طرح لرزتی ہے دیوارِ شہر بھی

ایسی گھٹن کہ سانس لبوں کو نہ چھو سکے
سر سے گزر رہی ہے ہواؤں کی لہر بھی

تو اس قدر نہ اپنے بکھرنے پہ رنج کر
ذرّوں میں بٹ گئے ہیں طلسماتِ دہر بھی

یوں تو اُتر چکا تھا نشہ رات کا مگر
سویا نہ ایک پل کو کوئی پچھلے پہر بھی

کھل کھیلنے کی موج پلٹ کر نہ آ سکی
سوکھی پڑی ہے اب تو تکلف کی نہر بھی

مٹ جائیں گی لبوں سے گناہوں کی تلخیاں
رکھ لیجئے زبان پہ لذّت کا زہر بھی

میں ہی حریفِ سنگِ ہوس مدّتوں رہا
میرے ہی سر پہ ٹوٹا ہے شیشوں کا قہر بھی

شعلے کو بازوؤں میں جکڑ تو لیا مگر
اختر رگوں میں دوڑ گئی سرد لہر بھی

یہ گرم سورج زمیں پہ اُترے گا
اور ہمارے سروں پہ شعلوں کا تاج ہوگا
پلک جھپکتے ہوئے ستاروں کی
ساری قندیلیں کوئلہ ہوں گی
چاند جل بجھ کے راکھ ہوگا
اور آسمانوں کی کھال اُدھڑے گی
اور لعل و گہر اُگلتے ہوئے سمندر
کے نیلے پانی میں زہر ہوگا
اور آگ اُگلتی ہوئی ہواؤں کے دوش پر
مثلِ گرد
ساکت پہاڑ اُڑیں گے

میرا یہ ایمان ہے کہ ایسا ضرور ہوگا
میری یہ تشکیک ہے کہ ہوگا
تو کون ہے جس کے اک اشارہ پہ ایسا ہوگا
خدائے برتر؟
خدائے برتر جو ایک چیونٹی کے مارنے کو بھی
ایک معصوم اجنبی راہ گیر کے بے ارادہ تلوے
کا منتظر ہے!
خدائے نادیدہ اپنے ہر فعل کے لئے
کوئی ایک مرئی وسیلہ ہر لحظہ ڈھونڈھتا ہے
ہم اونچی شاخوں کی تتلیوں کے حسیں تعاقب
میں دوڑنے والے
آگ کو پھول جان کر
اپنے نرم ہاتھوں سے چھونے والے
سیاہ نادیدہ رسیوں میں بندھے
کھلونوں سے کھیلنے والے
طفلِ ناداں
اُس آخری دن کے منتظر ہیں
خدائے برتر کے اس ارادہ سے بے خبر ہیں
کہ تجربہ گاہوں میں رکھے قیمتی کھلونے
(جنہیں ہمارے ہی دستِ مشاق نے گھڑا ہے
اُس آخری دن کی ساری تبدیلیوں
کے مرئی وسیلہ ہوں گے۔

ظہیر صدیقی

سمندروں کی افادیت

بدیع الزماں اعظمی

مہذب دُنیا کے سامنے بروقت سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی مسائل کے علاوہ اور بھی بہت سی الجھنیں ہیں۔ جو درد سر بنی ہوئی ہیں جن میں دو خاص طور پر باعث تشویش ہیں۔

۱۔ غذائی مسئلہ ۲۔ محدود معدنی ذخائر

انسانی آبادی جس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ہر چوبیس گھنٹہ کے بعد تین لاکھ اٹھائیس ہزار نفوس کا اضافہ ہوجاتا ہے لہٰذا اضافہ کی اس شرح سے اس صدی کے اختتام تک دنیا کی مجموعی آبادی تین ارب تیس کروڑ سے تجاوز کرکے سات ارب چالیس کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اُس تناسب سے غذائی پیداوار میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے اس لئے نسل انسانی کو عالمگیر غذائی بحران کا سامنا کرنا بعید از قیاس نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بیشتر حکومتیں نس بندی کی طرف رجوع کر رہی ہیں اور پوری کوشش سے کام لے کر آبادی کو بڑھنے سے روک رہی ہیں مگر محض نس بندی اس مسئلہ کا واحد حل نہیں ہے۔ اشیائے خوردنی کی پیداوار میں معتدبہ اضافہ کی بھی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ قدرتی معدنی ذخائر میں بھی روز بروز کمی آتی جارہی ہے۔ بالمخصوص کوئلہ اور مٹی کا تیل جو موجودہ دور کی صنعتی دنیا کے دو اہم ستون ہیں جس رفتار سے کھودے جارہے ہیں اس کے پیش نظر گمان غالب ہے کہ ان کے ذخائر مستقبل قریب میں ختم ہوجائیں گے اگر ایسا ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ ایک بھیانک سوال ہمارے سامنے آتا ہے۔ مگر ہمیں ہراساں ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس ان دونوں مسئلوں کا ایک معقول حل ہے اور وہ ہے وسیع سمندر!

کرۂ ارض کا تین چوتھائی حصہ کرۂ آب سے ڈھکا ہوا ہے جس کا مجموعی رقبہ ۳۲ کروڑ مکعب میل ہے ہمارے سمندر نہ صرف وسیع ہیں بلکہ ہماری ضروریات کے ضامن بھی۔ آج انسان کی دوڑ دھوپ چاند اور مریخ پر پہنچنے کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنی دولت پانی کی طرح بہا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو سرمایہ روس اور امریکہ کی کمین گاہوں سے چاند پر کمندیں ڈالنے پر صرف ہو رہا ہے اگر اس کا عشر عشیر بھی سمندر کی گہرائیوں میں اترنے پر صرف کیا جائے تو یہی دُنیا بے شک جنت نشان بن سکتی ہے۔ آیئے اپنے سمندروں کی دولت کا ایک طائرانہ جائزہ لیں۔

ہمارے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ سمندر کے پانی میں پانچ کروڑ ارب پانچ پچاس پدم ٹن نمک گھلا ہوا موجود ہے جو اگر حاصل کیا جاسکے اور اسے سطح ارض پر پھیلایا جاسکے تو یقین مانئے کہ نمک کی ۵۰۲ فٹ موٹی تہہ کرۂ ارض کو ڈھک لے گی۔ نمک کے علاوہ پچاس کروڑ ٹن چاندی، سات کھرب ٹن بورون، پندرہ پندرہ ارب ٹن تانبا اور مینگنیز، ڈھائی کروڑ ٹن میگنیشیم، چالیس لاکھ ٹن پوٹاشیم ہونے کے امکانات ہیں۔ سونا تو سمندروں میں اتنا موجود ہے کہ ہر آدمی کروڑ پتی بن سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اور دیگر معدنیات کی بھی کثرت ہے۔

سمندر کی اس بے پایاں دولت کا تصور ہی ہمارے دل و دماغ میں مسرت اور اطمینان کی لہر دوڑانے کے لئے کافی ہے مگر جب ہمیں اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ یہ سارے اربوں اور کھربوں ٹن معدنی خزانے سنکھا سنکھ ٹن پانی میں گھلے ہوئے ہیں تو ہم امید و بیم کے بھنور میں غوطے لگانے لگتے ہیں۔ مگر ہمیں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمارے سائنسداں ایسے ذرایع کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں کہ جن کی مدد سے ہم اس دولت کو آسانی کے ساتھ سمندر سے حاصل کر سکیں گے۔

ہمارے سائنسداں اور ماہرین علم طبقات الارض کا خیال ہے کہ ہماری ندیاں ہر سال تین ارب پچاس کروڑ ٹن فاسفورس بہا کر سمندروں میں لے جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے ہم چھچھلے سمندروں سے اسے دستیاب کر سکتے ہیں۔ بحر ہند کی بحری تحقیقاتی مہم کے سلسلہ میں اس بات کی کھوج کر لی گئی ہے کہ جزائر انڈمان کے متصل سمندر کی تہہ پر فاسفورس والی چٹانیں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ جن کی کان کنی سے ہم کھاد کا مسئلہ آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یخ کے زمانہ میں سمندروں کی سطح موجودہ سطح سے ۳۰۰ فٹ نیچے تھی۔ اس وقت کی ندیوں کے ڈیلٹے اور ساحلی میدان یخ کا زمانہ ختم ہوتے ہی زیر آب ہو گئے کیونکہ سیلہائے یخ کے پگھلنے سے سمندر کی سطح ۳۰۰ فٹ اونچی اٹھ گئی۔ معدنی مادے جو اُن میں موجود تھے آج تقریباً پندرہ بیس ہزار برس سے زیر آب ہیں اب ہم انھیں کھود کر نکال رہے ہیں۔ ملایا۔ انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کی حکومتیں اپنے ساحلی سمندروں سے رانگا نکال رہی ہیں۔ جاپان خلیج ٹوکیو سے لوہے کے ذرات برآمد کر رہا ہے۔ الاسکا (شمالی امریکہ) کے ساحلی سمندر سے سونے کے ذرات حاصل کئے جا رہے ہیں اور جنوب مغربی افریقہ کے ساحلی سمندر سے ہیرے نکالے جا رہے ہیں۔

گہرے سمندروں کے فرش پر فاسفورس اور مینگنیز کی چٹانیں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں کھود کر نکالا جائے اور کام میں لایا جائے۔ شمالی امریکہ کے مغربی ساحل سے چار سو میل کی دُوری پر گہرے سمندر کے فرش پر ہر مربع فٹ کے رقبہ پر پانچ سے سات پونڈ وزنی چٹانیں بے شمار تعداد میں موجود ہیں جن میں تانبا جستہ اور کوبالٹ ہر ایک دو دو فیصد اور مینگنیز پچاس فیصد کی اوسط سے موجود ہے۔ پروفیسر گیلن جونس آف بوسٹن یونی ورسٹی (امریکہ) کے اندازہ کے مطابق ان چٹانوں کی ساخت حشرات البحر کی رہین منت ہے۔ یہ حشرات بحری سمندر سے نباتاتی غذا کے ساتھ ساتھ معدنی غذا بھی لیتے رہتے ہیں جسے وہ فضلہ کی شکل میں کسی بے جان شے جیسے شارک کے دانت یا وھیل کی ہڈیوں پر جمع کرتے رہتے ہیں۔ جن کی دبازت ایک ہزار سال میں ۱/۲ انچ سے ۱ ۱/۲ انچ تک ہو جاتی ہے۔ ان کی ساخت چاہے جس طرح بھی ہو مگر ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اپنی موجودہ ضرورت کے مطابق ہی ان معدنیات کو سمندر کی تہہ سے حاصل کرتے رہیں تو ان ذخیروں میں کمی آنے کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ اس واسطے کہ سمندر کی تہہ میں اس قسم کی چٹانیں مسلسل بنتی رہتی ہیں۔

بروقت ساحلی سمندروں سے مٹی کا تیل اور اس کے ساتھ ساتھ نیچرل گیس بھی دستیاب کیا جا رہا ہے۔ تیل کی کمپنیاں اگرچہ کئی سال سے چھچھلے سمندروں میں ہی اس کام کو انجام دے رہی ہیں مگر وہ بتدریج گہرے سمندروں کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ خیال یہ ہے کہ ۱۹۷۵ء تک ایک ہزار فٹ گہرے سمندر تک تیل نکالا جا سکے گا۔ رائل ڈچ پٹرولیم کے چیرمین مسٹر جان لندن کا اندازہ ہے کہ ۱۹۹۵ء تک بہت سی کمپنیاں دو ہزار فٹ گہرے سمندر تک تیل نکالنا شروع کر دیں گی۔ جزائر برطانیہ کے مشرقی ساحل کے قریب بحیرہ شمالی میں تیل کی کھوج کے سلسلے میں نیچرل گیس کا خزانہ دستیاب ہو گیا ہے جس سے برطانیہ میں گیس کی ضرورت تیس سال تک پوری ہوتی رہے گی چنانچہ گیس کی پائپ لائنوں کے بچھانے کا کام شروع ہو گیا ہے خیال ہے کہ ۱۹۷۵ء تک اہل برطانیہ کو سمندر سے گیس سپلائی ہونے لگے گی۔

براعظمی پلیٹ فارم کے نیچے تو کرۂ ارض پر پائے جانے والے تیل کے خزانوں کا پچاس فیصدی تیل موجود ہے جو آسانی کے ساتھ نکالا جا سکتا ہے مگر گہرے سمندروں کے فرش کے نیچے تیل کا ایک

سمندر ہے جسے قدرت نے جگہ جگہ دفن کر رکھا ہے۔ اگر ہم نے اسے حاصل کر لیا تو یہ ہماری ٹیکنالوجی کا عظیم کارنامہ ہوگا۔ پھر تو ہمیں سمندر کی گہرائیوں میں اترنا ہوگا۔ وہیں پر تیل کے کنوئیں کھودے ہوں گے، وہیں پر تیل صاف کرنے کے کارخانے بنانے ہوں گے۔ کام کرنیوالوں میں بے جان آہنی انسان ہوں گے۔ آبدوز کشتیاں، پٹرول، تیل اور دیگر اشیاء کو لے کر اوپر آئیں گی تاکہ آباد دُنیا اُن سے مستفید ہو سکے۔ کھدائی، صفائی اور بار برداری کا سارا کام آٹومیٹک ہوگا۔

مٹی کے تیل سے مختلف اشیاء حاصل کی جاتی ہیں اور ہم اس کے استعمال سے کما حقہ واقف بھی ہیں۔ مگر جدید تحقیق یہ ہے کہ اس کا استعمال بطور غذا بھی ہو سکے گا اس سے ہم پروٹین حاصل کر سکیں گے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تیل کی موجودہ پیداوار کے ڈھائی فیصدی تیل سے ۲ کروڑ ٹن پروٹین حاصل ہو سکتی ہے جو دُنیا کے تمام جانوروں سے حاصل ہونے والی پروٹین کے برابر ہوگی۔ اس طور پر مٹی کے تیل کا ایک نیا استعمال پروٹین کی شکل میں ہوگا۔

ہمارے سمندر انواع و اقسام کے کیڑے مکوڑوں اور آبی حیوانات اور نباتات سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے بعض بہترین کیمسٹ ہیں۔ مثال کے طور پر کیکڑے سمندر کے پانی سے کوبالٹ اخذ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے خون کے اندر تانبے کا جز ۱/۱۰۰۰۰۰۰ کی اوسط میں اسی طرح پایا جاتا ہے جس طرح انسان کے خون میں لوہے کا جز۔ ایک دن آئے گا کہ ہم ان سمندری کیڑے مکوڑوں اور جانوروں سے سمندر کے پانی میں حل شدہ معدنیات کے حاصل کرنے کا گر بھی معلوم کر سکیں گے۔

تاریخ کی ابتدا کے قبل سے ہی انسان نے سمندروں کو اپنی شکار گاہ بنا رکھا ہے۔ مچھلی پکڑنا اس کا قدیم پیشہ ہے۔ یوں تو دُنیا کے سارے سمندر خواہ وہ گرم ہوں یا سرد یا سرد ترین مختلف قسم کی مچھلیوں سے بھرے پڑے ہیں مگر مچھلی پکڑنے کا دھندا بڑے پیمانے پر منطقہ معتدلہ کے ساحلی سمندروں میں ہوتا ہے چونکہ اُن کی گہرائی چھ سو فٹ سے کم ہی ہے اس لئے سورج کی کرنیں سمندر کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں اور وہاں ایک قسم کی سواد جسے پلینکٹن کہتے ہیں پیدا کرتی ہیں۔ اسی نباتات پر پلینکٹن نامی چھوٹے چھوٹے کیڑے پرورش پاتے ہیں جو مچھلیوں اور ان کے بچوں کی خاص خوراک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مچھلیوں کی ایک کثیر تعداد انڈے بچے دینے کے لئے ان چھچھلے سمندروں میں آجاتی ہے جہاں بچے اپنی خوراک پاکر تیزی سے بڑھتے ہیں۔ ان بچوں کو کھانے کے لئے گہرے سمندروں سے بڑی بڑی مچھلیاں بھی بے شمار تعداد میں آجاتی ہیں جو بالآخر شکار کرلی جاتی ہیں۔ مچھلی پکڑنے کے کاروبار میں چلی اور جاپان کے ممالک سب سے آگے ہیں۔ جاپان کے ماہی گیر سورج غروب ہوتے ہی بڑے بڑے جال جن کو ٹرال (TRAWL) کہتے ہیں، سمندر میں ڈالتے ہیں۔ ان میں بجلی کے ٹائم بلب لگے ہوتے ہیں جو وقت مقررہ پر اپنے آپ 'آن' اور آف ہوتے رہتے ہیں۔ مچھلیاں ان قمقموں کی روشنی کے سہارے جھنڈ کے جھنڈ جال کے اندر آجاتی ہیں۔ یکے بعد دیگرے قمقمے 'آف' اور 'آن' ہوتے رہتے ہیں۔ اور مچھلیاں روشن قمقموں تک پہونچتی رہتی ہیں۔ بالآخر جال کے اندرونی آخری حصہ کا بلب بھی پچھلے پہر کے قریب آف ہو جاتا ہے اور جال مشین کے ذریعہ سمیٹ لیا جاتا ہے اور جب اُسے اُٹھا کر اسٹیمر پر رکھا جاتا ہے تو منوں مچھلیوں کا انبار لگ جاتا ہے۔ قطبی سمندروں میں وھیل، سیل، اور والرس کا شکار کیا جاتا ہے اُن سے گوشت بھی حاصل ہوتا ہے اور چربی بھی۔ ان میں وھیل سب سے بڑی ہوتی ہے ۱۱۳ فٹ لمبی، ۵۲ فٹ چوڑی اور ۱۵ فٹ اونچی وھیل کا شکار کیا جا چکا ہے۔ وھیل کا اوسط وزن دو سو ٹن یعنی ساڑھے پانچ ہزار من کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ کھال کے نیچے بیس انچ موٹی چربی کی تہہ بھی ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ قطبی خطے کے برفیلے سمندروں کی ٹھنڈک برداشت کر لیتی ہیں۔

ہمارے ملک میں بھی ساحلی علاقوں میں ماہی گیروں کی بستیاں ہیں۔ بھارت سرکار ان ماہی گیروں کو جدید قسم کے جال اور اسٹیمر فراہم کر رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مچھلیاں پکڑی جا سکیں تاکہ اناج کی کمی کسی حد تک پوری ہو سکے۔ اس میں شک نہیں کہ مچھلیاں غذائی بحران دور کرنے میں بڑی حد تک معاون ہیں اور رہیں گی۔ کیکڑے جنھیں کوئی کھانا پسند نہ کرتا تھا آج ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لئے ۴۴ کروڑ ڈالر سالانہ کی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔

سمندر کے پانی میں بے پناہ قوت بھی ہے۔ انسان نے اس طاقت سے فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بھی بنا لیا ہے۔ ہندوستان میں بھی بڑے پیمانے پر آبی بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی جن ندیوں میں مد و جزر آتا ہے اسی طرح آبی بجلی پیدا کرنے کی اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں۔

سمندر کا پانی کھاری ہے۔ اسے استعمال میں لانے کے لیے اس کا کھاری پن دور کرنا پڑتا ہے۔ بر وقت صرف چند کروڑ گیلن پانی صاف کیا جا رہا ہے مگر ایسے ذرائع ایجاد کیے جا رہے ہیں کہ جن کی مدد سے کم سے کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ پانی کا کھاری پن دور کیا جا سکے۔ اس لیے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہم اس مقدار میں پانی صاف کرنے لگیں گے جو ہمارے موجودہ ریگستانوں کو سرسبز میدانوں میں تبدیل کر سکیں گے۔ پھر یہی ریگستان اپنی لہلہاتی فصلوں سے غذائی بحران دور کرنے میں ہمارے معاون ثابت ہونگے۔

سمندر کی افادیت کے پیش نظر سمندروں کی باقاعدہ چھان بین کرنے اور اُن کے رازہائے سربستہ کو معلوم کرنے کے لیے دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کی ایک کانفرنس ۱۹۶۵ء میں بمقام جنیوا منعقد ہوئی تھی۔ اس میں طے پایا کہ شد و مد کے ساتھ بحری مہم چلائی جائے اور یہ بھی طے پایا کہ ہر ملک کے سمندری پلیٹ فارم پر ۶۵۵ فٹ کی گہرائی تک جو کچھ بھی پایا جائے وہ اُس ملک کی ملکیت قرار پائے گی۔ چناں چہ سمندروں کی دولت کی کھوج کی مہم جاری ہو گئی۔ بڑی بڑی حکومتیں اس کام میں آگے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنی اس مہم پر ساٹھ کروڑ ڈالر سالانہ صرف کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اس مہم سے ہمیں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا۔ کہ ہم اپنے گمشدہ خزانوں کو بھی ڈھونڈھ نکالیں گے۔ جو ہر سال جہازوں کے تباہ ہو جانے اور ڈوب جانے پر سمندر کی تہہ میں بیٹھتے جاتے ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سنہ ۱۵۰۰ء کے بعد سے آج تک تقریباً دس لاکھ جہاز ڈوب کر سمندر کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں جو اپنے ساتھ آج تک کھو دیے گئے سونے اور چاندی کی چوتھائی مقدار بھی لیتے گئے۔ جب ہم ان ڈوبے ہوئے جہازوں کا سراغ لگا لیں گے تو ہم اپنے گم شدہ خزانوں کو بھی برآمد کر سکیں گے۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے۔

●●

بقیہ: شیش محل

بلرام نے کہا۔

اس نے سوچا انل شاید رات کی بات کا اثر اس کے دل سے مٹانا چاہتا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر اپنا وہی پرانا کوٹ پہنا تھا۔ لیکن انل نے جیسے اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے اس بناوٹی رویہ کو بلرام محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

دن بھر دونوں برلا مندر، چاندنی چوک اور لال قلعہ کی سیر کرتے رہے۔ رات کے نو بجے جب بس سے اتر کر انل کے گھر کی طرف چلے تو بلرام کی بیوی آہستہ سے بولی ــــ انل کی بہو بہت بدل گئی ہے اس نے تو انل کو بہکایا ہے۔ رات والی بات۔ ۔ ۔ ۔ ''

''تم تو ہمیشہ بہو کو ہی دوش دے گی۔ عورت جات ہے نا۔'' بلرام نے کہا۔

''نہیں دوش تو انل کا بھی ہے جو ماں باپ کو اس طرح بھول گیا۔''

''اس کا کوئی دوش نہیں ہے انل کی ماں۔ سوچتا ہوں تو اس کی بات ٹھیک لگتی ہے۔ خود بڑا افسر ہے۔ اپنے دوستوں اور پڑوسیوں سے یہ کہتے کیا اُسے اچھا لگتا ہوگا کہ اس کا باپ ایک معمولی پوسٹ مین ہے۔ آخر اس کی بھی تو عزت کا سوال ہے۔''

بلرام کی بیوی خاموش رہی۔

''لیکن انل کی ماں میرا من یہاں نہیں لگ رہا ہے۔ انل اور اس کے بچوں کو دیکھ لیا۔ ہم لوگ کل لوٹ جائیں گے۔'' بلرام یکایک بولا۔

''اتنی جلدی۔ ۲۶ جنوری نہیں دیکھنا ہے کیا؟'' بلرام کی بیوی نے تعجب سے پوچھا۔

''چھوڑو بھی کیا رکھا ہے ۲۶ جنوری میں۔ انل کو پاس بھی تو نہیں ملتا۔ بغیر پاس کے کوئی مزا بھی نہیں آئے گا۔ پھر کن من بھی تو بہت یاد کرتا ہوگا۔ پہلی بار اس سے الگ ہوئے ہیں۔''

بلرام کی نگاہوں میں لال قلعہ کا شیش محل جگمگا اٹھا۔ گائیڈ کی جلائی ہوئی روشنی میں شیش محل کتنا خوبصورت لگ رہا تھا ــــ وہ سوچنے لگا۔

●●

شرون کمار



بچے

وہ تینوں کناٹ پلیس کے کاریڈورس میں بھٹک رہے تھے میاں بیوی اور بچہ۔ ہر دکان کے سامنے وہ چند لمحے رکتے اُن کے اندر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھتے اور پھر گھٹے گھٹے سے آگے بڑھ جاتے۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ بھیڑ کا ریلا اُنھیں اپنے ساتھ ڈھکیل لے جاتا۔

تہوار کا دن تھا۔ ہر دکان پر، ہر کونے پر خریدار ایسے ٹوٹے پڑ رہے تھے جیسے مکھیاں شہد پر ٹوٹتی ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج ہی کے دن کے لئے، لوگوں نے اپنی ساری پونجی جمع کر رکھی تھی۔ جیسے وہ اپنے آپ کو لٹا دینا چاہتے تھے۔ جہاں اُنھیں ایک چیز کی ضرورت تھی وہاں وہ دو خرید رہے تھے۔ بازار میں جیسے پیسے کی باڑھ آگئی تھی۔ کچھ لوگ جو کچھ خریدتے جاتے تھے اپنی کاروں میں جمع کئے جا رہے تھے۔ کچھ نے اس کام کے لئے چھوٹے چھوٹے مزدور بچوں کا سہارا لیا تھا جو اپنی پیٹھ میں اُن کے دو دو چار بنڈل لادے اُن کے ساتھ ٹنگے ٹنگے سے ایک دوکان سے دوسری دکان کی طرف گھسٹتے چلے جا رہے تھے۔ اِن چمچماتی کار والوں کے اُجلے، قیمتی کپڑوں کا کچھ اپنا ہی رعب تھا۔ ان کا بھیڑ کیلا پن ایک عجیب کیفیت لئے ہوئے تھا۔ ایسا نکھار دلی پر کبھی کبھی ہی آتا ہے۔

اچانک بچے نے انگلی چھڑانی چاہی "ممی مجھے گیارا لے دو" عورت نے غصے سے بچے کی طرف دیکھا اور اپنے بازو پر جھٹکا دیتے ہوئے اُسے گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ باپ نے بھی گھڑکی دی اور بچے کی طرف دیکھا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ بھئی ابھی بازار میں آئے ہی ہیں اور تم نے اپنی فرمائش شروع کر دی۔

وہ چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ بچے نے پھر ضد کی " پاپا ہم قلفی کھائیں گے۔" "ہم رچھلے کھائیں گے۔"

اور پاپا یکا یک بھڑک اٹھے "اس کی عادتیں روز بروز بگڑتی جا رہی ہیں۔ اس کو ڈانٹ کر رکھا کرو"۔

لیکن بچے کی فرمائشیں جاری تھیں "ہمیں بوٹ لے دو نا : ہمیں چمکنے والی چپنڈل لے دو نا : دیکھو میری چپنڈل تو ٹوٹ بھی گئی ہے"

"لے دیں گے، لے دیں گے بیٹے۔" میاں نے کہا "تم ضد نہ کیا کرو۔ "ضد مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی"۔

اتنے میں بیوی ایک ہاکر کے سامنے رُکی۔ وہ جوڑے کے نیٹ بیچ رہا تھا۔ "یہ نیٹ انگلش ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا "دو سال تک ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

بیوی نے بنا زیادہ سوچے اس سے دو نیٹ خرید لئے۔ ہاکر کے پاس جوتے کے فیتے بھی تھے۔ میاں کو یاد آیا کہ اس کے بوٹ کے فیتے ٹوٹ رہے ہیں اور اس نے فیتوں کے لئے بھی بیوی کو پیسے دیدینے کو کہا۔ بچے کا شوق پورا کرنے کے لئے انہوں نے اس کو بالوں کی سوئیاں بھی خرید دیں اب وہ تینوں پھر چلنے لگے تھے۔

اب تک وہ کناٹ پلیس کے دو چکر لگا چکے تھے اور تیسرا لگا رہے تھے۔ بیوی چاہتی تھی کہ اس کے لئے ایک سفید کارڈیگن خریدا جائے جو وہ ہر ساڑی کے ساتھ پہن سکے۔ تین سال پہلے اس نے خود ہی ایک کارڈیگن خریدا تھا جو اب بدرنگ ہو رہا تھا۔ خاوند چاہتا تھا کہ اس کے لئے ایک کوٹ کا کپڑا خریدا جائے کیونکہ وہ پچھلے آٹھ برسوں سے کوئی کوٹ نہیں بنوا سکا تھا۔ اور اس کی حالت یہ تھی کہ وہ آستینوں سے اُدھڑ رہا تھا اور اس کی رنگت بے جان سی دکھائی دے رہی تھی اس میں اب اتنا دم بھی نہیں رہا تھا کہ اُسے پلٹوایا ہی جاتا۔

بڑی مشکل سے کسی طرح کھینچ تان کر کے وہ پچھلے چار مہینوں میں ساٹھ روپے بچا پائے تھے۔ چار سو کی ماہانہ تنخواہ میں سے پچیس تیس دفتر میں کٹ جاتے ہیں۔ پھر ہر مہینے سو روپے مکان کا کرایہ پانچ بجلی پانی، پندرہ بیس بس کا کرایہ، پندرہ بیس جیب خرچ۔ پہلے انہوں نے سوچا تھا کہ کسی سستی سی جگہ میں رہیں تاکہ مکان کا کرایہ پچاس سے زیادہ نہ دینا پڑے لیکن پھر یہ سوچا کہ غلط لوگوں میں رہ کر بچے پر غلط اثر پڑے، انہوں نے راجہ گارڈن میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر بچے کو بھی اچھے اسکول میں بھیجنا پڑا۔ ہر مہینے اس کی فیس وغیرہ کے ہی تیس روپے ہو جاتے ہیں۔ پھر کتابوں اور کاپیوں کے پیسے الگ، سردی، گرمی کی ڈریس پر خرچ الگ، شوہر نے ایک بار بیوی کو سمجھایا بھی تھا بچے کو میونسپلٹی کے اسکول میں بھرتی کروا دیا جائے۔ آخر وہ بھی تو انہیں اسکولوں میں پڑھے ہیں۔ لیکن بیوی نہ مانی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک تو میونسپلٹی کے اسکولوں میں نرسری کلاس ہوتی ہی نہیں اور دوسرے وہاں بچے کی شخصیت نہیں بنتی۔ پبلک اسکول میں بچے کی شخصیت کا صحیح ارتقا ہوتا ہے۔

میاں بیوی کی بات سن کر ہنس دیا تھا۔ اور پھر اس نے کہا تھا لیکن تمہیں معلوم نہیں۔ ہمارے بعض رہنما پبلک اسکولوں کی کتنی بُرائی کرتے ہیں۔"

"ہاں برائی تو کرتے ہیں" بیوی نے تڑاک سے جواب دیا تھا۔ "لیکن سب سے زیادہ ان کے بچے ہی ان اسکولوں میں پڑھتے ہیں،" اور پھر دونوں ایک ساتھ ہنس دیئے تھے اور انہوں نے بھی اپنا بچہ پاس ہی کے ایک اسکول میں داخل کروا دیا تھا جہاں سے "نمستے" کی بجائے "گڈ مارننگ" کرنا سکھایا جاتا ہے۔

دراصل خرچے کا حساب ان کا کبھی بن ہی نہیں پایا تھا۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو انہیں تنخواہ ملنے کا ہلکا سا احساس ہوتا تھا ورنہ حالت ویسی کی ویسی ہی رہتی تھی۔ وہی مکان کا کرایہ، وہی راشن والے کے پیسے، وہی دودھ کا خرچ، وہی بیبی کی اسکول فیس۔ کبھی کبھی تو گہری سوچ میں ڈوب جاتے تھے کیونکہ وقت بے وقت کے لئے ان کے پاس کچھ نہ بچتا تھا۔ اور کئی چیزیں تو ایسی تھیں جو ان کی فہرست سے ہی نکل چکی تھیں۔ جیسے فروٹ اور انڈے۔ اور آہستہ آہستہ اور کئی چیزیں بھی نکلتی جا رہی تھیں اور جو کام بیچ میں رہ جاتا وہ بیچ میں ہی رہ جاتا تھا۔ جیسے ان کے پاس ایک کھڑکی کے لئے تو پرانا پردہ تھا۔ لیکن دوسری کھڑکی کو وہ ڈھک ہی نہ پا رہے تھے۔ اور رات کو سوتے وقت اس پر ایک معمولی سی سفید چادر اوڑھا دیتے تھے۔ تاکہ "پرائیویسی" کسی طرح بنی رہے۔ ہاں یہ تو غنیمت تھا کہ ڈاکٹری علاج سرکاری نوکری ہونے کی وجہ سے مفت تھا۔ ورنہ بیماری آنے پر جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔

ان کے پاس پڑوس میں نت نئے ڈیزائنوں کی روز مرہ اٹھتی بلڈنگوں کو دیکھ کر ایک دن شوہر نے خود ہی کہا تھا "میں نے کی بھی تو ایک سرکاری نوکری جس سے ٹھیک ڈھنگ سے پیٹ بھی نہیں بھر پاتا۔ ورنہ دیکھو ہمارے ان پڑوسیوں کو کتنی شاندار کوٹھیاں بنوائے ہیں۔" اور پھر میاں بیوی دیر تک "چور بازاری اور جلد امیر بننے کے نسخے" کی باتیں کرتے رہے تھے۔

"تمہیں یاد ہے وہ پراپرٹی ڈیلر جس نے ہمیں یہ مکان کرایہ پر دلوایا تھا۔" شوہر نے بات شروع کی "اس نے کچھ گھنٹوں کی محنت سے ہی ہم سے کمیشن کے پچاس روپے کما لئے تھے۔ جبکہ میں تمام دن دفتر

میں گھستے رہنے پر بھی تیرہ سوا تیرہ روپے سے زیادہ نہیں کما سکتا۔ اس کی ایک لاکھ کی تو بلڈنگ ہی ہے۔ اب اس کے نچلے حصے میں دکانیں بنوا رہا ہے اور باقی حصے میں ویسے ہی کرایہ دار بٹھائیگا۔ اسکوٹر اس نے لے ہی لیا ہے جلد ہی کار بھی خریدے گا۔ ٹیلیفون بھی اس کے پاس ہے ہی۔ کہتا تھا پہلے وہ بھی سرکاری نوکر تھا۔ ایل ڈی سی مشکل سے میٹرک پاس ہوگا۔"

اور بیوی نے اس سامنے والے پڑوسی کی بات کہی تھی جس پہ روز بروز چربی چڑھتی جا رہی ہے۔ "پتہ ہے کبھی بھی الیکشن لڑ رہا ہے۔"

"ہیں" پتی کو جیسے بجلی سے شاک لگا۔ "سچ" چمگادڑ کی اولاد جب اس محلے میں آیا تھا تو سالا پھٹیچر سا لگتا تھا۔ پچھواڑے میں ایک کمرہ ہی کرائے پر لے سکا تھا۔ پھر کالا دھندا شروع کر دیا۔ اور اب الیکشن ۔۔ امید ہے جیت بھی جائے گا۔"

اور بات کرتے کرتے خاوند نہ جانے کیوں غصے سے بھر گیا۔ اس کی آواز بے قابو ہو گئی۔

"کب ایسے لوگوں سے چھٹکارا ملے گا۔ کب تک ہم اُن کے پھندوں میں پھنسے رہیں گے۔" لیکن جلد ہی شانت ہو گیا۔ جیسے زیادہ بھڑکنے والی آگ جلد ہی راکھ بننے لگتی ہے۔

میاں، بیوی نے ایسے کئی دھندوں کا ذکر بھی کیا۔ جن میں منافع کافی ہوتا ہے۔ اور لاگت تقریباً کچھ بھی نہیں۔ جیسے نئی اسکیمیں چلانا اور چِٹ فنڈ کھولنا اور لوگوں کو اپنے چنگل میں پھنسانا اور بعد میں دیوالیہ بن جانا۔ پھر بچوں کو غیر ملکوں میں پڑھنے بھیجو اور کوئی انڈسٹری کھول لو ــــ بجھتی راکھ میں جیسے کوئی چنگاری پھر چمک اٹھی تھی۔ شوہر نے کہا تھا کہ اس سے تو ریڑھی والے ہی اچھے ہیں جو رات کو بیس پچیس بنا کر گھر لوٹتے ہیں جب کہ وہ ایک کوالیفائڈ جرنلسٹ ہوتے ہوئے بھی محض دو وقت کی روٹی کمانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ بیشک سرکار مہنگائی بھتہ بڑھائے جا رہی ہے لیکن ادھر مہنگائی بھتہ بڑھانے کی خبر اخباروں میں چھپتی ہے اور ادھر بازار والے جیسے پہلے سے ہی راہ دیکھتے رہتے ہیں اور ایک ایک چیز کا دام بڑھا دیتے ہیں۔

چلتے چلتے بیوی یکایک رکی۔ "اچھا آپ ہی اپنا کوٹ سلوا لیجئے۔" اُس نے کہا۔

"میرا کیا ہے مجھے دفتر کونسی تھوڑے ہی جانا ہے۔"

لیکن شوہر بھی محبت کے جذبے سے معمور ہو کر بولا "نہیں جی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی تو اچھے کپڑے پہنے اور عورت اور بچے چیتھڑے لگائے رہیں۔"

"لیکن جب سے شادی ہوئی ہے۔ آپ نے کوئی گرم کپڑا بنوایا ہی نہیں۔ ذرا اپنے کوٹ کی حالت تو دیکھئے۔"

شوہر ہمیشہ سولی پر چڑھتا آیا تھا اس لئے اُسے اب بھی انکار نہیں تھا۔ اگرچہ اب بیوی بھی اس کے ساتھ لٹکنے کو تیار تھی۔

اتنے میں بچہ یکایک چلا اٹھا "میں بھی وہ چھوٹ (سوٹ) اور اس نے شوکیس میں ٹنگے ایک بے بی سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھو نہ میرا چھوٹ کتنا گندا ہو رہا ہے۔"

سن کر ماں یکایک بے چین ہو گئی۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے بے بی سے وعدہ کیا تھا کہ بازار میں وہ اسے ایک نیا سوٹ ضرور لے دے گی کیونکہ اس کے پہلے سوٹ میں جگہ جگہ سوراخ ہو رہے ہیں۔

لیکن شوہر کو ایسے لگنے لگا تھا جیسے اس کے اندر کچھ تن تن کر اینٹھنے لگا ہے۔

"ہاں لے دیں گے، لے دیں گے، کہہ تو دیا لے دیں گے۔" وہ غصے سے تمتما سا اُٹھا۔ "اسے ہمیشہ اپنی ہی لگی رہتی ہے۔ اور اس غصے میں اس نے بچے کو دو تین تھپڑ جڑ دیئے۔ بچہ زور زور سے رونے لگا تھا۔ اس ڈر سے کہ لوگ کیا کہیں گے اُس نے بچے کو گود میں لے لیا تاکہ وہ چپ ہو جائے اور پھر کندھے سے لگا کر تھپتھپانے لگا۔

ایسے ہی وہ کچھ دیر تک چلتے رہے۔ پھر بیوی نے کہا "چلو، ناؤ پھر کبھی خریدیں گے۔" اور شوہر نے خاموش رضامندی دے دی۔ بچہ کندھے سے لگا لگا اب تک سو چکا تھا۔

(ہندی سے ترجمہ)

●●

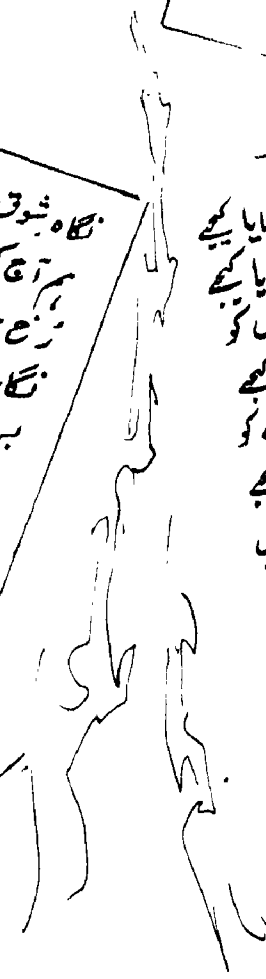
غزلیں

عشق میں بخت جگا اشکِ رواں تک پہنچے
تیرے شکوے نہ مگر نوکِ زباں تک پہنچے
دیدۂ کوتاہ نظر لوگ کہاں تک پہنچے
کعبہ پہنچے تو کہا تیرے مکاں تک پہنچے
پلکیں ابرو سے بچیں ہو گئی دلدوز نظر
چل ہی پڑتا ہے اگر تیر کماں تک پہنچے
مار ڈالے گی مجھے تیری عنایت کی نظر
بیچارے نوبت یہ بھی تیشہ و سناں تک پہنچے
کھو گئے راہِ محبت میں رسا کچھ ایسے
خود بھی معلوم نہیں ہم کو کہاں تک پہنچے

رسا جاودانی

ی کی کہیں حرکت تو ہے میخانہ سہی
ی گردش میں تو ہے ساغر و پیمانہ سہی
زلفِ برہم نے کسی کو تو سرافراز کیا
دستِ اربابِ محبت نہ سہی شانہ سہی
عشق فرزانگیٔ شوق ہے لیکن مجھ کو
آپ دیوانہ سمجھتے ہیں تو دیوانہ سہی
اس شبستاں میں جہاں خم کو ہے ساغر سے لگاؤ
کوئی تو شمع کا غم خوار ہے پروانہ سہی
ہوں میں وہ خوش جو مصیبت میں ہیں شاکر لیکن
شکر اس حال میں خود طنز ہے شکوہ نہ سہی
ہے عبادت یہی صہبا تو کہیں سر پھوڑو
خشتِ کعبہ نہ سہی خشتِ صنم خانہ سہی

قاسم صہبا جمیلی



نگاہِ شوق میں جلوے سمیٹ لائے ہیں
ہم آج کوچۂ جاناں سے ہو کے آئے ہیں
رخِ حیات دمکتا ہے آفتاب کی طرح
نگارِ زیست پہ خوش ہیں فسوں کے سائے ہیں
بس ایک مرحلۂ زیست اور ہے یارو!
عدم کی راہ تو پیچھے ہی چھوڑ آئے ہیں
اسی ایک جرم پہ ہمیں نے کر دیا پامال
کہ پھول آج ذرا دیر مسکرائے ہیں
اجالے مانگ لئے ہیں ترے تبسم سے
اندھیرے غم کے مرے دل پہ چھا بھی جاتے ہیں
جنوں نے کی ہے مری رہبری خرد مندو!
نشانِ منزلِ مقصود میں نے پائے ہیں
عمل کے ہاتھوں سنورتی ہے زیست کی تقدیر
شمیم ہم یہ کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں

ایم اے شمیم مرونجی

پھول سا جسم نہ رستے میں جلایا کیجے
میں صنوبر ہوں مری چھاؤں میں آیا کیجے
اور کیا چاہئے اس دور کے انسانوں کو
صرف دو چار گھڑی ساتھ بتایا کیجے
آپ ساگر ہیں تو سیراب کریں پیاسے کو
آپ بادل ہیں تو مجھ وحشت پہ سایا کیجے
آپ سے نور کی خیرات طلب کرتے ہیں
جن کے خورشید نہ پھولوں کو جلایا کیجے
کم سے کم دیکھ سکوں اپنی حقیقت کیا ہے
میری آنکھوں سے نہ آئینہ چھپایا کیجے

عبدالرحیم نشتر

ر الزماں

جدید اردو شاعری

میری نظر میں

جدید اردو شاعری کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ اس مضمون سے ہم ایک سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں جدید اردو شاعری کے بارے میں ادبا و شعرا اور قارئین کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے۔ مضمون زیادہ طویل نہ ہو۔

اردو شاعری اپنی ساخت و تعمیر کے لئے فارسی اور عربی کی رہین
نت ہے اور خود فارسی شاعری کی ساری بساط تعمیر، عربی کے مرتبہ اصول
بنی ہے بحر، ردیف، قافیہ، وزن وغیرہ یہ سب کے سب صدیوں کی
امی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ آپ شاعری کو ان سے آزاد و معریٰ کر دیجئے
ادبی ترقی، تنوع اور ترفع کے وہ کون سے نئے ممالک ہیں جنہیں آپ
سخر کرلیں گے۔ وسعت و ترقی کی اُمنگ و حوصلے سے انکار نہیں۔ لیکن
گر آپ اس اُمنگ و حوصلہ کو ایک اسپ بے لگام بنا دیں تو یقین جانئے
آپ کی ساری کاوش صدا بصحرا ہو کر رہ جائے گی: خدارا ایسے پیکر
ڈھالیئے گا کہ ہمیں مجبوراً یہ کہنا پڑے :-

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے:

کہا جاتا ہے کہ ردیف و قافیہ کی تلاش اور وزن کے قائم کرنے میں، شاعر کو بڑی کاوش اور تضیع اوقات کرنی پڑتی ہے، لہٰذا اس جھگڑے سے جلد از جلد سبکدوش ہو کر آزاد اور معریٰ شاعری کے دامن میں پناہ لینی چاہئے۔ اکتساب علم سے بچنے کے لئے کتنا موثر نسخہ ہے! اہل علم و بصیرت اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حصول علم کے بعد، شاعر الفاظ کا غلام نہیں ہوتا بلکہ خود الفاظ شاعر کے غلام بن جاتے ہیں۔ دُور کیوں جایئے۔ مثال کے طور پر عہد جدید کے دو شاعر لیجئے۔ علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی یہ دونوں جب شعر کہنے بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کا سمندر اُن کے سامنے موجزن ہے۔

"ادب جدید" کی ایک اُپج اور ملاحظہ فرمایئے۔

گل و بلبل، شمع و پروانہ، ساغر و مینا، دشنہ و خنجر، اور اس

قسم کے تمام الفاظ کو زبان کی قلمرو سے خارج کر دینا چاہئے کیونکہ یہ خیال آفرینی کی راہ میں مخل ہوتے ہیں۔ اس نام نہاد منطق کے جواب میں مرزا غالب کے دو شعر کافی ہوں گے۔ مزید مباحثہ کی زحمت میں آپ کو کیوں ڈالوں۔

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو!
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ محض دلیل معقول نہیں ہے کہ غالب کے نام سے آپ کو مرعوب کر دیا گیا ہو۔ اگر آپ اِن اشعار پر غور کریں تو اس میں آپ کو ایک جہانِ فلسفہ و حکمت نظر آئے گا۔ اگر آپ غور نہ کریں تو "چشمۂ آفتاب را چہ گناہ"!

بعض اربابِ علم نے شعر کی تعریف اس پر منحصر کر دی کہ کلام موزوں کا نام شعر ہے۔ اگر اس تعریف کو جامع مان لیا جائے تو پھر یہ بھی شعر ہو گیا ؎

ہاتھی کو بڑا کیا پڑا ہے ؛ لٹھے کو کھڑا کیا کھڑا ہے

دراصل شعر کی یہ تعریف فلسفہ میزان سے بیگانگی پر دلالت کرتی ہے۔ اہلِ نظر اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ شاعری کا جزءِ لاینفک موسیقی ہے اور سارے علم عروض کی بنیاد اسی موسیقی پر ہے اور خود موسیقی نے اپنی تمام کائنات براہِ راست مشاہداتِ فطرت سے تعمیر کی ہے، برق کی چمک، بادل کی گرج، دریا کا شور، ہوا کا سناٹا، آبشار کا ترنم، ہاتھی کی چنگھاڑ، کوئل و پپیہے کی پکار، قمری و بلبل کی چہک وغیرہ وغیرہ۔ موسیقی نے اپنی ساری بساطِ علم سات سُروں میں محدود کر دی جن کا نام سرگم رکھ دیا اور انہی سات سروں میں آواز کے ہر نشیب و فراز کو سمیٹ لیا۔ اہلِ فن کو اس خیال سے کہ ان سروں میں سے کوئی اپنی جگہ سے بہک نہ جائے، وزن کا عنصر داخل کرنا پڑا، جس سے رقص و ترنم وجود میں آیا۔ چنانچہ سُر اور وزن کے ربطِ باہمی سے موسیقی کا ایک عام ٹھاٹھ بنایا گیا، سُر یا تان اور تال و سم۔ اس ٹھاٹھ سے بے شمار پلٹے ترتیب دیئے گئے جن سے تمام راگ اور راگنیاں پیدا ہوئیں۔ موسیقی کے اسی ٹھاٹھ سے شاعری میں بحریں ردیف، قافیے اور اوزان ترتیب دیئے گئے۔ کیا آپ اس ساری فنی عمارت کو منہدم کر دینا چاہتے ہیں۔ نثر کا میدان بہت وسیع ہے۔ آپ اپنے قلم میں اگر صحیح قسم کا جوہر پیدا کر لیں تو اُس میں (نثر میں) طرح طرح کی گلکاریاں اور موشگافیاں کی جا سکتی ہیں۔ ہر صنف کلام کی تحریر و تصنیف کا ایک جداگانہ سیاق ہوتا ہے۔ تاریخ، ادب، فلسفہ، ڈرامہ، ناول، ہیئت، ریاضیات، اقتصادیات سائنس وغیرہ وغیرہ۔ اِن سب کے سیاقِ تحریر الگ الگ ہوتے ہیں۔ اہلِ علم و فن کو لازم ہے کہ جب تک سیاقِ تحریر پر کافی قدرت نہ حاصل کر لیں، کسی تصنیف کے لیے قلم ہی نہ اُٹھائیں۔ مستثنات کی اور بات ہے۔ دُنیا نے گبن اور ابنِ خلدون جیسے مورخ بھی پیدا کر دیئے جنہوں نے تاریخی واقعات کے دامن میں ادبیت کے حسین اور خوشنما پھول بھی بھر دیئے۔

نیچرل شاعری کے غلط مفہوم اور تصور سے بھی اُردو شاعری کو خاصہ نقصان پہونچا۔ نیچرل شاعری کا صحیح مفہوم یہ تھا اور ہے کہ زبان اور خیال کو دور از کار اور مصنوعی صنعتوں سے پاک کر دیا جائے۔ نیچرل شاعری کی نافہمیدہ بلا انگریزی زبان سے اُردو زبان میں نازل ہوئی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ علومِ جدید کے اکتشافات اور اختراعات کے لئے الفاظ کہاں سے لائیں جو اُنہیں شاعری کا لباس پہنائیں۔ یہ بھی ایک فقدانِ علم کی دلیل ہوگی۔ علم ہیئت و فلکیات کا یہ ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ ماہتاب اپنے تمام ضیاءِ حسن کے لئے آفتاب کا محتاج ہے۔ اس حقیقت کو شاعر کی زبان میں سن لیجئے ؎

پرتوِ مہر کی رہینِ کرم ؛ ورنہ کیا ماہتاب کی باتیں

یہ ہے نیچرل شاعری کا اصلی و صحیح مفہوم۔

بالآخر میں اپنے تمام اُردو اہلِ قلم سے نہایت مؤدبانہ استدعا کروں گا کہ اپنے مرحوم مشاہیر کی متاعِ بے بہا کو ضائع ہونے سے بچائیں اور ادبِ جدید کی تخلیق اس انداز اور عظمت کی کریں جس سے اُن مرحومین کی رُوح کو امن و انبساط حاصل ہو۔ اہلِ قلم کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ قارئین کے گرتے ہوئے ذوقِ سلیم کو پھر سے ابھاریں اور اُس کی احیاء کا کام کریں۔ ●●

نئی کتابیں

نگاہ اور نقطے (مضامین کا مجموعہ)

اُردو تنقید کی دنیا میں سلیم اختر ابھی نووارد کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن چند برسوں کی ریاضت نے ادب سے باقاعدہ دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں انہیں جانی پہچانی حیثیت دیدی ہے۔ ان دنوں تنقید کا مشغلہ بھی وہی شکل اختیار کرتا جارہا ہے جو کبھی روایتی غزل گوئی کو حاصل تھا کہ جس نے بھی دو چار لفظ جوڑنا سیکھا شاعر یا ادیب بن بیٹھا۔ شہرت کی طلب نے کچھ دنوں سے جس قسم کی تنقید کو ہمارے یہاں فروغ دیا ہے اس میں سنجیدہ اور ذمہ دارانہ ادبی عمل سے زیادہ فقرے بازی، لعن طعن اور لاحاصل بحث کا رنگ نظر آتا ہے۔ مطالعہ محنت اور غور و فکر جن کے بغیر تنقیدی عمل کی آزمائشوں سے گزرنا ممکن نہ تھا، آج کل رسائل میں چھپنے والے بیشتر تنقیدی مضامین اور تجزیوں میں ان کے نشانات ڈھونڈے نہیں ملتے۔ سلیم اختر نے تنقید کی ایک نئی راہ کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے سچی اور باوزن تنقید کے تقاضوں کو بھی دھیان میں رکھا ہے۔ انہوں نے نفسیات کو اپنی تنقید کا پیمانہ بنایا ہے اور فرائڈ اور ایڈلر سے آگے بڑھ کر ینگ کے نظریات کی مدد سے اپنی انفرادی فنی بصیرت اور تخلیقی شعور کی روشنی میں افکار و اشخاص کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

"نگاہ اور نقطے" اُن کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں بارہ مضامین شامل ہیں۔ مجھے غالب پر اُن کے تینوں مضامین، زولیس سے امیر حمزہ تک اور باغ و بہار کے درویش عاشق کے عنوان سے شامل مضامین نے خاص طور سے متاثر کیا ہے۔ ایک ایسی تنقیدی روایت کے پس منظر میں جہاں کسی فن کار یا فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت اصل فن کار کی ذات سے زیادہ کائنات کو سمجھنے میں محنت صرف کی جاتی تھی، سلیم اختر کے یہ مضامین ایک فالِ نیک کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کی دل رُبائی ہر پڑھنے والے کو متاثر کرے گی۔ بنیادی طور پر سلیم اختر خود ایک اچھے تخلیقی فنکار ہیں اس لیے فن کے اصل محرکات کی دریافت اور اُن کے جواز کا جو راستہ انھوں نے اختیار کیا ہے، اُسے خواہ ہر شخص تسلیم نہ کرے لیکن اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہ ہوگا کہ یہ راستے معتبر مذاق و مزاج، سنجیدہ غور و فکر اور قابلِ قدر فنی بصیرت کے بہت سے نشانات اپنے اندر رکھتے ہیں۔

"نگاہ اور نقطے" کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۸۸ ہے جس میں ڈاکٹر وحید قریشی کا دیباچہ اور عرشی صدیقی کا تکملہ بھی شامل ہیں۔ کتاب کی قیمت چھ روپے ہے اور ادارۂ جدید ناشرین، چوک اُردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے

(شمیم حنفی)

غزل انسائیکلو پیڈیا

:- مرتبہ ذکی کاکوروی۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۴۴ صفحات۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن چھ روپے۔ عام ایڈیشن پانچ روپے

ملنے کا پتہ :- مرکزِ ادب اُردو۔ انیس منزل ۱۳۷ شاہ گنج لکھنؤ۔

اپنے انتہائی گمراہ کن نام کے باوجود یہ صرف قدیم و جدید شعراء کے اشعار کا ایک مختصر انتخاب ہے۔ اُردو زبان میں اس سے طویل تر انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ اکثر تذکروں میں بھی منتخب اشعار کی تعداد کہیں زیادہ ہوگی۔ شارب ردولوی نے ابھی حال ہی میں "گل صد رنگ" کے نام سے جو انتخاب شائع کیا تھا اُس کی ضخامت بھی اس سے تقریباً دو چند تھی۔

مرتب کی جانب سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ "غزل انسائیکلو پیڈیا" اُردو میں پہلی بار برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد اُردو کے ممتاز شاعر اور محقق جناب ذکی کاکوروی نے مرتب کی ہے۔۔۔ یہ ابتداء سے دورِ حاضر تک کے تمام اُردو شعراء کے کل کلام کے بہترین اشعار کا مکمل ترین انتخاب ہے جس میں ہر ذوق و نظر کی پسند کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔۔ محض اعلیٰ ترین اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔" پوری انسائیکلو پیڈیا" پڑھ جانے کے بعد بھی اس میں کل ۴۲۱ شعراء کا انتخاب کلام ہے جبکہ ایک تذکرے میں نو نو سو شعراء کے کلام کا انتخاب چھپ چکا ہے۔ ان ۴۲۱ میں سے کئی چند اشعار کو نامعلوم شعراء سے منسوب کیا گیا ہے۔ ماخذ بھی دیوان یا کلیات شعراء نہیں بلکہ زیادہ تر تذکرے

پودوسرے انتخابات ہیں ان ماخذ میں مسعود حسین خاں کی "تاریخ زبان اردو"
درج ہے مختصر یہ کہ نہ تو اس میں تمام اردو شعراء کا انتخاب ہے، نہ ہر
ق و نظر کی پسند کا انتخاب ہے اور نہ ہر منتخب شعر اعلیٰ ترین ہے کتاب
انیکلو پیڈیا تو بہرحال نہیں ہے۔

اگر ان بلند بانگ دعاوی سے قطع نظر کر لی جائے تو یہ غزلیہ اشعار
یک اچھا اور مختصر انتخاب ہے۔ ہر انتخاب کی طرح اس میں جامعیت ڈھونڈھنا
کار ہے لیکن ہم اسے خاصا نمائندہ انتخاب ضرور کہہ سکتے ہیں۔ البتہ اس
اب پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بیشتر اشعار ذوق پر گراں نہیں
تے لیکن اگر ایسے اشعار صرف اعلیٰ ترین اشعار کے زمرے میں شامل نہ
جائیں تو اچھا ہو۔

اگریئ کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

مرزا شوق کے جو اشعار نقل ہوئے ہیں وہ غزل کے نہیں بلکہ مثنوی کے
م ہوتے ہیں۔ اس وقت میرے پاس اصل کتاب موجود نہیں کہ قطعی بات
سکوں۔

ترتیب کے بارے میں مرتب کا دعویٰ ہے کہ حتی الوسع زمانی ہے لیکن
حسن حسن اور شیخ غلام علی راسخ کے ناموں کے درمیان مرزا کاظم حسین
لکھنوی کا نام رکھنے کا جواز نظر نہیں آتا۔ محشر، مصحفی و ثاقب کے ہم عصر ہیں اور
رمین میں اور ان میں ایک صدی حائل ہے امید ہے کہ ذکی صاحب آیندہ اشاعت
ان کوتاہیوں کا ازالہ کر کے اپنے انتخاب کو زیادہ مفید اور عام پسند
ئیں گے۔ موجودہ مجموعہ پھر بھی ایک اچھے انتخاب کی حیثیت سے اس
ل ہے کہ ارباب ذوق مطالعہ کریں۔ (علی جواد زیدی)

کرۂ مسرت افزا

تذکرۂ مسرت افزا :۔ تالیف :۔ ابوالحسن امیرالدین احمد عرف
امراللہ الہ آبادی :۔ ترجمہ : ڈاکٹر مجیب قریشی
ضخامت : $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۲۶۴ صفحات، قیمت : پانچ روپے
ملنے کا پتہ :۔ علمی مجلس کتب خانہ
۱۱۷۲ کلاں محل۔ دلی

"تذکرۂ مسرت افزا" اردو شعراء کا ایک فارسی تذکرہ ہے جو امراللہ
الہ آبادی نے ۱۱۹۳ھ میں مرتب کیا۔ بعد میں دو ایک برس تک اس پر
اضافے بھی کرتے رہے۔ پہلے تو اس کا واحد نسخہ آکسفورڈ یونی ورسٹی لائبریری
میں تھا لیکن اب پروفیسر امیر حسن عابدی نے ایک اور نسخہ ڈھونڈھ نکالا
ہے جو غالباً پٹنہ پہنچ چکا ہے۔ آکسفورڈ نسخے پر مبنی متن قاضی عبدالودود
پہلے ہی شائع کر چکے ہیں۔ یہ متن رسالہ "معاصر" پٹنہ میں بالاقساط شائع
ہوا تھا اور کتابی صورت میں اس کا انتظار ہی کیا جا رہا تھا کہ ڈاکٹر مجیب
قریشی نے فارسی متن کا اردو ترجمہ شائع کر دیا۔ غالباً قریشی صاحب
دوسرے نسخہ کے وجود سے لاعلم ہیں اس لئے ترجمے کے وقت اس
نسخے کی طرف رجوع نہیں کر سکے۔ اگر یہ کام بھی ہو گیا ہوتا تو اور بھی مفید
ہوتا۔ بہرحال، موجودہ صورت میں بھی یہ ترجمہ بہت مفید اور کارآمد ہے

جس زمانے میں یہ تذکرہ مرتب ہوا اس زمانے میں اردو کے بہت
سے اساتذہ حیات تھے۔ اس کے علاوہ امراللہ نے کئی اہم علمی اور ادبی
مرکزوں کا سفر کیا اور وہاں کے شعراء سے مل کر حالات و اشعار جمع کئے ہیں کئی
تذکروں سے بھی مدد لی ہے اس لئے اس تذکرے کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ
تذکرہ اس لئے بھی اہم ہے کہ الہ آباد اور دوسرے مشرقی اضلاع کے
شعراء کے حالات اس میں زیادہ اور بتفصیل ملتے ہیں

قریشی کے ترجمے کی زبان عموماً رواں اور صاف ہے۔ کہیں
کہیں تسامحات ہیں لیکن چنداں قابل التفات نہیں۔ امید کہ آیندہ ایڈیشن
کے لئے نظر ثانی کرتے وقت یہ فروگذاشتیں دور ہو جائیں گی۔

اردو ترجمے کی وجہ سے یہ تذکرہ اب اُن حضرات کی دسترس میں
آ جائے گا جو زبان فارسی پر یا تو عبور نہیں رکھتے یا اس سے ناواقف ہیں
یہ دیکھتے ہوئے کہ فارسی کا رواج روز بروز کم ہوتا جاتا ہے اس کی
ضرورت ہے کہ دوسرے تذکروں کا بھی اس طرح ترجمہ کر دیا جائے
مترجم نے فارسی اشعار کا اردو نثر میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا نہ تو جواز ہے
اور نہ ضرورت۔ ان اشعار کو نقل کر کے اگر ضروری سمجھتے تو ترجمہ بھی
دیدیتے۔

بحیثیت مجموعی تذکرہ "مسرت افزا" کا یہ اردو ایڈیشن صاحبانِ
ذوق و نظر کے مطالعے کے قابل ہے۔ چونکہ فارسی متن کتابی صورت
میں نہیں ملتا اس لئے اس ترجمہ کی افادیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔
(علی جواد زیدی)

30 لاکھ عورتیں غلط نہیں ہو سکتیں

پچھلے چار برسوں میں 30 لاکھ عورتوں نے اپنی مرضی سے لُوپ لگوالئے۔ اُنہیں معلوم ہے، کہ لُوپ مؤثر ہے - یہ حمل روکنے کا سب سے زیادہ قابلِ اعتبار طریقہ ہے۔

یہ سادہ ہے، لیڈی ڈاکٹر اسے چند ہی منٹوں میں لگا دیتی ہے -

یہ نکلوایا جاسکتا ہے - جب آپ چاہیں کہ آپ کے دوسرا بچہ ہو، تو آپ لُوپ نکلوا سکتی ہیں۔

یہ کارآمد ہے - اگر لُوپ آپ کو راس ہے، تو آپ کو کسی اور طریقے کی ضرورت نہیں۔ لُوپ آپ کی جنسی مسرت میں دخل انداز نہیں ہوتا۔

یہ بے ضرر ہے - اِس سے کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ تکلیف ہو بھی جائے، تو اُسے آسانی سے دُور کیا جاسکتا ہے۔

محتاط مُطالعا اور مشاہدے کے بعد ڈاکٹروں نے رائے دی ہے کہ لُوپ عورتوں کے لئے موافق ہے۔ جن عورتوں کو لُوپ راس نہیں، وہ دُوسرے



طریقوں سے اپنے بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھ سکتی ہیں۔ وُہ بچوں کی تعداد بھی اپنے اختیار میں رکھ سکتی ہیں۔

مزید جانکاری اپنے قریب ترین فیملی پلاننگ سینٹر سے حاصل کریں۔

فیملی پلاننگ سے متعلق مشورہ اور خدمت مُفت ہے۔

افواہ کا اعتبار نہ کریں

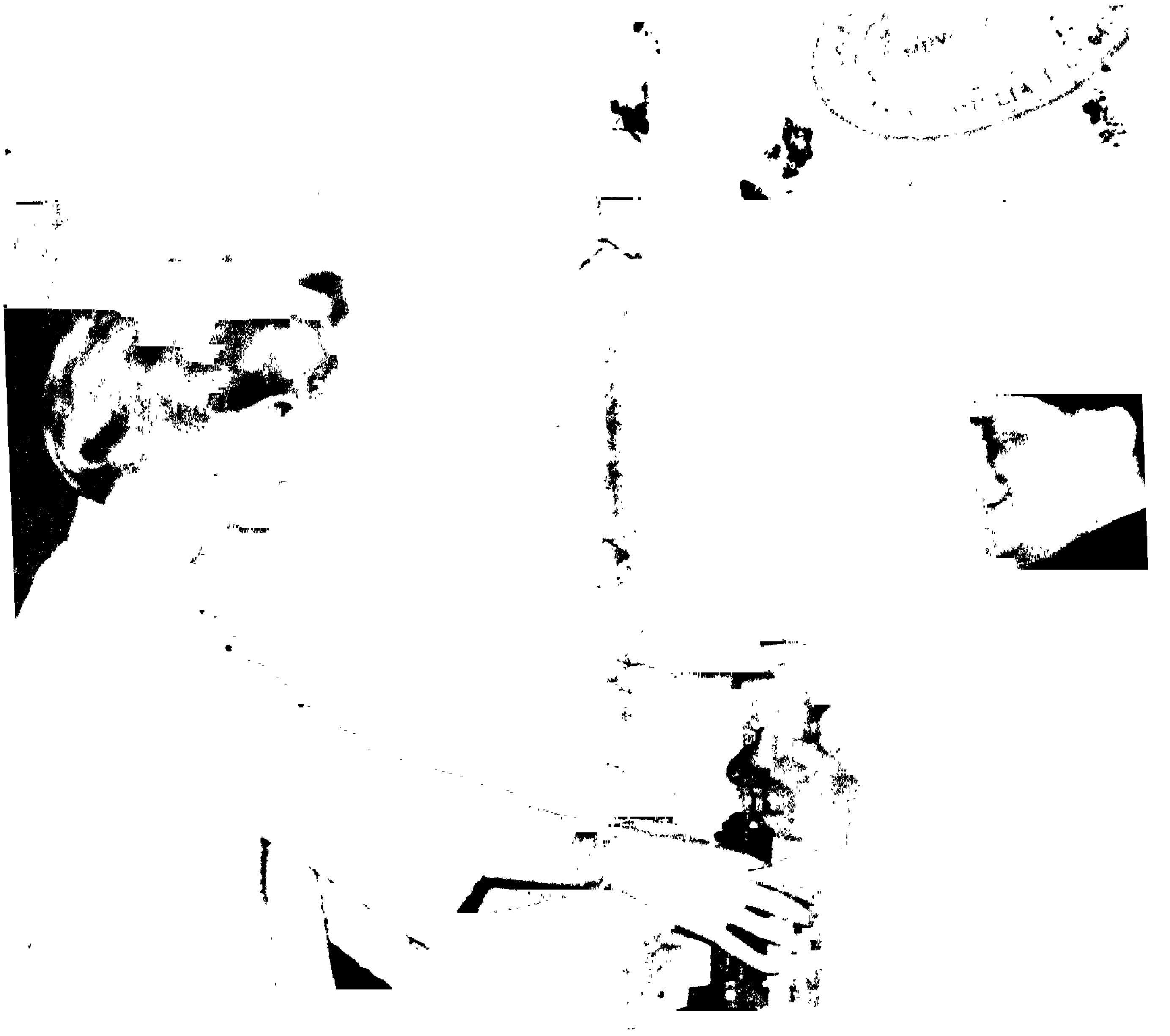




عظم شریمتی اندرا گاندھی ۲ دسمبر ۱۹۶۹ء کو پارلیامنٹ ہاؤس (نئی دہلی) میں چند مسلم ممبران پارلیامنٹ کے ساتھ روزہ افطار کرنے میں
ریک ہوئیں۔

ہلی میں وزیر تعلیم ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ نے ہندوستان کی کرکٹ ٹیم کو ایک استقبالیہ دیا جس میں وزیر اعظم بھی شریک ہوئیں
ریسے (بائیں سے دائیں) شریمتی گاندھی۔ ڈاکٹر راؤ۔ نواب آف پٹودی اور وشوا ناتھ





۱۰ دسمبر کو ایک شاندار تقریب میں وزیر اطلاعات ونشریات ورسل ورسائل جناب ستیہ نراین سنہا نے ہندوستان کے چوتھے بین الاقوامی فلمی میلے میں شریک ہونے والی بہترین فلموں کو انعامات تقسیم کئے۔ بہترین فیچر فلم کا انعام The Damned ۔ کو دیا گیا۔
(تصویر میں) وزیر موصوف طلائی طاؤس اس فلم کی ہیروئن انگرڈ تھولن کو عطا کر رہے ہیں۔

Vol. 28 No. 7 AJKAL (Monthly) February 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi

آجکل

جلد ۲۸

مارچ ۱۹۶۰ء

قیمت ۶۰ پیسے



اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۲۸ ——— شمارہ ۸

پھاگن چیت تک سمت ۹۲-۱۸۹۱

مارچ ۱۹۷۰ء

سرورق: گورچرن اروڑہ

پشت پر: لکھنؤ میں محرم

شرح چندہ

سالانہ چندہ: ہندستان میں: سات روپے، پاکستان میں: سات روپے (پاک)

دیگر ممالک سے ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ: ہندستان میں: ۶۰ پیسے، پاکستان میں: ۶۰ پیسے (پاک)

دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

ترتیب

مضامین اور توسیلے زر کا پتہ

شہباز حسین ایڈیٹر آجکل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ: ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

ملک کو فرقہ وارانہ فسادات، تشدد، باہمی منافرت، اور عدم اعتماد سے جو نقصان پہونچتا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ مالی اور جانی نقصان کے علاوہ اس سے جو نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ انتہائی مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

ملک کے مختلف فرقوں اور گروہوں میں خوش گوار تعلقات، اعتماد اور بھائی چارہ پیدا کرنے کے لیے افراد، تنظیمیں، سیاسی پارٹیاں، دانشور بھی اپنے طور پر سرگرم کار ہیں اور حکومت ہند بھی اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہے۔

۵۶-۱۹۵۵ء میں ریاستوں کی تنظیم نو کمیشن نے لسانی اقلیتوں اور بیرونی جنوں اور آدی باسیوں کے مفادات کے خصوصی تحفظ کی سفارشیں کی تھیں۔ ۱۹۵۸ء میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے قومی یک جہتی سے متعلق ایک سمینار منعقد کیا تھا جس میں مختلف یونی ورسٹیوں اور ثقافتی انجمنوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ اس سمینار نے مندرجہ ذیل سفارشیں کیں: تیز رفتار معاشی ترقی اور ہر شخص کے لیے یکساں مواقع کی فراہمی، امیری اور غریبی کے فرق کو دور کرنا، تمام بچوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم دینا، تاریخ کا مطالعہ جس میں سماجی مسائل پر زور دیا گیا ہو، بچوں کو مختلف زبانیں اور رسم الخط سکھانا۔

۱۹۶۱ء میں حکومت ہند نے جذباتی ہم آہنگی کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے تعلیمی میدان میں تبدیلیوں کی سفارش کی۔ اسی سال ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور مرکزی وزیروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں فرقہ وارانہ سرگرمیوں اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کے علاوہ تہذیبی، تعلیمی اور لسانی ہم آہنگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کو سری جواہر لال نہرو نے قومی یک جہتی سے متعلق ایک کانفرنس بلائی اور قومی یک جہتی کے لیے پہلی بار ایک بڑا قدم اٹھایا گیا۔ اس کانفرنس میں مرکزی وزرا اور وزرائے اعلیٰ، پارلیمنٹ میں مختلف پارٹیوں کے لیڈر، وائس چانسلر، ماہرین تعلیم، سائنس داں، صنعت کار اور ملک کے بہت سے ممتاز افراد نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے قومی یک جہتی کی راہ میں حائل تمام مسائل کا جائزہ لیا اور اپنی سفارشیں پیش کیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے ایک قومی یکجہتی کونسل قائم کی تاکہ یہ کونسل زیادہ گہرائی سے ان مسائل کا مطالعہ کرے اور ان کا حل ڈھونڈھے۔ قومی یک جہتی کانفرنس کے فیصلوں کی بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت کی گئی اور اس کی طرف سے جاری کردہ بیان پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں رکھا گیا۔

قومی یک جہتی کونسل نے (۱) علاقہ پرستی (۲) فرقہ پرستی (۳) طلبا اور اساتذہ کے لیے ضابطۂ اخلاق اور (۴) انگریزی ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کی یونی ورسٹی تعلیم میں جگہ سے متعلق چار کمیٹیاں مقرر کیں۔ علاقہ پرستی سے متعلق کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر سی پی۔ راماسوامی ایئر اور فرقہ پرستی سے متعلق کمیٹی کے سربراہ سری اشوک مہتہ مقرر کیے گئے۔

کونسل نے حکومت سے سفارش کی کہ پریس سے متعلق کمیٹی مقرر کی جائے جو صحافیوں کے مشورے سے اخبار والوں کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق مقرر کرے۔ اس کمیٹی کی سفارشات کے نتیجے میں پریس کونسل وجود میں آئی ہے جو ضابطۂ اخلاق کی پیروی نہ کرنے والے اخباروں کی تادیب و تنبیہ کرتی ہے۔

علاقہ پرستی سے متعلق کمیٹی نے سفارش کی کہ دستور میں آزادیٔ تحریر و تقریر کے جس حق کی ضمانت دی گئی ہے اس میں اس طرح ترمیم کر دی جائے کہ ملک کی سالمیت اور اقتدار اعلیٰ کے تحفظ کے لیے انتظامیہ کو زیادہ اختیارات حاصل ہو جائیں۔ اس کے نتیجے میں حکومت ہند نے ۱۹۶۳ء میں دستور میں سولہویں ترمیم کی، اور آزادیٔ تقریر و تحریر، پُرامن طور پر اور بغیر اسلحہ کے جمع ہونے اور انجمن اور تنظیمیں بنانے کے حق پر پارلیمنٹ کو قانون بنا کے مناسب پابندیاں عائد کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۸ء کے درمیان قومی یک جہتی کونسل کی سرگرمیاں برائے نام رہیں کیونکہ چینی حملے کے بعد ملک میں جو جوش و خروش اور قومی جذبہ و ولولہ دیکھنے میں آیا اس کے پیش نظر اس کی کوئی ضرورت نہ رہی تھی۔

مئی ۱۹۶۸ء میں یہ کونسل پھر سرگرم ہوئی اور ۲۰ جون ۱۹۶۸ء کو سرینگر میں اس کا جلسہ ہوا اور فرقہ وارانہ صورت حال پر خاص طور سے غور کیا گیا۔

یک جہتی کونسل کی مجلس قائمہ کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے ۳ نومبر ۱۹۶۹ء کو ایک آل پارٹی کانفرنس بلائی گئی تاکہ ملک میں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات کو روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔ وزیر اعظم ہند کی سربراہی میں اس کانفرنس نے یہ طے کیا کہ انتظامی اقدامات کے علاوہ تمام سیاسی پارٹیاں قومی اتحاد اور ہم آہنگی کے لیے مشترکہ طور پر عوامی مہم شروع کریں۔

ملک کی بھلائی، بہتری اور ترقی کا تقاضہ یہی ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا پیدا کی جائے تاکہ ہم صحیح معنوں میں اپنے دیش کی روایات کے امین بن سکیں۔

آصف فیضی



مشرق وسطیٰ اور ہم

بعض لوگ مشرق وسطیٰ کے نام پر اعتراض کرتے ہیں جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ یہ نام یورپ کے تسلط کی یاد دلاتا ہے، دوسرے اس لیے کہ یہ نام بحیثیت ارض کے لیے ناقص ہے، تیسرے اس لیے کہ ہماری وزارت خارجہ اس خطہ کے لیے "مشرق وسطیٰ" کے بجائے "مغربی ایشیا" استعمال کرتی ہے۔ لیکن اس مضمون کی ضروریات کے لیے اس کو غلط العوام فصیح کے مصداق درست سمجھنا چاہیے۔ خود مشرق وسطیٰ کے لوگ بھی اسی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں، اور یورپ اور امریکہ میں عام فہم اور مستعمل ہے۔ اور مشہور مورخ عرب و اسلام، پروفیسر برنارڈ لوئس، اس کو واضح اور صحیح سمجھتے ہیں۔ یہ اصطلاح ۱۹۰۲ء میں امریکہ کے بحری مورخ الفرڈ تھیر ماہن نے پہلی بار استعمال کی تھی اور اس سے عرب و ہندوستان کا درمیانی علاقہ مراد لیا تھا۔ بعد میں یہ اصطلاح چل پڑی اور عام طور پر استعمال ہونے لگی۔ ایک اسلامی مورخ کے لیے یہ نام بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ مشرق وسطیٰ اور مغرب اقصیٰ میں نمایاں فرق کیا جا سکتا ہے اور مزید توضیح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

مشرق وسطیٰ دنیا کا ایک ایسا حصہ ہے جس میں مشرق و مغرب کے تمدن و تہذیب کا میل جول ہے، وہاں کے باشندے اس کو صحیح معنوں میں گہوارۂ تہذیب و تمدن تصور کرتے ہیں، چنانچہ دنیا کے تین بڑے مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔

میں نے دنیا کے حسب ذیل ممالک کو اس خطے میں شامل کیا ہے۔ جس میں افریقہ۔ مغرب، الجزائر، تونیسیہ، لیبیا، مصر (جمہوریہ متحدہ) اور سوڈان۔ ایشیا: ترکی، عربستان یعنی سعودی عرب، شام، عراق، سلطنت عمان، یمن اور حضرموت، سواحل عرب، لبنان، ایران، اور افغانستان۔

اس علاقے میں تین خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔

اولاً:۔ اسلام کا غلبہ

ثانیاً:۔ عربوں کی اکثریت

ثالثاً:۔ زبان عربی کا عام رواج

اس علاقے کے تقریباً ۹۰ فی صد لوگ مذہباً مسلمان ہیں۔ اہل عرب اکثر ملکوں میں پائے جاتے ہیں اور ان کی تعداد تقریباً دس کروڑ ہے، ترک اور ایرانی تقریباً تین کروڑ ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو ان ملکوں سے کیا مناسبت ہے ان سے متعلق معلومات حاصل کرنے سے ہم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مذہبی، اقتصادی، سیاسی اور تاریخی لحاظ سے ہند و عرب کا رشتہ تقریباً تین ہزار سال پرانا ہے۔ ہمارے ہندوستانی جہازراں زمانۂ قدیم سے یہاں کے مسالے، اور موتی، ریشم اور سوتی کپڑا، شالیں اور جواہرات سواحل عرب تک لے جاتے اور عربستان جس کو سنسکرت میں دنا یو کہتے تھے، وہاں سے مرجان، سیندور، شیشہ، سونا اور زعفران لاتے

تھے۔ موہن جوداڑو کے لوگوں کے بھی عربستان سے کافی اچھے تعلقات تھے۔ راجہ ہرش کے لشکر میں عربی گھوڑے پائے جاتے تھے اور اہلِ عرب ہندی تلوار کو بہت پسند کرتے تھے جس کو عربی میں المہند اور فارسی میں ہندوانی موسوم کرتے تھے۔ سوتی کپڑے کو اہلِ عرب قسطنہ کہتے تھے، بعد میں یہی لفظ انگریزی کاٹن کا ماخذ بنا۔ دریائے فرات کے کنارے ایک ہندی قبیلہ دوسری صدی قبل از مسیح بسا ہوا تھا۔

ہندوستان کے مذاہب بھی وہاں تک پہنچ گئے تھے۔ البیرونی کا قول ہے کہ اشوک کے زمانے میں بدھ مذہب عربستان تک پہنچ گیا تھا اور اہل عرب تمدنِ ہند سے کافی واقف تھے۔

عباسیوں کے عروج کے زمانہ میں رومی علوم کے علاوہ ہندوستانی سائنس اور ہندسہ کی کتابیں عرب تک پہنچ گئی تھیں۔ پنچ تنتر اور ہتوپدیش کے قصے عربی میں ترجمہ ہوچکے تھے اور الف لیلہ کی بہت سی کتابوں میں ہندوستانی اثر موجود ہے۔

اب آیئے ہم ایک نظر سیاسیات پر ڈالیں۔ جس وقت اسرائیلی تسلط کی کشمکش شروع ہوئی اس وقت گاندھی سے لے کر نہرو تک سبھی لیڈروں نے عربوں کا ساتھ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے معاملہ میں مصر اور اکثر ممالک عرب نے ایک غیرجانبدارانہ رویہ اختیار کیا۔ رئیس ناصر، نہرو کی پالیسی کے بڑے مداح تھے اور ان دونوں میں برادرانہ مراسم تھے۔ اکثر عرب ہمیشہ سے اس اصول پر چلے ہیں کہ ہندو پاکستان کے باہمی اختلافات میں انہیں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ دونوں بھائی ہیں اختلافات کے باوجود ایک ہیں۔ کبھی نہ کبھی اُن کے اختلافات ضرور دُور ہوجائیں گے۔ اسی لئے اہلِ عرب ہمیشہ سیاسی آگ بھڑکانے سے پرہیز کرتے رہے اور اب بھی علی العموم اُن کی پالیسی یہی ہے۔

اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اِن ملکوں کے سیاسی اور اقتصادی حالات سے اچھی طرح واقفیت حاصل کریں۔ عربی، فارسی و ترکی کا علم حاصل کئے بغیر ہمارا سیاسی کام چلنا مشکل ہے۔ قدیم عربی (العربیہ) سے ہمارے ملک کے معدودے چند علماء واقف ہیں لیکن جدید عربی کے جاننے والے بہت کم ہیں اور روزمرہ کی بولی سے بالکل ناواقف ہیں، نیز جدید فارسی اور جدید ترکی سے بالکل بے بہرہ ہیں، آج کل معاملات اور خاص کر کی زبان بازار قاہرہ یا دمشق میں نہیں بولی جاتی ہے اس بات کی خصوصی ضرورت ہے کہ ہمارے سفارت خانوں کے لوگ خصوصاً ہمارے سفیر اور ان کے نائب ایسی بولی سے واقف ہوں جو عام فہم اور مستعمل ہو کیونکہ اگر ہم مشرق وسطیٰ کی بولیاں نہیں بول سکتے ہیں تو ہماری سیاسی اور اقتصادی کوششیں ناکام اور بے سود رہیں گی۔

چارلس عیسوی نے جو کولمبیا یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں، نے اپنی کتاب "مشرق وسطیٰ کی اقتصادی تاریخ" میں لکھا ہے کہ اس کرۂ ارض کی تاریخ وہی ہے جو ہمیشہ سے تاریخ رہی ہے یعنی پہلے ابتدا پھر عروج اور پھر زوال۔ آٹھویں صدی سے دسویں صدی عیسوی تک عروج کا زمانہ تھا۔ بارہویں سے سولہویں صدی عیسوی تک بتدریج زوال آیا اور انیسویں صدی سے دوبارہ اقتصادی طاقت ابھر رہی ہے۔ پٹرول کے ذخائر کی دریافت نے ان علاقوں کی اقتصادی حالت کو بہت بدل دیا ہے اور اس بات کے بڑے امکانات پیدا ہوگئے ہیں کہ ان میں اور ہمارے ملک کے درمیان وسیع پیمانے پر تجارتی تعلقات قائم ہوں۔ اس تمام بحث سے یہ ضرورت بالکل واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ ہمیں اپنے ملک کی اندرونی اور بیرونی تجارت کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوں اور ہمارے تاجروں کو آسانی سے معلوم ہوجائے کہ کونسی اشیاء جو ہم بنا سکتے ہیں ہم فروخت کرسکتے ہیں وہ مشرقِ وسطیٰ میں کہاں کہاں کھپ سکتی ہیں مشرقِ وسطیٰ بھی ایک ایسا کرۂ ارض ہے جس میں ہمارا سوتی اور ریشمی کپڑا، اشیائے چائے، صابن اور دوسری اشیاء فروخت کی جاسکتی ہیں اس لئے ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہئے جہاں سے یہ سب معلومات حاصل ہوسکیں اور ہم ایسے علاقوں کی زبانیں بھی سیکھ سکیں۔

میرے خیال میں مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ بولیوں عربی، فارسی و ترکی کی تعلیم کا فوری بندوبست ہونا چاہئے۔ ان کے علاوہ ہمیں اِن باتوں کی جانکاری بھی ہونی چاہئے:

(۱) مشرق وسطیٰ کی اقتصادی ضرورتوں، تیل کا بیوپار، اور اقتصادی ترقی

(۲) اس علاقے کی معاشرتی اور تہذیبی حالات، ان کا قانون، عوام (عربیت) کی تحریک۔ اس خطے میں تین زبانیں رائج ہیں عربی، فارسی

ترکی، یورپ اور امریکہ میں عام طور سے یہ تینوں "اسلامی زبانیں" کہی جاتی ہیں ان تینوں میں سب سے زیادہ رائج عربی زبان ہے، اسلام کی زبان عربی ہے اس کی شریعت اس کا قانون، اس کی تاریخ، اس کی اصلی اقدار، اس کا فلسفہ اسی میں قلمبند ہے۔ جدید اور قدیم عربی میں کچھ فرق ضرور ہے مگر جدید عربی بیس ملکوں کی سرکاری زبان ہے، دس کروڑ لوگوں کی بولی ہے اور اقوام متحدہ میں ترجمانی کے لئے پانچویں زبان قرار دی گئی ہے انگریزی فرانسیسی، روسی اور اسپانی کے بعد اس کا شمار ہے۔ اقوام متحدہ میں ہر تقریر ان پانچوں زبانوں میں ترجمہ ہوتی ہے۔

قدیم عربی چھ سو سال تک ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ جدید تہذیب و سائنس و فلسفہ اسی کی دین ہیں۔ اور جدید عربی اسی سے نکلی ہے یہ ایک اہم غیر ملکی زبان ہے جس کو سیکھ کر ہم یقیناً فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ صحیح طور پر اگر غور کیا جائے تو ہندوستانیوں کے لئے انگریزی زبان کے علاوہ یہی زبان سب سے زیادہ اہم اور ضروری غیر ملکی زبان ہے

آج کل عربی زبان کی تین شکلیں رائج ہیں۔ قدیم عربی جس میں اسلام کا تمام ادبی ذخیرہ موجود ہے۔ دوسرے رائج عربی (Standard Arabic) ریڈیو، صحافت، یونی ورسٹی اور پارلیمنٹ کی زبان ہے جو مراکش سے لے کر یمن تک ایک ہی ہے اور عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ قدیم عربی ہماری یونی ورسٹیوں اور مذہبی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ ایک مشکل اور ادبی زبان ہے۔ اس کے پڑھنے سے کوئی عملی یا اقتصادی فائدہ کسی طالب علم کو نہیں پہنچتا ہے، اس سے نکلی ہوئی رائج عربی ہے۔ اس زبان کی تعلیم و تدریس یہاں ہندوستان میں بہت ضروری ہے، اسی سے تجارت و سیاست میں فائدہ پہنچنے کی گنجائش ہے۔

ان دو کے ماسوا ایک "دارجہ" بھی ہے۔ یہ وہ خاص بولی ہے جو بازاروں میں بولی جاتی ہے۔ ہر شہر اور ہر ملک کی بازاری بولی مختلف ہے اور جب تک کہ ایک شخص اس شہر یا ملک میں قیام نہ کرے بولنا مشکل ہے۔

بہر صورت آج کل کی زندہ بولیوں پر توجہ دینی نہایت ضروری ہے۔ اسی زبان سے ہم عربوں سے مل کر بات چیت کر سکتے ہیں۔ ان کے خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں ان کے دلی جذبات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ معلقات اور حماسہ کے مطالعہ سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔

میں جس وقت مصر میں سرکار ہند کی سفارت پہ مامور تھا اس وقت قدیم عربی سے واقف تھا لیکن بول چال کی زبان سے نابلد تھا اور اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے باقاعدہ سبق لیا اور بازار میں بولی جانے والی عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود عرب مجھے نحوی GRAMMARIAN کہتے تھے اس لئے کہ میری بول چال کی زبان میں اکثر کتابی اور ادبی الفاظ آجاتے تھے اور ان کا رواج روزمرہ میں متروک سمجھا جاتا تھا۔ اور لفظ "نحوی" ذم کا پہلو رکھتا ہے!

مشرق وسطیٰ کی دوسری زبان فارسی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد تین کروڑ ہے۔ فارسی ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے زمانے میں کافی رائج ہو چکی تھی۔ ایران کے علاوہ یہ افغانستان کی بھی سرکاری زبان ہے۔ اب بھی ہماری یونی ورسٹیوں کالجوں اور اسکولوں میں اس زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایرانی زبان کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ قدیم ایرانی یعنی ژنداوستا جس کو ژند کہتے ہیں۔
۲۔ پہلوی،
۳۔ فارسی،

قدیم ایرانی اور ویدک زبان میں گہری مناسبت بلکہ یکسانیت ہے، وہ بہنیں ہیں۔ اور جیسے ویدک زبان سے سنسکرت اور سنسکرت سے پراکرت اور پراکرت سے ہندی نکلی ہے، اسی طرح سے قدیم ایرانی (ژند) سے پہلوی، اور پہلوی سے فارسی پیدا ہوئی ہے یہ ادبی فارسی تقریباً ایک ہزار برس، یعنی عہد فردوسی سے بہت کم بدلی ہے۔ اس رشتہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندی اور اردو فارسی کی خالہ زاد بہنیں ہیں۔

آخری ایک ہزار سال سے ایران اور افغانستان میں زبان فارسی رائج ہے، مغلیہ زمانہ میں یہ ہندوستان میں سرکاری زبان تھی۔ لیکن

بول چال کی زبان میں اتنا فرق نہیں ہوا ہے جتنا کہ قدیم اور جدید عربی میں، ادبی، فارسی جاننے والا جدید فارسی بہت آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ تلفظ میں البتہ فرق ہے۔ لیکن اس میں کوئی خاص مشکل نہیں ہے۔ ادبی فارسی کے متعلق ایک بات ضرور عرض کرنی ہے۔ ہماری درس گاہوں میں اکثر فردوسی سے لے کر جامی تک (یعنی دسویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک) کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن آج کل کے علماء اور خصوصاً چکوسلاویا کے مشہور فارسی داں یان ریپکا نے ثابت کیا ہے کہ آخری دو سو برسوں میں ایران افغانستان اور تاجکستان میں ایک نئی شاعری اور نئی نثر کی بنا ڈالی گئی ہے۔ جو آج کل کے اور خاص کر مارکسی خیالات کی آئینہ دار ہے، اور یہ ادبی ذخیرہ قدیم ادبی ذخیرے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان ادیبوں شاعروں اور نثاروں کے ادبی کارناموں سے ہم کو بھی فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

مشرق وسطیٰ کی تیسری زبان ترکی ہے۔ اس ملک میں ترکی سلطانوں نے کوئی پانچ سو سال تک عثمانی ترکی کو رائج کیا۔ یہ پہلے عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی لیکن کمال اتاترک کے زمانے سے یعنی ۱۹۲۸ء سے ایک نئی زبان ترکی جو رومن لپی میں لکھی جاتی ہے وہ منظر عام پر آئی اور سرکاری زبان بن گئی۔ آخری تیس سال میں نئی ترکی نے کافی ترقی کی ہے اور مطبوعات جامعہ انقرہ اور استنبول سے ظاہر ہے کہ ان کی کتابیں ہر فن اور سائینس میں چھپ رہی ہیں جو تعداد میں یورپ کے چھوٹے ممالک سے ہرگز کم نہیں البتہ انگریزی فرنچ اور جرمن کا مقابلہ نہیں ہو سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ اس اہم اور بڑھتی ہوئی زبان سے ہم ہندی بالکل ناواقف ہیں۔ خود قدیم ترکی کے جاننے والے ہندوستان میں کم ہی ہیں لہٰذا جدید ترکی کے جاننے والوں کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی اقتصادی حالت بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔ ہزاروں مدرسے ٹیکنیکل اسکول، اسپتال، کارخانے وغیرہ بن رہے ہیں۔ ان میں مدرسوں، انجنیروں اور ڈاکٹروں کی بے حد ضرورت ہے، یہ ضرورت ہمارے نوجوان بخوبی پوری کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی کمی نہیں ہے اگر ان کو جدید عربی سیکھنے کا موقع دیا جائے تو وہ اپنی روزی کما سکیں گے اور ہندوستان اور عربی ممالک میں دوستی اور خیرسگالی کا رشتہ قائم کرنے میں مددگار ہوں گے۔

امریکہ میں ایسے اٹھائیس ادارے ہیں جہاں مشرق وسطیٰ کی زبانیں، تاریخ، اقتصادیات اور دیگر فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں جدید عربی، جدید فارسی اور جدید ترکی کے مدارس موجود ہیں۔ بڑے بڑے کتب خانے ہیں جہاں ہر قسم کی کتابیں اور جرائد دستیاب ہیں۔

کیا ہندوستان میں چار ایسے ادارے قائم نہیں ہو سکتے۔ جن میں یہ تین ضروری زبانیں سکھائی جائیں اور ان ملکوں کے تاریخی اقتصادی اور سیاسی حالات کی تعلیم دی جائے؟

گاندھی شت دل (ہندی)

مرتب: سوہن لال دویدی

گاندھی جی نے ہندوستانی سیاست کو ہی نہیں ادب کو بھی غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ہندوستان کی سبھی زبانوں میں ان گنت کتب شائع کی گئی ہیں۔ ہندی کی زیر تبصرہ کتاب "گاندھی شت دل" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں گاندھی جی سے متعلق ہندوستان کی ۱۴ علاقائی زبانوں کی ۱۰۱ منتخب نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ اردو شعراء میں سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم، سرور لکھنوی، ساغر نظامی، عرش ملسیانی، احسان دانش، شمیم کرہانی، نذیر بنارسی، وامق جونپوری اور کرشن موہن کی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ اس طرح دیوناگری لپی میں اردو کی چند اچھی نظمیں یکجا ہو گئی ہیں۔ یہ مجموعہ گاندھی ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔ اردو والے اب عام طور سے ہندی رسم خط سے واقف ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کئی لحاظ سے مفید ثابت ہوگا۔

قیمت:- پانچ روپے۔ صفحات، ۲۹۴

ملنے کا پتہ:- پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی-۱

غزلیں



جاگ اُٹھے تھے مری آنکھوں میں یہ کس رات کے خواب
دل کے آنگن میں گرے ٹوٹ کے کتنے مہتاب

میکدے کی یہ حسیں شام، یہ یادِ احباب
موجِ خوں بن کے نہ رہ جائے کہیں موجِ شراب

اُن دیاروں کی فضا آج نہ جانے کیا ہو؟
جن دیاروں میں ہوئے تھے کبھی ہم خوار و خراب

ہجر کی دھوپ میں جل بجھ کے ہوئے راکھ تمام
تیری یادوں کے کنول، اپنی امیدوں کے گلاب

ہر ورق پر وہی اک نام تھا، جو محو ہوا
سادہ مجموعۂ اوراق ہے اب دل کی کتاب

آنے والے ہیں جو لمحے، کوئی سمجھا دو انہیں
مجھ سے مانگیں نہ مری عمرِ گزشتہ کا حساب

صاف صاف آج نظر موت کا چہرہ آیا
زندگی ہم سے ملی آج برافگندہ نقاب

آگہی جرم، اور اس جرم کی پاداش سہی
زندگی بھر کے لیے، سوچتے لمحوں کا عذاب

سب زمیں بوس ہوئے ٹوٹتی شاخوں کی طرح
سہہ سکا کون یہاں تند ہواؤں کا عتاب

حاصلِ عمرِ طلب کچھ بھی نہ نکلا مخمور
ہم جسے ڈھونڈھتے پھرتے تھے وہ شے تھی نایاب

تنویر سعیدی

ایک حرفِ سادہ اُن رنگین افسانوں میں تھا
کل اسی کا شور آدھی رات کو کانوں میں تھا

اک صدائے بے حصولی آج اس کا نام ہے
لوگ کہتے ہیں کہ یہ ذرہ بھی طوفانوں میں تھا

کون لے آیا اسے زندانِ خاک و خون میں
یہ خزانہ تیری چاہت کے بیابانوں میں تھا

ہاں وہی شمعِ حیا روشن تھی جو اس موڑ پر
یہ دلِ سادہ بھی شامل اس کے پروانوں میں تھا

تو نے جو دیکھا نہیں اُس کی شکایت ہے عبث
میرا چہرہ رازِ وحشت کے نگہبانوں میں تھا

خود کو پانے کی ہوس میرا تماشہ بن گئی
میرا قصہ شہر کے مشہور رومانوں میں تھا

شمیم حنفی



خود فریبی کا یہ نشہ بھی اُتر جائے گا
ایک لمحے کی شرارت سے بکھر جائے گا

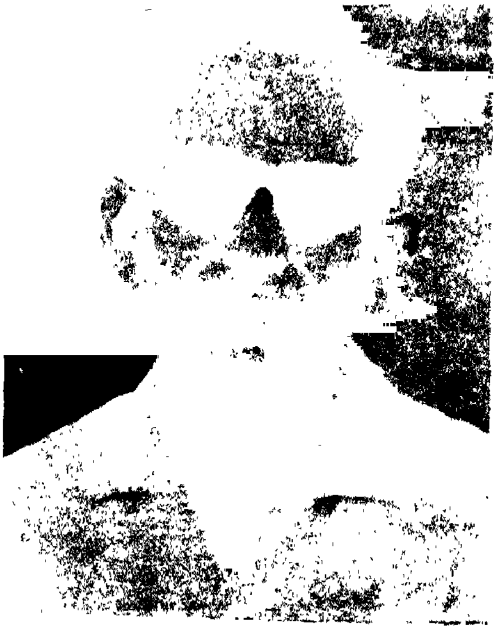
شب گزیدوں سے وہیں صبح کی سازش ہوگی
میرا سورج پھر اُسی شام کے گھر جائے گا

ایک دو پل کے لئے قہر فشاں ہے مجھ میں
قریۂ جاں سے یہ سایہ بھی گزر جائے گا

اُس کی ہر سانس میں ملفوف تھا اللہ کا نام
میں نہ کہتا تھا کہ جھوٹا ہے، مکر جائے گا

جانے کس زعم میں آئینہ بنا پھرتا ہے
اپنی تصویر جو دیکھے گا تو ڈر جائے گا

اے تماشے کی ہوس! چھین لے آنکھیں میری
بوجھ یہ سارا مری روح کے سر جائے گا



غبار کارواں

(۲)

اختر اورینوی

محاسبۂ نفس ایک مشکل کام ہے۔ اپنے نفس اور اپنی شخصیت کا تجزیہ شاید ناممکن ہے۔ دراصل تجزیۂ نفس کرنے والا ہر شخص دوسروں کے ذہن و نفس کا تجزیہ کرتا ہے اور اس بنا پر نفسیاتی علاج بھی ہوتے ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ سے مدد لے کر کاروبار، پیشہ اور دوسرے مشاغل اور ملازمتوں کا تعین بھی کیا جاتا ہے۔ بہرکیف ایک شخص کو اپنا تجزیۂ نفس بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔ جو شخص ایسا نہیں کر سکتا وہ شترِ بے مہار ہو جاتا ہے۔ صوفیوں نے محاسبۂ نفس پر بہت زور دیا ہے۔ اپنے نفسی میلانات کا تجزیہ پورے طور پر نہ بھی ہو سکے تو بھی کرتے رہنا چاہیئے کیوں کہ یہی طریقہ ثقافت و روحانیت میں ترقی کرنے کا ہے۔ ایک صاحب تجزیہ صوفی اور ایک ماہر علم النفس یہ مشورہ ضرور دیتا ہے کہ کسی مرشد یا کسی ماہر نفسی تجزیہ کار کی تلاش کی جائے۔ بغیر ان کی مدد کے صحیح رنگ میں تجزیۂ نفس اور شخصیت کے عناصر ترکیبی کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ میں اوّل الذکر فرض انجام دے دیتا ہوں یعنی اپنا آپ محاسبہ کر کے نتائج سے دنیا کو آگاہ کرتا ہوں۔ اس میں میری رسوائی ہوگی یا سرخ روئی مجھے نہیں معلوم اور مجھے یہ بھی نہیں پتہ کہ میرا لاشعور یا شعور کہاں کہاں پردہ داری کرے گا اور کہاں کہاں پردہ دری۔

شخصیت کی تعمیر میں معاشرہ اور ماحول حصّہ لیتے ہیں۔ انفس و آفاق کا رشتہ گہرا ہوتا ہے۔ ماحول قریب کے علاوہ وراثت کے ذریعہ ماحول بعید کا اثر بھی پڑتا ہے۔ خود وراثت ایک نہایت ہی اہم شخصیت آفریں توانائی ہے تو وراثت کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم و تربیت، اصلاح و ارشاد، تبلیغ و ہدایت سے نفسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور ان کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ تربیت، لعل بدخشاں ایک روشن حقیقت ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہر سنگ و خشت کو ہم لعل بدخشاں نہیں بنا سکتے۔ مگر شخصیت کا مسئلہ اتنا واضح نہیں ہوتا۔ ہمیں کیا پتہ کہ کون سا شخص کیا امکانات ترقی رکھتا ہے۔ کون سنگ و خشت ہے اور کون قیمتی پتھر، اس لئے بشری تقاضہ ہمیں اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ ہم ہر انسان کو قیمتی سمجھیں اور اس کی خودی سے آس لگا کر بڑے امکانات کی توقع کریں۔

جاجنیری سادات عرب سے شاید ایران کے راستے سے پنجاب میں داخل ہوئے اور پٹیالہ (پنجاب) میں آ بسے، وہیں انہوں نے بارہ گانواں بسایا۔ انہیں گاؤں میں سے غالباً مرکزی گاؤں جاجنیر تھا۔ تغلقوں اور خلجیوں کے زمانے میں میرے آبا و اجداد نبرد آزماؤں میں شامل ہو کر اتر پردیش اور بہار آئے۔ کچھ تو یوپی ہی میں بس گئے۔ قبیلہ کا دوسرا حصہ بختیار خلجی کی فوج میں شامل ہو کر

ارآیا۔ سید احمد جاجنیری میرے جدِ اول تھے بکسار ی ضلع مونگیر میں
ن کا مزار ہے۔ اُن کے ایک صاحبزادے سید احمد جان فاتحانہ طور
اورین (ضلع مونگیر) میں داخل ہوئے اور وہیں آباد ہوگئے۔ اورین
ں پہاڑی جگہ پر ہے۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت گرینائٹ پتھر کی پہاڑی
وں کے پہلو میں ہے۔ ایک ڈیڑھ میل جنوب میں جنگلوں سے بھرا
ا کوہستانی سلسلہ ہے۔ چار میل دور شمال کی جانب دریائے گنگا
ریں لیتا ہے۔ میرا خاندان سپاہیوں کا خاندان رہا ہے۔ بعد میں
ہ کاشتکار بن گیا۔ ظاہر ہے کہ اوائل میں امامتِ ملت، اور صوفیت
بھی اس کے حصے میں آئی تھی۔

میرا خاندان اختیار الدین بن بختیار خلجی کے عہد سے اورین
یں آباد ہے۔ سرکاری ملازمت سے ہمیشہ اجتناب رہا۔ وعظ و تلقین
سپہ گری اور تیغ آزمائی، کاشتکاری اور فلاحی پیشہ ہائے آبا، رہے
ں۔ میں پہلا بدنصیب ہوں جو ملازمت کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ میری
شخصیت کی تعمیر میں میری روایاتِ خاندان نے بڑا حصہ لیا۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرّہ آفتابِ تابا نیم

لاشعوری طور پر چراغ مصطفوی کی لو میری شخصیت میں سوز و ساز پیدا
رتی رہی ہے اور جاجنیریوں کے مجاہدانہ میلانات میرے مزاج میں
موجود ہیں۔ ابھی تک تلوار تو نہیں اٹھائی لیکن میرے مزاج اور
میری تحریر میں کچھ کاٹ ضرور پائی جاتی ہے۔ بفضلہ تعالیٰ آج تک میں
کسی شخص، کسی مجمع، کسی میلان، یا کسی معیبت سے ڈرا نہیں ہوں —
خوف طاری ہوتا ہے۔ لیکن میں اس پر بہت جلد فتح پالیتا ہوں۔ میں
بزدلانہ مفاہمت کا قائل نہیں۔ ہاں خواہ مخواہ جھگڑنا، تندخوئی یا
سخت مزاجی کو راہ دینا پسند نہیں کرتا۔ غالباً یہ حسنی میلان ہے صلح
کرانا، درمیانی راستہ نکالنا اور تھوڑی قربانی کرنے سے دریغ نہ کرنا
بھی بحمد اللہ میری فطرت میں ہے۔ میں ان سب میلانات کو اپنی خوبی
نہیں بزرگوں کی دین سمجھتا ہوں۔

میرے پردادا سید عنایت حسین صاحب نے سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ
علیہ سے بیعت کی تھی اور میری دادی اماں مرحومہ کے خاندان کے لوگوں نے
سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لشکر میں شامل ہوکر پنجاب اور بالاکوٹ (سرحد)
میں جہاد بھی کیا تھا کچھ لوگ اسیرِ فرنگ ہوکر کالا پانی بھی بھیجے گئے تھے۔
پھر میرے والد اور چچا صاحب نے حضرت غلام احمد مرزا قادیانی کی بیعت
کی۔ تحریک احمدیت نے میری شخصیت کی تعمیر میں بہت ہی گہرا حصہ لیا ہے۔

جماعت احمدیہ کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد مرحوم
نے میری نفسی ذہنی اور اخلاقی تربیت میں بہت بڑا حصہ لیا۔ آپ کی تصنیفات
خصوصاً آپ کی تالیف تفسیر کبیر نے میری فکری اور روحانی حالت کو گہرے
طور پر متاثر کیا ہے۔

میری والدہ مرحومہ کے مزاج میں کافی گداز پایا جاتا تھا ان کا ذوق
نہایت لطیف تھا اور مزاج میں شعریت تھی۔ اُن کی ہر ہر بات سے
ستھراپن اور اجلاپن ٹپکتا تھا وہ اپنا کمرہ اتنے خوبصورت انداز میں آراستہ
رکھتی تھیں کہ جی خوش ہوجاتا تھا۔ دُور دُور کے گاؤں کے رہنے والے
اُن کے آراستہ کمرے کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ اب سوچتا ہوں کہ والدہ
مرحومہ کے کمرے میں ہوتا کیا تھا۔ صرف سلیقہ اور ستھرائی، فضول خرچی نام
کو بھی نہ تھی۔ دادی اماں مرحومہ اور والدہ مرحومہ کی سیرت میں سادگی اور
غریب نوازی پائی جاتی تھی۔ گاؤں کی غریب سے غریب عورتوں سے یہ
دونوں خواتین بڑی محبت سے پیش آتی تھیں اور ہمیں تلقین کرتی تھیں
کہ خلقِ خدا سے نرمی اور محبت سے برتاؤ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی نیک
مثال نے میری شخصیت کی تعمیر میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ہے۔

میرے چچا سید ارادت حسین صاحب اور میرے والد سید
وزارت حسین صاحب مذہبی تصنیفات کرتے رہے ہیں چچا مرحوم کو
ادبی کتابوں اور رسالوں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ میرے گھر میں ایک
چھوٹی موٹی لائبریری تھی اور ہمارے آبائی بنگلے پر ادبی نشستیں بھی
ہوتی تھیں۔ ان کے سرپرست چچا مرحوم ہوتے تھے اور روحِ رواں
بھائی محمد حسین مرحوم ہوتے تھے۔ انہیں عبدالحلیم شرر کے ناولوں، مولانا
ابوالکلام آزاد کے مضامین و خطبات، نیاز فتحپوری کے افسانوں البلاغ،
الہلال اور نگار سے بڑی محبت تھی۔ کبھی کبھی طلسم ہوش ربا اور طلسم
نور افشاں کی خواندگی بھی ہوتی تھی۔ رمضان کے زمانے میں بالخصوص
درسِ قرآن حکیم کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ عام دنوں میں بھی درس

ہوتا تھا۔ میری ننھیال میں ادبی مذاق عام تھا۔ میرے ماموں جان حسن امام مرحوم شاعر تھے اور بڑے ماموں محمود صاحب مرحوم 'مخزن' اور 'تمدن' میں لکھنے والے ادیبوں میں شامل تھے۔ خاندانی ماحول نے میری شخصیت میں علمی اور ادبی میلانات پیدا کئے۔ جب میں بڑا ہوا تو تعلیم کی غرض سے پٹنہ آیا۔ شاد عظیم آبادی زندہ تھے اور پٹنہ کی ادبی فضا بہت غنیمت تھی۔ ہم لوگوں نے سائنس کالج میں بزم سخن قائم کی اور پھر پٹنہ کالج کی بزم ادب میں بھی دھوم مچانے لگے۔ مجموعی طور پر عظیم آباد اور پٹنہ کے تعلیمی اداروں نے میری شخصیت کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔

میری تعلیم رنگ برنگی ہوئی ہے۔ ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ نے دی۔ پھر گھر پر استادوں سے پڑھتا رہا۔ مڈل کے بعد کے درجے میں اسکول میں داخل ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم سائنس کی ہوئی۔ ڈھائی سال میڈیکل کالج پٹنہ میں پڑھتا رہا۔ سخت بیمار پڑا۔ صحت گاہوں میں گھومتا پھرا، اور بن میں کاشتکاری میں مشغول رہا۔ سیر و تفریح کی، شکار اور گھوڑ سواری کا شوق ہوا۔ واٹر کلر تصویریں کثرت سے بنائیں اور سینی ٹوریم میں پڑا کثرت سے اشتمالیت پر کتابیں پڑھتا رہا۔ دو سال کے وقفہ کے بعد دوبارہ پٹنہ کالج واپس آیا اور انگریزی آنرس کے ساتھ بی اے کی تعلیم حاصل کی۔ معاشیات اور فارسی کے پرچے بھی لئے۔ اردو میں ایم اے عربی کے ایک پرچے کے ساتھ کیا۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں پٹنہ کالج میں ہی اردو کا لیکچرر مقرر ہوگیا۔ ویسے مجھے طبابت کا بڑا شوق تھا لیکن ادبی درس و تدریس سے بھی بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی۔

میری تعلیم کی مختلف نوعیتوں نے میرے اندر حقیقت پسندی کے ساتھ وسعت نظری بھی پیدا کی ہے۔ سائنس اور آرٹ کی متعدد تعلیم نے میری تخلیق اور تنقید دونوں کو متاثر کیا ہے۔ سائنس کے مطالعے سے مجھے بہت زیادہ ادبی فائدے ہوئے ہیں اور ادب کے مطالعے نے مجھے سخت بیماری میں بڑا سہارا دیا۔ اگر ادب پروردہ رومانیت میری شخصیت میں پیدا نہ ہوجاتی تو شاید میں سینی ٹوریم سے صحت وسلامتی کے ساتھ واپس نہ لوٹ سکتا۔

استادوں میں جغرافیہ کے ایک بنگالی استاد اور یونیورسٹی سطح پر پروفیسر بے ایل ہل، پروفیسر عبدالمنان بیدل، ڈاکٹر گیان چند اور میڈیکل کالج میں ڈاکٹر ٹی این بنرجی سے متاثر ہوں۔ اپنے اسکول ٹیچر کی خوش مزاجی اور نقشہ کاری، پروفیسر ہل کی ادبیت اور لطیف انتقاد حضرت بیدل کی شگفتگی اور شاعری۔ ڈاکٹر گیان چند کا علم معاش اور زور خطابت مجھے نہیں بھولتا اور شعوری اور لاشعوری طور پر ان اساتذہ سے کسب فیض کرتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر ٹی این بنرجی میرے استاد بھی تھے اور معالج بھی۔ ان کی نرم خوئی، اعتماد نفس، شفقت اور طبی مہارت سے میری شخصیت اور میری طبیعت نے کچھ نہ کچھ استفادہ ضرور کیا ہے۔ ڈاکٹر گھوشال کی فنی ذہانت، شوخی طبیعت، اور زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا کرنے کی صلاحیت میرے لئے مشعل راہ رہی ہے۔ جب میں ملازم ہوا تو میں نے استاذی حافظ شمس الدین احمد منیری سے یہ سیکھا ہے کہ اپنے شرکائے کار سے کس طرح اعتماد کی بنا پر عزت ومحبت کا معاملہ کیا جائے۔ میں نے اور حریفوں سے بھی کسب نور کیا ہے لیکن سب کا تذکرہ مشکل ہے۔

میرا حلقۂ احباب زیادہ بڑا نہیں ہے۔ اسکول میں کوئی ہم جماعت ایسا نہیں تھا جو میرے لئے نمونہ شخصیت بنتا۔ کالج میں آکر میں نے جن دوستوں کو اپنایا وہ ضرور میری شخصیت کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ مثلاً شرف الدین احمد عظیم آبادی، یہ صاحب مزاح نگار، مکتوب نگار، بے حد مخلص دوست اور لطیف طور پر وفادار عاشق ہوا کرتے تھے۔ اب کراچی میں ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد دے رہے ہیں۔ انہوں نے لکھنؤ کی ایک صاحبزادی سے عشق کیا تھا اور انتقاماً وہیں کی ایک دوسری صاحبزادی سے شادی بھی کرلی۔ علی اطہر، رضا نقوی، زبیر احمد تمنائی، محسن عظیم آبادی، بہاء الدین احمد، کلیم عباس وغیرہ میرے خاص احباب میں ہیں۔ یہ سب گن والے لوگ ادیب و شاعر، مقرر، سیاست داں یا ادب نواز مجلس آرائی میں سب کو مہارت ہے۔ شرف عظیم آبادی مجھے دیوار قہقہہ کہتے تھے۔ میں سینی ٹوریم کے بستر پر بھی قہقہے لگاتا رہا ہوں۔ انھیں یاران میکدہ نے خواہ مخواہ مجھے ادب و شعر کی طرف کھینچ کرلایا۔ ورنہ میں حاذق طبیب ہوتا۔ میڈیکل کالج سے علاحدہ ہونے کا غم مجھے اب تک ہے۔

انقلاب اسلام، انقلاب فرانس، انقلاب روس اور چین

(بقیہ ص۱۸ پر)

جہانگیر کی شکار سے دلچسپی



نورالسعید اختر

جہانگیر سیر و تفریح کا دلدادہ، حسن کی جلوہ طرازیوں کا گرویدہ، دختِ رز کا عاشق اور شکار کا شوقین تھا۔ جس طرح قدرتی مناظر اس کی شاعرانہ طبیعت کو ایک کیف آگیں سرور بخشتے تھے اسی طرح شکار کی دھن اس کی سپاہیانہ زندگی اور بہادری کو جوش و ولولہ عطا کرتی تھی۔ تیموریوں اور گورگانوں کا محبوب ترین مشغلہ شکار تھا۔ فنِ شکار ان کے بہت سے مقاصد پورے کرتا تھا۔ گھوڑا سواری، تیراندازی، نیزہ بازی، شمشیرزنی، بندوق بازی اور سوجھ بوجھ کے بر وقت استعمال کرنے کی مشق شکار ہی ذریعہ حاصل کی جاسکتی تھی۔ دراصل شکار اُن کے نزدیک فنِ حرب سے عملی آگاہی کی تربیت گاہ تھی۔

جہانگیر کو یہ شوق اپنے آباؤ اجداد سے ملا تھا۔ اس کا دادا شہنشاہ بابر بے مثل تیرانداز تھا اور شکار کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابراہیم لودھی کی ماں نے خرگوش کے گوشت میں بابر کو زہر دینا چاہا تھا لیکن بابر بال بال بچ گیا۔ ہمایوں کو فرصت کے ماہ و سال کم نصیب ہوئے۔ اکبر نے عنفوانِ شباب تک بندوق اور چیتوں کی مدد سے خوب شکار کھیلا لیکن دینِ الٰہی کی ایجاد کے بعد اُس نے شکار ترک کر دیا۔ البتہ اُس نے جہانگیر کو چار سال کی عمر سے تعلیم کے علاوہ شکار وغیرہ کی تربیت دینی شروع کر دی تھی۔

اکبر کو اپنے تینوں لڑکوں میں جہانگیر سے والہانہ لگاؤ تھا اور وہ اس کی بڑی بڑی خطاؤں اور نافرمانیوں کو بھی نظر انداز کر دیتا تھا۔ اکبر کو سلطان دانیال سے بھی محبت تھی کیونکہ وہ نہایت شجیع، دُوربیں، اور مصلحت اندیش تھا اور اُن تمام خوبیوں کا مالک تھا جو ایک ولی عہد کے شایانِ شان ہوتی ہیں۔ البتہ شکار اور شراب اس کی ایسی کمزوریاں تھیں جو بالآخر اس کی جواں مرگی کا باعث ہوئیں۔ جہانگیر اپنے بھائی سلطان دانیال کی صحیح "نشانہ بازی" اور "فنِ شکار پر" پوری قدرت کا معترف تھا اور وہ تزکِ جہانگیری میں اس امر کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کرتا ہے ؎

" اُس (سلطان دانیال) نے اپنی مرغوب بندوق کا نام "یکہ و جنازہ" رکھا تھا اور یہ شعر اس پر کندہ کرایا تھا ؎

ازشوقِ شکارِ تو شود جاں تر و تازہ
برہر کہ خورد تیرِ تو یکہ و جنازہ [1]

---

[1] تزکِ جہانگیری: مترجمہ مولوی احمد علی صاحب رامپوری ص ۵۶ (لاہور جنوری ۱۹۶۰ء)

یہ ایک اتفاق ہے کہ سلطان دانیال کی موت اسی بندوق سے واقع ہوئی۔ اکبر نے سلطان دانیال کو کثرت شراب نوشی کے باعث نظر بند کر دیا تھا اور اس کی دیکھ بھال عبدالرحیم خانخاناں کے سپرد تھی۔ سلطان دانیال کو مقررہ مقدار شراب سے ایک قطرہ زیادہ ملنا ممکن نہ تھا۔ ایک دن دانیال نے اپنے ایک جاں نثار مرشد قلی بندوقچی کو "یکہ و جنازہ" کی نال میں پوشیدہ طور پر شراب لانے کا حکم دیا۔ مرشد قلی نے حسب حکم ایسا ہی کیا۔ جلی ہوئی بارود کا زہر شراب دو آتشہ کا جز بن گیا اور جونہی یہ زہر آلود شراب سلطان دانیال کے حلق سے اُتری وہ بے محابا تڑپا اور اس کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی۔

سلطان مراد متوفی ۱۰۰۸ھ مطابق ۱۵۹۹ء اور سلطان دانیال متوفی ۱۰۱۳ھ مطابق ۱۶۰۴ء کی جواں سال اموات نے اکبر کی تمام تر توجہات جہانگیر کی طرف منعطف کر دیں اس نے جہانگیر کو بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت دی تاکہ وہ ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت کو اچھی طرح سنبھال سکے۔ سن شعور کو پہونچنے تک جہانگیر نے دیگر علوم و فنون کے علاوہ فنِ حرب اور شکار میں اچھی خاصی مشق حاصل کر لی جب اکبر کو اس طرف سے پورا اطمینان ہو گیا تو اس نے جہانگیر کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اُسے سفید لومڑی کی پوستین بنام "روپ" تحفتاً عنایت کی۔ اس طرح اکبر نے کئی مرتبہ جہانگیر کو آلات حرب اور بندوقیں وغیرہ بھی مرحمت کیں۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد نہ صرف اس کے امرا بلکہ شاہجہاں اور ملکہ نور جہاں بھی پیش کش کے طور پر اچھی قسم کی بندوقیں، اعلیٰ قسم کے ہتھیار، شکاری چیتے، کتے اور باز دیتے رہے جنھیں وہ بخوشی قبول کرتا رہا۔

آج سے ۴۴۵ برس قبل سب سے پہلے آتشیں ہتھیار توپ کی شکل میں استعمال ہوئے۔ انھیں ہلکا بنانے کا عمل آج تک جاری ہے ہندستان میں سب سے پہلے آتشیں ہتھیاروں کے استعمال کا سہرا ظہیرالدین بابر کے سر ہے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں بابر نے ابراہیم لودھی کی کثیر التعداد فوج کو توپوں سے پسپا کر دیا تھا اور یورپ میں اس سانحے سے ایک سال قبل یعنی ۱۵۲۵ء میں فرانس کے بادشاہ لوئیس اول نے پاویا "PAVI A" کے محاصرے میں اسپینیوں کو تفنگ اندازوں کی مدد سے شکست دی تھی۔ اس جنگ میں جن تفنگوں کا استعمال ہوا تھا وہ میچ لاک ہارکوبس Match-lock Harouebus کے نام سے موسوم تھیں۔ ان میں ٹوپی دار بندوقوں کی طرح بارود بھری جاتی تھی لیکن اُن کی بارود کو مشتعل کرنے کے لئے ٹوپی کے عوض فلیتے سے کام لیا جاتا تھا۔ شکاریوں اور سپاہیوں کو سلگتا ہوا فلیتہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا ہوتا تھا فائر کرنے سے پہلے فلیتے کے جلتے ہوئے سرے کو راکھ سے صاف کر کے گھوڑے Hammer پر لگا دیا جاتا تھا۔ لبلبی igger دبانے سے گھوڑا گرتا تھا اور فلیتے میں آگ سے اولاً چاشنی والی بارود اور پھر بندوق کے اندر کوٹھی کی بارود بھڑک جاتی تھی۔ اس بندوق کے بھرنے اور فیر کرنے تک ۲۰ مختلف عمل کرنے پڑتے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں چقماقی بندوق Flint-Lock کی ایجاد سے فلیتے کی مشکل دُور ہوئی۔ اس بندوق کے گھوڑے میں چقماق لگا ہوتا تھا۔ لبلبی کے دبانے پر گھوڑا گرتا اور چنگاری سے چاشنی کی بارود سلگ جاتی تھی۔ یہ ہتھیار مسکیٹ "Musket" کے نام سے موسوم ہوا اور تقریباً دو سو برس تک یورپ اور ایشیا کے کچھ ملکوں میں استعمال ہوتا رہا۔ اگرچہ میچ لاک بندوق سے فلنٹ لاک بندوق بہتر تھی تاہم اس میں بھی چند ایسے عیوب تھے جن کی وجہ سے شکار میں اس کا استعمال قباحت سے خالی نہ تھا چقماق سے چنگاری نکلنے اور بندوق سر ہونے کے درمیان تقریباً ایک سیکنڈ کا وقفہ گزرتا تھا۔ اس کے علاوہ مرطوب آب و ہوا اور بارش کے اثر سے چقماق بیکار ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں صحیح نشانہ لگانے کے لئے پچھلی مکھی یا Back-sight مروج نہیں تھی۔ اس قسم کی بندوقوں میں شکاری کے اعتماد، بینائی اور فاصلے کے صحیح اندازے کو بڑا دخل ہوتا تھا۔ یہ بندوقیں ۵۰ سے ۶۰ قدم تک کاری ضرب لگا سکتی تھیں ورنہ شکاری کو مایوس ہونا پڑتا تھا۔

ان باریکیوں اور خطرات کا خیال رکھنا ایک کامیاب شکاری کے لئے ضروری ہوتا تھا۔ جہانگیر نے یہ چیزیں اچھی طرح ذہن نشین کر لی تھیں۔ وہ روسی ساخت کی بندوق پر پوری طرح اعتماد کرتا تھا اور درندوں کو اسی بندوق سے لقمۂ اجل بناتا اور تیر کماں، نیزے، شکاری جانور اور

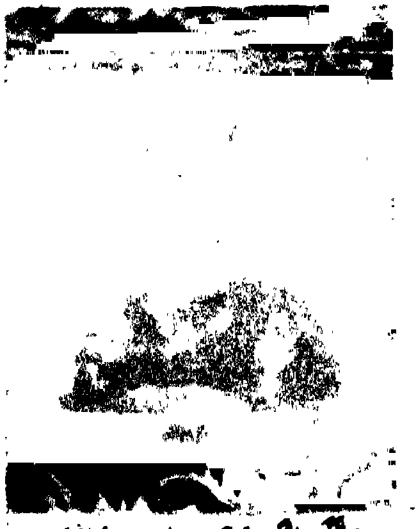
۱؎ شکاری رائفل۔ محمد صادق صفوی، ص ۴ تا ۵ (یوپی ۱۹۵۵ء)

پرندے، مچھلیاں پکڑنے کے جال اور دیگر سامان سے اپنے شوق پورا کرتا تھا۔ جہانگیر نے ۱۵ سال کی عمر تک شراب نہیں پی تھی۔ شکار کی تھکان نے اسے اس طرف رجوع کیا۔ اس امر کا اعتراف جہانگیر نے تزک میں اس طرح کیا ہے:–

"۱۵ سال کی عمر تک یعنی ۹۹۲ھ مطابق ۱۵۸۴ء تک میں نے شراب نہیں پی تھی چنانچہ ایک دن شکار کیلئے گیا تھا۔ واپس آیا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ اُستاد شاہ قلی نے جو میرے چچا مرزا محمد حکیم کا توپچی تھا مجھ سے کہا کہ اگر ایک پیالہ نوش جان فرمائیں تو ساری تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔ چونکہ جوانی کے دن تھے طبیعت جولانی پر تھی میں نے محمود آبدار کو حکیم علی کے پاس بھیجا کہ شربت کیف ناک لے آئے۔ حکیم مذکور نے زرد رنگ کی شیریں شراب آدھے پیالے کے برابر ایک چھوٹے سے جام میں بھیجی۔ میں نے جب اس کو پیا تو اس کا ذائقہ مجھے بہت پسند آیا اس کے بعد رفتہ رفتہ میں نے شراب پینا شروع کر دیا۔"

(تزک جہانگیری ص ۱۹۵)

تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے بارہ احکام جاری کئے تھے جس میں جمعرات اور اتوار کو ذبیحہ ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ جمعرات کو ذبیح اس لئے ممنوع تھا کہ یہ جہانگیر کی تخت نشینی کا دن تھا۔ اتوار کو اس لئے کہ وہ اکبر کی پیدائش کا دن تھا۔



جہانگیر بشکریہ ایم جی ایم ریسرچ سنٹر ابیش

جہانگیر ان دنوں شکار سے پرہیز کرتا تھا لیکن رعایا کی فلاح و بہبود کی خاطر آدم خور شیروں اور دیگر موذی جانوروں کو ہلاک کرتا تھا۔ جہانگیر جنگ اور شکار کے علاوہ خونریزی کو گوارا نہیں کرتا تھا۔

اس لئے سبب اس کے بڑے لڑکے شہزادہ خسرو نے ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶۰۶ء میں علم بغاوت بلند کیا تو جہانگیر نے امراء کو حسب ذیل تاکید کی:–

"مباش در پئے بے جان نمودن جاندار
مگر بعرصۂ پیکار یا بہ وقت شکار"

تزک جہانگیری ص ۴۷

جہانگیر مادہ جانوروں کے شکار سے جہاں تک بن پڑتا کترا تا تھا اور بلا وجہ کبھی کسی جانور کی جان نہیں لیتا تھا۔

جہانگیر کی شکار سے دلچسپی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ لگاتار تین چار مہینوں تک شکار میں مشغول رہتا تھا۔ ان ایام میں وہ حکومت کے فرائض بھی انجام دیتا رہتا اور شکار کے بہانے صوبے داروں دیگر کارکنوں اور رعایا کی زندگی کا مشاہدہ بھی کرتا تھا۔ شکار کا گوشت نہ صرف امراء میں تقسیم کروا تا بلکہ شاہی مطبخ میں تیار کروا کر غرباء میں تقسیم کرواتا۔ تزک میں جہانگیر نے اپنی پسندیدہ تیرہ شکارگاہوں کا ذکر کیا ہے اس کی محبوب ترین شکارگاہ "جہانگیر پورہ" (لاہور) تھی۔ یہاں اس نے اپنے لاڈلا ہرن "منسراج" کی قبر تعمیر کروائی تھی اور بطور یادگار ایک مینار بھی بنوایا تھا۔ باقی ماندہ شکارگاہوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) کوہ قرق (کابل) (۲) کوہچاک (دوآبہ)
(۳) اروند (جلال آباد) (۴) باغ دہرہ (آگرہ)
(۵) سونگو یا امین آباد (۶) بھکر (اجمیر شریف)
(۷) چشمہ نور (اجمیر شریف) (۸) رامسر (نورجہاں کی جاگیر)
(۹) پالم (دہلی) (۱۰) گرجھاک (دریائے جہلم کے کنارے)
(۱۱) آسمان آباد (فتح پور) (۱۲) مختلف دریا اور جھلیں

یوں تو میر شکار کا عہدہ پہلا بیگ کے سپرد تھا لیکن جہانگیر کا خاص الخاص منتظم شکار عبداللطیف قوش بیگی تھا۔ قوش بیگ "قوشچیوں" (شکاری ملازموں) کا نگراں ہوتا تھا۔ دوسرا عہدہ "قراول" کا تھا۔ قراول شکار میں بادشاہ کے ہمرکاب ہوتے تھے۔ اور ہانکے والوں اور گھیرے داروں کو ہدایات دیتے رہتے تھے۔ جہانگیر کا سب سے معتبر قراول "قیام خاں" تھا۔ اس کے انتقال کے بعد مرزا بیگ اس عہدے پر فائز ہوئے اور پھر امام وردی نے اس جگہ کو سنبھالا۔

توش بیگ کے سپرد بہت سی ذمہ داریاں ہوا کرتی تھیں۔ اسے صوبے داروں اور تعلقہ داروں کو بادشاہ کی آمد سے باخبر کرنا ہوتا۔ بادشاہ کے خیمے وغیرہ نصب کرانے ہوتے اور شکاری جانوروں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی تیز سواری کے جانوروں اور شاہی ملازمین کی دیگر ضروریات پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔

کبھی کبھی شکار میں شاہی حرم کی بیگمات، شہزادے، امراء، اور شاہی مہمان بھی ساتھ ہوتے تھے ان حالات میں توش بیگ اور قراول بیگ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی تھیں۔ بادشاہ کی اجازت پر شاہی مہمان نشانے بازی کے کمالات دکھاتے تھے جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا توش بیگ اور قراول بیگ خصوصاً اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں زخمی درندہ شاہی مہمانوں پر حملہ نہ کردے اور اگر کبھی ایسا واقعہ پیش آتا تو یہ لوگ اپنی جان پر کھیل جاتے تھے۔

بادشاہ ان لوگوں کی ہمت اور جوانمردی کے صلے میں انھیں بڑے بڑے انعام و اکرام، خلعت اور منصبوں سے نوازتا تھا۔ جہانگیر اپنے مہمانوں کی نشانہ بازی سے خوش ہو کر انھیں شکاری جانور یا نقد وغیرہ تحفتاً دیتا تھا۔

نور جہاں سے شادی کرنے اور اس کی بے پناہ صلاحیتوں سے آگاہ ہونے کے بعد جہانگیر نے بڑی حد تک امور مملکت سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور بسا اوقات سیر و شکار میں مصروف رہتا تھا اس لئے نور جہاں کو جہانگیر کے ساتھ شکار کے مواقع بہت کم فراہم ہوتے تھے حالانکہ وہ بھی ماہر شکاری تھی۔



نور جہاں بشکریہ ایم جی ایم ریسرچ سنٹر بمبئی

البتہ دو ایک مرتبہ نور جہاں اور خرم شکار میں جہانگیر کے ہمسفر رہے اور اپنی صحیح نشانہ بازی کے عوض شاہی عنایات سے نوازے گئے۔ امرائے خاص میں سے چند لوگ اکثر جہانگیر کے ساتھ شکار میں حاضر رہے۔ تزک میں مندرجہ ذیل امرا کا ذکر شامل ہے۔

(۱) آصف خاں ۲- مرزا رستم ۳- میر میراں ۴- آنی رائے ۵- ہدایت اللہ ۶- راجہ سارنگ دیو ۷- سید کاسو ۸- خواص خاں اور راجہ کنور کرن سنگھ (شاہی مہمان)

جہانگیر بادو باراں، آندھی و طوفان، اور رات کی تاریکی میں بھی بندوق سے صحیح نشانہ لگا لیتا تھا۔ اُسے بندوق پر انتہائی اعتماد تھا جس زمانے میں جہانگیر قلعہ مانڈو کے سامنے والے تالاب کے کنارے خیمہ زن تھا تو قراولوں نے ایک شیر گھیر کر بادشاہ کو اطلاع دی۔ جہانگیر وہاں پہنچا تو اُس نے شیر کو درخت کے سائے میں منہ کھولے ہوئے بیٹھا پایا۔ جہانگیر نے شیر کے حلق کا نشانہ بنا کر گولی چلا دی۔ گولی حلق سے نکل کر مغز سے نکل گئی۔ لوگوں نے جب شیر کے جسم پر گولی کا نشان نہ دیکھا تو حیرت زدہ ہوئے۔ جہانگیر نے کہا کہ اس کا منہ کھول کر دیکھا جائے۔ لوگوں نے دیکھا تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ گولی ٹھیک شیر کے حلق کے اندرونی حصے میں لگی تھی۔ (تزک جہانگیری ص ۲۳۱)

ایک مرتبہ جہانگیر راجہ امر سنگھ کے لڑکے کنور کرن سنگھ کو بندوق کی نشانہ بازی میں اپنی مہارت دکھانے کی غرض سے شکار کو لے گیا۔ اتفاق سے قراولوں نے ایک شیرنی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ حالانکہ جہانگیر مادہ جانوروں کے شکار سے کتراتا تھا لیکن عین وقت کسی شیر کا ملنا محال تھا اس لئے اس نے اپنے اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ناچار تیز و تند ہواؤں کے باوجود شیرنی کی آنکھ کا نشانہ باندھ کر گولی چلا دی۔ گولی صحیح نشانے پر لگی اور شیرنی وہیں ڈھیر ہوگئی۔ کنور کرن سنگھ بادشاہ کی نشانے بازی سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے بادشاہ سے ایک بندوق کی خواہش کی۔ جہانگیر نے اُسے ایک رومی ساخت کی بندوق عنایت کی۔

(تزک جہانگیری ص ۱۸۰)

رات کے وقت بغیر روشنی وغیرہ کے بندوق کا صحیح نشانہ لگانا نہایت مشکل کام ہے۔ لیکن جہانگیر کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ایک رات جب کہ جہانگیر غسل خانے میں تھا، اس وقت بعض امرا اور شاہ ایران کا ایلچی محمد رضا بھی وہاں موجود تھے۔ حُسن اتفاق سے ایک اُلو اُڑتا ہوا محل کی دیوار پر آ بیٹھا وہ اتنی اونچائی پر تھا کہ کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ جہانگیر نے بندوق طلب کی اور جس رُخ پر اُلو کی نشست کا اُسے یقین تھا، گولی چلا دی۔ اُلو کے پرخچے اُڑ گئے۔ اس کمال کی نشانے بازی پر سب نے تحسین

داؤں کے نعرے لگائے (تزک جہانگیری ص ۲۱۴)

۱۶۲۰ء کا واقعہ ہے کہ جہانگیر شاہی بیگمات کے ساتھ شکار میں مصروف تھا۔ قراولوں نے چار شیر گھیر رکھے تھے اس موقع پر نورجہاں بیگم نے جہانگیر سے ان شیروں کے شکار کی اجازت مانگی اور یکے بعد دیگرے چھ گولیاں چلا کر ان شیروں کو مار گرایا۔ نورجہاں کا ایسا کارنامہ تو جہانگیر نے کبھی نہ دیکھا تھا کیونکہ نورجہاں نے گولیاں ہاتھی کی عماری میں بیٹھ کر چلائی تھیں اور اس کا کوئی نشانہ خطا نہ ہوا تھا۔ نورجہاں کے اس عظیم کارنامے پر اس نے ایک ہزار اشرفیاں نچھاور کیں اور نورجہاں کو ایک لاکھ روپے کی ہیروں کی پہنچی عنایت کی۔ اس واقعہ پر ایک شاعر نے فی البدیہ کہا ؎

نورجہاں گرچہ بصورت زن است
در صفِ مرداں زنِ شیر افگن است"

(تزک جہانگیری ص ۲۴۰)

آدم خور شیروں اور دیگر موذی جانوروں کو جہانگیر بندوق سے ہلاک کرتا تھا۔ دیگر جانوروں کے لئے بھی موقع بموقع بندوق استعمال کرتا لیکن کبھی کبھی انہیں جال وغیرہ میں زندہ بھی پکڑواتا تھا۔ خطرناک درندوں، پہاڑی بکروں اور ہرنوں کے ہانکے کرواتا اور انہیں گھیر کر تیر و کمان کے نشانے کی آزمائش بھی کرتا۔ جنگلی ہاتھیوں کے شکار کی نوعیت ہی دوسری ہوتی تھی۔ ہاتھیوں کے راہ فرار کی جگہیں مسدود کر دی جاتی تھیں اور پھر سدھائے ہوئے ہاتھیوں کے ذریعہ بہ ہزار دقت انہیں پکڑا جاتا تھا۔ جنگلی سوروں کا گھوڑوں سے تعاقب کرکے نیزوں سے شکار کیا جاتا تھا۔

پرندوں میں تیتر، بٹیر، جنگلی کبوتر اور ڈرنا کا شاہین، باز اور جرہ باز کے ذریعے شکار کیا کرتا تھا۔ ترک شکار کے بعد بھی جہانگیر نے اپنے والد اکبر کی طرح سدھائے ہوئے چیتوں کی مدد سے مختلف جانوروں کا شکار کھیلا۔ کبھی کبھی شکار میں شکاری کتوں کی مدد بھی لی جاتی تھی۔

شکار سے جہانگیر کا مطلب محض اپنے شوق کی تشنگی کو دور کرنا نہیں تھا۔ وہ جنگلی جانوروں سے متعلق روایتی قصے اور کہانیوں کی چھان بین کرتا رہتا تھا اور اپنی تحقیق و تجربوں سے غلط باتوں کی تردید کرتا تھا۔ اس نے ایک چڑیا گھر بھی قائم کر رکھا تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں چڑیا گھر کے جانوروں اور پرندوں پر طرح طرح کے تجربے بھی کرتا تھا۔ ان باتوں سے جہانگیر کی تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ذیل میں جہانگیر کے تحقیقی کاموں اور تجربوں پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔

۱۔ جہانگیر نے سن رکھا تھا کہ پہاڑی مینڈھوں کے سینگوں کے اندر ایک کیڑا ہوتا ہے۔ یہ اُن کے سینگوں میں خارش پیدا کرتا ہے جسے وہ دوسرے مینڈھوں سے لڑ کر رفع کرتا ہے۔ اگر مینڈھا نہ ملے تو وہ درختوں اور چٹانوں سے ٹکریں مارتا ہے۔ جہانگیر نے اس بات کی تحقیق کی تو اُسے معلوم ہوا کہ ایسا کیڑا بھیڑ کے سینگوں میں بھی ہوتا ہے لیکن وہ بالکل نہیں لڑتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ روایت بالکل غلط ہے (ت۔ج۔ص ۹۱)

۲۔ جہانگیر پورہ (لاہور) کی شکارگاہ میں جہانگیر نے گلہری کی شکل کا جانور دیکھا۔ اس کے متعلق تحقیق کی تو اسے پتہ چلا کہ یہ جانور جس کسی کے گھر میں ہوتا ہے وہاں چوہے نہیں ہوتے اسی لئے اس جانور کو چوہوں کا بادشاہ کہتے ہیں (ت۔ج۔ص ۱۰۱)

۳۔ ایک مرتبہ جہانگیر کی خدمت میں ایک ہرنی پیش کی گئی۔ یہ ہرنی چار سیر دودھ دیتی تھی۔ جہانگیر کہتا ہے کہ ہرن اور گائے بھینس کے دودھ میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ دودھ دمے کے مریض کے لئے نہایت مفید ہوتا ہے (ت۔ج۔ص ۱۱۹)

۴۔ شہنشاہ اکبر نے ایک ہزار چیتے جمع کئے تھے اور اُن کو باغ میں آزاد رکھا تھا مگر انہوں نے کبھی جفتی نہیں کی۔ البتہ جہانگیر کے عہد میں ایک نر چیتے نے مادہ سے جفتی کی اور کچھ عرصہ بعد اس سے تین بچے پیدا ہوئے۔ اسی طرح جہانگیر نے شیر کے متعلق سن رکھا تھا کہ وہ اسیری میں مادہ کے قریب نہیں جاتا لیکن جہانگیر کے چڑیا گھر میں ایک شیرنی کے تین بچے ہوئے تھے۔ جہانگیر نے اطبا سے سن رکھا تھا کہ شیرنی کا دودھ آنکھوں کی بینائی کے لئے ازحد مفید ہوتا ہے۔ اس نے شیرنی کا دودھ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب

نہ ہوسکا (ت۔ج ص ۱۴۷)

۵۔ ساری دنیا شیر ببر کی بہادری کی قائل ہے لیکن آج تک کسی نے اس کی وجہ بتانے کی کوشش نہیں کی۔ جہانگیر نے تحقیق کے طور پر اپنے شکار کردہ ببر شیر کا پیٹ چاک کروایا اور اس رازِ سربستہ کی پردہ کشائی کی۔ دراصل ببر شیر کا پتہ اس کے جگر کے باہر ہونے کے بجائے اندر واقع ہوتا ہے اور یہی شیر ببر کی بہادری کی وجہ ہے

(ت۔ج۔ص ۲۲۴)

۶۔ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ سفید ہرن جسے ہم دودھاریہ کہتے ہیں بغیر پتے کے ہوتا ہے۔ موضع قاسم گرہ میں جہانگیر نے ایک سفید ہرن مارا اور اس کا پیٹ چاک کروایا تو پتہ موجود تھا۔ (ت۔ج۔ص ۲۴۴)

۷۔ بھیڑیا اپنی چالاکی اور مکاری کے لئے مشہور ہے۔ وقت آنے پر بہادری کے جوہر بھی دکھاتا ہے جہانگیر کے ایک امیر نے جب ایک بھیڑیا شکار کیا تو جہانگیر نے اس کا پیٹ چاک کرواکر دیکھا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا پتہ بھی شیر کی طرح جگر کے اندر ہوتا ہے اور یہی اس کی پھرتی اور چالاکی کا راز ہے۔

۸۔ جہانگیر کو مچھلی سے بہت رغبت تھی، وہ صرف چھلکے والی مچھلیاں پسند کرتا تھا۔ "رہو مچھلی" اُسے مرغوب تھی۔ ایک مرتبہ جب وہ مچھلی کا شکار کر رہا تھا تو جال میں "سنگ ماہی" نامی مچھلی آئی جس کا وزن ساڑھے چھ سیر تھا۔ اس مچھلی کا پیٹ کافی بڑھا ہوا تھا اُسے بادشاہ کے حکم سے چاک کیا گیا تو پیٹ کے اندر سے تقریباً دو سیر کی مچھلی برآمد ہوئی۔ جس سے ثابت ہوا کہ چھ سیر کی مچھلی دو سیر کی مچھلی کو بہ آسانی نگل سکتی ہے۔ (ت۔ج۔ص ۲۸۴)

۹۔ جہانگیر نے شہنشاہ اکبر سے سنا تھا کہ جس ہرن کو چیتا پکڑتا ہے اگر اُس ہرن کے جسم پر چیتے کے دانت اور پنجوں کے زخم نہ بھی لگے ہوں تب بھی وہ زندہ نہیں رہتا۔ جہانگیر نے اس بات کا تجربہ کیا جو بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ (ت۔ج۔ص۔ ۳۷۰)

۱۰۔ تجربے کے طور پر جہانگیر نے پہاڑی بکرے اور بربری بکری سے نسل پیدا کرنے کا حکم دیا اور آہوئے ختن کا گوشت پکوا کر کھایا لیکن وہ بدمزہ معلوم ہوا۔ (ت۔ج۔ص۔۳۸۶)

شکار کے دوران جہانگیر کو مندرجہ ذیل عجیب وغریب واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ واقعات بعید از قیاس معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کی صداقت پر اعتراض بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ سب سے پہلا عجیب وغریب واقعہ جہانگیر کو لاہور کے قریب پیش آیا۔ چنڈالہ کے جنگل میں جہانگیر نے ایک کالے ہرن کے شکم پر گولی ماری تو زخمی ہو کر اُس نے ایسی آواز نکالی جیسے ہرن مستی کی حالت میں نکالتے ہیں۔ جس نے اس واقعہ کو سنا حیران رہ گیا۔ حتیٰ کہ پرانے شکاریوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے آبا و اجداد سے کبھی ہرن کو ایسی آواز نکالتے ہوئے نہیں سنا۔

(ت۔ج۔ص ۹۱)

۲۔ جہانگیر اپنے عدل وانصاف کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔ اُس نے نہ صرف خلقِ خدا کے ساتھ عدل وانصاف کے لئے بلکہ پرندوں کی دادطلبی پر ان کے ساتھ بھی انصاف سے کام کیا۔ اپنی چہیتی بیگم نور جہاں کی جاگیر رامسر سے کچھ دور آگے دیوگاؤں کے مقام پر تالاب کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے چند خواجہ سراؤں نے سارس کے دو بچے پکڑ لئے۔ جہانگیر کے غسل خانے کا رخ اسی تالاب کی طرف تھا۔ ایک سارس کا جوڑا غسل خانے کے قریب آکر مظلوموں کی طرح فریاد بھری آوازیں نکالنے لگا۔ جہانگیر کو یہ سن کر محسوس ہوا کہ ضرور ان پر ظلم ڈھایا گیا ہے اور غالباً ان کے بچے پکڑ لئے گئے ہیں۔ تحقیق کرنے پر جہانگیر کا خیال درست نکلا۔ سارس کے دونوں بچے بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ سارس کے جوڑے نے جب اپنے بچوں کی آوازیں سنیں تو بے تاب ہو کر اُن کے پاس آگئے اور یہ خیال کرکے کہ وہ شاید بھوکے ہوں، اپنی چونچ سے اُن کو دانہ چگانے لگے۔ پھر وہ انھیں اپنے پروں کے اندر خوشی خوشی لے کر اُڑ گئے۔ (ت۔ج۔ص ۲۱۸)

۳۔ قصبہ دوحد (گجرات) کے قیام کے دوران پہلوان بہاء الدین برق انداز نے ایک لنگور کا بچہ اور ایک بکری بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ لنگور کا بچہ اپنی ماں کے ساتھ درخت پر بیٹھا تھا کہ ایک ماتحت توپچی نے اس مادہ پر بندوق چلادی۔ مادہ لنگور نے گولی کھاکر

اس بچے کو درخت پر رکھا اور خود نیچے گر کر مر گئی۔ اس اثنا میں پہلوان بہار الدین بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اس بچے کو وہاں سے اتار کر دودھ پلانے کے لئے ایک بکری کے پاس لے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بکری کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے اس بچے کو چاٹنا شروع کیا اور دودھ بھی پلایا۔ جہانگیر نے یہ ماجرا سن کر حکم دیا کہ اس بچے کو بکری سے جدا کر کے دیکھا جائے۔ جونہی اس بچے کو جدا کیا بکری نے بیقراری کی حالت میں طرح طرح کی آوازیں نکالنا شروع کر دیں اور لنگور کا بچہ بھی بہت بے چین اور بے قرار رہا (ت ج۔ ص ۲۸۹)

۴۔ جہانگیر نے سارس کی باہمی محبت سے متعلق کئی کہانیاں سن رکھی تھیں لیکن ان داستانوں کے راوی غیر معتبر تھے۔ قیام خاں جہانگیر کا نہایت معتبر قراول تھا چنانچہ اس کے حوالے سے جہانگیر لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ قیام خاں نے شکار کے دوران ایک سارس کو دیکھا قریب جانے پر وہ سارس دور ہٹ گیا۔ وہ نہایت نحیف و نزار نظر آ رہا تھا جس جگہ وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں چند ہڈیاں اور پر پڑے ہوئے تھے۔ قیام خاں نے سارس کو دام میں اسیر کر لیا۔ سارس کے سینے کا تمام گوشت سڑ گل گیا تھا اور کیڑے پڑ گئے تھے حالات سے اندازہ ہوا کہ اس کا جوڑا مر گیا تھا اور اس کے مفارقت میں سارس کا یہ حال تھا (ت ج۔ ص ۳۰۰)

۵۔ ایک مرتبہ امام وردی قراول باشی نے جہانگیر سے ایک تیتر کے متعلق پوچھا کہ آیا وہ نر ہے کہ مادہ جہانگیر نے بلا تامل کہا کہ وہ مادہ ہے۔ جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں سے بیضہ نکلا۔ اس پر حاضرین کو تعجب ہوا انہوں نے توضیح چاہی۔ تو جہانگیر نے بتایا کہ مادہ تیتر کی چونچ کی نوک نر کی نسبت چھوٹی ہوتی ہے۔ (ت۔ ج۔ ص ۲۴۴)

جہانگیر کو شکار کے گوشت سے خاص رغبت تھی۔ وہ شکار شدہ جانور اور پرندے اپنے سامنے صاف کرواتا اور شاہی مطبخ میں بھیجتا تھا۔ ذائقہ معلوم کرنے کے لئے اس نے آہوئے ختن اور گورخر کا گوشت بھی چکھا تھا۔

پرندوں میں جہانگیر کو پالتو اور جنگلی مرغابیاں پسند تھیں۔ مرغابیوں کو مکروہ کیڑے کھاتا دیکھ کر اس نے ان کا اور عقاب کا گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ دیگر پرندوں میں جہانگیر کو پنجاب کا ایک پرندہ "جان بہمن"، قرقاول (جنگلی مرغ) اور تذرو (جنگلی مرغ کی قسم) زیادہ مرغوب تھے۔

۱۰۱۹ھ کا ذکر ہے جہانگیر چیتے کے شکار میں مشغول تھا اچانک سے ایک خوفناک شیر کی اطلاع دی گئی جب یہ شیر گائے کھانے میں معروف تھا کہ لوگوں نے گھیرا ڈال دیا۔ اتفاق سے اس شکار میں جہانگیر کے ہمراہ شہزادہ خرم اور رام داس بھی تھے جہانگیر نے جونہی گولی چلائی شیر نے گھبرا کر میر شکار پر حملہ کر دیا اور اسے بری طرح زخمی کر کے جہانگیر کی طرف بڑھا۔ جہانگیر کی دوسری گولی بھی خطا ہو گئی۔ یہ دیکھ کر جہانگیر کا ایک خدمت گار انوپ رائے شیر سے مقابلے کے لئے کود پڑا۔ شیر نے انوپ رائے کو زخمی کر دیا اور دوسری طرف رخ کیا ہی تھا کہ انوپ رائے نے شیر کی پشت اور ناک سے ذرا اونچے حصے پر تلوار کے ایسے وار کئے کہ وہ اندھا ہو گیا۔ موقعہ پاتے ہی دوسرے لوگوں نے شیر کا کام تمام کر دیا۔ انوپ رائے ٹھیک ہو کر جب جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اسے بہادری کے صلے میں ایزائے سنگھ دلن (ہندی میں اس کے معنی "شیر مارنے والا فوجی سردار" ہیں) کے خطاب سے نوازا گیا، اور اس کے منصب میں اضافہ کیا گیا۔

۱۱ ربیع الاول ۱۰۲۰ ہجری کو جہانگیر نے واقعہ نویسوں مشرفوں وغیرہ کو حکم دیا کہ شکار شدہ جانوروں کی الگ الگ فہرست بنا کر پیش کی جائے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ بادشاہ سلامت نے ۱۲ سال کی عمر یعنی ۹۸۸ ہجری سے لے کر ۱۰۲۶ھ تک (۳۸ سال کی مدت میں) ۲۸،۵۳۲ جانور شکار کئے ہیں۔ ان میں ۱۷،۱۶۷ جانور خود جہانگیر نے شکار کئے تھے اس کے علاوہ پرندوں کی تعداد ۱۳،۹۶۴ تھی۔ جہانگیر آخر دم تک یعنی ۱۰۳۷ھ تک مصروف شکار رہا اور تقریباً پچاس ہزار (۵۰،۰۰۰) جانور و پرندے شکار کئے صرف ۱۰۲۵ھ اور ۱۰۳۶ھ میں وہ شکار نہ کر سکا۔

الہ آباد کے دوران قیام، لگ بھگ ۳۳ برس کی عمر میں، جہانگیر نے منت مانی تھی کہ وہ پچاسویں سالگرہ کے بعد تیر یا بندوق سے حیوانات کا شکار ترک کر دے گا۔ پچاسواں سال لگنے پر ایک دن دھوئیں اور آبخارات

کی وجہ سے جہانگیر کا دم گھٹنے لگا اور اُسے کوفت محسوس ہوئی۔ اس موقع پر غیبی الہام کی طرح خدا سے کیا ہوا عہد اُسے دوبارہ یاد آگیا۔ جہانگیر نے عہد کو پورا کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور طے کیا کہ جب اس کی عمر کے پچاسویں سال کا اختتام ہوگا تو وہ اپنے والد بزرگوار کے مرقد پر جا کر اُن کی رُوح سے درخواست کرے گا کہ وہ خدا سے دعا کریں تاکہ خدائے تعالیٰ اسے ترکِ شکار کی ہمت عطا کرے جس وقت جہانگیر نے اس منت کو پورا کرنے کا ارادہ کیا اس کی بے چینی اور تنگیٔ نفس کا عارضہ دُور ہوگیا۔ اس ارادے کے باوجود جہانگیر اپنے مشغلے سے باز نہ آیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ جہاں کے بیٹے شاہ شجاع کو ام الصبیان (غشی کی بیماری) کا دورہ پڑا۔ اطبا اور حکماء پریشان ہوگئے۔ جہانگیر کو دوبارہ خدا سے کیا ہوا عہد یاد آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس موقع پر صدقِ دل سے شہزادے کی سلامتی کی نیت کرکے شکار ترک کردے تو بارگاہِ ایزدی میں شہزادے کی زندگی ان جانداروں کی نجات کا وسیلہ بن جائے گی۔ خدا کے فضل و کرم سے اس عہد کے ساتھ ساتھ شہزادہ شجاع شفایاب ہوگیا۔

معتمد خاں نے لکھا ہے کہ ۱۰۳۶ھ میں جہانگیر فردوس بریں کشمیر کی سیر سے لاہور ہوتا ہوا بہیرم کلہ کے مقام پر پہنچا اور شکار کی طرف متوجہ ہوا دورانِ شکار میں ایک ہرن پہاڑ سے گر کر مر گیا۔ اس کربناک منظر سے جہانگیر کی طبیعت مکدر ہوگئی۔ گویا ملک الموت اس صورت میں آیا تھا۔ اسی وقت سے اس کی طبیعت میں بیقراری شروع ہوگئی راستے میں شراب کا پیالہ منہ سے لگایا مگر طبیعت مالش کرنے لگی اور اتوار ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو بوقتِ صبح جہانگیر کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

شکار کے ساتھ جہانگیر کی ساٹھ سالہ زندگی کے کئی اہم واقعات وابستہ ہیں۔ شکار کی تھکان نے اُسے رندِ بلا نوش بنایا۔ شہزادہ خسرو نے شکار کے دوران اُسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن ناکام رہا۔ بالآخر جہانگیر کی زندگی شکار کے دوران اختتام کو پہنچی۔

بقیہ: غبار کارواں

کے اشتراکی قائدین، کے پہلے دَور کی انقلابی کوششیں میری فضلائے شخصیت پر چھائی رہیں۔

میری مسلسل علالت عین شباب میں سِل کی بیماری اور مختلف عوارض کا ہجوم مجھے مار تو نہ سکا لیکن اس نے مجھے کچھ نازک مزاج اور کبھی کبھی سخت چڑچڑا بھی بنا دیا۔ تمنائے صحت میں اَرول رگبا میں سون کے کنارے قیام کو بھی میں ایک انقلاب ہی سمجھتا ہوں وہاں کی فضاؤں نے میرے مزاج میں روحانیت کو راسخ کر دیا۔

میں اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ اس واقعہ نے مجھے خود پسند اور نازک مزاج اور ضدی بنا دیا ہے۔ اور عموماً اپنی منواتا رہا ہوں۔ مجھے محبت نے بھی نقصان پہنچایا ہے۔

مطالعہ ایک اہم شخصیت آفریں عنصر ہے اس کی تفصیل میں جانا مشکل ہے۔ مختصراً میں عرض کروں گا کہ مطالعہ میرا محبوب مشغلہ ہے اور مذہبی کتابیں مجھے خاص طور سے مرغوب ہیں۔ روشنیاں ادھر سے آئی ہیں اور تاریکیاں میرے اپنے مادّی وجود کی ہیں۔ میں نے علامہ شبلی، علامہ اقبال شیکسپیر، سعدی و حافظ، میر و شاد اور غالب و انیس کی فنکاری سے اپنے حرمِ شخصیت کو روشن کیا ہے۔ جوانی میں کیٹس شیلی، براؤننگ نیاز فتحپوری، اور اختر شیرانی پر مرتا تھا۔ میں خوش تھا کہ کیٹس کی طرح مجھے بھی سِل ہوگئی ہے اور شاید اسی وجہ سے میں اپنی فنی براؤن کی تلاش میں رہا۔

اس کے آگے حرم تمنا شروع ہوتا ہے۔ اور میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ اپنے حرمِ آرزو میں ہرکس و ناکس کو باریاب کروں۔



منظر سلیم

ملاقات کے چند لمحے

وہ عورت کئی سال کے بعد اس دن اچانک
مجھے ایک کیفے میں اک شخص کے ساتھ
بیٹھی نظر آئی — اور میں
بنا سوچے سمجھے کچھ اِس طرح
اس میز کی سمت لپکا
کہ جیسے کئی سال سے اس ملاقات کو
اپنے سارے دکھوں کا مداوا سمجھ کر
اسے ڈھونڈھتا تھا۔
کہ جیسے ملاقات کا وقت اُس نے دیا تھا۔
مجھے اس نے دیکھا
مگر دوسرے لمحہ نظریں جھکا لیں
تو ایسا لگا جیسے اس کو
کئی سال کے بعد یوں اجنبی شہر میں
مجھ سے مل کر
مسرت ہوئی تھی نہ حیرت ہوئی تھی
بس اک بے حسی کا سا انداز
یہ پوچھتا تھا
کہ زندہ ہو اب تک؟

مگر میری بے تاب نظروں نے
اس کے بدن کی پُراسرار خالی عمارت میں
اس کو پکارا
تو وہ کسمسائی
اور اپنی پلیٹ آگے کھسکا کے بولی
"لو اس میں سے کھاؤ"
مرے ساتھ کھاؤ"
مجھے یہ لگا جیسے
صدیوں سے بھوکا ہوں
اور اس غذا کے سوا
ساری دنیا میں کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے
مگر بے حسی نے مرے ہاتھ پکڑے
مرے لب سئے
میری آنکھوں کو پھوڑا
مجھے بُت بنایا

تب اُس بُت سے عورت نے
کیں اپنے بچوں کی باتیں
بتایا پتہ اپنے گھر کا
اور آخر میں بولی
— سنو تم بھی میری طرح اب
اسی شہر میں آکے ٹھہرو
یہاں اس قدر کام ہے
اتنا پیسہ ہے — اب کیا بتاؤں"!
یہی مشورہ بت کو
اس شخص نے بھی دیا جو
معمر سی عورت کا شوہر نہیں تھا
یونہی اس کے ساتھ آگیا تھا

مگر بُت نہ بولا
کہ وہ پندرہ سال پہلے کی یادوں
میں کھویا ہوا تھا
یہی ہے وہ عورت جسے تم نے چاہا تھا
پوجا تھا برسوں
یہی ہے وہ عورت جو تم سے
بہن کی طرح پیار کرتی تھی
ماں کی طرح ڈانٹتی تھی
تمہارے محبت جتانے پہ جی بھر کے ہنستی تھی
کہتی تھی پاگل ہوئے ہو
میں دس سال تم سے بڑی ہوں
یہی ہے وہ عورت جو اک روز خود
اپنے کپڑوں کی دیوار کو پھاند کر
تم سے ملنے کو آئی
تو پاگل ہوئے تم

بڑی دیر کے بعد اک شخص
اس میز پہ آکے بیٹھا
تو میں نے نگاہیں اٹھائیں
وہاں وہ نہیں تھی
وہ کرسی بھی خالی تھی جس پہ

ذرا دیر پہلے وہ اک اجنبی شخص بیٹھا ہوا تھا
مرا میزباں جو مجھے لے کے
کیفے میں آیا تھا
کھانا کھلانے —— اور اب تک
کسی دوسری میز پر سرکھپاتا رہا تھا
مرے پاس بیٹھا تھا
غصّے میں کیا جانے کیا کہہ رہا تھا
مگر میں نے اس سے جو پوچھا
مری موت کو کے برس ہو چکے ہیں
تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا
اور بولا
"میں شاعر نہیں ہوں"

تب اُس بت نے سوچا
وہ عورت کہ جس کی بکھرتی ہوئی لاش لے کر
ابھی اس کا ساتھی یہاں سے گیا ہے
وہ خود مر چکی ہے
مگر مرتے مرتے
تمہیں اس نے اپنے بدن کے
پُراسرار زنداں سے
آزاد کرنے
تمہیں جنم دینے کا
صبر آزما درد ہنس ہنس کے جھیلا
انھو شاہراہوں پہ بڑھتے ہوئے شور سے
چل کے پوچھو
کہ میں دوسری بار پیدا ہوا ہوں
میرا گھر کہاں ہے
عزیز اور اقارب کہاں ہیں
کہاں جاؤں کس سے ملوں کیا کروں میں ؟



پچھتاوا

چاند کے جسم کا آدھا سایہ
دشت کے دل کا بگولہ کوئی
یا وہی تیز ہوا کا جھونکا
کوئی تو رات کی دیوار گرانے آتا
میں نے بھٹکی ہوئی آوازوں کو
خودکشی کرنے سے روکا بےکار
سبز اشجار پہ سورج کی برہنہ کرنیں
آج پھر ناچیں گی، گائیں گی
اسی صورت سے
دن کی نفرت کا ہدف

صرف مرا سایہ نہیں
میری آواز بھی ہے
میں نے بھٹکی ہوئی آوازوں کو
خودکشی کرنے سے روکا بیکار

شہریار



پھول اور انگارے

ڈوگری کہانی

نریندر کھجوریہ

ٹیکسی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کس عمر میں امتحان دینے جا رہا ہوں۔ امتحان
کی گھبراہٹ سے زیادہ شرم محسوس ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر مجھے حلیمہ پر غصہ آ رہا تھا۔
امتحان کے ہال کے سامنے ٹیکسی سے اُتر کر میں نے کئی اجنبی چہرے دیکھے۔ دوات
ہاتھ میں تھام رکھی تھی، اُسے ذرا جیب میں رکھ لیا۔ بڑی کوفت ہوئی۔ جلدی میں
سگریٹ سُلگایا اور پھر یہ سوچ کر کہ کئی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں میں نے سگریٹ
کو پاؤں تلے مسل دیا۔ اپنے ارد گرد دیکھا پر کوئی جانی پہچانی صورت دکھائی نہ دی۔
دیوار پر سیٹ پلان لٹکا ہوا تھا۔ قریب جا کر اپنی سیٹ تلاش کرنے لگا۔ رومال
کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ نمی سی محسوس ہوئی۔ دوات کا ڈھکن آدھا کھلا
رہنے سے جیب رنگ گئی تھی۔ ساتھ کھڑا ایک لڑکا معصوم سی آواز میں بول پڑا
"صاحب امتحان کے دن کپڑوں پر سیاہی گرنا بڑا ہی شبھ شگون ہوتا
ہے۔" میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔ گھڑی دیکھی۔ ہال کھلنے میں ابھی پچاس منٹ
باقی تھے میں کالج کے گول پارک میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔
پورے سولہ برس بعد میں نے کالج میں قدم رکھا تھا۔ سب کچھ بدل گیا ہے
آج جہاں امتحان کا ہال ہے ٹھیک اسی جگہ پارک ہوا کرتا تھا۔ یہ بیلیں جن سے
شعبۂ اُردو کے سامنے کی دیوار ڈھک گئی ہے ان دنوں ان کا نام و نشان بھی
نہ تھا۔ کالج کے چاروں طرف یہ پختہ سڑک بھی نہ تھی۔ صرف ایک پختہ سڑک
آمی تک جاتی تھی۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ پڑھنے پڑھانے والوں کے ساتھ
کالج کا نام بھی بدل گیا ہے۔
میں اُن دنوں سکنڈ ایئر میں تھا۔
ایک دن سائیکل اسٹینڈ کے پاس ایک فوجی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔
ہم کچھ ہم جماعت ادھر سے گزرے۔ میں نے یونہی موٹر کی مشین کے پرزے سے
چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ فرفر کر کے وہ کانپنے لگی۔ سارے ہم جماعت نو دو
گیارہ ہو گئے۔ میں نے اُسے سنبھالنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ زمین پر گر گئی۔
میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کہ ایک بھاری بھرکم ہاتھ میری
گردن پر زور آزمائی کرنے لگا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک فوجی سکھ ہاتھوں میں چمڑے
کے دستانے پہنے غصے سے کانپ رہا تھا۔ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔
"سردار جی پہلے آپ موٹر سائیکل سنبھال لیجئے ایسا نہ ہو کہ پٹرول کی ٹنکی میں آگ
لگ جائے۔"
سردار جی نے میری تجویز مان لی۔ وہ نیچے کی طرف جھکے اور میں
کینٹین کی طرف بھاگ گیا۔
حلیمہ کو یہ سب نہ جانے کہاں سے معلوم ہو گیا۔ گھر پہنچا تو امی اُبل پڑیں۔
ہم سے نہ سہی مگر خوفِ خدا سے تو ڈر۔ کہیں وہ موٹر سائیکل اوپر ہی گر پڑتی تو۔

اُس کا ڈرائیور ایک فوجی تھا، دو چار دھول ہی جما دیتا تو۔"

بوٹ کے تسمے ڈھیلے کرتے ہوئے میں نے کہا: "امی جان یہ حلیمہ کی بچی کالج میں بھیگی بلی بنی رہتی ہے اور آپ کو کالج کی ایک ایک بات کا آنکھوں دیکھا حال سُناتی ہے جیسے . . . "

حلیمہ نے میری بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا: "میں تو بھیگی بلی ہوں مگر آپ اتنے بہادر ہوتے تو بھیگی بلی کی طرح نہیں بھاگتے۔"

"تو کیا ہوتا؟"

"پرنسپل صاحب ایک لوکل پوسٹ کارڈ پھوپھا جی کو بھجوا دیتے" حلیمہ نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا

"پھر۔ پھر کیا ہوتا؟"

"وہی جو بلا اجازت سیالکوٹ جانے پر ہوا تھا۔"

"اباکی یونی فارم کا خیال کرتا ہوں۔ کیا کبھی سول کپڑے پہنے انہوں نے مجھے پیٹا ہے۔"

امی جان اور حلیمہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔

حلیمہ ہمارے ماموں جان کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ مڈل تک اپنے گاؤں میں پڑھنے کے بعد اب وہ ہمارے ہاں رہ کر پڑھ رہی تھی۔ اگر حلیمہ کی پڑھائی کے حساب سے دیکھا جائے تو یہ صاف ہے کہ ہم لڑکے پڑھتے نہیں تھے۔ پورا برس پروفیسر مجھے گھر پر پڑھاتے رہے لیکن میں ایف اے نہ کر سکا۔

رزلٹ سننے کے بعد منہ چھپانے کے لئے میں نے اُس دن لگاتار سینما کے تین شو دیکھے۔ آدھی رات گئے گھر پہنچا۔ سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ نوکر اور اردلی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک چکے تھے۔ اسپتال سے لے کر تھانے تک فون ہو چکا تھا۔ چچا جان سیالکوٹ پتہ لگانے گئے تھے۔ اباجان جلدی ہی کلب سے لوٹ آئے تھے اور جب میرے آنے کی خبر اُن تک جا پہنچی تو وہ اپنے کمرے سے ہی گرجے: "نالائق کو یہاں لے آؤ۔"

امی جان اور حلیمہ میری ڈھارس بندھاتی اباکے کمرے کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں جیون شاہ کے مزار پر منتیں مانگتا ہوا ایک ایک قدم اُٹھا رہا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ "خدا کے لئے مجھے تنہا نہ چھوڑ دیجئے" میں نے کہا۔

امی کی آنسو بھری آنکھوں نے مجبوری ظاہر کی۔ میں نے حلیمہ کی طرف دیکھا۔ اُس نے سر ہلا کر حامی بھری اور آٹومیٹک کھانسی کھانس کر اور میری بانہہ تھام کر اپنے کمرے کے اندر چلی گئی جیسے وہ مجھے اسکول چھوڑنے جا رہی ہو۔ کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ ابا یونیفارم پہنے ہوئے پر یونہی لیٹے سگار پی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے: "میں چاہتا تھا کہ تمہیں ولایت بھیجوں مگر تمہیں تو کالے صاحبوں کے تلوے چاٹنے ہیں، ٹھیک ہے جاؤ۔" یہ کہہ کر انہوں نے سگار بوٹ تلے مسل ڈالا۔

میں چپ چاپ پلنگ پر اوندھا لیٹ گیا۔ میری وجہ سے اباکس قدر دکھی ہوا۔ سگار مسلنے سے جو چنگاریاں قالین پر گر رہی تھیں لگتا ہے جیسے یہ چنگاریاں آنسو بن کر اُن کی آنکھوں سے گر رہی ہیں۔ اب کتنے ہی دنوں اباکسی سے بھی نہ بولیں گے۔ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔

میں یونہی لیٹا رہا ___ دفعتاً کسی نے سوئچ آن کیا۔ میں نے دھیرے سے آنکھیں کھول کر دیکھا حلیمہ ابھی تک اپنی دو انگلیاں سوئچ پر رکھے ہے۔ بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ مجھے اُس کی موجودگی گراں گزری۔

"حلیمہ مجھے تنہا چھوڑ دو"

"پہلے آپ چل کر کھانا کھائیں"

"مجھے بھوک نہیں ہے"

"کیوں"

"بھوک نہیں ہے۔ کیا اتنا کہنے سے کام نہیں چلے گا؟"

"نہیں۔ کیونکہ ابھی تک کسی نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے" حلیمہ نے بڑی نرمی سے کہا۔

"نہیں کھایا تو اب کھا لو۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے کروٹ بدل لی۔

حلیمہ میرے قریب آکر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ "فیل ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کو کچھ آتا جاتا نہیں۔ آج کل لڑکوں کو نوٹس رٹنے کے سوا آتا ہی کیا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ اگر آپ ایک بار اپنا کورس دیکھ لیں تو یوں پاس ہوں گے آپ۔"

اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ حلیمہ بڑی سمجھدار ہے۔ میں لاپروا ہوں مگر نالائق نہیں۔ آج پہلی بار کسی نے یوں میری ہمت افزائی کی تھی اور مجھے لگا کہ میں ازل ازل سے بھوکا ہوں۔ میں نے کہا ___ حلیمہ

امی کے پاس جاتے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہو رہی ہے۔ میرا کھانا یہاں ہی بھجوا دو۔" بہت اچھا کہہ کر وہ آہستہ سے چلی گئی۔ دوسرے لمحے وہ خود ہی کھانا لے کر آئی۔

دوسرے برس میں پاس ہو گیا اور ہم دونوں تھرڈ ایر میں آ گئے۔ لیکن میں بی اے نہ کر سکا۔ حلیمہ بی اے میں کامیاب ہوئی اور اب تو ماموں جان اُسے گاؤں لینے بھی گئے۔ چھ سال کے طویل عرصے میں کبھی بھی یہ سوچ نہ سکا کہ حلیمہ صرف بی اے کرنے تک ہی ہمارے ہاں ٹھہرے گی۔ مجھے لگا جیسے کوئی انہونی بات ہوئی ہو۔

دوسرے دن اُس نے جانا تھا۔ شام کو میرے کمرے میں آئی۔

"یہ لیجئے اپنا پن"

"پن تم اپنے پاس ہی رکھ لو" میں نے حیران ہو کر کہا۔

حلیمہ نے آہستہ سے کہا: "اس بار آپ امتحان نہیں دے رہے ہیں کیا؟"

میں نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ "نہیں اب نہ دوں گا۔"

"نہیں نہیں آپ امتحان ضرور دیں میں وثوق سے کہتی ہوں کہ . . .

"یہی نا کہ میں نالائق نہیں لاپروا ہوں۔ حلیمہ اب مجھ سے پڑھا نہیں جاتا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے رات کے بارہ بارہ بجے تک پڑھا ہے صرف تمہارے کمرے میں روشنی دیکھ کر۔ اب تو یہاں ان میں بھی اندھیرا ہوگا اور کوئی بھی اپنی مخروطی انگلیوں سے کھٹ کر کے سوئچ آن نہیں کرے گا۔ کسے پڑھتے دیکھ کر اب مجھے پڑھنے کا حوصلہ ہوگا۔ میں نے اپنی پرنم پلکیں اٹھا کر حلیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی بھیگی بلی بنی رہی۔

صبح میں اور امی جان انھیں الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن تک گئے۔ گاڑی چھوٹنے میں ابھی وقت تھا۔ ہم ٹرین شیڈ میں کھڑے ہو گئے۔ حلیمہ سسک سسک کر رو رہی تھی جیسے ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی ہو۔ امی نے کہا: "یوں نہ رو بیٹی۔ تھوڑے دنوں بعد ظفر تمہیں لینے آئے گا۔"

مگر حلیمہ کی سسکیاں بند نہ ہوئیں۔

ماموں جان نے شفقت سے کہا: "کیا بی اے پاس لڑکیاں روتی ہیں۔ کیوں ظفر تم نے کسی بی اے پاس لڑکی کو روتے دیکھا ہے"

میں نے اُن کی طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی بچہ اپنا کھلونا چھیننے والے کی طرف دیکھتا ہے۔ ماموں جان نے گھور کر میری طرف دیکھا اور امی کو لے کر ٹرین شیڈ کی دوسری طرف لے گئے۔

میں نے سٹال سے کچھ رسالے خریدے اور حلیمہ کو دیتے ہوئے کہا: "میں کچھ دنوں بعد آؤں گا۔"

حلیمہ کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی: "آپ ذرا اپنی سٹڈی کا خیال رکھیں۔"

سٹیشن سے واپسی پر امی نے دفعتاً پوچھا: "تو اس سال امتحان میں شامل نہیں ہوگا"

"نہیں"

"تب تجھے اپنے باپ کی طرح وردی پہن لینی چاہئے۔"

اور پھر ایک دن یونیفارم پہن کر بوٹ سے بوٹ ٹکرا کر میں نے کھڑاک سے سلام کیا۔ امی نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا: "پڑھنے میں نہ سہی۔ دیکھنے میں تو میرا بیٹا اول پاس ہے اسی لیے بھائی جان نے حلیمہ کے لیے . . . .

میں اٹنشن کھڑا تھا لگتا تھا جیسے کسی نے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا ہو۔ دوسرے لمحے میں حلیمہ کے کمرے میں گیا۔ مجھے لگا جیسے حلیمہ میری منتظر ہے۔ "آؤ بیٹھ کر اطمینان سے سوچیں۔ سکھ دکھ کی باتیں کریں۔ اور ہاں تمہاری سٹڈی کیسی چل رہی ہے۔" میں نے الماری سے حلیمہ کی نوٹ بک نکال لی۔ بس یہی ایک چیز اب اس کمرے میں اس کی آخری نشانی تھی۔ نوٹ بک میں کہیں بھی اس نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ حلیمہ نہ صرف خوبصورت لکھتی تھی بلکہ خوبصورت باتیں بھی کرتی تھی۔ میں نے بے تحاشا نوٹ بک کو چوما اور مجھے لگا جیسے حلیمہ سیالکوٹ کے ایک گاؤں کے کوٹھے کی منڈیر پر کھڑی یہ سب دیکھ رہی ہے۔

اس کے بعد وقت کا چکر کچھ اس طرح چلا کہ پھولوں کی خوشبو بدبو میں بدل گئی۔ ہواؤں میں زہر گھل گیا۔ گرم گرم لہو کی بارش ہوئی اور دھرتی کی کوکھ میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئیں۔ اور درمیان میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہو گئی۔ ایک جانب ہندوستان اور دوسری جانب پاکستان۔

ماموں جان کی چٹھیاں آئیں۔ پیغام آئے۔ بلاوے آئے مگر ابا اپنا وطن، گھر، جائداد، رتبہ، عزت چھوڑ کر مہاجر نہیں بننا چاہتے تھے انہوں نے انکار کیا اور آہستہ آہستہ ماموں جان نے خط و کتابت کا سلسلہ کم کر دیا۔

اور ایک دن حلیمہ کی شادی کا دعوت نامہ ملا کوئی مجید صاحب تھے۔

(بقیہ ص ۳۵)

ٹرین میں پڑھنا

مجتبیٰ حسین

ایک زمانہ تھا جب ہم کو مطالعہ کرنے کا بڑا شوق تھا بلکہ یہ شوق جُرم
ہ حدتک پہونچ گیا تھا جُرم ان معنوں میں کہ ہم دوستوں کے پاس سے
نابیں مانگ کر لایا کرتے تھے اور جب اُنہیں واپس کرنے کا وقت آتا تھا
ہم دوستی کو قبل ازوقت دشمنی میں بدل دیتے تھے اور مالِ غنیمت کے
ور پر کتابیں ہمارے پاس رہ جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے گھر میں کتابو
اانبار لگ گیا اور ہم نے اس انبار کو بڑے سلیقہ سے الماریوں میں رکھ
ایک لائبریری کی شکل دیدی۔ لیکن رفتہ رفتہ ہمارے مطالعہ کا شوق
ہی الماریوں میں بند ہوتا چلا گیا کیونکہ شادی کے بعد ہماری زندگی خود
یک ضخیم کتاب میں تبدیل ہوگئی۔ ہماری بیوی ہر سال بڑی پابندی سے
س کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے لگی۔ اور اب یہ حال ہے
ہماری زندگی کی کتاب کا ایک ایک ورق بکھر گیا ہے۔ آپ ہی بتائیے
ایسے میں کتابوں کا مطالعہ کیسے کریں؟

اب ہمارا مطالعہ صرف سفر کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی
ب بھی ہم کہیں سفر کے لئے جاتے ہیں تو مطالعہ سے اپنا جی بہلاتے ہیں اور
ہیں اپنا وہ ماضی یاد آجاتا ہے جب ہم بلا تکلف ایک ہی نشست میں کئی
تابیں پڑھ ڈالتے تھے۔ ایک ہم پر ہی کیا موقوف ہے، ٹرین میں سفر کرتے
وقت اچھا خاصا مسلمہ جاہل آدمی بھی تعلیم یافتہ اور دانشور نظر آنے لگتا
ہے۔ ٹرین کے مسافر کے پاس ٹکٹ ہو یا نہ ہو اس کے پاس ایک کتاب
یا پرچے کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور ہم آپ سے جھوٹ نہیں کہتے کہ
ادھر چند برسوں میں ہم نے مختلف کتابوں کے جو تین چار صفحات پڑھے ہیں
وہ سب کے سب ٹرین میں پڑھے ہیں۔ ٹرین میں مطالعہ کا لطف ہی کچھ
اور ہوتا ہے۔ یعنی ٹرین جب ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو ہم اپنے
سامان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہیں اور کتاب کھول کر برتھ پر دراز
ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو کتاب اور ٹرین دونوں ساتھ ساتھ
چلتے ہیں مگر اس کے بعد ہماری نظروں کے سامنے کتاب کی سطریں بڑی
تیزی سے پٹڑیاں بدلنے لگتی ہیں اور اس کے بعد نہ جانے کب ہماری
آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ پھر کتاب ہمارے سینے پر یوں سوار
ہو جاتی ہے جیسے وہ خود ہمارا مطالعہ کر رہی ہو۔ پھر نہ جانے کب تک ہم
سوئے رہتے ہیں مگر اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ ہماری نیند اچٹ جاتی
ہے۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہمارا ہاتھ اپنے سینے پر کتاب کو تلاش
کرنے لگتا ہے مگر کتاب وہاں نہیں ہوتی۔ ہماری تشویش میں ایک
نئے باب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ہم فوراً برتھ پر اٹھ بیٹھتے ہیں مگر ساتھ

ہی اطمینان کی ایک لمبی سانس ہمارے سینہ سے نکل جاتی ہے کیوں کہ ہمیں اپنی کتاب نظر آجاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کتاب ہمیں اپنے بازو والی برتھ کے مسافر کے سینہ پر نظر آتی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ ہمارے سونے کے بعد ہمارے پڑوسی مسافر نے موقع کو غنیمت جان کر ہمارے سینہ پر سے کتاب اٹھالی تھی اور پھر اُن کے ساتھ بھی وہی ہوا تھا جو ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ تب ہم اپنی کتاب کو پڑوسی مسافر کے سینہ پر سے بڑی آہستگی کے ساتھ یوں اُٹھاتے ہیں جیسے ہم اس کتاب کی چوری کر رہے ہوں۔ پھر از سرِ نو نیت باندھ کر اس کتاب کے مطالعے میں غرق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اتنا غرق ہوتے ہیں کہ پھر یہ کتاب ہمارے سینہ پر دراز ہوجاتی ہے اور جب ہم دوبارہ جاگتے ہیں تو پھر ہم اس کتاب کو اپنے پڑوسی مسافر کے سینہ پر پاتے ہیں اور یہ سلسلہ منزلِ مقصود کے آنے تک جاری رہتا ہے۔ کتاب کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی جائے۔ اور ہم اس عمل کے عادی ہوجاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہماری اور ہمارے پڑوسی مسافر کی آنکھیں بیک وقت کھلتی ہیں اور ہم دونوں کے ہاتھ حادثاً ایک دوسرے کے سینوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور جب ہم دونوں میں سے کسی کو بھی کتاب نہیں ملتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کا "حلقہ احباب" اب کافی وسیع ہوگیا ہے اور یہ کہ یہ کتاب ٹرین کے ڈبے میں مقبول ہوتی جارہی ہے اور اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی نوبت آگئی ہے۔ ہم دونوں جب ایک دوسرے کے حیران چہروں کو دیکھ کر نیچے نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کتاب ہنوز بخیر و عافیت ہے اور اب کی بار نیچے کی برتھ والے مسافر کے سینہ پر آرام کر رہی ہے۔ اب کی بار ہم کتاب کو اوڑھے بغیر ہی سو جاتے ہیں اور درمیان میں جب بھی ہماری آنکھ کھلتی ہے تو اپنی کتاب کو کسی نئے مسافر کے سینہ پر پاتے ہیں۔ پھر ایک موقع ایسا بھی آتا ہے جب ہماری کتاب اچانک ڈبہ سے غائب ہوجاتی ہے۔ ہم اُسے ڈبہ سے لے کر باتھ روم تک میں تلاش کرتے ہیں مگر وہ ہمیں داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔ ہم سینہ پر کتاب رکھنے کے بجائے پتھر رکھ لیتے ہیں۔ پھر ہمارا اسٹیشن آجاتا ہے جب ہم سامان لے کر باہر جانے لگتے ہیں تو ٹرین کے سب سے آخری ڈبہ میں ہمیں ایک صاحب ہماری کتاب کے مطالعے میں غرق نظر آتے ہیں۔ ہم قریب جا کر دست بستہ عرض کرتے ہیں: "یہ کتاب ہماری ہے۔ ہمیں واپس فرمایئے"۔ اس پر وہ صاحب ہمارے حقوقِ ملکیت کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں: "معاف کیجئے۔ میں نے یہ کتاب بازو والے ڈبہ کے ایک اور صاحب سے حاصل کی ہے۔ آپ کو میں یہ کتاب کیسے دے سکتا ہوں؟" ہم بازو والے ڈبہ کے شخص مذکور سے ربط پیدا کرتے ہیں۔ وہ جواباً ہمیں پھر اس کے بازو والے ڈبہ کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ ہم ڈبہ در ڈبہ اپنے پرلے ڈبہ کی جانب بڑھنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ٹرین کے گارڈ کو کسی طرح پتہ چل جاتا ہے کہ ہماری کتاب کا سلسلہ حسب و نسب اب ہم سے ملاہی چاہتا ہے تو وہ فوراً ہری جھنڈی ہلا کر سیٹی بجا دیتا ہے اور ٹرین کا سگنل ہماری قسمت پر گر جاتا ہے۔ ہماری کتاب ایک اجنبی مسافر کے پاس رہ جاتی ہے۔ ٹرین پلیٹ فارم سے اور کتاب ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہوتی ہے۔ ہم منہ لٹکائے پلیٹ فارم سے باہر آجاتے ہیں اور تہیہ کر لیتے ہیں کہ آیندہ کبھی ٹرین میں کتاب اپنے ساتھ نہ رکھیں گے مگر آپ ہی بتایئے ہم کیا کریں۔ ہمیں تو صرف ٹرین میں کتابیں پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ گھر میں تو ہم بحالتِ مجبوری صرف اپنے بچوں کے کورس کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمیں ان کتابوں کو پڑھانا ہوتا ہے لہٰذا اتنے سارے تلخ تجربوں کے باوجود ہم سفر میں اپنے ساتھ کوئی کتاب یا اخبار رکھنے پر مجبور ہیں۔

اب آپ سے کیا چھپائیں کہ ہمیں اخبار پڑھنے کا موقع بھی صرف ٹرین میں ہی ملتا ہے۔ اس لئے جب بھی سفر پر جاتے ہیں تو ہمیں دنیا کے حالات اچانک بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں فوجی انقلاب آگیا ہے۔ ہم حیران ہو کر اپنے بازو والے مسافر سے پوچھتے ہیں۔ "بھئی! یہ کیا معاملہ ہے۔ ابھی چار مہینے پہلے جب میں بمبئی گیا تھا تو اس وقت بھی اس ملک میں انقلاب آیا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

اس پر مسافر کہتا ہے۔ "مجھے کیا معلوم! میں تو پورے آٹھ سال بعد سفر کر رہا ہوں۔ میں دُنیا کے حالات سے آپ کے مقابلے میں بہت کم واقف ہوں۔"

اس پر تیسرا مسافر ہم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: "جناب والا!

رمہینے پہلے کی انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں حالانکہ اس اثناء میں اس ملک ئی چھ انقلاب آچکے ہیں۔"

اس جواب کو سن کر ہم جھینپ جاتے ہیں اور کہتے ہیں "معاف کیجئے پ کی طرح ہر روز ٹرین میں سفر نہیں کرتا کہ ہر روز کے حالات سے واقفیت ں۔ میں تو سال بھر میں دو تین بار ہی سفر کرتا ہوں۔" اور یوں بات دب ہے۔

مگر ٹرین میں کتاب کا مطالعہ تو پھر بھی قابلِ برداشت ہوتا ہے مشکل نبار کے مطالعے میں ہوتی ہے کیونکہ اخبار مجلد نہیں ہوتا اور اس کی سیم بڑی آسانی سے عمل میں آجاتی ہے۔ آپ ایک سالم اخبار لے کر ٹرین وبہ میں سوار ہوتے ہیں لیکن ابھی آپ اپنا اخبار اپنی نشست پر رکھ کر اپنا ملان سیٹ کے نیچے جمانے بھی نہیں پاتے کہ اچانک آپ کے کانوں میں ہڑا پھڑ" کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ پلٹ کر دیکھتے ہیں تو انکشاف ہوتا ہے یک نووارد مسافر آپ کے اخبار کو بطور جھاڑو استعمال کر رہا ہے۔ آپ بار کو اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ "تھینک یو" کہہ کر آپ زبان پر تالا لگا دیتا ہے۔

خیر صاحب: ٹرین چلتی ہے اور آپ اخبار اپنے منہ کے سامنے پھیلا تے ہیں۔ اتنے میں بازو والا مسافر ایک طویل جماہی لیتے ہوئے چٹکی بجا کر ہاہے" قبلہ! ذرا اوپر کا صفحہ تو عنایت فرمایئے۔ دیکھیں آج کی خاص خاص ریں کیا ہیں۔ آپ اپنی خاندانی شرافت سے مجبور ہو کر اوپر کا صفحہ مسافر دیدیتے ہیں اور بقیہ اخبار کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں لیکن موڑی دیر بھی نہیں ہوتی کہ مسافر مذکور آپ سے کہتا ہے۔ "قبلہ! اب ذرا نفوہ تو عنایت فرمایئے۔ کیونکہ پہلے صفحے والی ایک خبر کا سلسلہ آٹھویں نفحہ پر موجود ہے۔ اب اخبار آپ کے ہاتھوں سے قسطوں میں نکلنے لگتا ہے در کچھ دیر بعد آپ کے اخبار کے صفحات "فیضِ عام" کی طرح سارے ڈبہ میں گشت کرنے لگتے ہیں۔ خبروں کے سلسلے ایک صفحہ سے دوسرے صفحہ پر اور ایک مسافر سے دوسرے مسافر تک جانے لگتے ہیں اور آپ کا اخبار شرق سے لے کر مغرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک پھیل جاتا ہے۔

پھر آپ کی چشمِ گنہگار ایک اسٹیشن پر یہ منظر بھی دیکھتی ہے کہ ایک سافر نے آپ کے اخبار کے ایک صفحہ کو دسترخوان میں تبدیل کر لیا ہے۔ اور اس صفحہ پر انواع و اقسام کی نعمتیں سجادی گئی ہیں۔ آپ بڑی حسرت سے ان نعمتوں کی طرف دیکھتے ہیں کہ شاید اخبار کے مالک ہونے کی حیثیت سے آپ کو بھی ان نعمتوں سے فیض یاب ہونے کی دعوت دی جائے لیکن آپ کی حسرت صرف حسرت ہی بنی رہتی ہے۔ پھر اخبار کے دسترخوان پر سے کھانے پینے کی اشیاء اٹھالی جاتی ہیں۔ آپ کے دل میں موہوم سی امید پیدا ہوتی ہے کہ شاید آپ کا اخبار آپ کو واپس مل جائے لیکن اچانک اس اخباری دسترخوان کی مدد سے سیٹ کو پونچھنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور قبل اس کے کہ آپ اپنے اخبار کی جان بچائیں آپ کا اخبار اچانک مسافر کی مٹھی میں ایک گیند کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اخبار کی یہ گیند کھڑکی سے باہر چلی جاتی ہے۔ پھر ایک بلند بانگ ڈکار کی آواز آتی ہے اور آپ کا اخبار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہضم ہوجاتا ہے۔ آپ صبر کر کے اپنے اخبار کے باقیماندہ صفحات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن اس وقت پتہ چلتا ہے کہ کسی مسافر نے آپ کے اخبار میں کیلے باندھ رکھے ہیں۔ کسی نے جوتا سجا رکھا ہے۔ کوئی اسے پنکھے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ کسی نے اپنے روتے ہوئے بچے کو بہلانے کے لئے اخبار کے صفحہ کو پھاڑ کر ایک خوبصورت سی کشتی بنا دی ہے اور بچہ خوب زور زور سے ہنس رہا ہے۔ ایسے وقت آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ فوراً ٹرین کے خطرہ کی زنجیر کھینچ دیں اور ریلوے حکام کو مطلع کردیں کہ آپ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھر گئے ہیں مگر اس وقت تک آپ کے اخبار کے باقی صفحات بھی "صفحۂ ہستی" سے مٹ جاتے ہیں۔ اس لئے تو ہم نے اب یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ جب کبھی ٹرین سے سفر کرتے ہیں تو اپنے ساتھ ایک ہی تاریخ کے ایک ہی اخبار کی پندرہ پندرہ کاپیاں رکھتے ہیں کہ اخبار کی ایک کاپی ضائع ہو تو دوسری کاپی فوراً نکال لی جائے اور مطالعہ جاری رکھا جائے لیکن ایسا کرنے سے ہماری معیشت کو بڑا شدید دھکا پہونچتا ہے کیونکہ جب ہم اخبار کی پندرہ کاپیاں ایک ساتھ لے کر ڈبہ میں سوار ہوتے ہیں تو ڈبہ کے مسافرین ہمیں دیکھ کر پکارنے لگتے ہیں " او میاں: پیپر والے۔ ہمیں بھی ایک اخبار دینا اور ہم غصہ میں آکر اخبار کی کئی کاپیاں مسافرین میں تقسیم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں " ساتھیو: اتنے سارے اخبارات کی مفت تقسیم کے بعد بھی اگر پھر کسی نے میری کاپی کی طرف نظر ڈالی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میں اکیلا ہی اپنا اخبار پڑھنا چاہتا ہوں۔

غزلیں



الفت میں تیری سود و زیاں کچھ نہ کچھ تو ہو
ہستی کا اس جہاں میں نشاں کچھ نہ کچھ تو ہو

یہ کیا کہ اُن کو قصۂ ماضی بنا دیا
محفل میں ذکرِ غم زدگاں کچھ نہ کچھ تو ہو

دامن پہ اپنے نقش نہیں داغ ہی سہی
انجام تیرا اشکِ رواں کچھ نہ کچھ تو ہو

ہوں بیخودِ حیات مگر چاہتا ہوں یہ
صبحِ بہار، شامِ خزاں کچھ نہ کچھ تو ہو

اے برق تو جلا نہ نشیمن کو میرے بعد
گلشن میں آشیاں کا نشاں کچھ نہ کچھ تو ہو

بے کیف ہو رہی ہے اسیری میں زندگی
خاموشیٔ قفس میں فغاں کچھ نہ کچھ تو ہو

ہر وقت میرے لب پہ ہیں کیوں مسکراہٹیں
صورت سے میری رنج عیاں کچھ نہ کچھ تو ہو

کیوں تیرے ذہن میں ہیں وفا کے تصورات
مبنی حقیقتوں پہ گماں کچھ نہ کچھ تو ہو

کب تک کروں میں ضبط کا اپنے مظاہرہ
فرقت میں آنکھ اشک فشاں کچھ نہ کچھ تو ہو

اے نامراد کیوں ہے یہ خاموش زندگی
اس بیکسی میں حرف و بیاں کچھ نہ کچھ تو ہو

قائل نہیں ہوں نفع کا ثاقبؔ زمانے میں
الفت میں اس کی سود و زیاں کچھ نہ کچھ تو ہو

ثاقب کانپوری



ماضی کی رونقوں سے ہے امروز شرمسار
یہ زندگی ہے یا کوئی اُجڑا ہوا دیار

دیکھ! سنبھل کے بربطِ احساس چھیڑنا
نغموں کی ضرب سے کہیں ٹوٹے نہ کوئی تار

جھلسی ہوئی اُمیدوں کا چہرہ دمک اُٹھا
بیتے دنوں کی یاد ہے یا نور کی پھوار

اک دھوپ تھی کہ ہم قدمِ فکر و جاں رہی
راہِ طلب میں کس کو ملا نخلِ سایہ دار

محرومیوں سے بھی نہ کہا یہ کہ لوٹ جاؤ
کس نے کیا ہے میری طرح زندگی سے پیار

خوابوں کی طرح ٹوٹ کے وہ بھی بکھر گیا
شبنم کے موتیوں سے بنایا تھا ایک ہار

کیا کارواں سے چھوٹ گیا کوئی راہرو
اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہے کسے راہ کا غبار

حرمتؔ قدم قدم پہ کٹانا پڑا ہے سر
لمحات کا سفر ہے کہ چلتی چھری کی دھار

حرمت الاکرام



وہ سوزِ غم کی میرے دھجیاں اُڑاتے ہیں
ادائے خاص سے رسمِ وفا سکھاتے ہیں

فریب خوردہ رنگینیٔ بہاروں میں
مرے ارادے بھی اب مجھ سے منہ چھپاتے ہیں

اُنہیں کے عزم سے تابندہ ہے شرارِ حیات
ہوا کی زد پہ جو اپنے دیئے جلاتے ہیں

نگاہِ ناز کی اخگر فشانیاں منظور
انہیں شراروں سے ہم گلستاں بناتے ہیں

شکارِ واہمۂ جبر و اختیار ہیں ہم
خودی کو آئینۂ بیخودی دکھاتے ہیں

ٹپک رہا ہے میرے خونِ دل سے دامنِ گل
کلی چٹکتی ہے جب زخم مسکراتے ہیں

ایس۔ ایم محسن



زعفران دنیا کا سب سے قیمتی پھول

موہنی کول

کشمیر جنت نظیر ہے۔ ہر موسم میں اس کا حسن دلکش ہوتا ہے لیکن جب پامپور میں زعفران کے پودے لہلہاتے ہیں تو یہاں کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے جب زعفران کے چھوٹے چھوٹے پودوں میں سرخی مائل نارنجی رنگ کے پھول کھل اٹھتے ہیں تو آس پاس کے علاقے رنگوں کے تنوع سے ایک عجیب مسحور کن منظر پیش کرتے ہیں اور پورا علاقہ زعفران کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔

لیکن چاندنی راتوں میں اس کا حسن دلفریب ہوتا ہے۔ جب چاند آہستہ آہستہ آسمان میں بلند ہوتا جاتا ہے اور خشک اور تیز ہوا زعفران کے پھولوں کی خوشبو سے مست ہو جاتی ہے تو پامپور کی دوشیزائیں اپنے گھروں سے باہر نکل آتی ہیں اور رقص کرتے ہوئے نئے موسم کو خوش آمدید کہتی ہیں۔ اس وقت ایسا لگتا ہے کہ گاؤں کی ان لڑکیوں کے ساتھ پوری فطرت مستانہ وار رقص کر رہی ہے۔

کشمیری کسان، مرد اور عورتیں، بوڑھے اور جوان زعفران کے کھیتوں کے گرد جمع ہوتے ہیں اور سب مل کر خوشی کے گیت گاتے ہیں۔ اور اس گیت کے تال اور سُر پر سبھی رقص کناں ہوتے ہیں۔ ان گیتوں میں عام طور پر محبوبہ اپنے محبوب کی جدائی کا شکوہ کرتی ہے جسے زعفران کے پھولوں کی خوشبو نے اُسے اس سے جدا کر دیا ہے۔ ہجر کی ماری ان الفاظ میں فریاد کرتی ہے ؎

"میرا محبوب پامپور کی طرف گیا ہے۔
زعفران کے پھولوں کی خوشبو نے اُسے بے بس کر دیا ہے۔
وہ وہاں ہے اور میں یہاں ماری ماری پھر رہی ہوں
اے مالک میں کب اور کس جگہ اس کی صورت دیکھ سکوں گی۔

زعفران دُنیا کا سب سے قیمتی پھول ہے۔ ایک کلو خشک پھولوں کی قیمت (اکتوبر ۱۹۶۹ء میں) ۲۲۵۰ روپے تھی۔ موجودہ قیمت ۲۵ سال پہلے کی قیمت سے ۱۵ گنا زیادہ ہے۔

زعفران کی کاشت کس طرح شروع ہوئی اُس کے بارے میں کئی روایتیں ہیں۔ کشمیر کے مشہور مورخ کلہن نے اپنی مشہور تاریخ راج ترنگنی میں جو ۸۴۴، ابیات پر مشتمل ہے، اس کا ذکر اس طرح کیا ہے: زعفران کا ایک پودا تکشک ناگ نے تحفے کے طور پر پدم پور (پامپور) کے مشہور معالج واگھ بھٹ کو دیا تھا جب کہ اس وادی میں آسمانی مخلوق رہتی تھی۔ ایک بار ناگوں کے راجہ تکشک ناگ کی آنکھوں میں تکلیف ہوئی اور وہ علاج کے لئے واگھ بھٹ کے پاس آئے تھے۔

جب یہ ماہر معالج ناگ راج کے مرض کا علاج کرنے میں ناکام رہے۔ تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کا تعلق کس نسل سے ہے تو ناگ راج نے

بتایا کہ ان کا تعلق ناگوں کی نسل سے ہے۔ واگھ بھٹ نے سمجھ لیا کہ اُن کی آنکھوں میں جو دوائیں لگائی جاتی ہیں، وہ زہریلی پھنکار اور سانسوں کی وجہ سے بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اُنھوں نے آنکھ پر پٹی باندھ دی اور اس طرح ناگ راجہ کی تکلیف دور ہو گئی۔ اس بات سے خوش ہو کر تکشک ناگ نے زعفران کا پودا انہیں پیش کیا۔ اس طرح پامپور میں کیسر کی کاشت شروع ہوئی۔

کشمیری تکشک ناگ کو زعفران کے کھیتوں کی رکھوالی کرنے والا دیوتا سمجھتے ہیں۔ زیون میں ایک بڑے چشمے کے کنارے جو پامپور سے زیادہ دُور نہیں ہے اس ناگ دیوتا کی پرستش کی جاتی ہے۔ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ معتقدت مند کیسر کی کاشتکاری کے موسم کے شروع میں ہر سال اس متبرک چشمے کی یاترا کرتے ہیں۔

زعفران کی کاشت سے متعلق ایک دوسری روایت بھی ہے کہ بُدھ مت کے ایک فرقے مولاسر وستی وادن کی مذہبی کتابوں اور بُدھ صوفی تارا ناتھ کی تحریروں میں اس کی صراحت موجود ہے۔ ان ذرائع کے مطابق کشمیر میں زعفران کو بُدھ بھکشو مدھین دین نے رواج دیا تھا۔ کشمیر کے متعلق ابتدائی بودھ اور برہمن تحریروں میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی جھیل تھا اور اس میں خوفناک اژدہا رہتا تھا۔ مہاتما بدھ کے نروان کے پچاس برس بعد اور اُن کی پیشین گوئی کے مطابق اس خوفناک اژدہے کو ارہت مدھین دین نے رام کر لیا۔ یہ بُدھ بھکشو اس وادی میں آباد ہو گئے۔ اور شہر اور گاؤں کی بنیاد ڈالی جب لوگ یہاں بس گئے تو انہوں نے مدھین دین سے پوچھا کہ اس نئی جگہ وہ اپنی روزی کمانے کے لئے کیا کریں۔ انہوں نے اُنہیں زعفران کی کھیتی کرنے کو کہا جو گندھا ندن پہاڑ پر اُگا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سے آدمیوں کو لے گئے اور اُنہوں نے وہاں سے زعفران کے پودے اکھاڑ لئے۔ لیکن جب یہ لوگ پودے اکھاڑ رہے تھے تو اُن کی نگرانی کرنے والے اژدہے اُن کی طرف دوڑ پڑے اور چاہتے تھے کہ رعد اور برق اور باراں کا طوفان بپا کر کے اِن کو ہلاک کر دیں، لیکن بُدھ ارہت نے سمجھایا اور اس طرح اُن کے غصے کو ٹھنڈا کیا اور اِن اژدہوں نے یہ وعدہ کیا کہ جب تک (مہاتما) بدھ کا مذہب اس دنیا میں باقی رہے گا اس وقت تک تم لوگوں کو اس پہاڑ کی پیداوار کو استعمال کرنے کی اجازت ہو گی۔

بہرحال، روایتیں جو کچھ بھی ہوں یہ بات طے شدہ ہے کہ کشمیر میں زعفران کی کاشت زمانہ قدیم سے ہوتی آئی ہے۔ امر سنہا (چوتھی پانچویں صدی کا مصنف) کی مشہور سنسکرت فرہنگ "امرکوش" میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اور اس کے ہم معنی لفظ 'کشمیر رجا' دیا گیا ہے۔ ہمارے قدیم شاعروں میں صرف کالیداس نے تفصیل کے ساتھ زعفران کے پھول کا ذکر کیا ہے۔ اس نے اتنی باریکی اور تفصیل کے ساتھ اس پھول اور اس کی پنکھڑیوں کا ذکر ہے کہ بعض ماہرین اُسے کشمیری سمجھتے ہیں۔ اس کو کم کم بھی کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں اور اسی لفظ سے کشمیری زبان کا لفظ کونگ (زعفران) نکلا ہے۔

راج ترنگنی کے مطالعے سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ کشمیر کے شاہی خاندان کے لوگ اس کا لیپ یا اُبٹن جسم پر ملتے تھے تاکہ جلد چمکدار اور نرم رہے۔ قدیم یونان میں زعفرانی رنگ امراء و شرفا کے لئے مخصوص تھا۔ اہلِ یونان درباروں ایوانوں، تماشہ گاہوں اور حماموں میں اُسے بکھیر دیتے تھے تاکہ پوری فضا معطر ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ جب نیرو روم میں داخل ہوا تو سڑکوں پر زعفران کے پودے بکھیر دئے گئے تھے۔

مغل شہنشاہ جہانگیر زعفران کے پھول اور اس کی خوشبو کا بہت دلدادہ تھا۔ تزک جہانگیری میں اس نے تفصیل سے اس کے متعلق لکھا زعفران کا نباتاتی نام Crocus Sativus ہے۔ پورا پھول کارآمد نہیں ہوتا۔ پھول سے گردن بقچہ Style اور سر بقچہ (Stigma) الگ کر دیا جاتا ہے۔ اور یہی خشک ہو کر زعفران کہلاتا ہے۔

کیسر کی کاشت محنت طلب اور خرچیلی ہے۔ کھیت کو ایک مربع میٹر کے پلاٹوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور ہر پلاٹ دوسرے سے قدرے اونچا ہوتا ہے۔ پھر پودوں کو ہر تین سال کے بعد ادل بدل کر کے ۱۵ سینٹی میٹر کی دوری پر لگا دیا جاتا ہے۔

زعفران کا پودا ننھا سا ہوتا ہے۔ اس کی اونچائی تقریباً چھ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ زمین سے اوپر صرف اس کے پھول ہی نظر آتے ہیں جب

رہ لگ جاتے ہیں تو اُس کی پتّیاں، نکیلی اور سوئی جیسی ہوتی ہیں۔ پھول میں ھ پنکھڑیاں اور چھ زر بر (Stamens) ہوتے ہیں۔ آخر نومبر یا شروع دسمبر میں پھول توڑنے کے لائق ہوجاتے ہیں۔

سرینگر سے ۱۲ کلومیٹر دور اور دریا کے بائیں کنارے پامپور کا سطح رتفع واقع ہے جو زعفران کی کاشت کے لئے مشہور ہے۔ یہاں صرف ۱۲۰ ہیکٹر میں زعفران کی کھیتی کی جاتی ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ عفران صرف کشمیر میں لگائے جاسکتے ہیں لیکن کھیتی باڑی کے جدید طریقوں و بروئے کار لاکر اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ یہ قیمتی پودا اتر پردیش کے ہاڑی علاقوں میں بویا جاسکے۔

زعفران کے پھولوں کو چننا بھی ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ پھولوں کو توڑنے کے بعد زر بر اور گرزن بقچہ کو الگ کیا جاتا ہے، کیونکہ صل کیسر یہی ہیں۔ اصل زعفران کمیاب اور مہنگا ہے اس لئے بازار میں نقلی زعفران کی بھرمار ہوتی ہے۔ اصلی زعفران کی پہچان یہ ہے کہ تھوڑا زعفران ایک گلاس پانی میں ڈالا جائے تو اصلی زعفران کا رنگ اور خوشبو باقی رہے گی مگر نقلی زعفران اپنی دونوں صفتوں سے محروم ہوجائے گا۔

زعفران کی فصل کی کٹائی کا نظارہ بڑا دلفریب ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کے جھنڈ کے جھنڈ پھولوں کے توڑنے میں لگے رہتے ہیں ور ساتھ ساتھ بڑے رسیلے اور دلکش گیت گاتے جاتے ہیں۔ پہلے یہ قیمتی فصل جبراً ریاست کے مقرر کردہ ٹھیکیداروں کو دینی پڑتی تھی اور س طرح کسانوں کو اپنی محنت کا پورا ثمرہ نہیں ملتا تھا۔ لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ ریاستی حکومت نے سرکاری زمینوں کو کاشتکاروں کے حوالے کر دیا ہے اور اس طرح دلالوں کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کسانوں نے اپنی زمینوں میں خوب محنت شروع کر دی ہے اور زعفران کی کاشت کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے۔

ہندوستان اور یونان میں زمانہ قدیم سے زعفران دواؤں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی وجہ سے پامپور کے لوگ کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے۔ ایران اور اسپین کے لوگ اپنے کھانے کے لئے جو چاول پکاتے تھے اس میں زعفران ڈالتے تھے۔ انگریزی لفظ "Seffron" عربی کے زعفران سے نکلا ہے۔ خوشبو کے لحاظ سے اس کا جواب نہیں۔ زعفران کا شہد اپنے مزے اور خوشبو کے لحاظ سے ایک نادر شے ہے۔ پامپور میں شہد کی مکھیاں جو چھتہ لگاتی ہیں اُن سے یہ شہد برآمد ہوتا ہے۔

کیسر کو بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں راجپوت اپنے ماتھے پر کیسر کا تلک لگا کر میدان جنگ میں جاتے تھے۔ قدیم ہندوستان کے جھنڈے کا رنگ بھی کیسری ہے۔ جو بہادری اور جوانمردی کا مظہر ہے۔ ہندوؤں کی پوجا اور بہت سے تہواروں کا لازمی جزو زعفران ہے۔

پامپور کے علاوہ زعفران کشتواڑ (کشمیر) اسپین، فرانس، سسلی اور ایران میں بھی پیدا ہوتا ہے لیکن کشمیر کے زعفران کو سب سے عمدہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اٹھارویں صدی تک کیسر انگلستان میں بھی اگایا جاتا رہا۔ یہ جگہ والڈن تھی جسے آج کل "Saffron Welden" کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ طرابلس کا ایک یاتری اُسے انگلستان لایا تھا۔ وہ اس کا ایک پودا اپنی چھڑی میں جو اندر سے کھوکھلی تھی۔ چھپا کر لایا تھا۔

قدرت نے جہاں کشمیر کو بہت سی نعمتوں اور رعنائیوں سے نوازا ہے۔ اُن میں ایک انمول تحفہ زعفران بھی ہے۔ جو سیاح کشمیر آتے ہیں وہ زعفران کے لہلہاتے کھیتوں کو دیکھنا نہیں بھولتے کیوں کہ یہ ایک ایسا عجیب وغریب نظارہ ہے جو دلوں کو مسحور کر لیتا ہے۔



کرسمس کا تحفہ

ابراہیم یوسف

منظر : ایک مینی ٹوریم کے سامنے لان جس کے کنارے کنارے خوبصورت پھولوں کی کیاریاں ہیں. لان میں چند کرسیاں بے ترتیب پڑی ہیں اور ایک گول میز. صبح کے نو بجے ہیں. ہلکی ہلکی سردی ہے اور دھوپ خوشگوار. نلنی ایک شال اوڑھے کرسی پر بیٹھی ہے. اس کے پاس ایک ٹھیلے والا کھڑا ہے. نلنی ایک مفلر کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہے. کچھ دیر بعد نلنی مفلر واپس کر دیتی ہے اور ٹھیلے پر رکھے ہوئے ایک سوئٹر کی طرف اشارہ کر کے ٹھیلے والے سے

نلنی ، ذرا سوئٹر دکھانا

دکاندار: (سوئٹر نلنی کو دیتے ہوئے) یہ لیجئے خالص اون کا ہے۔

نلنی : (سوئٹر لے کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھ کر) اور قیمت کیا ہے ؟

دکاندار: دکانداری کی بات پینسٹھ روپے اور ایمانداری کی ساٹھ.

نلنی ، بہت مہنگا ہے .

دکاندار، دیکھ لیجئے خالص اون ہے، روزی کی قسم سے لیجئے میں تو صرف پیٹ بھرنے تک کا دھندا کرتا ہوں۔

(انجن سیڑھیوں سے اتر کر قریب آکر)

انجمنے : ہلو نلنی۔ کیا خریدا جا رہا ہے۔

نلنی : ایک سوئٹر دیکھ رہی ہوں (سوئٹر انجن کی طرف بڑھا کر) دیکھو کیسا ہے ؟

انجمنے ، (سوئٹر اپنے ہاتھوں سے کر الٹ پلٹ کر دیکھ کر) یہ تو مردانہ

نلنی ، (مسکرا کر) ہاں۔ مجھے مردانہ ہی چاہئے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) جسونت کو کل یہاں سے چھٹی مل جائے گی۔ آخر ان کو کوئی سو تو دینا ہوگا۔

انجمنے ، ہاں میں نے بھی ایک تحفہ خریدا ہے. (مسکرا کر) مگر کل ہی بتلاؤں گی۔

نلنی ، اچھا کہو یہ سوئٹر کیسا ہے ؟

انجمنے : بہت خوب ہے۔ (مسکرا کر) تمہاری پسند ہے اور وہ بھی جسونت کے لئے۔

نلنی : (دکاندار کی طرف دیکھ کر) کیوں پچپن روپے نہیں لوگے.

دکاندار، میں نے عرض کیا نا، آپ لوگوں سے دھندا نہیں کرتا

انجمنے ، یہ کیا مانگ رہے ہیں ؟

نلنی : ساٹھ روپے

انجمنے : پچپن بھی زیادہ ہیں مگر خیر اب تم نے کہدیا ہے تو دیدو

دکاندار، مگر روزی کی قسم

انجمنے : (بات کاٹ کر) سینی ٹوریم کی دوکان پر اس سے کم ہی

سے اچھا لی جائے گا۔ بس یہ بچپن کافی ہیں دیدو

(نلنی پرس سے روپیہ نکال کر دیتی ہے۔ دکاندار روپیہ لے کر چلا جاتا ہے۔ انجمن پاس ہی کرسی پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے) بعض لوگ بھی کس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کسی کو کم از کم حسین خواب ہی دے جاتے ہیں۔

نلنی: (چند سیکنڈ غور سے انجمن کو دیکھتی ہے۔ پھر آہستہ سے) انجمن یہ سینی ٹوریم ہے۔ کون یہاں سے واپس جاتا ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے اور جو جاتا ہے وہ خوش قسمت ہی ہوتا ہے۔

انجمن: (ہنس کر) میں تو ضرور یہاں سے واپس جاؤں گی۔

نلنی: بھگوان تمہاری زبان مبارک کرے۔ اس وقت جو جا رہا ہے ہمیں اس کی خوشی میں ضرور خوش ہونا چاہئے۔

انجمن: خدا کی قسم نلنی جس دن تم یہاں سے واپس جاؤ گی۔ اس دن میں — اس دن میں۔

(خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب جاتی ہے۔ اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

نلنی: (انجمن کو دیکھ کر) ارے انجمن یہ کیا۔ تمہارا تو یہاں سے جانے کا عزم پختہ ہے پھر یہ آنسو؟

انجمن: (آنسو پونچھ کر) نہیں نہیں نلنی۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) کوئی بات نہیں۔ جس وقت کوئی یہاں سے جاتا ہے تو میں خوشی میں آنسو نہیں روک سکتی اور میرا عزم اور پختہ ہو جاتا ہے۔

نلنی: کل تم نے اس کی ماں کو دیکھا تھا۔

انجمن: کس کی ماں کو؟

نلنی: جسونت کی۔ جب ہم نے کہا تھا کہ دو چار دن میں جسونت کو یہاں سے چھٹی مل جائے گی۔

انجمن: ہاں — خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔

نلنی: میں نے تو محسوس کیا تھا کہ بڑھیا کے چہرے کی جھریاں کم ہو گئی تھیں۔ (روزی سیڑھیوں سے اتر کر ان کے پاس آتی ہے نلنی اسے دیکھ کر) ہلو روزی سسٹر

روزی: (ان دونوں کے پاس آ کر) ہلو نلنی۔ ہلو انجمن (پر بیٹھ کر) کیا ہو رہا ہے؟

انجمن: (سوئٹر کی طرف اشارہ کر کے) نلنی نے جسونت کے لئے ہے۔

روزی: (سوئٹر دیکھ کر) مارولس۔ ونڈرفل۔ جسونت کو ایک کرے گا۔ (پھر جیسے کچھ یاد آجانے پر) ارے نلنی کامن ہال وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

نلنی: میرا۔ کون؟ کیوں؟

روزی: وہ ڈرامے کا ریہرسل کر رہے ہیں

نلنی: ڈرامے میں تو میرا پارٹ نہیں ہے۔

روزی: وہ تمہارے گانے کا ریہرسل لینا چاہتے ہیں۔

نلنی: میں کئی مرتبہ تو ریہرسل دے چکی ہوں۔

روزی: مگر یہ بالکل فائنل ہے۔ آج رات ہی کو تو ڈراما ہو

نلنی: خیر وہ بھی کر لوں گی۔

(نلنی اٹھ کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر غائب ہو جاتی ہے۔)

انجمن: (روزی کو دیکھ کر) نلنی جسونت کو چاہنے لگی ہے۔

روزی: ہوسکتا ہے یہاں کی ہمدردی بھی محبت ہوتی ہے

انجمن: ہم نے کتنے ہی لوگوں کو اچھا ہو جانے پر یہاں سے کیا ہے۔ کئی مرتبہ ڈرامے کئے ہیں مگر کبھی نلنی نے گیت جسونت کے جانے پر وہ بہت خوش ہے۔

روزی: جسونت ایکدم سویٹ ہے ایک دم ینگ۔ مارولس اس کے چلے جانے پر سونا سونا سا محسوس ہونے لگے

انجمن: سونا سونا! (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ سینی ٹوریم روزی سسٹر یہ کبھی سنسان نہ ہوگا۔ زیادہ لوگ آئے مگر کم لوگ یہاں سے جائیں گے۔ یہ آواگون تو لگا ہی

روزی: اوہ نو مائی ڈیر انجمن۔ یو آر ٹو پیسیمسٹ۔ اگر ہم بتا سکتے ہیں کہ ہم اس بیماری کی جڑیں بھی کھود کر پھینک رہیں جس کے لئے یہ عمارت بنائی گئی ہے۔

(برآمدے میں سے ایک عورت کی آواز)

آواز: روزی سسٹر۔ روزی سسٹر (روزی پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھتی ہے۔) ڈاکٹر ممتاز تم کو وارڈ نمبر ۴ میں بلا رہے ہیں جلدی سے۔

روزی: (کھڑی ہو کر) اچھا

انجمن: (کسی قدر خوف زدہ لہجے میں) کیا بات ہے روزی سسٹر؟

روزی: کوئی بات نہیں۔ ذرا اقبال کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

انجمن: مگر کل تک تو

روزی: (سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے) معمولی سا بخار ہو گیا ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔

(روزی چلی جاتی ہے۔ انجمن خاموش بیٹھی رہتی ہے مگر چہرے سے ایک خوف کا احساس ہوتا ہے۔ اسی وقت جسونت سیڑھیوں سے اتر کر آتا ہے اور انجمن کو دیکھ کر)

جسونت: ہلو انجمن آرا بیگم

انجمن: ہلو مسٹر جسونت

جسونت: (ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) دھوپ کھائی جا رہی ہے۔ (جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں لیتا ہے۔)

انجمن: کل آپ چلے جائیں گے۔

جسونت: اور میں سیدھا مندر جا کر تم لوگوں کے لئے پرارتھنا کروں گا کہ تم لوگ بھی جلد ہی میرے پاس آ جاؤ۔ تم لوگوں کی یاد بہت ستائے گی۔ میں اس سینی ٹوریم سے باہر جا کر اداس اداس محسوس کروں گا۔

انجمن: اداس اداس۔ جسونت سگریٹ سلگاتا ہے۔ انجمن مسکرا کر اس کے منہ سے سگریٹ نکال کر لان پر پھینکتے ہوئے) سگریٹ پینا منع ہے۔

جسونت: (ہنس کر) ڈاکٹر نے مجھے ایک سگریٹ روز پینے کی اجازت دیدی ہے (جسونت سامنے میز پر رکھے ہوئے سوئٹر کو اٹھا کر دیکھتا ہے۔ (انجمن مسکرا کر)

انجمن: یہ آپ کے لئے ہے۔

جسونت: میرے لئے:

انجمن: جی ہاں۔ نلنی نے آپ کے لئے بُن دیا ہے۔

جسونت: نلنی بہت فضول خرچ ہے بھلا اس کی کیا ضرورت ہے۔

انجمن: (مسکرا کر) جب وہ یہاں سے جائے تو آپ کفایت شعاری سکھا دیجئے گا مگر خدارا ایسا نہ کیجئے گا کہ وہ کنجوس ہو جائے۔

جسونت: (انجمن کا چہرہ دیکھ کر) جی کیا مطلب ہے آپ کا۔

انجمن: (مسکرا کر) یہی کہ جب میں آپ کے یہاں آؤں تو خاطر و مدارات پوری ہو کہیں کفایت شعاری کنجوسی تک نہ پہنچ جائے۔

جسونت: انجمن آرا بیگم آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کی باتیں سنکر کہیں میں ـــ

انجمن: (بات کاٹ کر) اچھا تو آپ اب بنانے بھی لگے ہیں ـــ اچھا سچ بتلائیے کہ کیا اس سے پہلے کسی اور کی فیئرویل پر کبھی گایا ہے (جسونت خاموش رہتا ہے) کیا آپ کے دل میں نلنی کے لئے جگہ نہیں ہے۔

جسونت: خالی دل میں جگہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بھلا نلنی۔

(نلنی سیڑھیوں پر سے آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جسونت اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ نلنی قریب آ کر)

نلنی: انجمن: ڈاکٹر صاحب چیک اپ کے لئے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

انجمن: میرا؟

نلنی: ہاں (مسکرا کر) کہہ رہے تھے کہ ایک مہینے کے اندر اندر آپ لوگوں کو انجمن کا بھی فیرویل جلسہ کرنا ہوگا

انجمن: میرا۔ (پھیکی مسکراہٹ سے) ڈاکٹر صاحب بہت ہی مہربان ہیں (کھڑی ہو کر) ایک مہینہ کس نے دیکھا ہے۔

نلنی: پھر وہی۔ جانے تمہیں ناامیدی کی باتیں کرنے میں کیا مزا آتا ہے۔

انجمن: اور مسٹر اقبال کے لئے تو صرف آٹھ ہی دن بتلائے تھے مگر۔

نلنی: مگر مسٹر اقبال کو کیا ہوا۔

انجمن: (سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے) آج پھر انہیں بخار ہو گیا ہے۔ ابھی روزی سسٹر نے بتلایا ہے۔

(سیڑھیوں پر چڑھ کر عمارت میں غائب ہو جاتی ہے۔ نلنی عجیب انداز

ے انجمن کو عمارت کے برآمدے میں غائب ہوتے دیکھتی رہتی
ہے جسونت نلنی کو دیکھ کر)

جسونت: اس طرح آپ کیا دیکھ رہی ہیں۔

نلنی : جی کچھ نہیں بعض وقت کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے جیسے
اس عظیم عمارت کے سامنے ہماری کوئی ہستی نہ ہو۔ انسان اس
میں اسطرح کھو جاتا ہے جیسے اس نے نگل لیا ہو۔

جسونت: (بات ٹالنے کے انداز میں) یہ انجمن آرا بیگم بھی کس قدر دلچسپ
ہیں۔ دوسروں کو خوش رکھنے میں خوشی محسوس کرتی ہیں۔

نلنی : اور اس کا بھائی خالد تو اور بھی خوش مزاج اور ہمدرد ہے
ابھی گئے اتوار کو باورام یہاں سے رخصت ہوا تو وہ کس قدر
خوش تھا۔

جسونت: بالکل یہ معلوم ہوتا تھا جیسے باورام اس کا سگا بھائی ہو۔ اپنی
گاڑی میں اُسے گھر تک پہنچانے گیا اور گاڑی کو دلہن کی طرح سے
سجا کر لایا۔ کافی روپیہ خرچ کر دیا کہ ایک غریب آدمی خوش
ہو سکے۔

نلنی : ہمیشہ باورام کے لئے تحفے لایا کرتا تھا اور پھل وغیرہ تو روز ہی
لاتا تھا۔ شاید باورام کا کوئی نہیں ہے۔

جسونت: صرف ایک بوڑھی ماں ہے اور وہ بھی محنت مزدوری کرتی
ہے۔

نلنی : (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کل آپ کی ماتاجی بھی بہت خوش تھیں

جسونت: اُن کی دعاؤں کی برکت ہے کہ میں کل یہاں سے رخصت ہو
جاؤں گا
(چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میرے یہاں سے جانے کے بعد
آپ مجھے یاد بھی رکھیں گی یا نہیں۔

نلنی : کیوں نہیں (مسکرا کر) آپ ہی بھول جائیں تو دوسری بات ہے

جسونت: کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ : میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں ؟
(مسکرا کر) میں نے یہاں رہ کر کچھ خواب بھی تو دیکھے ہیں۔

نلنی : یہاں آکر انسان خواب ہی دیکھتا ہے ، زندگی کا خواب ، موت
کا خواب اور اُن میں سے کس کی تعبیر سچی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا۔

جسونت: مگر ہمیں پُر امید رہنا چاہئے ۔

نلنی : (بات کاٹ کر) ان چھ مہینوں میں سیکڑوں بار ہی ہمارے
چہرے اُداس ہوئے۔ سیکڑوں ہی مرتبہ روزی سسٹر نے
اپنے سینے پر کراس کا نشان لگایا۔ سیکڑوں ہی مرتبہ ر

جسونت: (لقمہ دیتے ہوئے) ہم نے ان سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر
تالیاں بجائیں۔ جانے والوں کو رخصت کیا اور اُن پر پھول
برسائے۔

نلنی : ہاں ہاں یہ بھی کیا ہے۔ ہم خوش بھی ہوئے مگر وہ خوشی
کتنی عارضی رہی۔ شاید خوشی عارضی ہی ہوتی ہے۔

جسونت: اور غم بھی عارضی ہوتے ہیں۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں
ہر روز آپ سے ملنے آیا کروں گا۔

نلنی : ابھی آپ کو زیادہ محنت نہیں کرنا چاہئے۔ ہوسکے تو کسی ہل
پر چلے جائیے۔

جسونت: ماتاجی تو مجھے بنارس لے جائیں گی۔ انہوں نے کوئی منت
مانی ہے۔

نلنی : اُن کی منت ضرور پوری کیجئے گا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ
کی ماتاجی کی باتوں میں کتنا سکون ملتا ہے۔ (آنکھوں میں آنسو
بھر کر) کاش میری ماتاجی بھی زندہ ہوتیں۔

جسونت: ارے آپ تو رونے لگیں۔ آنسو پونچھ ڈالئے۔ میری
ماتاجی تو آپ کو اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگی ہیں۔

نلنی (آنسو پونچھ کر) اب اُن سے کیا ملاقات ہوگی؟

جسونت: کیوں نہیں ہوگی۔ میں ہر روز انہیں ساتھ لایا کروں گا۔

نلنی : لیکن اب تو آپ بنارس چلے جائیں گے

جسونت ابھی تو کچھ دن وہاں جانے میں لگیں ہی گے۔ اور اس وقت تک
آپ کو بھی چھٹی مل جائے گی۔ آپ بھی ہمارے ساتھ بنارس
چلئے گا۔

(نلنی خاموش رہتی ہے اور سامنے درخت
پر پرندوں کو اُڑتے ہوئے دیکھنے لگتی ہے۔ جسونت کچھ دیر خاموش
رہ کر) آپ کیا سوچنے لگیں۔

نلنی : کچھ نہیں۔ میں چھ مہینوں سے ان پرندوں کو روز ہی دیکھتی ہوں
کیسے آزاد اور بے فکر اڑاتے رہتے ہیں۔
(جسونت خاموش رہتا ہے۔ انجمن واپس آکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)
جسونت: (انجمن کی طرف دیکھ کر) چیک اپ کرالیا آپ نے؟
انجمن : جی ہاں (مسکرا کر) ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اب میں تندرست ہوتی جارہی ہوں۔
جسونت: (مسکرا کر) آپ کو اس میں شک کیوں ہے۔
انجمن : (پھیکی مسکراہٹ سے) اس لئے کہ ڈاکٹر صبح صبح ہر مریض کو مژدہ سناتے ہیں۔ (طنزیہ ہنس کر) اور پھر اُن کی کتنی پیشین گوئیاں سچ ہوتی ہیں۔
جسونت: پھر اس میں ۔
انجمن : (بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے) شاید انہیں جھوٹ بولنے کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے کہ ہر مریض کو پُرامید رکھو۔
جسونت: (ہنس کر) آپ تو خواہ مخواہ ڈاکٹروں پر تنقید کرنے لگیں۔
(موضوع بدلنے کے انداز میں) آج مسٹر خالد ابھی تک نہیں آئے۔
انجمن : آتے ہی ہوں گے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میری وجہ سے اُن کا سارا کاروبار تباہ ہو رہا ہے۔
جسونت : اُن جیسا پُرخلوص آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ دل کیا ہے اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائیوں میں محبت کے علاوہ کچھ نہیں
(سیڑھیوں سے روزی آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا چہرہ اترا ہوا ہے اور آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ آکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ تینوں خوف زدہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہیں)
روزی : مے گاڈ بلیس ہم۔ (سینے پر کراس کا نشان بناتی ہے)
مے گاڈ بلیس ہم۔
انجمن : روزی سسٹر ایک کراس اور
روزی: اس نے ڈاکٹروں کو ہرا دیا۔ ڈاکٹر اس کو۔ ڈاکٹر اس کو
(اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہے) وہ کس قدر پرسکون رہا۔
انجمن : روزی سسٹر کون ؟ یہ کراس کا تحفہ تم نے کس کو پیش کیا۔
روزی: اقبال ۔ وہ ۔ وہ

(آواز رندھ جاتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہے۔ نلنی ایکدم
نلنی : اقبال۔ تو وہ۔ تو وہ۔ (خاموش ہو جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔) اس کا تو اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔
وہ کس قدر تنہا تھا۔ بالکل اکیلا۔
جسونت : نلنی ۔ نلنی
نلنی : اس سے کبھی کوئی ملنے نہیں آیا (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے پھر اپنی ہچکیوں پر قابو پا کر) کس قدر گمبھیر اور پرسکون رہتا تھا
روزی : نلنی ۔ نلنی بیٹی تم ۔
نلنی : اس نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی خواہش نہیں کی سوائے میرے ۔
انجمن : سوائے تمہارے !
نلنی : ہاں انجمن سوائے میرے ۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں جسونت کے فیرویل پر ایک گیت گاؤں اور میں نے مان لیا مگر وہ اپنی یہ خواہش ہی دل میں لے گیا۔ اب میں گیت نہیں گاؤں گی۔ کبھی نہیں گاؤں گی۔ (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ ماحول ایک دم اداس ہو جاتا ہے۔)
پردہ

بقیہ پھول اور انگارے

جن سے حلیمہ کی شادی ہو رہی تھی —— میری امیدوں کے پھول انگارے بن گئے۔ مجھے لگا جیسے میں تنہا کسی ویرانے میں کھڑا ہوں میرے چاروں طرف جیسے سینکڑوں کوّے کائیں کائیں کرتے ہوں اور مجھے نوچ رہے ہوں :

یہ کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے لیکن آپ اُسے سُن نہ پاتے اگر دس برس بعد ایک اور واقعہ پیش نہ آتا۔ امی کی موت پر حلیمہ کا ماتمی خط آیا۔ جانے کے بعد یہ اس کا پہلا خط تھا۔ زندگی اور موت کی ٹھوس مثالیں دے کر اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی تھی چٹھی کے آخر میں لکھا تھا —— امید ہے کہ آپ نے بی اے کر لیا ہوگا اگر نہیں تو ادیب فاضل ہی کر لیجئے۔ یہ امتحان پاس کرنا آپ کے لئے مشکل نہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ امتحان ہال کھلنے میں صرف دو ہی منٹ باقی تھے۔ مجھے لگا جیسے میں سولہ برسوں سے اسی بنچ پر بیٹھا ہوں۔

ترجمہ: نورشاہ

غزلیں

لطف الرحمٰن

میرے اندر خفا ہے 'میں' کوئی
چیختی پھر رہی ہے پُروائی
کس نے سمجھا ہے درد ساگر کا
کس نے دیکھی ہے دل کی گہرائی
کتنی سونی ہے نیند کی دہلیز
چاند کا ہم سفر نہیں کوئی
دیکھ کر اپنا عکس شیشے میں
مہر بر لب ہے میری گویائی
شش جہت سے پلٹ گئی جیسے
ہم نے بن میں صدا لگائی تھی
اور اب کون جاگتا ہوگا
رات آدھی گزر گئی ہوگی

طالب جے پوری

اب تو یہ احساس بھی ہوتا نہیں
درد بھی دل میں کبھی سمایا نہیں
زندگی کا کیوں یقیں ہوتا نہیں
آج کیا فتنہ کوئی برپا نہیں
دیر سے بھی ملتی ہے کعبے کی راہ
ذہن لیکن اس طرف جاتا نہیں
تھم گئے کیوں وقت کے ماتھے پہ بل
خوش تو مجھ سے وہ ستم آرا نہیں
اس میں ہے خونِ تمنا بھی ذرا
رنگِ گل ہی کچھ چمن آرا نہیں
ہم بھی، طالب سے ملے ہیں، بارہا
جیسا تم سمجھے ہو وہ ویسا نہیں

شکیل مظہری

چاند نکلا نہ ستاروں نے کوئی بات کہی
دل بہلنے کی اک امید تھی، وہ بھی نہ رہی

اب کے ایسی بھی ترے ہجر میں افتاد پڑی
نہ کوئی درد ہی چمکا نہ کوئی شمع جلی

مدتوں دل نے لہو نذر کیا ہے فن کو
تب کہیں آئی ہے اشعار کے رُخ پر سرخی

کس نے گیتوں کے جزیروں سے پکارا مجھ کو
کس کی آواز مری فکر کے سانچوں میں ڈھلی

ہم کہ اک عمر غمِ زیست کے ہم راہ رہے
ہم کو راس آ ہی گئی زیست کی آشفتہ سری

آج بھی ساتھ ہے میرے وہ مہکتی ہوئی شام
جس میں چٹکی تھی ترے پیار کے وعدوں کی کلی

اتنا سرکش ہوا حالات کا برتاؤ شکیلؔ
زندگی وقت کے ماتھے کی شکن بن ہی گئی

نورالحسن انور ادیب

کیوں نہ ہو جائیں نثارِ جلوۂ جانانہ ہم
کر رہے ہیں اتباعِ مشربِ پروانہ ہم
ہر قدم پر ہے نئی آفت جہانِ عشق میں
تم کو یہ سمجھائیں کیوں کر اے دلِ دیوانہ ہم
ایک ہی عالم ہے دونوں کا کسے ہو امتیاز
عشق سے نا آشنا وہ حسن سے بیگانہ ہم
جو فنا ہو جائے بے خطر رہگزارِ عشق میں
بس سمجھتے ہیں اسی کو عاقل و فرزانہ ہم
بادۂ گل رنگ کا ساغر بھی تو ساقی بھی تو
خوب واقف تجھ سے ہیں اے نرگسِ مستانہ ہم
محتسب کو یہ خبر کر دو کہ پھر سے بزم میں
کر رہے ہیں اہتمامِ شیشہ و پیمانہ ہم
بارگاہِ حسن میں لائے ہیں پھر پیش کش
جذبۂ الفت کا اپنے بے بہا نذرانہ ہم
کیا قیامت ہے وہی ٹھہرے وجہِ بربادیِ ہم
جانتے تھے جس کو یارب زینتِ کاشانہ ہم
ہم کو دونوں سے برابر کی عقیدت کیوں نہ ہو
پاسبانِ کعبہ ہم اور خادمِ بت خانہ ہم
خوفِ رسوائی لگا رہتا ہے اے آزادؔ
پھر بھی اُن کی بزم میں جاتے ہیں بے باکانہ ہم



نسیم دہلوی

شفیع احمد عثمانی

مرزا محمد اصغر علی خاں نام نسیم تخلص۔ نواب آقا علی خاں قاچار کے بیٹے تھے۔ آقا علی خاں قاچار کا شمار دہلی کے عمائدین میں تھا۔ نسیم ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۷۹۶ء بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ اور وہیں اپنے والد کے زیر سایہ نشو و نما پائی۔ نسیم کے علاوہ آقا علی خاں قاچار کے تین اور فرزند اکبر علی خاں، احمد حسین خاں اور محمد حسین خاں بھی تھے۔ اُن میں سب سے بڑے اکبر علی خاں تھے۔ احمد حسین خاں اور محمد حسین خاں کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ نسیم سے چھوٹے تھے یا بڑے۔ اُن کے خاندانی حالات کی تفصیل کا جستجو کے باوجود کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کسی مورخ یا تذکرہ نگار نے بھی اس پر روشنی نہیں ڈالی۔ حسرت موہانی کے بیان سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن کے ایک بیٹے کا نام حسین بیگ عرف مرزا حسنا تھا۔ یہ اپنی کم علمی کے باوجود شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔

نسیم کی تعلیم کے بارے میں بھی کچھ تفصیلی حالات نہیں ملتے ہیں رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اُردو" میں صرف اتنا لکھا ہے کہ ضرورت زمانہ کے مطابق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ہمارے پاس اُن کے کلام اور اُس زمانے کے ماحول کو سامنے رکھ کر اُن کی علمی استعداد کو متعین کرنے کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اُن کا کلام اس بات پر شاہد ہے کہ وہ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ مومن خاں مومن کی شاگردی بھی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ نسیم کی علمی استعداد مسلّم تھی کیونکہ مومن کبھی بھی کسی ایسے کو شاگرد بناتے ہی نہ تھے جو ضروری علوم سے نابلد ہو۔

نسیم کو شعر و شاعری کا ذوق ابتدا ہی سے تھا اور یہ اس زمانے کے تقاضے کے عین مطابق بھی ہے۔

نسیم کو حکیم مومن خاں مومن سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور بقول ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، اُن کے بہترین شاگردوں میں سے تھے۔[1] استاد سے خصوصی لگاؤ کا یہ کھلا ثبوت ہے کہ اُن کے یہاں جو مشاعرہ ہوتا تھا اُس میں مومن خاں ضرور شرکت کرتے تھے۔ نسیم نے اپنے کلام میں مومن کی شاگردی پر جا بجا فخر کیا ہے۔

---

[1] دلی کا دبستانِ شاعری مولفہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی ۱۹۴۹ء صد ۲۶۲

فضل حق سے بسکہ ہے شاگرد مومن تو نسیم
دُھوم ہے سارے زمانے میں ترے اشعار کی

نسیم دہلوی تو بھی مگر شاگرد مومن ہے
کہ ہر ہر شعر لطفِ بندشِ اوستاد دیتا ہے

نسیم ابتداء میں اصغر تخلص کرتے تھے اور قیام دہلی یعنی ۱۲۶۲ھ تک غالباً یہی تخلص رکھا بعد میں اس تخلص کو تبدیل کر کے نسیم اختیار کیا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ تبدیلی مومن خاں کی ایما سے کی ہو۔

نسیم طبیعتاً آزاد مزاج اور مشرباً رند صفت تھے اور بزرگوں سے بڑے ادب سے پیش آتے تھے بڑے بھائی کا بہت احترام کرتے تھے چھوٹوں کے ساتھ اُن کا رویہ مشفقانہ رہتا تھا اور شاگردوں کی خاطر بھی حد سے زیادہ ملحوظ رکھتے تھے۔ چونکہ طبیعت میں وارستگی تھی اس لئے کلام کو کبھی جمع کرنے کی فکر نہ کی۔ حسرت موہانی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے۔ دوات قلم کبھی بھی اُن کے پاس نہ رہتا تھا اور اکثر غزلیں موزوں کرنے کے بعد قریب کے ایک مکتب میں ردّی کاغذ پر طالب علموں کے موٹے قلم سے لکھ کر بے احتیاطی کے ساتھ ڈال دیا کرتے تھے۔[1]

نسیم جب تک دلی میں رہے نہایت فراغت اور خوش حالی سے زندگی بسر کرتے رہے لیکن لکھنؤ آکر اُن کو وہ فراغت نصیب نہ ہوئی اور کبھی کبھی تو اُن کو بڑی تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی، رحم دلی اور فیاضی کے ساتھ جو اُن کی فطرت میں داخل تھی، حاجتمندوں سے پیش آتے تھے۔

نسیم طبیعتاً بڑے خود دار تھے، اُن کی خودداری اس سے ظاہر ہے کہ جب وہ بھائیوں سے خفا ہو کر دلی سے لکھنؤ چلے آئے، پھر کبھی دلی واپس نہ آئے۔ اُن کے لکھنؤ آنے کے کچھ دنوں بعد بھائیوں نے معذرت کے ساتھ دلی بلانے کی کوشش کی اور پانچ سو روپے زادِ راہ کے بھی بھیجے لیکن اُنہوں نے تنگیٔ معاش کے باوجود روپئے واپس کر دیئے اور بھائیوں کا احسان لینا گوارا نہ کیا۔ خودداری کی غالباً یہ صفت اُن کو اپنے اُستاد حکیم مومن خاں مومن سے ملی تھی۔ مرزا نے اپنی خودداری کی وجہ سے کبھی ملازمت کرنا گوارا نہ کیا۔ منشی نولکشور نے غدر کے بعد اُن کی طرف قدر دانی کا ہاتھ بڑھایا اور "الف لیلہ" کو نظم کرنے کی خدمت سپرد کی لیکن پہلا ہی دفتر ختم ہوا تھا کہ منشی صاحب کی طرف سے کتاب کو جلد ختم کرنے کا اصرار ہوا۔ مرزا کو یہ امر ناگوار ہوا اور وہ اس کام سے دست بردار ہو گئے۔ جس کے متعلق دو روایتیں ہیں مولانا عبدالحیؒ مصنف "گل رعنا" اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی مصنف "دلّی کا دبستانِ شاعری" کا خیال ہے کہ پیغام اجل آجانے کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن حسرت موہانی رسالہ "اردوئے معلیٰ" میں لکھتے ہیں۔ کہ منشی صاحب کی جانب سے کتاب کے جلد ختم کرنے کا اصرار ہوا۔ مرزا صاحب کو یہ امر ناگوار ہوا۔ اور اُنہوں نے اس شعر پر دفتر اوّل ختم کر کے چھوڑ دیا ہے

لکھا یاں تک نسیم دہلوی نے
کہا آگے سے طوطا رام جی نے

حسرت موہانی کی روایت زیادہ صحیح اور قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ خود اس کی تصدیق نسیم کے اشعار ذیل سے ہوتی ہے۔

کہا جلد آپ اس کو نظم فرمائیں
کہ ہوں محظوظ دل سامع مزا پائیں
ارادہ تھا کہ کچھ لکھے مگر آہ
پس از چندے یہ پہونچا حکم ناگاہ
کہ لاؤ الف لیلہ، الف لیلہ
ذرا دیکھیں تو حضرت نے کہا کیا
یہ سنتے ہی ہوئے عاجز جو برہم
تو کیسی الف لیلہ اور کہاں ہم
کہا بہتر بجا لاتا ہوں ارشاد
ہوئی پابند سرعت طبع آزاد
کہا جو جی میں آیا بے تامل

[1] رسالہ اُردوئے معلّیٰ بابتہ جنوری [illegible] ص ۱

ل مضمون سے ٹپکا کیف بے مل

یہ اشعار اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ناگواری کے سبب اُنہوں
، خود اس کام کو چھوڑ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد منشی نولکشور
ے تعلقات میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی ہو ورنہ اس سے پہلے اُن سے تعلقات
ہایت خوشگوار رہے۔

اُن کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جس سے طبیعت کی شان
ستغنا کا پتہ چلتا ہے ؎

کیوں ناز اُٹھائیں گے نسیمؔ اہلِ دول کے
حاجت نہیں رکھتے کوئی مشکل نہیں رکھتے

۱۲۴۲ھ مطابق سنہ ۱۸۲۶ء میں تیس سال کی عمر میں نسیمؔ دہلی سے ترک
ونت کر کے لکھنؤ میں آئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "لکھنؤ کا دبستان
اعری" میں نسیمؔ کی لکھنؤ میں آمد غدر سے کچھ پہلے لکھی ہے جو صحیح نہیں
ہے۔ یہ غدر سے ۳۳ سال پہلے لکھنؤ میں آ گئے تھے۔ قاضی عبدالودود
ماحب نے بھی ڈاکٹر صدیقی کی اس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے [1]

نسیمؔ کی شاعری جس وقت اپنے پورے عروج پر تھی اس وقت
اجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔

اُن کی قدردانی کی وجہ سے شعراء کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آ گئے، قلق، برق
سیر، اور بہار واجد علی شاہ کے خاص مصاحبین شعراء میں سے تھے۔ اس
ے علاوہ اس زمانے کے نامور شعراء میں وزیر، عیش، قبول، شرف
حر، رشک، ہلال، آباد، صبا، خلیل، عرش، اور سحر جیسے باکمال
ستادانِ فن موجود تھے۔ اُن میں سے بعض بعض تو آسمان شاعری کے
یرِ درخشاں کی حیثیت رکھتے تھے جن کی ضوفشانی لازوال ہے۔ یہ
ھا وہ ماحول جب نسیم نے لکھنؤ میں قدم رکھا۔

نسیمؔ نے جس وقت سرزمین لکھنؤ میں قدم رکھا شیخ امام بخش
اسخ کی کوششوں سے لکھنؤ کی زبان کو سند کا درجہ حاصل ہو چکا تھا
س کو اکابرین شعرائے دہلی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ غالب نے بھی جابجا
کھنوی زبان کا اعتراف کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک طرف زبان
سنور کر نکھر گئی اور اس میں شیرینی و حلاوت پیدا ہو گئی۔ لیکن دوسری طرف کچھ ایسی
بدعتیں اسی دور میں داخل ہو گئیں جو دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات قرار پائیں۔

دبستانِ لکھنؤ سے اُس دور کا ہر شاعر بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوا۔
یہ اثرات صرف لکھنؤ ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ دلی تک پہونچے تو پھر نسیمؔ
جو لکھنؤ ہی میں قیام پذیر تھے، اُس دبستان کے اثرات سے کس طرح بچ
سکتے تھے لیکن نسیمؔ نے انتہائی ذہانت سے کام لیتے ہوئے اُس چمنستان کے
گلوں کو چن کر اپنے دامن میں بھر لیا اور خاروں سے دامن بچا لیا۔ اس دبستان
کے محاسن کو اپنایا اور معائب کو بڑی حد تک چھوڑ دیا۔ یہ یقیناً نسیمؔ کا اجتہاد
ہے ورنہ اُس دور میں لکھنؤ کا ہر شاعر ایک ہی رو میں بہہ رہا تھا۔

نسیمؔ کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ اُنہوں نے لکھنؤ کی زبان کو
خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ لیکن رنگِ دہلی نہ چھوڑا جس کی وجہ سے ان
کی شاعری اپنے تمام ہمعصروں میں بلحاظ زبان و بیان ایک امتیازی شان
رکھتی ہے۔ اس طرح اُن کی شاعری میں لکھنوی زبان اور دہلوی خیالات کا
ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

ذیل کے چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔ ورنہ حقیقت
تو یہ ہے کہ نسیمؔ کا تقریباً سارا کلام اسی طرز میں ہے ؎

کسی صورت تو دل شاد کرنا
ہمیں دشمن سمجھ کر یاد کرنا
اُڑا دو خاک میری ٹھوکروں سے
اگر منظور ہے برباد کرنا

اس درجہ تھا قلق مجھے ردِّ سوال کا
دریا بہا کیا عرقِ انفعال کا
شعلوں میں آفتاب میں انجم میں ماہ میں
جلوہ کہاں کہاں ہے تمہارے جمال کا

ہاں خدارا اے اجل اتنا توقف چاہیئے
چلتے چلتے اک نظر بھر دیکھ لیں ہم روئے دوست

---

[1] رسالہ "ساغر" پٹنہ بابتہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء صہ ۲۹

ترے چھٹنے سے چھوڑا آنسوؤں نے ساتھ آنکھوں کا
گلے مل مل کے آپس میں چلے آتے ہیں دامن تک

نسیم کے عہد میں شعر کی ظاہری خوبیوں کو اُجاگر کرنے کے سلسلے میں شعراء نے بڑی جدتوں سے کام لیا۔ اُن میں سے ایک صنعت رعایتِ لفظی بھی ہے جس نے لکھنؤ کی شاعری کو بگاڑا بھی ہے۔ یہ شوق شعراء کی طبیعتوں میں اس قدر رچ بس گیا تھا کہ لکھنؤ کا کوئی بھی شاعر اس سے بچ نہ سکا۔ ہاں اگر کسی شاعر نے اس سے اجتناب کیا تو وہ تنہا نسیم دہلوی ہیں اس کی تصدیق حسرت موہانی کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتی ہے [1]

"شاعری میں بھی رعایتِ لفظی کی وبائے عام سے بالکل متاثر نہ ہوئے اور نہ صرف اپنے کلام کو اس عیب سے حیرت انگیز طور پر پاک رکھا بلکہ بہت سے باشندگانِ لکھنؤ کے مذاق کو تبدیل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔"

اس کو نسیم کی شانِ انفرادیت قرار دیا جاسکتا ہے۔ نسیم کی انفرادیت یہی نہیں کہ اُنہوں نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے یہاں کے دبستان کے خیالات سے اجتناب کیا بلکہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے دہلوی شعراء کی بھی اندھی تقلید نہیں کی۔ اُن کے نزدیک صرف عاشقانہ غزل لکھنا ہی فریضۂ شاعری نہیں بلکہ اُس کے تنگ دامن کو بوقلموں مضامین سے وسعت دینا بھی ایک کارنامہ ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

مضمون کے بھی شعر اگر ہوں تو خوب ہیں
کچھ ہو نہیں گئی غزل عاشقانہ فرض

نسیم کو غزل، مثنوی، اور قصیدے میں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ذیل میں ہم نسیم کی مختلف اصنافِ سخن میں قادر الکلامی پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قصیدہ — اُردو میں بیشتر دو قسم کے قصیدے ملتے ہیں۔ اوّل حمد، نعت یا منقبت میں دوسرے بادشاہ، امراء یا اہلِ دُوَل کی مدح میں۔ اوّل الذکر قصیدے ثواب کی نیت سے لکھے جاتے تھے اور آخر الذکر حصولِ زر اور دنیاوی منفعت کے لئے۔ نسیم کے دیوان میں اگرچہ چودہ قصیدے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حمد، نعت یا منقبت میں انہوں نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا حالانکہ مستغنی مزاج شعراء کا قصیدہ نگاری میں یہی میدان ہوتا ہے۔ غالباً وہ اس راہ کی دشواریوں سے آشنا تھے اور ان کے پیشِ نظر یہ نظریہ تھا ؎

زلافِ حمد و نعت اولیٰ است بر خاک اَدب خفتن
سجودے می تواں کردن، درودے می تواں گفتن

نعتیہ قصائد لکھنا سب سے زیادہ دشوار ہے۔ عرفی نے اس کو تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف کہا ہے ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا ست
آہستہ! کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!!!

اس لئے نسیم کے قلم نے اس وادی میں قدم نہیں رکھا۔ اُن کے مدحیہ قصیدے بھی بے سروپا قسم کی مدح اور جھوٹی تعریفوں سے پاک ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مستغنی مزاج اور سروسامان سے بے پروا شاعر کو قصیدے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ درحقیقت قصیدہ نگاری ہی شاعری کی ایسی صنف ہے جس میں شاعر اپنی قابلیت کا اظہار کر سکتا ہے چنانچہ وہ شعراء جو خوشامد اور تملّق سے کچھ سروکار نہ رکھتے تھے۔ اپنی قابلیت کے اظہار اور ہم عصروں کے دلوں پر اپنے علوم و فنون کا سکہ جمانے کے لئے قصیدہ لکھتے تھے کیونکہ سوائے قصیدہ کے کسی دوسری صنف کے لئے ہمہ دانی اور علومِ مختلفہ میں مہارت کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ نسیم کے قصیدوں میں مداحی کم اور قابلیت کا اظہار زیادہ ہے۔

غزل — نسیم کا خاص کمال ان کی غزل گوئی میں نظر آتا ہے۔ اسی کی بدولت انہوں نے اُردو شعراء میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ واقعی یہ چیز کوئی معمولی اہمیت نہیں رکھتی کہ ایسا شاعر جو اپنی عمر کے تیس سال دلی میں گزارنے کے بعد لکھنؤ آیا، وارستہ مزاجی جس کی فطرت میں داخل تھی جسکو درباری رسوخ بھی حاصل نہ تھا، لکھنؤ میں اساتذہ کی کمی نہ تھی، ناسخ اور آتش کے شاگردوں کا طوطی بول

---

[1] رسالہ "اردوئے معلیٰ" بابتہ جنوری ۱۹۱۰ء ص۵

رہا تھا۔ ایسے ماحول میں نسیم کے لئے اپنا مقام پیدا کرلینا صرف اُن شاعرانہ صفات کی وجہ سے ہے، جو اُن کو اپنے نامور اُستاد حکیم مومن خاں سے ورثہ میں ملی تھیں۔ خود نسیم کے مندرجہ ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے اشعار کی لوگوں میں بڑی دھوم تھی ؎

شکر کر درگاہ حق میں اے نسیم
اب تو شہرے ہیں ترے اشعار کے

نسیم کو یہی نہیں کہ لکھنؤ میں صرف داد ہی ملی ہو بلکہ انھوں نے یہاں پرستاروں اور عقیدت مندوں کا ایک معقول گروہ پیدا کرلیا تھا۔

نسیم کی غزلیات کے مطالعے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ نسیم کی غزلوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے غزل گو کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ نسیم کے کلام کی اِن خوبیوں کا ہم مختلف عنوانوں کے تحت جائزہ لیں گے۔

۱۔ نازک خیالی ــــ نسیم کے کلام کی سب سے بڑی خوبی نازک خیالی ہے۔ یہی خوبی اُن کے اُستاد حکیم مومن خاں مومنؔ کے یہاں بھی اِس پایہ کی تھی کہ آج تک کسی اردو شاعر کے یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ نسیمؔ نے مومن کی شاگردی پر فخر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اُستاد کا طرز اُن سے نہیں چھٹ سکتا ؎

مومنؔ کا طرز چھٹ نہ سکے گا نسیم سے
شاگرد سے نہ بندشِ اُستاد جائے گی

اُستاد کے طرز میں سب سے زیادہ اُن کو نازک خیالی ہی ملی۔ نسیم خود بھی اپنی اس خوبی سے واقف تھے جیسا کہ کہا ہے ؎

جو ہیں نزاکت پسند عالم کہیں گے بیشک وہ منصفی سے
بہت ہیں اُستاد یوں تو لیکن نسیمؔ کا سا سخن نہیں ہے

ذیل کے اشعار سے اُن کی یہ خوبی واضح ہو جائے گی ؎

کس طرح آگے بڑھوں مانع ہے کچھ پاسِ اَدب
آنہ جائے زیرِ پا سایہ تری دیوار کا

دیکھو ضرور یار نزاکت سے ہو گا رنگ؛
اے جان نہ اُٹھ سکیں گے قدم سے حنا کے ناز

کوئی شیشہ نہیں اے رونق محفل ٹوٹا
آہ کی ٹھیس لگی آبلۂ دل ٹوٹا

۲۔ رنگینیٔ بیان ــــ نسیمؔ کی دوسری نمایاں خوبی بیان کی رنگینی ہے۔ یہ صفت بھی اُنھیں بقول حسرت موہانی اپنے اُستاد سے ملی تھی۔ مومن کی زندگی بڑی رنگینیوں میں گزری لیکن نسیمؔ کی زندگی ہمیں رنگینیوں سے بہت دور نظر آتی ہے۔ پھر بھی اُن کے کلام میں خاصی رنگینیاں ہیں اور بیان کی رنگینی یقیناً قابلِ داد ہے۔ یوں تو اُن کے دیوان میں بہت سے ایسے اشعار مل جائیں گے جو رنگینیٔ بیان کی اچھی مثالیں ہیں لیکن بخوفِ طوالت ہم ذیل کی چند مثالوں پر اکتفا کر رہے ہیں ؎

آسماں پر کچھ شفق پھولی نظر آنے لگی
عکس جا پہونچا تمہارے دامنِ گلنار کا

کسی کے چہرے پہ ہوتا کسی کے دامن میں
مجھے بھی آنکھ کا اشکِ چکیدہ ہونا تھا

ہوئی جھوٹی قسم کھائی جو منظور
خوشا قسمت میں اُن کو یاد آیا

اَبرو میں خم، جبیں میں چیں، زُلف میں شکن
آیا جو میرا نام تو بَل کِس کِس میں بل پڑے

۳۔ سہل ممتنع ــــ نسیم کے دیوان میں تقریباً ہر غزل میں دو ایک اشعار ایسے ضرور ملیں گے جو سہل ممتنع کی اچھی مثالیں قرار دیئے جا سکتے ہیں لیکن بعض بعض تو پوری غزلیں ایسی ہیں جو

اس خوبی سے مرصع ہیں۔ نسیم کی یہ وہ خوبی ہے جو اُن کے ہم عصر لکھنوی شعرا کے یہاں ناپید ہے۔ متفرق اشعار سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم ایک غزل سے چند اشعار نقل کرتے ہیں تاکہ اُن کی اس خوبی کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

بنانے سے یہ مطلب ہم نے پایا
مٹانے کے لیے ہم کو بنایا

بشکل اشک ہوں باقدر و بے قدر
وہ گوہر ہوں کہ کھویا جس نے پایا

نہ طعنہ تھا، نہ شکوہ تھا مرا نام
عجب ہے تیرے لب پر کیوں کر آیا

نہ اُوٹھا گر کے آنسو کی طرح سے
عدم کا لطف ہستی میں دکھایا

ہوئی جھوٹی قسم کھانی جو منظور
خوشا قسمت میں اُن کو یاد آیا

شوخی ۔ نسیم کے کلام میں شوخی بھی بدرجہ اتم موجود ہے جیسا کہ ذیل کی چند مثالوں سے واضح ہوگا ؎

ڈراتا ہے کسے واعظ عذابِ روزِ محشر سے
قیامت اک خیال کا کل برہم سمجھتے ہیں

صُبح سے تا شام ہٹ کرتے ہو لاکھوں بار تم
اس قدر کثرت سے دِل کوئی کہاں سے لائیگا

ضد یہ نئی ہے کہ میرا لے کے دل
کہتے ہیں ایک اور لا دیجیے

زبان کی صفائی اور شیرینی —— یہ نسیم کی وہ صفت ہے جو اُن کو تمام دہلوی شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ نسیم کے یہاں لکھنوی زبان کے ساتھ دلی کے خیالات کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے جو ہمیں کسی اُردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اُن کی زبان میں بڑی لطافت صفائی اور شیرینی ہے۔ ذیل کے اشعار ظاہر کر دیں گے کہ وہ کیسی کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی زبان استعمال کرتے تھے ؎

کمالِ ربط میں ہوتی ہیں سیکڑوں باتیں
نہ اس قدر تمہیں ہم سے کشیدہ ہونا تھا

دوڑو خدا کے واسطے دیکھو تو کیا ہوا
کہتا ہے کوئی ہائے کلیجہ نکل گیا

میں نہ کہتا تھا نہ دیکھو آئینہ اچھا نہیں
صدقے جاؤں حال میرا سا تمہارا ہو گیا

نہ کر آزاد اے صیاد لیکن رحم کر اتنا
نظر سے دیکھ لوں لے چل مجھے اُجڑے نشیمن تک

عارفانہ مضامین —— نسیم کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی شاعری پر مذہب کی گہری چھاپ تھی۔ اُن کی بعض بعض پوری غزلیں اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مثلاً وہ غزل جو آتش کی اس مشہور غزل پر لکھی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

نسیم کا مطلع ہے ؎

جو عاشق ہو تو کچھ سمجھے یہ نکتہ آشنائی کا
ملا ہے حکم سجدے میں ہم کو جبہ سائی کا

نسیم اس خاص وصف میں خواجہ آتش سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اس غزل کے علاوہ نسیم نے متعدد غزلیں خواجہ آتش کی مشہور غزلوں پر لکھی ہے۔ ہم ذیل میں نسیم کے متفرق اشعار بطور مثال پیش کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ وہ معرفت کے رنگ میں کس قدر ڈوبے ہوئے تھے ؎

عالم سے نرالا ہے ہر ایک سے بالا ہے
حاجت نہیں کچھ رکھتا محتاج تیرے در کا

شعلوں میں، آفتاب میں، انجم میں، ماہ میں
جلوہ کہاں کہاں ہے تمہارے جمال کا

قصور اپنی نظر کا تھا نسیمؔ آہ
وگرنہ اس کا جلوہ چار سو تھا

مثنوی — نسیم کی مثنوی نگاری کے سلسلے کی پہلی اور آخری کوشش الف لیلہ منظوم کا دفتر اول تھا۔ الف لیلہ نظم میں پہلے نسیم دہلوی نے منتقل کیا۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نسیم کی طبیعت مثنوی نگاری کے لئے بہت زیادہ موزوں واقع ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کو مثنوی نگاری جبراً کرنا پڑی لیکن یہ کہیں سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ آورد ہے۔ برخلاف اس کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک تیزرو دریا ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے۔ مثنوی کے تمام محاسن بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ اس میں اور اردو کی دیگر مثنویوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری مثنویوں میں صرف ایک ہی قصہ شروع سے آخر تک نظم ہوا ہے لیکن اس میں سیکڑوں داستانیں ہیں اور وہ بھی ایسی جن کی بنیاد مافوق الفطرت عناصر پر رکھی گئی ہے۔ کوہ قاف کی باتیں ہیں، دیو پریوں کے قصے ہیں، طلسمات کے جنگل ہیں، آگ کے دریا ہیں۔ غرضکہ جو کچھ ہے سب بے سروپا ہے۔ جس کا صداقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ایسے قصوں میں ربط و روانی قائم رکھنا شاعر کا بڑا کمال ہے۔ بخوف طوالت ہم مثالوں سے گریز کر رہے ہیں کیوں کہ اتنی طویل داستانوں کی مثالوں کے لئے بھی ایک دفتر چاہیئے۔

اس کے ساقی ناموں کے بارے میں مولانا عبدالحیؒ مولف "گل رعنا" تحریر فرماتے ہیں۔

"الف لیلہ کے ساقی نامے اگر ایک جا جمع کر دیئے جائیں۔ تو میرا خیال ہے کہ ظہوری کا ساقی نامہ اس کے سامنے بے حقیقت ہو جائے گا۔"[1]

آگے چل کر مولانا نے نمونے کے طور پر مثال میں ذیل کے اشعار تحریر کئے ہیں۔

سنبھل ساقی کہ وقت اب اور آیا
رہوں بے ہوش پھر وہ دور آیا
مزا رکھتا نہیں بے کیف جینا
تمنا ہے کہ برسے ابر مینا
ہر اک قطرہ لہو بن بن کے ٹپکے
مرے دامن سے مے چھن چھن کے ٹپکے
طبیعت صورتِ مے جوش میں ہے
تمنا عزم نوشا نوش میں ہے
نظر آئے کنارِ جام گلگوں
لب شاعر سے ٹپکے لطفِ مضموں
وفورِ شوق و قفسِ گفتگو ہو
سخن افسانہ ریزِ آرزو ہو
گلے مل مل کے لفظوں سے معانی
دکھائیں گفتگو کی نوجوانی
طبیعت محو ہو عرضِ سخن میں
فسانہ یوں بیاں ہو انجمن میں

کلام پر رائے — کسی شاعر کی اہمیت یا اس کے کلام کی خصوصیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں استادانِ فن اور ناقدین کی کیا رائے ہے۔ ہم نے جتنی بھی تاریخوں اور تذکروں کا مطالعہ کیا یا جس نقاد کی بھی رائے پڑھی اسکو نسیم کی شاعرانہ خوبیوں کے بارے میں رطب اللسان پایا۔ ذیل میں ہم چند کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جس سے اردو شاعری میں نسیمؔ کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم رائے ضرور

---

[1] "گل رعنا" مولفہ مولانا عبدالحیؒ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ صفحہ ۳۹۰

شاعرانِ اُردو مرزا غالب کی ہے۔ مرزا نے ایک گلدستہ میں نسیمؔ کی ایک غزل دیکھ کر منشی نولکشور سے ان کے متعلق استفسار کیا اور اُن کے کلام کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ نولکشور نے نسیمؔ سے دریافت کر کے اُن کا حال اور کلام بھیجا۔ مرزا نے بہت پسند کیا اور جب اُن کا دہلوی ہونا معلوم ہوا تو لکھا "گہرا جستم و عقیق یافتم"، مرزا نے اس ایک جملہ میں نسیمؔ کے بارے میں وہ سب کچھ کہہ دیا جس کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔

سید نورالحسن خاں مولف "تذکرہ طور کلیم" نے اُن کا شمار مشاہیر سخنوروں میں کیا ہے[1]

عبدالغفور نساخ "سخن شعراء" میں رقم طراز ہیں کہ لکھنؤ میں اُن کی شاعری کا بڑا شہرہ ہے"[2]

سید علی حسن خاں مولف "بزم سخن" اُن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"سخن شایستہ و سنجیدہ فرمود"[3]

مولانا عبدالحیٔ مولف "گلِ رعنا" نے لکھا ہے

"میری نظر میں وہ اپنے معاصرینِ اہلِ دہلی میں ایک ہی شخص ہیں جس نے اپنے طرزِ بیان کو محفوظ رکھتے ہوئے اہلِ لکھنؤ کی متروکات قبول کرنے میں پیش قدمی کی اور زبان کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ شعرائے لکھنؤ نے اس کی داد دی"[4]

اس سلسلے میں حسرت موہانی کی بھی رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ فرماتے ہیں

" لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جلوہ جیسا مرزا نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے کے کلام میں نہیں مل سکتی"[5]

---

[1] تذکرہ طور کلیم مولفہ سید نورالحسن خاں ۱۲۹۸ھ ص ۱۱۶

[2] سخن شعراء مولفہ عبدالغفور نساخ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء ص ۵۱۹

[3] "بزم سخن" مولفہ سید علی حسن خاں مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ ۱۸۸۶ء ص ۱۱۳

[4] 'گلِ رعنا' مولفہ عبدالحیٔ ص ۳۹۰

[5] اُردوئے معلّیٰ بابتہ جنوری ۱۹۰۸ء ص ۵

خود نسیمؔ کی اپنے بارے میں جو رائے تھی، اس کا ذکر کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔

ہوئے مضمون اعلیٰ میری طبع پاک سے پیدا
ہزاروں آسماں ہیں ایک مشتِ خاک سے پیدا

کیوں نہ مستغنی رہیں فضلِ خدا سے اے نسیمؔ
رکھتے ہیں ملکِ سخن کی واقعی جاگیر ہم

نسیمؔ دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

نسیمؔ کے اِن اشعار میں اگرچہ شاعرانہ تعلّی کا کسی حد تک دخل کہا جا سکتا ہے لیکن ہم اُوپر کی اہم رایوں کی روشنی میں اُن کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نسیم کے اِن اشعار میں شاعرانہ تعلّی کم اور صداقت کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔

وفات — نسیمؔ کی وفات بہ عمر ستتر سال ۱۴ رمضان ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۴ء ہوئی جس پر تمام تذکرہ نویس متفق ہیں۔ اس بارے میں کچھ تفصیلی ذکر کہیں نہیں ملتا کہ اُن کی موت کا بہانہ کون مرض ہوا تھا اور کتنے دن علیل رہے۔

مغفرت صدقے رہی مدفن پہ میری تا دوں
منہ چھپایا رو کے ایسا دامنِ تقصیر نے



نثر کا حسن مرتبہ عابد رضا بیدار، ضخامت ڈیمائی آٹھ پیجو سائز کے ایک سو ساٹھ صفحات۔ قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ: انڈو انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۸۰۶ کلاں محل، دہلی -۶

ہمارے یہاں غزلوں اور نظموں کے بے شمار انتخابات ہیں کیونکہ ہم نے شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ لیکن نثر کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمیں عابد رضا بیدار کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے دورِ حاضر کے چند جانے مانے اور بعض نسبتاً کم معروف مگر قابلِ توجہ نثر نگاروں کے نثر پاروں سے روشناس کرایا۔ کتاب کا اصل عنوان تو "نثر کا حسن" ہے لیکن اس کا ذیلی عنوان اور ہے "میرے عہد کے صاحبِ طرز نثر نگار" جن نثر نگاروں کو انہوں نے صاحبِ طرز مانا ہے۔ ان کے نام ہیں، (۱) رشید احمد صدیقی (۲) ڈاکٹر ذاکر حسین (۳) ابوالکلام آزاد (۴) خواجہ غلام السیدین (۵) محمد مجیب (۶) وصی احمد بلگرامی (۷) نیاز فتحپوری (۸) آل احمد سرور (۹) رگھوپتی سہائے فراق (۱۰) یگانہ علیگ (۱۱) مشتاق احمد یوسفی (۱۲) عبداللہ حسین۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ اگلے حصے میں (۱۳) عبدالماجد دریا بادی (۱۴) مجنوں (۱۵) حجاب امتیاز علی (۱۶) قرۃ العین حیدر (۱۷) صحافی عبدالباقی (۱۸) خورشید الاسلام (۱۹) خواجہ محمد شفیع اور (۲۰) عامر عثمانی شامل ہونگے۔ بعض اور نام بھی زیرِ غور ہیں۔

سب سے پہلے بیدار نے نثر کو بنیادی نثر اور طرحدار نثر دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ سر سید، حالی، پریم چند، عبدالحق، عابد حسین، حسن نظامی، میر ناصر علی، اور قاضی عبدالغفار کو انہوں نے انتخاب کے دائرے سے اس لئے باہر قرار دیا کہ وہ طرحدار نثر نگار نہیں ہیں۔ اور جو طرحدار ہیں اُن میں سب صاحبِ طرز نہیں ہیں۔ پھر بھی بیدار کا خیال ہے کہ اُن کے ہم عصروں میں پچیس کے قریب ایسے صاحبِ طرز نثار ضرور ہیں جو ایک آدھ جملہ دیکھیں تو پہچان لے جائیں۔ میرے خیال میں موجودہ دور کے کسی ادیب کو بھی دو ایک جملوں سے قطعی طور پر پہچان لینا تقریباً ناممکن ہے۔ کسی کے صاحبِ طرز تسلیم کئے جانے کی یہ ضروری شرط ہے بھی نہیں کہ اُس کے ہر جملے پر اُس کی مہر ہو۔ یہ بات کسی بھی زبان کے ادیبوں کو آج حاصل نہیں ہے۔ بلکہ شاید کبھی حاصل نہیں رہی ہے۔

صاحبِ طرز ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے یہاں بہ حیثیت مجموعی ایک طرز اور ایک آہنگ کا واضح احساس ہو۔ یہ بات احتشام حسین اور آل احمد سرور کے تقابل سے واضح ہو جائے گی۔ دونوں ہی ہم عصر، وسیع المطالعہ، اور صاحبِ نظر نقاد ہیں۔ لیکن اکثر ایک ہی بات کے ادا کرنے میں بھی اُن کا طریق کار ہی نہیں بلکہ طرزِ اظہار بھی مختلف ہوتا ہے۔ یہ اُن کی انفرادی طرز ہے اور اِن دونوں کو ہی صاحبِ طرز قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہیں سے وہ دوسرا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جو بنیادی نثر لکھنے والوں کو حلقہ بیرون در قرار دینے سے ابھرتا ہے۔

رشید صاحب یقیناً صاحبِ طرز ادیب ہیں اور انہوں نے "بنیادی نثر" کو ان معنوں میں استعمال نہیں کیا ہوگا، جن معنوں میں ہم "بنیادی تعلیم" کی اصطلاح سمجھنے لگے ہیں۔ 'بنیادی نثر' اساسی نثر ہے جو حشو و زوائد، صناعی اور مصنوعی اثر آفرینی سے گریز کر کے صناعانہ سادگی سے بات کو قاری تک پہنچاتی ہے۔ اس نثر کا لکھنا طرحدار نثر لکھنے سے کم مشکل نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، سید عابد حسین اور مسعود حسن رضوی ادیب

کی نثر کی وقعت اس لیے کم نہیں ہے کہ وہ سادہ یا عاری ہے۔ یہ لوگ جس طرح مشکل مباحث اور معانی کو بھی پانی کر دیتے ہیں اور اس سادگی کے باوجود اثر انگیزی میں کمی نہیں آنے دیتے، وہ ایک ہنر ہے۔ ہر سادگی بھی یک رنگ نہیں ہوتی۔ اس کو خود بیدار نے قاضی عبدالودود کے سلسلہ میں تسلیم کیا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر بات سنبھال لی کہ وہ انتہائی بنیادی نثر لکھتے ہیں۔ اس "انتہائی بنیادی نثر" کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ایجاز و اختصار کے معاملے میں انتہا پسند ہیں لیکن یہ بھی سادگی کی ایک طرز ہی تو ہے!

کوئی بھی انتخاب آخری اور حتمی نہیں ہوتا۔ یہ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی دو چار گزارشیں اس انتخاب کے بارے میں کرنا ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کتاب میں فہرست نہیں ہے، دوسرے منتخبہ مضامین میں کوئی ترتیب نہیں، تیسرے حوالے نہیں۔ یہ کام ضروری تھے اور ہیں۔ آل احمد سرور کی دوسری تحریریں (میرے خیال میں) زیادہ نمائندہ تھیں، لیکن یہ ذوق کا سوال ہے! ابوالکلام آزاد کا جو انتخاب ہے وہ نثری نگارش نہیں بلکہ خطبہ ہے اور یہ سبھی کو معلوم ہے کہ مولانا کوئی خطبہ لکھ کر نہیں پڑھتے تھے۔ وہ شیوۂ بیاں مقرر تھے اور اُن کا زورِ خطابت زورِ تحریر سے کم نہیں تھا۔

اِن چند باتوں کی نشاندہی اگلے ایڈیشن میں ترمیم و تصحیح کی اُمید پر کر دی گئی ہے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے انتخاب کی سخت ضرورت تھی۔ ایسے بہت سے اور انتخابات شائع ہونا چاہئیں تاکہ نثری اکتسابات اور نثری اسالیب سے پوری واقفیت ہو سکے۔ نثاروں کی فہرست میں افسانہ نگاروں کو شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے افسانوی ادب میں علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کا لہجہ پہچانا جا سکتا ہے۔ اتار چڑھاؤ کہاں نہیں ہوتا لیکن بحیثیت مجموعی یہ صاحبانِ آہنگ و لہجہ ہیں۔ اس زمرے میں چودھری محمد علی کو تو ہرگز بھلایا نہیں جا سکتا جن کی تیسری جنس خاصے کی چیز ہے۔ مزاح نویسوں میں شیخ ممتاز حسین عثمانی اور خواجہ اطہر حسین (جنہوں نے "سرودِ ہمسایہ" "سالی" وغیرہ کچھ ممتاز مضامین "رند" کے فرضی نام سے "ادب" لکھنؤ میں لکھے تھے۔) قابلِ ذکر ہیں۔

(علی جواد زیدی)

فسانۂ عجائب: تصنیف: مرزا رجب علی بیگ سرور، ترتیب: اطہر پرویز

ضخامت: ڈمائی آکٹیو سائز کے ۴۱۶ صفحات،
قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ: سنگم پبلشرز، الہ آباد

گزشتہ چند برسوں سے "فسانۂ عجائب" ہماری خصوصی توجہات کا مرکز بن گیا ہے۔ مخمور اکبرآبادی کے قدرے طویل دیباچے کے بعد ضمیر حسن دہلوی کی کتاب "فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ" سامنے آئی۔ اس کے بعد نیر مسعود رضوی کی بھرپور کتاب "رجب علی بیگ، حیات اور کارنامے" طبع ہوئی۔ اب اطہر پرویز نے "فسانۂ عجائب" کو بڑی کاوش اور محنت سے مرتب و مدون کر کے پیش کیا ہے اور اپنے تفصیلی مقدمے اور تعلقات سے اس کی افادیت اور اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔ کتابت و طباعت کی خوبی کے ساتھ حسنِ ترتیب اور توازن نے اس کتاب کو داستانیات میں قابلِ ذکر اضافہ بنا دیا ہے۔

تدوین کے سلسلے میں تیرہ مطبوعہ نسخوں کے علاوہ آزاد لائبریری علی گڑھ اور انجمن ترقی اُردو علی گڑھ کے قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اور پوری توجہ سے ایک معیاری متن مرتب کیا گیا ہے۔ آخر میں فسانۂ عجائب کے چند اہم خاتمۃ الطبع کے علاوہ لکھنؤ کے شادی بیاہ کی رسمیں اور لکھنؤ کے ہنرمند اور فنکاروں کا تذکرہ بھی فسانۂ عجائب سے ترتیب دیا گیا ہے۔ فسانۂ عجائب کی عام فرہنگ محاورات و امثال بھی شامل کی گئی ہیں۔ "آیات و فقرے عربی (کذا) کے معنی بھی دیدیئے گئے ہیں۔ سرور کے حالات اور تنقید مقدمے کا جزو ہیں۔

اطہر پرویز نے فسانۂ عجائب کا دانشورانہ دیانتداری اور بے جنبہ داری سے مطالعہ کیا ہے اور اس عام غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ مقفیٰ اور مسجع ہونے کی وجہ سے یہ طرزِ عبارت ہی نہیں بلکہ پوری داستان ناقابلِ التفات ہے۔ اطہر پرویز نے اس بات پر زور دیا ہے کہ فسانۂ عجائب داستانوں کے عہد کا اختتامیہ اور ناول کے عہد کی بشارت ہے۔ اس کے مزاج کی ہندوستانیت بھی جاذبِ نظر ہے۔ اطہر پرویز نے سرور کی مبالغہ آمیزی کا ذکر کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ مبالغہ بھی ادبی حسن سے خالی نہیں ہے۔ عبارت اس زمانے کے مقررہ ادبی معیاروں کے مطابق ہے اور اس کا آمن کے باغ و بہار سے مقابلہ اس لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ

تقاضائی ضرورت کے پیشِ نظر لکھی گئی تھی اور بذاتِ خود ادبی تصنیف کی حیثیت سے وجود میں نہیں آئی تھی۔ رجب علی بیگ سرور کے اکتسابات کے لئے یقیناً ایک ایسے متوازن تجزیے کی ضرورت تھی۔

عربی کے فقروں، حدیثوں، اور آیتوں کے جو ترجمے دیئے گئے ہیں اُن میں کچھ تسامحات سرسری طور پر مجھے نظر آئے مثلاً لا فتیٰ اِلاّ علی لا سیف اِلاّ ذو الفقار کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ علی کے سوا جوان نہیں اور ذوالفقار کے سوا تلوار نہیں، اور مفہوم یہ ہے کہ علی جیسا جوان اور ذوالفقار جیسی تلوار نہیں۔ اسی طرح حدیث شریف میں مَن تخلّفَ عنہا کا صحیح ترجمہ "جس نے اس سے روگردانی کی" ہوگا۔ نورٌ علیٰ نور کا مفہوم تو ٹھیک دیا گیا ہے لیکن ترجمہ 'نور بالائے نور' ہوگا۔ لِمَنِ المُلکی میں 'یا' زاید ہے۔ یہ دراصل اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ لِمَنِ المُلکُ الیوم اور جو معنی دیئے گئے وہ اس پورے ٹکڑے کے ہیں نہ کہ لِمَنِ المُلکی کے۔ اسی طرح "الہ الامجاد" کا ترجمہ اولاد کے بزرگ غلط ہے صحیح ہوگا "اس کی اولاد جو (سب کے سب) بزرگ ہیں تالمنون والصلاد" کا ترجمہ صاحبِ تلوار (کذا) اور لوٹ کر آنے والا کیا گیا ہے۔ یہ معنی مرادی ہو سکتے ہیں۔ میرا ذہن تو "بالنصوص" کی طرف منتقل ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اُن کی اولاد ازروئے نصِ قرآن و حدیث بزرگ ہیں۔ بہرحال، میں اس خاص معاملے میں کوئی قطعی رائے دینے سے معذور ہوں

(علی جواد زیدی)

یک چمن گل

:- مصنف :- اختر اورینوی ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۶۴ صفحات۔ قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ :- کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ ۔۴

اختر اورینوی ہمارے ہمہ فن ادیبوں میں ہیں۔ نثار اور نقاد بھی ہیں۔ افسانہ نگار بھی اور شاعر بھی، تعلیم اور تدریس پیشہ ہے، محتاط ترقی پسندی رجحان ہے اور مطالعہ و تشکیک ذاتی ذوق کی چیزیں ہیں۔ "یک چمن گل" اُن کی چند نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مختصر مگر خیال انگیز۔ ایک مختصر مجموعے سے اس سے زیادہ آپ کیا توقع رکھیں گے کہ وہ آپ کی توجہ مبذول کرائے۔ "یک چمن گل" یقیناً جاذبِ توجہ ہے۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ لہجے میں انفرادیت ہے۔ انفرادیت کتنے ادیبوں اور شاعروں کو نصیب ہوتی ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اُن کا رنگ تقلیدی نہیں ہے اور اُن کے لہجے میں ایک ہمواری اور تخیل میں ایک توازن ضرور پایا جاتا ہے۔ یہ خصوصیات شاعر کے کلام کو انفرادیت کے قریب لاتی ہیں۔ اختر کے یہاں اُردو کا روایتی رچاؤ ہے اور اقبال کے مکتبۂ فکر سے روشنی حاصل کرنے والا آہنگ ہے۔ جس میں غالب اور میر کا بھی پرتو ہے اور ترقی پسندی کے دَور کے شعبہ ہائے آواز بھی ہیں۔ اِن کے امتزاج سے ایک حرکی حسنِ کلام کی صورت سامنے آجاتی ہے۔

اختر کے دل و نگاہ ایک حسنِ گریزاں کے تعاقب میں ہیں۔ یہ حُسن ذرّے ذرّے میں، قدم قدم پر بکھرا پڑا ہے۔ پھر بھی دستِ شوق کی پوری دسترس اس تک نہیں۔ ہاتھ جتنا بھی بڑھتا ہے، دامن اتنا ہی کھنچ جاتا ہے۔ حسن چمن گل میں بھی ہے، نیستانِ نالہ میں بھی ہے اور خمخانے میں بھی۔ اسی لیے، وہ یہ کہتے ہیں کہ "عشق جز جلوۂ رعنائی محبوب نہیں" غرض اختر ہر وقت ایک حیرت آبادِ تجلی "میں محوِ نظارہ نظر آتے ہیں اور تہذیبِ شعور کے لیے، کربِ فن، فسونِ انتظار اور محروم ساعتوں کی سوگواری کے ساتھ تشنگی شوق بجھانے کے لیے، ہر روش پر محوِ خرام ہیں۔ ماضی کی یادیں ٹہوکے دیتی ہیں، حال کی بے چینیاں دامن تھامتی ہیں اور مستقبل کا تصور ہمت بندھاتا ہے۔ وہ کاروبارِ شوق میں کبھی ہار نہیں مانتے۔

اُن کے اس مجموعے میں باشعور رومانیت کے پہلو بہ پہلو واقعیت کے نشتر بھی ملتے ہیں۔ وہ وقت کے امکانات میں تبدیلی کے منصوبے بناتے ہیں، جنگ بازی اور آتش ریز سیاست کی سفاکیوں سے برہم ہیں، لیکن اس خفگی میں یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ:

نقشِ تہذیب تماشائے فنِ شیشہ گراں

اس میں یہ پہلو ضرور ہے کہ یہ تہذیب شیشے کی طرح چور چور ہو سکتی ہے، لیکن اگر شیشہ نہ ہو کر یہ تہذیب لوہا بھی ہوتی تو انسان اپنی گرمیِ عمل و ارادہ سے موم بنا سکتے تھے۔ نقشِ تہذیب اب تک ایک خاص طبقہ بناتا گیا ہے۔ اب جمہوری نظام میں یہ نقش عوامی طاقتوں کو ابھارنا ہے اور حسن و عشق کے کردار کو پیشِ نظر رکھ کر ابھارنا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ مجموعہ خیال انگیز اور قابلِ مطالعہ ہے۔

——(علی جواد زیدی)

مرد!

صرف 5 پیسے خرچ کر کے

آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کر سکتے ہیں



نرودھ استعمال کیجئے۔ محفوظ، آسان طریقہ۔

اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ کنڈوم ہیں

ملک بھر میں بازاروں میں عام ملتے ہیں۔

بچے کی پیدائش [illegible]

محفوظ [illegible] کنبے کی خوشحالی کا [illegible]

بچے کی پیدائش کو روکنا آپ کے اختیار میں ہے

اب ملک بھر میں دستیاب

15 پیسے کے 3

سرکاری امداد سے رعایتی دام

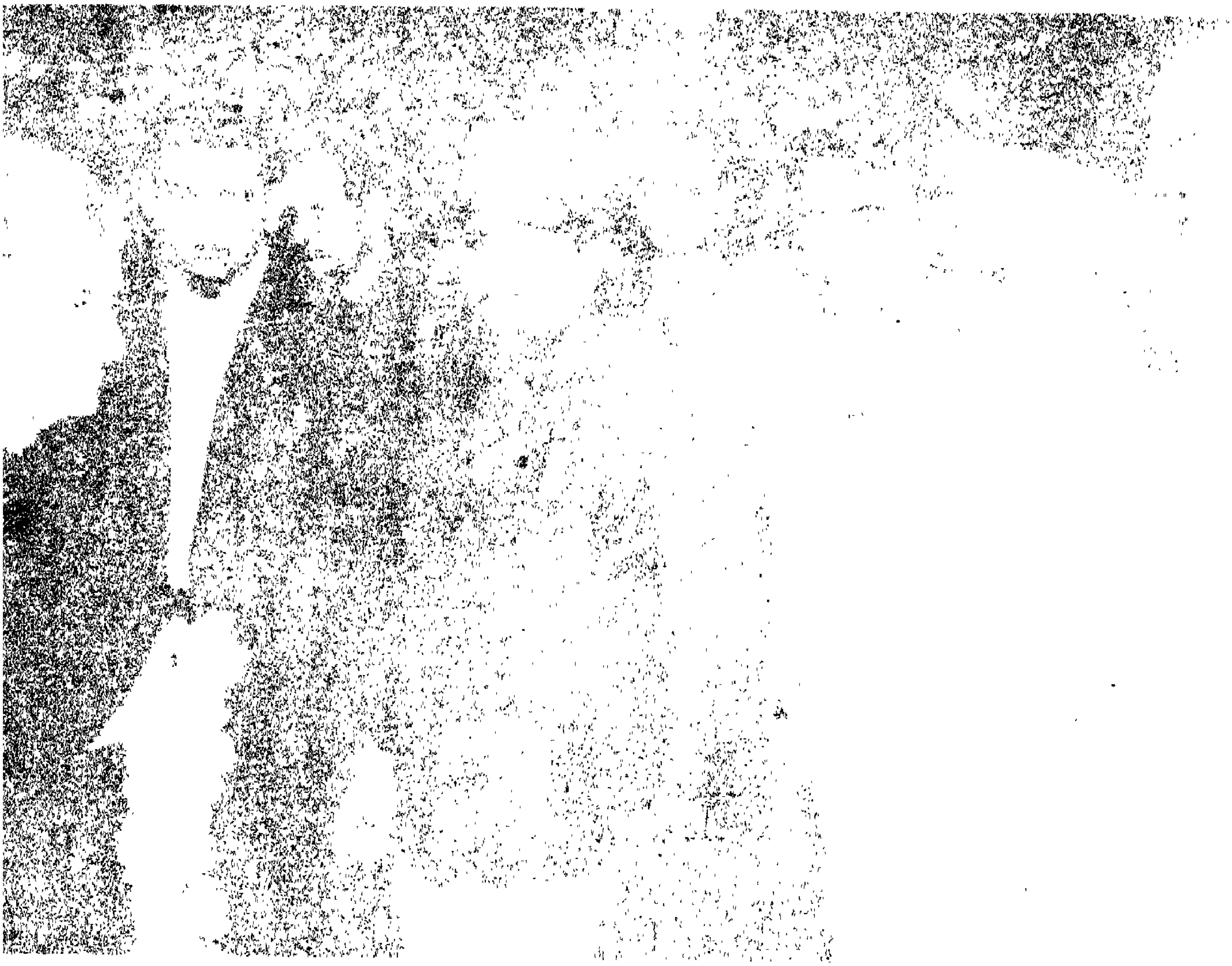
نرودھ استعمال کیجئے

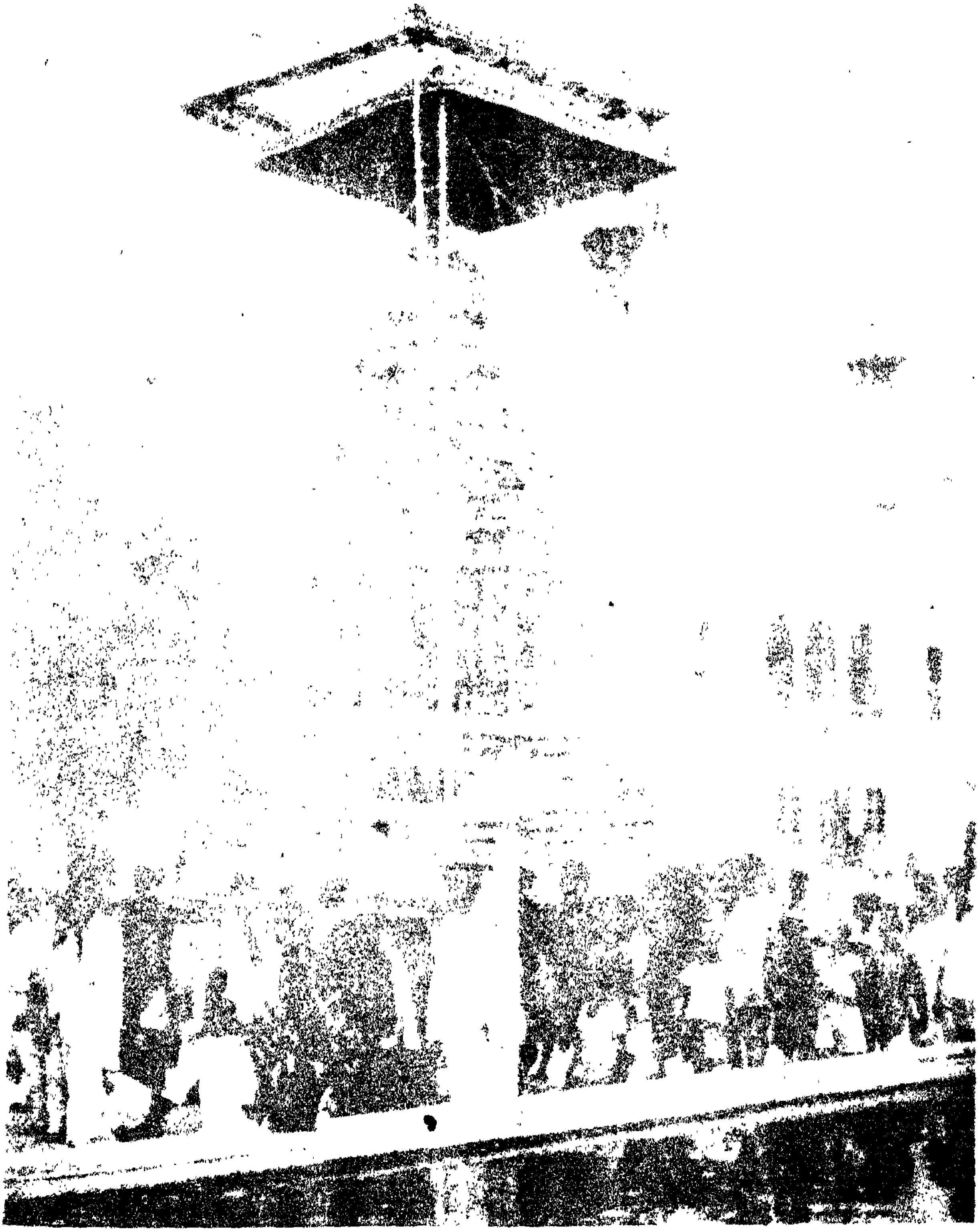
اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ کنڈوم

فیملی پلاننگ کے لئے

[illegible] ڈسٹری بیوٹرز، [illegible] جنرل مرچنٹ اور سگریٹ فروش رکھتے ہیں۔

69/444



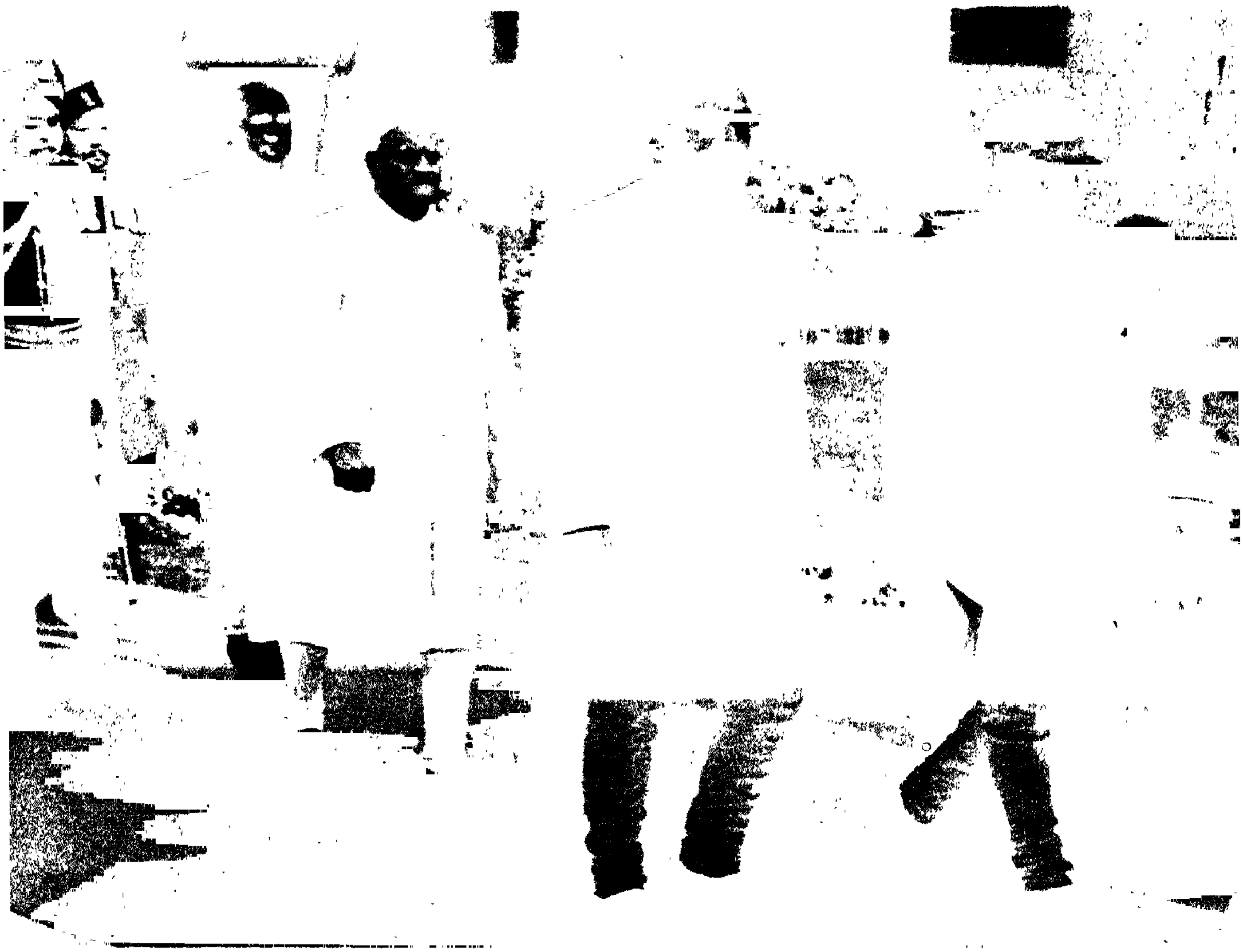


Vol. 28 No. 8 AJKAL (Monthly) March 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by the Asian Art Printers Private [illegible]

آج کل





۲۰ فروری ۱۹۷۰ء کو صدر جمہوریہ ہند شری گری نے سنٹرل ہال میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کر کے بجٹ سیشن کا افتتاح کیا۔

(تصویر میں) شری گری، لوک سبھا کے سپیکر سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں اور نائب صدر شری گوپال سروپ پاٹھک کے ہمراہ سنٹرل ہال کی طرف جا رہے ہیں۔

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۸ —— شمارہ ۹
اپریل ۱۹۷۰ء
چیت بیساکھ شک سمہ ۱۸۹۲

سرورق: زرعی انقلاب
عکس: گورچرن اروڑہ

ترتیب

سالانہ چندہ: ہندوستان میں: سات روپے، پاکستان میں: سات روپے (پاک)
دیگر ممالک سے: ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ: ہندوستان میں: ۷۰ پیسے، پاکستان میں: ۷۰ پیسے (پاک)
دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین اور ترسیلِ زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
[illegible]

ملاحظات

پارلیمنٹ کے بجٹ سیشن کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند نے ان تمام اہم مسائل کا ذکر کیا ہے جن سے ہم دوچار ہیں۔

غذائی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا: "ملک کی غذائی صورت حال اطمینان بخش ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے نئے طریقۂ کار کے تحت زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا ہے۔ زیادہ اُپج دینے والے بیج ۶۷-۱۹۶۶ء میں ۱۹ لاکھ ہیکٹر کھیتوں میں لگائے گئے تھے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۹۰ لاکھ ہیکٹر کھیتوں میں ایسے بیج بوئے گئے تھے۔ پہلی بار کیمیاوی کھادوں کی سپلائی اطمینان بخش ہے۔ زراعت کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے وہ زیادہ آب پاشی والے علاقے تک محدود ہے۔ آئندہ برسوں میں ان علاقوں پر خصوصی توجہ دی جائے گی جہاں پانی کی کمی ہے۔ حکومت نے ایک قومی کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو زراعت سے متعلق تمام مسائل کا جائزہ لے گی۔"

غریبی کو دور کرنے کے سلسلے میں آپ نے کہا: "حکومت ملک میں پائی جانے والی نابرابریوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ اسی لئے وہ ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنے کے سلسلے میں، جو انصاف پر مبنی ہو اور جس میں انسانی قدروں کو اہمیت حاصل ہو، تیز رفتاری سے کام لے گی، اور آبادی کے کمزور طبقوں کا خاص طور سے خیال رکھے گی۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اور ہمارے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسائل کو بالکل ہندوستانی ڈھنگ سے اور اپنی زندگی، روایات اور تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے حل کرنا ہوگا۔"

اسپات، کھاد اور خام تیل کی پیداوار میں اضافے کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ بوکارو کے اسپات کارخانے کے دوسرے مرحلے پر جلد عمل درآمد شروع کیا جائے گا۔ ۱۹۶۹ء میں ۶۷ لاکھ ٹن کچا تیل نکالا گیا جبکہ ۱۹۶۸ء کی پیداوار ۵۰ لاکھ ٹن تھی۔ کیمیاوی کھاد کی پیداوار کو بھی ترجیح دی گئی ہے۔ سال رواں میں دو کارخانوں نے اپنی پیداوار شروع کر دی ہے اور اس طرح اب نائٹروجن کی پیداوار کی کُل تنصیبی صلاحیت ۱۲ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن ہو گئی۔ درگا پور، کوچین اور مدراس میں تین اور کارخانے جن کی مجموعی تنصیبی صلاحیت ۵ لاکھ ٹن ہو گی، ۱۹۷۰ء کے دوران کھاد تیار کرنا شروع کر دیں گے۔ اس اہم میدان میں خودکفیل بننے کے لئے ہماری سرگرم کوششیں جاری رہیں گی۔

آپ نے مزید کہا: زیادہ پیداوار، دولت کی بہتر تقسیم اور ایسی آمدنیاں جو روزگار کے مواقع پیدا کریں، ہماری معاشی پالیسی کی کامیابی کی کسوٹی ہوں گی۔ یہ ترجیحات چوتھے پلان سے پوری طرح مترشح ہونگیں) جو جلد ہی اس ایوان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ میری حکومت اس بات سے باخبر ہے کہ بیروزگاری ملک کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور اس کا فوری اور موثر حل بے حد ضروری ہے۔

پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ پاکستان کی حکومت اور عوام سے ہمارے دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ اس سلسلے میں ہم نے متعدد تجویزیں اور مشورے پیش کئے مگر بدقسمتی سے ہماری پیش قدمی کا پاکستان کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ تاہم ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔

صدر ہند کا خطبہ ملک کے کروڑوں عوام کی امیدوں اور آرزوؤں کا مظہر ہے۔ یقیناً ہمارا راستہ بڑا کٹھن اور لمبا ہے لیکن ہمارے جوش عمل کے لئے ایک للکار بھی ہے۔ دیانت، محنت اور سچی لگن سے ہم بڑی سے بڑی مشکلوں پر قابو پا سکتے ہیں۔

گیان چند

غبارِ رواں

(۳)

(مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

اپنے بارے میں لکھنے میں آدمی کی انا آسودہ ہوتی ہے، اپنی ذات کا (وہ کتنی بھی مریل اور نکمی کیوں نہ ہو) پروپیگنڈا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ قباحت ہے کہ اپنے بارے میں غیرجانبداری نہیں برتی جا سکتی۔ ہزار انصاف اور لاکھ جرأت سے کام لیجئے لیکن بعض باتیں جو کہنے کی ہیں، کہنے سے رہ جاتی ہیں۔ شخصیت کے پرانے قلعے کے بعض تہہ خانوں میں دوسروں کو کیا خود کو بھی لے جاتے ہوئے عار سی ہوتی ہے۔ انھیں نگاہوں سے اوجھل رکھنے ہی میں عافیت دکھائی دیتی ہے اور پھر راستی فتنہ انگیز کو فردوسیِ ہند کی یہ ہدایت بھی لگام دیتی ہے۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

یہ بھی تو بڑی دشواری ہے کہ آدمی خود کو جانتا کہاں ہے۔ میں اپنے چہرے، اپنی شباہت، اپنے خدوخال کا اتنا واضح تصور نہیں رکھتا جتنا اپنے اقارب کے ظاہر کا۔ میں دوسروں کی سیرت و کردار کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کر سکتا ہوں لیکن اپنی ذات میرے لئے دھندلکے میں ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے اندر کیا کیا گُن ہیں اور کیا کیا دوش۔ کتنا صحیح کہا ہے حکیمِ ملت نے۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

انگریزی کی کہاوت ہے کہ خیرات بانٹنے کی شروعات اپنے گھر سے کی جاتی ہے کسی کو متاثر کرنے والوں میں سب سے پہلے والدین کا نام آتا ہے میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اس لئے مجھے اپنی ماں سے زیادہ قربت رہی۔ وہ بڑی دیندار اور پارسا خاتون تھیں۔ دنیا کے کسی مذہب میں خود کو لذّتوں اور آسائشوں سے محروم رکھنے اور جسم کو تکلیف دینے پر اتنا زور نہیں جتنا جین دھرم میں ہے۔ مجھے ایک طرف میری ماں کی دینداری اور زہد نے متاثر کیا تو دوسری طرف اُن کی ممتا نے۔

مہابھارت میں ارجن سے کسی نے سوال کیا کہ وہ کیا ہے جو زمین سے زیادہ بھاری ہے اور وہ کیا ہے جو آسمان سے زیادہ اُونچا ہے۔ جواب سُنئے۔ زمین سے بھاری ماں ہے اور آسمان سے اونچا باپ ہے۔ کتنا صحیح ہے۔ ماں کے احسان کا بوجھ اتارا نہیں جا سکتا۔ باپ کے سامنے ہمیشہ چھوٹے رہتے ہیں۔ میرے والد اور مجھ میں عمر کا بہت تفاوت ہے، کوئی ۴۴ سال۔ انہوں نے بہت کچھ کمایا لیکن بالطبع وہ کفایت شعار تھے۔ اس کے باوجود اولاد پر خرچ کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ خصوصاً کھلانے پلانے کے معاملے میں، اولاد کے لئے ان کے جذبۂ ایثار نے مجھے راستہ دکھایا ہے۔ اُن کا دوسرا اصول تھا اولاد کا کوئی مالی احسان نہ لینا اور ہمیشہ بزرگی کی آن برقرار رکھنا۔

[illegible] میں تیسری متاثر کرنے والی شخصیت اپنی رفیقۂ حیات کی ہے۔ یہ کیسے کہوں تھا کہ میں اس کے بے پایاں جذبات سے متاثر نہ ہوتا لیکن اس باب میں خاموشی ہی مناسب ہے۔ دوستوں میں دو قابلِ ذکر ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ہوسٹل میں مجھ سے ایک کلاس پیچھے ایک طالب علم رام نواس مردترا تھے جو آج بھی میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں۔ یہ اب سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں ریڈر ہیں۔ دوبار ولایت جا چکے ہیں [illegible] آج کل امریکہ میں ہیں۔ طالب علمی کے دنوں میں بھی یہ بلا کے ذہین اور پڑھے لکھے تھے۔ ریاضی کے طالب علم تھے لیکن انگریزی کی عام معلومات کی کتابیں بازار میں آتے ہی فوراً خرید کر پڑھتے تھے، وہ نہرو کی دریافتِ ہند ہو کہ چرچل کی دوسری جنگ عظیم کی عظیم یادداشت کپلنگ کا ناول حیوانی جنگلستان ہو یا لن یو تانگ کی فلسفیانہ کتابیں۔ میں تو اردو کے دائرے سے بہت کم باہر نکلتا ہوں۔ اُن کے روشن ذہن، جدیدیت اور تعقل پسندی نے مجھے جس طرح متاثر کیا اس کا ذکر آگے کروں گا۔

میرے ایک اور دوست جن سے دورانِ ملازمت طویل ساتھ رہا کٹر قسم کے فرقہ پرست ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اُن کے دل میں اچھے خیالات نہیں۔ میری ان سے دنیا کے کسی سیاسی اور نیم سیاسی مسئلے پر بات ہوتی وہ گھما پھرا کر مسلمان اور پاکستان پر تان توڑتے۔ ہمیشہ اپنے فرقے کو فرشتہ اور دوسرے کو شیطان سمجھتے۔ ان سے بات چیت میں ہمیشہ گرماگرمی اور تلخی آجاتی۔ معلوم نہیں یہ مسموم ہندو ذہنیت اسلامی فرقہ واریت کا ردِ عمل ہے یا علت۔ ان کی وجہ سے مجھے ہندو فرقہ واریت سے کچھ اور چڑ ہو گئی ہے۔

اپنی طالبعلمانہ زندگی میں مجھے بعض بڑے فاضل اساتذہ سے درس لینے کا شرف ہوا۔ ان میں سے ایک پروفیسر اودھ بہاری لال تھے جنہوں نے مجھے بی اے میں سیاسیات پڑھائی۔ آج کل وہ الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ بی اے میں انہوں نے سیاسی نظریات کے مفکروں پر لکچر دیئے۔ طلبا تیزی سے اُن کے لکچروں کے نوٹ لیتے جاتے تھے۔ افلاطون پر اُن کے نوٹ ۵۰ صفحات ہو گئے۔ افسوس! وہ اب وائس چانسلر ہو کر روز روز طلبہ کے ہاتھوں ذلّت اٹھاتے ہیں۔ انہیں کے پائے کے دوسرے استاد ڈاکٹر اے ایم گھاٹگے ملے جنہوں نے مجھے ساگر کے لسانیات اسکول گرما میں لسانیات پڑھائی۔ یہ دکن کالج پونا میں لسانیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ لسانیات کے طالب علم کو اپنا سارا وقت مطالعے ہی کی نذر کرنا چاہیے۔ پونا میں انہوں نے اپنے ایک شاگرد ریسرچ اسکالر کو شام کے وقت ٹیبل ٹینس کھیلتے دیکھا تو اس پر برس پڑے کہ لسانیات کے طالب علم کو ان فضولیات میں وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔ کیسا بے پایاں علم تھا ان کا۔ کتنا شوق اور سلجھا ہوا فکر ہوتا تھا۔

اور ایک استاد کا سطحی تاثر بھی ہوا۔ لکھتے ہوئے قلم کو شکست ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت آپ سے کیوں کر چھپاؤں۔ یونیورسٹی میں میرے صدرِ شعبہ تھے جنہوں نے مجھے بالکل متاثر نہ کیا۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ پچھلے بیس سال میں انہوں نے اردو کی کوئی کتاب نہ پڑھی تھی۔ دو سال میں انہوں نے ایم اے میں جو درس دیا اس میں کلاس میں کتاب پڑھوا کر ہی سنا کئے۔ کبھی کبھی کسی شعر کا مطلب بتا دیتے تھے اور بس۔ اب بھی کالجوں اور یونیورسٹی میں بعض ایسے حضرات اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں کہ اگر انہیں بغیر کسی تیاری کے بی اے کے موضوع میں ایم اے کے امتحان میں بٹھا دیا جائے تو پاس ہونے کے لالے پڑ جائیں۔

اردو کے علماء میں مجھے قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی اور مولانا امتیاز علی عرشی نے بہت متاثر بلکہ مبہوت کیا ہے۔ یہ وہ عالم ہستیاں ہیں جن کی توصیف کی مجھے مجال نہیں۔ عرشی صاحب خدا معلوم کس قسم کے پٹھان ہیں، مرنجاں مرنج، زبان یا قلم سے کبھی کسی کے خلاف کوئی لفظ بھی نہیں کہا۔ کسی معترض کی بات کا برا ماننا ہی نہیں۔ شاید یہ خان عبدالغفار خاں کی قسم کے پٹھان ہیں۔ ان کے علم، سادگی اور انکساری نے مجھے معتقد بنا رکھا ہے۔ دوسرے ابنائے وطن کی طرح اہلِ سیاست میں مجھے دو عظیم ترین ہستیوں مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے شدت سے متاثر کیا۔ میں مہاتما گاندھی کو اپنے دور کا سب سے بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ وہ ایسے سنت تھے جن میں انسانیت اور ملوکیت سمو گئی تھی۔ سیاست اخلاق اور پوری زندگی کو انہوں نے جو رفعت عطا کی وہ انہیں کا کام ہے۔ ملک کو آزادی دلانے میں جو حصہ اُن کا ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں۔ لیکن ان کے فلسفۂ حیات سے میں متفق نہیں۔ میرے خیال میں ان کی سب سے بڑی ہار یہی ہے کہ خود اُن کے ملک نے اُن کے فلسفے کو نہیں اپنایا۔ پنج سالہ منصوبے گاندھیائی معاشیات کے مطابق نہیں۔ موجودہ حالات میں بھاری مشینوں کو رد کر کے دیہاتی خودکفالت کو اپنا لینا ممکن نہیں لیکن یہ بھاری صنعتوں کی تہذیب بھی تو بڑی جان لیوا ہے ع

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے نوجوان مہاتما گاندھی کے مقابلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات سے زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ جواہر لال میرے ہیرو ہیں۔ کاش وہ چند سال وزیرِ اعظم رہ کر عہدے کو تیاگ دیتے اور تصنیف و تالیف کی طرف لگ جاتے۔ وہ مفکر تھے، اُن کے دیئے ہوئے تمام اصول، جمہوریت، سیکولرازم، اور مذہب پر تعقل پسندی کو ترجیح دینا، میرے بھی

ں میں ان کا عقیدہ [illegible] ہے [illegible] جس سے انکار نہیں کر
ے کہ الہام کی حیثیت سے وہ مثال بالکل نہیں تھے۔

متعدد واقعات ہیں جو مجھے متاثر کرتے رہے ہیں۔ جن میں سے ایک آزادی ہے ہی [illegible] جنگ کا سب سے واضح منظر اگست ۱۹۴۲ء کی میں دیکھا۔ میں ان دنوں میں الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ ۱۱ اگست کو میں طلبہ کے ایسے جلوس میں شریک تھا جس پر پولیس نے گولیاں چلائیں۔ آنکھوں کے سامنے نوجوانوں کے گولیاں لگ رہی تھیں۔ لال پدم دھر شہید ہی سے جاتا رہا۔ میں نے یونیورسٹی کی عمارت میں گورے مجسٹریٹ کے حکم س کو طلبہ پر لاٹھی چارج کرتے بھی دیکھا اور اسی طرح شہنشاہیت سے ور نفرت ہو گئی۔ ایک قوم دوسری قوم پر بالجبر کیوں حکومت کرے۔ یہ امی خود غرضی بلکہ ٹھگی ہے۔

تحریک آزادی میں مجھے فرقہ وارانہ سیاست کے منفی کردار نے طور پر متاثر کیا۔ اگست ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے کلکتے میں Direct Action Da منایا۔ کسی سیاسی پارٹی کی تاریخ میں اس طریقے تجاج نہ کیا گیا ہوگا۔ دوسرے مذہب والوں کا قتل عام، لوٹ مار اور فریق ثانی کی طرف سے اس کا اسی قسم کا جواب بہیمیت کا ایک سلسلہ پڑا جس کا نقطۂ عروج آزادی کے بعد ظاہر ہوا۔ لوگوں نے آزادی کے دوسرے فرقے کے قتل، غارت، زنا اور بہیمیت کی آزادی کے لیے روحانیت ہنڈورا پیٹنے والے اس برصغیر میں ۱۹۴۷ء میں عورتوں اور بچوں پر جو مظالم ئے ہیں وہ چنگیز اور ہلاکو کے فوجیوں نے خواب میں بھی نہ سوچے ہوں گے۔

کئی عوامل ہیں جنہوں نے مجھے مذہب سے بیزار کر دیا ہے۔ الہ آباد ی ورسٹی میں مجھے ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن نے نگریزی پڑھائی۔ وہ کلاس میں کہا کرتے تھے کہ یہ صحیح نہیں کہ خدا نے انسان اپنے عکس میں ڈھالا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ انسان نے خدا کو اپنے عکس کے مطابق تخلیق کیا ہے۔ سیاسیات میں میں نے غالباً پرنس کروپاٹکن کا زیں مقولہ پڑھا کہ "مذہب زندگی کی افیون ہے"۔ پہلے اپنے ایک دوست اکٹر رام نراین مہروترا کا ذکر کر چکا ہوں وہ کہا کرتے تھے کہ مذہب انسانیت سانیت سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ میں نے سماجیات میں بھی ایم اے کیا ہے۔ اس میں ایک پرچہ انتھروپالوجی (بشریات یا علم الانسان) کا تھا۔ اس کی تابوں میں صاف صاف یہ کہا گیا ہے کہ مذاہب قبائلی تصورات کی ارتقاء یافتہ شکل ہیں۔ یہ یکایک وجود میں نہیں آگئے بلکہ آہستہ آہستہ ارتقا [illegible] پذیر ہوئے ہیں۔ جوش نے اپنی شاعری میں [illegible] پر چوٹ کی ہے وہ مجھے بہت بھاتی۔ ان کی نظم "باغی روحوں کا کورس" دل کو تڑپا دینے والی ہے گویا میں بھی اس کورس میں شامل ہو کر گا رہا ہوں۔

دنیا کے بیشتر لوگ اپنے مذاہب کی صحت پر اس طرح اصرار کرتے ہیں گویا انہوں نے عقل سے سوچ وچار کر کے صحیح ترین پایا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ خاندانی ماحول کا اثر ہے۔ ۹۹ فی صدی سے زیادہ لوگ اسی مذہب کے پیرو ہوتے ہیں جس کے ان کے والدین۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے مذہب کو صحیح ترین ماننے میں تعقل کا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں جس گھرانے میں پلا ہوں۔ اس میں ایک خدا بلکہ فاعل خدا (یا فاعل دیوتاؤں) کا تصور نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہندوؤں یعنی سناتن دھرم میں وحدت نہیں تثلیث ہے۔ برہما، وشنو، مہیش (شو)۔ اگر دنیا کے کارخانے کو کوئی غیبی طاقت چلا رہی ہے تو وہ شر کی طاقت ہے خیر کی نہیں۔ دنیا میں کتنی ناانصافی کتنا ظلم ہے۔ نیک تکلیف اٹھاتے ہیں اور برے عیش کرتے ہیں۔ پھر کتنی نامعقول ہے۔ کہیں خشک سالی ہے تو کہیں سیلاب۔ سردیوں میں خواہ مخواہ بادل چھائے رہتے ہیں اور بارش نہیں ہوتی۔ یہ انسانوں کو اذیت دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ خیر سے شر نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ بڑے بڑے بھونچال جو آتے ہیں تو کیا ان علاقوں کے سارے انسان چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت گنہگار ہوتے ہیں۔ جن سب کو سزا دینے کی ضرورت تھی۔ سب غلط، سب حماقت، سب توہم پرستی۔

لیکن میں الحاد کا نہیں تشکیک کا شکار ہوں۔ دنیا میں فوق فطرت واقعات دکھائی دیتے ہیں۔ بھوت کا وجود ہے۔ پچھلے جنم کا حال بتانے والوں میں کچھ نہ کچھ افراد سچے ہیں۔ محرم کے موقع پر بعضوں کا آگ کے شعلوں پر چلنا عقل پر عقیدے کی زندہ جیت ہے۔ اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ [illegible] دیو سانپ کے کاٹے کو منتر سے ٹھیک کر دیتے ہیں۔ یعنی روح کا وجود ہے۔ حیات بعد ممات بھی ہے۔ کیا ہے یہ معلوم نہیں۔ ایک پردۂ ظلمات آگے تنا ہوا ہے۔ آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ عقل اسے پار نہیں کر پاتی۔

میں اعلیٰ اخلاق کی ضرورت سے منکر نہیں۔ مذہب ہی اخلاق کا سب سے بڑا پشت پناہ رہا ہے۔ مذہب کو چھوڑ کر اخلاقی اصولوں پر عقیدہ رکھنا بڑے بالیدہ ذہن ہی سے ممکن ہے۔ مجھے مابعد الطبیعیات سے سروکار نہیں۔

میرے لئے یہ اصول کافی ہے کہ ہو سکے تو دوسروں کی خوشی میں اضافہ کرو۔ یہی سب سے بڑا مذہب ہے۔

کئی واقعات ہیں جو میرے دل کو چھو گئے ہیں یا جھنجھوڑ گئے ہیں۔ قحطِ بنگال میں لاکھوں کا مرنا، جاپان میں ایٹم بم گرانا، ہٹلر کا نازی ازم، [illegible] کے مظالم کا شکار، جلیانوالہ باغ، تقسیمِ ہند کے فسادات، ۱۹۶۵ء کے [illegible] میں پاکستان کی جارحیت، افریقہ کے بعض ملکوں میں گوروں کا کالوں پر برتری کا اعلان، روس کا ہنگری اور چیکوسلواکیہ کو بہ زور ان کی من پسند حکومت سے محروم کرنا، تبت کی غلامی، ویٹ نام میں ملائی کے جیسے واقعات یہ سب ہر دل اور آنکھیں رکھنے والے کو تہلا دینے کے لئے کافی ہیں لیکن بعض گھروں کے اندر جو ویٹ نام اور الجیریا بپا رہتے ہیں ان سے کون واقف ہے۔ دسیوں سال ہوئے میرے ایک ساتھی کا حقیقی چھوٹا بھائی بے پڑھا آدمی تھا۔ لیکچرر صاحب بھلے آدمی تھے لیکن بھائی کو ملازم کی طرح رکھتے تھے۔ گھر کے برتن مانجھنا، بچّے کو ٹہلانے لیجانا وغیرہ۔ آخرش وہ فرار ہو گیا اور آج تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ جنوں میں کسی شخص کی بوڑھی ماں گھر کے سب کام کاج کرتی تھی اور بہو بیٹا آرام کرتے تھے۔ گھر میں ان لگایا گیا ہے کا ڈھیر ہے۔ سردیوں کی رات میں بوڑھی ماں سب کچھ اٹھا کر پھینک رہی ہے۔ کمرے میں سگا بیٹا اور بہو آرام کر رہے ہیں۔ اگر ماں یہ سب کام نہ کرے تو بیٹا اور بہو زد و کوب کریں۔ کتنی بہوئیں ساس کے مظالم برداشت کرتی ہیں اور شمع کی طرح خاموشی سے جلتی گھلتی رہتی ہیں۔ کیا یہ ویٹ نام اور الجیریا نہیں۔

میں صبح کے اخبار میں شائع شدہ واقعات سے متاثر ہوتا رہتا ہوں، میں، جو یہ سمجھتا ہوں کہ نوعِ انسان آہستہ آہستہ بہتری کی طرف جا رہی ہے، مجھے کیوں ایسی خبریں پڑھنی پڑتی ہیں، جن سے میرے عقیدے پاش پاش اور میرا ایقان چکنا چور ہو جاتا ہے۔ بعض انسان کیوں اتنے ظالم اور شقی ہوتے ہیں۔ ان کے سینے میں ضمیر کیوں نہیں ہوتا۔ وہ کیوں بہیمانہ جرم کرتے ہیں۔ والدین کی ممتا کتنی مقدس چیز ہے۔ کوئی اس پر حملہ کرتا ہے تو میں بھی مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ کئی سال ہوئے اخبار میں پڑھا کہ دلی میں رات کو کسی کے یہاں ڈاکوؤں نے دراندازی کی۔ چار پانچ سال کی بچّی رو پڑی تو اس کا گلا دبا کر ختم کر دیا۔ یا دلی ہی میں دن کے وقت کوئی عورت اور اس کا بچہ اپنے کوارٹر میں تنہا تھے، کوئی شقی ہیم کا چور نہیں، مال کا چور، دروازہ کھلوا کر اندر آیا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ تین سال کا لڑکا رو پڑا اس نے ڈھیر کر دیا، آخر کار جرم پکڑا گیا۔ عدالت میں ماں اپنے جگر گوشے کا المیہ بیان کرتے وقت پھوٹ پڑی۔ آہ انسان کا دل ایسا پتھر بھی ہو سکتا ہے کہ ماں کے سامنے اس کے چھوٹے بچّے کو بے رحمی سے مار ڈالے۔

جنسی فعل کتنا خوشگوار اور کیف آور ہوتا ہے لیکن بے راہ رو ہو کر یہی سب سے زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے۔ اخبار میں ایک دفعہ پڑھا کہ آگرے میں کسی فوجی افسر کی بیوی تنہا تھی۔ اس کے ملازم نے اس سے زنا بالجبر کیا اور اس کے بعد اسے مار کر فرار ہو گیا۔ بعد میں وہ گرفتار ہو گیا اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا۔ میری رائے میں زنا بالجبر کی سزا موت ہونی چاہئے۔ شہوت کا جنون آدمی کو کتنا اندھا کر دیتا ہے۔ اخباروں میں روز پڑھتے ہیں کہ فلاں نے سات سال کی لڑکی سے زنا کیا، فلاں نے چار سال کی بچّی سے۔ یہ تو ایسی خبریں ہیں کہ انہیں پڑھ کر مر جانے کو جی چاہتا ہے۔

اُردو ادب کے مطالعے نے مجھ میں سماجی شعور پیدا کیا۔ برنارڈ شا کی کتاب An Intelligent Women's Guide To Socialism نے مسائل کو کچھ اور سلجھایا۔ میں تعلیم کو ختم کرنے کے بعد یعنی اُردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر تین سال تک بے روزگار رہا۔ تبھی سے سماجی ناہمواری کا ادراک ہو گیا ہے۔ یہ ترقی پسند شاعری اور افسانے ہی کی دین ہے کہ میں شدت سے معاشی مساوات کا قائل ہوں۔ ہندوستان کے عوام کی غربت دل شکن اور حوصلہ شکن ہے اور پھر نابرابری کس غضب کی ہے۔ اکثریت اس لئے جسمانی محنت کرتی ہے تاکہ خالی پیٹ کو بھرنے کا سامان ہو سکے۔ چند لوگ اس لئے جسم کو ہلاتے ہیں، ہلکی پھلکی ورزش کرتے ہیں تاکہ بھرا پیٹ کچھ خالی ہو جائے اور بھوک لگ سکے۔ ملک میں مکمل مساوات ممکن نہیں لیکن اتنا بھی ہو جائے تو کیا اچھا ہو کہ کسی کی آمدنی سو روپے ماہوار سے کم نہ ہو اور کسی کی ہزار روپے ماہوار سے زیادہ نہ ہو۔ اگر ثروت کی برابر تقسیم نہیں ہو سکتی تو کم از کم افلاس کو برابر بانٹ دیا جائے۔ سب رئیس نہیں ہو سکتے تو سب کو غریب ہی بنا دیا جائے تاکہ سب یکساں ہو جائیں۔

قدیم ہندوستانی تہذیب سماجی اور معاشی جمہوریت سے ناآشنا تھی۔ سوشلزم کے نعرے کے باوجود ابھی تک ہمارے خون میں مساوات کا جذبہ نہیں۔ ہم اپنے کتے کو صوفے پر بٹھا سکتے ہیں لیکن ایک ملازم یا ایک مزدور کو اپنے سامنے کرسی تو درکنار چارپائی پر بٹھانے کے بھی روادار نہیں۔ پیسے والوں کو قالین پر جوتے لے کر چلنے دیں گے لیکن ایک مفلس کو بغیر فرش والے کمرے میں بھی جوتے پہنے ہوئے آنے کی اجازت نہ دیں گے۔ غریب کو برآمدے سے نیچے ہی جوتے اتار دینے چاہئیں۔ ریلوں میں تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں بھیڑ رہتی ہے اور فرسٹ کے

ڈبے خالی چھوڑتے ہیں۔ ہم سب سوشلسٹ ہیں لیکن محض طبقے کے نیچے تک کم رع کر دیکھا جائے تو وہی طبقاتی شعور کے پجاری اور امارت پسند ہیں۔ انھیں میں میں ہوں، سوشلزم سے ذہنی اور جذباتی ہمدردی رکھنے والا لیکن عملاً کچھ نہ کرنے والا۔

ادب فنِ لطیف ہے۔ فنِ لطیف میں جمالیات کا شعور ناگزیر ہے۔ میں نے اردو میں شاعری بھی کی جو بعد میں چھوٹ گئی لیکن اپنے ترکے کے طور پر ایک جمالیاتی مزاج دے گئی۔ اردو ادب کے مطالعے نے اس کو اور جلا دی۔ میں زندگی کے ہر ساز و برگ میں جمال کا متلاشی ہوں، جس چیز میں جتنی زیادہ خوشنمائی ہوتی ہے اسے وہ اتنی ہی زیادہ پسند ہوتی ہے۔ حسنِ فطرت ہو کر حسنِ خصلت کہ حسنِ انساں، اسی جذبے کے زیرِ اثر میں نے پھولوں کی کاشت کا مشغلہ شروع کیا اور اس میں خاصا آگے بڑھا۔ جنوں میں یہ تعیش برقرار نہ رکھ سکا۔ صرف حالی کا مصرع ذہن میں رہ گیا ہے۔ ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

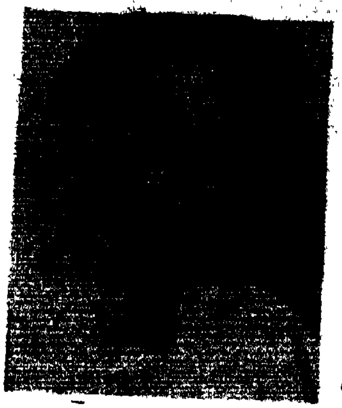
اب میری توجہ کا مرکز تصنیف و تالیف کا شغل رہ گیا ہے۔ بھوپال میں میرے دوست وزیرِ تعلیم ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے مجھ سے کہا تھا کہ کام نہ کرنا اسکالر کی موت ہے۔ میں اسی اصول کو مدِنظر رکھتا ہوں اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھنے کی فکر میں رہتا ہوں۔ فرائضِ منصبی میں اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ اپنی خواہشِ تخلیق کو آسودہ کرنے کی خاطر خواہ وقت نہیں ملتا۔ جو وقت قلم فرسائی میں گزرنا چاہیے تھا وہ دفتری چٹھیاں لکھنے اور حساب کتاب کی نذر ہو جاتا ہے۔ کاوش میں کسی طرح پروفیسری برقرار رکھ کر صدارتِ شعبہ کا بوجھ سر سے پھینک سکوں۔ لکھنے کے لیے صرف متعلقہ کتابیں پڑھ پاتا ہوں جس کی وجہ سے میں اردو ادب کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب سے کافی حد تک ناواقف رہ گیا ہوں۔ سو دو سو سال کی زندگی ہو تو آدمی جی بھر کر پڑھ لکھ سکتا ہے ورنہ اگر کچھ لکھ کر چھوڑ جانا ہے تو صرف اسی پر مرکوز رہنا ہوگا۔ تصنیف کے کام کی یہ قیمت ادا کرنی پڑی ہے کہ میں پڑھا لکھا جاہل رہ گیا ہوں۔

میری ذہنی ساخت کی یہ ایک سرسری سی جھلک ہے لیکن کیا معلوم کہ یہ پوری سچائی ہے کہ نہیں۔ سال دو سال پہلے میں نے یہ شعر کہا تھا۔

بہروپ ہے فقط، مرا دعوائے علم و فضل
میری فرشتگی میں بھی ہے درندگی !!

پورا آدمی

سنگلاخیں ہی سنگلاخیں
ان گنت چھوٹے چھوٹے خانے۔



ہر اک خانہ نیا چہرہ
ہر اک چہرہ نئی پہیلی
کبوتر
لومڑی
تتلی
ہرن، چیتر، کنگ، ناگن،
کبھی کچھ رنگ سا بکھرے
کبھی شعلہ سا بل کھاتے
کہیں جنگل، کہیں بستی، کہیں دریا سا لہرائے
سمٹتے، رینگتے، پھنکارتے
اڑتے ہوئے سائے
وہ ساڑھے پانچ چھ فٹ
چلتا پھرتا میوزیم جیسا۔۔۔۔۔!!
شباہت سے تو پورا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

ستون

آج اس کے لبوں پہ سرخی ہے
آدھا لڑکا ہے آدھی لڑکی ہے۔
سر کٹے آدمی نما یہ ستون
مدتوں سے کھڑا ہوا ہے یونہی
سوچتا ہے نہ بات کرتا ہے۔
اس کی لمبائی
اس کی چوڑائی
روز نیلام ہوتی رہتی ہے۔
فوج، بیمہ، سماج، دین، وطن
مختلف ہاتھ، مختلف سانچے
جو نیا پوسٹر لگاتا ہے
پچھلے چہرہ کو پھاڑ جاتا ہے۔

[illegible]

وامق جونپوری

نازل اُسی پہ ہوتی ہے کشمیر میں بہار
دیکھے ہے جو زمانۂ تیغ تیر میں بہار
کل تک جو اشکبار میں تھی زندگی وہ آج
پائے ہے اپنے خواب کی تعبیر میں بہار
کیا جانیں وہ ہواوس کی لذّت بہار میں
جو کھینچتے ہیں پھولوں کی تصویر میں بہار
غم کی نہ کوئی حد نہ مسرت کی انتہا
کچھ کم نہیں شراب سے تاثیر میں بہار
اک سلسلہ شگوفوں کا زنداں کے اردگرد
یوں ہے کہ جیسے حلقۂ زنجیر میں بہار
عکس چنار تختۂ گل بانگ عندلیب
تحریر میں بہار ہے تقریر میں بہار
ابر بہار مرگ شگوفہ حیات کشت
تخریب میں بہار ہے تعمیر میں بہار
نرگس کا تذکرہ قلم مشک بید سے
لکھیے تو آہی جاتی ہے تحریر میں بہار
فصل بہار نام پڑا نو بہار کا
وامق وگرنہ کب نہیں کشمیر میں بہار

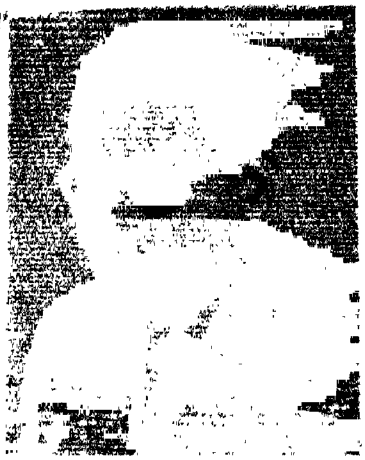
[illegible]

من خاموش بیتی رہی ہے

ہمارے نالے شکست زنداں ہمارے نغمے بہار ساماں
ہمارے دم سے چمن چمن ہے روش روش پر ہمارا احساں
وہ ہم میں نباض اہل گلشن جو گنتے رہتے ہیں دل کی دھڑکن
اور ایک وہ تھے کہ خون گل سے رنگے ہوئے جن کے دست و داماں
وہ ایک ہم ہیں کہ جن کے نقش قدم پہ شہلا بچھائے آنکھیں
اور ایک وہ تھے کہ چپہ چپہ چمن کا جن کے قدم سے نالاں
ہنسو ہنسوائے دہن کے غنچو کھلو کھلائے سخن کے پھولو
تمہیں نہ معلوم ہو تو سن لو ہمیں نہیں تاب چشم گریاں

٭ ٭ ٭

ہوا کی کاکل مہک رہی ہے گلوں سے ڈالی لچک رہی ہے
نمو کی چھاگل چھلک رہی ہے چھلک اٹھا ساغر بہاراں
کلی سے امرت ٹپک رہا ہے زمیں پہ سبزہ لہک رہا ہے
چمن میں بلبل چہک رہا ہے شباب پر آگیا گلستاں
صراحی تیغ پگھل رہی ہے حیات چشموں میں ڈھل رہی ہے
بہار پانی پہ چل رہی ہے تمام جل تھل تمام نیساں
کسان سونا اُگا رہا ہے چنار پہ رنگ آرہا ہے
سفیدہ یوں سر اٹھا رہا ہے کہ جیسے عاشق کے دل میں ارماں
وہ بید کی شاخ سے زمرد کی جھالریں یوں لٹک رہی ہیں
کہ جیسے سرشارگی کے عالم میں بھیگی بھیگی سی زلف خوباں



حسن نعیم

ہاتھ پھیلایا، نہ منعم کا نوالہ توڑا
میں ہوں وہ جس نے خموشی کا پیالہ توڑا
آج آتش کدۂ غم سے ملا اک گل داں
ہم نے لب سے ترے وہ پھول نرالا توڑا
وار کرنے کے لئے لائے تھے کیا کچھ احباب
روک لی دل پہ سناں، فرق سے بھالا توڑا
عمر جب بیت گئی دشت نوازی میں حسن
اُن کی پلکوں نے میرے پاؤں کا چھالا توڑا
باغ کو باغ کیا خوشۂ محنت سے نعیم
دست گل کھینچا، نہ پیمانۂ لالہ توڑا،

لنج عبداللہ

ملیالم کہانی

زندہ مُردہ

دُور دُور تک پھیلے ہوئے گیہوں کے کھیتوں کے اُس پار افق سے روشنی پھوٹ نکلی، سونا چونک کر جاگ اٹھا۔ جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے، پھٹے پرانے میلے کمبل کو جسم سے الگ کیا۔ پھر جھونپڑی کا دروازہ کھولا، تو کھر کے بیچ سے آنے والی روشنی اور باہر کی ٹھنڈ اندر گھس پڑی۔ سونا نے ہتھیلیوں کو مل مل کر گرم کیا اور منہ پونچھا۔ پچھلی رات، مٹی کے گھڑے میں پانی رکھنا بھول گیا تھا۔ اس لئے منہ دھونے نل کی طرف چل پڑا۔ گاؤں والوں کی فلاح و بہبود کے لئے زمیندار نے لگوایا تھا وہ نل۔

سونا نے منہ دھویا اور صافہ نکال کر پانی پونچھا۔ جسم پر ٹھنڈی ہوا لگ رہی تھی۔ سونا نے اپنی جواہر کوٹ کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈال کر چاروں طرف دیکھا۔

جھونپڑی کی طرف لوٹتے وقت سونا یاد کرنے لگا، "اس جمال پور گاؤں کا چہرہ کتنا بدل گیا ہے۔ میرے بچپن میں جب والد بھنگی کا کام کرتے تھے اور ماں بھینس پال کر دودھ دوہ کر بیچا کرتی تھی۔ سامنے کے یہ بڑے بڑے کھیت بنجر زمین تھے۔ لیکن جب حکومت نے جمنا پر باندھ بنا کر پانی روک لیا، تب بنجر زمین میں بھی پانی آگیا۔ ساتھ ہی ساتھ جمال پور میں بھی بڑی کایا پلٹ ہوئی۔ گاؤں کے بیچ میں زمیندار کی کوٹھی بنائی گئی۔ جھونپڑی اور مویشیوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ بنجر زمین میں پکے گیہوں کی بالیاں ناچنے لگیں۔ میں نے سوچا تھا، یہ گاؤں جنت بن جائے گا۔ لیکن . . پتاجی نے مجھے 'سونا' نام دیا جس کا مطلب ہوتا ہے زر۔ وہ دق کا شکار بن کر چل بسے۔ ڈاکٹر کو دکھائے بغیر، دوا کی ایک بوند پئے بغیر۔ ماں نے مجھے پالا پوسا۔ بھینس بوڑھی ہو کر مرگئی۔ میں جوان ہو گیا اور ماں فالج کی وجہ سے لیٹ گئی۔ . . یہی تو میری جنت ہے! اوہ! لگتا ہے، آج بڑی دیر ہو گئی۔" سونا جلدی جلدی جھونپڑی کے اندر آیا، تو دیکھا، ماں لیٹی ہوئی کراہ رہی ہے۔ "ماں!" اُس نے پکارا۔

ماں جاگ پڑی۔ بے جان سی آنکھیں، مصائب کی جھریوں سے بھرا چہرہ۔ سونا نے پھول کی کٹوری میں دوا لے کر ماں کے منہ میں ڈال۔ دوا کی شیشی پلنگ کے نیچے رکھی۔ پھر روٹی اور پانی کا برتن لا کر انہیں ایسی جگہ پر رکھا، جہاں ماں کا ہاتھ پہنچ سکتا تھا۔ پھر وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔

آٹھ بج رہے تھے۔ سڑک پر آنے جانے والوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ سر پر کپڑے لپیٹے، دودھ والے دودھ کے برتن کیریر پر رکھے جلدی جلدی سائیکل چلا رہے تھے۔ سونا بھی جلدی جلدی آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر سے پہنچا، تو ڈاکٹر صاحب آنکھیں نکال کر برا بھلا کہنے لگیں گے۔ وہ تو کسی طرح سہ لوں گا، لیکن اس شیشہ نما کرتا پہننے والے ٹیکنیشن نثار احمد کی بھدی گالی نہ سہہ سکوں گا۔

کنکروں پر چلتے چلتے سونا کے پیر دُکھنے لگے۔ کیوں نہ دُکھیں۔ یہ جوتے ڈیڑھ سال تک ڈاکٹر مہدی حسن کے پیروں میں رہے۔ اب میرا وزن بھی کتنے دنوں تک سہہ سکیں گے؟

"ایک پرانی سائیکل خرید سکتا، تو اتنی مصیبت نہ ہوتی۔ کتنے دنوں سے سائیکل خریدنے کی سوچ رہا ہوں۔ لیکن ہر مہینے جو تنخواہ ملتی ہے، اس کا زیادہ تر حصہ ڈاکٹر کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ . . ."

دوا کو روپے خرچ کر کے بنائے گئے اونچے نادر کے سر پر لگائی گئی

کمرے کی طرف دیکھا۔ سارے کمرے میں بچھی کرسیوں کے نیچے چپاتی تھوڑا اور [illegible] طرف ... الفاظ کندہ ہیں — اے انسان میں نے تیرے لئے کائنات کی تخلیق کی ہے۔

اسی بڑے پھاٹک سے جس سے ہو کر ہزاروں اسکالر، ریکشا اور خوبصورت عورتیں اور مرد آتے جاتے ہیں، سونا بھی اندر چلا گیا۔ ڈیسکشن ہال میں پہنچ کر معلوم ہوا ٹیکنیشن ابھی نہیں آیا ہے۔ خوش قسمتی کی بات! تو اکیلا ریفریجریٹر (وہ ٹینک جس میں لاشیں محفوظ کر دی جاتی ہیں) کے پاس بیٹھ کر پان سپاری چبا رہا تھا۔ سونا کو دیکھ کر تو اٹھا۔ پیک اس نے تھوک دیا اور منہ پونچھ کر کہا "نمسکار!"

"نمسکار جی" سونا نے بھی کہا۔

تو دھیرے سے بولا "جانور نہیں آیا ہے!"

"آجائے گا!" سونا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ایک دن میاں پکڑ کر خوب پیٹوں گا۔ میری ماں کی طبیعت ذرا ٹھیک ہو جائے۔"

پھر کسی کی آہٹ پا کر دونوں چونک پڑے۔ مڑ کر دیکھا، وہاں کھڑا تھا ٹیکنیشن نثار احمد۔

"کتو! میری طرف گھورتے ہوئے کیوں کھڑے ہو؟" نثار احمد کی آواز بلند ہو گئی۔

"طلبا ابھی آئیں گے نا؟ لاشیں نکال کر میزوں پر رکھ دو!"

نثار پروفیسر کے کمرے کی طرف تک گیا۔ معلوم بڑا چالباز تھا۔ "ڈھکن" سونا نے ریفریجریٹر کا ڈھکن اٹھایا۔ جب وہ چلی گئی۔ اسے یاد آیا کہ پچھلے دن نثار اسے ڈانٹنا بھول گیا تھا۔

"ابھی جانور ادھر آ دھمکا۔ [illegible]" اس نے جلدی جلدی نکالیں اور لاشوں پر انڈیل دیا۔ تو [illegible] پندرہ منٹ کے اندر اندر ڈیسکشن میزوں پر لاشیں رکھ دی گئیں۔ [illegible] کسی کا سر، کسی کا پیر غائب تھا۔

سونا تانبے کا پرانا برتن لے کر باہر نکلا۔ سائیکل اسٹینڈ کے پاس اپنے چولھے پر برتن چڑھا کر آگ جلائی۔ برتن میں پچھلے دن کاٹے گئے اعضاء تھے۔ ان کو ابال کر اچھی ہڈیاں نکالنی تھیں۔ کھوپڑی کے ساتھ سب ہڈیاں جمع کرنے پر تیس روپے ملا کرتے تھے۔ لیکن جب نثار نامی یہ شیطان آیا، تب اس کی نگاہ وہاں بھی پہنچ گئی۔ طلبا کو ہڈیاں بیچنے پر جو روپے ملا کرتے تھے، وہ نثار کے ہاتھوں سونپ دینے پڑتے۔ چائے پانی کے لئے وہ کچھ دے دیتا تو خوش قسمتی!

سونا نے برتن میں ابلتے ہوئے پانی سے ہڈی کے ٹکڑے ایک ایک کرکے باہر نکالے۔ پھر ہڈی میں ادھر ادھر چپکے ہوئے گوشت کو چاقو سے کھرچنے لگا۔ تب ہی مہدی صاحب کی آواز اس کے کانوں میں پہنچی۔ یہ مہدی صاحب پڑھاتے وقت کتنا اونچا بولتے ہیں! ایسا لگتا ہے کہ گلا ابھی پھٹ جائے گا۔ ایک ہاتھ میں ایک ہڈی، دوسرے ہاتھ میں رنگین چاک پکڑ کر چلاتے چلاتے پسینہ بہایا کرتے ہیں۔ ساتھی تو کہا کرتا تھا، ڈاکٹر صاحب جتنی تنخواہ لیتے ہیں، اس کے لائق کام بھی کرتے ہیں۔

سونا یاد کرنے لگا۔ "کالج کے ڈاکٹروں میں سب سے اچھے اور نیک مزاج ہیں مہدی صاحب، میرے پاس روپے نہیں ہوتے، اس لئے فیس نہیں دے پاتا، پھر بھی پچھلے پانچ برسوں سے میری ماں کا علاج کر رہے ہیں۔ میرے پاس ہوتے، تو دس بیس روپے دے دیتا لیکن اس وقت تو دوا خریدنے کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں! مہدی صاحب پیر ہیں۔ اے خدا ان کی مدد کرنا!"

"سونا! ادھر آ" مہدی صاحب بلا رہے ہیں۔

وہ مہدی صاحب کے کمرے میں آیا تو روز کی طرح ان کے کمرے میں بیٹھے چالیس پچاس طلبا کی آنکھیں اس کی طرف مڑ پڑیں۔ طلبا ہنس رہے تھے اور کئی اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہے تھے گویا وہ کوئی عجیب چیز ہو۔

"سونا، اپنا کرتا اتار!" مہدی صاحب نے حکم دیا۔

سونا نے اپنا جواہر کوٹ اور نیچے کا میلا کرتا اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ مہدی صاحب صرف یہی ایک مہربانی کرتے ہیں — کبھی کبھی بلا کر کرتا اتروا کر لکڑی کی طرح کھڑا کرتے ہیں۔ مہدی صاحب اس کے گلے کے نیچے، پسلیوں پر اور پیٹھ پر انگلیوں سے چھو کر اونچی آواز میں کچھ بولنے لگے۔ طلبا اور طالبات اس کی طرف دیکھ کر اپنی اپنی کتابوں میں جلدی جلدی کچھ لکھنے لگے۔ مہدی صاحب نے اس کی چھاتی اور پیٹھ پر کئی لکیریں کھینچیں اور کئی لفظ لکھے۔ سونا کو بڑا دکھ ہوا — ہائے، یہاں میں ایک اوزار کے مانند بن گیا ہوں۔

پھر مہدی صاحب نے ایک لڑکی کو بلایا۔ سونا کو لگا کہ وہ گوری، خوبصورت پنجابی لڑکی ایک ناگن کی طرح پاس چلی آ رہی ہے۔ جب لڑکی کی لمبی

انگلیاں اس کی پسلیوں پر رینگنے لگیں۔ تب وہ محسوس کرنے لگا کہ میں ایک اوزار کے مانند نہیں ہوں، بلکہ ایک انسان ہوں۔

"سر! ہٹ دی اونلی ڈفرنس از۔ ہی از اے لیونگ کیڈیور۔" ایک لڑکے نے کہا۔

سونا کچھ سمجھ نہ سکا۔ طلبا ہنسنے لگے۔

مہدی صاحب کا چہرہ لال ہو اٹھا۔ انہوں نے اس لڑکے کو خوب ڈانٹا اور کلاس سے باہر کر دیا۔

شام کو سونا جھونپڑی کو لوٹا، تو دیکھا کہ ماں کے پلنگ کے کنارے انگولی بیٹھی ہے۔ انگولی، سونا کو دیکھتے ہی ساڑی کے پلو سے منہ چھپا کر دور سرک گئی۔ اس نے ماں کی پیشانی اور گلے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، بخار تیز تھا۔ وہ چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ تب انگولی نے کہا، "آج ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"انگولی، میں کیا کروں؟ میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر کو تو کچھ دینا نہیں پڑے گا، لیکن دوا کیسے خرید سکوں گا؟"

پھر بھی وہ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ ماں کو جلدی اسپتال لے جانا چاہیے شاید اس وقت مہدی صاحب ڈیوٹی پر ہوں۔ ایک رکشا بلانا ہے لیکن رکشا والے کو دینے کے لیے پیسے نہیں۔

وہ پریشان ہو کر چوکی پہنچا تو دیکھا، مولانا ایک فرشتے کی طرح کھڑا ہے۔

سونا نے پاس آکر آواز دی، "مولانا صاحب!"

مولانا نے مڑ کر دیکھا۔ غیر متوقع سونا کو دیکھ کر اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"مولانا صاحب، ماں سخت بیمار ہے۔ . . . اسے اسپتال لے جانا ہے . . . میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے!"

مولانا نے سائیکل رکشا آگے بڑھایا، پھر کہا، "چڑھ کر بیٹھ جا، سور کے بچے!"

سونا نے انگولی کی مدد سے ماں کو رکشا پر بٹھایا۔ پھر انگولی سے کہا۔ ہمارے لوٹنے تک جھونپڑی میں بیٹھنا پھر وہ بھی رکشا میں جا بیٹھا مولانا دھیرے دھیرے رکشا چلانے لگا

"سونا! ہوشیار رہنا! سامنے ایک گڑھا ہے!"

سونا چونک پڑا۔ اس نے ماں کو پکڑ لیا۔ رکشا ایک بار گڑھے میں ڈول اٹھا۔ پھر اوپر چڑھ گیا۔

اسپتال کے سامنے مریض اور ان کے رشتہ دار 'کیو' میں کھڑے تھے۔ یہ کیسی منحوس 'کیو' ہے! اسپتال میں، سینما میں، راشن شاپ میں . . . سب جگہ 'کیو'! آج کل کیو کے بغیر زندگی ہی نہیں ہے۔

سونا ماں کو رکشا میں چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آیا۔ مہدی صاحب مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ پاس ہی ایک دوسرا ڈاکٹر بڑی لاپروائی سے ایک ماہنامہ کھول کر نیم عریاں گوری لڑکیوں کے ننگے اعضا کو بڑے مزے سے دیکھ رہا تھا۔ سونا سامنے آکھڑا ہوا۔ تو مہدی صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر انہوں نے سونا سے کہا کہ ماں کو پاس والے کمرے میں لے جاؤ۔ وہ اس وقت ایک ایسے بچے کا معائنہ کر رہے تھے جس کا پیٹ پھولا ہوا تھا اور جو درد کے مارے کراہ رہا تھا۔

سونا نے ماں کو کمرے میں لا کر لٹایا۔ پانچ منٹ بعد ڈاکٹر مہدی حسن وہاں آگئے۔ انہوں نے بڑی توجہ سے مریضہ کو دیکھا، پھر تھوڑی دیر تک سوچا اور ایک انجکشن دے دیا۔ سونا کو دلاسہ دیا کہ ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

سونا ماں کے ساتھ گھر لوٹا، تو دیکھا، انگولی لالٹین کے سامنے بیٹھی ان کا انتظار کر رہی ہے۔ سونا نے کہا، "انگولی، تو ہمارا راستہ دیکھتے دیکھتے اکتا گئی ہوگی!"

ماں کو تھام کر لٹاتے ہوئے انگولی نے جواب دیا، "نہیں۔ تم دونوں ابھی تو گئے تھے!"

ماں نے نحیف آواز میں کہا، "بیٹا، اب انگولی کو اس کے گھر پہنچا آ۔"

ماں انگولی کو یہاں جھونپڑی میں ٹھہرانے سے ڈرتی تھی۔ شادی سے پہلے لڑکی کو یہاں ٹھہرا کر گاؤں والوں کو برا بھلا کہنے کا موقع کیوں دیا جائے۔

دونوں باہر نکلے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر انگولی کی جھونپڑی تھی۔ انگولی اپنی جھونپڑی میں اکیلی رہتی تھی۔ اس بات پر سونا کو دکھ ہوتا تھا۔ ماں تندرست ہو جائے۔ تب شادی کر کے اسے اپنی جھونپڑی میں لا سکوں گا۔ لیکن کتنے دنوں کے بعد!"

جھونپڑی میں پہنچ کر انگولی نے دیا جلایا۔ سونا اندر آبیٹھا۔ تب انگولی

نے المونیم کے ایک برتن میں کچھ لاکر اس کے سامنے رکھا۔

سونا نے پوچھا، "یہ کیا ہے ؟"

"کھاکر دیکھو"

اس نے کھایا۔ بڑھیا حلوا۔ بعد میں پانی پیتے وقت اس نے پوچھا، "کہاں سے ملا ؟"

اور کہاں سے ملے گا، تار والے بنگلے کی میم صاحب نے دیا۔ بڑی خوش ہیں ماں کو ایک بچہ ہوا ہے . . . . پہلا بچہ۔"

سونا تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، پھر اس نے پوچھا، "انگولی، تیرا بچہ کب پیدا ہوگا ؟"

انگولی شرما گئی۔ اس نے ساڑی کا پلو کھینچ کر منہ چھپا لیا۔

سونا کا جی چاہا کہ اُسے پکڑ کر گلے سے لگالے۔ لیکن شادی سے پہلے کیسے . . . ؟ پھر اُس نے ایسا خیال آنے کی وجہ خود کو سنبھالا۔

"اب میں جاؤں ؟" وہ اٹھا۔ پھر اس نے پوچھا، "انگولی یہاں رہتے ہوئے تو ڈرتی نہیں ؟"

"میں کیوں ڈروں ؟"

"کوئی غنڈا آدھمکے تو"

انگولی نے کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی جھاڑو کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

سونا خوش ہوا۔ 'لڑکی ہو، تو ایسی !' وہ چل پڑا۔

بہت دنوں تک انگولی دکھائی نہیں دی، تو ایک دن شام کو سونا اس کی جھونپڑی کی طرف چلا آیا۔ پاگل کی طرح بالوں کو کھلا چھوڑ کر انگولی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی تھی۔ سونا کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔

سونا ہکا بکا رہ گیا۔ اُسے شبہ ہوا، کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں ؟ اس نے دروازے پر دستک دے کر آواز دی، "انگولی، دروازہ کھول تجھے کیا ہوا ؟"

انگولی بھرائی ہوئی آواز میں بولی، "مجھے کچھ نہیں ہوا . . . تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

سونا نے حیرت کو کسی طرح دباکر پھر پوچھا، "انگولی، کیا ہوا، مجھے بتا۔"

وہ رو رہی تھی یا اس کی سسکیوں کی آواز دروازے کے اس پار اس کے کانوں میں پہنچ گئی۔ سونا پہلی بار انگولی کو روتے دیکھ رہا تھا۔ سونا کے دل میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ وہ اس کے آنسو پونچھ کر اسے دلاسہ دے لیکن دروازہ تو بند تھا۔

یکایک دروازہ کھلا انگولی باہر آئی اور اس کی طرف نگاہ ڈالے بغیر آگے بڑھ گئی۔ وہ آنگن کے ایک طرف جاکر بیٹھ گئی۔ اور قے کرنے لگی۔ پھر انگولی اُٹھ کر اندر چلی گئی اور دروازہ بند کرنے کے بعد انگولی نے کہا: "آئندہ کبھی اس پاپن کو دیکھنے کے لئے یہاں مت آنا!"

جواب نہیں ملا۔ سونا کے سامنے منہ اُٹھا کر انگولی کس طرح اپنے گناہ کا اظہار کرتی ؟

انگولی کی ایک ہی مددگار میم صاحب تھیں۔ سویرے انگولی میم صاحب کے گھر جاتی تھی۔ پھر گھر بیت الخلا، غسل خانہ، مرغیوں اور خرگوشوں کے پنجرے وغیرہ سب صاف کرتی تھی۔ میم صاحب روز کھانا دیتی تھی اور ہر مہینے دس روپے تنخواہ بھی۔

انگولی کام کرنا پسند کرتی تھی۔ اُسے میم صاحب کے گھر کے گلہارن مرغے مرغیوں سے اور سفید خرگوشوں سے پیار تھا۔ لیکن اُسے گھر میں ایک آدمی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ تھا افتخار صاحب، جو جھاڑو دیتے وقت اس کے جسم کو گھورنے والی نگاہ سے دیکھتا رہتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں چیچک کے داغوں والا چہرہ ڈراؤنی آنکھیں بڑی توند۔ وہ میم صاحب کا شوہر تھا۔ انگولی اس بات پر رنجیدہ ہوا کرتی تھی کہ یہ بدصورت آدمی ہرنی کے مانند خوب صورت میم صاحب کا شوہر بنا ہے۔

روز کی طرح انگولی بنگلے میں آئی، تو میم صاحب دکھائی نہیں پڑیں۔ پتہ چلا کہ میم صاحب زچگی کے لئے اسپتال گئی ہیں۔ وہ آنگن میں جھاڑو دینے لگی۔ تب افتخار صاحب ایک چاقو سے امرود کاٹ کر کھا رہا تھا۔ پھر انگولی سونے کے کمرے میں آئی۔ بستر ٹھیک ٹھاک بچھایا اور کمرے میں جھاڑو دینے لگی، یکایک اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں اندھیرا پھیل رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو افتخار صاحب دروازہ بند کرکے اس کی طرف گھورتے ہوئے کھڑا تھا۔ افتخار صاحب کے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا گلا سوکھ گیا۔ بولنے کی طاقت نہیں رہی۔ پھر انگولی کو سکتے کے عالم میں، پلنگ پر بیٹھ کر اپنی پھٹی پرانی چپلیں اُتار نیچے ڈالنی پڑیں . . . .

انگولی نے یہ سب نہیں بتایا۔ پھر بھی سونا بھانپ گیا۔ 'انگولی، جسے میں ایک اپسرا کی طرح پوجتا تھا، مجھے دھوکہ دے گئی . . . . !' اپنے دل

کے درد کو کم کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ پھر وہ جیتا رہا: نثار احمد کی گالیاں سنتے ہوئے، ڈیسکشن ہال میں کام کرتے ہوئے، دوا کی شیشی لے کر اسپتال کے سامنے 'کیو' میں کھڑے ہوتے ہوئے۔

اس واقعہ کے بعد انگولی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آخری بار دیکھ سکا تھا۔ اسپتال میں اس کی لاش۔

انگولی نے زہریلے جنگلی پھلوں کو پیس کر، زہر تیار کرکے پی لیا، لیکن جلدی مر نہیں سکی۔ ایک ہفتہ تک اسپتال میں لیٹے لیٹے تکلیف سہنے کے بعد ہی وہ مری

انگولی اسپتال میں بیمار پڑی تھی، یہ سن کر ماں نے سونا سے کئی بار کہا کہ اسپتال جاکر اُسے دیکھ آئے، لیکن وہ اسپتال گئے بغیر اور انگولی کو دیکھے بغیر ماں سے کچھ نہ کچھ جھوٹی بات کہہ دیتا تھا۔

رشتہ دار نہیں تھے، اس لیے اس کی لاش لے جانے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ لاش اسپتال میں پڑی رہی۔ 'کچھ بھی ہو، وہ تو مرگئی۔ اب جاکر اس کی لاش لے آؤں گا'، اس خیال سے سونا اسپتال چلا آیا۔

اسپتال کے لاشوں والے کمرے میں انگولی کی کپڑے سے ڈھکی لاش پڑی تھی۔ اس نے کپڑا اٹھاکر آخری بار اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ سونا اس کا چہرہ پہلے کی طرح کپڑے سے ڈھک کر دکھی دل سے باہر نکل آیا۔

اگلے دن سونا روز کی طرح اپنے کام پر میڈیکل کالج میں آیا۔ ٹیکنیشین نثار احمد وقت سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ سونا کو دیکھتے ہی اس نے آواز دی،

"ارے سونا! ادھر آ۔ کتنی دیر سے تیری راہ دیکھ رہا ہوں!"

سونا اس کے کمرے میں چلا آیا۔ نثار نے ایک تیز ریزر اس کی طرف بڑھا کر حکم دیا، "ایک نئی لاش آئی ہے۔ تو جاکر اس کے بال کاٹ دے!"

سونا ریزر لے کر پاس والے کمرے کی طرف آگے بڑھا۔ میز پر پلاسٹک کی چادر کے اندر لاش پڑی تھی۔ اس نے چادر اٹھایا، تو سکتے میں آگیا۔ انگولی کی لاش! لاش لے جانے کے لیے کوئی نہیں آیا، تو اسپتال والوں نے کالج میں بھیج دی۔ "کیوں گھورتا کھڑا ہے، گدھے! جوان عورت کی خوب صورتی دیکھ رہا ہے کیا! جلدی کام کر!" سونا مشین کی طرح کام کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا، دنیا گھوم رہی ہے۔ نثار پاس چلا آیا، لیکن وہ دیکھ نہیں سکا۔ نثار نے چادر کھینچ لی۔ انگولی بالکل ننگی پڑی تھی۔ سونا نے چاہا کہ نثار کے ہاتھ روک لے۔ نثار نے لاش کو تھوڑا چیرا۔ 'ڈائی انجکٹ کرنی چاہیے'۔ کام کرتے وقت اس نے پوچھا، "تو اس رنڈی کو جانتا ہے؟"

"نہیں۔" سونا کے ہونٹ ہلے۔

"ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا، اسی علاقے کی ہے۔ من مانی کرنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔" سونا کچھ نہیں بولا، اس نے لاش کے لمبے، گھنے، کالے بالوں کو کاٹ دیا۔ تب اُسے یاد آیا کہ ماں کبھی کبھی انگولی کے کالے گھنے بالوں کی تعریف کیا کرتی تھی۔

تب نثار نے ایک لمبی سوئی اور دھاگا اس کے ہاتھ میں دے کر لاش کے ہونٹوں کو سی دینے کا حکم دیا۔ جب سوئی ہونٹوں کو پار کرگئی تو سونا نے محسوس کیا کہ وہ سوئی اس کے کلیجے کو پار کر رہی تھی۔ اس رات سو نہیں سکا۔ آنکھیں بند کرتے وقت لاش کا منڈھا ہوا سر، آپس میں سئے ہوئے ہونٹ اور ننگا جسم دکھائی سا دینے لگا۔ صبح ایک جھپکی آئی، تو خواب میں انگولی کو دیکھا۔ انگولی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا، "میں نے تمہیں دھوکا دیا۔ اسی غم میں زہر کھاکر مرگئی۔"

سونا کے دن بڑی بے چینی سے کٹنے لگے۔ اس دن انگولی کی لاش ڈیسکشن میز پر لائی گئی۔ سونا نے ہی کیڈیور ٹینک سے لاش اٹھاکر اسٹریچر پر رکھی اور پھر میز پر لاشوں کے بیچ۔ پہلے کبھی اسے محسوس نہیں ہوا تھا کہ ان میں بھی کسی وقت گرم لہو دوڑتا تھا۔ سونا نے اس خیال سے سارا کام کیا کہ انگولی کو دکھ نہ ہونے پائے۔

تھوڑی دیر بعد طلبا اور طالبات میز کے پاس آئے۔ قینچی، چاقو، ریتی وغیرہ چلنے لگے۔ سونا نے کیڈیور روم کے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا، اسے دکھائی پڑا کہ ریزر کی دھار لاش پر پڑ رہی تھی

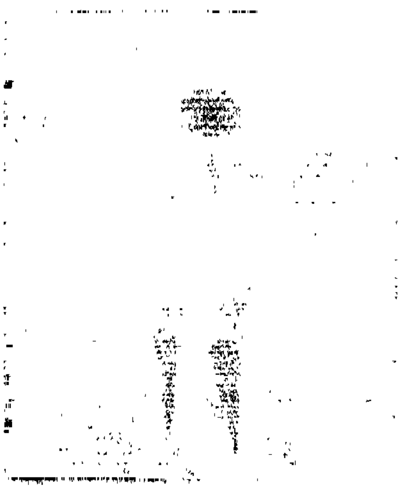
آخر وہ دن بھی آگیا۔ لاش کی کھوپڑی توڑی جارہی تھی۔ یہ کام دیکھنے کی ہمت نہ ہونے کے سبب سونا باہر آکر کھڑا ہوگیا۔ تب ایک طالب علم نے آکر اُسے بلایا۔ سونا اندر آیا تو طلبا نے اس کے ہاتھ میں چھینی اور ہتھوڑا دے کر کہا، "سونا یہ کھوپڑی توڑ دو! ہم سے توڑی نہیں جاتی!"

سونا کچھ بول نہ سکا۔ چھینی ہاتھ میں پکڑ کر وہ کچھ لمحوں تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ تب طلبا نے جلدی کی، "جلدی کام کرو! وقت گزر رہا ہے۔"

سونا کھوپڑی پر چھینی رکھ کر ہتھوڑا چلانے لگا۔ کتنی دیر تک ہتھوڑا چلاتا رہا، اُسے یاد نہیں۔ کھوپڑی ٹوٹ گئی۔ تب اس نے دیکھا، سفید رنگ کا، نہیں، ہلکے پیلے رنگ کا، بہت سی سلوٹوں سے بھرا ہوا دماغ: عجیب دماغ، جس نے کئی بار اس کو یاد کیا تھا۔ (مترجم اصغر حسین)

اے ڈی ارشد

مسئلہ وحدت الوجود اور بھگتی تحریک



خلافتِ راشدہ (۶۳۲-۶۶۱ء) کے بعد بنو امیہ کے عہد (۶۶۱-۷۴۹ء) میں ملکی فتوحات کی کثرت اور دولت کی فراوانی نے اسلام کے سیاسی نظام میں خاص تبدیلی پیدا کر دی۔ خلیفہ مسجد کو چھوڑ عالیشان محل میں رہنے لگا اور منبر کے بجائے پرشکوہ تخت پر بیٹھنے لگا۔ قصرِ خلافت کے دروازوں پر دربان بٹھا دیئے گئے۔ عوام سے وہ گہرا ربط اور تعلق جو خلفائے راشدین کے عہد کی خصوصیت تھی ختم ہو گیا۔ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو مسلمانوں کی وحدتِ عمل بھی جاتی رہی۔ حضرت معاویہؓ کی وفات (۶۸۰ء) کے بعد یزید کے عہدِ حکومت کے تین برسوں (۶۸۰-۶۸۳ء) میں ایسے سنگدلانہ واقعات وقوع پذیر ہوئے جن کی وجہ سے نیک دل مسلمانوں میں سخت بیزاری پیدا ہوئی۔ چنانچہ بہت سے بزرگوں نے حکومتِ وقت سے قطع تعلق کر لیا۔ کچھ خدا پرست لوگ حکمرانوں کی سنگدلانہ پالیسی اور اُن کی عیش و امارت کی زندگی سے نفرت کرنے لگے اور دُنیا سے منہ موڑ بیٹھے۔ یہ لوگ صوفی کہلائے۔ تصوف کے مسلک نے خدا سے وصال کے طریقوں پر زور دیا اور رسمی دین اور ظاہری عبادات سے ہٹ کر باطنی وجدان اور دلی کیفیات کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اس رجحان نے کئی نئے نظریات کو جنم دیا۔ ان میں سے ایک اہم نظریہ "وحدت الوجود" تھا۔

نظریۂ وحدت الوجود کا سادہ زبان اور مختصر الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کائنات میں کوئی چیز موجود نہیں "یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ اہلِ ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں۔ نیز کائنات کی مختلف اشیاء اور انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ جو فرق ہے ظاہر میں ہے۔ باطن میں بالکل نہیں۔

ویسے تو توحید کا نظریہ اسلامی تعلیمات کی اصل اور بنیاد ہے۔ لیکن ویدانت

اور افلاطونی فلسفہ کا اثر لے کر مسلمان صوفیوں نے اسے وحدت الوجودَ لباس پہنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عقیدہ مسلم سوسائٹی کے جسم و جان مر حلول کر گیا کہ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر نظر آنے لگا۔ مذہب، ا شعر، فنونِ لطیفہ کوئی چیز اس کے دائرہ اثر و نفوذ سے باہر نہ رہی۔

وحدت الوجود کا نظریہ مسلمان صوفیوں کے دلوں میں یوں تو ہجری کے اختتام پر اپنی جگہ پیدا کر چکا تھا۔ لیکن اس کی باضابطہ تدو چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں فلسفہ پسند صوفیوں کی ایک جماعت ہوئی۔ ان لوگوں نے تصوف کو فلسفہ کے رنگ میں رنگ کر ایک جداگا الٰہیات کا فکری نظام قائم کر دیا جس کو اصل اسلام سے بہت کم تعلق گروہ کے ممتاز افراد ابوالفتوح شہاب الدین (م ۵۸۷ھ)۔ ابنِ ع ابن فارض (م ۶۳۲ھ) ابن سبعین (م ۶۶۸ھ) عفیف الدّ اور اُن کے ہمنوا حضرات ہیں لیکن جس بزرگ نے اس عقیدے کی ، کی اور جس کے ہاں پہنچ کر یہ فلسفہ مکمل اور پختہ ہوا۔ نیز مدّون کیا گ محی الدین ابن عربی ہیں۔ جو شیخ اکبر کے لقب سے یاد کیے جاتے ہ تبلیغ نے وحدت الوجود کے خیالات کو ایک اسلامی عقیدے کی حیثیہ

شیخ اکبر ۵۶۰ھ میں اسپین کے مشہور شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے و مغربیہ کے ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے ۶۳۸ھ میں وفات پا میں مدفون ہوئے۔ اُن کی تصنیفات میں "فصوص الحکم" اور فتوحا سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ شیخ اکبر کے عقائد اور نظریا ان ہی کتابوں میں ملتا ہے۔

شیخ کی تصانیف برصغیر پاک و ہند میں پہنچیں تو ان کا پرجوش خیرمقدم
یہاں کے عالموں نے ان کی شرحیں لکھیں اور مسئلہ وحدت الوجود پر خاص
دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حملوں کے سامنے مقامی
ہیں پسپا ہو چکی تھیں۔ اور اُن کی قوت کی بحالی کا بظاہر کوئی امکان نہ رہا تھا
نی ہوئی بات ہے کہ جب قوموں کے قوائے عمل میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے
جد و جہد کا ولولہ باقی نہیں رہتا ہے تو اس میں تصوّف خوب پھلتا پھولتا ہے۔
مان ہوں تو مسجدوں کے بجائے خانقاہیں زیادہ آباد نظر آتی ہیں۔ بعینہٖ
ت ہندو قوم کی ہوئی اس حالت میں انہیں مسلمانوں کا تصوف پسند آیا۔ اور
ں کے بل بوتے پر بھگتی تحریک نے زور پکڑا۔ سادھو سنتوں کی تعلیم کے اثرات
ب سے شروع ہو کر ملک کے شمال تک پھیل گئے۔ مندر کے مقابلے میں مٹھ
د نظر آنے لگے۔

ہندوستان میں اسلامی تصوّف مقبول ہونے پر ہندو دھرم بہت سے
افکار سے روشناس ہوا مثلاً تمام انسانوں سے محبت کا مسلک۔ ذات پات کے
یازات سے نفرت۔ انسانی مساوات کا عقیدہ۔ یہ عمل اسلام سے میل ملاپ
زیر اثر تھا۔ اس کے علاوہ اسلام اُن عناصر کو تقویت پہنچا کر بروئے کار لایا
اگرچہ پہلے سے ہندو فکر میں مضمر تھے مگر کسی نہ کسی وجہ سے خاموش اور خوابیدہ
ہے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت توحید کے تصوّر کو حاصل ہے۔ دیگر
ثرات بھی ایسے تھے۔ جو حیرت انگیز حد تک اسلامی معتقدات سے قریب تر
لوم ہوتے۔ وحدت الوجود کا عقیدہ ہندوؤں میں بھی موجود تھا۔ ہندوؤں کے
ہم ترین مفکر شنکر آچاریہ وحدت الوجود کے قایل تھے اور کہتے تھے کہ خدا ایک
، اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ بعد کے ہندو مصلحین نے اسلامی عقاید کے بعض
سرے عناصر ہندو مذہب میں جذب کر لئے جو لوگ بھگتی کے معتقد تھے انہیں صوفیت
سلامی تصوف میں بہت سی جاذب اور رُوح افزا چیزیں مل گئیں۔

نظریۂ وحدت الوجود درحقیقت ایک وجدانی کیفیت، ایک ذوقی حالت
۔ انجانی اور روحانی احساس ہے جنہیں الفاظ میں منتقل کرنا نہایت مشکل کام
ا۔ یہ مشکل اس وقت اور بھی سخت ہو گئی جب اس کے متعلق بیانات ایسے لوگوں
، پہنچے۔ جو اس راز کے محرم اور اس شراب کے جرعہ نوش نہ تھے۔ یہی وجہ تھی
ب اس نظریہ پر عوام سے گفتگو ہوئی اور انہیں اس سے متعارف کرایا گیا تو بڑی
بدگیاں واقع ہوئیں۔ یہاں تک کے گمراہی اور بے دینی کے پیدا ہونے کا قوی
تال ہو گیا۔ انجان لوگوں نے خود کو خدا سمجھنا شروع کر دیا۔

ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے مشائخ کا وحدت الوجود کے عقیدہ
پر پورا یقین تھا۔ لیکن وہ تمام عقیدت اور ارادت کے باوجود عوام کو اس کے
مطالعہ کی دعوت دینے میں سخت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ہندوستان میں سب
سے پہلے جس بزرگ نے نظریۂ وحدت الوجود کو عام گفتگو کا مبحث بنایا وہ مسعود
بک تھے۔ جو سلطان فیروز تغلق کے عہد اور اس کے قرابت دار تھے۔ عوام کو اس
گفتگو میں شریک کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انا الحق کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ سلطان
فیروز تغلق نے اپنی کتاب فیروز شاہی میں ایسے ہی چند اور حضرات کا ذکر کیا ہے۔
ایک صوفی احمد بہاری تھے جن کے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ساتھ گہرے
تعلقات تھے اُن کے متعلق لکھا ہے۔ "وطائفہ از بہار او را خدا می گفتند" (بہار
کے ایک طبقے کے لوگ اسے خدا کہتے تھے)۔ اُن پر کفر کا فتویٰ عاید ہوا اور انہیں
موت کی سزا دی گئی۔ پھر گجرات کے ایک صوفی کے متعلق لکھا ہے "کلمۂ انا الحق می
گفت"۔ خود مسعود بک بھی اپنے عقائد میں شدت کی بناء پر حسین بن منصور حلاج کی
طرح عوام کے روبرو موت کی سزا پا گئے۔

مسلمانوں میں عقیدہ وحدت الوجود اور اس کے متعلقات کی ترویج کا اثر
خطرناک ثابت ہوا۔ اس سے ان میں عمل کی رُوح بے حد کمزور ہو گئی۔ اس عقیدے
کا مطلب یہ تھا کہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں خدا ہے لہٰذا خدا کی عبادت
ہر طریقے سے کی جا سکتی ہے۔ پتھر، حیوان، آگ، پانی، ہوا، انسان غرض کسی کی
بھی پرستش کی جائے وہ خدا ہی کی پرستش سمجھی جائے گی۔ اس لئے کہ سب اشیاء
اور مخلوقات میں خدا موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفیانہ عقیدے اور اسلام کے
عقیدۂ توحید میں بُعد المشرقین ہے۔۔۔ لیکن بیشتر علماء و مصنفین نے ان دونوں
میں مطابقت پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کیں۔ ملا جامی نے لوائح لکھی، حکیم سنائی،
محمود شبستری، فریدالدین عطار، جلال الدین رومی اور دیگر عالی قدر مصنفین و
شعراء نے نظریاتی اعتبار سے تصوّف کو انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا اور عقیدۂ
وحدت الوجود کو زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول بنانے میں مصروف رہے۔

عقیدہ کے ایسے اثرات کے پیشِ نظر مناسب انسداد کی ضرورت بلا تاخیر
محسوس کی گئی۔ جن برگزیدہ ہستیوں نے مخالفت میں آواز بلند کی ان میں دو
شخصیتیں زیادہ ممتاز ہیں ایک امام ابن تیمیہ (م - ۷۲۸ھ) اور دوسرے مجدد
الف ثانی حضرت احمد سرہندی (م - ۱۰۲۴ھ) امام ابن تیمیہ کی تردیدی کوشش
زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس لئے بھی کہ ان کے زمانہ (۶۶۱ - ۷۲۸ھ) تک
یہ عقیدہ ابھی پوری طرح پھیل نہیں سکا تھا۔ بعد کی صدیوں میں جب پورے

قوم اخلاقی زوال اور سیاسی جمود اور تعطل سے دوچار رہی۔ تو اس عقیدے کو زیادہ موقع ملا۔ اس حالت کو دیکھ کر حضرت مجدد الف ثانی میدان میں آئے وہ خود تصوف کے تمام مقامات سے آگاہ تھے۔ سلوک کی تمام جانی اور انجانی منزلیں طے کر چکے تھے۔ انہوں نے اس راہ کے واردات کی بنا پر عقیدۂ وحدت الوجود کی تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ ابن عربی کو دھوکا ہوا ہے جس مقام پر جا کر انہیں وحدت الوجود محسوس ہوا۔ وہ سلوک کی آخری منزل نہیں۔ وحدت الوجود کے تجربے تو اس راہ کی درمیانی منزلوں کی واردات ہیں ان پر اعتماد کرنا بڑی غلطی ہوگی۔ ان درمیانی منزلوں میں سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہی ہے اور اس ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہیں۔ لیکن آگے بڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض وحدتِ شہود ہے یعنی صرف ایسا نظر آتا ہے۔

حضرت مجدد نے جو تردیدی نظریات پیش کئے، ان سے ان کے معاصر بے حد متاثر ہوئے۔ سلسلۂ نقشبندیہ نے مجدد صاحب کے نظریۂ وحدت الشہود کو اپنا مسلک بنا لیا۔ اور وحدت الوجود کی تردید اپنے لئے لازمی قرار دے لی۔ اس کشمکش کو فرو کرنے کے لئے بالآخر شاہ ولی اللہ محدث نے اجتہاد سے کام لیا۔ اور متصادم نظریات میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔

وحدت الوجود کا عقیدہ جیسا کہ ابن عربی نے فصوص الحکم میں بیان کیا ہے۔ تمام مذاہب انسانی کے فرقوں کو ہم رتبہ قرار دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کی برتری کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتا۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی جنہوں نے ابن عربی کی فصوص الحکم کی شرح لکھی، کی تصنیفات میں بھی اس برتری کے احساس کی نفی کے بیانات عام ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کیا فضول بحث ہے کہ فلاں مومن ہے اور فلاں کافر۔ فلاں مسلمان ہے اور فلاں نصرانی۔ سب کے سب لوگ ایک ہی خیال کے پیرو ہیں۔ وغیرہ وغیرہ مسلمانوں میں جب اس عقیدے کی اشاعت ہوئی تو مذہب کے متعلق نئے رجحانات پیدا ہوئے جو بالآخر اکبر کے دینِ الٰہی اور داراشکوہ کی تصنیف "مجمع البحرین" کے روپ میں تکمیل پذیر ہوئے۔

یہ اتفاق کی بات تھی کہ ہندوؤں کی طرف سے بھگتی تحریک نے پہلی مرتبہ ہندوستان میں اس وقت سر اٹھایا جب وحدت الوجود کے حامی اس عقیدے کو مسلمانوں میں پھیلانے میں مصروف تھے۔ دونوں تحریکیں اکٹھی ہو گئیں۔ اور یہ سمجھ لیا گیا کہ تمام مذاہب اگر ظاہری اعتبار سے نہیں تو باطنی طور پر ضرور یکساں ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں ہندومت میں انحطاط پیدا ہو چکا تھا۔ ہندوؤں نے اس کے احیا کے لئے کوشش شروع کی۔ مشہور ہندو مفکر شنکر آچاریہ (۷۸۸ء - ۸۲۰ء) مالابار کے علاقہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ہندوؤں کو اپنے فلسفیانہ اور منطقی انداز سے سمجھا لیا کہ اسلام اور ہندومت برابر ہیں۔ چنانچہ تبدیلیٔ مذہب کا رجحان کسی حد تک رک گیا اور برہمنوں کا مذہب عروج پر آ گیا۔ شنکر آچاریہ نے خدا کا جو تصور پیش کیا تھا۔ اس سے یک طرفہ عبادت گزاری مقصود تھی۔ اسلام نے ایک رحیم اور مہربان خدا کا تصور پیش کیا۔ جو مخلوق سے محبت کرتا ہے اور مخلوق اس سے محبت کرتی ہے۔ اس تک پہنچنے کا ذریعہ بھگتی و پرستش و عبادت ہی تھا۔ اسلام کے زیر اثر زیادہ سے زیادہ لوگ "بھگتی مارگ" کے قائل ہوتے گئے۔

شنکر آچاریہ کے بعد رامانج نے (۱۰۳۷ء - ۱۱۳۷ء) نے دکن میں بھگتی کی تعلیم عام کی۔ بعد ازاں راما نند (۱۲۹۹ء - ۱۴۱۰ء) نے بھگتی کی تعلیم کا پرچار کرتے ہوئے ایک الگ پنتھ قائم کیا جس میں بنیادی اصول یہ رکھا کہ خدا کے بھگت ہوتے ہوئے سب لوگ بھائی بھائی ہیں۔ برہمنوں کی تعلیم کے خلاف اس نے اپنے پنتھ میں چمار، خاکروب، نائی، قصاب حتیٰ کہ عورت کو بھی داخل کیا۔ اور ان سب کو برابر گردانا۔ راما نند کے چیلے بھگت کبیر (۱۴۸۸ء - ۱۵۱۷ء) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ خدا سے محبت جبھی میسر ہو سکتی ہے کہ انسان ہندو اور مسلمان کے خانوں میں نہ بٹے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ نجات ہر شخص کے لئے ممکن ہے بشرطیکہ اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو اور ایسا کرنے کے لئے کسی مذہب کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ بنگال میں ہندومت کے احیاء کا کام چیتنیہ (۱۴۸۸ء - ۱۵۲۲ء) نے شروع کیا یہاں مسلمان صوفی بکثرت جمع تھے چیتنیہ نے کیرتن (کرشن مہاراج کی تعریف میں گیت) ایجاد کر کے ہندو عوام میں مقبولیت حاصل کی۔ چیتنیہ نے برہمنوں کے رسموں اور رتوں سے بھرے ہوئے دھرم اور ذات پات کی مذمت کی۔ اور ہندوؤں کے طریقِ عبادت کو جو بڑی حد تک انفرادی ہے۔ اجتماعی حیثیت دی۔

شنکر آچاریہ سے بھگتی تحریک تک پہنچتے پہنچتے ہندو دھرم کے بھگتی مسلک کی شکل و صورت واضح طور پر اسلام سے مشابہ ہو گئی۔ اور اس میں تصوف کا عنصر بھی صاف نظر آنے لگا۔ یہی نہیں شری شنکر سے لے کر سوامی دیانند تک تمام اکابر ہندوؤں کی جدید تحریکات اسلام سے متاثر ہوئیں۔ سر جادو ناتھ سرکار، ڈاکٹر تارا چند ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور کئی اور مورخین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ بات یہ تھی کہ ہندو، مسلمانوں کے تصوف سے بہت متاثر ہونے لگے چونکہ تصوف کے اکثر اجزا مثلاً وحدت الوجود۔ ترک دنیا، نفس کشی، ریاضت

امامت شیخ، پاس انفاس، رقص و سماع، ہندوؤں میں ویدانت اور یوگ کی وجہ سے پہلے سے موجود تھے اور نروان، آتم درپے، ابھیاس اور چمتکار یعنی فنا و بقا، طریقہ و سلوک، مراقبہ اور کرامت کی اصطلاحات سے بھی ہندو بیگانہ نہ تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے تصوف نے اپنے بعض اجزا ر آریائی ماخذ مثلاً یونان، ایران اور ہندوستان سے حاصل کئے تھے۔ اس لئے بھی تصوف کو ہندوستان میں بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ بھگتی مارگ کے بڑے بڑے ہندو مصلحین کی تعلیمات تصوف کے اثر سے لبریز تھیں۔

اکبر اعظم کے عہد میں ہندو اور مسلمانوں میں میل ملاپ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس اختلاط باہمی سے بڑے بڑے معاشرتی اور ثقافتی نتائج پیدا ہوئے۔ ہندو اور مسلمان بچے مکاتب و مدارس میں اکٹھے تعلیم پانے لگے۔ ہندوؤں نے عربی اور فارسی زبانیں سیکھیں۔ مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت سیکھی۔ بعض مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت سیکھی۔ بعض مسلمانوں نے ہندوؤں کی رسوم اختیار کیں۔ بعض ہندوؤں نے مسلمانوں کے طور طریق سیکھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں صوفیاء اور اولیاء کی درگاہوں پر یکساں عقیدت سے حاضر ہونے لگے۔ بلکہ بعض صوفیاء نے ہندوؤں کو (بلا تبدیلِ مذہب) مرید کرنا بھی شروع کردیا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے تہواروں میں حصہ لینا شروع کردیا۔

دینِ الٰہی کی تحریک بھی اس زمانے کی روحانی سرگرمی کا ایک اظہار تھی۔ اتحادِ مذاہب کے مسلک نے اکبر کے دینِ الٰہی کے لئے بنیاد کا کام دیا۔ مورخ عبد بدایونی کے بیان کے مطابق دینِ الٰہی کا تخیل اول اول دربار کے برہمنوں نے پیش کیا۔ پھر وحدت الوجود کے حامیوں نے اسے تقویت دی۔ اس بیان کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ اکبر کو دینِ الٰہی کے اجرا کی ترغیب دلانے والوں میں شیخ تاج الدین کا نام بھی آتا ہے۔ جو شیخ امان پانی پتی کا شاگرد تھا۔ شیخ تاج الدین نے ابنِ عربی کی تصنیف فصوص الحکم کی شرح لکھی تھی۔ اور وہ خود ابنِ عربی کے عقائد کا معتقد تھا۔

مذہبوں کی یکسانیت کے نظریہ نے جو عقیدہ وحدت الوجود کی پیداوار تھا۔ ہندو دھرم پر ہی نہیں سکھ دھرم پر بھی خوش گوار اثر ڈالا۔ سکھ دھرم کے بانی گورو نانک صاحب پر اسلام کا اثر پڑا، جو آپ کی تحریروں سے نمایاں ہے آپ کے اقوال میں تصوف کا رنگ نمایاں ہوا۔ آپ نے چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر کے بارھویں گدی نشین سے شیخ فرید دو مرتبہ پاک پٹن جا کر ملاقات کی۔ اور ان کے اقوال جو دوہوں کی شکل میں ہیں۔ سکھ دھرم کی مقدس کتاب گورو گرنتھ صاحب میں ایک الگ باب کی شکل میں "اشلوک شیخ فرید جی" کے زیرِ عنوان شامل کئے گئے ہیں۔ اسی طرح سے مسلمان درویش بھگت کبیر جو سلسلۂ چشتیہ کے ایک بزرگ شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے اقوال بھی جو دوہوں کی شکل میں ہیں گورو گرنتھ صاحب کے متن کا ایک جز ہیں۔

آگے چل کر بھگتی کے مسلک میں ایک متصوفانہ جدت پیدا ہوئی۔ اس کا اثر اسلامی تصوف پر بھی پڑا۔ بعض صوفیاء کو محی الدین ابنِ عربی کی تکنیک اور فلسفہ ویدانت میں بنیادی اشتراک نظر آیا۔ چنانچہ وہ بھگتی والوں کے قدر دان بن گئے۔ یہ طریقِ فکر سترھویں صدی عیسوی میں خاصا رواج پذیر ہوگیا۔ شیخ محمد غوث گوالیاری اس دبستان کے پہلے مشہور نمائندہ تھے۔

غزل

جگر بریلوی

تری بے التفاتی کیا کوئی کم ہوتی جاتی ہے
طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے
تسلی آپ نے دی فرق ہے ہاں دل کی حالت میں
جو تھم تھم کر خلش ہوتی تھی پیہم ہوتی جاتی ہے
ہزاروں چارہ گر ہیں اور غم بڑھتے ہی جاتے ہیں
جو صورت دیکھئے تصویرِ ماتم ہوتی جاتی ہے
نظر کیا آپ کی بدلی مزاجِ زندگی بدلا!
جو پہلے جانفزا تھی اب وہی سم ہوتی جاتی ہے
نہ احساسِ غمِ جاناں نہ احساسِ غمِ دوراں
تو کیوں مانوسِ گریہ چشمِ پُرنم ہوتی جاتی ہے
سب الٹی پڑ رہی ہیں شاید آزادی کی تدبیریں
کہ زنجیرِ محبت اور محکم ہوتی جاتی ہے
کسی کا غم سموئے جاتا ہے رگ رگ میں کچھ ایسے
کہ اپنی زندگی حسنِ مجسم ہوتی جاتی ہے
جہاں پہلے شررِ تھا اب لپکتا ہے وہاں شعلہ
محبت عمر ڈھل جانے سے کیا کم ہوتی جاتی ہے
جگر کیا تاب لا سکتا ہے کوئی دل کے زخموں کی
مگر کچھ غیب سے تدبیرِ مرہم ہوتی جاتی ہے

غزلیں

کسریٰ منہاس

بن کے عبرت کا نشاں دیکھنے والوں کے لیے
گھُپ اندھیروں میں ترستے ہیں اُجالوں کے لیے
وقت موزوں نہیں، رنگین خیالوں کے لیے
لاؤ اشکوں کی شراب ایسے پیالوں کے لیے
جستجو کی ہو تڑپ دل میں تو مشکل کیا ہے
راستے بند نہیں ڈھونڈنے والوں کے لیے
دل کی اب شمعیں جلاؤ کہ چھٹے ظلمتِ وقت
روشنی اور ہے درکار اُجالوں کے لیے
کھل ہی جاتی ہیں نئی راہیں، ہو گر عزم جواں
مشکلیں ہوتی ہیں آسان جیالوں کے لیے
دے کے سر چھوڑ گئے نام شہیدانِ وفا
عشق میں زندۂ جاوید مثالوں کے لیے
بعد مدت کے حقیقت یہ سمجھ میں آئی
مفت حیراں رہے، موہوم خیالوں کے لیے
سوچتا کیا ہے! جو کہنا ہے وہ کہہ دے اے دل
منتظر خود ہے جہاں تیرے سوالوں کے لیے
میں سمجھتا ہوں یہ ہے فیض کسی کا کسریٰ
باب کھل جاتے ہیں جب تازہ خیالوں کے لیے

ضیا فتح آبادی

عشرتِ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کے جُڑ جانے میں ہے
یعنی جو مستی ہے کھونے میں، وہی پانے میں ہے
بر بنائے یاد ہے دیوارِ شہرِ آرزو
آج کل ذکرِ حسیں بھی کل کے افسانے میں ہے
بلبلِ شوریدہ سر، اُڑنے سے پہلے دیکھ لے
شاخ پر گل کی ہنسی، یا برق کاشانے میں ہے
خاکِ پروانہ ہی پوچھے شمعِ سوزاں سے یہ راز
منزلِ ہستی تڑپنے میں کہ تڑپانے میں ہے
یہ بھی باقی، وہ بھی باقی کون اب کس کو بجھائے
آگ اک سینے میں ہے، اک آگ پیمانے میں ہے
ہر کھنڈر تصویرِ عبرت ناک ہے تعمیر کی
بستیوں کا بھوت محوِ رقص ویرانے میں ہے
کھینچتا ہے دل اِدھر اور پاؤں اٹھتے ہیں اُدھر
پُر سکوں دیر و حرم ہیں شور میخانے میں ہے
خود نمائی جذبۂ تخلیق میں ڈھالی گئی
صورتِ آئینہ گر بھی آئینہ خانے میں ہے
اے ضیا، پائے پرستش پر جو رکھ دے اپنا سر
کوئی بت بہتر کا ایسا بھی صنم خانے میں ہے

وفا ملک پوری

کیونکر سحر کہوں شبِ ظلمت اثر کو میں
کب تک فریب دوں نگہِ معتبر کو میں
اب دیکھتا نہیں کسی آشفتہ سر کو میں
سنسان پا رہا ہوں تری رہگزر کو میں
بخشا ہے اس نے کیفِ حیات و نشاطِ غم
دل سے دعائیں دیتا ہوں بیداد گر کو میں
ٹھہرے ہوئے ہیں اس پہ بہاروں کے قافلے
مدت سے جانتا ہوں تری رہگزر کو میں
کوئی رفیق، راہِ وفا میں نہ مل سکا
ہر گام ڈھونڈھتا ہی رہا ہمسفر کو میں
اہلِ خرد جو چاہیں سو الزام دیں مگر
رسوا نہ ہونے دوں گا شعورِ نظر کو میں
تازہ ہوئی ہے یادِ بیاباں کو دیکھ کر
دیوانگی میں بھول گیا تھا جو گھر کو میں
جز کرب مل سکا نہ کہیں حاصلِ شعور
اے مرکزِ سکوں تجھے ڈھونڈھوں کدھر کو میں
پیشِ نظر ہے نقشِ کفِ پا کا احترام
پلکوں سے جھاڑتا ہوں تری رہگزر کو میں
اس کی نظر میں قلبِ شکستہ عزیز ہے
پہچانتا ہوں فطرتِ آئینہ گر کو میں
سارا قصور حضرتِ دل کا ہے اے وفا
الزام کس طرح دوں کسی کی نظر کو میں

شیام لال دربہار

کشمیر میں سیکولرازم کی روایت



ریاست جموں وکشمیر میں کئی فرقے مثلاً مسلمان، ہندو سکھ، بودھ، عیسائی، جینی، پارسی، یہودی اور قدیم قبیلے وغیرہ رہتے ہیں مگر اس باوصف کشمیری ایک ہیں ــ بیشک بلند پہاڑوں کے آر پار رہ کر لوگوں کی پوشاک زبان اور خوراک پر اثر پڑا ہے مگر ان کے ایثار، محبت اور جذبۂ انسانیت میں صدیوں سے کوئی فرق نہیں آیا ہے کشمیریوں کا تمدن ان کے رسم ورواج، عادات، خصائل اور طرزِ معاشرت ایک جیسے ہیں کشمیری سب ایک پرانی تہذیب کے وارث ہیں۔

بودھوں کے زمانے میں بھی تمام ملک عالم برہمنوں کے زیر اثر رہا جن کی سنسکرت دانی اور علم وادب کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر چین، جاپان، لنکا اور جاوا تک پھیلی۔ ہاروں کی قدیم یونیورسٹی کے کھنڈرات ابھی اس بات کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ جو ہیون سانگ نے کشمیر آکر لکھا ہے "لوگ خوبصورت عالم اور اچھے تربیت یافتہ ہیں"۔ آن کانگ ایک اور چینی سیاح جو ۷۵۹ء میں کشمیر آیا، ہیون سانگ کے بیان کی تائید کرتا ہے۔ البرونی اپنی کتاب تحقیقاتِ ہند میں لکھتا ہے۔ "بنارس اور کشمیر فلسفہ کے بڑے درسگاہ ہیں۔ یہ کشمیر ہی ہے جس نے سب سے بڑے تاریخ داں، شاعر اور فلسفی پیدا کیے"۔ ان میں فیدر۔ شارح۔ ناگ ارجن۔ کھمیندر۔ ابھنو گپت۔ بلہن۔ سوم دیو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

یہ مذہبی رواداری کی ہی مثال تھی کہ برہمنوں نے ناگا کے اپنائے ہوئے مذہبی عقیدوں میں تھوڑی سی تبدیلی لائی اور آج بھی ناگا کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے ہر ایک برہمن اپنے جنم دن پر سال بہ سال پوجا کرنے کے لیے یاد کرتا ہے۔ یہی وہ زمین جہاں سیکولرازم کے پودے کی آبیاری سمراٹ اشوک نے کی۔ اس نے برہمنوں اور بدھ مت کے پیروؤں کو اپنے اپنے مذہبی عقیدوں پر چلنے کے لیے کھلی اجازت دی۔

آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ رنچین شاہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی سنسکرت کو فروغ دیا گیا ہمیں قبروں پر شاردا اور سنسکرت کے ساتھ عربی زبان میں بھی کندہ کی گئی عبارتیں ملتی ہیں۔ بدھ مت جب عروج پر تھا تو اُن کے پیرو کاروں نے ہندوؤں کے لیے مندر بنوائے۔ اور ایسی بھی مثالیں سامنے آئی ہیں جب ہندوؤں نے مسجدوں کے لیے چندہ دیا۔ اور مسلمانوں نے مندر بنوانے میں ہاتھ بٹایا۔ تیرھویں صدی کے دوران جب شہاب الدین کشمیر پر حکومت کرتا تھا تو اس وقت سبھی فوجی کمانڈر ہندو تھے۔ اسی بادشاہ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ جب گوتم بدھ کا بت جو کانسی کا بنا تھا سکوں میں تبدیل کرنے کے لیے آخری حکم کے لیے پیش کیا گیا تو اس نے ملازمان کو ایسا کرنے سے روکا۔ قطب الدین کی حکومت میں بھی جب ۱۳۹۰ء کے دوران قحط پڑا تو اس نے ایک ہون ہندوؤں سے کرایا تاکہ قحط ملک سے ٹل جانے رمانف

ظاہر ہے کہ مذہب دلوں کو جوڑنے کا ذریعہ کشمیر میں بنا تھا، توڑنے کے لئے نہیں۔

اس کے بعد سیکولرازم، رواداری، بھائی چارہ اور آپسی میل ملاپ کو جس قدر زین العابدین نے تقویت دی۔ وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ثقافتی پہلوؤں کو اس نے جس طرح اُجاگر کیا، اس کی کم اہمیت نہیں یا اپنی ہندو رعایا کے ساتھ اس نے اُن کے تہواروں میں شرکت کی۔

مغلوں نے بھی زین العابدین کی روایت کو باقی رکھا۔ مغلوں کے ماتحت کشمیر کے گورنر علی مردان کا خاص صلاح کار مہادیو تھا۔ احمد شاہ ابدالی کا نمائندہ اس کا بھتیجا جان محمد جو احمد شاہ کے نام پر حکومت کرتا تھا۔ اس کا اپنا خاص مشیر گورنام سنگھ تھا۔ افغان بادشاہوں میں سے جنہوں نے کشمیر پر حکومت کی ان میں سے خرم خاں نے کیلاش دھر کو اپنا چیف منسٹر مقرر کیا تھا۔ سکھ راجوں کے تحت بھی مسلمان اچھے عہدوں پر تعینات تھے۔ شیخ غلام محی الدین مسلم گورنر سکھوں کے ہر دلعزیز گورنر گزرے ہیں۔ بعد کے حکمرانوں نے بھی ان روایات کو باقی رکھا اور پروان چڑھایا۔

کشمیر میں متعدد ایسے شاعر، صوفی اور سنت گذرے ہیں، جنہوں نے رواداری اور یگانگت کی تعلیم دی ہے۔ کبھی کبھار مذہبی کٹرپن کی مثالیں بھی سامنے آئی ہیں مگر اس کا کوئی دیرپا اثر نہیں رہا ہے۔

للہ عارفہ جنہیں ہندو للشوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عمر بھر معرفت الٰہی کے گیت گائے ہیں۔ اُن میں خدا پرستی، معرفت، انسانی اخوت و ہمدردی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ آپ کے کلام پر اسلام اور ویدانت کا اثر نمایاں ہے۔ آپ کو ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان سمجھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ پر کشمیری صوفی میر سید حسین سمنانی کی تعلیم کا اثر تھا۔ آپ کے کلام کا شیخ نورالدین ولی پر بہت اثر پڑا۔ روایت ہے کہ جب شیخ نورالدین ولی پیدا ہوئے تو کئی دن تک ماں کا یا اور کسی عورت کا دودھ نہیں پیا۔ اتفاقاً للہ عارفہ اُدھر آ پہنچی اور نورالدین ولی کے منہ میں پستان دے کر کہا "چیہ مالیہ چیہ ینہ مندہ چھوک نہ تہ چینہ ژھک مندہ چھان" ترجمہ۔ یعنی پی لے پی تو یہاں آنے سے نہیں شرمایا تو دودھ پینے سے کیوں شرماتا ہے" ان کا یہ کہنا تھا کہ حضرت نورالدین رح نے ان کی چھاتیوں سے دودھ پینا شروع کر دیا۔

شیخ نورالدین ولی چرار شریف میں مدفون ہیں اور آپ کا مزار کشمیر کی مشہور زیارت گاہ ہے۔ ہندوؤں کو بھی آپ سے بڑی عقیدت ہے اور وہ آپ کو نند ریشی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

رُوپہ بھوانی جو الکھ ایشوری کہلاتی ہے نے پنڈت مادھو رام دھر کے ہاں سترہ صدی کے شروع میں جنم لیا۔ عشق حقیقی کی تڑپ سے صحرا نوردی اختیار کی اور ایک دن جب صحرا نوردی کے دوران محمد صادق قلندر ایک مسلمان بزرگ سے ملاقات ہوئی تو ان کی روحانیت کی قایل ہوئی اور ان کی تعریف میں لکھا۔

ہوشم بہ نگاہے برد جانانہ چنیں باید
یک جرعہ حرامم کرد پیمانہ چنیں باید
بیرون و درون من شد صورت او پیدا
در حضرت کفرستان بت خانہ چنیں باید

شاہ غفور کا رجحان بھی صوفیانہ ہے۔ دوئی کو خیرباد کرکے انسان کو روحانی عظمت حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

یُت یتھ زنس کینہ چھنہ لارن ، اتھ وارنا یہ وارن ستو سم سو
برہما مہیش بشن گژھ ہو گارن ؛ شوشکتھ آسی تھہتری زیو
واہ چھی اوتار زاہ نگ نہ تھارن ؛ مہ زن پریزہ لان نارلن چھ
رام رام کرن گو نام سندارن ؛ ورانا یہ وارن سو ہم سو

ترجمہ

یہاں اگر کچھ نہیں حاصل ہونا ہے۔ سوائے اس کے کہ تم خدا کا نام رٹ لوگے۔ برہما، وشن، مہیشر کی تلاش میں لگ جاؤ۔ یہ سنسار کا کھیل ان ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔

انسان کو کبھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ کیونکہ ایشور ہی سب کچھ ہے اور وہ ہی چاند کی طرح تاباں ہو کر راستہ دکھلانے والا ہے۔

رام رام کا جاپ کرنا ہی اپنی زندگی سنوارنا ہے اس لئے تو ہمیشہ اس کی شرن لے اسی کا نام لے۔

اکبر بٹ جو ۱۹۷۳ بکری میں وفات پا چکے ہیں بعض نظموں میں ہندو دھرم کے یوگ اور گیان کے فلسفہ کو بڑے سلیقہ، صفائی اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرتے ہیں ؎ کشمیری

سرہ کرنیہ نوی پان ؛ ٹھاکور وزہ ناو تن
آکاش نترن میان ؛ نربل ناو تراو تن

گُرہ نوکھ سور اشنان ؛ ہیوشِش پُھول ناوتن
ت نگ و دہتھ پھے جان ؛ ٹھاکو روزہ ناوتن

ترجمہ:-
اپنے آپ سے آگاہ ہو اور ٹھاکر جی کو جگا ڈالو۔ آنکھوں کے سامنے سب کچھ آئے گا اگر تم اپنے اندر کی محیط بکراں میں ایشور کے نام کی بنا میں بیٹھو گے۔ گورو کے اُپدیش کے برابر کچھ نہیں ہے۔ اس سے جہالت مٹ کر حقیقت کے پھول کھل جائیں گے سب سے اچھا طریقہ رشیوں منیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ تب ہی ٹھاکر جی کو آسانی سے جگا سکو گے۔

شاعر جلال الدین ہنار ماتھے پر تلک لگاتے تھے۔ دوسری مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ گرنتھ صاحب کا بھی مستقل مطالعہ کرتے تھے۔۔۔ انہوں نے خود فرمایا ہے ؎

کشیری: ملامت ہیتھ جلال الدین ؛ ڈیکس ٹکو عاشقس آئین
درا از زہد و از تقوی ؛ یہ رندی زاہدس نشہ چھا

ترجمہ: جلال الدین کو لوگوں کی ملامت خوش آتی ہے (اس لئے کہ وہ ماتھے پر تلک لگاتا ہے) ماتھے پر تلک لگانا عاشق کا دستور ہے۔ اُسے زہد و تقویٰ سے کیا تعلق؟ زاہد کے پاس یہ رندی کہاں ملے گی۔

کشمیر میں ہندو مسلمان دونوں کس طرح شیر و شکر رہے ہیں۔ اس کا اظہار پیغمبر اسلام کے تئیں ہندو شعراء کے اظہار عقیدت سے بھی ہوتا ہے۔ آنند رام بچاس برس کی عمر پاکر ۱۹۹۶ بکرمی میں سورگباش ہوئے۔ حضرت محمد صلعم کی نعت لکھی ہے۔ نمونہ یہ ہے۔

کشیری:۔ اَزمیہ دادین کردوا ؛ یا محمد مصطفیٰ
یِمُس بوِ اُمت یا اُمید ؛ مہ کرتم نا اُمید

اے مصطفیٰ (آپ پر درود و سلام ہو) میرے تمام امراض کی دوا عنایت کریں۔ میں یہی امید لے کر آپ کے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ لہٰذا مجھے آپ ناامید نہ کریں۔

دوسرے شاعر ست رام بٹ بھی ایک خوش اعتقاد مسلمان کی طرح لکھتے ہیں ؎

ہیتھ ژولم دلبر مہ دل للاؤن میہ تھاونم نارِ عشق
پانہ لاگتھ آو محمدؐ دراوْ دربازارِ عشق
کیا چھُ اوّل کیا چھُ آخر زانٗ تو اسرارِ عشق
پرہوا لاول نُوا لاٰخر چھُو تون انوارِ عشق

ترجمہ:۔ میرے محبوب نے میرا دل مجھ سے چھین لیا ہے۔ اور میرے پاس عشق و محبت کی آگ چھوڑ دی۔ میرے محبوب (یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلعم) بذات خود عشق کے بازار میں تشریف لائے۔

عشق کے اسرار اور بھید یہی ہیں کہ دُنیا وجود میں آنے سے پہلے کیا تھی۔ اور اس کے فنا ہونے کے بعد باقی کیا رہنے والا ہے۔ جس کسی نے اس کی واقفیت حاصل کی۔ گویا اس نے عشق کے راز اور بھید جان لئے۔

عشق کی روشنی سے یہی ظاہر ہے کہ ہر وقت زبان پر یہ الفاظ ہونے چاہئیں کہ وہ یعنی باری تعالیٰ ابتدا میں تھا اور وہی انتہا تک رہنے والا ہے۔

ادب میں ان اشعار کی اہمیت کچھ ہو یا نہ ہو مگر اس سے اس کی عکاسی ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں مذہبی تعصب اور تفرقہ سے لوگ کتنے دُور رہ چکے ہیں اور کس طرح شاعر وسعت قلبی کی تعلیم لوگوں میں پھیلاتے رہے۔

لوگوں کو جس نے اخلاقی تعلیم کی طرف زیادہ رجوع کیا۔ اُن کا نام سوامی پرمانندجی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دین و دھرم سے منہ موڑنے والے انسان ہمیشہ پریشان رہتے ہیں اور آخر جسمانی اور روحانی راحت کھو بیٹھتے ہیں۔

جس شاعر نے لوگوں کو صاف الفاظ میں " دوئی " کو بُرا کہہ کر اس سے گریز کرنے کے لئے کہا ہے۔ ان کا نام مقبول شاہ کرالہ واری ہے۔ انہوں نے کہا ہے۔ کہ 'دوئی' انسان کے لئے موت سے بڑھ کر بھی ظالم ہے۔ جو انسان کو انسانیت سے بھی گرا دیتی ہے اور خاک میں ملا دیتی ہے۔

وطن کی تقسیم اور دردناک المیہ جو آبادی کی تبدیلی کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے آیا۔ اس سے کشمیری عوام کس طرح بے خبر رہ سکتے تھے۔ جب کہ انہیں بھی اس وقت اقتصادی ناکہ بندی سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ مگر اس وقت بھی کشمیری ہندو سکھ مسلمان اکٹھے رہے۔ غلام احمد مہجور جنہوں نے ۶۸ سال کی عمر میں ۹ اپریل ۱۹۵۲ء کو وفات پائی سیکولرازم کے اصولوں کو بلند رکھنے کی تلقین کی۔

نیایِ ترا وِیو مایِ تھاوِیو یا نہ وینْ
پوز محبت باگہ را وِیو یانہ

ترجمہ: جھگڑے اور فسادوں کو خیر باد کہہ دیجئے اور آپس میں سچی محبت پھیلائیے۔ اسی غزل میں مزید کہتے ہیں کہ ہندو جہاں شکر ہیں وہاں مسلمان دودھ ہیں۔ تمہیں چاہئے۔ کہ شکر اور دودھ کو آپس میں ملاؤ اور پھر اس کا مزہ دیکھو۔

کشمیر کے سیکولر روایات کی آبیاری میں یہاں کے ماحول کا بھی ہاتھ ہے۔ یہاں پانی، دودھ اور دوسری ایسی ہی اجناس میں کبھی چھوت چھات نہیں برتی گئی۔ متبرک جگہوں پر مسلمان کا لایا ہوا دودھ ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں پر چڑھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ امرناتھ جی کی گپھا کا علم پہلے پہل ایک مسلمان کو ہی ہوا تھا۔ ان مسلمانوں کے ذات برادری کے لوگوں کو "ملک" (Melek) کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور اب جس دن امرناتھ جی کی یاترا ہوتی ہے اس سے پہلے ہی یہ ملک حضرات عقیدت مندوں کی طرح گپھا میں موجود ہوتے ہیں اور جو بھی چڑھاوا ساون کی پورن ماشی کو گپھا میں چڑھتا ہے اس کا تیسرا حصہ ان ملک حضرات کو بھی ملتا ہے! اور یہ بھی سچ ہے کہ شیخ نورالدین کے مزار پر ہندو بھی جاتے ہیں۔ بابا رشی کی زیارت کرنے والوں میں جو گلمرگ سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ ہندو مسلمان دونوں ہوتے ہیں۔ اسی طرح رشی پیر کی سمادھی بھی ہندو مسلمان دونوں کی زیارت گاہ ہے۔ شاہ ہمدان کے مقبرے کے ساتھ خانقاہ بھی ہے جہاں ہندو مسلمان اپنے اپنے طریقے سے عبادت کرتے ہیں۔ رعنا واری کے مقام پر جو شہر سرینگر سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر ہے میشا صاحب کا مقبرہ ہے۔ اس بزرگ کے عرس کو ہندو مسلمان اکٹھے مناتے ہیں اور سبھی لوگ یک زبان ہو کر "میشا زی پادشاہ" یعنی میشا ہمارا بادشاہ ہے" کہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، مسلمان کے ہاتھ کی بنی ہوئی رکھڑیاں جسے ساون کی پورن ماشی پر باندھتے ہیں یا ہندو عورتوں کی سہاگ کی نشانی جسے "اٹہ ہورو" کہتے ہیں مسلمان ہی بناتے ہیں۔ مسلمان اور ہندوؤں میں اس سے بھی بڑھ کر یگانگت آپ کو تہواروں پر نظر آئے گی جب کہ آپس میں لوگ شیوراتری اور عید پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ہندو اور مسلمانوں کے پوشاک اور زیورات میں بھی یہاں مطابقت ہے وہ فرن ہو یا اس کے ساتھ اندر کا کپڑا "پوژہ" عورتوں کے سر کا کپڑا پوچھ ہو۔ یا زیورات "تالہ رز" "کوڈمرکڑ" وغیرہ

قدیم سیکولر روایات کے پیش نظر آج بھی ہر روز ہاری پربت مسلمان اور ہندو دونوں صبح چار بجے سے جاتے ہوئے ملیں گے۔ ہندو ہاری پربت کے مغرب میں جا کر شاریکا دیوی کے استھان پر جا کر اپنی شردھا کا اظہار کرتے ہیں۔ اور مسلمان شیخ حمزہ سلطان عارفین کے مزار مقدس جو ہاری پربت کے مشرق میں ہے جا کر عقیدت سے مرادیں مانگتے ہیں۔ ویروار کے شب کو بابا رشی اور نورالدین ولی کے مقبروں پر یعنی گلمرگ اور چرار شریف کے مقامات پر ہندو اور مسلمان عورتوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔

ہندو مسلمان بھی آج سے ۴۰ سال پہلے اکٹھے مخدوم شیخ حمزہ سلطان عارفین کی درگاہ میں "نوفل" کرتے تھے۔ نوفل اسی وقت کرتے تھے جب کہ برسات زیادہ ہو یا گرمی زیادہ بڑھ جائے۔ دونوں صورتوں میں فصلوں کو نقصان کا احتمال رہتا ہے۔ نوفل کے موقع پر لوگ شیخ حمزہ کی درگاہ پر جہاں ایک تالاب ہے، اس میں سے برسات زیادہ ہو جائے پر لوگ اس سے پانی نکالتے ہیں اور گرمی ہونے پر اس تالاب میں پانی بھرتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ "نوفل" کرنے کے بعد عام طور پر دھوپ یا بارش جس کی ضرورت لوگوں کو ہوتی تھی ایسا ہی ہو جاتا تھا۔

ہماری آنکھوں کے سامنے آزادی حاصل کرنے کے بعد یعنی پچھلے بائیس برسوں میں جموں و کشمیر کو دو قومی نظریہ رکھنے والوں نے دو بار جنگ میں ڈھکیلنا چاہا مگر دونوں بار یہاں کے لوگوں نے یک جان ہو کر حملہ آور کا مقابلہ کیا۔ اس کی وجہ صرف لوگوں میں قوم پرستی کا جذبہ تھا۔ سیکولرازم کی روایتوں سے پیار تھا۔ اسی لئے جب مہاتما گاندھی کشمیر آئے تو انہوں نے یہ فرمایا۔

"کشمیر میں مجھے روشنی کی کرن نظر آرہی ہے۔ کشمیریوں کا ایک ہی تمدن ہے اور جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں وہ ایک قوم ہیں۔ . . . میں آسانی سے ایک کشمیری ہندو اور ایک کشمیری مسلمان میں تمیز نہ کر سکا۔ بڑا اجتماع جو میں نے دیکھا اس میں میرے لئے یہ جاننا مشکل ہوا کہ کیا یہاں مسلمان کی تعداد زیادہ ہے یا ہندوؤں کی؟"

کشمیریوں نے کبھی دو قومی نظریے کو نہیں مانا ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ "حضرت آدمس اَسِس زہ گبر۔ اک رُٹ اور ین۔ اک رُٹ قبر" (ترجمہ۔ حضرت آدم کے دو فرزند ہیں۔ ایک نے چتا پر جلنے کی خواہش کی اور دوسرے نے قبر میں دفن ہونے کی۔ ان کے درمیان مذہب کا نام پیار اور قوم پرستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے ہندو مسلمان اور سکھ صدیوں سے ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک تصور کرتے ہیں۔ وطن کی بھلائی کو قوم کی بھلائی اور قوم کی بھلائی کو اپنی بھلائی سمجھتے ہیں۔

تبدیلئ قلب کے بعد

ڈاکٹر! تو نے میرے سینہ میں
کس کا دل دفن کر دیا ظالم!
دھڑکنیں روح کے اُجالے میں
ڈگمگاتی ہوئی بھٹکتی ہیں
سانس پیلو بجا کے چلتی ہے
نبض خاموش لیٹی رہتی ہے

آنکھ تکتی ہے شاہراہوں کو
در کو، دیوار کو خلاؤں کو
ڈھونڈتی ہے زمیں سے تاروں تک
اپنی کھوئی ہوئی نگاہوں کو
سینہ ساکت کھڑا ہے مثلِ مزار
ذہن بے داغ ہے کفن کی طرح

بات سنتا ہوں بات کرتا ہوں
بھوک لگتی ہے کھانا کھاتا ہوں
شکل شیشہ میں دیکھنے میں مگر
عکس کچھ اجنبی سا لگتا ہے
میں وہی ہوں یا اور کوئی ہوں
کچھ گماں کچھ یقیں سا لگتا ہے

آہ! کیا بے بسی کا عالم ہے
آج غم بھی شریکِ غم نہ رہا
آرزوؤں کے ہاتھ چھوٹ گئے
ساری یادوں کے پاؤں ٹوٹ گئے
طاقِ نسیاں میں چھپ گئے ارماں
خودکشی کرکے درد ٹال گیا

اُف! یہ بے چارگی، کہ وحشت میں
سونا چاہوں تو سو نہیں سکتا
کیسی آفت ہے، کیا مصیبت ہے
رونا چاہوں تو رو نہیں سکتا
کس کا دل ہے کہ اس کے مرقد کو
اشک کے پھول بھی نصیب نہیں!

ڈاکٹر! تو نے میرے سینہ میں
کس کا دل دفن کر دیا ظالم

انعام صدیقی

ایک منظر
ایک مستقبل

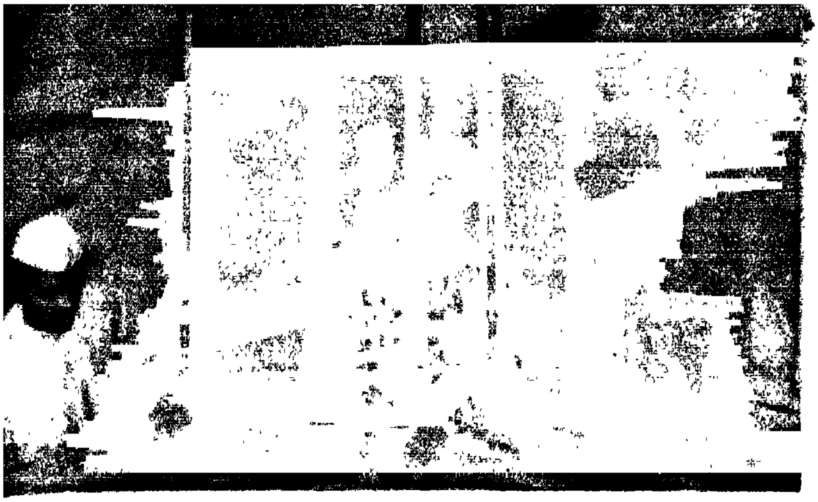
قطب سرشار

ناگ ارجن ساگر ڈیم (آندھرا پردیش) پر ایک مقام "پائلان" ہے۔ جہاں سے رات کے وقت ڈیم کے دونوں جانب کا دلکش منظر خوابِ نہرو کی تعبیر اور بھارت کے خوبصورت مستقبل کا خوش آیند تصور بخشتا ہے۔ ذیل کی نظم اسی تاثر کی ترجمان اور منظر کی عکاسی کرتی ہے۔

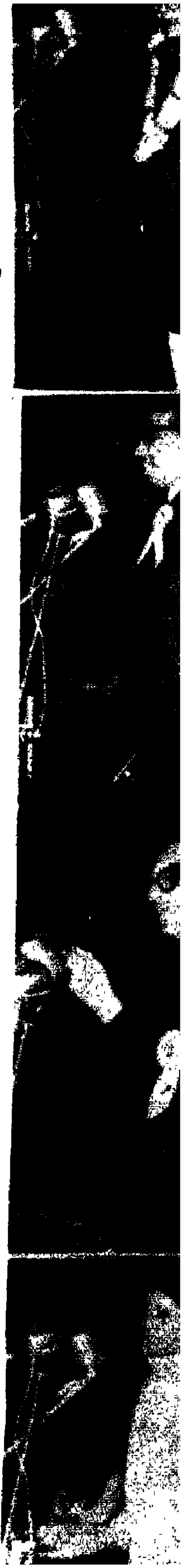
قطب سرشار

شب کی آغوش میں
سینۂ ارض پر
بند کے دونوں جانب اِدھر اور اُدھر
اُونچے ٹیلوں پہ پھیلی ہوئی بستیاں
غرق ہیں تیرگی کے سمندر میں سب
جگنوؤں کی طرح
جھلملاتی ہوئی زرد رو بتیاں
جیسے آئینۂ بحرِ ظلمت کی شفاف سی سطح پر
جگمگاتا ہوا سایۂ کہکشاں
جیسے روشن ہوا بختِ ہندوستاں
نور افزا ستاروں کا دلکش سماں
جن سے ملتی رہے گی ضیائے بقا
خوابِ نہرو کو مستقبلِ ہند کو

جھلکیاں



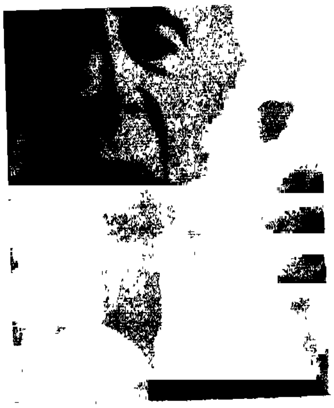
مشہور جادوگر پی سی سرکار کو عالمی شہرت حاصل ہے اور وہ دُنیا کے متعدد ممالک میں ا
کا مظاہرہ کر کے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ گزشتہ دنوں آپ نے پہلی بار نئی د
کمالات دکھائے۔ اُن کا سب سے حیرت انگیز کھیل یہ ہے کہ وہ مشینی آرے سے ایک
جسم کے دو حصے کر دیتے ہیں اور پھر اُسے جوڑ دیتے ہیں (دیکھئے تصویر)



۲۴ جنوری ۱۹۷۰ء کو دہلی کے لال قلعہ میں مشاعرہ جشنِ جمہوریت منعقد ہوا جس کا افتتاح جناب فراق گورکھپوری نے کیا اور صدارت دہلی کے چیف ایگزیکٹیو کونسلر شری وجے کمار ملہوترہ نے کی۔ اس میں ہندوستان کے ۴۳ نامور شعراء نے حصہ لیا۔ تصاویر (اوپر سے نیچے) فراق گورکھپوری، جگن ناتھ آزاد، غلام ربانی تاباں اور مینا قاضی اپنا کلام سناتے ہوئے۔



۱۹ فروری ۱۹۷۰ء کو محکمہ ڈاک و تار نے اُردو، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت کے ممتاز پبلشر
عالم منشی نول کشور کی یاد میں سرخ و بادامی رنگ کے ڈاک ٹکٹ جاری کئے۔ منشی صاحب ۳
۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۸۵ء میں انہوں نے اپنا مشہور مطبع نولکشور پریس اور
لکھنؤ میں قائم کیا جس کی شاخیں کانپور، پٹیالہ، اور لندن تک پھیل گئیں۔ انہوں نے فارسی
اور سنسکرت کی قلمی کتابیں فراہم کیں اور اپنی زندگی میں چار ہزار کے قریب کتابیں شائع کیں
انہوں نے اسلام کی اہم مذہبی کتابوں کا سنسکرت اور ہندی میں اور ہندوؤں کی مقدس
کا اُردو اور فارسی میں ترجمہ شائع کیا۔







چار مہینے کے دورے کے بعد خان عبدالغفار خاں ۸ فروری ۱۹۷۰ء کو
ہندوستان سے کابل کے لئے روانہ ہو گئے۔

۲ فروری ۱۹۷۰ء کو ۹۷ برس کی عمر میں امن عالم کے عظ
ممتاز ریاضی داں، نامور فلسفی و مفکر اور انسان دوسہ
برٹرینڈ رسل کا انتقال ہوگیا۔ وہ انفرادی آزادی کے زبر
حامی اور مبلغ تھے اور انہوں نے ہندوستان کی آزادی م
دلچسپی لی تھی۔ وہ جنگ و جدل کے سخت مخالف تھے جب
جنگ عظیم کے دوران ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرے ا
خلاف سب سے پہلے انہوں نے ہی آواز بلند کی اور مظا
کئے۔ انہوں نے امن فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی اور مہلک ہ
کے خلاف فضا پیدا کی۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف ت
کی آخری تصنیف اُن کی خود نوشت سوانح عمری تھی جس
جلد حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔



کستوربا گاندھی (۱۸۶۹-۱۹۴۴ء)

۱۲ فروری کو ہر سال کستوربا کی برسی منائی
جاتی ہے! اس تاریخ کو یوم مادر کی حیثیت
سے بھی منایا جاتا ہے اسی تاریخ کو
گاندھی صدی کی تقریبات ختم ہوگئیں۔

جنوری ۱۹۷۰ء کو ممتاز صحافی اور مصنف
فشر ۷۴ برس کی عمر میں امریکہ میں ہیکنس سیک
جرسی) کے مقام پر انتقال کر گئے۔
وئی فشر کو ہندوستان اور سوویت رُوس
بے حد دلچسپی تھی وہ ایک آزاد صحافی کی
یت سے لگ بھگ ۱۴ برس تک رُوس میں مقیم
ہے اور وہ روسی معاملات کے ماہر سمجھے جاتے
تھے۔ انہوں نے لینن کی سوانح عمری لکھی تھی جس پر
نہیں نیشنل ایوارڈ ملا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران
ئی فشر نے کئی سال ہندوستان میں گزارے۔ وہ
اندھی جی سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے گاندھی
ی کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی جسے عالمی شہرت
حاصل ہوئی۔ انہوں نے روسی اور ایشائی م
وضوعات پر تقریباً ۲۰ کتابیں لکھی ہیں۔



رُوسی انقلاب کے عظیم
سوویت ریاست کے
جن کا صد سالہ یوم
۲۲ اپریل ۱۹۷۰ء کو
ہے۔



یوم جمہوریہ کے موقع پر مختلف شعبوں
میں ممتاز افراد کو قومی اعزازات
دیئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔
مصنفوں اور شاعروں میں ڈاکٹر
تاراچند کو پدم وبھوشن ڈاکٹر
عبداللطیف اور یش پال کو پدم بھوشن
اور سید مسعود حسن رضوی اور سکندر علی
وجد کو پدم شری کا اعزاز دیا گیا ہے۔

شفق سہسرامی

دھواں



گاؤں کے اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔

شہر میں سب کچھ آسانی سے مل جاتا ہے نہیں ملتا تو ایک رہنے کا مکان لیکن میرے رہنے کا مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا، اس طرح جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ مرزا ارشد صاحب سے میرے والد کے دیرینہ تعلقات بلکہ یوں کہئے' دانت کاٹی روٹی، تھی۔ دونوں کا بچپن ساتھ ہی گزرا تھا۔ دونوں نے ساتھ ہی باغوں سے پھل چرائے تھے، ندی میں تیرے اور بلند سے بلند درختوں کی چوٹیاں سر کی تھیں پھر وہ جوان ہوئے تو دونوں کی برات بھی ایک ہی دن آئی تھی۔ لیکن اچانک وقت نے کروٹ بدلی اور حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ زمینداری ختم ہو گئی، زمیندار صاحب کا انتقال ہو گیا، باقی بچی جائیداد کے لئے زمیندار کے دونوں بیٹوں میں اختلاف ہوا۔ مرزا ارشد کے بڑے بھائی ماجد اس بٹوارے کے حق میں تھے اور بٹوارہ کرا کے چھوڑا۔

اس بٹوارے سے مرزا ارشد کو دلی تکلیف پہنچی، ان کا دل ٹوٹ گیا اس لئے انہوں نے اپنی زمین میرے والد کے ہاتھ فروخت کر دی اور شہر چلے گئے، وہاں انہوں نے ایک مکان خریدا اور پارچون کی دوکان کھول لی۔

جس وقت کی یہ بات ہے اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اس لئے مجھے ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ ہاں مرزا ارشد کا تذکرہ میں اپنے والد کے منہ سے اکثر سنا کرتا تھا۔ جب کالج میں داخلہ لینا ہوا تو پھر اُن کا نام آیا اور مجھے اُن کے متعلق اتنی واقفیت ہوئی۔ وہ گاؤں چھوڑ گئے تو پھر پلٹ کر گاؤں کا رُخ ہی نہیں کیا تھا اس لئے مجھے اُن کی شکل و صورت بھی نہیں یاد تھی۔

جب میں اپنے والد کا تعارفی خط لے کر اُن کی دوکان پر پہنچا تو وہ گاہکوں میں اُلجھے ہوئے تھے مجھے بھی انہوں نے گاہک ہی سمجھا۔ "کیا چاہئے جناب آپ کو ؟"

میں نے خط اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے ایک نظر حیرت سے مجھ پر ڈالی پھر خط پڑھنے لگے۔ پڑھتے پڑھتے اُن کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا اور پھر انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ مجھے اپنے برابر بٹھا کر گاؤں کا حال چال پوچھنے لگے "یہ بتاؤ نعیم میاں کیسے ہیں؟ صحت کیسی ہے؟ دانت وانت سلامت ہیں یا ؟"

"جی نہیں، ابھی تو اُن کے سارے دانت سلامت ہیں۔ بغیر چشمے کے آسانی سے لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو میں نے کبھی اُن کی طبیعت خراب ہوتے دیکھی ہی نہیں، میرے سر میں درد ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں، کیسے جوان ہو میاں مجھے دیکھو ساٹھ برس کا ہونے کو آیا لیکن کچا چنا چبا کر کھاتا ہوں اور کبھی تم نے مجھے بیمار دیکھا؟"

"خوش قسمت ہیں وہ" مرزا صاحب نے ٹھنڈی سانس لی، "ایک مجھے دیکھو میں انہیں کا ساتھی ہوں جس وقت شہر آیا تھا صحت اتنی شاندار تھی کہ چلتا تو زمین کا سینہ دہل جاتا لیکن شہر کی زہریلی فضا نے میرا سب کچھ چھین لیا، دانت جھڑ گئے، بالوں میں سفیدی آ گئی، آنکھ پر چشمہ چڑھ گیا اور پیٹ گیس کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ سمجھ لو ڈاکٹری کی دوا کے سہارے جی رہا ہوں۔ خیر باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آؤ چلو تمہارے رہنے کا انتظام کر دوں۔"

یہ تھی میری اُن سے پہلی ملاقات، مجھے اُن کے مکان میں رہنے کو باہری کمرہ مل گیا کھانا بھی انہیں کے یہاں سے آنے لگا۔ پھر مجھے اور باتوں کا علم ہوا جس کا علم والد صاحب کو بھی نہیں تھا۔

مرزا صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے دوسری شادی ایک کنواری لڑکی سے کرلی تھی۔ پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکی زرینہ تھی جس کی عمر پندرہ برس ہونے کو آئی تھی بلور والی چوڑیوں جیسا حسن رکھنے والی کھلی کلی، جس کی خوشبو سے سارا محلہ مہکنے والا تھا۔ اس نے ساتویں جماعت تک اسکول میں تعلیم حاصل کی، پھر مرزا صاحب نے آگے پڑھنے نہ دیا۔

"کون سا لڑکی سے نوکری کرانی ہے؟"

زرینہ نے خوب ہاتھ پاؤں مارا۔ خوب ضد کی۔ لیکن مرزا صاحب کے سامنے ایک نہ چلی اور رو دھو کر چپ بیٹھ رہی۔ بیگم صاحبہ بھی تعلیم کے حق میں تھیں اس لئے جب میں آیا تو ایک بار پھر زرینہ کی تعلیم پر باتیں ہونے لگیں۔

لڑکیوں کے لئے تعلیم ضروری ہے۔ محلے کی سب لڑکیاں اسکول جاتی ہیں۔ اُن کی مائیں کتنے فخر سے کہتی ہیں۔ میری بیٹی خیر سے میٹرک میں پڑھ رہی ہے اور میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ جب وہ پوچھتی ہیں، زرینہ کس کلاس میں پڑھتی ہے؟ اے بہن تم نے اس کا پڑھنا کیوں چھوڑا دیا۔ بڑا خراب زمانہ آگیا ہے۔ جاہل لڑکی کو بر ملنا بہت مشکل ہے بیگم تم آج کی خرابیوں سے واقف نہیں ہو" مرزا صاحب نے سمجھانا چاہا۔" اسکولوں میں تعلیم تو خیر کیا دی جاتی ہے، لڑکیاں صرف فلموں کی، ناولوں کی اور ایک دوسرے کے عشق کی باتیں کرتی ہیں۔ پھر وہ یہی کیڑا لے کر گھر آتی ہیں اور کسی قریبی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگتی ہیں۔ یہ بڑھتی ہوئی عریانی، فحاشی سب اسی تعلیم کی دین ہے۔"

" یہ آپ کیسے کہتے ہیں میں بھی تو اسی زمانے کی لڑکی ہوں اور میں نے بھی اسکول سے میٹرک پاس کیا ہے تو پھر میں بھی آپ کی نظر میں آوارہ ہوں گی"

بیگم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

" نہیں بیگم تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو تمہارے متعلق میں اپنے دل میں اس طرح کا خیال لا ہی نہیں سکتا مجھے اس پر حیرت ہے کہ اس زمانے کی لڑکی اتنی سمجھدار اور نیک کیسے ہے۔ ہر جگہ اچھے اور برے دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن باتیں اکثریت کی جاتی ہیں۔ تم نے چار پانچ سال پہلے میٹرک پاس کیا تھا اس وقت حالات اتنے خراب نہیں تھے روز بروز معاشرے کی خرابی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ پھر تعلیم ڈگری کا نام تو نہیں۔ علم دراصل کسی چیز کے مطالعے کا نام ہے اور مطالعے کے لئے ڈگری کی قید نہیں۔ علم کا بحر بیکراں ہے ڈگریاں اس کا احاطہ کر ہی نہیں سکتیں۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ زرینہ پڑھے اور خوب پڑھے لیکن بھئی میں اسکول کی تعلیم کے حق میں نہیں ہوں۔

" میں تو صرف زرینہ کو پڑھانا چاہتی ہوں۔ بیگم نے کہا۔ خواہ جیسے بھی ہو آپ کو اسکول سے چڑ ہے۔ اگر یہ پرائیویٹ پڑھ کر امتحان دے تو آپ کو اعتراض نہ ہوگا۔؟"

اعتراض کیوں ہونے لگا لیکن یہی میں سوچتا ہوں کہ اسے گھر پر پڑھائے گا کون؟ مجھے کوئی مناسب آدمی نظر نہیں آتا اور جوان ماسٹر رکھنے سے وہی خطرہ ہے جس کا ڈر اسکول میں ہے۔"

" ماسٹر ڈھونڈھنے کی ضرورت ہی کیا ہے کلیم میاں ماشاءاللہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ پھر وہ غیر بھی نہیں، بقول آپ کے وہ آپ کے جگری دوست کے لڑکے ہیں کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتے؟"

" میں زرینہ کو اس کے سامنے بھی نہیں کرانا چاہتا بیگم، پڑھوانا تو الگ بات ہے۔؟"

" کیا وہ اچھا لڑکا نہیں ہے؟ بیگم نے حیرت سے پوچھا "میں نے ایک جھلک دیکھی ہے، صورت شکل سے تو بہت نیک معلوم ہوتا ہے" "تم نہیں سمجھو گی۔ دراصل جب پہلی بار میں نے کلیم میاں کو دیکھا تو میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ اس دور میں اچھا لڑکا ڈھونڈھنا پتھر سے پانی نکالنے کے برابر ہے۔ اور زرینہ ماشاءاللہ سیانی ہو گئی ہے۔

" ارے میں نے تو اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا" بیگم کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، یہ بہت اچھا ہوگا ہم ایک بڑی فکر سے بچ جائیں گے لیکن جب آپ یہ سوچ رہے ہیں تو پھر سامنے کرانے میں کیا حرج ہے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پسند کریں، ایک دوسرے کے مزاج وغیرہ سے واقف ہو جائیں تو اور اچھا ہے۔

" بیگم آئندہ تم ایسی بات نہیں کرو گی" مرزا صاحب کے چہرے پر خون چھلکنے لگا "میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں، میری رگوں میں ایک غیور خاندان کا خون دوڑ رہا ہے۔ ہمارے یہاں یہ بات عیب سمجھی جاتی ہے پھر اگر دونوں ساتھ رہے اور کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو؟ میں نے خیال ظاہر کیا اور تم نے بس سمجھ لیا۔ یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نعیم میاں نے رشتہ کہیں اور طے کر رکھا ہے، وہ کیا سوچیں گے میرے بیٹے کو پھانس لیا ہے۔ اس لئے اسے وقت پر چھوڑ دو"

"اللہ مالک ہے"

پھر بات اُس دن ختم ہوگئی اور ماحول پُرسکون ہوگیا لیکن میرے دل میں زرینہ کو دیکھنے کی تمنا انگڑائی لینے لگی۔ میں نے کئی بار پردے کے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس کیا۔ اکثر دو آنکھیں مجھے اپنے جسم میں چبھتی محسوس ہوتیں لیکن کبھی میں انہیں دیکھ نہ سکا۔

نصیبن بوا میرے کمرے میں کھانا پہنچا دیتی تھیں۔

مجھے وہاں رہتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک دن جب کالج سے واپس آیا تو گھر میں چہل پہل محسوس کی۔ دروازے پر اگربتی جل رہی تھی۔ لوبان کی مہک بھی آرہی تھی۔ میں نے سمجھا شاید میلاد ہے لیکن یونہی سان و گمان میلاد کیسے ہو سکتا ہے۔ میں کسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ نصیبن بوا باہر سے آتی نظر آئیں۔ اُن کے ہاتھ میں پھولوں کی دو کرسی اور کچھ پھول تھے۔

"کیا بات ہے بوا؟" میں نے پھول کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"اے بابو آج جمعرات ہے نا؟"

"اچھا تو جمعرات ہونا بہت بڑی بات ہے کیا؟" میں نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں پوچھا۔

"تم نہیں جانتے بیگم صاحبہ پر ہر جمعرات کو جنات صاحب آتے ہیں" وہ رازدارانہ انداز میں بولیں اور میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ہنسو مت بابو۔ وہ خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ تم نئے زمانے کے لڑکے اِن باتوں پر یقین نہیں رکھتے لیکن تم بیگم صاحبہ کو اُس وقت دیکھو تو کہو، آنکھیں لال انگارہ ہو جاتی ہیں، چہرے پر خوب جلال آجاتا ہے" آواز بدل جاتی ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا بدن اینٹھ جاتا ہے، دانت جم جاتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں"

پھر انہیں ہوش کیسے آتا ہے؟ ڈاکٹر کو بلایا جاتا ہے یا۔۔۔؟

تم بھی بڑے بے وقوف ہو، جس پر جنات صاحب آئیں اُسے ڈاکٹر موا کیا اچھا کر سکتا ہے، اُس وقت کہیں پہنچے ہوئے مولوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ درگاہ کے بڑے مولوی آتے ہیں گھنٹوں عمل کرتے ہیں۔۔۔ جب جنات صاحب خوش ہو جاتے ہیں تو بیگم صاحبہ کو ہوش آجاتا ہے۔"

مجھے اس اطلاع پر بہت حیرت ہوئی۔ میں نے جنات کے بارے میں سُنا ضرور تھا لیکن میرے گاؤں میں کبھی اس طرح کی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں اُسے گپ سمجھتا تھا لیکن نصیبن بوا کے منہ سے یہ سُن کر تعجب ہوا۔

"یہ جنات کب سے بیگم صاحبہ پر آرہے ہیں؟"

"ادب سے نام لو بابو" وہ لرز کر بولیں۔ "وہ ہوا بیار سب کچھ سُن لیتے ہیں۔ خدا سب کو اُن کے غصے سے بچائے جس پر خفا ہو جائیں اُسے نیست و نابود کرکے چھوڑتے ہیں جمعرات کے دن صبح سے بیگم صاحبہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتیں۔ غسل کرکے عطر لگا کر بیٹھی پڑھتی رہتی ہیں۔ ہم لوگوں کو کمرے کی طرف جانے کی اجازت نہیں ہے اور بابو میں تو ڈر سے اپنے کمرے میں چھپ جاتی ہوں اور زرینہ بی بی کو بھی کہتی ہوں کہ آپ بھی چھپ جائیے۔ جوان جہان اور چندے آفتاب اور چندے مہتاب ہیں اگر آپ جنات کی نظر پڑ گئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ مگر وہ بھی آپ کی طرح ہنستی ہیں جب جنات صاحب آجاتے ہیں تو وہ دروازے کی جھری سے جھانکتی بھی ہیں اور۔۔۔

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ کب سے آرہے ہیں" نصیبن بوا کو تفصیل میں جاتے دیکھ کر میں نے کاٹ دی۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ بیگم صاحبہ کے بیاہ کو دو سال ہوئے ہیں۔ اور مجھے یہاں آئے صرف چھ مہینے، لیکن میں نے سُنا ہے بیگم پر کنوارے پنے ہی سے جنات کا سایہ ہے۔ دراصل یہ بچھڑا اُن کا خاندانی ہے سنتی ہوں اُن کی ماں پر بھی آتے ہیں۔ اللہ بچائے سب کو" نصیبن بوا کے جانے کے بعد میں لباس تبدیل کرنے لگا لیکن میرا ذہن اس میں اُلجھا رہا۔ پھر میں نے ایک ہٹے کٹے مولوی کو دیکھا جو اندر تشریف لے گئے۔ پھر ایک گھنٹہ بعد وہ چلے گئے تو گھر میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ بیگم اور نصیبن بوا کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں پھر میرا ناشتہ بھی آگیا۔

اُس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی کئی طرح کے خیالات ذہن میں گھومتے رہے۔ صبح میں نے مرزا صاحب سے اس سلسلے میں گفتگو کی "میرا خیال ہے چچی صاحبہ بیمار ہیں۔ اُن پر کوئی اعصابی دورہ پڑتا ہے۔ آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔ ان مولویوں کے چکر میں نہ پڑیے، اُن کی روزی ہی اس طرح بھولے لوگوں کو بیوقوف بنا کر چلتی ہے"

"میں نے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ علاج کرتے کرتے تھک گیا لیکن دورہ نہ تھما پھر کیا کروں؟" اُن کے چہرے پر اُداسی چھاگئی۔

"میں خود جنات وغیرہ پر اعتقاد نہیں رکھتا اور تمہاری چچی بھی نئی روشنی کی تعلیم یافتہ عورت ہیں۔ توہم پرست نہیں لیکن۔۔۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہوگئے۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے شبہے کا اظہار کیا۔ "سُنا ہے چچی صاحبہ کی یہ خاندانی مرض ہے۔ اُن کی والدہ کے سر پر بھی سایہ تھا۔ مجھے ڈر ہے کہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے زرینہ پر بھی۔۔۔"

میں نے جملہ مکمل نہ کیا لیکن مرزا صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"میں کیا کروں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ بے بسی سے بولے" لیکن زرینہ کہاں دوسری تھیں اس لئے اسے کوئی خطرہ نہیں ہے" پھر انہوں نے اپنے جملے کا ردعمل میرے چہرے پر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

کئی دن گزر گئے لیکن میرے ذہن سے یہ بات نہ نکلی، لیکن میرے ذہن پر ایک انجانا سا خوف مسلط ہو گیا تھا۔ یہ جنات مجھے کسی بڑے طوفان کا پتہ دے رہا تھا جب بھی میں گھر آتا عجیب طرح کا احساس ہوتا۔ جیسے مرے دل سے آواز آتی بھاگ چلو یہاں رہنا ٹھیک نہیں میں نے اپنے ایک دوست سے گھر کے لئے کہا۔ وہ اپنا کمرہ دینے کو تیار ہو گیا تو میں نے مرزا صاحب سے کہا،

"چچا جان! میں نے ایک دوست کے یہاں رہنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ آپ نے کچھ کہا تو نہیں۔ . . . لیکن پھر بھی میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے یہاں رہنے کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ کے بیٹے کا کمرہ میں نے ہتھیا لیا ہے پھر ابا جان نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہیں رہ جانا۔

مرزا صاحب چپ چاپ سنتے رہے۔

"تمہارے منہ سے غیریت کی بات سن کر مجھے دلی تکلیف پہنچی ہے بیٹے۔ تم اس رشتے کو نہیں جانتے جو میرے اور نعیم کے درمیان ہے۔ اگر میرا بیٹا نعیم سے یہی بات کہتا تو اُسے اور زیادہ تکلیف ہوتی" اُن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں تو پھر مجھ سے اور کچھ نہ کہا گیا لیکن میرے دل کی دھڑکن روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک بے نام خوف میرے ذہن و دل پر مسلط تھا۔

اور پھر طوفان آ ہی گیا۔

ایک شام جب میں کالج سے واپس آیا تو گھر میں بہت شور و ہنگامہ تھا۔ میں گھبرا کر زنجیر بجانے لگا۔ نصیبن بوا گھبرائی ہوئی باہر نکل آئیں۔

"کیا بات ہے بوا؟ یہ ہنگامہ کیسا ہے؟"

"کیا بتاؤں بابو، وہی ہوا جس سے میں ڈرتی تھی" نصیبن بوا کا چہرہ خوف سے زرد تھا۔ "میں زرینہ بی بی کو منع کرتی تھی، جنات صاحب آئیں تو تم اس طرف نہ جایا کرو لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی اور اُن پر بھی جنات کا سایہ ہو گیا۔ وہ بھی بیٹھی بیٹھی پہلے تو بڑبڑانے لگیں پھر بے ہوش ہو گئیں ہیں۔

"پھر مولوی صاحب کو کیوں نہیں بلایا جاتا" میں نے سمجھا گھبراہٹ میں مولوی صاحب کو بھول بیٹھے ہیں۔ اس لئے میں نے یاد دلایا" میں بھی بیگم صاحبہ سے یہی کہہ رہی ہوں لیکن وہ بہت غصے میں ہیں۔ کہتی ہیں۔ مرے تو مر جائے لیکن مولوی صاحب نہیں آئیں گے کبھی نہیں —— !!"

آج کل دہلی۔

غزلیں

صحرا میں ہر طرف ہے وہی شورِ العطش!
دریا کا رُخ بدل نہ سکے لوگ آخرش

بانٹے گئے ہیں ایک خطِ مستقیم پر
یکساں ہیں اب نظر میں ہماری جہاتِ شش

رُخ سے حقیقتوں کے حجابات اٹھ گئے
اب اعتبارِ دید پہ کھائیگا کون غش؟

وہ اختیار و جبر کی صورت نہیں رہی
دل سے نکل چکا ہے ہر اک تیرِ نیم کش

اے آفتابِ صبحِ فراغت ادھر کہاں
ہم لوگ پی رہے ہیں ابھی زہرِ کش مکش

حامدؔ حریمِ ذات میں خود اپنی دیکھئے
آخر چھپا ہوا ہے یہاں کون برق وش

حامد حسین حامدؔ

الفاظ فارسی کے سمندر میں غرق تھے
تنہائیوں کے زہر کو ہم کیسے بانٹتے

بے فائدہ کسی کے لئے اپنی جان دے
کس کو یہاں پڑی ہے کہ وہ کوہ کن بنے

اپنی تلاش اپنے توسط سے کیجیے
اپنا سراغ کس کو ملا ہے کتاب سے

ویرانے ہر جگہ پہ مرے ہم رکاب تھے
صحرا چھٹا تو شہر میں آباد ہو گئے!

ہم تھک تھکا کے پاس کے جنگل میں سو گئے
بیتے ہوئے دنوں کو کہاں تک پکارتے

شہرت کے بھوت ناچ رہے ہیں گلی گلی
دل کہہ رہا ہے تو بھی انہیں فن کی داد دے

حامدؔ غزل کی شکل بدلنے کے بعد بھی
تجھ کو یہ فکر کیوں کہ ہر اک اس پہ سر دھنے

محمد عبد الحلیم

ناطق گلاؤٹھوی

مرزا داغ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے اب صرف ایک مولانا ناطق گلاؤٹھی اور دوسرے حضرت جوش ملسیانی ہی باقی رہ گئے تھے۔ افسوس کہ ۲۷ مئی ۱۹۶۹ء بمطابق ۱۰ ربیع الاول ۱۳۸۹ھ ناطق صاحب نے بھی اس دارِ جہاں فانی کو خیرباد کہدیا ؎

سُن لے کہ جا رہا ہوں اب اپنی خبر کو میں
اے زندگی سلام گیا عمر بھر کو میں ! ناطقؔ

مولانا کی ذاتِ گرامی دلی کے دبستانِ شاعری کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُن کی اُستادانہ عظمت ہندو پاک میں مسلّم اور اُن کی آراء ادبی وشعری مباحث میں مستند مانی جاتی تھیں۔ مرزا داغ کے تمام سربرآوردہ شاگردانِ رشید اُنہیں اپنا خواجہ تاش بھائی کہتے تھے اور خاندانِ داغ کا ایک اہم ستون سمجھتے تھے۔ مرحوم نے ۸۳ سال کی عمر پائی اور کم وبیش ستر سال اُردو ادب کی خدمت کی۔

مرحوم سے میرے تعلقات گزشتہ ۱۱ سال سے قائم تھے۔ میں نے اس گیارہ سال کی مدت میں ان کے عادات وخصائل، حسنِ اخلاق اور اوصافِ حمیدہ کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایک عظیم المرتبت اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ میرے لئے یہ بات مایۂ ناز ہے کہ مولانا تا دمِ زیست مجھے اپنا ایک عزیز سمجھ کر مجھ پر بے حد شفقت اور اعتماد فرماتے رہے۔ پہلی ملاقات کا شرف محترمی محمد حنیف صاحب فاتح، ریسرچ اسکالر ناگپور یونیورسٹی کے توسط سے بھائی عبدالسلام صاحب کی معیت میں مئی ۱۹۵۸ء میں حاصل ہوا۔ میرا یہ معمول تھا کہ ہر اتوار اور تعطیل کے دن بلاناغہ ان کے مکان پر حاضری دیتا۔ یہ مرحوم کا بزرگانہ کرم تھا کہ وہ مجھ ناچیز کو اپنا امینِ ادب اور معینِ ادب سمجھتے تھے اور اپنے تمام ادبی اور شعری سرمائے کا مجھے مالک بنا دیا تھا۔

مولانا مرحوم کے محاسن شاعری اور کمالاتِ فن پر روشنی ڈالنا بوجہ کم مائگی میرے بس کی بات نہیں اور نہ اُن کی اُستادانہ عظمت مجھ جیسے شخص کے تعارف کی محتاج ہے۔ میں یہاں ناظرین کرام کی معلومات کے لئے اُن کے حالاتِ زندگی پیش کرتا ہوں جن سے بہت سے اربابِ علم وادب ناواقف ہیں۔ سب سے پہلے ان کی سرگزشت خود اُن ہی کی زبانی سنئے۔

حسب ونسب وخاندانی حالات :-

"میرا نام ابوالحسن اور تخلص ناطقؔ ہے۔ والد صاحب کا اسم گرامی ظہیرالدین تھا۔ وطن مالوف قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر ہے۔ ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ء کو



ناطقؔ گلاؤٹھوی اور مضمون نگار

کامٹی میں جو شہر ناگپور سے تقریباً ۹ میل کے فاصلے پر ہے، میری پیدائش ہوئی۔ سلسلۂ نسب سادات گیلان سے ملتا ہے۔ میرے ساتویں پشت کے دادا مولانا سید منہاج الدین صاحب احمد شاہ ابدالی کی فوج میں سپہ سالار کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ میرے دادا جن کا نام سید غلام غوث تھا، میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ میری ننہال قصبہ اُدن ضلع میرٹھ میں تھی۔ میرے والد صاحب کے چھ بھائی اور تھے، میرے والد صاحب سب سے چھوٹے تھے۔ میرے سب سے بڑے تایا سید فیض الحسن صاحب نے بہاولپور کی ریاست میں وزیر اعظم اور چیف جسٹس کی حیثیت سے ملازمت کرتے

ہوئے انتقال کیا۔ وہ ایک زبردست عالم، ادیب، اور شاعر تھے مگر ان کے صاحبزادے نے اُن کا سب کچھ برباد کردیا۔ دوسرے تایا سید تاج الدین صاحب پنجاب میں تحصیلداری کرتے ہوئے مرے، تیسرے تایا سید عبداللہ صاحب گلاؤٹھی میں رہتے تھے اور جدی جائداد کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ انہوں نے گلاؤٹھی ہی میں وفات پائی۔ چوتھے تایا سید عنایت اللہ صاحب کو اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں حکومت برطانیہ نے پھانسی دیدی اور اس سلسلے میں تمام جدی جائداد بھی جس میں تقریباً نصف گلاؤٹھی اور دو مواضعات تھے سب ضبط کر لیے۔ عنایت اللہ صاحب کو پھانسی کی سزا ہونے سے میرے پانچویں تایا سید نعیم الدین صاحب اپنے باقی دو چھوٹے بھائیوں سید وحید الدین اور سید ظہور الدین کو لے کر پا پیادہ گلاؤٹھی سے چل کر مصیبتیں اٹھاتے ہوئے بھنڈارہ پہنچے اور وہاں اپنے ایک خالہ زاد بھائی کے مکان میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہونے تک چھپے رہے۔ اس وقت نعیم الدین صاحب کی عمر چودہ سال، وحید الدین صاحب کی دس سال اور میرے والد صاحب (ظہور الدین) کی صرف سات سال تھی۔ میرے تایا زاد بھائی ڈاکٹر ایس، ایم حسن (مرحوم) سابق ہیلتھ منسٹر مدھیہ پردیش نعیم الدین صاحب ہی کے بیٹے تھے۔

میرا ایک ہی بھائی تھا سید حسن نامی جو مجھ سے آٹھ سال چھوٹا تھا۔ تعلیم سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی، اُس نے مکتب فارسی سے آگے نہیں پڑھا۔ شاعری بھی اس نے شروع کی تھی اور چل نکلا تھا مگر ۱۹۲۵ء میں طاعون کے کچھ بیمار مریضوں کی تیمارداری میں بد احتیاطی سے کام لیا اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر گلاؤٹھی میں انتقال کر گیا۔ بہنیں چار تھیں جن میں سے تین عرصہ ہوا مر چکیں۔ اور ایک لاولد بیوہ بہن ابھی زندہ ہیں اور گلاؤٹھی میں رہتی ہیں۔ یہ بات بتانے سے رہ گئی کہ میرے والد محترم لے جو رائے پور میں جہاں وہ لکڑی کی تجارت کرتے تھے، ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ بڑے شفیق باپ تھے۔ مجھ سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ انھیں بھی ذوقِ سخن تھا مگر لکھ کر جمع کرنے کے عادی نہ تھے۔ میری والدہ نے جنھیں خدا جانے کیوں میرے ساتھ قطعی محبت نہ تھی، ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔

میری نسبت میرے قبیلے کے رواج کے مطابق میرے بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔ اور شادی ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ میری بیوی جو مجھ سے ایک سال بڑی تھیں مولانا اطہر ہاپوڑی کی بھی خالہ زاد بہن تھیں اور میری خالہ کی بھی لڑکی تھیں اور تایا کی بھی۔ یہ ۱۴ مئی ۱۹۵۸ء میں گلاؤٹھی میں انتقال کر گئیں۔ اس سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ جن میں اب کوئی بھی زندہ نہیں۔ چار بچے تو ایک سے ے کر چھ سال کے درمیانی عمر میں ختم ہوئے۔ ایک لڑکی ۴۵ سال کی عمر میں لاولد مری اور لڑکا تقریباً پچاس سال کی عمر میں دو لڑکے اور لڑکیاں چھوڑ کر مرا۔ مجھے اس بات کا بے حد صدمہ ہے کہ میرا لڑکا جس کو میں سب کچھ بنانا چاہتا تھا مگر کچھ نہ بن سکا۔

ابتدائی تعلیم :-

" یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ میری پیدائش کامٹی میں ہوئی جہاں میرے والد صاحب بسلسلۂ تجارت مقیم تھے۔ سات برس تک کی عمر کامٹی ہی میں گذری۔ یہاں اُردو اور فارسی میں تعلیم مولوی قادر نواز خاں صاحب مدراسی سے حاصل کی۔ مکتب ہمارے گھر میں ہی تھا۔ ۱۸۹۴ء میں والد کے ہمراہ گلاؤٹھی چلا گیا جہاں فارسی کی تکمیل وہاں کی برگزیدہ ہستی مولانا عبدالعزیز صاحب سے کی۔ گلاؤٹھی ہی کے مدرسہ منبع العلوم میں جسے تعلیم علوم عربیہ کے لئے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے قائم کیا تھا عربی کی تعلیم شروع کی اور بیشتر حصہ وہیں پڑھا۔ یہاں کے اساتذہ میں مولانا محی الدین صاحب گلاؤٹھوی، مولانا محمد حسن صاحب مرادآبادی آتالیق فرمانروائے بھوپال اور مولانا ماجد علی صاحب جیسے مشہور محدث اور منطقی تھے۔ آخر میں دیوبند میں "دورہ" (تعلیم حدیث) شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب سے پڑھا۔ علم طب بھی وہیں حکیم احمد حسن المعروف حکیم ٹیڈن برادرِ خورد مولانا شیخ الہند سے پڑھا۔ ۱۹۰۱ء میں دیوبند سے علوم عربیہ کی سند حاصل کی۔ دورانِ تعلیم میں کبھی دیکھ کر پڑھا نہیں اور پڑھ کر دیکھا نہیں۔ تعلیم سے میدان میں کھیل کی طرف زیادہ رجحان رہا جس میں خصوصیت سے دلچسپی شطرنج، چوسر، اور کبڈی رہی۔ تعلیم کے بعد کھیلوں کو ترک کردیا۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد والد صاحب کے ساتھ رائے پور آگیا تھا۔ انگریزی زبان کہیں پڑھی نہیں مگر ضرورتِ زمانہ نے یہ زبان بھی سکھائی۔ اور اب اس میں بھی تحریری و تقریری ضرورتوں کو پورا کرلیتا ہوں۔

ابتدائے شاعری کے حالات :-

" میں نے بہت کم عمر میں حضرت اطہر ہاپوڑی کی تحریک پر شاعری کی ابتدا کی۔ گو میں اس وقت کم عمر تھا لیکن عربی نصاب دارالعلوم دیوبند کو تقریباً ختم کر چکا تھا اور یہ میرے اساتذۂ کرام کا کرم تھا کہ وہ مجھے ذہین اور ہونہار سمجھتے تھے مگر جہاں میرے دیگر ہم جماعت احباب اپنا سب وقت تعلیم میں صرف کرتے تھے وہاں میں زیادہ وقت کھیل میں گزارتا تھا۔

مگر امتحان کے نتائج میں سب سے اچھا رہتا۔ اسی طرح جہاں اساتذہ مجھ سے محبت کرتے تھے وہاں انہیں میری کم توجہی پر افسوس بھی رہا جب میں نے شاعری شروع کی تو میرے احباب نے مجھے بہت روکا اور اساتذہ نے اس پر افسوس ظاہر کیا چنانچہ مولانا محمد حسن صاحب مرادآبادی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تو نکما تو تھا ہی اب دونوں جہان سے جاتا رہے گا۔ غرض یہ کہ ابتدائے شاعری میں میرا ماحول بہت ہمت شکن تھا۔ میں شعر چوری چھپے کہتا تھا کیونکہ علم نواز احباب و اقربا، میرے ہر اس شعر کا جو وہ سن پاتے تھے، مذاق اُڑاتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ وصل نوازی اور بوسہ بازی کی شاعری سے میں شروع ہی سے مجتنب رہا اور تعوق رقیب کو ہمیشہ حرام سمجھا۔

نہ اپنی شاعری کی دسترس ہے بند محرم تک
نہ آتا ہے ہمیں مضمون ناطقؔ بوسہ بازی کا

گل و بلبل، شمع و پروانہ و بیانِ زلف کی شاعری سے بھی بہت اجتناب کیا۔ حسن و عشق کا بیان بھی میرے یہاں بہت کم ملے گا۔ محبوب کی بے وفائی ظلم و ستم، کج ادائی، ناز و نیاز اور بے حیائی کے بیان کو بھی جو طوائفوں کا خاصہ ہے چھوڑا اور ایسے مضامین لکھنے سے بھی محتاط رہا جو طوائفوں کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہتا کہ ایسا کوئی مضمون میری شاعری میں بالکل نہیں ہوگا لیکن بہت ہی کم کیونکہ کسی فن کی ڈگر کو ایک دم چھوڑ دینا اور چھوڑ کر اہلِ فن رہنا بہت مشکل بات ہے۔ اس کے لئے مجھے اپنا طرزِ بیان سب سے الگ کر دینا پڑا۔ میری شاعری اب حالاتِ زمانہ اور اپنے پیش پا افتادہ مضامین تک ہی محدود ہے۔

"میں سب سے پہلے طوطیٔ ہند حضرت بیاںؔ یزدانی میرٹھی سے ملا جو میرے ہی ضلع کے قصبہ جارچہ کے رہنے والے تھے جس کا فاصلہ گلاؤٹھی سے کل چھ میل ہے۔ میں نے اُن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا مگر بد قسمتی سے کچھ استفادہ نہ کر سکا کیوں کہ اسی سال ان کا انتقال ہوگیا۔ ہنوز مجھے یہ خیال بھی نہ آنے پایا تھا کہ اب کس کی طرف رجوع ہوں کہ حضرت امیر مینائی کی بھی خبر آگئی۔ میں بیاںؔ کا شاگرد اس لئے ہوا تھا کہ میں نے اس وقت انھیں اپنے وقت کا بہترین مکمل ہمہ گیر فاضل اور اہلِ فن شاعر اور اُستاد سمجھا اور ہنوز اس خیال پر راسخ ہوں کہ وہ اپنے وقت کے سب سے اچھے شاعر تھے۔

ابتدائے شاعری میں میں نے تیرؔ شکوہ آبادی کے دیوان کو بہت پڑھا۔ میرے خواجہ تاش بھائی فداؔ گلاؤٹھی نے جو میرے دُور کے رشتے سے عزیز بھی تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ صدرا اور شمس بازغہ سے شاعری نہیں آتی۔ میں نے جواب دیا کہ متنبی اور حماسہ سے تو آتی ہے بات آئی گئی ہوئی مگر مجھے خیال ہوا کہ داغؔ کے دواوین کو دیکھوں کہ میں دہلی کے نواح کا باشندہ تھا اور ان کی ذات دہلی اور اہلِ دہلی کے لئے مایۂ ناز تھی جب میں نے اُن کے دو دیوان "گلزار" اور "آفتاب" کا مطالعہ کیا تو بلحاظ صفائی زبان و سلاستِ بیان مجھے "آفتاب" زیادہ پسند آیا اور اس قدر پسند آیا کہ میں نے اُسے بہت پڑھا۔ بار بار پڑھا۔ بہت غور سے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ اس وقت پورا دیوان مجھے حفظ ہوگیا تھا۔ اسی نے میری شاعری پر اثر کیا اور یہی میرے طرزِ بیان پر بلا ارادہ چھاگیا۔ چونکہ اپنا عیب خود انسان کو نظر نہیں آتا اس لئے سنہ ۱۹۰۰ء میں اپنے والد صاحب کے مشورے سے بذریعہ خط و کتابت داغؔ کا شاگرد بنا مگر تین چار سے زیادہ غزلوں پر اصلاح نہیں لی کیونکہ ان اصلاحوں سے اندازہ ہوگیا تھا کہ مجھے اصلاح سے زیادہ اپنے کلام پر خود لکھتے وقت اور لکھنے کے بعد غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۰۵ء میں داغؔ کا انتقال ہوگیا اور قصہ ہی تمام ہوگیا۔ پھر کسی کو کلام دکھانے کا خیال نہیں کیا۔ ہمیشہ اپنے لکھے پر خود اصلاح کی مگر "آفتاب" جو میرا راہبر تھا عرصہ تک رہا۔ "آفتاب" کی زبان میرا روزمرہ تھا۔ میرے گھر کا روزمرہ تھا، اور میرے قصبے کا روزمرہ تھا اسی لئے میں نے اپنے گھر کی زبان، بیان اور محاورات پر اپنی شاعری کو قائم کیا۔ چونکہ میں نے اپنی شاعری کی بنیاد "آفتاب" پر رکھی اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ براہِ راست میرا استاد "آفتاب" ہے۔ اور بالواسطہ داغؔ۔

میں نے بجز درسی عروض کے کبھی فن کے متعلق کوئی کتاب نہیں پڑھی مگر یہ اتفاق ہے کہ جن جن باتوں کو میں نے پابندی سے اختیار کیا وہی مسلمات شعر نکلے اور وہی فن نکلا۔

ایک تردید [1]

کچھ لوگوں نے مجھے حضرت جلال لکھنوی اور مولانا اطہر ہاپوڑی کا بھی شاگرد بتایا ہے جو بالکل غلط ہے۔ حضرت جلال سے میں ایک ہی مرتبہ ملا۔ دورانِ گفتگو میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ انہوں نے امیرؔ کو ایک دیہاتی اور شاعر کہا اور داغؔ کے متعلق فرمایا کہ وہ اہلِ علم نہیں، اس لئے ان کے شعر ...

[1] پروفیسر نفیس سندیلوی نے "نگار کے داغ نمبر" اور سید رفیق مارہروی نے اپنی تصنیف "زبانِ داغ" میں مولانا ناطقؔ کو جلال لکھنوی اور اطہر ہاپوڑی کا بھی شاگرد بتایا ہے۔ یہ تردید اسی کے متعلق ہے۔

سخن میں صرف "گلزار" معتبر ہو سکتا ہے کہ اس پر اُستاد ذوق کی اصلاح ہے۔ وہ اسی ملاقات میں میرے اس شعر پر بھی اعتراض کر بیٹھے ؎

ساغر پہ فاتحہ ہو دلِ تشنہ کام کی
ساقی معلّیوں کو پلا میرے نام کی

اور فرمایا کہ "فاتحہ" مذکر ہے۔ جب میں نے جواب دیا کہ دہلی کے استعمال میں مونث ہے اور جب اس میں تائے تانیث جو حالتِ وقفی میں "ہ" موجود ہے تو اہلِ دہلی حق پر ہیں۔ اس پر جلال صاحب چڑ گئے اور تلخ کلامی تک نوبت آ پہونچی یہاں تک اطہر ہاپوڑی صاحب کی شاگردی کا تعلق ہے اس کے متعلق عرض ہے کہ حضرت اطہرؔ کے اہلِ فن اور صاحبِ تحقیق ہونے کا میں شروع ہی سے معترف رہا ہوں ان کا شاگرد ہو جانے میں مجھے کوئی عار نہ تھا مگر ہوا یہ کہ اس وقت میرے قصبے کے بعض بے ہنر اُن کے شاگرد تھے جو استاد سے شعر لکھا کر اپنے نام سے سناتے تھے اور اسی پر ناز کرتے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں نے مشارکت کو پسند نہیں کیا۔ آخر میں اتنا اور سن لیجئے کہ میں مولانا راسخ دہلوی کا بھی معترفِ کمال تھا اور ان کے ساتھ بسلسلہ علوم عربی اچھی خاصی ملاقات بلکہ دوستی بھی تھی مگر میں نے ان کی شاگردی کو پسند نہیں کیا کہ شعر نویسی میں باوجود انہماک شاعری وہ محتاط نہ تھے جس کی بدولت باوجود متقی عالم ہونے کے اُن کے تغزل پر سوقیت نے غلبہ کر لیا تھا۔ جسے میری آوارگی اور رندی نے بھی گوارا نہ کیا۔

تلامذہ کی تعداد:

"میں نے اپنے شاگردوں کی کوئی فہرست نہیں رکھی۔ سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا کسی کو شاگرد بنانے کی کوشش نہیں کی جو گلے پڑ گیا اس کو اصلاح دیدی۔ مجھ سے بہت لوگوں نے اصلاحیں لی ہیں۔ اور بلاد ہند و پاک میں کئی مجھے اپنا اُستاد بتاتے ہیں بعض نام ایسے بھی آجاتے ہیں کہ غور کرنے پر بھی مجھے یاد نہیں آتا کہ کب وہ مجھ سے اصلاح لیتے تھے ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جنھوں نے مجھ سے کبھی اصلاح نہیں لی لیکن مجھے اپنا استاد بنانے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ ناگپور اور کامٹی میں بہت سے لوگ میرے شاگرد ہوئے لیکن کوئی کچھ بنا نہیں اور اب تو سب ختم بھی ہو گئے۔"

رنگِ سخن

"مولانا آسی مرحوم کی تحریک پر میں نے غالبؔ کا مشکل رنگ بھی لکھا ہے۔ مومنؔ کا رنگ بھی لکھا ہے اور میر تقی میرؔ کا بھی۔ اور اب اپنا الگ رنگ بھی زبان و فن کی پابندی کے ساتھ لکھتا ہوں اور اہلِ علم و فن کی حرف گیری سے ڈرتا بھی ہوں۔ میں نے اپنی شاعری میں محاورات کو صفائی اور روانیِ بیان کے ساتھ بہت زیادہ نظم کیا ہے۔ ماسٹر حمید جمال صاحب (کامٹوی) نے میرے متعلق ایک مضمون لکھا تھا جو جریدہ "آج کل" دہلی کی اشاعت ماہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں موجود ہے اس مضمون میں انہوں نے میرے رنگِ سخن کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔

تصوف کے ساتھ لگاؤ

"میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے خدام میں داخل ہوں۔ مدرسہ عالیہ دیوبند کا عالم تو کیا ہو سکتا ہوں ہاں طالب علم ضرور رہا ہوں۔ اور میں نے بیشتر سب ہی اکابر دیوبند کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔

اثرات

"میں نے اپنی زندگی میں بہت کم لوگوں کا اثر لیا ہے۔ سب سے زیادہ میں نے جو اثر لیا ہے وہ خود اپنے والد بزرگوار کا ہے جو بڑی قابلیت اور صلاحیت کے مالک تھے۔ میں نے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمت اللہ علیہ کی ذاتِ بابرکات کا بھی بہت اثر لیا ہے۔ اپنے اساتذہ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا شیخ الہند صاحب، حضرت مولانا محمد حسن صاحب مراد آبادی، حضرت مولانا محی الدین صاحب گلاؤٹھوی اور حضرت مولانا حکیم احمد حسن صاحب دیوبندی المعروف حکیم بڈن صاحب کی شخصیت اور عظمت سے میں بہت متاثر ہوں۔ احباب میں حضرت صوفی کرم حسین کی شخصیت کا بھی مجھ پر بہت اثر ہے۔

اکابر ہند میں نواب وقار الملک صاحب سے میں ملا ہوں اور ان کی شخصیت کا بڑا اثر لے کر آیا ہوں۔ اکابر شعراء میں حضرت بیاںؔ میرٹھی، حضرت داغؔ، شادؔ عظیم آبادی اور تسلیمؔ لکھنوی کی شخصیتوں کو مانتا ہوں۔ اساتذۂ دہلی میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کا میں بے حد احترام کرتا ہوں۔

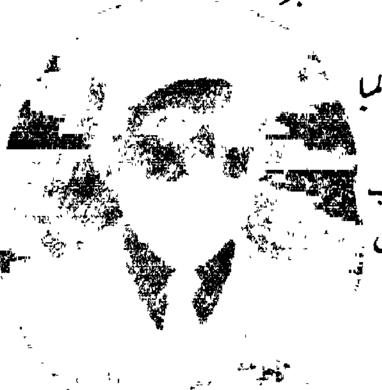
ہم عصر شاعروں میں کسی ایک کی شخصیت سے بھی متاثر نہیں ہوا۔ مرزا یگانہ چنگیزی نے بھی مجھے ماننے کی طرح مانا مگر میں نے ان سے بھی کہہ دیا کہ میں تمہیں کیونکر مانوں اور خود میری حالت یہ ہے کہ اپنی شاعری پر بھی جتنا شاعروں کو ہوتا ہے۔ اعتماد نہیں آج تک یہ حالت ہے کہ کسی زمین میں غزل لکھنے کا خیال کرتا ہوں تو مطلع لکھے بغیر آگے نہیں بڑھتا اور سوچا کرتا ہوں کہ مطلع خاطر خواہ ہو بھی سکے گا کہ نہیں۔" مولانا مرحوم کے سوانح کے متعلق اوپر جو

ربیان لیا لیاہے ، وہ خود ان کی نگارشات سے ماخوذ ہے ۔ اب میں سوانح
ے ہی متعلق کچھ مزید حالات اپنے مشاہدات اور معلومات کی روشنی میں پیش کرتا
ہوں ۔

سیاسی زندگی

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا ایک عالم فاضل ، حکیم ، شاعر
رادیب ہونے کے علاوہ ایک سیاست داں اور سماجی کارکن بھی تھے ۔
۱۹۱ء میں جب وہ مرکزی حکومت میں ایم ایل اے تھے تو پنڈت موتی لال
ہرو ، مسٹر سی آر داس اور پنڈت مدن موہن مالویہ جیسی شخصیتوں کی معیت
ں انہیں کام کرنے کا موقع ملا ۔ تحریک خلافت میں بھی انہوں نے سرگرم حصہ لیا ۔
ناگپور میونسپل کارپوریشن میں تیس سال تک مسلسل ممبر رہے

قد و قامت اور حلیہ



قد دراز ، رنگ گورا ، چہرہ لمبا
ریش سفید ، جسم بھرا ہوا ، گردن اونچی ،
آنکھیں چمکدار ، آواز گرجدار ، بڑے بارعب
سیہ اور پر وقار شخصیت تھی ۔ مشاعروں
میں تحت اللفظ پڑھتے لیکن اپنے مخصوص
انداز میں اور یہ انداز بڑا دلکش تھا ۔

مزاجی کیفیت

بڑے دیر آشنا تھے لیکن جس سے ملتے بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے پیش
تے ۔ اِن لوگوں کے خاص گرویدہ ہوجاتے تھے جن کے متعلق یہ یقین ہوجاتا کہ وہ
ی ان کے ساتھ خلوص و محبت سے پیش آئیں گے پھر اس میں کسی بڑے چھوٹے بوڑھے
ان اور بچے کی قید نہ تھی ۔ اس سے انہوں نے نقصان بھی بہت اُٹھایا کہ ہر کہہ و
مہ اور خود غرض احباب اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد دھوکا دیتے رہے جس
پتہ اُن کے اشعار سے جا بجا ملتا ہے ۔ تمثیلاً دو شعر درج ذیل ہیں ۔

کس کس سے کیا بتائیے کھاتے رہے فریب
ناطق ہمیں تباہ کیا اعتبار نے
ہماری منزلِ ہستی بھی یارب کیا مصیبت ہے
وہی دیتا ہے دھوکا جس کسی کا ساتھ کرتے ہیں

ظرافت اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کے بھری تھی ۔
ری میں کیا بتائیں ناطق اسی دہن سے :: اب دانت جھڑ رہے ہیں موتی کبھی جھڑے تھے

بات میں بات پیدا کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا ۔ خود فرماتے بھی ہیں ۔

ناطق نہ ہو جو بات تو بولے نہ آدمی
بولے تو اس میں بات بھی پیدا کرے کوئی

بڑے خوددار ، صاف گو اور بے باک بزرگ تھے ۔ حق گوئی اور خدا لگتی باتیں کہہ دینے میں بڑی سے بڑی شخصیت کا لحاظ نہیں کیا ۔ وہ اپنے اس مسلک پر ہمیشہ قائم رہے ۔

اہلِ حق بھی یہیں مل جائیں گے اٹھ تو ناطق
حق کی آواز تو بُت خانۂ باطل سے اُٹھا

بڑی بڑی ادبی معرکہ آرائیوں سے نبرد آزما رہے اور اور اپنا لوہا منوا کر رہے ۔ ان معرکہ آرائیوں سے بے شمار ادبی و علمی مسائل حل کرنے میں مدد ملی ۔ اور اس طرح بھی انہوں نے بیش بہا ادبی خدمات انجام دی ہیں ۔

زندگی کے آخری ایام

مولانا کی عمر کے آخری چھ مہینے مسلسل بیماری میں گزرے ۔ اس عرصے میں وہ نہایت کمزور ہو گئے تھے ۔ کمر بالکل جھک گئی تھی ۔ حافظہ جاتا رہا تھا ۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے ۔ پلنگ پر ہی بیٹھے لیٹے تمام ضروریات پوری کرتے تھے ۔ یہ زمانہ بڑی عسرت اور مفلوک الحالی میں بسر ہوا ۔ رفیقوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا ۔ رشتہ داروں اور دوستوں نے منہ موڑ لیا تھا ۔ صلبی اولاد تمام مدت ہوئی مر چکی تھی ۔ حتیٰ کہ ان مقامی لوگوں نے کبھی جو اب انکی معنوی اولاد ہونے کے مدعی ہیں ، ان کی کوئی خبر نہیں لی ۔ ان کی زندگی خود ان کے ذیل کے اشعار کے حسب حال تھی ۔

ہم سفرانِ راہ عمر کیا ہوئے سب کہاں گئے
یا کوئی ایک ہی نہ تھا یا کہیں ایک بھی نہیں
دوست ہی تھا جسے ناطق نہ ہوئی کچھ پروا
ورنہ رونا ہے مرے حال پہ دشمن کیسا

اور یہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

کس کو مہرباں کہیئے کون مہرباں اپنا
وقت کی یہ باتیں ہیں وقت اب کہاں اپنا
آہی جاتا ہے بُرے وقت میں اپنوں کو خیال
کوئی ہوتا جو ہمارا بھی تو پُرساں ہوتا

گلاؤٹھی اور ناگپور سے نسبت : قصبہ گلاؤٹھی جو دہلی سے تقریباً بیس میل

کے فاصلے پر ہے مولانا کا وطن مالوف ہے۔ دنیائے شعر و ادب میں وہ اپنے آبائی وطن کی نسبت سے مشہور رہیں۔ یہاں اور اس قصبے کے اطراف و اکناف کے قصبات میں اب بھی ان کے رشتہ دار موجود ہیں لیکن انہیں اس قصبے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ یہاں کے رشتہ داروں سے وہ خوش تھے۔ ان کے یہ دو اشعار اس کے ثبوت میں کافی ہیں ؎

ناطق، فداؔ، رساؔ و کمائیؔ نہیں رہے
باقی فقط وطن ہی وطن اب وطن میں ہے

خیالِ اہلِ وطن آگیا جب اے ناطق
وطن ہی کہنے کے قابل گلاؤٹھی نہ رہی

شہر ناگپور مولانا کا پیدائشی وطن ہے کہ وہ یہیں کے ایک علاقہ کامٹی میں پیدا ہوئے یہیں کم و بیش ساٹھ سال مقیم رہے اور اب یہیں کی خاک میں آرام فرما رہے ہیں اس وجہ سے ہم بجا طور سے اُنہیں ناگپوری کہہ سکتے ہیں۔

دورانِ گفتگو میں ایک مرتبہ میں نے مرحوم سے عرض کیا تھا کہ حضرت اگر آپ ناگپور میں نہ بھی پیدا ہوئے ہوتے تو بھی اس طویل قیام کی بدولت آپ کو ناگپوری ہونا تھا پھر کیا وجہ ہے کہ آپ خود کو اپنے آبائی وطن گلاؤٹھی سے جس سے اب آپ کو کوئی تعلق نہیں رہا نسبت دیتے ہیں۔ انہوں نے اس کے جواب میں اہل ناگپور کی جو تاریخ بتائی وہ انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ حالات اور واقعات کی جھلک ان کی نگارشات و کلام میں بکثرت نظر آتی ہے۔ میں یہاں ان کا صرف ایک شعر ہی پیش کرتا ہوں ؎

ساتھ رہتی اس طرح غربت میں کیوں فکرِ وطن
ساتھ لے آتے زمیں دو گز جو مدفن کے لیے

مولانا مرحوم کو بھارت سرکار نے اُن کی ادبی و شعری خدمات کے صلے میں ۱۹۵۵ء میں ایک صد روپے ماہوار کا وظیفہ عطا کیا تھا، جو اُنہیں اُن کی وفات تک ملتا رہا۔

تصانیف

مولانا "مخزن" کے دورِ اوّل کے لکھنے والوں میں تھے "پیسہ اخبار" لاہور میں بھی آپ کا کلام شائع ہوتا تھا گلدستہ "پیامِ یار"، "جلوۂ یار" وغیرہ میں تو مسلسل آپ کا کلام چھپتا تھا: "نیرنگِ خیال"، "شاعر" (آگرہ) "نگار" (بھوپال و لکھنؤ) اور "عالمگیر و خیام" وغیرہ مشہور جرائد میں آپ کا کلام ہمیشہ چھپتا تھا۔ آپ کے ساتھ قدرت نے یہ ستم ظریفی کی کہ ایک جگہ تقریباً دو سو کتابیں تھیں اور ان میں ہی ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی تھا۔ اس دیوان کو دیمک نے چاٹ کر بالکل تباہ کر دیا اور کتابیں جوں کی توں رہیں۔ اس کا انہیں بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے بہت سی غزلیں کہیں اور ادھر اُدھر پھینک دیں اور



مولانا مرحوم کی آخری تصویر انتقال کے تین دن قبل

جمع کر کے چھپوانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک مقطع میں فرماتے ہیں۔

اس سے کچھ ہوتی اگر ناطق ہمیں تسکینِ طبع
آج تک سب جمع کر لیتے کلام اپنا نہ ہم

غزلوں کا بہت بڑا حصہ دست بردِ زمانہ ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق دی کہ میں نے پرانے رسائل اور ان کے کاغذات سے تلاش کر کے تقریباً تین سو غزلیں جمع کر لی ہیں۔ خدا کرے جلد ہی کوئی ایسی سبیل پیدا ہو جائے۔ جس سے میں دیوان کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر سکوں۔ یہ اُردو زبان کا المیہ ہے کہ جہاں ما و شما کے دیوان روزانہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں ستر سال کی خدمتِ ادب کے بعد بھی مولانا کا دیوان شائع نہیں ہوا مطبوعہ کتابوں میں ایک "نطقِ ناطق" (نیچرل نظموں کا مجموعہ) سالِ اشاعت ۱۹۱۱ء، دوسری "بخیل میں فیلو" (ایک طویل مکتوب) اور تیسری "سبع سیارہ" (تنقیدی اور علمی مضامین کا مجموعہ) ہے۔ آپ کی کتاب شرح دیوانِ غالب موسومہ "کنز المطالب" جو انہوں نے ۱۹۲۶ء میں لکھی تھی۔ میں نے دوبارہ مرتب کر کے پچھلے سال مکتبہ دین و ادب لکھنؤ سے چھپوایا ہے۔ غیر مطبوعہ تصانیف میں دیوان کے علاوہ "تصریحاتِ اُردو" اور دوسری "افادات" ہیں

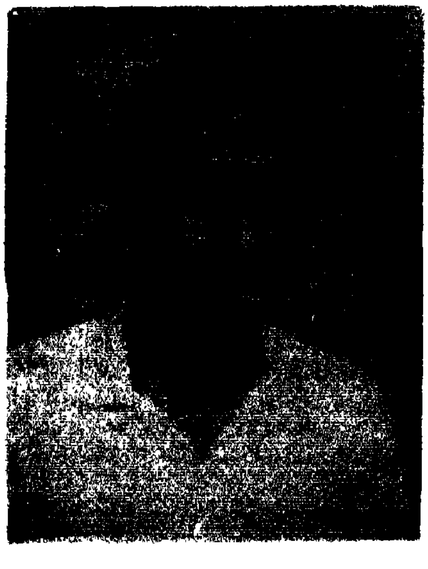
---

(۱) فداؔ گلاؤٹھوی داغؔ کے قدیم شاگردوں میں تھے (۲) رساؔ گلاؤٹھوی۔ یہ بھی داغؔ کے قدیم شاگردوں میں تھے چونکہ رامپور میں جا کر شہرت پائی اس لئے رامپوری مشہور ہوئے (۳) مولانا کمائیؔ گلاؤٹھوی، یہ امیر مینائی کے شاگرد تھے جمشید پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

غزلیں

احتشام اختر

محبت کے گھنے بن میں اندھیرا جال پھیلائے
کوئی بھٹکا مسافر سوچتا ہے کس طرف جائے
نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں زندگی کے مدھ بھرے سپنے
حقیقت سے کوئی کہدے کہ اپنا روپ دکھلائے
گگن پر دل کے چھائے ہیں تمہاری چاہ کے بادل
خوشی کے شہر میں ایسا نہ ہو پھر بارشھ آجائے
جلا کر دل کے مندر میں نئی آشا کا اک دیپک
پجارن دیوتا کے سامنے رہ رہ کے مسکائے
نہ جانے کیوں مری آنکھوں میں آنسو آگئے اخترؔ
کسی معصوم کوئل، نے مرے جب گیت کل گائے





میری ویران سی اُجڑی ہوی محفل کے سوا
تم کہیں اور رہو انجمنِ دل کے سوا
یوں ہی جو تیری نوازش ہی اے برق تپاں
اور بھی گریہ کناں ہوں گے عنادل کے سوا
مجھ خزاں دیدہ سے ملنے کو نہیں آمادہ
زندگی کی یہ بہاریں تری محفل کے سوا
گیسوؤں والو! کوئی اور نہ تدبیر کرو!
ہم بہلتے ہیں کہاں طوق وسلاسل کے سوا
سرفروشانہ جنوں کی نہیں ملتی ہے داد
جائیے اور کہاں کوچۂ قاتل کے سوا
ایک ہی چہرہ ہے جو سب کو حسیں لگتا ہے
کہیں رکتی ہے نظر اس مہ کامل کے سوا
ڈال دو بحر حوادث میں سفینے کو نثارؔ
لطف موجوں میں بھی کچھ کم نہیں ساحل کے سوا

نثار اعظمی

ظفر صہبائی

پتھرا گئی ہے شہر کی ہر اک صدا چلو
ہنستی ہے جنگلوں میں ابھی تک ہوا چلو
اپنے نئے شعور کے تیشے سے دوستو
صدیوں پرانے جسم کی دیوار ڈھا چلو
تم سانپ بن گئے ہو تو ڈھونڈو کوئی بدن
جو زہر تم میں ہے وہ کسی کو پلا چلو
جب یہ سفر نیا ہے تو ہو راہ بھی نئی
جس راہ سب گئے ہیں اسی راہ کیا چلو
سمجھا رہے ہو فلسفہ تم امن کا ۔ مجھے
دل میں یہ ہے کہ شہر کو صحرا بنا چلو
لفظوں میں دیکھو جھانک کے ایمائیت کا در
اسلوب کو ظفرؔ کے سمجھ لو برا ۔ چلو



اناج میں خود کفالت کے لئے



سبز انقلاب

راج نرائن راز

گاندھی جی نے کہا تھا: ہندوستان اپنے دیہات میں آباد ہے۔ ہمارے ۸۲ فی صد لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔ دیہات میں آباد ہمارا یہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ زراعت کو ملک کی معیشت اور ہمارے عوام کی زندگی میں اہم مقام حاصل ہے۔ ہمارے ۷۰ فی صد سے زائد عوام کھیتی باڑی کرتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو زراعت ہمارے عوام کے لئے محض کھانے کمانے کا ذریعہ نہیں، زراعت ان کی روایت ہے ان کی طرز زندگی ہے۔ ان کی اس طرز زندگی نے صدیوں سے ان کے افکار کو ایک سمت دی ہے ان کے نظریوں کی تشکیل کی اور ان کی ثقافت کے خدوخال متعین کئے ہیں۔

ہماری زراعت ہماری قومی آمدنی کا خاص ذریعہ ہے۔ قومی آمدنی کا لگ بھگ نصف حصہ ہمیں زراعت سے حاصل ہوتا ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں ہمیں ۱۲۰۰۰ کروڑ روپے زراعت سے حاصل ہوئے تھے۔

ہماری زراعت کا ایک برآمدی پہلو بھی ہے۔ پٹ سن، لاکھ، تلہن، چائے اور تمباکو جیسی زرعی اجناس ہم دوسرے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں بدیسی سکہ حاصل ہوتا ہے۔ اس بدیسی سکے سے ہم ملک کی ترقیاتی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ ہمارے کھیت ہمارے عوام کو خوراک اور ملک کے کروڑوں مویشیوں کو چارہ مہیا کرتے ہیں یہی نہیں زراعت ہماری متعدد صنعتوں بشمول تجارت و نقل وحمل کی بنیاد بھی ہے چینی اور کپڑے کے کارخانے کچا مال کھیتوں ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ ریلیں اور سامان ڈھونے والے دوسرے ذرائع زیادہ تر زراعتی پیداوار کی نقل وحمل میں ہی لگے ہوئے ہیں۔

ملکی معیشت میں ہماری زراعت کی حیثیت کلیدی ہے۔ اس لئے ترقیاتی منصوبوں کے آغاز ہی سے زراعت کی ترقی پر خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے۔ یہ ملک کے کروڑوں عوام کو ملکی ذرائع سے خوراک مہیا کرنے اور ہندوستانی کسانوں کو ضرب المثل غریبی کی دلدل سے نکالنے کے لئے ازحد ضروری تھا۔ پہلے منصوبے کی نسبت تیسرے پنج سالہ منصوبے میں زراعت، بجلی و آبپاشی پر اڑھائی گنا رقم یعنی ۲۰۲۲ کروڑ روپے خرچ کئے گئے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ ۵۱-۱۹۵۰ میں اناج کی کل پیداوار ۵۰۱ لاکھ ٹن تھی، جو اضافے کے بعد تیسرے منصوبے کے اختتام پر ۸۹۰ لاکھ ٹن ہو گئی تھی۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں ملک میں ۹۵۵ لاکھ ٹن اناج پیدا ہوا تھا۔

ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب سے ہمارے کھیت ہم بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا نہیں کر پاتے۔ ۱۹۶۷ء ہی کو لیجئے! پیداوار زیادہ ہونے کے باوجود ہمیں ۸۶ لاکھ ٹن اناج باہر سے منگانا پڑا تھا۔ ترقیاتی منصوبوں میں بدیسی سکے کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی بڑی رکاوٹیں محسوس کی جا رہی ہیں اور اناج کی درآمد پر بڑی مقدار میں بدیسی سکے کے خرچ سے مشکلات اور بڑھ رہی ہیں اور پھر تیسرے منصوبے کے آخری برسوں میں ہمیں جو تجربات ہوئے ان کے پیش نظر بھی زرعی پیداوار کو بڑھانا بے حد ضروری تھا۔ تیسرے منصوبے کے آخری برسوں کے تجربے نے معیشت کے استحکام کی ضرورت کو پوری طرح اجاگر کر دیا تھا۔ معیشت میں پائے جانے والے عدم استحکام کی خاص وجہ یہ تھی کہ زرعی پیداوار میں اتار چڑھاؤ اور اشیا کی قیمتوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ اناج کی قلت سے پیدا شدہ صورت حال کے مقابلے کے لئے ضروری

کہ زرعی اشیاء کا وافر ذخیرہ رکھا جائے اور موقع اور ضرورت کے مطابق اناج فراہم کر کے کمی کو دور کیا جائے۔ مزید یہ ذخیرہ زرعی اجناس کی قیمتوں کو قابو میں رکھنے کے لئے معاون ہو سکتا ہے۔ ایسے میں اناج کی پیداوار کو تیزی سے بڑھانا ملک میں ایک سبز انقلاب لانا اور بھی ناگزیر تھا۔ بہتر قسموں کے بیج فصلوں کی پیداوار میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ اس امر کا مظاہرہ پہلی بار ہندوستان میں تیس چالیس برس پہلے ہوا تھا، جب سر ٹی ایس وینکٹ رامن نے گنے کی بہتر قسمیں اگا کر ہندوستان کی چینی کی صنعت کی کایا کلپ کر دی تھی۔ اور ادھر حالیہ برسوں میں جوار، باجرہ، مکئی، گندم اور چاول کے تیار کئے گئے بہتر پیوندی بیجوں نے ایک بار پھر اس امر کی تصدیق کر دی ہے اور اب یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کرنے اور نتیجتاً اناج اور دوسری زرعی اشیاء میں خود کفیل بننے کے لئے ہمیں ماڈرن ٹیکنالوجی کی مدد سے زیادہ پیداوار دینے والی بیجوں کی بہتر قسموں ہی پر تکیہ کرنا ہوگا۔

کم پیداوار کی وجہ کم زرخیز زمین بتائی جاتی تھی۔ کیمیاوی کھادوں کے بھرپور استعمال سے اب زمین کو زیادہ زرخیز بنایا گیا اور بنایا جا رہا ہے۔ اب ہماری دھرتی سے ہلکے سبز یا زرد نہیں بلکہ گہری سبز رنگت والے پودے اُگتے ہیں۔ دانوں سے بھرپور ہرے بھرے گہرے سبز پودے ہی سبز انقلاب کا آئینہ ہیں۔

سبز انقلاب کا بنیادی ذریعہ اور وسیلہ بہتر اور ترقی یافتہ قسموں کے بیج ہیں۔ اُن کی تیاری پر گزشتہ کچھ عرصے سے روز افزوں توجہ دی جا رہی ہے۔ ان کی تیاری ایسی قسموں کی سوجھ بوجھ پر مبنی ہے جو زیادہ کیمیاوی کھاد اور زیادہ سینچائی وغیرہ کی متحمل ہو سکیں۔ ہمارے ملک میں عام طور پر اس سے پیشتر گندم کے اونچے پودے دینے والی قسمیں بوئی جاتی تھیں۔ یہ کھاد کی زیادہ مقدار کو برداشت نہ کر پاتی تھیں لہٰذا گندم کی ایسی قسموں کی ضرورت محسوس کی گئی جن کے پودے چھوٹے ہوں اور جو زیادہ کھاد و پانی ملنے پر گر نہ پڑیں۔

زراعتی تحقیق کی بھارتی کونسل نے میکسیکن گندم کی بونی قسموں کی آزمائش و تجربے کے بعد ۱۹۶۵ء میں لیرما روجو ۶۴-اے اور سونارا ۶۴ کو بڑے پیمانے پر بونے کی سفارش کی۔ سینچائی والے علاقوں میں یہ قسمیں مفید ثابت ہوئیں اور گندم کی کھیتی میں انقلابی ترقی کا پیش خیمہ بنیں۔ لیرما روجو ۶۴-اے سے ۴ سے ۵ ٹن فی ہیکٹر اور سونارا ۶۴ سے ۶ ٹن فی ہیکٹر تک پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔

۱۹۶۷ء میں زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی بعض دوسری قسمیں چھوٹی لیرما، سفید لیرما اور ایس ۳۰۸ کاشتکاروں کو عام کاشت کے لئے دی گئیں۔ ان سے زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ یہی نہیں اُن کے پودے بیماریوں کا مقابلہ بہتر ڈھنگ سے کر سکتے ہیں۔ ان سے سرخ یا سفید دانے حاصل ہوتے ہیں جو نرم اور نیم سخت ہوتے ہیں۔

گندم کی اِن بہتر قسموں کی جگہ پر اب ہلکے نارنجی رنگ کے سخت دانے دینے والی بونی قسمیں کلیان سونا، سونالیکا اور شربتی سونارا اگائی جائیں گی۔ ان کی بدولت سال میں چار فصلیں تک حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اناج میں خود کفالت کی طرف فی الواقع یہ ایک بڑی چھلانگ ہے۔

ہندوستانیوں کی دوسری خاص خوراک چاول ہے۔ اناج کی پیداوار کو بڑھانے کے سلسلے میں ضروری تھا کہ چاول کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ ملک میں چاول کی جو بہتر قسمیں اس سے پیشتر بوئی جا رہی تھیں وہ ۶۰ کیلوگرام فی ہیکٹر سے زیادہ نائٹروجن کھاد برداشت نہ کر پاتی تھیں۔ بھارت نے گندم کی طرح چاول کی بہتر قسمیں بھی بدیس سے ہی حاصل کیں اور ان کے ذریعے اپنی کوششوں سے مزید بہتر قسمیں تیار کیں۔

چاول کی بدیسی قسمیں تائیوان سے حاصل کی گئی قسم تائی چنگ نیٹو ۱ اور چاول کی تحقیق سے متعلق بین الاقوامی مرکز واقع فلپائن سے حاصل کی گئی قسم آئی آر ۸ تھی۔ گہرے ہرے رنگ کے پتوں والی، موسم سے بے نیاز یہ بونی قسمیں بہت مفید پائی گئیں۔ تائیوان سے حاصل کی گئی چاول کی بعض دوسری قسمیں تائی چنگ ۶۵، تائی نن ۳، کاؤشی انگ ۲۱، کاؤشی انگ ۶۴، چائے نن ۲ اور چائے ننگ ۲۴۲ ملک کے مختلف حصوں میں زیادہ پیداوار کا باعث بنی ہیں۔ موسم سے متاثر نہ ہونے اور متوسط اونچائی کے پودے دینے والی اِن قسموں سے پانچ سے سات ٹن فی ہیکٹر پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض قسمیں بعض بعض ریاستوں میں خاص طور پر مقبول ہیں۔ مثلاً تائی نن ۳ کیرالہ میں تائی چنگ ۶۵ میسور میں اور چائے نن ۲ آندھرا پردیش میں۔

ادھر ملک میں چاول کی دو مزید بہتر قسمیں جے اور پدما تائی چنگ نیٹو ۱ اور ہندوستانی چاول کی اڑیسہ قسم ٹی ۱۴۱ کی پیوند کاریوں سے تیار کی گئی ہیں۔ آئی آر ۸ کے مقابلے میں جے دس بارہ فی صد زائد پیداوار دیتی ہے۔ تائی چنگ نیٹو ۱ سے پدما کی پیداوار کسی قدر کم ہے، لیکن یہ موسم گرما میں مغربی بنگال، بہار اور آسام میں لگانے کے لئے مفید ہے۔ جنوبی ہند میں یہ ربیع کی کاشت کے لئے بہت مناسب ہے۔ یہ نئی قسمیں اس اعتبار سے بھی بہتر ہیں کہ یہ

عارضین کو زیادہ قابلِ قبول ہیں۔

چاول کی نئی و بہتر قسموں کی تیاری کے ضمن میں بعض ریاستوں مثلاً آندھرا پردیش، کیرالہ اور مدراس کے زراعت کے محکموں اور زراعتی یونیورسٹیوں نے قابلِ ذکر پیش قدمی کی ہے۔ یہ قسمیں نبلوا اے ڈی ٹی ۲۷ اور اے ڈی ٹی ۲۸ ہیں۔ ان کی کاشت ان ریاستوں میں مفید مطلب ثابت ہوئی ہے۔

سبز انقلاب کے پہلے آثار جس فصل میں نمایاں ہوئے وہ مکئی کی تھی۔ پیوندی مکئی کی تیاری کے لئے اولین کوشش ۱۹۵۷ء میں بروئے کار لائی گئی۔ کوشش بار آور ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں تین قسموں کے پیوندی بیج جاری کئے گئے۔ اُن سے ۴ سے ۶ ٹن فی ہیکٹر پیداوار حاصل ہوئی۔ بعد میں ملک میں مزید بہتر پیوندی بیج تیار کئے گئے، جن سے ساڑھے چار سے ساڑھے چھ ٹن فی ہیکٹر پیداوار حاصل ہوئی۔ یہ پیوندی قسمیں ہیں گنگا ۱۰۱، رنجیت، دکن، گنگا سفید-۲، ہی سار، گنگا-۳، ہمالین ۱۲۳، گنگا-۵۔

ملک کے مختلف حصوں کی مخصوص ضرورتوں کے پیشِ نظر تیار کی گئی ان پیوندی قسموں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ پودوں اور دانوں کو لگنے والی بیماروں کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہیں۔

حالیہ برسوں میں مکئی کی کاشت کے ضمن میں ایک پیش قدمی اور ہوئی ہے۔ ملک میں مزید بہتر قسموں کے بیج تیار کئے گئے ہیں۔ یہ قسمیں مرکب قسمیں کہلاتی ہیں۔ یہ پیوندی قسموں جتنی پیداوار دیتی ہیں۔ ان کے پودے بیماری کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان قسموں کے بیج کسان خود آپ تیار کر سکتے ہیں۔ یہ قسمیں ہیں جواہر، امبر، وجے، سونا، وکرم اور کسان۔ امید ہے کہ ۱۹۷۰ء یا ۱۹۷۱ء میں مکئی کی کاشت کے بیشتر علاقوں کو ترقی یافتہ قسموں کے بیج مہیا کئے جا سکیں گے۔

ملک کی ایک اور اہم فصل جوار ہے۔ جوار کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں مفید کوششوں کو کام میں لایا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں سی ایس ایچ ۱ اور ۱۹۶۵ء میں سی ایس ایچ ۲ قسموں کے بہتر بیج جاری کئے گئے تھے۔ سی ایس ایچ ۱ سے سینچائی والے علاقوں میں ۵ ٹن فی ہیکٹر اور بارش والے علاقوں میں دو سے اڑھائی ٹن فی ہیکٹر پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔

ان قسموں سے ہلکے کریمی رنگ کے موتیوں جیسے دانے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ خوش ذائقہ اور زیادہ غذائیت والے ہوتے ہیں۔

جوار کی ایک بہتر قسم سورن ۱۹۶۸ء میں جاری کی گئی تھی۔ یہ پیداوار تو سی ایس ایچ ۱ جتنی دیتی ہے لیکن اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کسان اس کے بیج خود تیار کر سکتے ہیں۔

اناج کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں باجرے کی فصل پر بھی خاص توجہ صرف کی گئی۔ چار بہتر قسموں کے پیوندی بیج ایچ بی ۱، ایچ بی ۲، ایچ بی ۳ اور ایچ بی ۴ کسانوں کو دیئے گئے۔ یہ بہتر پیوندی بیج ملک کے مختلف حصوں کی ضرورت کے عین مطابق ہیں۔ ان سے ۵ ٹن فی ہیکٹر تک پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔

باجرے کے مزید بہتر بیجوں کی تیاری کے تجربے جاری ہیں۔ امید ہے کہ ان سے فی ہیکٹر پیداوار میں مزید اضافہ ہوگا۔

پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں پہلی اور بنیادی ضرورت زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی وافر فراہمی کی ہے۔ اس ضمن میں بیجوں سے متعلق قومی کارپوریشن، مرکزی و ریاستی حکومتوں کے فارم، زراعتی یونیورسٹیاں اور بیج تیار کرنے کے بعض نجی ادارے جدید بنیادوں پر بیج پیدا کر رہے ہیں۔ سورت گڑھ، ہبیر اور اڑیسہ کے مرکزی فارم پہلے ہی سے بڑی مقدار میں ایسے بیج تیار کر رہے ہیں۔ بہتر بیجوں کی تیاری کے کام کو بڑھاوا دینے کے لئے پنجاب، ہریانہ اور دوسری ریاستوں میں زیادہ پیداوار دینے والے بیج تیار کرنے کے مزید مراکز کے قیام کی تجویزیں بھی زیرِ غور ہیں۔

زیادہ مقدار میں ایسے بیجوں کی فراہمی کا یہ تقاضا ہے کہ یہ بیج زیادہ رقبے میں بوئے جائیں۔ اس ضمن میں بار آور کوششوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً ۱۹۶۷-۶۸ء کے دوران ۶۰ لاکھ ۴۰ ہزار ہیکٹر زمین میں یہ بیج بوئے گئے تھے۔ ۱۹۶۸-۶۹ء کے لئے ۹۰ لاکھ ہیکٹر اراضی میں ایسے بیج بونے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ اس ضمن میں آخری اعداد و شمار ابھی موصول نہیں ہوئے۔ لیکن امید ہے کہ یہ نشانہ مکمل کر لیا گیا ہوگا اور اسی امر کے پیشِ نظر اب ۱۹۶۹-۷۰ء میں ایک کروڑ بانوے ہزار ہیکٹر اراضی میں ایسے بیج بونے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

زیادہ اراضی میں زیادہ پیداوار دینے والے بہتر بیج بونے کا سیدھا مطلب زیادہ کیمیاوی کھادوں کی فراہمی اور سینچائی کی مناسب سہولتوں کا انتظام ہے۔

کیمیاوی کھادوں کے ضمن میں ہم جانتے ہیں کہ ملک کے کیمیاوی کھاد تیار کرنے والے کارخانے بتدریج زیادہ مقدار میں کھاد تیار کر رہے ہیں۔ پچھلے چھ برسوں میں ہماری کیمیاوی کھاد کی پیداوار میں تین گنا اضافہ ہوا ہے لیکن ۱۹۶۴-۶۵ء کے مقابلے میں کیمیاوی کھاد کی کھپت ۲۰۰ فی صد بڑھی ہے۔ ایسے

ظاہر ہے کہ ہمارے کسانوں کی کیمیاوی کھاد کی ضرورتیں ملکی ذرائع سے پوری نہیں ہوتیں اور نتیجتاً ہمیں ایسی کھادیں ایک بڑی مقدار میں دوسرے ملکوں سے منگانا پڑتی ہیں۔ تاہم ۶۹-۱۹۶۸ء کے دوران ۱۵ لاکھ ٹن کیمیاوی کھاد کے استعمال کا نشانہ رکھا گیا تھا۔

زیادہ فصل دینے والے بیج جہاں زیادہ کیمیاوی کھاد کے متقاضی ہوتے ہیں، وہاں مناسب مقدار میں سینچائی بھی چاہتے ہیں۔ بھارت پر دو سو سالہ برطانوی حکومت کے دوران کل ایک کروڑ تیس لاکھ ہیکٹر اراضی میں سینچائی کا انتظام کیا گیا جب کہ آزادی کے بعد ۱۵ برس کے معمولی عرصے میں ۷۰ لاکھ ہیکٹر زمین میں سینچائی کے انتظامات کئے گئے۔ ۷۱-۱۹۶۶ء کے لئے سینچائی کے بڑے اور درمیانہ پروجیکٹوں سے مزید ۳۶ لاکھ ہیکٹر اور چھوٹے ذرائع سے ۴۹ لاکھ ہیکٹر زمین کی سینچائی کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ سینچائی کے سالانہ نشانوں کے حصول میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء کے دوران مزید ۱۴ لاکھ ۵۰ ہزار ہیکٹر میں سینچائی کا نشانہ تھا۔ ۷۰-۱۹۶۹ء کے لئے مزید ۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار ہیکٹر اراضی کے لئے سینچائی کے انتظامات کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

ملک میں صحیح معنوں میں سبز انقلاب لانے — پیداوار میں قابلِ لحاظ اضافہ کرنے کے لئے زیادہ کیمیاوی کھادوں اور سینچائی کے انتظامات کے ساتھ ساتھ فصلوں کے تحفظ یعنی پودوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کیڑے مار دواؤں اور ان دواؤں کو چھڑکنے کے لئے مشینوں کی تیاری اور فراہمی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں خاطر خواہ توجہ دی جا رہی ہے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء کے دوران ۵ کروڑ ۴۰ لاکھ ہیکٹر اراضی پر کیڑے مار دواؤں کے ذریعے، پودوں کو محفوظ کیا گیا۔ نیز ۷۰-۱۹۶۹ء کے لئے ۷ کروڑ ۶۰ لاکھ ہیکٹر اراضی پر پودوں کو محفوظ کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

زمین کو پانی اور ہوا سے ہونے والے کٹاؤ سے محفوظ کرنے، ناکارہ زمینوں کو کھیتی کے قابل بنانے اور اصلاحات اراضی کی کوششیں بھی اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

زراعتی ترقیوں نے ہمارے کاشتکاروں میں بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے۔ وہ کھیتی کے جدید طریقوں کی اہمیت و قدر کو بخوبی سمجھ گئے ہیں اور ان مساعی کی بدولت ملک کے کسانوں کی، ٹریکٹروں اور دوسرے جدید ساز و سامان کے لئے بڑھتی ہوئی مانگ ہے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں ٹریکٹروں کی اندازاً مانگ ۴۰۰۰۰ تھی جبکہ ملک میں ۳۰۰۰۰ کی نصب شدہ صلاحیت کے باوجود کل ۱۸ ہزار ٹریکٹر ہی تیار ہو پائے۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۶۲-۱۹۶۱ء میں کل ۸۰۰ ٹریکٹر تیار ہوئے تھے۔ کھیتی کے جدید ساز و سامان کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور مانگ کے پیشِ نظر ان کی تیاری پر ادھر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔

پیداوار بڑھانے کے لئے زیادہ کیمیاوی کھادوں کی تیاری، سینچائی کے مناسب انتظام، کیڑے مار دواؤں کی فراہمی، زمین کو کٹاؤ سے محفوظ کرنے اور ناکارہ زمینوں کو کھیتی کے قابل بنانے کی ضرورت ناگزیر ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں مل جل کر بھی ہمارے مسئلے کو خاطر خواہ طور پر حل نہیں کر سکتیں۔ ان سب عناصر سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے کھیتی کے بہتر طریقوں کو اپنانا ضروری ہے۔ کھیتی کے بہتر طریقوں میں کاشت کے بہتر طریقے اور کاشت کے بہتر وسیلے شامل ہیں۔ بہتر وسیلوں، کیمیاوی کھادوں، سینچائی کے مناسب انتظامات، کیڑے مار دواؤں کی فراہمی اور کھیتی کے جدید اوزاروں وغیرہ کا ذکر ضمناً اوپر آ چکا ہے۔ کاشت کے بہتر طریقے ایک ہی قطعۂ اراضی سے، سال میں متعدد فصلیں اگانے پر مشتمل ہیں اور متعدد فصلیں اگانے کی انتہائی خوشگوار صورت ریلے کراپنگ یعنی کوئی درمیانی وقفہ ڈالے بغیر ایک ہی قطعۂ اراضی میں ایک کے بعد دوسری فصل اگانا ہے۔ ریلے کراپنگ کے ذریعے ایک کھیت سے ایک سال میں چار فصلیں تک حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یہاں ریلے کراپنگ کا اجمالی ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ریلے کراپنگ کا عمل آخری اپریل میں مونگ کی بجائی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ مونگ موسم گرما کی فصل کے طریقے پر بوئی جاتی ہے۔ یہ فصل آخر جون تک پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ پھر مکئی بوئی جاتی ہے۔ تیسری فصل توریا یا آلو کی ہو سکتی ہے جو دسمبر کے آخر میں تیار ہوتی ہے، جو ستمبر کے اختتام پر بوئی جاتی ہے اور چوتھی فصل گندم کی تاخیر سے بوئی جا سکنے والی قسم (شربتی سونارا) ہو سکتی ہے۔ گندم کی یہ فصل وسط اپریل میں تیار ہو جائے گی۔

ملک اور کسانوں کو ریلے کراپنگ سے کتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس کا اندازہ ذیل کے گوشوارے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

فصل	لاگت	کل آمدنی	خالص آمدنی
	روپے	روپے	روپے
مونگ	۳۸۱	۲۱۲۵	۱۷۴۴
مکئی	۹۰۹	۴۱۳۰	۳۲۲۱
توریا	۵۴۴	۱۷۲۰	۱۱۷۶
گندم	۱۲۸۱	۵۴۲۵	۴۱۴۴

تو ریا کے بجائے آلو اگانے کی صورت میں لاگت ۱۷۵۴ روپے آتی ہے۔ کل آمدنی ۴۰۲۰ روپے اور خالص آمدنی ۲۲۶۸ روپے ہوتی ہے گویا کسان آلو کی فصل بو کر ایک ہزار سے زیادہ روپیہ مزید کما سکتا ہے۔ لاگت میں جہاں کھاد، بیج وغیرہ کی قیمت شامل ہے، وہاں بجائی، گوڑائی، چھانٹی، وغیرہ جیسے کاموں کے لئے مزدوروں کی اجرت، سینچائی کا خرچ اور زمین کا کرایہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے کسان کی اصل لاگت اوپر درج لاگتی رقموں سے کہیں کم بیٹھتی ہے۔ اس لئے کہ اُسے نہ تو زمین کا کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے نہ کھیتی کے کاموں کے لئے اُجرت دینی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے اپنے ہی کنبے کے لوگ کھیت پر کام کرتے ہیں۔ اس طرح فی الواقع اُسے اوپر درج چاروں فصلیں اگانے پر، لگ بھگ گیارہ سو روپے گرہ سے صرف کرنے پڑیں گے جبکہ اس کی اصل آمدنی دس ہزار روپے سے کچھ زیادہ بیٹھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دو ہیکٹر زمین رکھنے والا کسان پیش قدمی سے کام لیتے ہوئے ۲۰ ہزار روپے سالانہ پیدا کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے اس سے کسانوں کی مالی حالت بہتر ہوگی۔ قومی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ملک کو زیادہ اناج حاصل ہوگا۔ کھیتی کے دوسرے طریقوں کی نسبت، ریلے کراپنگ کے ذریعے ایک ہیکٹر سے دوگنی یعنی ۱۰۰ من پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے اور چونکہ ادھر بہتر بیجوں اور کھیتی کے بہتر طریقوں کی اہمیت کو بخوبی محسوس کر لیا گیا ہے اس لئے ان کی طرف زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔

بہتر بیجوں اور کھیتی کے بہتر طریقوں کا ایک بڑا فائدہ اور بھی ہے ان کے ذریعے حاصل ہونے والی پیداوار میں غذائیت زیادہ ہوتی ہے۔ اب ملک میں چاول اور گندم کی جو فصلیں اگائی جا رہی ہیں، ان میں پروٹین کی مقدار ۱۴ فی صد تک زیادہ ہوتی ہے جب کہ اس سے پیشتر ان میں موجود پروٹین کی مقدار ۸ سے ۱۰ فی صد ہوا کرتی تھی۔ اس معاملے میں ہم جاپان کو لگ بھگ جا پہنچے ہیں۔ جاپانی چاولوں میں پروٹین کی مقدار ۱۳٫۶ فی صد ہوتی ہے۔ ریلے کراپنگ کے ذریعے حاصل ہونے والی مونگ کی فصل میں پروٹین کی مقدار ۲۴ فی صد ہوتی ہے۔

ان سب کوششوں کا لازمی نتیجہ زیادہ پیداوار کی صورت میں ہمارے سامنے آئے گا۔ لیکن زیادہ پیداوار ہی ہمارے مسئلے کا حل نہیں۔ ایک سنجیدہ مسئلہ اس پیداوار کو ضائع جانے سے بچانے اور محفوظ کرنے کا ہے۔ ممکن ہے یہ امر باعث حیرت ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم اپنی پیداوار کو کیڑے مکوڑوں اور چوہوں وغیرہ سے محفوظ کر لیں تو اناج کی درآمد ہم آج بند کر سکتے ہیں۔ چوہوں ہی کی مثال لیجئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۵۰ چوہے سال بھر میں آدھا ٹن اناج کھا لیتے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی وہ اس سے کہیں زیادہ ضائع کرتے ہیں۔ یہاں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ چوہوں کی تعداد ملکی آبادی سے کہیں زیادہ ہے اگر انسان ایک ہے تو چوہے پانچ اور اگر ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو چوہے تیس پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ سنجیدہ ہے۔ ادھر اس کے حل کی خاطر خواہ تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ اناج کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ اناج کو بہتر ڈھنگ سے ذخیرہ کرنے پر بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے۔



سبز انقلاب اور ان سب کوششوں کا ایک ہی مرکز و محور ہے۔ اور وہ ہے اناج میں ملک کی خود کفالت۔ اس ضمن میں زراعتی تحقیق کی بھارتی کونسل زراعتی تحقیق کی بھارتی انسٹی ٹیوٹ جیسے قومی اداروں، ملک کی مختلف زراعتی یونیورسٹیوں، مختلف ریاستوں کے زراعت سے متعلق محکموں اور راک فیلر فاؤنڈیشن جیسے غیر ملکی اداروں کی معاونت سے بڑی مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔

آج کھیت کھلیانوں کی حدیں علم و تحقیق کے مرکزوں سے ملی ہوتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک میں اناج کی پیداوار برابر بڑھ رہی ہے۔ حالات بڑے امید افزا ہیں اور ایسے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان کوششوں اور سبز انقلاب کی بدولت اناج میں خود کفالت کی دہلیز پر آکھڑے ہوئے ہیں۔

زیب غوری

ظلمتوں کے شہر میں کچھ روشنی کیونکر ملے
آج شاید راستے میں کوئی پیغمبر ملے
لطف کیا مجھ کو مری خانہ خرابی دے گئی
کوچہ کوچہ کیسے کیسے دوستوں کے گھر ملے
جو صنم نکلا خداؤں کی طرح پوجا گیا
پتھروں کی اوٹ میں کیا کیا پری پیکر ملے
دور تک جن راستوں پر منتظر بیٹھے تھے لوگ
لوٹ کر بادِ صبا آئی تو کچھ پتھر ملے
ارتقا کی کھوج میں پلٹیں زمیں کی جب تہیں
کچھ لہو کے داغ، کچھ ٹوٹے ہوئے خنجر ملے
زیب تیرے فن کی ہوگی قدر لیکن صبر کر
پہلے مٹی میں تو میرے دوست یہ جوہر ملے

غزلیں

بہت آئے مگر ہم جیسے کم ہی دیدہ ور آئے
ہماری طرح جو اُن کے لب و رخ تک گزر آئے
فریبِ جستجو ہے یہ کہ ہے تکمیلِ نظارہ
نگاہِ شوق جس جانب اُٹھی تم ہی نظر آئے
انہیں تاریکیوں میں آؤ ہم ڈھونڈیں کرن کوئی
یہ کب تک انتظارِ آخرِ شب گزرے سحر آئے
نظر آیا نہ شامِ بیکسی پرسانِ غم کوئی
اُجالا پھیلتے ہی کس قدر سائے اُبھر آئے
سمیٹے ہی رہے کانٹوں کے ڈر سے لوگ دامن کو
صبا کی طرح ہم تو وادیٔ گل سے گزر آئے
نہ جانے کس قدر راہوں کے پیچ و خم سے گزرے ہیں
کہیں پھر جا کے راہی ہم کو آدابِ سفر آئے

رحمٰن راہی

تبسم سحر

قسمت میں اپنی ہے غم و آلام دیکھنا
کیا کیا ملے ہیں ہم کو بھی انعام دیکھنا
اہلِ زمانہ بعد مرے مجھ کو ہے یقیں
روئیں گے برسوں لے کے مرا نام دیکھنا
ہمدردی جرم اور وفا بھی گناہ ہے
یہ رسم ہو نہ جائے کہیں عام دیکھنا
اپنی تباہیوں کا مجھے غم نہیں مگر
تم پر بھی آئے گا کوئی الزام دیکھنا
دولت کو دیکھنا ہے نہ ہے نام دیکھنا
اہلِ نظر کا کام ہے بس کام دیکھنا
کچھ دیر کے لیے جو ہمیں ہوش آگیا
دیکھیں گے تجھ کو گردشِ ایام دیکھنا
گزرو کبھی ادھر سے تو اے رہروانِ شوق
ہر برگ ہر شجر پہ مرا نام دیکھنا
یہ راہبر یہ ناصحِ مشفق یہ فخرِ قوم
ہیں آج کون کون تہہِ دام دیکھنا

رئیس مینائی بنگلوری

اے لوگو چلو بھاگو کہ آشوبِ بلا ہے
سورج بھی سوا نیزے پہ اب آکے کھڑا ہے
لذت کا اک خونخوار لپکتا ہوا چیتا
وہ بھی تو اسی جسم کے جنگل میں چھپا ہے
ہم خود بھی تو زندانیٔ حالات بنے ہیں
اس دور میں جینے کی یہی سب کو سزا ہے
کچھ دیر اسی جسم کے محبس ہی میں رہیے
باہر کوئی ہمزاد تعاقب میں کھڑا ہے
تہذیب کے ہاتھوں کا ستایا ہوا انساں
آوازوں کے جنگل میں بھٹکتا ہی رہا ہے

شہرِ زیست

اعجاز فاطمہ

زیست :
اک ترنم ہے چاندنی ہے مستی ہے۔
اک خوشگوار مہک
اک تابناک کرن

زیست :
اک تبسم بھی، سرخوشی بھی نکہت بھی
آرزو کا سرچشمہ
عشرتوں کا گہوارہ
راحتوں کی محفل کا دلنشیں سویرا بھی۔

زیست
اک اجالا ہے۔
اور اجالے کے سائے میں
تم ہو، ہم ہیں
اور ہم سے ہمارے بچے ہیں
دل کی راحت، نظر کا حسن قرار
دو ہی کافی ہیں خوش نما بچے
تین ہو جائیں تو گوارا ہیں
اس سے زیادہ اگر ہوں پارۂ دل
تو سمجھتے ہیں آپ کیا ہوگا
زیست بن جائے گی عظیم کھنڈر
پھیل جائیں گے موت کے سائے۔

عبدالمغنی

جدید اُردو شاعری میری نظر میں

(۲)

اِن دنوں اِس عنوان پر بحث وگفت وگو کا بازار گرم ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے متضاد باتیں کی جارہی ہیں، کوئی جدید اُردو شاعری کی مذمت میں منہ سے جھاگ اُڑا رہا ہے تو کوئی اس کی مدح خوانی میں زمین وآسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس انتہا پسندی کا ایک بڑا سبب خود موضوع کا ابہام ہے، مختلف لوگ اپنے اپنے طور پر اِس کا مختلف مفہوم فرض کر کے اسی مفہوم کے تحت موافقانہ یا مخالفانہ اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ تنقید میں یہ بات عجیب بھی ہے، افسوسناک بھی، اور خطرناک بھی۔ ایک موضوع پر موقف اور نقطۂ نظر کا تضاد واختلاف دو یا زیادہ اصحابِ رائے کے درمیان ہوسکتا ہے، مگر موضوع کا مفہوم تو اختلافِ رائے کرنے والوں کے درمیان واضح اور متعین ہونا چاہئے تاکہ بحث وگفت وگو کے نتیجے میں بالآخر کچھ مشترک پہلو اور ایک قسم کا اجماع بروئے کار آسکے، جو علمی تنقید کا واحد جواز اور مقصود ہے۔ اس لئے زیرِ نظر موضوع پر تنقیدی مباحث کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ جدید اُردو شاعری کا ایک واضح مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس توضیح وتعیّن کے بعد باہمی اختلاف کے بہت سے ناگوار پہلو غائب ہوجائیں گے اور اتفاق یا کم ازکم مفاہمت کے بہتیرے نقطے ابھر آئیں گے۔

بات یہ ہے کہ اس وقت بعض جدید شاعروں، ناقدوں، اور مدیروں نے اپنی بے دانشی سے جدید اُردو شاعری کو خواہ مخواہ ایک اصطلاح اور تحریک یا فلسفہ و رجحان بنادیا ہے اور اس طرح ایک سیدھی سادی چیز کو مابہ النزاع مسئلہ بنادیا ہے۔ دوسری طرف جو لوگ اُن کے مخالف ہیں وہ جب جدید اُردو شاعری پر گفت وگو کرتے ہیں تو اسی تصور کو سامنے رکھ کر، جواِن جدید شاعروں، ناقدوں اور مدیروں نے بنادیا ہے۔ اس طرح ہماری ادبی تنقید میں ایک ایسی لڑائی چھڑی ہوئی ہے جس میں دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں ہیں۔ آخر یہ جدید اُردو شاعری کوئی ایسی انوکھی چیز ہے جو تاریخِ ادب میں پہلی بار ابھری ہے؟ کیا جدید وقدیم کا یہ تماشا ہر دور میں ابھرا نہیں ہے؟ صاف بات یہ ہے کہ تاریخ کا دھارا اس طرح چلتا ہے کہ ہر چند سال کے وقفے پر ایک انداز فرسودہ سا ہونے لگتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا تازہ انداز سامنے آجاتا ہے۔ ابتداً دونوں کے درمیان ایک عبوری کش مکش سی ہوتی ہے اس کے بعد جب تازہ انداز مستحکم ہوجاتا ہے اور اس پر چند سال گزر جاتے ہیں تو پھر اپنی باری پر وہ بھی فرسودہ ہونے لگتا ہے اور ایک نیا انداز اس کے ساتھ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو وہ اپنے سے پہلے کے پرانے انداز کے ساتھ کرچکا ہوتا ہے۔ اسی انداز سے ماضی، حال، اور مستقبل کی تقویم چلی جارہی ہے لیکن اس کا مطلب کبھی بھی یہ نہیں ہوتا ہے کہ پرانا بالکل ختم ہوکر ناپید اور بے مصرف ہوجاتا ہے اور ہر وقت صرف نیا ہی نیا زندگی میں نظر آتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو ارتقاء، اور روایت اور تاریخ اور اجتماعیت بلکہ انسانی معاشرت اور تہذیب وتمدن کے سارے تصورات ہی ختم ہوجائیں اور تاریخِ انسانی کا تسلسل اس طرح ٹوٹ جائے کہ ارتقائے حیات کی صرف ایک کڑی نہیں بلکہ ساری کڑیاں بجز لمحۂ حاضر کے گم ہوجائیں اور ہر لمحہ گم ہوتی رہیں یہاں تک کہ جنت تو اولادِ آدم کے لئے گم شدہ ہوئی ہی ہے اب دنیا بھی گم شدہ ہوجائے۔ اس لئے گزشتہ کے

ساتھ پیوستہ ہی ہو کر اور رہ کر موجودہ اور اس سے وابستہ و پیوستہ آئندہ بروئے کار آتا ہے۔ لہٰذا جدید و قدیم کے درمیان کوئی تضاد نہیں اور ان کے سلسلے میں جھگڑا بالکل فضول ہے۔ دونوں ایک ہی سکے کے دو رُخ اور ایک ہی خاندان کے دو رکن ہیں۔ باپ بیٹے کے درمیان جانشینی کی روایت بالکل فطری طور پر چلتی ہے۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اس طرح جدید اُردو شاعری بس موجودہ شاعری ہے جو بہت جلد گزشتہ ہو جائے گی۔ تو کیا ضرور ہے کہ اس موجودہ شاعری کے خلاف جنگ کی جائے۔ اور یہ جنگ کیا اس لئے کی جائے کہ یہ شاعری موجودہ کیوں ہے؟ گزشتہ یا آئندہ کیوں نہیں۔ اس لئے جدید اُردو شاعری کی مخالفت محض اس کے جدید ہونے کے سبب ناقابلِ فہم ہے لیکن جدید و قدیم کی زمانی بحث سے الگ، موجودہ شاعری پر اسی طرح تنقید کی جاسکتی ہے جس طرح گزشتہ پر کی جاتی رہی ہے اور آئندہ پر کی جائے گی۔ یعنی بحث و گفت و گو جدت و قدامت کی بنیاد پر نہیں بلکہ عام ادبی اقدار و اوصاف کی بنیاد پر کی جائے اور جو بھی فیصلہ ہو وہ اصولی معیار پر ہو، نہ کہ شخصی اور گروہی معیار پر۔ اس منطقی اور حکیمانہ موقف سے جب جدید اُردو شاعری پر نگاہ ڈالی جائے گی تو معلوم ہوگا کہ اس وقت ہماری شاعری کے بعض اُن حلقوں میں جو جدید ہونے کے تنہا دعویدار ہیں، حالانکہ اسی دورِ حاضر میں شاعری کے دوسرے حلقے بھی موجود ہیں۔ ایک خاص قسم کی جدیدیت کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اور ان حلقوں کی طرف سے جو سرگرمیاں دکھائی جا رہی ہیں وہ کسی تجدید کی بجائے محض تجدّد کا سامان کر رہی ہیں۔ جدید ہونے میں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر جدید بننا بڑی ہی مضحکہ خیز حرکت ہے، جدت ایک فطری چیز ہے، لیکن جدیدیت ایک ڈھونگ ہے تازگی اور تصنع میں بڑا فرق ہے۔ لمحۂ حاضر میں سانس لینے والا ہر شخص جدید ہے۔ اُسے اپنے آپ کو جدید کہلانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ جدید ہونے کے لئے مر اس بات کی ضرورت ہے کہ لمحۂ حاضر میں سانس لینے والے دوسرے لوگوں کو غیر جدید کہا جائے اور جدید ہونے کے جملہ حقوق صرف اپنے لئے محفوظ کر لئے جائیں۔ جو لوگ اس طرح کی ٹھیکیداری کرتے ہیں وہ یقیناً جدیدیت کا کوئی غیر معمولی فلسفیانہ تصور وضع کرنا چاہتے ہیں۔

اس لئے دیکھنا چاہئے کہ آج کی اُردو شاعری میں جدیدیت کے اس پُر تکلف تصور نے کیا گُل کھلائے ہیں۔ جہاں تک جدت اور تازگی کا تعلق ہے، یہ اتنی عام معمولی اور مسلّمہ بات ہے کہ صرف اس کی بنیاد پر کسی فلسفیانہ یا صوفیانہ جدیدیت کا تخیل نہیں قائم کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصطلاحی اور مدعیانہ جدیدیت کے علمبردار فکر میں ایک خاص قسم کی سرّیت و رمزیت اور فن میں انتہا پسندانہ بے قیدی و بے ضابطگی پر عمل پیرا ہیں۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ فکر و فن کے تمام اقدار و اصول اور مواد و ہیئت کے تمام قیود و ضوابط یکسر بدل جانے چاہئیں اور دنیائے ادب میں ایک ایسا بنیادی انقلاب برپا ہونا چاہئے، جو اب تک کی قائم شدہ ادبی روایات سے یکسر بے نیاز ہو، یعنی روایت سے مکمل بغاوت ہونی چاہئے۔ ہیئتِ شاعری سے لے کر استعاروں علامتوں، تلمیحوں، حتیٰ کہ محاورات میں بھی رد و بدل ہونا چاہئے۔ جدید اُردو شاعری کے اس حلقے میں انقلابی تغیّر و تبدل کی یہی وہ تمنا ہے جس نے اپنے بے محابا اظہار کے لئے نظمِ آزاد کی شکل اختیار کی ہے۔ چنانچہ یہ نظمِ آزاد صرف عروض کے مسلّمہ آداب سے بیگانہ نہیں ہے، بلکہ اب یہ ہیئتِ اظہار بجائے خود ایک علامت بن گئی ہے۔ فکر و خیال اور زبان و بیان کی تمام بے قیدیوں اور بے ضابطگیوں کے لئے نیم پختہ افکار، اُلجھے خیالات اور خام احساسات و جذبات، نقصِ بیان اور عجزِ بیان ان سب کی نکاسی کا ایک آسان ذریعہ یہ نظمِ آزاد بن گئی ہے۔ لیکن جدیدیت کے علمبرداروں کی طرف سے حجت یہ پیش کی جاتی ہے کہ ان کے تازہ خیالات، انوکھے افکار اور نرالے احساسات اور جذبات پر اُردو شاعری کی تمام مروجہ ہیئتوں کا دامن تنگ ہو چکا ہے۔ اس لئے انہوں نے تجربے کی راہ اختیار کی ہے۔ اور اپنے آزاد تخیل کے لئے آزاد نظم کا وسیلۂ اظہار ہی انہیں سازگار آیا ہے۔

یہاں چند تنقیدی سوالات اٹھتے ہیں: کیا واقعہ یہی ہے کہ ہمارے جدید شاعروں نے نظمِ آزاد کو ذاتی تجربے کے نتیجے میں اختیار کیا ہے؟ کیا واقعی ان کے خیالات ایسے منفرد ہیں کہ اُردو شاعری کی مسلّمہ ہیئتوں میں ان کا اظہار ممکن یا موزوں نہیں ہے اور نہ یہ ممکن اور موزوں ہے کہ ان ہیئتوں میں کچھ جزوی توسیع کر کے اُن سے کام لیا جائے۔ جس طرح ماضی میں بعض جدت طراز فن کاروں نے مستزاد مربّع، مسدّس، مخمّس، قطعہ اور ترجیع بند کے ذریعے کام نکالا تھا؟ مجھے شک ہے کہ ہمارے جدید شاعروں نے اپنی فنی روایت کی جست و جو اور اس کے وسائلِ اظہار پر ریاض کیا ہی نہیں ہے، جس کے بعد ہی وہ کوئی انوکھا تجربہ کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے۔ اور میرے نزدیک اس شک کا ثبوت یہ ہے کہ آزاد نظم نگاروں نے پابند اور روایتی

نظم نگاری کی کسی بھی ہیئت میں اپنی شاعرانہ صلاحیت کا کوئی نمونہ نہیں پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ غزل جیسی رواں ہیئت میں بھی ان کا ناطقہ بند معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح صورتِ حال یہ ہے کہ آزاد نظم نگاری کے لئے ان جدید شاعروں کی اہلیت اور دیانت ہی مشتبہ ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جو شاعر بگڑ کر مرثیہ کہا کرتا تھا وہ اب نظم میں اپنا قافیہ تنگ پاکر آزاد نظم میں قسمت آزمائی کر رہا ہے۔ اس موقع پر بعض لوگ شاید کہنا چاہیں کہ آزاد نظم کا تجربہ بالکل نومولود نہیں ہے بلکہ اس تجربے کی روایت کا سراغ کسی نہ کسی شکل میں عبدالحلیم شرر تک لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک تاریخی حقیقت میں ان لوگوں کو یاد دلانی چاہوں گا وہ یہ کہ اقبال اور ان کے برابر کے اور چھوٹے ہم عصروں نے اس تجربے کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا، اور حقیقت یہ ہے کہ کسی قابلِ ذکر شاعر نے اس تجربے کو اپنے فن کی روایت بنانے کا اعزاز نہیں بخشا۔ چنانچہ یہ تجربہ پچھلے دس سال سے قبل کبھی بھی ہمارے ادب میں ایک تحریک یا واضح رجحان نہ بن سکا۔ ان حقائق سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ آزاد نظم کا تصور ایک تو مستعار ہے، فیشن کی طرح، دوسرے، یہ عجزِ بیان اور فنی نااہلی کا ایک پردہ ہے۔

ہمارے جدید شاعروں نے آزاد نظم نگاری اُدھار لی ہے مغربی ادبیات، بالخصوص انگریزی سے۔ اس سلسلے میں چند فنی حقائق سنجیدہ حضرات کے غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہوں۔ ہر ادب کا اپنا ایک ذہن اور مزاج ہوتا ہے، بالخصوص ہر ادب کی شاعری اس موسیقی پر مبنی ہوتی ہے جو اس ادب کے معاشرتی ماحول میں پائی جاتی ہے، اور مغربی اور مشرقی موسیقیوں کے درمیان نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ اُن کی نغماتی قماشیں ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیائی اور یوروپی شاعریوں کے عروض کی بنیادیں یکسر مختلف ہیں۔ چنانچہ شاعری کے بنیادی آہنگ میں اس فرق کے سبب دونوں خطوں کی منظومات کا ڈھنگ اور ڈھانچہ ایک دوسرے سے اس حد تک مختلف ہے کہ کسی بھی کھینچ تان سے اُن کے درمیان تطبیق و اشتراک ممکن نہیں۔ اب دیکھئے کہ یورپ میں نظم آزاد کی پیدائش اور پرورش کن حالات کے تحت ہوئی ہے۔ اس معاملے میں اہم ترین فنی نکتہ یہ ہے کہ مثال کے طور پر انگریزی شاعری میں سب سے پہلے تو سولہویں سے انیسویں صدی تک تقریباً چار صدیاں پابند نظم نگاری سے نظم معریٰ کی طرف ارتقا، فن کے استحکام میں لگ گئیں۔ اس کے بعد کچھ فن کاروں کو نظم آزاد کا تجربہ کرنے کا حوصلہ ہوا، جب کہ ایک تو انگریزی موسیقی اور اس پر مبنی عروض کی طرف سے اس تجربے میں کوئی مزاحمت نہیں تھی، دوسرے نظم معریٰ نے بڑی حد تک راہ ہموار کر دی تھی دوسرے اہم بات یہ کہ دورِ حاضر میں تمدنی ترقیات کے اندر بعض الم ناک انحرافات کے باعث یورپ میں شاعری اور عمومی طور پر ادب کا تصور ہی بدل رہا ہے وہاں اب کسی فن کے لئے مستقل بالذات اور منضبط رہنا دشوار ہو گیا ہے اس لئے کہ زندگی کے تمام سانچے ٹوٹ چکے ہیں۔ اور ہر طرف خلط ملط اور انتشار و اضطراب کا دور دورہ ہے۔ فنونِ لطیفہ کی صورتِ حال یہ ہے کہ رقص، موسیقی اور موسیقی کے نت نئے بازاری انداز شاعری کے پورے رنگ و آہنگ کو توڑ مروڑ رہے ہیں۔ مصوری کے ایبسر یکٹ آرٹ اور کیوبزم وغیرہ نے شعری علائم و رموز کو تاراج کر کے رکھ دیا ہے اور رقص و موسیقی و مصوری کی یہ جدتیں بلکہ بدعتیں کسی فنی محرک یا کسی جمالیاتی مقصد کے تحت بروئے کار نہیں آئی ہیں، بلکہ ان سب کا محرک و مقصود غلیظ قسم کا تعیش و تلذذ یا محض تلوّن مزاج اور تفننِ طبع، تفریح اور خوشی فعلی، یا پھر کاروبار اور سوداگری ہے۔

اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ابھی تو ہماری شاعری میں نظم معریٰ کی بھی کوئی روایت نہیں بنی ہے۔ اس کے بس کچھ انفرادی، جزوی اور نہایت قلیل تجربے ہوئے ہیں۔ اس طرح بغیر کسی مستحکم فنی بنیاد پر نظم آزاد کے تجربے کا کیا حشر ہوگا۔؟ ارتقاء چھلانگ لگا کر نہیں ہوتا۔ اس کے لئے تسلسل اور تدریج درکار ہے۔ دوسرے، کیا ہمارے لئے اس قسم کے تجربوں سے گزرنا ضروری اور مفید ہے؟ ایک تو ہمارے یہاں ابھی وہ تہذیبی فضا ہی نہیں پیدا ہوئی ہے، جس کے عوامل اس قسم کے تجربوں کی تحریک کرتے ہیں، اس کے علاوہ کیا یہ فضا کوئی مرغوب و مطلوب چیز ہے۔ اور اگر یہ فضا پیدا بھی ہونے لگے تو بھی شاعری کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا خود شعریت کے لئے مناسب ہوگا؟ تیسرے کیا ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اپنی موسیقی اور عروض کی بنیادیں کھود کر ان کی جگہ مغربی بنیادیں نصب کر دیں۔ یا پھر اپنے عروض و موسیقی کو تتر بتر کر ڈالیں؟ چوتھے، ابھی خود مغربی ادبیات میں نظم آزاد کی قدر و قیمت کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ جب اُستاد کا حال یہ ہے تو شاگرد کا کیا بنے گا۔؟

آخر میں میں کہنا چاہتا ہوں کہ جدید اُردو شاعری درحقیقت صرف غلط رو آزادیوں اور بدعنوانیوں ہی کا مرکب نہیں ہے، بلکہ اس کے بہتر انداز بھی پائے جاتے ہیں۔

نئی کتابیں

رگِ ساز : شاہین غازی پوری ادبی مرکز۔ ڈھاکہ

گزشتہ پندرہ سال سے شاہین غازی پوری کا کلام ہند و پاک کے مشہور رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ مجموعہ اس کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس میں متعدد ترجموں کے علاوہ ۵۵ نظمیں اور ۴۳ غزلیں ہیں۔ نظموں میں مواد اور موضوع ہی نہیں، ٹکنک کے اعتبار سے بھی بڑا تنوع ہے۔ کہیں لطیف بیانیہ اسلوب میں بات کہی گئی ہے کہیں بعض جاندار تمثالوں سے محض فضا کی تخلیق کر دی گئی ہے اور کہیں ڈرامائی اور مکالماتی انداز نمایاں ہے۔ شاہین کی طویل نظموں کے مقابلہ میں مختصر نظمیں زیادہ تاثر آفریں ہیں۔ صرف تین مصرعوں کی ایک مختصر نظم " انتظار " دیکھئے۔

رات گئے جب آہٹ سی محسوس ہوئی
ہاتھ بڑھا کر برہن نے پٹ کھول دیئے
آنے والا سرد ہوا کا جھونکا تھا۔

شاہین کی نظمیں ابہام، تجرید، اور لفاظی سے پاک ہیں اس کے ساتھ ہی انہوں نے پچھلے دور کی شاعری کے پامال اور روایتی مضامین سے بھی گریز کیا ہے۔ اُن کی غزلوں میں بھی ایک اچھوتی تازگی کا احساس ہوتا ہے غزلوں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جو عصرِ حاضر کی زندگی سے اُن کے ذہنی اور جذباتی رشتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔

ہم اور تم ابھی دیئے رہنے والے ہیں
نہ بے نیاز ہو اس قدر خدا کی طرح

نغمۂ شب :- اختر بستوی، شب خون کتاب گھر۔ الہ آباد

یہ ایک طویل نظم ہے۔ طویل اس معنی میں کہ تقریباً پچاس صفحات اور چار سو مصرعوں پر مشتمل ہے۔ نظم کا مرکزی خیال یوں ہے کہ شاعر تیرہ و تار فضاؤں میں رات کی دیوی کا درد بھرا نغمہ سنتا ہے اور اس سے سوال کرتا ہے کہ کن دکھوں نے تیرے گیت کو درد و غم کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ رات جواب دیتی ہے ؎

تیرے لئے اس راز کو بھی افشاں کرتی ہوں اے ہمدم
تین قسم کے دکھوں نے مرے نغمے کو بخشا ہے کرب
زیست کا صدمہ، موت کی بے دردی کا الم، حالات کا غم

اس کے بعد رات ان تینوں غموں کی نوعیت کو مثالوں سے واضح کرتی ہے اور اس دنیا میں انسان کی بے بسی، مجبوری اور مظلومی پر روشنی ڈالتی ہے۔ نظم میں رات کی کیفیات کو کہیں کہیں شاعرانہ حسن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے نظم اپنی تعمیر اور تاثر کے اعتبار سے ایک اوسط درجے کی تخلیق ہے۔

بادۂ شبانہ :- پیام فتحپوری، ادارہ شعر و ادب کانپور

پیام فتحپوری کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ جس میں اُن کی ۵۰ منتخب غزلیں شامل ہیں۔ پیام فتحپوری ان شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اگرچہ مشاعروں میں شہرت حاصل کی لیکن وہ اس طلسم کے اسیر نہیں ہوئے۔ اُن کی غزلوں میں اس طرح کا چٹخارہ، شوخی اور سطحیت کہیں نظر نہیں آتی جو مشاعرہ کے شاعروں کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی داخلی کیفیات کی شدت اور کیفیت کو غزل کی شائستہ رمزیاتی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں یہ صحیح ہے کہ اُن کی غزلوں میں عشقیہ تجربات کی فراوانی ہے لیکن یہ عشق نہ تو رسمی ہے اور نہ ہی محض عشق۔ اس بلاخیز جذبہ کی آگ میں بہت سے دوسرے بے نام جذبات کی چنگاریاں بھی شامل ہوئی ہے۔ اس طرح کہ کبھی کبھی وہ پوری زندگی پر محیط نظر آتا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

کیا کوئی سرفروش نہیں شہرِ عشق میں !
مدت ہوئی کہ کوچۂ قاتل اُداس ہے

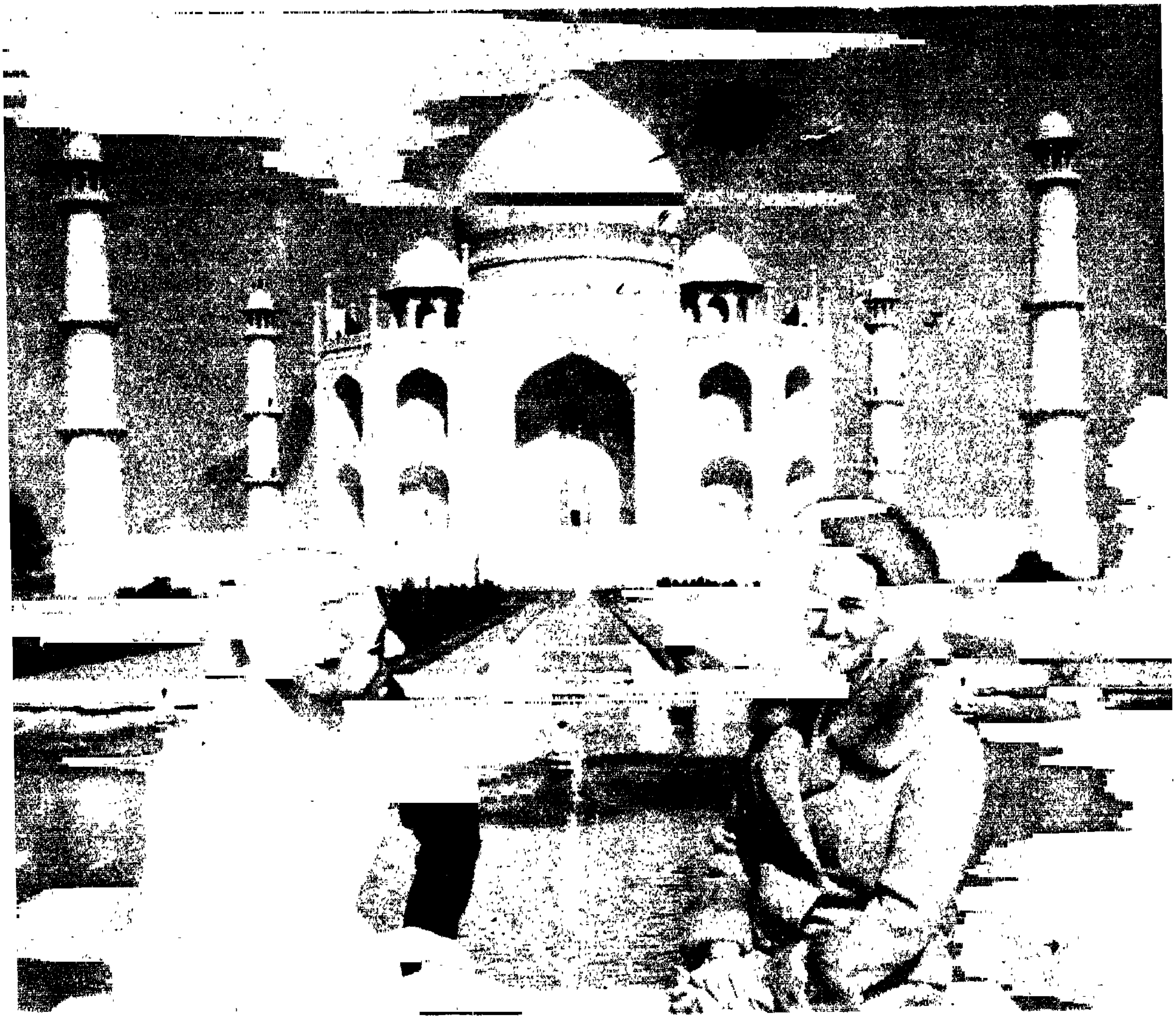
ہوئی خوشی جو میسر تو یہ ہوا معلوم
خوشی کا بوجھ اٹھانا محال ہے کتنا

ہر دشتِ طلب میں ہے تری زُلف کی شبنم
ہر دشتِ جنوں میں ترے قدموں کی صدا ہے
(قمر رئیس)



(اوپر) ۲۲ فروری ۱۹۷۰ء کو وزیرِاعظم شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں "ایوانِ غالب" کا سنگِ بنیاد رکھا۔
(نیچے) ۱۴ فروری ۱۹۷۰ء کو وزیرِاعظم شریمتی گاندھی نے دہلی کے نزدیک تغلق آباد میں ادویات اور طبی تحقیق کی تاریخ کے ادارے کی لائبریری اور میوزیم کا افتتاح کیا۔ وزیرِاعظم کے ساتھ اس ادارے کے صدر حکیم عبدالحمید کھڑے ہیں۔





بیجیم کے بادشاہ اور ملکہ نوروز کے سرکاری دورے پر ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپ نے ہندوستان کے کئی مقامات کی سیاحت کی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۷۰ء کو آپ نے تاج محل دیکھا۔

Vol. 28 No. 9 **AJKAL (Monthly)** **APRIL 1970**

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by the Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd No D-509





فورٹ ولیم کالج نے ہندوستانی زبانوں خصوصاً اُردو کی ترقی میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کالج سے متعلق یورپی مستشرقین اور مقامی لوگوں نے اُردو کی نشوونما میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے

ابتدائی کتابوں کی ترتیب و تدوین کے علاوہ اس کالج نے مختلف زبانوں کے چھاپے خانے قائم کرکے ان زبانوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع عطا کئے۔ اس کالج کی لائبریری کا گراں قدر خزانہ اب نیشنل آرکائیوز نئی دہلی کو منتقل کر دیا گیا ہے۔

۲۶ مارچ سے ۲ اپریل ۱۹۷۰ء تک ان کتابوں کی ایک نمائش انڈیا انٹرنیشنل نئی دہلی میں منعقد کی گئی۔ اس میں اردو، فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت، بنگلا اور تامل وغیرہ کی بڑی نادر کتابیں اور مخطوطے رکھے گئے تھے۔

ہندوستان کے چیف جسٹس جناب ہدایت اللہ نے اس نمائش کا افتتاح کیا۔ (تصویر میں) جناب ہدایت اللہ نمائش میں پیش کردہ کتابیں دیکھ رہے ہیں۔

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۲۸ — شمارہ ۱۰

مئی ۱۹۷۰ء

ویساکھ جیٹھ شک ۱۸۹۲

سرورق : عکس : چودھری جوگین

پشت پر : نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ نئی دہلی کے احاطے میں نصب مجسمہ "محنت کی جیت" تخلیق "ڈی پی رائے چودھری"

ترتیب

سالانہ چندہ ہندوستان میں : سات روپے : پاکستان میں : سات روپے (پاک)

دیگر ممالک میں : ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ ہندوستان میں : ۶۰ پیسے : پاکستان میں : ۶۰ پیسے (پاک)

دیگر ممالک سے : ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

شہباز حسین ایڈیٹر آجکل پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

بھارت اور پاکستان کے درمیان اسلام آباد میں فرخا پراجیکٹ سے متعلق سرکاری سطح پر گفتگو کا چوتھا دور بھی ختم ہو گیا۔ اس گفت و شنید کا اہم مقصد تکنیکی مسائل سے متعلق ماہرین کے اب تک کے مطالعے کا جائزہ لینا تھا۔ مگر افسوس تکنیکی مسائل پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔

یہ کانفرنس آٹھ ماہ کے بعد منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں پاکستان نے اس خالص تکنیکی نوعیت کے مسئلے کو اپنے مفاد کی خاطر سیاسی مسئلہ بنانے کی کوشش کی حالانکہ بھارت نے بات چیت کے دوران ہر بار یقین دلانے کی کوشش کی کہ فرخا بیراج سے مشرقی پاکستان میں سیلاب کی روک تھام ہو سکے گی اور اس کے مفاد کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہونچے گا۔

اسلام آباد میں جو بات چیت ہوئی اس میں پاکستان نے غیر ضروری مسائل اُٹھا کر اس گفت و شنید کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی۔ ایک مرحلہ تو ایسا آیا جب یہ محسوس ہونے لگا کہ پاکستان بات چیت ملتوی کرنا چاہتا ہے۔ بہرحال بھارت کی کوششوں سے یہ اندیشہ ٹل گیا۔

آج سے چند سال قبل پاکستان نے خود دور یورپ کے ممالک سے متعلق اقتصادی کمیشن کے اجلاس میں تسلیم کیا تھا کہ پوربی پاکستان میں پانی کی کمی کا مسئلہ نہیں بلکہ سیلاب کی روک تھام کا ہے لیکن اب اس کانفرنس میں صرف ہندوستان کو پریشان کرنے کے لئے پانی کی کمی کا مسئلہ کھڑا کیا گیا۔

بھارتی وفد کے سربراہ شری وی دی جاری نے ہندوستان کے موقف کا اعادہ کیا کہ پاکستان کو دریائے گنگا سے جو صرف بھارت کا دریا ہے، پانی حاصل کرنے کے لئے اپنی ضرورتوں کے بارے میں صحیح صحیح اعداد و شمار مرتب کرنے چاہئیں لیکن پاکستان نے اپنے ابتدائی اندازے سے ہم اگنا زیادہ ضرورت بتائی حالانکہ اس سے پیشتر گزشتہ سال جولائی میں پاکستان نے صرف ۳۵۰۰ کیوسک پانی کی ضرورت بتائی تھی۔ پاکستان نے اس قدر پانی کی ضرورت اس لئے بتائی کہ دریائے پدما پر مجوزہ بند کی تعمیر ہو سکے جو کہ فرخا بیراج کے بہاؤ کی جانب ۹۰ میل کے فاصلے پر ہوگا۔

پاکستان نے جس قدر پانی کی ضرورت بتائی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجوزہ پراجیکٹ صرف کاغذی ہے اور اس کا مقصد صرف بھارت کے خلاف جارحانہ پراپگنڈہ میں مزید شدت پیدا کرنا ہے۔

دراصل جس دن سے کلکتہ کی بندرگاہ کو ریت سے اٹ جانے سے بچانے کے پیش نظر بند کی تعمیر کا پروگرام بنایا گیا، پاکستان نے بڑی شدت سے اس کی مخالفت شروع کردی حالانکہ کلکتہ بندرگاہ کی گودی کو ریت سے بھر جانے سے جو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اس کے لئے نیز کلکتہ کے تحفظ کے لئے یہ بند بے حد ضروری ہے۔

بھارت ایک اچھے ہمسائے کی طرح پاکستان سے باہمی گفت و شنید کے ذریعے اس کا حل تلاش کرنا چاہتا ہے لیکن پاکستان اسے بین الاقوامی مسئلہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس میں کچھ غیر ممالک کو بھی الجھا رہا ہے۔ دراصل پاکستان اس تکنیکی مسئلے کو سیاسی رنگ دے رہا ہے جو کہ بالکل نامناسب ہے — بہرحال امید کرنی چاہئے کہ نئی دہلی میں ہونے والی بات چیت کے دوران پاکستان اس مسئلے کے تکنیکی پہلو پر توجہ دے گا تاکہ اس کی بنیاد پر باہمی مفاہمت کی راہ نکل سکے۔

آج کل دہلی

مئی ۱۹۷۰ء



غزلیں

نازشؔ پرتاب گڈھی

(۱)

صدہا گلِ دلگداز قدم چوم رہے ہیں
ہم آبلہ پا دشت میں یوں گھوم رہے ہیں

آتے ہوئے لمحات اُنہیں چوم رہے ہیں
صدیوں سے تہِ تیغ جو حلقوم رہے ہیں

قاتل ہیں مگر شہر میں یوں گھوم رہے ہیں
جیسے کہ ازل ہی سے یہ معصوم رہے ہیں

ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرح بکھرے پڑے ہیں
وہ لمحے کہ جو زیست کا مفہوم رہے ہیں

حالات بتاتے ہیں کہ ہم سخت گنہگار
احساس یہ کہتا ہے کہ معصوم رہے ہیں

اے سنگِ حقائق! ترے ہر جبر کے باوصف
سینے بھی ہر اک دور کا مقسوم رہے ہیں

شاید نظر آجائیں کسی پھول کے لب بھی
آواز کے صحراؤں میں ہم گھوم رہے ہیں

تنہائی ماحول کی بانہوں سے نکل کر
سینے ہیں کہ ناگوں کی طرح جھوم رہے ہیں

مصلوب کیا جن کو کسی دورِ خرد نے
تاریخِ جنوں میں وہی معصوم رہے ہیں

مانا کہ عبارت ہے تو اک حرفِ جنوں سے
اے زیست! مگر ہم ترا مفہوم رہے ہیں

پھر آنہ سکا حسنِ زلیخا نفسی تک
آدابِ جنوں گو اُسے معلوم رہے ہیں

اخلاص لٹاتے رہے ہر دشمنِ جاں پر
ہم لوگ بھی کیا سادہ و معصوم رہے ہیں

اس تلخ حقیقت پہ یقیں آئے گا کس کو
جو آج ہیں ظالم کبھی مظلوم رہے ہیں

گزرے ہوئے لمحوں کے گھنے شہر میں نازشؔ
تنہا ہیں مگر رات گئے گھوم رہے ہیں

(۲)

درد اُٹھتے ہی ہونٹوں سے ہنسی پھوٹ پڑی ہے
تادیبِ غمِ عشق! تری بات بڑی ہے

کیا ضبطِ ستم پر کوئی اُفتاد پڑی ہے
کیوں لذتِ غم روٹھی ہوئی مجھ سے کھڑی ہے

آج اس کی نظر یوں مری نظروں سے لڑی ہے
تپتے ہوئے صحراؤں پہ اک بوند پڑی ہے

جذبات کے چہرے بہے جاتے ہیں پگھل کر
بے رحمئ حالات کی دھوپ اتنی کڑی ہے

کہتے ہیں میں آپ اپنے کو پہچان رہا ہوں
سنتا ہوں کہ یاروں پہ قیامت کی گھڑی ہے

فرصت ہو تو اے لذتِ غم اس سے بھی مل لے
سعئ کرم و لطف ترے در پہ کھڑی ہے

مانگیں غمِ امروز سے ہنسنے کی اجازت
رونے کے لئے تو ابھی اک عمر پڑی ہے

مصلوب ہوا کرتی ہیں تنہائیاں میری
سولی مرے احساس کے آنگن میں گڑی ہے

لا، ترکِ محبت کا تقاضا بھی مجھے دے
یہ بھی مری زنجیرِ تمنا کی کڑی ہے

جو شدتِ غم دل کے اُڑا دیتی ہے ٹکڑے
وہ بن کے تبسم مرے ہونٹوں پہ کھڑی ہے

اس دور کا انسان ہے جلتا ہوا جنگل
جو لمحۂ ہستی ہے قیامت کی گھڑی ہے

سامانِ تجارت ہے نہ ارمانِ تجارت
ہستی مری بازار میں حیران کھڑی ہے

اس دور کے منصور ہیں محلوں میں فروکش
سولی ہے کہ بازار میں سنسان پڑی ہے

میں ہوں متوجہ تو کرے کوئی گزارش
دو گام پہ مجھ سے مری تقدیر کھڑی ہے

دنیا کو دکھانے کے لئے جب بھی ہنسا ہوں
نازشؔ مرے زخموں کی مہک پھوٹ پڑی ہے

جمیل مظہری



نقشِ کارواں

(۴)

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

میری شخصیت کی تعمیر میں کون سے عناصر کارفرما ہوئے اس سوال کے ساتھ میری زندگی کا المیہ میرے سامنے آرہا ہے۔

مجھے کیا بننا چاہئے تھا اور میں کیا بن گیا: اپنی محرومیوں اور اپنی تقصیروں کی داستان کیا دہراؤں اور اگر دہراؤں تو کہاں سے دہراؤں؟ جس شخصیت کے بارے میں مجھ سے پوچھا جا رہا ہے، اس کی تعمیر ہوئی کب؟ وہ تو شاید بننے سے پہلے بگڑ گئی؟ کیوں بگڑ گئی اور کیسے بگڑی؟ اس سوال کے جواب کے سلسلے میں غالب کا ایک شعر میرے ذہن کی رہنمائی کر رہا ہے ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

غالب کا عقیدہ یہ ہے کہ بعض حالات میں طبیعت کو اپنی گمرہی کا احساس ہو جاتا ہے لیکن دل کے تقاضوں کے مقابلے میں اس کی قوتِ ارادی اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہش کے باوجود سیدھی راہ چل نہیں پاتا۔ جو بھی قدم اٹھتے ہیں اس کے ارادے کے خلاف اٹھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ایک طاقت اور بھی ہے جو آدمی کے ارادوں پر اس طرح مسلط ہوتی ہے اور اُدھر جانے نہیں دیتی جدھر وہ اپنائے عقل و ہوش جانا چاہتا ہے۔ یہ ایک بے بسی کی منزل ہے لیکن اس سے خطرناک مرحلہ وہ ہے جہاں عقل و ہوش کا تقاضا خود انسان کو غلط راستے پر چلنے کی ترغیب دے۔ یہی وہ مرحلہ صعب ہے جس کا احساس مجھے زندگی کے ایک موڑ پر ہوا ؎

جمیل کو گمرہی مبارک کہ اب تو سامان بھی وہی ہے
جو دل کی وحشت کا ہے تقاضا، خرد کا میلان بھی وہی ہے

میری زندگی میں اکثر اقدامات ایسے ہی ہوئے کہ جدھر دل کی وحشت کا تقاضا تھا، خرد کا میلان بھی اُدھر ہی رہا لیکن چند قدم آگے بڑھ کے نتیجے نے بتلایا کہ خرد کا میلان مجھے غلط راستے پر لے گیا تھا۔ لیکن بعض حالات میں بقول غالب ایسا بھی ہوا کہ خرد نے ثوابِ طاعت و زہد کو سمجھ تو لیا لیکن سمجھ کے بھی طبیعت کے اندرونی تقاضوں سے مجبور ہو کر اسی راستے پر چل پڑی، جدھر وہ لئے جا رہے تھے۔ میں کیا میری فکر و نظر کے رہنما، غالب کی زندگی کا المیہ بھی یہی تھا ؎

ما نہ بودیم بریں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

غالب شاعر نہیں بننا چاہتے تھے لیکن حالات نے انہیں شاعر بنا دیا۔ کم و بیش یہی صورتِ حال میرے ساتھ بھی ہوئی۔ میں نے بھی اپنے شعور کی کسی منزل میں اپنے لئے شاعر ہونا پسند نہیں کیا لیکن ماحول کا اثر کہئے یا طبیعت کے محرکات، جنہوں نے میری مرضی کے خلاف مجھے کچھ اور بننے نہ دیا، شاعر بنا دیا اور شاعر بھی کیسا؟ جس کی شاعری مشہور ہو تو ہو مقبول نہیں۔ مقبولیت کا راز کلام کے پسندیدۂ عوام ہونے میں ہے، بے چیدہ اور سنجیدہ بات مطبوع نہیں ہوتی۔ غالب اپنے کلام کی پیچیدگی سے خوش تھے کیونکہ اُن کی خودی کو گوارا نہ تھا کہ نچلی سطح کے لوگ ان کی بات سمجھ لیں ؎

"خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے"

لیکن میری خودی کا تقاضا یہ تھا کہ لوگ میری بات زیادہ سے زیادہ سمجھیں اور سمجھ کے مجھے دادِ تحسین سے نوازیں مگر اس تمنا کے باوجود میں اپنے کلام کو فہمِ عوام کے مطابق نہ بنا سکا۔ حالانکہ اپنی پوری قوتِ ارادی کے ساتھ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جو کچھ کہوں اسی رنگ میں کہوں جو رنگ مقبولِ زمانہ ہے۔ غالب کی طرح میری شاعری کا نظریہ یہ کبھی نہ رہا کہ

سخنِ سادہ دلم را نہ فریبد غالب
نکتۂ چند ز پیچیدہ بیانی بہ من آر

میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ وہ کون سے محرکات تھے جنہوں نے مجھے غالب کی پیچیدہ بیانی کا مقلد بنایا۔ نہ گھر کا ماحول ایسا تھا، نہ اس معاشرے کا جن میں میرے ذوقِ طبیعت نے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ گہوارے میں جب کہ میرے شعور کی آنکھیں بالکل مُندی ہوئی تھیں، میرے کان میں جو شاعری کی پہلی آواز گئی وہ میر انیس کے مراثی کے بند تھے جنہیں میرے والد مرحوم گنگنایا کرتے تھے اور اُن کی یہ گنگناہٹ میرے لئے لوری کا کام کیا کرتی تھی۔ جب گہوارے سے اُتر کر پاؤں پاؤں چلنے لگا تو آدمیوں کا پہلا اجتماع جو میں نے دیکھا تو وہ محرم کی مجلسیں تھیں جن میں میرے ابا مرحوم انیس کا مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ میں مجلس سے گھر آکر اُن کی نقل کرتا اور اپنی توتلی زبان میں انیس کے مصرعے دہراتا۔

جب سات آٹھ سال کی عمر ہوئی تو والد نے ایک سلام رٹوا کر مجھے منبر پر پہونچا دیا۔ اس وقت سے عنفوانِ شباب تک برابر محرم میں مرثیہ خوانی کرتا رہا اور چودہ سال کی عمر میں میری شاعری کی ابتدا غزل سے نہیں سلام سے ہوئی جس میں کچھ اشعار میرے اور کچھ میرے والد مرحوم کے ہوتے۔ شاید ذوقِ سخن کی اسی ابتدائی تربیت نے مجھ سے میری شاعری کے عہدِ شباب میں مرثیے کہلوائے۔ آج بھی جن کے مطالعے کے بعد میرا نقاد یہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُن میں انیس کے آہنگ سے زیادہ غالب کا آہنگ اور انیس کے اندازِ فکر سے زیادہ غالب کا اندازِ فکر قبول رہا ہے۔ حالانکہ جس معاشرے میں میرا ذوقِ سخن جوان ہوا، اُس کے کسی گوشے میں غالب کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ والد کے علاوہ میرے دادیہالی اور نانیہالی بزرگوں میں کوئی بھی غالب کا پرستار نہ تھا۔ سبھی میر و آتش اور ذوق کا پیالہ پیئے ہوئے تھے۔ گھرانوں کی نشستوں میں میر کے اشعار پر سر دھنے جاتے، ذوق کی بامحاورہ زبان کی داد دی جاتی اور آتش کے قلندرانہ آہنگ کی تشریح کی جاتی۔ غالب اُن کے لئے شاید دوم درجے کے شاعر تھے جو اُن کی نظر میں زبان کشی کے بھی مجرم قرار دیئے جاتے تھے۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں جب مجھے کہیں سے غالب کا دیوان ہاتھ لگ گیا تو میرے ا جان نے مجھے اس کے مطالعے سے یہ کہہ کر روکا کہ اس سے تمہارا ذوقِ سخن بگڑ جائے گا اور زبان خراب ہو جائے گی۔ تمہارے دادا (یعنی مولانا سید مظہر حسن جن کی نسبت سے میں مظہری ہوں) ہمیشہ اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتے تھے کہ اپنے ذوق کی تربیت کے لئے ذوق کا دیوان بغور پڑھیں۔ نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جس نے مجھ سے غالب کا دیوان پڑھوایا اور تمام عظیم شعراء کو چھوڑ کر غالب کا دل دادہ بنایا۔ میرے ذوقِ سخن کا سانچہ بنانے میں، غالب سے پہلے اقبال کا ہاتھ ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کے ذریعے میں غالب تک پہونچا جب کہ میری عمر بچپن کے مرغزار کے آخری کنارے پر پہونچ رہی تھی، میری ملاقات اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ سے ہوئی۔ یہ مرغوب ایجنسی کا دیدہ زیب پاکٹ ایڈیشن تھا جسے میں نے شروع سے آخر تک بار بار پڑھا۔ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا لیکن بار بار پڑھنے سے اس کے بہت سے بند ازبر ہوگئے۔ جو اشعار سمجھ میں نہ آتے وہ بھی اپنے آہنگ کی بنا پر خوش گوار معلوم ہوتے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ جوابِ شکوہ کا یہ بند جسے اقبال نے بعد میں خارج کر دیا، میں بار بار پڑھا کرتا تھا۔

کشورِ ہند میں کلیۂ ناکام کا بت
عربستان میں شفاخانۂ اسلام کا بت
لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت

لیکن اُس وقت اس بند کے کسی مصرع کی تلمیح میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بُت سے شاعر کا کیا مقصود تھا، یہ تو مجھے اُس وقت سمجھ میں آیا، جب کہ میں غالب کے اس شعر کو سمجھنے کے قابل ہو گیا

کثرت آرائیِ وحدت میں پرستاریِ وہم
کردیا کافرِ اصنام خیالی نے مجھے

اس میں شک نہیں کہ میرا دماغ جو گھریلو اور معاشرتی روایات سے بت خانۂ روایات تھا اُس کے بہت سے بُت غالب ہی نے توڑے۔ اور یہ کہنا سو فیصدی صحیح ہے کہ اگرچہ میری شاعری غالب، اقبال، انیس اور شاد کی مشترکہ مخلوق ہے لیکن اس تخلیق میں غالب کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ میری مخصوص ذہنیت کی تعمیر کے سلسلے میں، جو غالب نے کھود دی، اُس پر کچھ اینٹیں اقبال نے، کچھ رومی و عرفی نے اور کچھ کیٹس و ورڈسورتھ نے رکھیں۔ شعراء کے علاوہ مغربی مفکروں

وہ مجھے خاموش نظر آئے اور اس کے لئے مجھے پیچھے مڑ کر محمد کی طرف ہی دیکھنا پڑا، جو مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑے میرے اس اضطراب ذہنی پر مسکرا رہے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ محمدؐ اور بدھ نے جو کچھ چاہا وہ اُن کے بعد بھی ہو سکا یا نہیں ؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ بدھ مت نے فقیروں کی ایک قوم بنائی جس نے خدمت دنیا کی جگہ ترک دُنیا کو اپنا شعار ٹھہرایا۔ اسلام نے مجاہدوں اور فاتحوں کی ایک امت تیار کی جس نے ملک گیری ہی کو مذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھا ؎

خرد بہ عالم حیرت کہ این چہ بوالعجبی

کتب تاریخ کا مطالعہ بچپن ہی سے میرا مشغلہ رہا۔ اس کی روداد بھی سُن لیجئے۔ پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرا گھرانہ راسخ العقیدہ شیعہ گھرانہ تھا اس لئے تشیع بچپن ہی سے مرے ذہن میں راسخ رہا۔ میرے ایک بزرگ جو سنی عقیدہ رکھتے تھے، میرے دوسرے بزرگوں سے برابر مناظرانہ بحثیں کرتے رہتے تھے۔ جب اُن کو کوئی نہیں ملتا تو ہم بچوں کو ہی اپنی بحث میں الجھا لیا کرتے — اُن ہی کے فیضان صحبت سے مجھے مناظرے کا چسکا پڑا اور میں نے اسی عمر میں شیعہ سنی مناظرے کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جب اُن سے کوئی فیصلہ کن بات سمجھ میں نہ آئی تو میں نے تاریخ اسلام کی ورق گردانی شروع کی۔ رفتہ رفتہ یہ ذوق یہاں تک پہونچا کہ میں نے اسلامی تاریخ کے عربی ماخذوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے فارسی، اُردو اور انگریزی ترجمے جو مجھے میسر آئے، سب پڑھ ڈالے۔ جیوں جیوں پڑھتا گیا تسنن اور تشیع کے اختلافات کے سارے راز مجھ پہ کھلتے گئے۔ اور اب اپنی عمر کے خاتمے پر جب کہ فکر و نظر کے طلسم ایک ایک کرکے ٹوٹ رہے ہیں، میں آج بھی دونوں کے متعلق اقبالؔ کی زبان سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ ؎

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی

مذہب کے سلسلے میں حقیقت کی جستجو نے مجھے مابعدالطبعیاتی مباحث میں بھی الجھا دیا اور میں نے جبر و اختیار اور خیر و شر کے مسائل پر بھی غور کرنا شروع کیا۔ جبریوں اور قدریوں، معتزلہ اور اشاعرہ کی بحثیں بھی پڑھیں لیکن گتھی سلجھنی تھی نہ سلجھی۔ مشکل یہ تھی کہ انسان کو بالکل مجبور سمجھ لیا جائے تو دنیا میں جو برائیاں ہیں اس کا خالق بھی خدا ہی کو سمجھنا چاہیئے یا شر کی تخلیق کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے ایک اور خدا تصنیف کرنا ہوگا۔ یہ ذہنی کشمکش خدا کی ذات سے صفات کو منسوب کرنے کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اگر اس کو قادرِ مطلق مانئے تو وہ اس دکھ بھری دنیا کا خالق ہونے

مستقل انقلاب انسان کے نفس
یہ کام کئی ہزار برس میں نہ ہو سکا
پہنچ چکا ہے۔ ادیب و شاعر سے
داستان سرائیوں سے فرصت

ایمان ہے اور میں پورے یقین کے
سے ممکن نہیں۔ اور تشدد ہی کیا
جب معاشرے کے عدم مساوات
جواب دیا کہ دولت مند، دولت
مجھے ان سے پوچھنے کا یہ موقع مل جاتا
میں بھی یہ امانت نہ پہونچا سکا تو
چھین لی جائے۔ لیکن سوچتا ہوں
کہ چھینی کس طرح جائے ؟ کیا تلوار
سے ہاتھ میں ہے وہ کل ان کے
بس نہ لے لیں گے ؟ جس کی لاٹھی
یہ سلسلہ دُنیا کی عمر طبعی تک دراز
غرض تشکیک کی بیماری ہر حال میں
مجھے کوئی ایسا جنون بھی میسر نہ آسکا
ہو جاؤں۔ مذہبی جنون یا سیاسی
پر عمر کے کسی حصے میں طاری ہو جاتا
سی حد تک نجات مل جاتی۔ لیکن اسے
کہ مجھے سکون کیا جنون کی بھیک
نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں خدا
کا پرستار ہو گیا جب بھی میں نے
کر کہا، یہ معلوم کرنے کی تمہیں کیا
ہیں معلوم کرتے کہ تمہارے محلے میں
ہیں یا نہیں۔ یا تمہارے شہر میں۔ جو
میں آگ ہے یا نہیں۔ گوتم بدھ کے
یہی، فرد کے ارتقائے روحانی کا
کی بہبود کا پروگرام اُن سے پوچھا تو

بڑھتا ہے، وہ تلوار سے گر بھی سکتا ہے۔ ایک مستقل انقلاب انسان کے نفس ذہن کی تربیت ہی سے ممکن ہے، مذہب سے یہ کام کئی ہزار برس میں نہ ہو سکا راب وہ اپنی عمر طبعی کی آخری منزلوں میں پہونچ چکا ہے۔ ادیب و شاعر سے نایدیہ کام ممکن تھا لیکن انہیں حسن و عشق کی داستان سرائیوں سے فرصت ہیں۔

گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد پر میرا پورا ایمان ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ تشدد کا استیصال تشدد سے ممکن نہیں۔ اور تشدد ہی کیا سی برائی کو برائی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب معاشرے کے عدم مساوات اعلاج میں نے باپو سے پوچھا تو انہوں نے وہی جواب دیا کہ دولت مند، دولت امالک نہیں دولت کا امین ہے۔ کاش مجھے ان سے پوچھنے کا یہ موقع مل جاتا ، دولت کا امین جب حقداروں تک کسی عہد میں بھی یہ امانت نہ پہونچا سکا تو ایسے خائین امین خائین سے امانت کیوں نہ چھین لی جائے۔ لیکن سوچتا ہوں ، شاید وہ میرے سوال کا یہی جواب دیتے کہ چھینی کس طرح جائے؟ کیا تلوار سے؟ اس کی کیا ضمانت ہے کہ جو تلوار آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ کل ان کے ہاتھ میں نہ آئے گی؟ اور وہ چھینی ہوئی چیز واپس نہ لے لیں گے؟ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، اگر اس اصول کو مانا جائے تو یہ سلسلہ دنیا کی عمر طبعی تک دراز ہوتا رہے گا۔ اس مسئلہ کا حل کیسے سمجھا جائے، غرض تشکیک کی بیماری ہر حال میں میرے دماغ پر حاوی رہی۔ سکون تو سکون مجھے کوئی ایسا جنون بھی میسر نہ آسکا جس کی دھن میں محو ہو کر گرد و پیش سے غافل ہو جاؤں۔ مذہبی جنون یا سیاسی جنون، یا کسی ایک کی محبت کا جنون اگر مجھ پر عمر کے کسی حصے میں طاری ہو جاتا تو میرا گمان ہے کہ مجھے اضطراب ذہنی سے کسی حد تک نجات مل جاتی۔ لیکن اسے عقل کی فراوانی کہئے یا تشکیک کی بے چینی کہ مجھے سکون کیا جنون کی بھیک بھی کسی دروازے سے نہ مل سکی۔ گوتم بدھ نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں خدا اور مذہب سے بیگانہ ہو کر صرف انسانیت کا پرستار ہو گیا جب بھی میں نے خدا کے متعلق پوچھنا چاہا تو گوتم نے مجھے ٹوک کر کہا، یہ معلوم کرنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ تم یہ کیوں نہیں معلوم کرتے کہ تمہارے محلے میں جو مفلس عورتیں ہیں اُن کے بدن پر کپڑے ہیں یا نہیں۔ یا تمہارے شہر میں جو غریبوں کے گھر ہیں، اُن کے سرد چولہوں میں آگ ہے یا نہیں۔ گوتم بدھ کے یہاں مجھے سب کچھ ملا، تربیت نفس کا نظریہ بھی، فرد کے ارتقائے روحانی کا پروگرام بھی، لیکن جب بھی میں نے جماعت کی بہبود کا پروگرام اُن سے پوچھا تو

وہ مجھے خاموش نظر آئے اور اس کے لئے مجھے پیچھے مڑ کر محمد کی طرف ہی دیکھنا پڑا، جو مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑے میرے اس اضطراب ذہنی پر مسکرا رہے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ محمدؐ اور بدھ نے جو کچھ چاہا وہ اُن کے بعد بھی ہو سکا یا نہیں؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ بدھ مت نے فقیروں کی ایک قوم بنائی جس نے خدمت دنیا کی جگہ ترک دنیا کو اپنا شعار ٹھہرایا۔ اسلام نے مجاہدوں اور فاتحوں کی ایک امت تیار کی جس نے ملک گیری ہی کو مذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھا ؎

خرد بہ عالم حیرت کہ این چہ بوالعجبی

کتب تاریخ کا مطالعہ بچپن ہی سے میرا مشغلہ رہا۔ اس کی روداد بھی سُن لیجئے۔ پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرا گھرانہ راسخ العقیدہ شیعہ گھرانہ تھا اس لئے تشیع بچپن ہی سے مرے ذہن میں راسخ رہا۔ میرے ایک بزرگ جو سنی عقیدہ رکھتے تھے، میرے دوسرے بزرگوں سے برابر مناظرانہ بحثیں کرتے رہتے تھے۔ جب اُن کو کوئی نہیں ملتا تو ہم بچوں کو ہی اپنی بحث میں الجھا لیا کرتے ــــ اُن ہی کے فیضانِ صحبت سے مجھے مناظرے کا چسکا پڑا اور میں نے اسی عمر میں شیعہ سنی مناظرے کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جب اُن سے کوئی فیصلہ کن بات سمجھ میں نہ آئی تو میں نے تاریخِ اسلام کی ورق گردانی شروع کی۔ رفتہ رفتہ یہ ذوق یہاں تک پہونچا کہ میں نے اسلامی تاریخ کے عربی ماخذوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے فارسی، اُردو اور انگریزی ترجمے جو مجھے میسر آئے، سب پڑھ ڈالے۔ جیوں جیوں پڑھتا گیا تسنن اور تشیع کے اختلافات کے سارے راز مجھ پہ کھلتے گئے۔ اور اب اپنی عمر کے خاتمے پر جب کہ فکر و نظر کے طلسم ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے ہیں، میں آج بھی دونوں کے متعلق اقبال کی زبان سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ ؏

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی

مذہب کے سلسلے میں حقیقت کی جستجو نے مجھے مابعد الطبعیاتی مباحث میں بھی الجھا دیا اور میں نے جبر و اختیار اور خیر و شر کے مسائل پر بھی غور کرنا شروع کیا۔ جبریوں اور قدریوں، معتزلہ اور اشاعرہ کی بحثیں بھی پڑھیں لیکن گتھی سلجھنی تھی نہ سلجھی۔ مشکل یہ تھی کہ انسان کو بالکل مجبور سمجھ لیا جائے تو دنیا میں جو برائیاں ہیں اس کا خالق بھی خدا ہی کو سمجھنا چاہئے یا شر کی تخلیق کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے ایک اور خدا تصنیف کرنا ہوگا۔ یہ ذہنی کشمکش خدا کی ذات سے صفات کو منسوب کرنے کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اگر اس کو قادر مطلق مانئے تو وہ اس دکھ بھری دنیا کا خالق ہونے

میں روسو، نیطشے، شپین ہار اور شیلی نے اس کی دیواریں اٹھائیں۔ شبلی نے شاعر کی حیثیت سے مجھے اتنا زیادہ متاثر نہ کیا، جتنا ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے شبلی کے سیاسی اور سماجی افکار پر ایک مسلسل مقالہ جو کلکتے کے ایک انگریزی جریدے میں شائع ہوا، اس نے بڑی حد تک میرے سیاسی ذہن کو بنایا۔ اگرچہ اس کی تعمیر کا کام بہت پہلے مولانا آزاد کی تحریروں نے "الہلال" کے ذریعے شروع کر دیا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی عقیدت کا بیج میرے ذہن میں بچپن سے بویا گیا۔ میرے والد مرحوم اگرچہ سیاسی مذاق کے آدمی نہ تھے لیکن مولانا آزاد کی تحریروں کے بڑے رسیا تھے۔ ۱۹۱۲ء میں میری عمر جب کہ نو دس سال کی تھی، وہ "الہلال" کی تحریریں بڑے ذوق و شوق سے اپنے دوستوں کو سنایا کرتے اور میں اُن کی صحبت میں چپکا بیٹھا سنا کرتا۔ اگرچہ کچھ سمجھ میں نہ آتا لیکن اسلوبِ بیان کا آہنگ میرے گوشِ سماعت میں اپنا سحر انڈیلتا رہتا۔

چند سال بعد جب میں اسکول سے نکل کر کالج میں پہونچا تو ایک دوست کے یہاں "الہلال" کے پرانے فائل دیکھے اور بڑی گرویدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ شروع کیا۔ مولانا کے بلند آہنگ مقالوں نے میرے سامنے فکر و نظر کے بہت سارے دروازے کھولے۔ میں ہر کھلے ہوئے دروازے کے پاس آیا اور ہر دروازے سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ یہ میری ذہنی زندگی کی صبح تھی جس کا دھندلکا میرے دماغ میں غالب کے مطالعے کے ساتھ پیدا ہوا۔ اور اس کے بعد دوسرے مغربی و مشرقی مفکّرین کے افکار کے زیرِ سایہ دن چڑھتا گیا، دوپہر ہوتی گئی اور اب جب کہ سہ پہر کے بعد شام کی سیاہی میرے ذہن کے ارد گرد منڈلا رہی ہے تو میں دیکھ رہا ہوں کہ جتنی روشنیاں ملی تھیں، وہ سب کی سب بجھتی جا رہی ہیں اور یہ محسوس ہو رہا ہے کہ

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

میرا پورا کنبہ راسخ العقیدہ شیعہ اثنا عشری تھا۔ مجھے مذہب پرستی کی میراث بچپن ہی میں ملی اور مذہب کی محبت نے بہت دنوں تک میرے دماغ کی کھڑکیوں کو بند رکھا۔ اقبال کی ملت پرستارانہ شاعری نے اُن میں عقیدت کے قفل ڈالے لیکن نگار میں نیاز فتح پوری کی تحریروں نے اِن تالوں کو ایک ایک کر کے کھول دیا اور میرے دماغ میں کچھ ایسے روزن پیدا کیے جن سے باہر کی روشنی اندر آنے لگی۔ اور میرا ذہن موروثی عقائد سے نبرد آزما ہونے کے قابل ہو گیا۔ یہی وہ دور تھا جب کہ میں نے غالب کے اس مشورے پر

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

عمل کرتے ہوئے اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہبِ عالم کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اور چشمِ تنگ کثرتِ نظارہ سے وا ہونے لگی۔ میں نے گوتم بدھ، عیسیٰ مسیح، زرتشت اور نانک کی شریعتوں پر بھی غور کیا، ہر ایک کے سامنے عقیدت کے سجدے بکھیرے۔ اسی سلسلے میں غزالی کی "کیمیائے سعادت" اور بزرگانِ قادیان کے بعض رسائل بھی میرے لئے بصیرت افروز ہوئے لیکن دل کی تسکین کہیں میسر نہ ہوئی۔ مذہب سے مایوس ہو کر میری پیاس مجھے فلسفے کے سرچشموں تک لے گئی لیکن وہاں بھی میری قسمت میں سراب و تشنہ لبی کے سوا کچھ نہ تھا۔ شپین ہار نے مجھے خدا سے بے زار کر دیا اور یہ بات تو مجھے کچھ دیر بعد سمجھ میں آئی کہ خدا کو اپنے پیمانۂ خرد و شر سے ناپنا ابلہی ہے اور خدا ہی پر کیا منحصر ہے، کسی بھی انسان کے کردار کو اپنے سود و زیاں کی ترازو پر تولنا، حد درجہ کی کم نظری اور کم ظرفی ہے۔ بہر حال شپین ہار کے بعد نیطشے اور کانٹ نے بھی مجھے شکوک کے اضطراب میں مبتلا کیا۔ حکیم اسلام علی ابن ابی طالب کے خطبات اور اقوال نے اگرچہ شکوک کے اضطراب کو بہت کچھ کم کر دیا لیکن یقین کی آسودگی مجھے آج تک حاصل نہ ہوئی۔ رومی نے بھی مجھے بصیرت دی لیکن وہ تسکین نہ دے سکے جو اقبال کو انہوں نے دی تھی۔ نیطشے نے مجھے بتلایا کہ عیسیٰ کی تعلیم و تربیتِ نفس ایک غلامانہ ذہن کی پرورش ہے، لیکن گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدّد نے اس طلسمِ فکر و نظر کو باطل قرار دے کر مجھے عیسیٰ کی آغوشِ محبت میں ڈال دیا۔ مگر اُن کے اقوال میں جو اسرائیل پروری کا عنصر تھا اُس نے مجھے پوری طرح اُن سے مطمئن ہونے نہ دیا۔ میرے اس اضطرابِ ذہنی کی پرچھائیاں میرے پڑھنے والوں کو میری غزل میں بھی جا بجا ملیں گی۔ مطالعے نے میرے ذہن کی افتاد کو کچھ ایسا بنا دیا تھا کہ مجھے کسی مذہب، کسی نظریئے، کسی تحریک سے کلّی اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ راسخ العقیدہ مسلمان تو بہر حال میں نہ رہ سکا لیکن عیسائیت اور بدھ ازم بھی مجھے پوری طرح نہ اپنا سکے۔ جب حالات نے مجھے صحافت کے ذریعے سیاست سے قریب تر کیا تو گاندھی وادی بھی بنا اور کانگریسی اور اشتراکی بھی ہوا اور کارل مارکس کا مرید بھی لیکن میرے ذہن کو سو فیصدی اتفاق کسی نظریے سے نہ ہو سکا۔ کارل مارکس کی تعلیمات سے میں پوری طرح مطمئن ہو جاتا لیکن اُس کے پاس انسانی نفس کی تربیت کا کوئی نسخہ نہ تھا اس کے متبعین جو انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ طاقت کے بل پہ اور عیسیٰ کے تبسم نے مجھے بتلایا کہ جو تلوار

ے اُٹھتا ہے، وہ تلوار سے گر بھی سکتا ہے۔ ایک مستقل انقلاب انسان کے نفس و ذہن کی تربیت ہی سے ممکن ہے، مذہب سے یہ کام کئی ہزار برس میں نہ ہو سکا اور اب وہ اپنی عمرِ طبعی کی آخری منزلوں میں پہونچ چکا ہے۔ ادیب و شاعر سے شاید یہ کام ممکن تھا لیکن انہیں حسن و عشق کی داستان سرائیوں سے فرصت نہیں۔

گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد پر میرا پورا ایمان ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ تشدد کا استیصال تشدد سے ممکن نہیں۔ اور تشدد ہی کیا کسی بُرائی کو بُرائی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب معاشرے کے عدم مساوات کا علاج میں نے باپو سے پوچھا تو انہوں نے وہی جواب دیا کہ دولت مند، دولت کا مالک نہیں دولت کا امین ہے۔ کاش مجھے ان سے پوچھنے کا یہ موقع مل جاتا کہ دولت کا امین جب حقداروں تک کسی عہد میں بھی یہ امانت نہ پہونچا سکا تو ایسے خائین امین خائین سے امانت کیوں نہ چھین لی جائے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ شاید وہ میرے سوال کا یہی جواب دیتے کہ چھینی کس طرح جائے؟ کیا تلوار سے؟ اس کی کیا ضمانت ہے کہ جو تلوار آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ کل ان کے ہاتھ میں نہ آئے گی؟ اور وہ چھینی ہوئی چیز واپس نہ لے لیں گے؟ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، اگر اس اصول کو مانا جائے تو یہ سلسلہ دنیا کی عمرِ طبعی تک دراز ہوتا رہے گا۔ اس مسئلہ کا حل کیسے سمجھا جائے، غرض تشکیک کی بیماری ہر حال میں میرے دماغ پر حاوی رہی۔ سکون تو سکون مجھے کوئی ایسا جنون بھی میسر نہ آسکا جس کی دُھن میں محو ہو کر گرد و پیش سے غافل ہو جاؤں۔ مذہبی جنون یا سیاسی جنون، یا کسی ایک کی محبت کا جنون اگر مجھ پر عمر کے کسی حصے میں طاری ہو جاتا تو میرا گمان ہے کہ مجھے اضطرابِ ذہنی سے کسی حد تک نجات مل جاتی۔ لیکن اسے عقل کی فراوانی کہئے یا تشکیک کی بے چینی کہ مجھے سکون کیا جنون کی بھیک بھی کسی دروازے سے نہ مل سکی۔ گوتم بدھ نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں خدا اور مذہب سے بے گانہ ہو کر صرف انسانیت کا پرستار ہو گیا۔ جب بھی میں نے خدا کے متعلق پوچھنا چاہا تو گوتم نے مجھے ٹوک کر کہا، یہ معلوم کرنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ تم یہ کیوں نہیں معلوم کرتے کہ تمہارے محلے میں جو مفلس عورتیں ہیں اُن کے بدن پر کپڑے ہیں یا نہیں۔ یا تمہارے شہر میں جو غریبوں کے گھر ہیں، اُن کے سرد چولہوں میں آگ ہے یا نہیں۔ گوتم بدھ کے یہاں مجھے سب کچھ ملا، تربیتِ نفس کا نظریہ بھی، فرد کے ارتقائے روحانی کا پروگرام بھی، لیکن جب بھی میں نے جماعت کی بہبود کا پروگرام اُن سے پوچھا تو وہ مجھے خاموش نظر آئے اور اس کے لئے مجھے پیچھے مڑ کر محمد کی طرف ہی دیکھنا پڑا، جو مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑے میرے اس اضطرابِ ذہنی پر مسکرا رہے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ محمدؐ اور بدھ نے جو کچھ چاہا وہ اُن کے بعد کبھی ہو سکا یا نہیں؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ بدھ مت نے فقیروں کی ایک قوم بنائی جس نے خدمتِ دنیا کی جگہ ترکِ دنیا کو اپنا شعار ٹھہرایا۔ اسلام نے مجاہدوں اور فاتحوں کی ایک امت تیار کی جس نے ملک گیری ہی کو مذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھا ؎

خرد بہ عالمِ حیرت کہ این چہ بوالعجبی

کتب تاریخ کا مطالعہ بچپن ہی سے میرا مشغلہ رہا۔ اس کی روداد بھی سُن لیجئے۔ پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرا گھرانہ راسخ العقیدہ شیعہ گھرانہ تھا اس لئے تشیع بچپن ہی سے مرے ذہن میں راسخ رہا۔ میرے ایک بزرگ جو سنی عقیدہ رکھتے تھے، میرے دوسرے بزرگوں سے برابر مناظرانہ بحثیں کرتے رہتے تھے۔ جب اُن کو کوئی نہیں ملتا تو ہم بچوں کو ہی اپنی بحث میں الجھا لیا کرتے ــ اُن ہی کے فیضانِ صحبت سے مجھے مناظرے کا چسکا پڑا اور میں نے اسی عمر میں شیعہ سنی مناظرے کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جب اُن سے کوئی فیصلہ کن بات سمجھ میں نہ آئی تو میں نے تاریخِ اسلام کی ورق گردانی شروع کی۔ رفتہ رفتہ یہ ذوق یہاں تک پہونچا کہ میں نے اسلامی تاریخ کے عربی ماخذوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے فارسی، اُردو اور انگریزی ترجمے جو مجھے میسر آئے، سب پڑھ ڈالے۔ جیوں جیوں پڑھتا گیا تسنن اور تشیع کے اختلافات کے سارے راز مجھ پہ کھلتے گئے۔ اور اب اپنی عمر کے خاتمے پر جب کہ فکر و نظر کے طلسم ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے ہیں، میں آج بھی دونوں کے متعلق اقبال کی زبان سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ ؎

چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی

مذہب کے سلسلے میں حقیقت کی جستجو نے مجھے مابعد الطبیعاتی مباحث میں بھی الجھا دیا اور میں نے جبر و اختیار اور خیر و شر کے مسائل پر بھی غور کرنا شروع کیا۔ جبریوں اور قدریوں، معتزلہ اور اشاعرہ کی بحثیں بھی پڑھیں لیکن گتھی سلجھنی تھی نہ سلجھی۔ مشکل یہ تھی کہ انسان کو بالکل مجبور سمجھ لیا جائے تو دنیا میں جو برائیاں ہیں اس کا خالق بھی خدا ہی کو سمجھنا چاہئے یا شر کی تخلیق کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے ایک اور خدا تصنیف کرنا ہوگا۔ یہ ذہنی کشمکش خدا کی ذات سے صفات کو منسوب کرنے کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اگر اس کو قادرِ مطلق مانئے تو وہ اس دکھ بھری دنیا کا خالق ہونے

کی حیثیت سے رحیم نہیں ثابت ہوتا۔ اور اگر رحیم مانئے تو اس کا قادرِ مطلق ہونا مسلّم نہیں ہو سکتا۔ یہی کشمکش مجھے زرتشت کے پاس لائی، لیکن وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ دو ازلی خداؤں کا تصور ایران کے قدیم زنادقہ کا تصور تھا۔ زرتشت کے پاس خدا اور ابلیس کا وہی اسرائیلی تصور ہے یعنی اہرمن جس کا اسرائیلی نام ابلیس ہے اس کا خالق خود یزداں ہے۔ لیکن اس کی اس مخلوق نے اس سے بغاوت کی اور وہ آج تک اس بغاوت کا استیصال نہ کر سکا۔ پھر ایک ایسے خدا کی پرستش سے کیا حاصل ہے جو ہم انسانوں کی ہی طرح مجبور ہو۔ اب رہا خیر و شر کا سوال جو خیر حالات کے ماتحت شر ہو جاتا ہو اور وہ شر جسے حالات کبھی خیر بھی بنا دیتے ہوں، ان کی نفسیاتی بنیادوں پر بھروسہ کر کے نیکی اور بدی کا کوئی تشفی بخش تصور کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ الغرض میرے ذہن کی بے چینی بڑھتی گئی اور میں نے مسئلۂ وحدت الوجود میں بھی اس بے چینی کا علاج ڈھونڈھنا شروع کیا۔ لیکن مجھے یہ مسئلہ خدا کے وجود سے ایک مؤدّب اور محتاط انکار نظر آیا۔ ایک ایسا خدا جو ہماری ذات سے ایک علٰحدہ ذات نہ ہو، جو غیر مادّی ہونے کے بجائے تشخص کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہ رکھتا ہو، ذہنِ انسانی میں خدا کی حیثیت سے کیسے سما سکتا ہے۔؟ یہی وہ مسئلہ ہے جس میں میرا ذہن غالب کے ساتھ نہ چل سکا۔ محی الدین عربی کی تصنیفات میری دسترس سے باہر تھیں۔ ان پر جو مقالے مجھے اردو میں ملے، ان سے اس عقیدے کی تسکین بخش تشریح نہ مل سکی۔ صوفیا اس راہ میں خود گم ہیں، میری رہنمائی کیا کرتے؟ اس سلسلے میں میں نے فلسفۂ ہنود سے بھی قریب ہونے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی اسلامی صوفیوں کی طرح وجود و شہود کے چکّر میں کھوئے کھوئے نظر آئے۔ تاہم معاد کا آریائی تصور مجھے اسلامی و اسرائیلی تصور کے مقابلے میں زیادہ قرینِ قیاس اور تشفی بخش نظر آیا اور میں آواگون کے عقیدے سے تسکین کی بھیک مانگنے لگا لیکن اس میں بھی میں سزا اور جزا کے تصور کا قائل نہیں، بلکہ ہر زندگی کو روح کی ایک منزلِ تربیت سمجھتا ہوں۔ ایک روح کی ارتقا کے لئے کسی زندگی میں اس کا منعم ہونا اور کسی زندگی میں گدا ہونا ضروری ہے۔ بقول اجتبیٰ رضوی ؎

مجھے کچھ تجربے ہر رنگ کے دامن میں بھر لینا

اگرچہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے بھی یا نہیں؟ یہ سوال خود محلِ نظر ہے لیکن اگر اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہیں تو یہ تجربے کس لئے؟ اس قسم کے بہت سے سوالات میرے دماغ کو پریشان کرتے رہے اور یہ بات تو مجھے جوشؔ ملیح آبادی نے سمجھائی کہ جو مسائل ہمارے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں، جن تک ہم اپنے حواس کے ذریعے پہونچ نہیں سکتے۔ ان کے متعلق سوچنا پہلی حماقت ہے اور اگر کوئی اس حماقت پر ذہنی حیثیت سے مجبور ہے تو اس سلسلے میں کسی عقیدے کا انکار یا اقرار دوسری بڑی حماقت ہے۔ اس حماقت کا ارتکاب کئے بغیر ہر حال میں خوش رہنے کا نام ہی زندگی ہے۔ لیکن اپنے کو خوش رکھنے کے لئے دوسرے کی خوشی کا لحاظ نہ کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ اس سوال کے ساتھ مابعد الطبیعاتی مباحث کا رشتہ، فلسفۂ اخلاقیات سے جڑ جاتا ہے۔ اگر اخلاقی حس ہے تو آزاد زندگی کی مشکلات یہیں سے شروع ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ میں نے جوشؔ کے مشورے سے ذہن کی وہ تمام کھڑکیاں بند کر دیں، جن سے علمی مسائل اس میں داخل ہوئے تھے لیکن چور چوری سے باز آئے ہیرا پھیری سے کب باز آتا ہے؟ جب میں نے دماغ شکن مسائل سے گھبرا کر ناولوں اور افسانوں کے مطالعوں میں اپنے ذہن کو گم کرنا چاہا تو اس ہلکے پھلکے مطالعے کے سلسلے میں بھی بعض افکار نے چور دروازے سے میرے ذہن میں داخل ہو کر اسے بے چین کرنا شروع کیا اور بے چینی میرا مقدر ہو کر رہ گئی۔

طویل اور مختصر کہانیوں کے مطالعے نے ہر حال میں میرے اخلاقی شعور کو بیدار کیا، اور مجھ میں خود احتسابی کی عادت پیدا کی۔ ناولوں میں مجھے اناطول فرانس کے ناول تائیس نے بے حد متاثر کیا، اور عبادت و ریاضت کی بے حاصلی مجھ پر ثابت کی۔ ہارڈی کے ناول میں زیادہ نہ پڑھ سکا کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ یہ مصنف مجھ سے جینے کا حوصلہ چھینے رہا ہے اور جینے کے لئے اُمیدوں کے سراب پر کچھ نہ کچھ اعتقاد رکھنا، زندگی کی ایک نفسیاتی ضرورت ہے۔ ٹالسٹائی سے بھی میری صاحب سلامت دور ہی کی رہی، اُن کے کسی ناول نے میرے ذہن پر کوئی گہری چھاپ نہیں چھوڑی۔ اُن کے مقابلے پریم چند کے بعض ناولوں نے میرے خوابیدہ اور نیم خوابیدہ شعور کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ جیمز جوائس، ذہن کی تربیت نہیں کرتا، ذہانت کا امتحان لیتا ہے، اور میں امتحان دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے اس کی حضوری مجھے حاصل نہ ہوئی۔ اس کے اُردو مقلدین کی تحریروں نے مجھے اور بھی اس سے وحشت زدہ کر دیا۔ برنارڈ شا نے میرے دماغ کے بہت سے جالے صاف کئے۔ لیکن جب میں نے اس کے کسی ڈرامے کو پڑھا تو اس نتیجے پر پہونچا کہ مصنف کے پاس دماغ ہی دماغ ہے، دل ایسی کوئی چیز اس کے پاس نہیں۔ اس لئے وہ کمزوری سے نفرت تو کر سکتا ہے، ہمدردی نہیں کر سکتا۔

——————— اس میں شک نہیں کہ خدا

کے مقابلے میں نفرت اور محبت انسان کی دو نفسیاتی کمزوریاں ہیں۔ محبت محبوب کا عیب نہیں دیکھ سکتی اور نفرت، دشمن کا ہنر دیکھنے سے قاصر ہے۔ ایک عظیم انسان کو دونوں سے بلند ہونا چاہیئے لیکن وہ قصور بصیرت جو محبت کی بنا پر ہو اُسے تو میں معافی دے سکتا ہوں لیکن جو کم بینی اور بے باکی نفرت کی بنیاد پر ہو اس کے معاف کرنے پر میں اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں کر پاتا۔ اس لئے برناڈ شا سے میں مرعوب تو ہوا متاثر نہ ہو سکا۔ اس سے بہرہ مند تو ہوا لیکن عقیدت اس سے اور اس کے جیسے آدمیوں سے آج تک نہ ہو سکی۔ شاید عقیدت کا مزاج، محبت کے مزاج سے بھی نازک ہے۔ ہم عصر مصنفین اور شعراء میں کم و بیش میں ہر ایک سے کچھ نہ کچھ مستفیض ہوا سب سے آخر میں قرۃ العین کے آگ کے دریا کی ابتدائی لہروں نے مجھے بے حد متاثر کیا لیکن جہاں سے اُن کی یہ طویل کہانی عہد وسطیٰ سے نکل کر عہد حاضر میں داخل ہوئی، وہاں سے مصنفہ اپنے من بھاتے ماحول میں گم ہو گئیں اور اپنی داستان کے مقصد اور تقاضوں کو بھی گم کر دیا۔ مسئلہ خیز اور فکر انگیز ناول جب میرے تھکے ہوئے دماغ پر بار گراں ثابت ہونے لگے تو مجھے سستے قسم کے ناولوں میں پناہ لینی پڑی۔ ان میں الہ آباد کی رُومانی دنیا کا سلسلہ میرے لئے مرغوب خاطر ہوا مثل مشہور ہے کہ کوڑے میں بھی موتی مل جاتے ہیں۔ رومانی دنیا کے دو مصنفین شاہد اختر، اور ابن سعید کے بعض ناول مجھے خاصے کی چیز معلوم ہوئے۔ یہ ملک کی انتہائی بد نصیبی ہے کہ اس کے بہترین ذہن اپنے گھر کے چولہوں کے ایندھن بن رہے ہیں اور عوامی مانگ کا لحاظ کر کے خود ایسی چیزیں لکھ رہے ہیں جو اُن کے معیار سے بھی نیچی ہیں۔

اُردو کے کلاسیکل مصنفین کا احسان بھی مجھ پر کم نہیں ہے۔ سرشار نے مجھے زبان سکھائی، شبلی، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم اور مہدی افادی نے مجھے سوچنے اور لکھنے کا ڈھنگ سکھایا۔ متقدمین شعراء میں میری قصیدہ نگاری کا شوق، سودا، ذوق، قاآنی اور عرفی کا رہین منت ہے۔ آخر میں صفی اور عزیز کی نظموں اور قصیدوں کے مطالعے نے میرے ذوق سخن کی کچھ آراستگی کی۔ غزل گوئی میری غالب کے علاوہ درد، آتش، مومن شاد اور فارسی شعراء میں حافظ، نظیری اور بیدل کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ میر سے مجھے فیض صرف اسی وقت حاصل ہوا جب میں نے کچھ دنوں کے لیے کسی سے عشق کیا۔ لیکن ذہن کی یہ انفعالیت میرے لئے کبھی دیرپا ثابت نہ ہو سکی مگر میں ہر حال میں میر کو غزل کا ایک خدا سمجھتا ہوں۔ مثنویوں میں گلزار نسیم اور زہر عشق بچپن سے میرے کسب ذوق کا سرچشمہ رہیں۔ داغ کا تغزل بھی میرے لئے شوق افزا رہا لیکن ان کے رنگ کا ایک شعر بھی باوجود کوشش کے کہہ نہ سکا۔

میری ذہنیت کی تعمیر میں مطالعے کے علاوہ، بزرگوں کا فیضان صحبت بھی شامل ہے۔ اُستاد محترم مولانا رضا علی وحشت کی صحبت نے میرے ذوق شعری کو بہکنے نہ دیا۔ میری جدت پسندی کو دائرہ اعتدال میں رکھا اور مجھے فنی بصیرت عطا کی۔ اِن کے علاوہ میں آغا حشر کاشمیری، حکیم ناطق، آرزو لکھنوی، نصیر حسین خیال، مولانا ابوالکلام آزاد، جوش ملیح آبادی، مرزا ابو جعفر کشفی، اعجاز حسین جعفری، اور سب سے آخر میں قاضی عبدالودود کی صحبتوں سے فیضیاب ہوا۔ ان صحبتوں میں میرے ذہن کے بعض دریچے بند ہوئے اور بعض کھلے۔ میں جب بھی ان بزرگوں کے پاس سے اٹھا اپنی جھولی میں کچھ نہ کچھ لیکر اٹھا۔ ناانصافی ہو گی اگر میں یہاں پہونچ کر ان دوستوں کو بھول جاؤں جن کے ہاتھ میری شخصیت کی تعمیر میں ارادی یا غیر ارادی طور پر شامل رہے۔ میرے سنیر قسم کے احباب میں مولانا رزاق ملیح آبادی، مولانا شائق احمد عثمانی، پروفیسر محفوظ اور میرے ہم عمر دوستوں میں سید انوار احمد، رفیع الدین بلخی، طاہر رضوی، شبلی ابراہیمی، اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی کا نام ناقابل فراموش ہے۔ طاہر رضوی نے دین مجوس سے میرا تعارف کرایا۔ شبلی ابراہیمی نے مجھ میں سیاسی شعور جگایا۔ کارل مارکس سے میری ملاقات انہی کی رہین منت ہے۔ اجتبیٰ رضوی نے مجھے فلسفے اور تصوف کی چاٹ دلائی اور مجھے دشت تحیر میں تنہا چھوڑ کر خود خانقاہ بے خودی یا خودی میں گوشہ نشین ہو گئے۔ میرے شاعر دوستوں میں آصف بنارسی، قمر صدیقی اور عباس علی خاں بیخود کے ذوق سخن کا میرے ذوق سخن پر بڑا احسان ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی اپنے دوران قیام کلکتہ میں اپنے تحقیقی اور علمی خزائن سے مجھے حصہ دیا۔ مجھ سے جونیئر دوستوں میں اختر اور نیوی اور بہار الدین کا نام بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ جن کی صحبت میں آج بھی مرے افسردہ ذہن کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری سے میری دوستی بہت پرانی ہے لیکن ان سے میری جب بھی ملاقات ہوئی، اُن کے قنوطیت نے میرے علمی اور ادبی ذوق کو پست ہمتی ہی عطا کی۔ اُن کے مقابلے میں آل احمد سرور نے میری بیمار خودی کو اپنی حوصلہ افزائیوں سے صحت بخش انجکشن دیئے اور اُن کے اس احسان کی وجہ سے میں نے انہیں اپنا دوست سمجھا، دوستی کے معاملے میں میں خاصا خوش فہم ہوں۔ یہی خوش فہمی مجھ سے جوش ملیح آبادی کے بارے میں بھی سرزد ہوئی۔ بات یہ ہے کہ میں نے عمر بھر دوستی ہی کی بھنبھی عشق کے راستے پر میرے قدم کبھی آگے نہ بڑھ سکے۔ اور اس کے لیے میں اپنی طبیعت کی کاہلی کا ممنون ہوں ـــ

کاہلی سے جو خدا کو نہ کرے سجدہ وہ سر ؎ رحمتِ شوق کہے پائے بتاں تک پہنچے

معشوقوں کی جگہ میں نے دوستوں ہی سے عشق کیا، اُنہیں کی کم نگاہی اور کم التفاتی کا نوحہ خواں رہا اب اُسے میری بدنصیبی کہئے یا اُن کی ناحق شناسی کہ احسان اُن میں سے ہر ایک نے مجھ پر کیا لیکن محبت جس چیز کا نام ہے وہ کسی ایک نے بھی مجھے آج تک نہ دی۔ آخر میں میری تشنگی اپنی ناآسودگی پر قانع ہو کر ہر گھاٹ سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ زندگی کی آخری سرحد پر پہونچ کر اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ محبت جنسی ہو یا غیر جنسی، عزیزانہ ہو یا دوستانہ بہرحال ایک نفسیاتی کمزوری ہے لیکن کیا کروں کہ اپنی اس نفسیاتی کمزوری پر اب تک قابو نہ پا سکا۔ آج بھی جب کوئی چمکار دیتا ہے تو میری طبیعت سگِ بے کینہ کی طرح اُس کے قدموں میں لوٹنے لگتی ہے۔ دو بزرگ قسم کے شاگردوں کا بھی مجھ پر احسان ہے، جس کا بھول جانا احسان فراموشی ہوگی۔ اُن میں سے ایک تو برادرِ محترم مسٹر علی اکبر کاظمی مرحوم ہیں اور دوسرے شفیق مکرم آغا محمود شاہ نشتر کاشمیری مرحوم۔ ان بزرگوں نے ازراہِ شفقت اپنا کلام مجھے بنانے کو دیا اور اس سلسلے میں ایک ایک مصرعے کو مجھ سے اس طرح منجھوایا جیسے کوئی سخت گیر آقا اپنے سست ملازم سے کسی برتن کو بار بار منجھوائے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اشعار کے بنانے کے سلسلے میں خود اس طرح بن گیا جس طرح ذوق مرزا الٰہی بخش معروف کی اصلاحِ سخن کے سلسلے میں بنے تھے۔

یہ ہے میری ذہنی اور جذباتی زندگی کا سفرنامہ جس میں اگر تفصیل کی گنجائش ہوتی تو میرے پُرسانِ حال کو میری پوری سوانح عمری بھی اس میں مل جاتی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ نہ بہ حیثیت شاعر میری کوئی شخصیت بنی اور نہ بہ حیثیت مفکر۔ میں نے تاریخ کے مطالعے میں عمر کا ایک حصہ گنوایا اور مورخ نہ بن سکا۔ عمر بھر کا سوچ وچار مجھے فلسفی نہ بنا سکا۔ میں نے کانگریسی تحریک میں حصہ لیا، نوکری چھوڑی اور جیل گیا لیکن ایک سیاسی آدمی بننے کی ہمت مجھ میں نہ پیدا ہو سکی۔ اب جبکہ عمر پینسٹھ کے قریب ہو چکی ہے۔ میرے سامنے تاریکی کا ایک بے کراں سمندر ہے اور میری حقیر بینائی آج بھی اس میں غوطے لگا رہی ہے۔ سفر ختم ہے اور منزل قریب ہے۔ میری پیٹھ تجربات کے بوجھ سے ٹوٹ رہی ہے۔ اُسے کہیں پھینک دینا چاہتا ہوں لیکن کہاں پر پھینکوں اور کس طرح پھینکوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم کچھ لکھتے کیوں نہیں ہیں سوچتا ہوں لکھوں تو کیا لکھوں۔ کون سی نئی بات ہے جسے میں دوسروں تک پہنچاؤں۔ شاید یہ بھی میری کاہلی کی منطق ہو، جو یقیناً نتیجہ ہے میرے ضعفِ اعصاب کا۔ القصہ نہ مدیے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

غزل

اعجاز صدیقی

فکر اگر تہذیبِ عصرِ نو کی تراشیدہ نہیں
فن کے سانچے کچھ بھی ہوں لیکن پسندیدہ نہیں

تو نے جو کچھ بھی دیا، اُس کو سر آنکھوں پر لیا
اے غمِ امروز، ہم تجھ سے تو رنجیدہ نہیں!

خوابگاہوں تک مسلسل آ رہی ہیں آہٹیں
جسم خوابیدہ ہیں، لیکن ذہن خوابیدہ نہیں

کون انہیں پوجے، جھکائے ان کے آگے کون سر!
راہ کے پتھر ہیں، اصنام تراشیدہ نہیں!

ہے پیامِ انقلابِ تازہ، سرپیچیدگی!
اس سے کب انکار ہے، حالات پیچیدہ نہیں

کیا نہیں بازار میں طاقوں کی زینت کے لئے؟
وہ کھلونے توڑ ڈالو، جو پسندیدہ نہیں

ہیں کچھ ایسے لوگ، سُونا پن جنہیں مرغوب ہے
ہم مگر شبہائے تنہائی کے گرویدہ نہیں

یوں تو صدیوں کی پرانی ہے کتابِ زندگی
لفظ کچھ دھندلے سہی، اوراق بوسیدہ نہیں

بارہا گزرے ہیں ان سے آبلہ پایانِ شوق
کوئی منزل اور کوئی راہ نادیدہ نہیں

دیکھنا ہے، کون اب کس کا اُڑاتا ہے مذاق
وقت سنجیدہ ہے، لیکن لوگ سنجیدہ نہیں

جن پہ پردے ڈالنے کی ہو رہی ہیں کوششیں
ہم سے وہ حالات بھی اعجاز پوشیدہ نہیں!

بنال چرخ بذاکر حسین زبدۂ جود

۱۹۶۹

حیف آخر شد دریغ کائنات ۱۹۶۹ء — عالم آرائے، جنبل دیں گذشت ۱۹۶۹ء

مغفرت بادا پسند ہندیاں ۱۹۶۹ — صیقل صد انقلاب ما گذشت ۱۹۶۹

باد غفراں باد بر صدر حسین ۱۹۶۹ — زیب فردوس فنا از ما گذشت ۱۹۶۹

آمدی چوں ناظم قوم قلوب ۱۹۶۹ — چوں شدی مٹہ سایۂ جائے گذشت ۱۹۶۹

شد امور یاری کل محو ذات ۱۹۶۹ — آمرے حق جوئے آفاقے گذشت ۱۹۶۹

بدنشار بخشش روح القدس ۱۹۶۹ — صاحب اولی، سر عالم گذشت ۱۹۶۹

رحمت کل منقلب ذاکر حسین! ۱۹۶۹ — زمزمہ پردازئ طورے گذشت ۱۹۶۹

نیر اقبال و صد قرنے نہفت ۱۹۶۹ — جلوۂ صدق و صفا قالب گذشت ۱۹۶۹

بہر استقبال می آیند حوران بہار

۱۳۸۹

پیکر طیب و عطا، جلوہ گہ عالم گذشت

۱۹۶۹

اقبال احمد اعظمی ایم، اے ایل ایل بی اطاب جدہ

۱۳۸۹

١ زرہ، خود لباس حربی۔ ٢ معزز، ہکوم ٣ محرک، ٤ جام جہاں نما ٥ منشا، مرکز، مکان، محفوظ
٦ شہر آبادی ٧ زمانہائے دراز، صدیوں

وقار خلیل



۲۷ مئی ۱۹۶۴ء

(بیادِ نہرو)

وہ دن ہے آج کا دن
گلستانِ دانش سے
وفا کا پھول جدا ہو کے شاخ سے جس دم
فروغ ماہ کی صورت فضا میں بکھرا تھا
ملوں میں، کھیتوں میں، دفتر میں درس گاہوں میں
جنونِ عقل کی پُر پیچ رہگزاروں میں
اُسی کے لمس کی خوشبو، اُسی نظر کی مہک
سحر شناس دریچوں میں اس کا چہرہ ہے
فشارِ شب سے جو بکھرے وہی سویرا ہے
وہ روشنی، وہ حرارت، وہ زندگی کا خمار
مئے نشاطِ تمنا سے جس کا دل لبریز
وہ ماہِ ہند، وہ نخلِ وفا، گل گیتی
مہک رہا ہے نئی نسل کے دماغوں میں
چمک رہا ہے چھلکتے ہوئے ایاغوں میں
وہ دن ہے آج کا دن، گلستانِ دانش سے
وفا کا پھول جدا ہو کے شاخ سے جس دم
فروغ ماہ کی صورت فضا میں بکھرا تھا۔

آج کل دہلی

آفاق احمد

غالب نودریافت خطوط



مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان خطوط کے تفصیلی تعارف سے قبل چند سطور میں کتوب علیہ یعنی مولانا عباس رفعت کا مختصر سا تعارف کرا دیا جائے۔

رفعت ۲۰ مئی ۱۸۲۶ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے ذی علم والد شیخ احمد یمنی مصنف نفحۃ الیمن اور دیگر اساتذہ سے عربی و فارسی میں استعداد کامل بہم پہنچائی۔ اسی کے ساتھ جملہ علوم حربیہ میں کمال حاصل کیا۔ غالب کے بھوپال سے متعلق شاگردوں میں رفعت کا علمیت و ذکاوت کے معاملے میں کوئی ثانی نہیں ملتا۔



مولانا عباس رفعت

مالک رام صاحب نے غالب کی شاگردی اختیار کرنے کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ دہلی آئے اور یہاں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ مرزائی، خانی اور ابوالفضل دوراں کے خطاب عطا ہوئے۔ ان ہی ایام میں غالب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنے فارسی کلام اور قصائد پر بالخصوص اُن سے اصلاح لی" لیکن رفعت کا ایک مخطوطہ "نوردیدہ" بھوپال کے اسمٰعیل کتاب گھر میں موجود ہے اور اسی کی صاف نقل سیفیہ کالج کے اُردو شعبہ میں موجود ہے۔ یہ نقل خود رفعت کے قلم سے ہے۔ اس مخطوطہ میں رفعت نے صفحہ ۵۱-۵۲ پر غالب کے بارے میں مختصر تذکرہ تحریر کیا ہے اس میں وہ رقم طراز ہیں۔

"راقم الحروف غائبانہ بدیں کلام منیش معتقد گشت واز دور سر فرود آوردہ در حلقۂ شاگرداں زانو شکست۔ جناب ممدوح ازراہِ اخلاق بے پایاں مانند حکمائے اشراقیاں چندمرتبہ توجہ دلی فرمود و اشعار بندہ را کہ ذریعہ نیایش نامہ ہا فرستادہ بودم اصلاح نمود۔"

مذکورہ بالا عبارت "نوردیدہ" کے دونوں قلمی نسخوں میں موجود ہے۔ لیکن صاف والے نسخہ میں حاشیہ میں بعد کو یہ عبارت بھی بڑھائی گئی ہے۔ "دچوں کشش آب ودانہ اتفاق رفتم بدہلی شد از ملاقات جناب غالب بہرہ ور شدم ومورد الطاف شان گشتم۔"

یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ رفعت نے یہ تذکرہ غالب کی وفات کے بعد لکھا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ انہیں دہلی کا جانا اور غالب سے ملنا جب "نوردیہ"

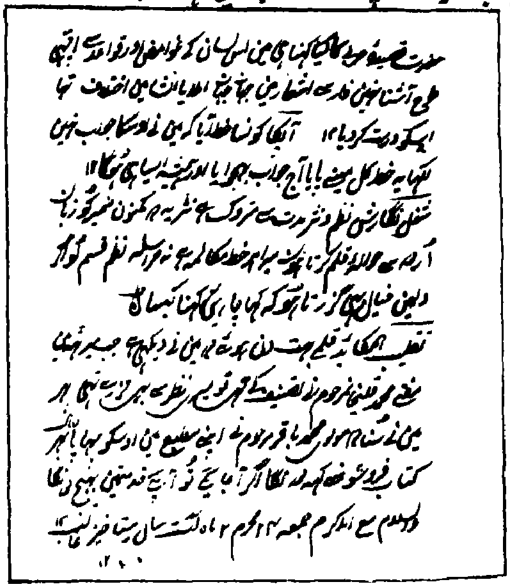
پہلی بار تحریر کر رہے تھے تو کیوں یاد نہیں آیا اور پھر جب انہوں نے صاف کیا تو بھی انہیں اس کی تحریر کا خیال کیوں پیدا نہیں ہوا۔؟ پھر اضافہ شدہ عبارت سے پہلے کا جو حصہ ہے وہ واضح طور پر غائبانہ غالب کا کلام دیکھنے اور معتقد ہو کر ان کے حلقۂ شاگرداں میں شامل ہونے اور خط و کتابت کے ذریعہ فارسی کلام پر اصلاح کا اظہار ہے۔

یہ تو تھی رفعت کے غالب کا شاگرد بننے کی داستان۔ بعد میں رفعت کے مرزا سے دوستانہ مراسم بھی ہو گئے تھے اور دونوں میں باقاعدہ خطوط کا بھی تبادلہ ہونے لگا تھا۔ خود رفعت نے فخریہ کہا ہے۔ ؎

بود غالب دہلوی از زمرۂ یارانِ من

رفعت ۶۰ سے زیادہ تصانیف نظم و نثر کے مصنف تھے۔ انہوں نے علم و ادب کے ہر گوشہ پر قلم اٹھایا اور سچ تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ ۱۳۱۵ھ میں انہوں نے بھوپال میں انتقال کیا۔ آئیے اس تعارف کے بعد، جو چند سطور تک محدود نہ رہ کر قدرے طویل ہو گیا ان خطوط کا جائزہ لیں جو "آج کل" کے توسط سے پہلی بار ہندوستان کے ادب دوستوں کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔

غالب کے ان خود نوشت نو دریافت اردو خطوط میں پہلا خط ۲ اگست ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں غالب نے رفعت کے عربی قصیدے کی رسید اور فارسی کلام پر اصلاح کا ذکر کیا ہے۔ اس خط کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفعت نے مرزا سے شکایت کی تھی کہ مرزا نے اُن کے کسی خط کا جواب نہیں دیا جس کے جواب میں غالب نے لکھا ہے کہ "کون سا خط آیا کہ میں نے اس کا جواب نہیں لکھا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اور رفعت میں باقاعدہ خط و کتابت تھی اور مرزا، رفعت کو فوراً جواب دیتے تھے۔ پورا خط مندرجہ ذیل ہے۔ ؎


حضرت قصیدۂ مدحیہ کا کیا کہنا ہے میں اس لیے ہاں کہ تم واقف اور قواعد سے اچھی
طرح آشنا نہیں فارسی اشعار میں جا بجا جو الفاظ ان میں اختلاف تھا
اسکو درست کر دیا۔ آپکا کونسا خط آیا کہ میں نے اوسکا جواب نہیں
لکھا یہ خط کل پہنچا یا آج جواب بھیجا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے
شغل نگارش نظم و نثر مدت سے متروک ہے [illegible]
[illegible]
دل میں خیال [illegible] کہ کہا جا رہی کہنا کیسا ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
والسلام مع الاکرام جمعہ ۲۲ محرم ۲ ماہ اگست سال [illegible] غالب
۱۲۰

نو دریافت خطوط کا اہم ترین خط وہ ہے جو ۴ نومبر ۱۸۶۱ء کو رفعت کو تحریر کیا تھا۔ اس خط میں غالب نے اپنے دل کی وہ کیفیت بیان کی ہے جس کی وجہ سے غدر کو چار سال بیت جانے کے بعد بھی اُن کا دل ڈوبا جاتا تھا۔ اس خط کا مزاج بالکل اُس خط جیسا ہے جو مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے نام تحریر کیا تھا اور جس کا پہلا اور آخری جملہ یہ ہے۔

"پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آ جاتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔"

"اے مرگ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے

... ہائے: اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو مرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎۱

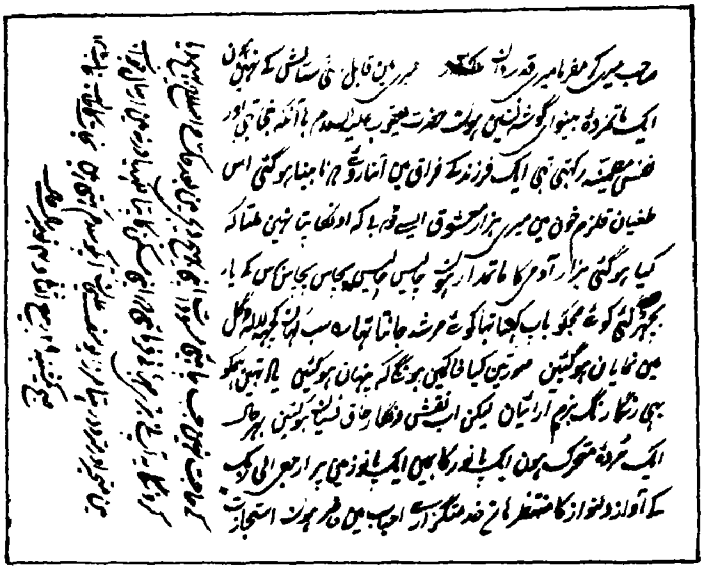
"وہی درد، وہی کرب جو مرزا تفتہ کے خط میں پایا جاتا ہے اس نو دریافت خط میں بھی ہے۔ زیر نظر خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب مرزا نے رفعت کو یہ خط لکھا اس وقت یوسف علی خاں بھی موجود تھے۔ اُن کے سامنے ہی مرزا نے رفعت کا یہ خط ختم کیا اور آخر میں یوسف علی خاں کا سلام بھی لکھ دیا۔ اس خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں رفعت نے مکان تبدیل کر دیا تھا اور ریت گھاٹ کے چوراہے پر اپنے ذاتی مکان میں رہنے لگے تھے اور غالب کو نیا پتہ لکھا تھا جس کا ذکر غالب نے خط کے آخری حصہ میں کیا ہے۔

خط کا عکس ملاحظہ کیجئے اگلے صفحہ پر

؎ جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی "مکاتیب غالب" دوسری ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۴۹ء میں تحریر فرماتے ہیں۔ مرزا صاحب کی تحریروں میں پرانی علامات اوقاف کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ پیراگراف کے آخر میں اکثر یہ علامت (۵) لکھتے ہیں۔ جو لفظ فقط کی طغرائی شکل ہے۔ کبھی (۱۲) کا ہندسہ بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جو لفظ "حد" کے عدد ہیں۔" ص ۲۲۹

خود مرزا غالب نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام اپنے ایک خط میں (۱۲) کے ہندسے کے سلسلے میں اس طرح رقم کیا ہے "صاحب بندہ، اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ لکھا کرتا ہوں خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی ہندسے پر ہو۔" خطوط غالب (حصہ اوّل) مرتبہ غلام رسول مہر ص ۲۲۶

؎۱ خطوط غالب مرتبہ مالک رام مطبوعہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۴۲-۴۳



صاحب میری کر مفرما میر قدر اس ملک میری قابل ہی ستائش کہ نہیں
ایک ماتمزدہ بینوا گوشہ نشین ہوں حضرت یعقوب علیہ السلام با آنکہ نبی تھے اور
نفس مطمئنہ رکھتے تھے ایک فرزند کے فراق میں آنسو بہا بہا کر نابینا ہو گئے اس
طغیان قلزم خون میں میری ہزار معشوق ایسے ڈوبے کہ اُن کا پتا نہیں ملتا کہ
کیا ہو گئے ہزار آدمی کا ماتمدار ہوں چالیس چالیس پچاس پچاس برس کے یار
بچھڑ گئے کوئی مجھکو باپ کہتا تھا کوئی مرشد جانتا تھا سب بہائم بکھ للہ دل
میں نمایاں ہو گئیں صورتیں کیا خاک میں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں یا تمہیں مجکو
بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں بھر حال
ایک مردہ متحرک ہوں ایک پا نو رکاب میں ایک پانو زمیں پر ارجعی الی کی
صدا کا منتظر ہوں از خدمتگزاری احباب میں قاصر ہوں استجابت

آخری خط فارسی میں لکھا ہوا ہے۔ یہ خط کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کا مالک ہے یہ خط غالب کے خطوط کے مجموعے پنج آہنگ، کلیات نثر فارسی، انشائے نورچشم (دیار محمد خاں شوکت) نوردیدہ قلمی نسخہ رفعت بھوپالی میں موجود ہے لیکن اب اصل خط کے مل جانے سے ان کتب میں جو اختلافات تھے اُن پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اس خط کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب امتیاز علی صاحب عرشی نے اپنے مرتبہ "مکاتیب غالب" کا دیباچہ تحریر فرمایا تو مرزا کے فارسی مراسلت ترک کر کے صرف اُردو میں خط و کتابت کرنے کے باب میں بطور ثبوت جو فارسی خط نقل کیا وہ یہی رفعت بھوپالی کے نام لکھا ہوا غالب کا خط تھا۔

عرشی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں یہ عزم تھا کہ اب فارسی آمیختہ و ناآمیختہ
بتازی کو ترک کر کے سادہ اُردو میں اظہار مطالب کریں گے۔
کیونکہ فارسی کے لئے جس فراغ خاطر و قوت دماغ کی ضرورت
تھی۔ غلبۂ پیری کے سبب سے میرزا صاحب اس سے محروم
ہو چکے تھے۔" [1]

اس کے بعد عرشی صاحب نے جنون بریلوی کے نام لکھے اُردو کے خط سے اور رفعت بھوپالی کے نام لکھے فارسی خط سے اقتباسات پیش کئے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

ان دونوں خطوں میں مرزا صاحب نے ترک فارسی کا سبب غلبۂ
رنج و غم اور ضعف پیری کو قرار دیا ہے" [2]

فروری سنہ ۱۹۵۵ء میں عرشی صاحب کا ایک مضمون "غالب کے فارسی خطوط (ایک نئی تحقیق)" رسالہ ماہ نو کراچی میں شائع ہوا۔ اس میں پہلی بار عرشی صاحب نے پنج آہنگ اور کلیات نثر فارسی اور دوسرے مجموعوں میں شائع شدہ غالب کے خطوط کے اختلافات پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا کہ — چونکہ غالب کے فارسی خطوط کا بڑا حصہ ابھی تک اپنی اصلوں سے جدا ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں دانستہ و نادانستہ کتنی معنوی تحریف ہو چکی ہے۔ اس انکشاف کا تقاضا یہ ہے کہ فارسی خطوں کی اصلیں تلاش کرنے کی زیادہ کوشش کی جائے تاکہ ایک طرف تو یہ اندازہ ہو سکے کہ مرزا صاحب کے ذوق فارسی میں کب کب اور کیا کیا تغیر ہوا اور دوسری طرف اُن کی سیرت کے تعین اور سوانح حیات کی ترتیب میں آسانی ہو جائے۔" [3]

جب غالب کا یہ خط مجھے ملا تو میرے ذہن میں عرشی صاحب کی یہی عبارت تھی میں نے تقابلی نقطۂ نظر سے اس خط کا جائزہ لیا تو انکشاف ہوا کہ نہ صرف یہ کہ کلیات نثر غالب اور انشائے نورچشم کی عبارت میں اکثر جگہ اختلاف ہے بلکہ یہ اختلاف نوردیدہ میں تحریر کئے خط اور اصل خط میں بھی ہے (حالانکہ نوردیدہ خود رفعت کی نقل کی ہوئی ہے۔) ویسے کلیات نثر غالب اور انشائے نورچشم میں ۱۹ جگہ اختلاف ہے جبکہ انشائے نورچشم اور نوردیدہ میں اصل خط کو سامنے رکھ کر نقل کی گئی ہے اور یہ اختلاف صرف دو جگہ ہے۔ جبکہ اصل خط اور نوردیدہ میں بھی اختلاف کی نوعیت کم و بیش یہی ہے

اصل خط کا عکس اگلے صفحے پر ملاحظہ کیجئے

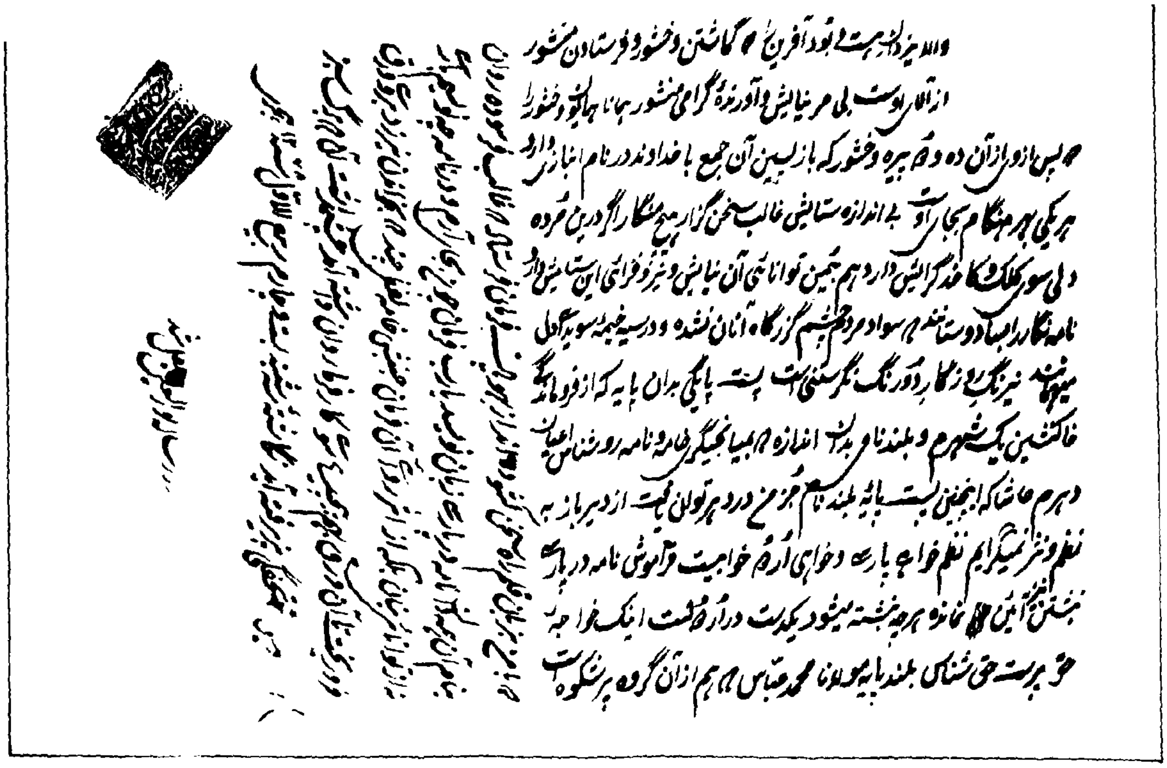
زیر نظر خط میں موجود اختلافات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشائے نورچشم اور نوردیدہ میں قریب قریب اصل خط ہی نقل کیا گیا ہے البتہ کلیات نثر غالب اور اصل خط میں کافی اختلاف ہے اس اختلاف کے دو وجوہ ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غالب نے رفعت سے اس مکتوب کی نقل طلب کی ہو اور رفعت نے یہ تبدیلیاں کر کے نقل ارسال کی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ تبدیلیاں خود غالب کی رہین منت ہوں۔ آخری وجہ ہی درست نظر آتی ہے کیونکہ رفعت نے تبدیلیاں کی ہوتیں تو انشائے نورچشم اور نوردیدہ میں بھی کرتے جبکہ ہر دو بہر حال کلیات نثر غالب کے بعد منظر عام پر آئیں۔

---

[1] مکاتیب غالب دوسری ایڈیشن مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۵۷

[2] مکاتیب غالب دوسری ایڈیشن مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۵۸

[3] رسالہ "ماہ نو" کراچی غالب کی صد سالہ برسی پر خصوصی اشاعت سنہ ۱۹۶۹ء (یہ وہی مضمون ہے جو اس سے قبل سنہ ۵۵ء میں "ماہ نو" کے غالب نمبر میں شائع ہوا تھا۔)



اس خط کے آخر میں غالب کی مہر سے پہلے "در رسالہ نور العین نقل شد" بھی لکھا ہوا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رفعت نور العین کے نام سے ایک رسالہ تیار کر رہے تھے جس میں اس خط کو بھی شامل کیا گیا۔ مجھے جو خطوط ملے ہیں اس میں ارسطو جاہ کا بھی خط ہے۔ اس میں بھی "در رسالہ نور العین نقل شد" تحریر ہے۔ وہ خط بھی فارسی ہے۔ غالب کا یہ خط اور ارسطو جاہ والا خط دونوں "نور دیدہ" میں شامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ رسالہ نور العین ہی بعد میں قرۃ العین ہوا اور پھر یہی رسالہ آگے چل کر نور دیدہ کے نام سے موسوم ہوا جیسا کہ خود رفعت نے تحریر کیا ہے کہ انہوں نے یکم محرم ۱۲۹۰ھ کو قرۃ العین کو صاف کر کے اس کا نام نور دیدہ رکھا۔

یہ خط سب سے پہلے کلیات نثر غالب[۶] میں شائع ہوا۔ پھر نور العین سے منتقل ہوتا قرۃ العین اور نور دیدہ[۷] میں نقل کیا گیا۔ اسی دوران یہ انشائے نور چشم کی بھی زینت بنا۔ بعد میں یہ مقتدر غالبیات کے ماہروں کے مضامین میں بھی شامل کیا گیا ہے اور غالب صدی کے دوران بھوپال اور غالب سے تعلق نیز مولانا عباس رفعت پر لکھے مضامین میں بھی اسی کا اعادہ کیا گیا[۸]۔ ان معروضات کے بعد اپنا یہ مقالہ ختم کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ غالب کے کچھ اور خطوط کی چلیں ضرور ہوں گی جو ابھی تک سعی و تلاش کی دعوت دے رہی ہیں۔

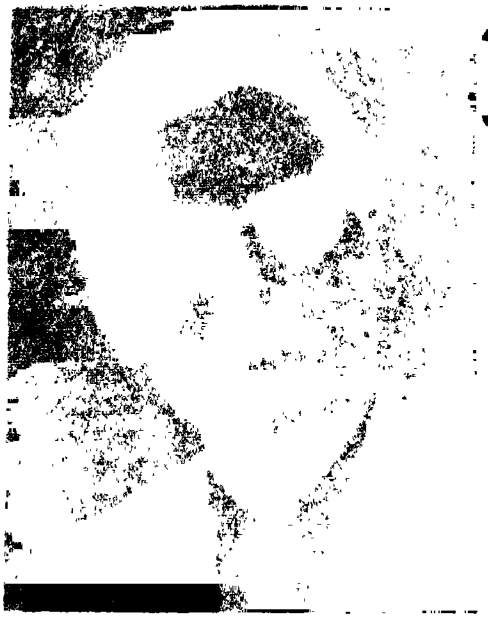
۵۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ صرف دو تین جگہ اختلاف ہے۔ ایک جگہ ایک جملہ بڑھا ہوا ہے اور آخر میں سال رسا خیز کے بجائے سنہ دیا ہوا ہے اس کے علاوہ ایک آدھ جگہ جو اختلاف ہے وہ لفظی ہے۔ ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں اپنے ساتھی ڈاکٹر حامد حسین کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے ان اختلافات کی نشاندہی میں میری معاونت فرمائی۔

۹۔ میری بہت تلاش کے باوجود یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ رسالہ نور العین کیا ہوا لیکن جب میں نے غور سے نور دیدہ کا دیباچہ پڑھا تو مجھے یہ عبارت بھی نظر آئی "سہ شنبہ روز دوم عید النحر دہم ذیحجہ الحرام ۱۲۸۰ھ تالیف و ترصیف رسالہ قرۃ العین آغاز کرد و بحدہم ماہ مذکورہ چہار شنبہ روز دوم مبارک عید العزیز از کتابت مسودہ فارغ شد و دوشنبہ روز بست و چہارم ماہ مرقوم یوم عید المباہلہ از نگارش مبیضہ فرصت یافت" صفحہ ۲-۳

۶۔ کلیات نثر غالب مطبع نولکشور ۱۸۶۸ء صفحہ ۲۲۵، ۷۔ نور دیدہ قلمی صفحہ ۵۳-۵۴

۷۔ انشائے نور چشم از یار محمد خاں شوکت مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ صفحہ ۵۱-۵۲

۸۔ رسالہ "جامعہ" دہلی کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں قوی صاحب دسنوی کا مولانا عباس رفعت پر ایک مضمون شائع ہوا ہے اس میں بھی یہ خط موجود ہے۔ خط کے اختتام پر قوی صاحب نے انشائے نور چشم اور کلیات نثر غالب دونوں کا حوالہ اور صفحات کے نمبر درج کئے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ غالباً دونوں کتابوں میں ایک ہی عبارت کا خط ہے۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ دونوں جگہ زبردست اختلاف ہے۔ دراصل قوی صاحب نے جو خط نقل کیا ہے وہ کلیات نثر غالب کا ہے انشائے نور چشم کا نہیں



جمالیاتی تنقید کی خصوصیات

بشیر بدر

انسانیت کی مثبت قدریں ہمیشہ سے حقیقت اور مسرت کی تلاش میں ہیں۔ یہ سفر جاری ہے اور رہے گا۔ اس منزل کے دو راستے ہیں ایک عقل، دوسرا احساس۔ چونکہ دونوں ایک حقیقت کی جستجو کے راستے ہیں، اس لئے کبھی کبھی دونوں میں قربت بھی نظر آجاتی ہے۔ عقل سے جو سلسلہ وجدان تک پہنچتا ہے وہ مذہب سے ایمان کا ہے۔ علم سیاست، فلسفہ اور دیگر علوم بھی تابع عقل ہیں۔ دوسرا سلسلہ احساس سے وابستہ ہے جس کے مظاہر تمام فنون لطیفہ ہیں۔ ان میں شاعری موسیقی اور مصوری بہت نمایاں اور قدیم ہیں۔ جمالیات کا عملی تعلق فنون لطیفہ سے ہے، اس لئے اس کا تعلق شاعری، اور مصوری سے ہمیشہ رہا ہے۔ آج جمالیات ایک ارتقا پذیر سائنس ہے۔ جس کی تشکیل، فطری انداز میں مختلف سمتوں کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس لئے ادب، شاعری، موسیقی کی طرح جمالیات بھی تہہ دار ہے۔

فلسفی سقراط کے یہاں حسن کے وجود کی شرط اس کا تابع حقیقت ہونا ہے، وہ کسی ایسی چیز کو "حسن" نہیں مانتا جس میں بابرکت سچائی نہ ہو۔ افلاطون اسی مادی دنیا کے علاوہ ایک بلند و برتر ماورائی دنیا کے وجود پر ایمان رکھتا ہے اور اس مادی دنیا کو اس ماورائی دنیا کی پرچھائیں کہتا ہے۔ یہ مادی دنیا ہی حقیقت اصلیہ نہیں، ادب (شاعری) اس غیر حقیقی یا نقلی دنیا کی نقالی ہے، اس لئے زیادہ لائق احترام نہیں۔ دوسرے شاعری حسی لذت کوشی ہے اس لئے بھی ارفع و اعلیٰ نہیں ہوئی۔ ارسطو کا نظریۂ جمال جو دراصل نظریۂ شاعری ہے، فنون لطیفہ میں سب سے کمتر جگہ پا کر بھی اپنی الگ اہمیت کا اشارہ کرتا ہے۔ ارسطو نے یہ تو تسلیم ہی کر لیا کہ یہ بے ہنگم، غیر مرتب اور نامکمل کائنات کی خوبصورت اور نئی ترتیب ہے۔

جمالیات کی باقاعدہ ابتداء بام گارتن سے ہوتی ہے۔ جمالیات اس کے لئے فلسفۂ حسن ہے۔ اور اس کا درجہ کسی سے کمتر نہیں، اس لئے کہ دیوان حق تک پہنچنے کے دو طریقے ہیں، عقل اور احساس اور جس چیز کا نام منزل ہے وہ حسن ہے۔ تعقل نے اسی کو حقیقت کہا ہے۔ کانٹ نے شروع میں جمالیات کو نظریۂ حسیات کا نام دیا۔ لیکن آخر میں وہ بام گارتن سے متفق ہوگیا۔ کانٹ کا نظریہ ہے کہ بظاہر بدصورت چیزیں بھی حسن ترتیب سے خوبصورت ہوجاتی ہیں۔ برخلاف اس کے ونکل مان نے حسن کو صرف قدیم آرٹ میں ڈھونڈھا اور لیسنگ نے صرف خوبصورت اشیا کو موضوعِ شعر مناسب سمجھا۔ دائی کو شاعری کو حسن اور عقل کے درمیان ایک ارتقائی کڑی سمجھتا ہے، اس لئے کہ شاعری کی بنیادی صفت احساس ہے، اس کے بعد مشاہدہ اور بالآخر غور و فکر۔ اور غور و فکر عقل کی بنیادی صفت ہے اس کے بعد اسے صحیح ادراک سے اس حقیقت یا حسن کا احساس ہوسکتا ہے جو شاعری کی بنیادی صفت ہے۔ شلر کا کہنا ہے کہ حسن

ہم کائنات میں موجود ہے یہ کوئی ذہنی چیز نہیں۔

اور حسن اور اخلاقی تبلیغ میں ضد ہے۔ فشٹے نے جمالیات کو لاقیات کے ساتھ ملانا چاہا۔ شوپنہار نے فنونِ لطیفہ کو ذہنی فتوحات کا کمال مایا گویا احساس کو تعقل پر فوقیت دی۔

یہ چند اہم نظریات ثابت کرتے ہیں کہ فلسفہ میں تصورِ حسن جامد اور مقررہ ہیں رہا۔ کثرت میں مماثلت پیدا کرتا ہے اگر ہم کوئی بنیادی پہچان تلاش کریں تو یہ واضح دکا کہ جمالیات نے افادیت اور سماجی عمل کے تابع ہونے سے بالآخر انکار کیا اکثر لوں نے اخلاق سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہا لیکن کچھ لوگوں نے (جیسے فشٹے) اسے خلاقی بنانا چاہا۔ فلسفہ کے اس تصورِ حسن کا اثر مغربی ادب و تنقید پر واضح پڑتا رہا۔

یورپ میں رومانیت کی تحریک، سائنس کی قطعیت، سرمایہ دارانہ نظام جبر، عقل کے تسلط اور ادب میں کلاسیکیت کی سخت گرفت کے خلاف ردِعمل تھی۔ چونکہ یہ ردِ عمل فطری تھا۔ اس لئے اس میں طاقت تھی۔ روسو کے یہاں فطرت کی طرف واپسی، عقلیت کے خلاف نعرۂ انقلاب ہے۔ کیٹس کے یہاں شاعری کی بنیادی قدر جمالیات ہو جاتی ہے، اس کے یہ شعری نعرے تھے کہ "حسین چیز ابدی مسرت ہے"۔ "حسن صداقت ہے اور صداقت حسن اور یہی وہ سب کچھ ہے جو ہمیں جاننا چاہئے"۔ جمالیاتی تنقید میں لان جی نس کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ الہامی کیفیت کو سب کچھ مانتا ہے۔ اور حسن کے علاوہ ہر عنصر اس کے یہاں قابلِ رد ہے دوسری یا تیسری صدی کے اس نقاد کا اس دور میں بہت اثر ہوا۔ رسکن کو خالص جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے پہلے ہی اہم نہ سمجھا جائے لیکن اس کے یہاں احساسِ جمال میں بھی سچائی ہے اور اخلاقی قدروں میں بھی خلوص، یہ دراصل دو انتہا پسندوں کا توازن ہے۔ لیکن والٹر پیٹر نے اخلاقیات کی مخالفت کی اور احساسِ حصول حظ کو ہی آرٹ کا بنیادی مقصد قرار دیا۔ والٹر پیٹر تاثراتی تنقید کا موجد کہا جاتا ہے۔ اس صدی میں کروچے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نے حسنِ اظہار پر زور دیا۔ وہ حسن کو مادی نہیں سمجھتا بلکہ وجدانی شئے سمجھتا ہے۔

وہ فن اور ادب کو حسن اور اظہارِ حسن سمجھتا ہے۔ فن کو اس سے بالکل دلچسپی نہیں، کہ کیا سچ اور کیا جھوٹ ہے نہ اس کا اخلاق سے کوئی واسطہ ہے۔ فن کا واسطہ صرف فن سے ہے۔ جو حسن وجدان ہے اس کا خیال ہے کسی فن پارے کی تخلیق ہی میں اس کا اظہار مکمل ہو جاتا ہے۔ تخلیق کرنے والا جب اسے کاغذ پر منتقل کرتا ہے یا سناتا ہے تو ایک مکمل چیز کو دوبارہ یاد کرتا ہے۔

ادبیاتِ مغرب میں، قدرِ جمالیات ایک تحریک کی طرح آئی۔ کئی عظیم شخصیتیں ایسی ہیں جن کے یہاں حسن کائنات پر چھا جانے والا نور ہے احسن انسان کا خوبصورت بدن ہے، یہی اول ہے اور یہی آخر ہے۔ اس کے باوجود تمام جمالیاتی ادب میں ایسی کوئی یکسانیت نہیں جن سے چند اٹل فارمولے بنائے جائیں۔ جمالیات کے احترام کے ساتھ اخلاق کا بھی دامن پکڑے رہنے والا رسکن نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن افادیت اور جمالیات کو یکجا کرنے والی آوازیں خالص جمالیاتی ادب کے مقابلے میں بہت کم ہیں، ہاں کثرت کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جمالیاتی نقطۂ نظر میں افادیت اور اخلاق کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادب کی پہلی قدر حسن ہے، اس احساسِ حسن میں تغیر ہے اس لئے ارتقا ہے۔

قدیم مشرقی ادب میں فلسفہ جمالیات شاید کبھی بھی ایک تحریک کی صورت میں اپنی یکسر خود مختار حیثیت میں نظر نہیں آتا۔ وہ اس لئے کہ کہیں ایک اخلاق یا مسلک سے انحراف کے باوجود کسی دوسرے ترقی پسند مسلک سے وابستگی ہوتی ہے۔ اسلام سے قبل عربی شاعری میں مرثیہ اور قصیدہ نمایاں اصناف ہیں۔ مرثیہ کی دردناکی میں جمالیاتی پہلو زیریں لہر ہی ہو سکتا ہے۔ عربی قصائد اپنے قبیلوں کی شجاعت، سخاوت وغیرہ کا فخریہ بیان ہوتے تھے۔ فارسی شاعری میں نزاکت، نفاست اور تخیل کی بلند پروازیاں ہیں لیکن شاعری بہرحال دربار یا خانقاہ سے وابستہ رہی، اس لئے ابنِ قدامہ کا عربی قول "احسن الشعر اکذبہ" "سب سے اچھا شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ ہو" جو عربی سے زیادہ فارسی شاعری کے مبالغے کی وکالت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کسی فلسفہ جمالیات کے جواز میں نہیں ہے بلکہ شاعری کی اس بنیادی صفت کی طرف اشارہ ہے جس میں شاعری جذبہ کا اظہار و ابلاغ ہے۔ ایک جذبۂ داخلی کو منتقل کرنے کے لئے اگر منطقی رو سے کوئی بڑا جھوٹ بھی بولا جائے اور وہ اس جذبہ کو منتقل کر دے تو شاعری میں سچ ہے۔ اُردو مرثیے اس کی مثال ہیں کہ شاعر "صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری ہے" کہہ کر کیا کہہ رہا ہے۔ اسی طرح سنسکرت میں بھی جمالیاتی تجربہ (رسو دان) باشعور ہستی کو ذہنی جذب کے عالم میں وجدانی طور پر ہوتا ہے یہ وہ نور ہے جو غیر مرئی ہے جس سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس ماورائی کوندے میں ہماری جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم مشرقی ادب میں یکسر انفرادی نقطۂ نگاہ رکھنے والا مروجہ اقدار سے انحراف کرنے والا شاعر بھی کسی ایسے نظریۂ حسن کو تشکیل

سے کر ایمان نہیں بنا پاتا جو یکسر ارضی، مادی اور انسانی ہو۔ اس طرح ہماری شاعری میں جمالیات اور افادیت میں وہ بیر نہیں جو کیٹس، والٹر پیٹر، یا کروچے کے یہاں نظر آتا ہے۔

اردو تنقید کا ایک وہ سلسلہ ہے جو انتخاب کلام اور زبان و بیان سے براہ راست متعلق ہے۔ نکات الشعراء سے لیکر آج کے رسائل میں شائع ہونے والی تنقید میں یہ تسلسل قائم ہے جو کسی شاعر کا انتخاب کلام اپنے معیار و پسند پر کر دیتا ہے۔ ایسے بھی نقاد ہیں جو آج بھی شعر میں الفاظ کا دینا، ایطا اور تعقید کا ذکر کرتے ہیں۔

ہاں یہ ضرور ہے کچھ لوگ صنائع لفظی و معنوی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور کچھ کم۔ نکات الشعراء سے گلشن بے خار تک اردو شاعری کی تنقید کا بیشتر حصہ انہیں تذکروں میں ہے۔ انتخاب کلام اور تجنیس کلام میں شاید ہی کہیں شعر کی افادیت کی طرف اشارہ ہو، مگر یہ ضروری ہے کہ اخلاق کی گرفت، شعوری اور غیر شعوری طور پر مزاج ادب میں داخل ہو گئی۔ ابھی بیس سال قبل تک یہ دستور تھا کہ میر، مصحفی اور آتش کا خالص عشقیہ شعر بھی اگر استاد اپنے شاگرد کو سمجھائے گا تو عموماً عشق مجازی اور حسن مجازی سے پہلے اس شعر کا سلسلہ حسن حقیقی اور عشق حقیقی سے وابستہ کرے گا۔ میر، جرأت کی شاعری کو جب چوما چاٹی کہتے ہیں تو اُن کی شدید ناراضگی کی تہہ میں مشرقی اخلاق ضرور ہے ورنہ اگر جرأت کے اشعار شاعری کی بنیادی صفت سے محروم ہوتے اور میر اس پر خفا ہوتے تو اس کا اظہار مختلف ہوتا۔ متاخرین میں لکھنوی شاعری کی جو درگت بنی اس کی وجہ بجا طور پر رعایت لفظی وغیرہ بتائی جاتی ہے۔ لیکن مذموم اس وجہ سے سمجھی جاتی ہے کہ وہ حسن مجازی اور حسن حقیقی کی اکائی کو برقرار نہیں رکھ پاتی۔ مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" میں کہاں کی لفظی بازی گری یا صنعت گری تھی۔ لیکن ایک زمانے میں اس کی اشاعت ممنوع تک ہوئی۔ لکھنؤ کی شاعری میں ایک خالص جمالیاتی احساس کی ایسی لہر تھی جو حسن کو روحانی نہیں کرتی تھی، لیکن احساس جمال کی یہ لے ادب میں کوئی بہت وقیع کارنامہ اس لئے نہیں پیدا کر سکی کہ اس دور میں کوئی بڑی شاعرانہ شخصیت نہیں پیدا ہوئی۔ اور جن شاعروں میں کچھ رمق تھی وہ زبان و بیان کی سخت گرفت، صنائع لفظی کے اہتمام میں کمزور ہو گئے۔ احساس جمال کو اگر اظہار کا سادہ شعری اسلوب ملتا تو لکھنؤ کی شاعری خالص جمالیاتی شاعری کے اچھے نمونے پیش کر سکتی تھی۔ اس لئے کہ لکھنؤ کی تہذیب حسن، نفاست، نزاکت اور توازن کا امتزاج تھی۔ جس لکھنؤ میں خوبصورت امام باڑے، نقرئی و نقشیں علم، موم اور جھوٹے کے تعزیئے، انیس کے مرثیے پرورش پا سکے ہیں اس سے کہیں زیادہ خالص جمالیاتی غزل پنپ سکتی تھی۔ لیکن شعری اسلوب کے ناقص ہونے سے اس دور کا بڑا شعری ذہن ضائع ہو گیا۔ دلی میں داغ کی شاعری کا بیشتر حصہ، اخلاق کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش ہے۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے داغ کی سرمستی بہت جلد مذموم ہو گئی۔

یہ جائزہ ثابت کرتا ہے کہ اردو کا عظیم شعری ذہن جو زاہد اور آداب مذہب وغیرہ کا مذاق اڑاتا تھا کبھی اخلاق اور روحانیت کی گرفت سے آزاد ہو کر دنیاوی حسن میں نہ کھو سکا۔ دوسرے جن شاعروں نے یہ جوا گردن سے اتار پھینکا وہ یا تو بڑے خلاق نہ تھے۔ یا اپنے دور کے اُن شعری روایات کے قتیل ہوئے جو احساس دشمن تھیں، اس لئے خالص جمالیاتی شاعری کا کوئی عظیم شاعر، متقدمین و متاخرین میں نہیں ہے۔ اس لئے قدیم اردو کی تنقید میں، ایسا کوئی تذکرہ نگار بھی نہیں ملتا جس میں وہ ذوق جمال ہو جو کسی جنسی (اخلاقی معیار سے) جذبہ کے کامیاب شعر کو سراہتے ہوئے منتخب کر سکے۔

جدید تنقید کا آغاز حالی سے ہوتا ہے۔ وہ ادب کو مقصد کے تابع کرتے ہیں۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے۔ اور شاعری کے پارکھ بھی، لیکن ان کے نزدیک شاعری کا نام مورل "ہونا بڑا جرم ہے۔ حالی۔ سرسید کی ادبی آواز بھی تھے۔ یہ آواز ہزار مخالفت کے بعد چھا گئی۔ حالی کا خیال ہے کہ شاعری اخلاق، اور سوسائٹی کے تابع ہے۔ ملٹن کی طرح وہ شاعری کے لئے سادگی، اصلیت اور جوش ضروری سمجھتے ہیں۔ سرسید کی تحریک اور حالی کی مقصدی یا افادی تنقید کے اثرات بہت دور رس ہیں۔ اُن کے ہم عصر اپنی تمام انفرادیت کے باوجود ادب کی افادیت کے معترف ہیں لیکن حالات کی سفاکی سے سہم کر ادب کو مقصد کے تابع کرنے والے ادیب جلد ہی ایک دوسری لہر کی طرح اسی دریا میں رہ کر بھی نظر آنے لگے۔ شبلی، سرسید تحریک کے اہم رکن ہیں۔ اگرچہ واضح طور پر انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ شاعری اپنے ماحول کی دین ہے۔ لیکن فارسی اور عربی شاعری کا فرق بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "دونوں ملکوں کے تمدن، معاشرت اور مقامی حالات میں اس قدر اختلاف ہے کہ ہر طرح کے تعلقات کے ساتھ بھی دونوں کے شاعروں میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔" یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ تخلیق میں ماحول کی اثر اندازی کو اہم جزو مانتے ہیں۔ عرب کی شاعری کو اس لئے سراہتے ہیں کہ اس میں اعلیٰ اخلاق، قومی حمیت اور بہادری ہے۔ لیکن جب شاعری کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں۔

"اصل شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو"

تو وہ شبلی سامنے آجاتے ہیں جو ادب کو افادیت کے تابع نہیں کر سکے۔ شعرالعجم موازنہ انیس و دبیر، مقالات اور تبصرے کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ شبلی کے ہاں جمالیاتی قدر اہم ہے۔ اس جمالیاتی لے کی اہمیت یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ نئی نسل اُن سے متاثر ہوئی۔ سرسید تحریک سے جو انگریزی تعلیم یافتہ نسل آئی اس کا مطالعہ انگریزی کا براہ راست تھا۔ اس نئی نسل میں انگریزی ادب و تہذیب سے مرعوبیت کم ہو رہی تھی۔ وہ انگریزی تعلیم کے ذریعہ نئے نئے رجحان سے واقف ہو رہی تھی۔ جن میں کچھ کو پسند اور کچھ کو ناپسند کرنے کا شعور بھی تھا، یہ نئے ادیب انگریزی کے بارے میں بھی جان گئے تھے کہ ملٹن کا قول کوئی آخری معیار نہیں ہے افادیت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اپنے ماضی کے ورثے اور اس کی اچھی چیزوں کی جستجو بھی اسی تعلیم کی دین تھی۔ شرر، ناصر علی، مہدی افادی، ریاض خیرآبادی سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری کے یہاں اس نظریہ جمال کا ارتقا، عروج اور زوال دیکھا جا سکتا ہے، جو مغرب کی تعلیم کی دین تھا۔ سرسید تحریک کی افادیت کا ردِ عمل اور مشرقی مزاج رندانہ ضمنی عناصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مغرب میں دوسری تحریکات عالمی بننے لگیں تو جمالیاتی تخلیق و تنقید کے فنکار یا تو بدل گئے، یا تائب ہو گئے۔

وحیدالدین سلیم اور امداد امام اثر جب نظریۂ تنقید بیان کرتے ہیں تو چند ضمنی باتوں کو چھوڑ کر حالی کی تشریح ہو جاتے ہیں لیکن عملی تنقید میں ان کے دل کے چور سامنے آجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سودا کے قصائد پر امداد امام اثر کے کلمات تحسین مشاعرے کی داد کا رنگ لے رہے ہیں۔ جیسے سبحان اللہ اشعار بالا کیا خوب ہیں۔ سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے، سبحان اللہ کیا غزل سرائی ہے۔

مہدی افادی پہلے نقاد ہیں جن کے یہاں احساسِ جمال سب سے طاقت ور عنصر ہے۔ وہ سرسید تحریک کے پیدا کردہ ہیں لیکن ان کے وجدان کو شبلی کے جمالیاتی رجحان سے روحانی غذا ملتی ہے۔ ان کا ماحول، حالی سے متاثر ہے اس لئے وہ بھی ان اثرات سے خود کو نہیں بچا سکتے تھے۔ یہ اثر صحت مند ہے اسی کے تحت مغرب شناسی آئی لیکن براہ راست واقفیت کی وجہ سے حسن و قبح دونوں پر نظر گئی۔ مغرب کے زیر اثر ہی نئی مشرقیت کا احترام پیدا ہوا۔ جذبۂ اسلامی بھی قوی ہے۔ یہ عناصر ثابت کرتے ہیں کہ وہ رُومانی تو ہو سکتے ہیں مگر خالص جمالیات پرستی کے زمرے میں نہیں آسکتے۔ لیکن احساسِ جمال بہت شدید اور دیگر عناصر پر بھاری ہے۔ یہاں تک کہ وہ تصوّف میں بھی ذوق، وجدان اور ادب کے پہلو دیکھتے ہیں۔

"ہم تصوف کو صرف اس نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ اس میں ذوقی اور وجدانی کیفیت کے ساتھ ایک ادبی پہلو بھی موجود ہے"

مہدی اپنے ذوق اور پسند کو اعلیٰ مانتے ہیں۔ اُن کی پسند کے خلاف اگر کوئی دلائل لائے گا۔ تو اُن کی نگاہ میں "بے ادب ملزم" ہوگا جس پر وہ محتسب کے دُرّے برسانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ حسن ظاہری و باطنی دونوں کے پرستار ہیں۔ الغزالی کی خطاطی اور چھپائی کی تعریف میں لکھتے ہیں "بس یہ معلوم ہوتا ہے سنگ مرمر پر اسود کی پچی کاری کی گئی ہے"

ناصر علی کی تحریر کی تعریف میں جو انداز بیان ہے وہ بھی لطافت سے خالی نہیں ہے۔

"میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں، آپ کی چشم سخن جہاں "جنس لطیف اور اس کے متعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ نزاکت خیال کی آخری حد ہے"۔ . . . . یورپ میں آج بڑے پائے کے لکھنے والے ہیں۔ اُن میں مذاق حسن پرستی اس قدر رچ گیا ہے کہ قریب قریب اُن کی ہستی کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ عورت جسے خوابِ طفلی اور آرزوے شباب کہئے ــ یہ بات تری فسانۂ حسن، ہیئت اجتماعیہ کی رُوح رواں ہو رہی ہے۔ جس سے کوئی شائستہ لٹریچر، دست بردار نہیں ہو سکتا"

مہدی کی فکر تصورِ حسن سے تیز ہوتی ہے۔ عورت کا تصور اُن کی فکر رندانہ کے لئے پیمانۂ صہبا کا کام کرتا ہے وہ اُردو کانفرنس کا سنجیدہ مسئلہ ہو یا کسی سنجیدہ شخصیت سے ہم کلامی، اُن کا استعارہ عورت ہی سے جھلکتا ہے مثلاً

"بہرحال اُردو کانفرنس ہو یا انجمن ترقی اُردو، اسٹیج کی خوش بیانی سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس امر پر غور کریں کہ موجودہ نسل کو کس طرح اُردو داں بنایا جائے جس کی حالت اس بگڑی ہوئی عورت کی سی ہے جو شوہر کے ہوتے ہوئے "بوئے غیر" کی شائق ہو"

سید سلیمان ندوی کو خط میں لکھتے ہیں۔

"۔ وطن آیا تو دارالمصنفین میرے لئے گھر آنگن ہوگا اور آپ سے بوسۂ پیام کی جگہ آپ عورت ہوتے تو کہتا لب بہ لب کی ٹھہرے گی۔ آخری فقروں سے آپ کے تقدس میں کچھ فرق تو نہیں آیا ہے۔"

اس طرح کی تمام مثالیں یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ مہدی، فطری طور پر جمالیاتی تخلیق و تنقید کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ اخلاق اور افادیت کے عناصر اکتسابی ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے رومانیت کے تین رکن بتائے ہیں (۱) تخیل کی پرستش (۲) جمالیاتی احساس (۳) انفرادیت۔ فلسفۂ جمالیات، ادب جمالیات یا جمالیاتی تنقید غالباً کسی اسٹیج میں ان تینوں ارکان کو جدا نہیں کرتی، ہاں رومانیت میں تخیل کی پرستش اور انفرادیت انقلاب اور نعرۂ انقلاب بھی بن سکتے ہیں۔ اور یوں رومانیت مقصدیت کا کام بھی کر جاتی ہے۔ اس لئے رسکن یا جوش کو رومانی شاعر یا ادیب کہنا زیادہ موزوں ہے ورنہ خالص جمالیاتی تخلیق یا تنقید کی کوئی اصطلاح واضح نہیں ہوگی۔ اسی طرح لائٹ لٹریچر جس کے پیش رو ناصر علی ہیں وہ صرف ادب حسن و عشق ہے۔ دیگر اکبر آبادی صلائے عام کے شمارہ اکتوبر ۱۹۱۰ء میں لکھتے ہیں۔

"دنیا میں جتنی زبانیں ہیں اور جن کا لٹریچر پاکیزہ سمجھا جاتا ہے ان کو نظر غائر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ہر ایک زبان کے لٹریچر کا عنصر لطیف سوائے حسن و عشق کے جذبات کے اور کچھ نہیں ہے۔ لٹریچر میں کبھی حلاوت و شیرینی نہیں پیدا ہو سکتی جب تک کہ حسن کا ذکر خیر نہ کیا جائے۔"

ناصر علی کی تحریر میں بھی عورت کا استعارہ چمکتا ہے اردو زبان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جس طرح کسی لڑکی کو آپ نے چھوٹی سی عمر میں دیکھا ہو اور اتفاق سے پھر وہ جوانی میں نظر آجائے تو نگاہ ہشانی مشکل ہو جاتی ہے! اسی طرح صلائے عام میں اپنی زبان کو دیکھئے کہ اس کی ادائے بیان کیسی دلکش ہے جس کے دیکھنے کو حسینان معانی، لسان مہ جبیں پاسا سطروں سے چنے ہوئے مضامین رنگین کے دوپٹے اوڑھے اور وسعت خیال کے بڑے گھیرے کے لباس پہنے ہوئے نکلے ہیں۔"

دیگر کا بیان اور ناصر علی کی تحریر ثابت کرتی ہے کہ ادب کی جمالیاتی قدر کو سب سے اہم سمجھنے کا رجحان ہے۔ دیگر کے بیان میں یہ نکتہ توجہ طلب ہے کہ جس ادبیات مغرب کے حوالے سے سرسید۔ اور حالیؔ نے ادب کو مقصد اور اخلاق کا تابع بنایا تھا۔ اسی کو "نظر غائر" سے دیکھ کر یہ کہا جا رہا ہے کہ عنصر لطیف سوائے حسن و عشق کے جذبات کے اور کچھ نہیں ہے ناصر علی اور ان کی ادارت میں نکلنے والے رسائل مثلاً تیرھویں صدی اور صلائے عام، شرر اور ان کا رسالہ دلگداز ان رجحانات کی پیش روی کرتے ہیں۔

خالص جمالیاتی تنقید کے لئے سجاد انصاری کی شخصیت بہت موزوں تھی ان کے پاس وہ نگاہ تھی جو ہر حادثہ میں اسباب حسن تلاش کر لیتی تھی۔ سجاد انصاری واحد شخصیت ہیں جن کا مذہب حسن ہے۔ کوئی اخلاقی، افادی، مذہبی اہمیت انہیں متاثر نہیں کرتی، وہ صرف حسن نفاست اور سلیقے کے پرستار ہیں۔ وہ اس طبقے کو نا عاقبت اندیش کہتے ہیں جو حسین عورت کو زہد و تقویٰ میں خراب کرنا چاہتا ہے۔

"جاہل انسان اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ زہد خشک کچھ انسان نما حیوان پر ہی کھلتا ہے۔ یہ آہنی زنجیر عورتوں کے جسم لطیف کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔ عورت کا اگر کوئی فرض ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عورت ہے۔"

وہ بدصورت عورت کو فطرت کا غمزۂ پیری کہتے ہیں۔ قرۃ العین کے قتل ہونے کا انہیں بے حد ملال ہے علمائے ایران تو ان کے نزدیک مجرم ہیں ہی انہیں ایرانیوں کے مذاق سلیم پر شک ہونے لگا۔ انہیں قرۃ العین پر بھی افسوس آتا ہے کہ اس نے اپنے حسن کو مذہب کے لئے خراب کیا اور اسطرح خدا کو یہ کفران نعمت اچھا نہیں لگا۔ خدا نے اسے اس لئے دنیا سے اٹھا لیا۔ قرۃ العین حیدر کی موت ایک دردناک حقیقت تھی لیکن اس کی موت کا یہ جواز کہ وہ اپنا حسن و شباب برباد کر رہی تھی، قدرت سے یہ نہ دیکھا گیا، سجاد انصاری کی مخصوص جمالیاتی فکر کا نمونہ ہے۔ ایسی ہی منفرد فکر اگر پوری طرح خود کو جمالیاتی تنقید میں لگاتی تو ممکن تھا کہ اردو تنقید کے پاس بھی ایک اعلیٰ جمالیاتی تنقید کا نقاد ہوتا، لیکن سجاد انصاری کا تنقیدی سرمایہ صرف چند مضامین ہیں۔ شبلی، مہدی اور نیاز فتح پوری یقیناً حالی کی افادیت پسندی سے خوش نہیں ہیں۔ اس کے باوجود کسی میں دو ٹوک بات کہنے کی طاقت نہیں۔ یہ حالی کا احترام نہیں ہے بلکہ ادب میں حالی کی جو مقبولیت ہے اس سے یہ حضرات جھجکتے ہیں۔ اور حالی پہ نکتہ چینی کا انداز دوسرا اور دوہی ہوتی ہے، لیکن سجاد انصاری نے کسی مضمون نگار کی اس تعریف پر کہ حالی کے اشعار جواہرات حالی ہیں۔ بلا خوف اپنی رائے کا یوں اظہار کیا۔

"جواہرات حالی، بد مذاقیوں کی یہ انتہا، حالی کے مصلح ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ان کا مرتبہ بھی احترام کا مستحق ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی مصلحانہ شاعری "جواہرات کا مخزن" ہے۔ ان کی جس شاعری کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ شاعری نہیں ایک مصیبت ہے جس سے خدا ہر انسان کو محفوظ رکھے۔ وہ جواہرات جن میں کوئی جھلک نہ ہو صرف اس بدنصیب کے لئے قابل فخر ہو سکتے ہیں جو اپنی بیوگی کے باعث خوش رنگ جواہرات سے محروم کر دی گئی ہو۔ جس کی آنکھ کو گورغریباں کے سنگ ریزے جواہرات نظر آئیں، اس کی بد توفیقیوں پر ہزار افسوس!"

جوش کی شاعری پر "روح ادب" کے عنوان سے ان کی تنقید بھی جمالیاتی تنقید کا اچھا نمونہ ہے۔ عبدالماجد دریابادی نے جوش کی زیادہ توصیف بیان

کی تھی سجاد کا خیال ہے۔

"حسنِ عقیدت کا تقاضہ یہ ہے کہ جوش کو ایک بلند پایہ شاعر مان لیا جائے صرف اس لئے کہ حضرت اکبران کی مدح سرائی میں مبتلا ہو گئے؟ اگر کسی بدصورت کو کوئی حسین عورت خوبصورت کہہ دے تو عبدالماجد کی منطق کا اصرار ہوگا کہ اُسے خوبصورت مان لیا جائے؟"

ایسی تنقیدی آراء سے ہم چاہے متفق نہ ہوں لیکن متاثر ضرور ہوتے ہیں سجاد انصاری کے یہاں جمالیاتی فکر و احساس ہے۔ اس لیے اُن کی نہ ماننے والی بات بھی غلط نہیں لگتی۔ ایسی تنقید معیاری تنقید نہ ہو کر بھی ادب رہتی ہے کہ اس میں شدید اظہار اور شخصیت کا رنگ ہوتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کے ناول ترکی کہانیوں کے ترجمے، ان میں جدید عورت کا تصور، احساسِ جمال میں سرشار ہیں۔ سلطان حیدر جوش کے برخلاف وہ تخیل کی وادیوں اور سبزہ زاروں میں حسن کی تخلیق کرتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کا جمالیاتی تنقید میں بھلے ہی کچھ حصہ نہ ہو، لیکن ان کی تخلیقات کو پسند کرنے والے نقاد جمالیاتی تنقید کے نقاد ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم نے اپنے دور کی چند بڑی ذہانتوں کو متاثر کیا۔ نیاز فتحپوری نے خود اعتراف کیا ہے۔ نیاز آسکر وائلڈ اور ٹیگور سے بھی متاثر ہوئے۔ ٹیگور کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جیسے کوئی فقیر لذتِ موسیقی سے سرشار جنگل میں بیٹھا ہوا گا رہا ہو اور خود ہی کبھی رو بھی پڑتا ہو"

نیاز کے یہاں عورت کا ذکر لپک کے ساتھ ہے لیکن اس میں نفسیاتی حقیقت شناسی بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی کہانیوں کی ساری فضا تخیلی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اکثر آسکر وائلڈ کے اس قول کو نقل کرتے ہیں "کسی تصنیف یا کتاب کے متعلق یہ بحث کرنا کہ وہ اخلاق کا درس دیتی ہے یا بداخلاقی کا درس دیتی ہے — بالکل لایعنی سی بات ہے۔ اس کے متعلق صرف یہ بحث ہو سکتی ہے کہ وہ تصنیف ایک تصنیف کی حیثیت سے اچھی ہے یا بُری"

نیاز اپنی عملی تنقید میں بھی ادب کو اخلاق کے اثر سے دور رکھتے ہیں اور خالص عشقیہ ادیب یا شاعر کو یقیناً دوسرے ایسے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں جو حسن و عشق پر تصوف، مذہب یا ثقافت کا غلاف چڑھائے ہوتے ہیں۔ اصغر گونڈوی انہیں اسی لیے پسند نہیں آتے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ جھاڑ پھونک والی شاعری مجھے کبھی پسند نہیں آئی اور باوجود انتہائی غور و فکر کے آج تک اس کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

اصغر کے اس شعر

اُٹھا کے عرش کو رکھا ہے فرش پہ لا کر
شہود غیب ہوا غیب ہو گیا ہے شہود

پر کافی طنزیہ جملے لکھنے کے بعد یوں ختم کرتے ہیں۔

"معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی ہلاکت کے لیے کوئی سیفی پڑھ رہا ہو۔"

نیاز فتحپوری کا جمالیاتی تنقید میں بہت نمایاں مقام ہے۔ اُن کے افسانوں انشائیوں، خطوط، تنقید اور رسالہ نگار نے پوری نسل کو متاثر کیا لیکن خالص جمالیاتی ادب و تنقید کے خلاف بھی آندھی تیز تھی۔ مگر نیاز صاحب کی خاموشی اعترافِ شکست بھی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بُرا نہ مانئے تو عرض کروں کہ اب ہماری آپ کی فسانہ نگاری کا دور ختم ہو چکا ہے۔ پچھلے چند سال کے اندر جو انقلاب اس فن میں ہوا ہے اس کو نباہنے کے لیے جس آزاد روی اور کھل کھیلنے کی ضرورت ہے وہ ہمیں اور آپ کو نصیب نہیں۔ اس سے قبل فسانہ نگاری نام تھا صرف خیال سے لطف اندوز ہونے کا لیکن اب وہ عملی زندگی کی چیز ہے اور اب معاملہ حقائق کا ہے۔ جس کے لیے خاک چھاننا ضروری ہے۔ پھر اب خاک بسر رہنے کا زمانہ ہمارے آپ کے لئے کہاں، جو بساط آپ اُلٹ چکے ہیں اس کو اپنے حال پر رہنے دیجئے۔ دوسری رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں۔ صنادید کی عظمت اس کی کہنگی میں ہے۔ تاج محل کبھی ڈرائنگ روم نہیں بن سکتا۔"

اس تحریر میں جہاں نئی قوت کا تکلیف کے ساتھ اعتراف ہے وہاں اپنے کئے پر کوئی پشیمانی نہیں بلکہ وہ اُسے 'تاج محل' کی طرح عظیم اور خوبصورت سمجھتے ہیں کہنگی کی عظمت اس کے برقرار رہنے میں ہے، تبدیلی Alter -ation میں نہیں۔ نیاز صاحب کی یہ ثابت قدمی کوئی ضد نہیں بلکہ اُن کے سچے ادیب ہونے کی دلیل ہے۔ اُن کے دوسرے جمالیات پرست ساتھی ل۔ احمد اپنے افسانوں میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کی جب جنگ کرا رہے تھے تو نیاز چپ ہو گئے، اس لئے کہ سچی تخلیق اور تنقید اپنی شخصیت کا بھی اظہار ہے۔ ان کا دل اپنے کئے پر شرمندہ نہیں، وہ ادب کو سیاست، اور مقصدیت کے ہاتھوں میں نہیں دے سکتے تھے اور زمانہ اُن کی تخیلی جنت سے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے خاموشی مناسب تھی۔

مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری صرف ہم وطن ہی نہیں ہیں بلکہ دونوں کا انگریزی ادب کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ دونوں ہی ابتدا میں خالص تاثراتی تنقید کی طرف متوجہ ہوئے اور نیاز صاحب سے متاثر تھے۔

مجنوں صاحب کے لئے اگر یہ بات کہی جائے کہ وہ جمالیاتی ادب کے آخری بڑے فنکار تھے تو یہ بات صحیح ہوگی اور یہ کہا جائے کہ جمالیاتی ادیبوں میں وہ پہلے ادیب تھے جس نے جمالیاتی تخلیق اور تنقید کی بت شکنی کی تو یہ بات بھی درست ہوگی۔

مجنوں صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز سنہ ۱۹۲۵ء کے قریب ہوتا ہے، سنہ ۱۹۳۲ء تک اُن کے افسانے حسن و محبت کی تخیلی فضا میں ڈوبے ہیں۔ اُن کے یہاں حسن کا تصور بھی خیالی اور مثالی ہے۔

"شاعروں نے جتنے سراپا لکھے ہیں، مصوروں نے جتنی تصویریں کھینچی ہیں، سنگ تراشوں نے جتنے مجسمے بنائے ہیں، دنیا والوں نے جتنی دلفریب صورتیں دیکھی ہیں ان میں سے حسین ترین خصوصیات الگ کر لیجئے اور یہ سب کچھ اور ان سے بھی زیادہ میری پریما میں موجود تھیں۔"

لیکن زمانے کے ساتھ وہ تیزی سے بدل گئے، وہ اس لئے کہ اُن میں لچک تھی، بدل جانے کی قوت بھی تھی۔ اُن کے یہاں احساسِ جمال تھا جو آج بھی ہے، لیکن اور حقائق پر بھی اُن کی نظر رہی۔ اس لئے "سمن پوش" کی دوسری اشاعت میں لکھتے ہیں۔

"زمین کے ہنگامے فرو ہولیں تو آسمانی حقیقت بھی اس قابل ہے کہ اُن پر غور کیا جائے اور اُن پر عبور حاصل کیا جائے۔ . . . میرے خیال سے اس وقت دُنیا کو ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ہماری سادگی اور واقعاتی زندگی کی فلاح و ترقی میں مدد دے۔"

مجنوں صاحب کا میر پر مضمون، یا فراق گورکھپوری کا مضمون ریاض کی شاعری پر تاثراتی تنقید کے تو نمونے ہیں لیکن ہم اُسے شاید جمالیاتی تنقید کے خانے میں نہیں رکھ سکتے۔ خاص طور پر مجنوں صاحب کے یہاں مغربی فلسفہ جمالیات سے پوری واقفیت کے باوجود، افادی ادب سے وابستگی، تنقید میں افادیت اور جمالیاتی قدروں کا توازن قائم کرنے لگتی ہے۔

خالص رومانی ادب، ادب لطیف کی نثری تخلیقات کے خلاف واضح ردِ عمل ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ہمایوں میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء کے شمارے میں لکھا۔

"افسانے ہوں یا تخیل کے مضامین، عریانی سے قطعاً پاک ہونے ضروری ہیں۔ افسانوں میں عشقیہ جذبات بیان کئے جائیں تو صرف شوہر اور بیوی کے درمیان پھر اس قسم کے جذبات نہایت بلند اور شریفانہ ہونے چاہئیں۔"

اس کے بعد بھی انہوں نے لکھنے والوں پر زور دیا کہ وہ "اخلاقی ہدیہ" پیش کریں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں سہیل کی پہلی اشاعت میں رشید احمد صدیقی صاحب نے بھی ادب لطیف کی شدید مخالفت کی۔ رشید صاحب، مرزا شوق اور مہدی افادی کو عریاں نگاری میں برابر سمجھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ وہ اچھے لکھنے والے بھی ہو گئے جنہوں نے اردو افسانے کے جمالیاتی فضاؤں میں تیز پروازیں کی تھیں اس طرح جمالیاتی تخلیق و تنقید کا دور بظاہر اُردو میں مرحوم ہو گیا۔

جمالیاتی تنقید کے سرمایہ کا جائزہ لینے اور اس کی خصوصیات متعین کرنے کے لئے ہم زیادہ سے زیادہ شبلی سے لے کر مجنوں تک نظر ڈالنی ہوگی۔ یہ دو نام باتوں کی وضاحت کے لئے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ شبلی جو ادب کی افادیت کے نظریہ کا اعلان کرتے ہیں لیکن جمالیاتی لہر رہ رہ کر اُن کے یہاں سر اٹھاتی ہے۔ اور مہدی افادی، سجاد انصاری، نیاز فتحپوری کے یہاں اس کا عروج ملتا۔ مجنوں اور فراق اس جمالیاتی قدر کے پروردہ ہیں لیکن اِن لوگوں کے ذریعہ اس کی انفرادیت، ادب کے بڑے دھارے کی ایک زیریں لہر بن جاتی۔

یہ سوال ضروری ہے کہ کیا جمالیاتی تنقید میں اِن چند ناموں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے تو اس کا جواب تو یہ مناسب ہوگا کہ اِن حضرات کے یہاں بھی تنقیدی سرمایہ نہیں ہے جو جمالیاتی تنقید کو کوئی اعلیٰ مقام دلا سکے۔ دوسرے جمالیاتی تنقید کا بیشتر حصہ مکاتیبی ہے۔ جمالیاتی تخلیقات، افسانے، انشا۔ اور ادب لطیف کی تعریف میں عموماً خطوط شائع ہوتے تھے، وہی جمالیاتی تنقید کے نمائندہ ہیں۔ کسی تخلیق پر باقاعدہ مضمون مہدی افادی سے شروع ہوتے ہیں۔ مکاتیبی فروغ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایسی تنقید میں اپنی پسند، اپنا مزاج اور ذوق بنیادی کسوٹی ہوتا ہے۔ اس کے اظہار میں جو حسن کاری ہوتی ہے اُسے کہاں تک طوالت دی جا سکتی ہے۔ اس لئے بھی یہ تنقیدیں ایک خط کا سرمایہ ہوتی تھیں۔

ملیدرم کی تحریر کے بارے میں دلگیر کی مکتوباتی تنقید یوں ہے۔

"مخزن کا علمی دستر خوان بے نمک ہے اگر سجاد کی ظرافت طبعی کی چاشنی اس میں نہ دی جائے۔ اس پیارے دل کے لبھانے والے رنگ کے اہنسا۔ رنگ کے آج کل بے حد قدرداں ہیں جس کو سجاد اپنے رنگ کا مالک سچ برداشتہ لکھنا چاہتا ہے۔"

صلائے عام پر ایک قاری کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

صلائے عام بابت ماہ جون سنہ ۱۹۰۹ء ملا تو سمجھئے کہ یہ بھی اس معشوق کی طرح ایفائے عہد کے خیال سے خراماں ہے مگر بیچارے عاشق کی کم نصیبی سے راہ میں

کے بلے چڑھ گیا۔اس پرچے کو کبھی شاہجہاں آباد سے اکبر آباد کے آنے میں کوئی سانحہ پیش آیا۔صلائے عام کے کاغذی پیرہن میں اس کا حسن پرلوز کہیں چھپ سکتا ہے۔بہرحال حسن کی دلفریبیاں مشتاقوں کو اپنی جانب مائل کرنے والی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنا تھا کہ اس پرچے کا حسن ظاہری روئے دُنیا کی طرح دلکش اور اُس کے مضامین شب وصل کے قصّوں سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ سال کے اوسط ماہ کا پرچہ کبریا کی طرح معدوم ہونے سے کتاب کی شیرازہ بندی ملتوی ہے اور بقیہ رسائل زلف پریشاں کی طرح پریشان ہیں۔

اس طرح کے سیکڑوں خطوط تیرھویں صدی، صلائے عام، مخزن، وغیرہ میں موجود ہیں جن میں جمالیاتی تنقید ہے۔ان کا مقصد حسن تخلیق سے پیدا ہونے والی مسرت کا اظہار ہے۔ ناپسند کرنے کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ تخلیق سے وہ مسرت حاصل نہیں ہوتی جس سے احساسِ جمال آسودہ ہوسکے۔ ایک عام قاری سے لے کر مہدی افادی، اور سجاد انصاری تک جیسے اعلیٰ او رمنفرد ادیب جب کسی رسالہ اصول، تخلیق اور بزرگ سلیمان ندوی) کو پسند کریں گے۔ تو بہرصورت استعارہ، عورت، حسن اس کے سراپا اور اپنے جذبۂ عشق سے ہوگا اس لئے جمالیاتی تنقید کی آسان پہچان ہے کہ اصل گفتگو استعارے میں ہوگی اور وہ استعارہ عورت اس کے متعلقات کا ضرور ہوگا۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اس تنقید کا سرمایہ کم ہے۔اچھے لکھنے والوں کا کل سرمایہ چند مضامین ہیں اور وہ بھی زیادہ طویل نہیں اس کی وجہ پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ یہاں دلائل کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔اپنا وجدان اظہار ہو جاتا ہے! اس بات کا اعتراف ناصر علی نے جمالیاتی انداز سے کیا ہے۔

" دوسرے کہتے ہیں کہ میرے مضمون بڑے نہیں ہوتے اُن کو معلوم نہیں کہ خوشبودار پھولوں کے درخت تاڑ کے برابر نہیں ہوتے، گل ولالہ، نرگس وسنبل کے درخت بہت اونچے نہیں دیکھے۔"

جمالیاتی تنقید کی ہمارے یہاں یہ خصوصیات بہت عام ہیں۔خالص جمالیاتی تنقید کا یہ دور یہ بات بھی ثابت کرتا ہے کہ خالص جمالیاتی تنقید یا تخلیق دیگر عناصر زندگی کو نظر انداز کرکے مشرقی سماج میں دیر تک نہیں پنپ سکتی، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ جمالیاتی تخلیق یا تنقید ہمیشہ ادب کے ساتھ رہے اور رہے گی۔یہاں ادب کے ساتھ کی شرط بنیادی ہے، جب یہ اپنی انفرادی حیثیت کا اعلان کرے گی اور دوسرے عناصر کی حق تلفی کرے گی تو بالآخر اس کا ردعمل جس میں اس کا جائز مقام بھی کچھ عرصے کے لے چھین لیا جائے گا۔جیساکہ سردار جعفری کا یہ بیان ثابت کرتا ہے۔

" جو لوگ جمالیاتی ذوق کو وجدانی، داخلی اور بالکل انفرادی سمجھتے ہیں، وہ خیال پرستی، تصوریت، ہمیت اور ماورائیت کے مرتکب ہوتے ہیں اور شعوری اور غیر شعوری طور سے رجعت پرستی کے لئے راستے کھولتے ہیں جن کے پیچ وخم بظاہر کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں۔ بہرحال ہوتے ہیں خطرناک۔"

ترقی پسند تحریک میں جمالیاتی قدروں کے ساتھ وہی زیادتیاں ہوئیں جو اس سے قبل مقصدیت کے ساتھ رُومانی ادیب اور ادب لطیف کے دور میں ادب برائے ادب کے نظریہ کے حامی کر چکے تھے۔اس سے تو غالباً کوئی بھی منصف مزاج انکار نہیں کر سکتا کہ ادب میں جمالیاتی قدر بہت اہم ہے اور جو تنقید ادب میں جمالیات کا احترام نہ کر سکے وہ ناقص ہے لیکن وہ جمالیاتی تنقید جو ادب میں دوسرے اہم عناصر کو نظر انداز کرے وہ بھی درست نہیں ہے اس لئے ایک متوازن جمالیاتی تنقید یا متوازن سماجی تنقید وہ ہوگی جو دونوں کے مناسب امتزاج سے بنے گی ایسی متوازن تنقید میں بوقت ضرورت نفسیاتی تنقید بھی مددگار ہوگی! پروفیسر آل احمد سرور ایسے ہی وسیع جمالیات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

" حال ہی میں یہ احساس ہوا ہے کہ ادب کے مخصوص دائرے اور اس کے بنیادی تقاضوں کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں ایک ایسی جامع جمالیات کی ضرورت ہے جس میں سماجی اور اخلاقی قدروں کا احساس ہو اور جو فن کی نزاکتوں پر نظر رکھے مگر ان میں اسیر ہو کر نہ رہ جائے اور جو اپنی سرزمین اور ماحول سے رشتہ رکھتی ہو۔"



۲۵فروری ۱۹۷۰ء کو سنگیت ناٹک اکادی کی طرف سے منعقدہ ایک تقریب میں رقص موسیقی
اور ڈرامے کے ممتاز فنکاروں کو صدر جمہوریہ ہند نے اکادمی کا ایوارڈ عطا کیا۔
(تصویر میں) صدر جمہوریہ اردو کے ممتاز ڈرامہ نویس اور ہدایت کار جناب حبیب تنویر کو ایوارڈ
دے رہے ہیں۔



رح پروفیسر محمد مجیب جنہوں نے اس سال
رسٹی کے نظام خطبات کے تحت ۱۶ اور ۱۷
۱۹ء کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی زندگی
ت سے متعلق خطبہ دیا۔

دن بھلیا



اُردو کے مشہور شاعر خورشید احمد جامی کا ۹ مارچ ۱۹۷۰ء کو حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کینسر میں مبتلا تھے اور آٹھ ماہ سے زیر علاج تھے ۔۔۔ جامی ۱۱ مئی ۱۹۱۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اورنگ بھگ ۳۳ سال سے شعروادب کی خدمت کر رہے تھے۔ انہوں نے ۴ کتابیں تصنیف کی تھیں، جن میں "شرارے"، "نشان راہ"، "منزل کی طرف"، "رخسار سحر" اور "برگ آوارہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
حال ہی میں جشن جامی منانے کا پروگرام بنایا گیا تھا اور ان سے متعلق مضامین اور ان کے منتخب کلام پر مشتمل کتاب قیمت عرض ہنر شائع کی گئی تھی۔



۲۸ فروری ۱۹۷۰ء کو کھٹمنڈو میں نیپال کے ولی عہد پرنس بیریندر بیر بکرم شاہ کی شادی راجکماری ایشوریہ راجیہ لکشمی بائی کے ساتھ ہوئی جس میں لگ بھگ ۵۰ ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ ہندوستان کی نمائندگی صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے کی۔ (تصویر میں) دولہا دلہن



صدر جمہوریہ ہند نے بمبئی کی ممتاز ماہر تعلیم اور سماجی کارکن محترمہ کلثوم سیانی کو نہرو تعلیمی انعام عطا کیا۔ محترمہ کلثوم نے کسی کالج یا اسکول میں روایتی تعلیم حاصل نہیں کی ہے لیکن گزشتہ چالیس سال میں اُن کی محنت اور سچی لگن سے بمبئی کے ۵ لاکھ افراد اُردو، ہندی، گجراتی، مراٹھی اور تلگو سے واقف ہوچکے ہیں۔ مزید سات لاکھ افراد ۹۰۰ سو مقامات پر تعلیم بالغان کے مرکزوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں — آپ نے گاندھی جی کی سرکردگی میں گاؤں کی عورتوں کو تعلیم سے روشناس کرانے میں نمایاں حصہ لیا تھا اور آپ نے اقوام متحدہ کے تعلیم سے متعلق صلاح کار بورڈ میں بھی ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔



ا مارچ ۱۹۷۰ء کو جاسوسی ناولوں کے نامور مصنف
ارل سٹینلے گارڈنر کا ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا
اپ لگ بھگ ۱۴۰ کتابوں کے مصنف تھے اور آپ
لی کتابوں کی اب تک ایک ارب ۷۰ لاکھ جلدیں فروخت
ہوچکی ہیں — شہرہ آفاق کردار پیری میسن کے خالق
گارڈنر ۲۵ سال تک فوجداری کے کامیاب وکیل رہے
بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں انہوں نے اس پیشے کو خیرباد
کہہ کر تصنیف و تالیف شروع کی اور پھر جاسوسی ناول
لکھنے میں اُنہیں عالمی شہرت حاصل ہوگئی۔



حکومت اترپردیش نے اُردو، ہندی، اور سنسکرت
کے ۵۹ مصنفین کو انعامات دینے کا اعلان کیا ہے۔ اُر
کے مشہور ادیب پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین کو اُن کی خد
کے پیش نظر ۵ ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے۔



اس سال ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ (۵ ہزار روپے) اُردو کے مشہور ممتاز شاعر جناب مخدوم محی الدین (مرحوم) کو اُن کی تصنیف بساطِ رقص پر دیا گیا۔

انیس فاروقی

نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ

بدقسمتی سے غیر ملکی دورِ حکومت میں کبھی یہ نہیں سوچا گیا کہ اس برصغیر میں قدیم اور جدید ہندوستانی فنون مصوری اور سنگ تراشی سے متعلق کوئی میوزیم قائم کیا جائے۔ حالانکہ اس دور میں بھی کم و بیش ہر صوبے میں ایک نہ ایک میوزیم ضرور موجود تھا۔ یہ میوزیم عوامی زبان میں عجائب گھر کہے جاتے تھے اور فرصت کے اوقات میں عوام کے لئے فقط تفریح گاہ تصور کئے جاتے تھے۔ اِن اداروں کے متعلق فرنگی پالیسی یہ تھی کہ اُن کی کوئی غیر معمولی اہمیت یا ان کا کوئی تعلیمی مقصد ہندوستانی عوام کے سامنے کبھی نہ پیش کیا جائے کیونکہ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ہندوستانی عوام میں یہ شعور نہ پیدا ہو جائے کہ یہ ادارے ہماری کلاسیکی اور روایتی تہذیب و تمدن کے آئینہ دار ہیں اور کوئی ایسی تحریک وجود میں نہ آجائے جس کی وجہ سے انہیں نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑے۔

آزادی کے بعد ہماری قومی حکومت کو یہ احساس ہوا کہ یہ ادارے فقط عجائب گھر ہی نہیں بلکہ عوام میں اپنی شاندار روایات کو پہچاننے اور زمانہ ماضی کی بے پناہ تخلیقی قوتوں سے روشناس کرانے کے اہم مراکز ہیں۔ اِن کے ذریعے ایک بیدار قوم کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اِن اداروں کو تعلیمی مراکز میں تبدیل کرنے کے لئے قدم اٹھائے گئے اور ان میں خاطر خواہ سدھار لانے کے لئے میوزیم ایڈوائزری بورڈ کا قیام کیا گیا۔

۱۹۴۹ء کے آخر میں پہلی آرٹ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سارے ملک کے فن کار، نقاد، اور تاریخِ فن کے کچھ ماہروں نے حصہ لیا۔ اس کی صدارت مولانا ابوالکلام نے کی جو اس وقت وزیرِ تعلیم تھے اس کانفرنس کے دوران پہلی بار جدید فنِ مصوری اور سنگ تراشی پر مشتمل ایک میوزیم قائم کرنے کی تجویز زیرِ بحث آئی جسے بغیر کسی اختلاف رائے پاس کر دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر ۲۹ مارچ ۱۹۵۴ء کو اس قسم کے میوزیم کا قیام جے پور ہاؤس نئی دہلی میں نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ کے نام سے کیا گیا جس کا افتتاح اس وقت کے نائب صدر جناب رادھا کرشنن نے کیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ جے پور ہاؤس مہاراجہ جے پور کا سرمائی محل تھا اس کے کمرے اور کاریڈور وغیرہ بہت تنگ ہیں۔ بہرحال کسی طرح ضرورت کے مطابق اسے میوزیم کی شکل دیدی گئی لیکن یہ عمارت جدید فنی شاہکاروں کو جدید تقاضوں کے ساتھ پیش کرنے کے لئے ناموزوں ہے۔

گیلری کے قیام کے بعد سب سے پہلا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اس میں نمائش کے لئے پیش کئے جانے والے فنی شاہکاروں کی کیا حدِ تاریخ مقرر کی جائے۔ اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے سرکار نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے یہ مشورہ دیا کہ اس قومی ادارے میں تقریباً ۱۸۵۷ء سے لے کر زمانہ حال تک کے فنونِ جمیلہ کے اعلیٰ نمونے جس میں مصوری، سنگ تراشی اور گرافکس شامل

ہوں پیش کئے جائیں۔ یہ محسوس کیا گیا کہ سیاسی اور تاریخی نقطہ نظر سے ۱۸۵۷ء کا غدر ہماری آزادی کی پہلی کوشش تھی لیکن اس کی ناکامیابی کی وجہ سے ہمارے اندر شعوری طور سے بڑے انقلاب رونما ہوئے۔ ہم نے قرون وسطیٰ کی تہذیب تمدن سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور مغربی تہذیب، بود و باش اور علم و ہنر کو گلے لگانا شروع کیا۔ اگر اس سانحہ کو تعصب کی نظر سے نہ دیکھا جائے تو بلاشبہ ہم ایک ایسے جدید دور سے ہمکنار ہونا شروع ہو گئے جس کی ارتقائی منزل اب زمانہ حال میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

گیلری کے منتظمین کے لئے دوسرا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس معین شدہ دور سے متعلق فنی نمونے کہاں سے حاصل کئے جائیں۔ آخر کار سرکار نے وقتی طور پر کچھ ایسے نمونے نیشنل میوزیم نئی دہلی سے قرض کے طور پر لے کر پیش کر دیئے جو اس دور سے متعلق تصور کئے گئے۔ لیکن اس مسئلے کے پیش نظر سرکار نے فوری طور پر گیلری کے لئے ایک خریداری کمیٹی بنا دی جو ملک کے مایہ ناز فن کاروں اور نقادوں پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی کے مشورے سے فنی شاہکاروں کے خریدنے کا کام شروع کیا گیا اور کچھ سالوں میں اچھی تعداد میں ایسے نمونوں کا ذخیرہ کر لیا گیا۔ اب کوشش یہ کی گئی کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر زمانہ حال تک جو جدید تجربات فنی میدان میں کئے گئے انہیں ترتیب وار تاریخی اعتبار سے پیش کیا جائے تاکہ دیکھنے والے کو اس صد سالہ دور کے مختلف فن کے ارتقائی منازل کا تفصیلی علم ہو سکے۔ لہٰذا پہلی منزل میں ان کو ۱۸۵۷ء سے بنگال تحریک کے خاتمہ (۱۹۰۴ء) تک اور نچلی منزل میں کلکتہ گروپ (۱۹۴۳ء) سے موجودہ ایام تک منقسم کر کے لگایا گیا ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے دور کا فن پیش کرتے ہوئے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ کچھ ایسے نمونے بھی ہونے چاہئیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستانی فن کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کیا حالت تھی۔

۱۸ ویں صدی کے آخری دہائی میں کچھ برٹش مصور جس میں خاص طور سے تھومس ڈینیل، ٹلی کیٹل۔ مارشل کلیکسٹن اور ولیم ہوجز قابل ذکر ہیں، سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے۔ ان مصوروں کا ہندوستان کے مختلف درباروں میں بڑا خیر مقدم کیا گیا اور انہیں اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی آمد کا اثر ہندوستانی مصوری پر اگر زیادہ نہیں پڑا تو کم از کم اس کی شروعات ضرور ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں بھی مغل طرز کی مختصر تصویر کشی کہیں کہیں سانس لیتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے خاص مراکز شمال میں پٹنہ، لکھنؤ، اور دہلی تھے اور جنوب میں حیدرآباد، میسور اور تنجور۔ اُدھر راجپوت طرز راجستھان کے مغربی علاقے میں اور پہاڑی طرز ہمالیہ کے دامن میں کہیں کہیں اب بھی جولانیاں دکھا رہے تھے لیکن جیسے جیسے انگریزی اقتدار بڑھتا گیا۔ ہندوستانی فنی طرز پر مغربی اثر بڑھتا گیا اور دیکھتے دیکھتے قرون وسطیٰ کے فنی اقدار پر ایسی بے بسی چھائی کہ ان کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ انگریزوں کی ہندوستانی فن و ثقافت سے نفرت اور راجا مہاراجاؤں اور نوابوں کی بدحالی اور پسماندگی نے فن کاروں کو افلاس کا شکار بنا دیا۔ وہ مجبوراً فرنگیوں کے حسب منشا قرون وسطیٰ کے فنی نمونوں کی نقالی کر کے سستے داموں میں اپنی گزر اوقات کے لئے فروخت کرنے لگے۔ اس بدحالی کے دور کو تعارف کے طور پر گیلری کی پہلی منزل میں اولاً پیش کرتے ہوئے مندرجہ بالا انگریز فن کاروں میں تھومس ڈینیل اور ٹلی کیٹل۔ راجپوت، کانگڑہ، لکھنؤ، دہلی، پٹنہ طرز اور جنوبی ہند کے میسور اور تنجور طرز کے نمونے لگائے گئے ہیں تکنیکی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مغربی طرز کے روشنی اور سایہ کا امتزاج کپڑوں میں نمایاں شکنیں جن کا ہندوستانی طرز میں فقدان تھا اب نمایاں طور سے جھلکتا ہے۔ تصویر کی ساخت اور رنگوں کی ہم آہنگی بھی مغربی اسلوب پر مبنی ہے۔



نورجہاں حقہ پیتے ہوئے

انگریزی اقتدار کے بڑھتے ہی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں مغربی تہذیب کو بڑی تیزی سے اپنانا شروع کیا گیا اور اسے زیادہ سے زیادہ فروغ دینے میں مدد کی گئی۔ فن مصوری اور سنگ تراشی میں بھی رائل اکادمی لندن کے طرز کی نقل شروع کر دی گئی، مختصر تصویر کشی سے منحرف ہو کر روغنی رنگوں کے ذریعہ کینوس پر بنائی جانے والی تصاویر کا آغاز ہوا۔ راجا روی ورما نے مغربی اسلوب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔

۱۹ ویں صدی کے آٹھویں دہائی تک بمبئی۔ مدراس اور کلکتہ میں گورنمنٹ

آرٹ اسکول قائم کیے گئے جہاں انگریزی نصاب کے تحت رائل اکاڈمی کے طرز پر تعلیم دی جانے لگی اور ہمارے اس دور کے فن کار بالخصوص چہرہ کشی اور منظر کشی کو فن کی معراج سمجھتے رہے۔ بہرحال تاریخی نقطۂ نگاہ سے ان ابتدائی کوششوں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ لہٰذا گیلری میں اس دور سے روشناس کرانے کے لئے راجا روی ورما، پتھا والا۔ تریبی واد لیس تونجی، بومن جی اور جے بی گنگولی وغیرہ کے شاہکاروں کو لگایا گیا ہے۔ ان تصاویر میں زیادہ تر تصاویر چہرے کی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخری دہائی میں ای۔ بی ہیول جب کلکتہ آرٹ اسکول کے پرنسپل ہو کر آئے تو انہوں نے ہندوستانی مصوروں کی اس نقالی اور ان کی رائل اکاڈمی کی اندھی تقلید پر گہرا افسوس ظاہر کیا۔ انہوں نے بڑی ہمدردی اور جرأت کے ساتھ ہندوستانی فن کاروں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی روایات اور ماضی کی روحانی قدروں کے احیاء پر زور دیں اور رائل اکاڈمی کی تقلید کرنا چھوڑ دیں۔ ہیول کے اس پُرخلوص مشورے سے ہندوستانی مصوروں میں ایک نئی امنگ پیدا ہوئی۔ ہیول نے کلکتہ کے ایک بارسوخ شخص ابھنندر ناتھ ٹیگور کو جو فنِ مصوری میں بدرجہ اتم دلچسپی لے رہے تھے اپنا آلۂ کار بنایا۔ اور انھیں کلکتہ آرٹ اسکول میں وائس پرنسپل کی جگہ دیدی۔ ابھنندر ناتھ کی رہنمائی میں اس تحریک احیاء کی شروعات اجنتا باگھ اور دوسرے غاروں کی تصاویر کی نقل سے شروع ہوئی۔ بعد ازاں مغل، راجپوت پہاڑی اور جاپانی طرزوں کے اسلوب کو بھی اپنایا گیا۔ تجربات کرتے کرتے ٹیگور نے آخرکار ایک مخلوط قسم کا طرز ایجاد کیا جسے عام فہم زبان میں "بنگال اسکول" یا



ابھنیدر ناتھ ٹیگور —— تبتی بھکشو

واش پینٹنگ کہتے ہیں۔ اس طرز کی بنیاد پڑتے ہی اسے سارے ہندوستان کے فنی حلقوں میں بڑی تیزی سے پھیلانے کا کام شروع کیا گیا۔ ابھنندر ناتھ ٹیگور کے خاص شاگردوں میں ڈی۔ پی رائے چودھری، اسیت کمار ہلدار، وینکٹپا، چغتائی، کے این مجمدار، نندلال بوس، گگنیدر ناتھ ٹیگور اور بنود بہاری مکرجی قابل ذکر ہیں۔ ان سبھی مصوروں کے شاہکاروں کو گیلری میں بڑی ممتاز جگہ دی گئی ہے۔ ان کی تصاویر کے موضوع خالص ہندوستانی ہیں اور مذہبی عنصر لئے ہوئے ہیں۔ تصویروں کے سارے سطح پر ایک دھندلی فضا ہمیشہ دکھائی جاتی ہے جس سے تصوف کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سانحہ ایک دھندلکے میں وقوع پذیر ہو رہا ہو۔ انہیں دوسرے الفاظ میں مذہبی کہانیوں کا مرقع کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان سبھی مصوروں کے خاکے بہت کمزور ہیں لیکن رنگوں کی آڑ میں انہیں چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نقل اچھی کرتے ہیں لیکن جب خود اختراع کرتے ہیں تو بدن کے تناسب نہایت ناموزوں ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی وکالت کرتے ہوئے اسے EXAGGERA-TION کا نام دیا ہے۔ بہرحال اس تحریک کا ایک قومی مقصد بھی تھا لہٰذا عوام نے اسے بڑی عزت کے ساتھ نوازا لیکن اس تحریک کا مقصد یہی ہندوستانی مصور ایک قومی فن بین الاقوامی سطح پر پیش کرے، بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا کیونکہ اس تحریک کے مصوروں نے فن کی مقصدیت کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

تحریک احیاء کا طوفان بنگال سے شروع ہوا تھا لیکن بنگال ہی کے ایک مصور جامنی رائے کو یہ مخلوط طرز قطعی متاثر نہ کر سکا۔ انہوں نے اپنی انفرادی کوششوں سے ہندوستانی عوامی مصوری پر تحقیق شروع کی اور نتیجہ نکالا کہ صحیح ہندوستانی مزاج بغیر کسی خارجی اثرات کے نہ غاروں میں ہے اور نہ قلمی نسخوں میں، بلکہ ہمارے دیہی علاقوں میں ہے۔ جن کی روایاتی قدریں انتہائی قدیم اور گہری ہیں۔ ہمیں ان سے سبق لینا چاہئے۔ بہرحال جامنی رائے نے بنگال کے بنکورا ضلع کی عوامی مصوری کو اپنی بنیاد بنایا۔ اور اسی طرز کو وقت کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ تجربہ کامیاب رہا۔ عوام کے تعلیم یافتہ ترقی پسند ذہن نے بنگال تحریک کی بہ نسبت اس انفرادی شخصیت کو زیادہ قدر و منزلت سے دیکھنا شروع کیا اور یہ محسوس کیا کہ جامنی طرز فن جدید کے تقاضوں کو بین الاقوامی سطح پر بدرجہ اتم پورا کر سکتا ہے جبکہ بنگال تحریک نشاۃ ثانیہ کی حیثیت کی حامل تھی۔ جامنی رائے کے مشہور و نادر نمونے گیلری میں کافی تعداد میں لگائے گئے ہیں۔ ان کے موضوع بھی ہندوستانی ہیں۔ سادگی ان کے فن کی جان ہے۔ عوام ان کے فن میں بڑی اپنائیت محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کسی قسم کی تیکنیکی الجھنیں نہیں ہیں۔

پانچویں دہائی میں دوسری جنگ عظیم کے شروع ہو جانے سے ہندوستان کی فضا پر کافی اثر پڑا۔ تحریک احیاء کا زور کم ہو تا گیا۔ مصور اپنی فنکارانہ صلاحیتیں پوری طور سے جامنی کی طرح انفرادیت پیدا کرنے میں مرکوز کرنے لگے۔ انہوں نے مغرب کی جدید فنی تحریکوں کا بھی مطالعہ شروع کیا لیکن کوئی جامع نتائج نظر نہ آئے۔ بہرحال اس سراسیمگی کے دور کو بھی گیلری میں مختلف طرز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جسے نہ ہی دانش طرز اور نہ ہی عوامی طرز کہا جا سکتا ہے بلکہ ایک ایسا طرز ان دونوں دائروں سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے اور اپنے بازو کو تولتا ہوا جدید بین الاقوامی قدروں سے منسلک ہونا چاہتا ہے۔ بس انفرادی کوششوں میں مصروف جو شکلیں ہمارے سامنے نظر آئیں۔ وہ ہیں الیکر، راول، پلسکر اور ان کے کچھ شاگرد جن کے نمونے اس دور کا تعارف کراتے ہیں۔ ان کے شاہکار ہندوستان کی مذہبی اور فرسودہ روایات سے منہ موڑ آگے بڑھے ہیں اور روزمرہ کے واقعات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ رنگوں میں شوخی اور متضاد کیفیت پائی جاتی ہے۔ خاکوں کو توڑنا مروڑنا شروع ہو گیا مگر بہت سنبھل سنبھل اور ڈر ڈر کر جس سے مخلوطیت برقرار رہی۔ اس صدی کی پانچویں دہائی سے جو کچھ فنی تجربات کئے گئے وہ گیلری کی نچلی منزل میں رکھے گئے ہیں۔ اس دور کی شروعات دو غیر معمولی تخلیقی قوت لئے ہوئے مصوروں سے ہوتی ہے۔ پہلی امرتا شیرگل اور دوسرے رابندر ناتھ ٹیگور۔ بنگال اسکول جب اپنی مکمل وسعت کر چکا تھا اسی دوران شیرگل پیرس سے مغربی اسالیب کا بڑا وسیع مطالعہ کر کے ہندوستان واپس ہوئیں اور بعید اثر پرست مصوروں کے طرز پر کام کرنا شروع کیا یہ بنگال تحریک کے لئے دوسرا سب سے بڑا چیلنج تھا لہذا بنگال اسکول کے پیروؤں اور رہنماؤں نے امرتا شیرگل کی فنی سرگرمیوں کو غیر قومی قرار دیا اور اُن کے فن کی اشتراکی کیفیت کے کٹر مخالف ہو گئے جس سے اُنہیں بہت دکھ ہوا۔ اُن کی عمر نے بھی زیادہ وفا نہ کی اور ۱۹۴۱ء میں ۲۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

امرتا شیرگل کی ۹۷ تصاویر گیلری میں موجود ہیں۔ لیکن اُن کے فن میں تکنیکی صلاحیت قدرے کم ہے۔ وہ بلا کی حساس مگر جلد باز تھیں۔ وہ غالباً پیرس کے گاگاں۔ موڈگلیانی کے طرز کو اپنا محور بنا کر ایک راہ ڈھونڈ نکالنے میں مصروف نظر آتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اجنتا اور مختصر تصویر کشی سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتیں۔ "جھولا" اور "عورتیں" ان ہندوستانی اثرات سے بھرپور ہیں۔ رنگ بہت محدود ہیں۔ سادگی ان کی تصاویر کی خصوصیت ہے۔ تفاصیل سے پرہیز کرتی ہیں اور نہ ہی وہاں کوئی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کا فنی مجموعہ فقط ایک غلام ہندوستان کا بے کیف خاکہ ہے جس میں زندگی کم اور محرومیت بلا درجہ کی ہے۔ کچھ بھی ہو عوام کے لئے ان کی گیلری بڑی کشش کا باعث ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور شروع شروع میں بنگال کی تحریک احیاء کے بڑے علمبرداروں میں سے تھے مگر جب انہیں غیر ممالک جانے کے مواقع ملے تو انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ فن مصوری اور سنگ تراشی بین الاقوامی سطح پر اس رخش کی مانند ہے جس کی نہ رکاب ہے نہ باگ ہے اور وہ ماضی کی بندشوں کو توڑ کر اپنی بے پناہ قوتوں سے فلک بوس ہو رہا ہے، اور ایک ہم ہیں کہ ہزاروں برس پرانے غاروں میں فن کے معنی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ آخر ٹیگور سے رہا نہ گیا اور وہ چیخ پڑے "پرانی روایات کو دہرانا ہی فن نہیں ہے، بلکہ انفرادی اور جرأت مندانہ تجربوں کی ضرورت ہے"۔ لیکن اس سے پہلے کہ فن کار ان کی آواز کو جامہ پہنا سکتے ٹیگور نے خود اسے شرمندہ تعبیر بنا دیا۔ ٹیگور کے اسی قلم میں جس نے شاعری اور ادب میں ہندوستانی روایات، نزاکت، خوبصورتی لچک، تشبیہ و استعارہ اور بہت کچھ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو، وہاں اب تلخی آگئی۔ فن مصوری میں اُس نے روایات سے منہ موڑ لیا۔ اس نے سفید صفحات پر نقشے بکھیرنے کے بجائے سیاہی انڈیلنا شروع کر دیا۔ انہیں اوراق پر بنگال کی حسیناؤں کے قصیدوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے غم و الم سے بھرپور چہروں کے نقش ابھرنے لگے۔ انسان کا ایک دوسرا رُخ جو ٹیگور اپنی شاعری میں پیش کرنے سے قاصر رہے وہ مصوری میں لے آئے جیسے ٹیگور پیغام دے رہے ہوں کہ فن فقط ایک حسین خواب کی تعبیر ہی نہیں بلکہ زندگی کی ایک تلخ حقیقت بھی ہے۔ ٹیگور کے فنی شاہکار دنیا کے سامنے ۱۹۳۰ء میں پہلی بار پیرس میں پیش کئے گئے۔ بعد ازاں ان کی نمائش روس، انگلینڈ، اور امریکہ میں بھی ہوئی۔ بہت سراہا گیا لیکن کہیں نقادوں نے اُن کی مصوری کو یورپ کے اظہار پرست طرز کا پیرو بتایا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیگور کا فن نوجوان نسل کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ گیلری میں سو تصویریں ہیں لیکن اس میں سے کچھ ہی تصویریں عوام کے لئے لگائی گئی ہیں۔ ان کی تصویروں کا میڈیم عموماً روشنائی ہے جس کا روشنی کے وجود سے پھیکے پڑ جانے کا خطرہ رہتا ہے لہذا ان تصاویر کو ہمیشہ پردے سے ڈھکا رکھا جاتا ہے، مگر جب کوئی دیکھنے کی فرمائش کرتا ہے تو پردہ ہٹا کر دکھا دیا جاتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے کلکتہ کے کچھ نوجوان ترقی پسند مصوروں کی ہمت



پرودوش داس گپتا ۔ کانسی کا مجسمہ

افزائی کر کے بنگال کی تحریک احیاء کے خلاف مورچہ بندی کی بنیاد ڈال دی جو بالآخر ۱۹۴۳ء میں کلکتہ گروپ کے نام سے پرودوش داس گپتا ۔ نرود مجدار، رتھن موترا، سنیل مادھوسین ، پری توش سین، ہینت معز گوپال گھوش، پر مشتمل ایک جدید تحریک شروع ہوئی جہاں کسی لائحہ عمل کے بجائے انفرادی راہوں کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔ ان فن کاروں نے بڑے استقلال اور جرأت کے ساتھ جدید فنی قدروں کی بنیادوں پر تجربے کرنا شروع کئے لیکن یہ اظہار پرست اسلوب سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس گروپ سے متعلق شاہکاروں کو گیلری میں رابندرناتھ ٹیگور سے ملے ہوئے کمرے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے فن میں موضوعات اور ان کی مکمل بندش صاف نمایاں ہے۔ صرف اس کی ساخت میں آزادی اظہار ضروری ہے۔ یعنی تخیل اور اس کا آزادانہ اظہار ہی اظہار پرستی ہے۔ کچھ سالوں سے ہینت معز نے اپنے فن میں استعجابی کیفیت لانے کی کوشش ہے اور سنیل مادھوسین عوامی مصوری کی طرف راغب ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مجموعی طور سے ان سبھی مصوروں نے پرائمری رنگوں سے پرہیز کیا ہے۔ زیادہ تر ہلکے اور بجھے بجھے رنگوں کے استعمال سے تصویروں میں صوفیانہ ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر نتیجہ اس کے برعکس ہے اور آنکھوں کو سکون کے بجائے یاس کا پیغام دیتی ہیں۔

تین سال بعد بمبئی میں جدید مصوروں نے اپنا ایک الگ پرچم لہرایا اور اسے بمبئی ترقی پسند گروپ کے نام سے منسوب کیا۔ اس کے خاص ممبران، سوزا، حسین، پدمسی، گے تونڈے اور گاڈے تھے۔ بعد میں ان کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ ان کی تصاویر، کچھ بمبئی، اور قرب وجوار کے انفرادی فطرت پرستوں کے شاہکاروں کے ساتھ آویزاں کی گئی ہیں۔ بمبئی گروپ نے پرائمری رنگوں کے ذریعہ اظہار پرستی کا راستہ اختیار کیا۔ پدمسی اور گے تونڈے کچھ آگے ہی بڑھ گئے۔ اور تجریدی طرز اختیار کیا۔ پدمسی کے فن میں تجریدیت تو ہے مگر موضوع سے مطابقت برقرار ہوتی ہے۔ لیکن



حسین : دو عورتیں

گے تونڈے نے موضوع کو غیر ضروری قرار دے کر فقط رنگ اور ساخت پر ہی قناعت کر کے اپنا دائرہ کار وسیع کر لیا ہے۔ حسین نے عوامی فن اور صنعت سے متاثر ہو کر ایک انفرادی اسلوب پیدا کر لیا ہے جس پر وہ مستقل مزاجی سے پچھلے ۲۲ برسوں سے قائم ہیں۔ ان کے خاکے سلیس ہیں۔ مگر مجموعی ہیئت سے کافی رنگینیت پائی جاتی ہے خطوط میں بدرجہ اتم کفایت دکھائی جاتی ہے۔ یہی ان کے فن کا سب سے اہم راز ہے۔ حسین کبھی موضوع سے الگ ہو کر کام نہیں کرتے۔ وہ حسن لطیف کے اگر مصور کہے جائیں جیسا کہ کچھ نقادوں نے کہا بھی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ نسائیت کے راز داں معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نتھ پہنے دیہاتی الہڑ عورت، عمامہ پہنے کشمیری حسینہ اور کرتا یا قمیض پہنے کسی شہر کی ماڈرن دوشیزہ حسین کے قلم سے یکساں جاذبیت رکھتے ہوئے کنوس پر نظر آتی ہے۔ ان کے حسن اور نسائیت کو بغیر کسی جامع خدوخال دکھائے پیش کر دینا حسین کی تخلیقی قوتوں کی شہادت ہے۔ ہاتھوں کی ادا دکھانا حسین کے قلم کی دوسری خصوصیت ہے جس سے تصویر میں ہندوستانیت پیدا کر دی جاتی ہے۔ کبھی تشبیہات کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ حسین نے اپنے فن کے متعلق خود بیان کرتے ہوئے ایک بار کہا کہ وہ صرف حقیقی اور غیر حقیقی کیفیات کے امتزاج کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ حقیقی مادے ہمارے پیش نظر قدرت میں موجود ہیں۔ جن سے میں بالواسطہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن کچھ ور مادے بھی ہیں جو ہم نہیں دیکھتے فقط محسوس کرتے ہیں۔ جن کو حقیقت کا روپ دینے کے

لیے استعارہ یا تشبیہ کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ان کی تصاویر کا یہ دوسرا رُخ لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتا۔

۱۹۵۰ء کے لگ بھگ دہلی میں دہلی شلپ کلا چکر کے نام سے ایک گروپ قائم ہوا جس کے لیڈر سیلوز مکرجی تھے۔ اس گروپ کے کچھ مصور اور کچھ دوسرے جو اس گروپ سے متعلق نہ تھے۔ اور آزادانہ کام کر رہے تھے اُن کے شاہکاروں کو آویزاں کیا گیا ہے۔ ان فن کاروں میں امرناتھ سہگل، ستیش گجرال، سیلوز مکرجی، اوناش چندر، بیرن ڈے، دل داس گپتا، سلطان علی، رام کمار، کلکرنی، کشن کھنہ، دھرمانی، جیون لوٹلیا



سیلوز مکرجی ۔ گاؤں کا کنبہ

اور ادم پرکاش قابل ذکر ہیں۔ . . . . . . ادم پرکاش، بمل داس گپتا کشن کھنہ، بیرن ڈے، تجریدی اسلوب پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ بقیہ سبھی کم و بیش اظہار پرست فن کار تصور کیے جاتے ہیں۔ سلطان علی نے اظہار پرستی میں استعجابی کیفیت پیدا کرکے اپنا انفرادی مقام حاصل کر لیا۔ وہ ہندوستانی قبائلی مصوری سے کافی متاثر ہیں۔ بمبئی گروپ کے مصوروں کی طرح ان سبھی نے شوخ اور تیز رنگوں کا استعمال کیا ہے۔ دہلی گروپ میں صرف سیلوز مکرجی ایسے فن کار تھے جنہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی تھی کہ ہندوستانی فن میں بین الاقوامی جدید قدروں کے ساتھ ساتھ ہندوستانیت ضرور برقرار رکھنی چاہیئے۔ ورنہ ہندوستانی مصوری کی انفرادیت ختم ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو سکتا ہے۔ بہرحال انہوں نے اپنی مصوری میں یہ بات پیدا کرنے کی کوشش کی تھی حالانکہ وہ بدرجہ اتم فرانس کے ماتیس مصور سے متاثر تھے۔ انہوں نے فرانس میں جب اپنی نمائش کی تو وہاں کے نقادوں نے انہیں ماتیس آف انڈیا کے لقب سے پکارا۔ یہ کمی انہوں نے محسوس کی اور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ماتیس کے اثر کو کافی حد تک ختم کر دیا تھا اور خالص ہندوستانی رنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے مگر ۱۹۶۱ء میں انتقال ہو جانے سے ہندوستان ایک مایۂ ناز مصور سے محروم ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے ان کی تقلید شروع کی مگر بعد میں اس خوف سے باز رہے کہ کہیں انہیں بھی سیلوز سے متاثر ہونے کا الزام نہ دے دیا جائے۔

ستیش گجرال اس گروپ کی نہایت اہم شخصیت ہے گجرال نے اپنی شروعات میکسیکو کی دیواری تصاویر کے زیر اثر کی اور انہوں نے اس دور میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ مگر نقادوں نے کچھ سال تو انتظار کیا کہ شاید یہ کوئی ایسا اسلوب پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں جسے ہندوستانی کہا جا سکے مگر جب ایسا نہ ہوا تو انہیں بھی سیکرا اور اوروزکو سے متاثر ہونے کا مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور یہ دیکھا گیا کہ گجرال نے اس قسم کی تصویریں بنانے سے احتراز کرنا شروع کیا۔ اور دوسرا اسلوب ڈھونڈھ نکالنے میں مصروف نظر آنے لگے۔

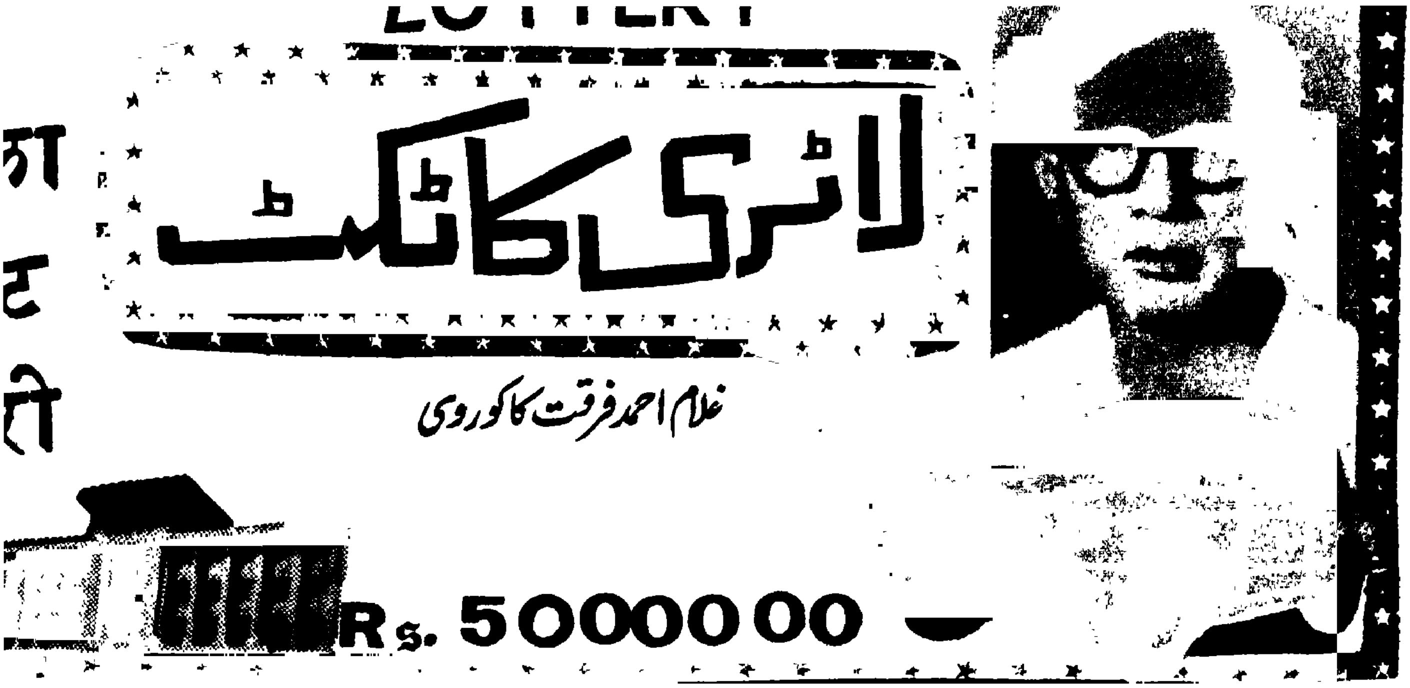
پچھلے چند سالوں میں مدراس گروپ نے بھی ہندوستانی جدید مصوری میں اپنا خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ پانیکر کی نمائندگی میں سنتھا راج، راجا دلو، ڈھن پال، شانن مگا سندرم اور مونو سوامی وغیرہ نے جدید تجربے کئے ہیں۔ یہ فن کار کوشش کر رہے ہیں کہ جدید تقاضوں کے ساتھ پرانی ہندوستانی قدروں کو بھی اجاگر کیا جائے۔ ان کے فن میں جنوبی ہند کے مندروں کے فن سنگ تراشی کی جھلک کچھ تبدیلیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان تجرباتی کوششوں کے نمونے گیلری میں نمائندگی کر رہے ہیں۔

آخر میں بڑودہ گروپ ۱۹۵۲ء میں قائم کیا گیا۔ جس کی رہنمائی بیندرے نے کی۔ اور جس کے ممبر شنکھو چودھری، سنتوش، شانتی دوے، راگھو کنیرا



بیندرے ۔ ایک مکان

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)



لاٹری کا ٹکٹ

غلام احمد فرقت کاکوروی

میں روزانہ سڑکوں کے کنارے کچھ لوگوں کو آئس کریم کے بکسوں کی وضع کے بکس لئے کھڑے دیکھتا تھا اور اُن کے قریب سے گزر جاتا تھا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ ان بکس والوں سے میری نگاہیں چار ہوگئیں مگر میں نے کبھی ان سے کسی قسم کا سوال کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ایک مرتبہ جب میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اُدھر سے گزر رہا تھا میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ یار! یہ کون لوگ ہیں جو بکسوں پر بڑے بڑے اشتہاروں کی جھولی ڈالے دن دن بھر ایک ٹانگ سے کھڑے رہتے ہیں۔ اس پر انہوں نے بتایا کہ آج کل ہمارے ملک کی تمام صوبائی حکومتوں کی طرف سے سرکاری طور پر لاٹریوں کا کاروبار شروع کیا گیا ہے اور یہ لوگ بطور ایجنٹ اُن کے ٹکٹ بیچتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان لاٹریوں میں کوئی لاٹری سچی بھی ہوتی ہے۔ بولے سبھی لاٹریاں سچی ہوتی ہیں اور ان میں جن خوش نصیبوں کے نمبر آتے ہیں وہ آن واحد میں، لکھ پتی ہوجاتے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے دو ایک مثالیں بھی دیں اور بتایا کہ ابھی حال میں ایک معمولی جھلی والے کے نام پچاس لاکھ روپے کا انعام نکلا ہے اور اب وہ ایک کوٹھی میں رہتا ہے اور اس کے لڑکے موٹروں میں لدے لدے پھرتے ہیں۔ اُن میں سے کئی نے بڑے بڑے کارخانے کھول لئے ہیں۔ یہ سنتے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جھلی والے کے بجائے پچاس لاکھ روپے مجھے مل گئے ہیں چنانچہ میں نے بڑھ کر ایک پچاس لاکھ والی لاٹری کا ٹکٹ خرید لیا جس میں پہلا انعام پچاس لاکھ کا تھا اور دوسرا چالیس لاکھ اور تیسرا بیس لاکھ کا۔ میں نے ٹکٹ خریدنے کے بعد دل میں کہا کہ ایک معمولی جھلی والے کو جس کے حسب نسب کا کوئی ٹھیک نہیں

ہوتا پچاس لاکھ مل سکتے ہیں تو ہم جیسے نجیب الطرفین جس کا حسب نسب براہ راست عرب تک چلا گیا ہے کہاں کے گئے گزرے ہیں کہ قدرت ہم کو دس بیس لاکھ روپے کا مستحق بھی قرار نہ دے۔ اس کے بعد ہم نے اپنی پچھلی زندگی کے بعض حقائق پر جب غور کرنا شروع کیا تو یاد آیا کہ ایک مرتبہ والدہ صاحبہ کسی سے ہماری پیدائش کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں تو انہوں نے کہا تھا کہ کسی فقیر نے بتایا ہے کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر بڑا بھاگوان ہوگا۔ نہ جانے فرشتوں کی فروگذاشت سے یہ آپ کے یہاں کیسے پیدا ہوگیا اس کو تو کسی راجہ مہاراجہ کے یہاں پیدا ہونا چاہئے تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جب یہ ادھیڑ عمر کو پہنچے تو اُسے کہیں سے چھپّر پھاڑ کر دولت ملے گی اور بڑے بڑے حکام اور دولتمند اس کے آگے پانی بھریں گے۔ اسی طرح پیدائش کے بعد میرے سینہ پر ایک سرخ رنگ کا دو دوڑا تھا جسے دیکھ کر ایک دوسرے درویش نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر لعل و جواہر سے کھیلے گا اور اتنی بڑی جائداد کا مالک ہوگا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی گرد و پیش کی عظیم ترین عمارتیں ہم کو ہیچ نظر آنے لگیں۔ ریزرو بنک کی وہ عمارت جسے ہم ابھی تک دلی کی حسین ترین عمارت سمجھے ہوتے تھے ہم کو جھونپڑے سے بدتر نظر آنے لگی۔ اس کے بعد لال قلعہ کے بارے میں ہم سوچنے لگے کہ اگر شاہجہاں کی جگہ ہم ہوتے تو بجائے سرخ پتھر کے سارا قلعہ سونے چاندی کی اینٹوں کا بنواتے۔ اس کے بعد لاٹری نکلنے کا خیال آتے ہی خود بخود ہماری

بغلیں بجنے لگیں اور مارے خوشی کے ہم اپنی کھال بھڑکانے لگے۔ ہم نے اپنی گردن کو اپنے جسم پر زاویہ قائمہ کی شکل دے کر اِس انداز میں چلنا شروع کر دیا جس طرح بڑے بڑے وزرا، اپنا فوٹو کھنچواتے وقت اپنی حال میں ایک خاص قسم کا استغنا پیدا کر لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم کو اپنا زمین پر قدم رکھ کر چلنا بُرا معلوم ہونے لگا اور ہمارا خیال دنیا کی تیز رفتار موٹر کی طرف گیا۔ نہ جانے کس سے سنا تھا کہ دُنیا کی سب سے زیادہ تیز رفتار موٹر امریکہ کے مرحوم صدر کینیڈی کے پاس تھی چنانچہ یہ خیال آتے ہی ہم نے طے کر لیا کہ لاٹری نکلتے ہی ہم کم از کم ویسی ہی چار موٹریں خرید کر اپنے بچوں میں بانٹ دیں گے۔ اور اُن کے لئے کناٹ پلیس میں چار عظیم الشان محل تعمیر کرا دیں گے جسے دیکھنے کے لئے ساری دُنیا کے سیاحوں کا تانتا ہندوستان کی طرف بندھ جائے گا اور دُنیا کی حسین ترین عمارت تاج محل لوگوں کو ہیچ نظر آنے لگے گی۔

چونکہ لاٹری کھلنے کی تاریخ میں صرف پانچ روز باقی رہ گئے تھے۔ اور ۲۱ مارچ کو ہمارے نام انعام ملنے کا تار آنے والا تھا اس لئے وقت کی تنگی کے پیشِ نظر ہم سیدھے اپنے عزیز ترین دوست مرزا کے پاس گئے، جن کو عمارتوں کی خرید و فروخت میں خاص شہرت حاصل تھی اور جو دُنیا کی موٹروں کی وجہ تسمیہ سے بھی بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ مرزا صاحب کے گھر پہنچتے ہی ہم نے زور زور سے ان کے گھر کے کواڑ پیٹنا شروع کر دیئے۔ مرزا صاحب اس وقت حجام کا انتظار کر کے غسل خانے جا چکے تھے چنانچہ اُنہوں نے غسل خانے میں جب کواڑوں کی بھڑ بھڑاہٹ سنی تو گھر کی مغلانی سے چلا کر کہا: "کہدو مردود سے کہ مرزا صاحب تیرا انتظار کرتے کرتے غسلخانے چلے گئے۔ تجھ کو سویرے بلایا تھا اور دس بجے آیا ہے۔ چنانچہ مغلانی نے بغیر دروازہ کھولے مرزا صاحب کے الفاظ جوں کے توں دُہرائے۔ اِس پر میں نے کہا: "ارے۔ میں ہوں" اس پر مغلانی نے پھر آ کر مرزا صاحب سے کہا کہ وہ حجام نہیں کوئی دوسرا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مرزا صاحب بولے تو پھر موچی ہوگا۔ اس کم بخت سے کہدو کہ آٹھ بجے کے اندر آنا تھا اور اب تو ساڑھے دس بجے آیا ہے۔ اس کے بعد جب میں نے پھر زور سے کہا کہ ارے: مرزا میں ہوں ذرا جلدی نکل" تو مرزا نے قہقہہ لگا کر لاحول ولا قوۃ کہا اور ہنس کر مغلانی سے کہا کہ باہر کمرہ کھول کر مرزا صاحب کو بٹھا دو میں ابھی آتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد مرزا صاحب کاندھے پر تولیہ ڈالے اور گنگناتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے اور بولے " ابے تو ہے۔ پہلے تیری آواز پر مجھے حجام کا دھوکا ہوا اس کے بعد موچی جیسی آواز معلوم ہوئی۔ ابے جہاں پہلی بار شریف گھرانے میں پیدا ہوا تھا، وہاں لب و لہجہ بھی بدلوا لیا ہوتا۔ میں نے کہا مرزا اس وقت میں تیری بکواس سننے نہیں آیا ہوں بلکہ ایک بہت ہی اہم معاملے میں مجھے تجھ سے مشورہ کرنا ہے مرزا نے کہا۔ وہ کون سا ایسا اہم معاملہ ہے جو آج تمہارے سر آن پڑا۔

میں نے کہا: مرزا! یہ بتاؤ کہ اس وقت دلّی میں تم مجھ کو چار بہترین قسم کی کوٹھیاں دلوا سکتے ہو۔

مرزا بولے: کیوں نہیں۔

میں نے کہا:۔ تو بتاؤ نا

مرزا نے کہا:۔ لال قلعہ، پارلیمنٹ ہاوس، وائسرائیگل لاج جہاں آج کل ہمارے صدرِ جمہوریہ مقیم ہیں اور حویلی حسام الدین۔

میں نے جھنجھلا کر کہا:۔ مرزا اگر تم مذاق کے موڈ میں ہو تو میں چلا جاؤں۔

مرزا نے کہا:۔ اس وقت مذاق کی کون سی بات ہے۔ کیا اِن چاروں میں سے تم کو کوئی پسند نہیں۔

میں نے کہا:۔ مرزا: اس وقت میں تمہاری احمقانہ باتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں تم سے سنجیدگی سے ایک بات پوچھ رہا ہوں اور تم اُسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ میرے بچوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی زندگی ہی میں بچوں کی آیندہ زندگی کے لئے انتظام کر دوں۔ ورنہ زندگی کا کیا بھروسہ آدمی بُلبلا ہے پانی کا۔

مرزا نے کہا:۔ تو آپ ابھی مر کب رہے ہیں۔ اور اگر مرتے بھی ہوں گے تو میں کب مرنے دوں گا

میں نے کہا:۔ مرزا تم سمجھ نہیں رہے ہو کہ میری صحت کس درجہ خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مگر میں سمجھ رہا ہوں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔

مرزا نے کہا:۔ بھائی خدا کے لئے اس قسم کی احمقانہ باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟

میں نے کہا:۔ کیا بات کہی ہے۔ اتنی دیر سے میں کہہ تو رہا ہوں کہ تم مجھے چار حسین ترین کوٹھیاں دلوا سکتے ہو یا نہیں۔

مرزا صاحب نے کہا:۔ یہ تو میں نے سُن لیا مگر یہ بتاؤ کہ یہ کوٹھیاں خرید کون رہا ہے اور کس مقصد کے لئے خرید رہا ہے۔

میں نے کہا:۔ کوٹھیاں میں خرید رہا ہوں اور اس مہینے کی ۲۱ تاریخ تک ان کا انتظام ہو جانا چاہیئے ورنہ پھر مجھے زمین لے کر از سرِ نو بنوانا

پڑیں گی اور اس میں کئی سال لگ جائیں گے۔ قیمت کی فکر مت کرنا جتنے کی بھی ہوں گی لے لوں گا۔ جب میں نے مرزا سے آخری فقرہ کہا تو مرزا حیرت سے مجھے دیکھنے لگا اور اس نے اپنا منہ میرے منہ کے پاس لا کر اس طرح مجھے دیکھنا شروع کیا کہ جیسے وہ میری دماغی کیفیت آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا: تو پھر مرزا بتاؤ۔ کوئی ایسی چار کوٹھیاں تمہاری نظر میں ہیں؟

مرزا نے کہا: ہوں۔

میں نے کہا:۔ ہوں، نہیں۔ مجھے چار کوٹھیاں ایسی ول فرنشڈ درکار ہیں۔ جو دلی میں اپنا جواب نہ رکھتی ہوں۔

مرزا نے کہا میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور غوط میں پڑ گیا۔ ایسے موقع پر جب کوئی اس قسم کی حرکتیں کرنے لگتا ہے تو میرے آگ لگ جاتی ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں مگر غصہ کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے مرزا سے پھر کہا۔ "مرزا میں تم سے کوٹھیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ تو دلواتے ہو یا نہیں۔ اگر یہ کام تمہارے بس سے باہر ہو تو اسی وقت صاف صاف بتاؤ۔ تاکہ میں کوئی دوسرا انتظام کروں۔"

مرزا نے اس کے جواب میں اپنی جیب سے سگرٹ کی ڈبیہ نکال کر اور اس میں سے ایک سگریٹ منہ تک لے جاتے ہوئے کہا۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مرزا میری ساری باتیں بجائے کانوں کے آنکھوں سے سن رہا تھا۔ اس نے پھر مجھے بڑے غور سے دیکھا اور بولا۔

"بھابی کی طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ دیکھو مرزا۔ تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو اور میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں کیونکہ مجھے انہیں کوٹھیوں کی مناسبت سے دُنیا کی چار تیز ترین رفتار کی موٹریں بھی خریدنا ہیں

مرزا بولے:۔ ہوں

میں نے کہا:۔ تو ۲۱ کی صبح تک اِن دونوں چیزوں کا تمہیں انتظام کرنا ہوگا۔

مرزا نے قدرے موہوم آواز سے کہا۔ ہوں

میں نے کہا۔ مرزا دیکھو اب مجھے دوبارہ یاد دلانے کی ضرورت نہ پڑے۔

مرزا نے اپنی گدی کھجا کر کہا۔ ہاں

میں نے اُٹھتے ہوئے پھر کہا۔ مرزا ۲۱ تاریخ یاد رکھنا یعنی ۲۱ کے بعد ہی ۲۲ تاریخ ہوتی ہے۔ یعنی دوسرے دن سویرے۔

جب میں چلنے لگا تو مرزا نے نہ تو حسب دستور قدیم مجھ سے بیٹھنے کے لئے اصرار کیا اور نہ اس موضوع پر زیادہ گفتگو کی۔ البتہ جب میں دروازہ کھول کر باہر جانے لگا تو مرزا نے مجھے اس طرح دیکھا جس طرح کینسر کے آخری اسٹیج والے مریض کو کوئی ڈاکٹر دیکھ کر اس سے رخصت ہوتا ہے۔

میں مرزا صاحب کے پاس سے اُٹھ کر سیدھا گھر آیا اور بیوی سے لاٹری کی خریداری کا ذکر کرتے ہوئے بعض فقیروں نے میرے بارے میں جو پیشین گوئیاں کی تھیں انھیں کچھ اس طرح بیان کیا کہ بیوی بچوں کو ہماری کامیابی کا روپیہ میں سترہ آنے بھر یقین ہو گیا۔ اس کے بعد بیوی نے کہا کہ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جس عمرے میں گزری ہوں اس کے بارے میں بچپن میں حضرت نبی اللہ شاہ نے جو میری امی کے پیر اور بہت پہنچے ہوئے درویش بھی تھے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ لڑکی جس گھر میں بھی بیاہ کر جائے گی اُس گھر میں ایک زمانے میں اچانک ہُن برسنا شروع ہو جائے گا اور اس کا شوہر بہت بھاگوان ہوگا۔ اُس پر میں نے کہا کہ دیکھو پرسوں اللہ میاں کیا دکھاتے ہیں؟

بیوی نے کہا کہ پرسوں کے معنی یہ ہوئے کہ جمعے کے دن۔

اس پر میرے بڑے صاحبزادے نے کہا کہ امی مجھ سے قسم لے لیجئے لاٹری ہزار دو ہزار میں والد ہی صاحب کے نام نکلے گی کیونکہ پرسوں جب میں یونیورسٹی جا رہا تھا اور لال قلعہ کے سامنے بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اتنے میں میں نے مڑ کر دیکھا کہ ایک شخص پنجڑے میں کئی بٹے لے بیٹھا تھا اور وہ بٹے تاش کے برابر پتوں کو اپنی چونچ سے اٹھا اٹھا کر لوگوں کی قسمت کا حال بتا رہے ہیں چنانچہ میں نے بھی تفریحاً دس پیسے پھینک کر اپنی قسمت کا حال دیکھنا چاہا تو بٹے نے جو پتہ اٹھانا چاہا اس پر لکھا تھا۔

" FRIDAY IS THE HAPPIEST DAY FOR YOU."

یعنی جمعہ کے دن تم کو سب سے زیادہ خوشی ہوگی۔

یہ سُن کر بغل میں جو میری آٹھ سالہ بچی کھڑی تھی اُس نے بغلیں بجا بجا کر اُچکنا اور کہنا شروع کیا کہ پرسوں ہم سب لوگ لکھ پتی ہو جائیں گے۔

بیوی نے کہا کہ پہلے یہ بتایئے کہ آپ نے ٹکٹ احتیاط سے رکھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دوسرے کے ہاتھ لگ جائے کیونکہ آپ اول جلول واقع ہوئے ہیں۔ میں نے ٹکٹ جیب سے نکال کر کہا "یہ دیکھو بٹوے میں میں نے بڑے احتیاط سے رکھ لیا ہے اور بٹوے کو ایسی جگہ رکھ لیا ہے کہ وہاں تک کسی کا ہاتھ

، پہنچ سکتا۔ بیوی نے کہا "مگر مجھے اب بھی اطمینان نہیں ہے۔ اگر ممکن ہو تو ینک لاٹری نہیں نکلتی آپ اس کو کسی بنک کے فکسڈ ڈپازٹ میں رکھوا دیجئے۔"
نے کہا کہ بنک وینک میں رکھوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پرسوں تو ڑی نکل رہی ہے۔

کے بعد بیوی نے اپنی دونوں باچھیں دونوں کانوں کی لوؤں تک پہنچاتے ہوئے ا کہ اگر انعام ملا تو کتنا ملے گا۔

میں نے کہا کہ پہلا انعام پچاس لاکھ کا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ موٹر اور ۸۰۰ گز کا پلاٹ ہے۔

بیوی نے کہا کہ دیکھو کہ اللہ میاں نے کتنے دنوں بعد میری دعا قبول کی نے سچ کہا ہے کہ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ہمیشہ سے میری دلی تمنا کہ کم از کم گھر میں ایک موٹر ہو اور ایک بڑی سی کوٹھی جسے میں اپنی مرضی کے ق سجا سکوں اور گھر میں کم سے کم پانچ نوکر ہوں۔ سو اللہ میاں نے میری سُن لی۔

نے کہا۔ بیوی! میں آج سویرے مرزا صاحب کے پاس گیا تھا وہ مکانوں کے دین میں ماہر ہیں اور وہ چار کوٹھیاں اچھی سی دلوا دیں گے۔ سردست میں نے یہ یا ہے کہ جب تک تینوں لڑکوں کی شادی نہیں ہوتی وہ ہم لوگوں کے ساتھ رہیں اس کے بعد ان کو علیحدہ علیحدہ کوٹھیاں دے دوں گا تاکہ وہ علیحدہ اپنی بیوی بچوں ساتھ رہیں اور ایک ایک موٹر خرید دوں گا۔ ایک کوٹھی مجھے شمو کو جہیز میں دینا اس لئے فی الحال اس کی شادی کے وقت تک وہ کرایہ پر اٹھی رہے گی ب شادی ہو جائے گی تو وہ جانے اس کا کام۔

ی نے کہا "ہاں یہ میری بھی رائے ہے کیونکہ میں ہمیشہ سے بہوؤں کو ساتھ رکھنے خلاف ہوں۔"

نے کہا۔ میں سمجھتا ہوں۔ ہمارے تمہارے لئے دو موٹریں کافی ہوں گی۔ ایک ارے قبضہ میں رہے گی اور دوسری کو میں آنے جانے میں استعمال کروں گا۔ یہ ٹھیاں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس لاکھ میں مل جائیں گی۔ اس کے بعد بقیہ پیہ بنک میں جمع کرا دوں گا اور اپنی زندگی ہی میں تمہارا مہر بھی ادا کر دوں گا۔ سے جو سود آئے گا وہ اتنا ہوگا کہ دو تین پشتیں نہایت فراغت سے زندگی ر سکیں گی۔

ی نے کہا: تو ۱۳ کی صبح کو کے بجے تک لاٹری کھل جائے گی؟

نے کہا: یہی دس گیارہ بجے تک اور دوپہر نہیں تو شام تک تار آجائے گا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے پتہ بھی ٹھیک لکھا ہے۔ کہیں تار اِدھر سے اُدھر نہ ہو جائے

میں نے کہا کہ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ گھر کا پتہ غلط لکھ دوں۔ پتہ لکھنے کے بعد میں نے دو مرتبہ غور سے پڑھ لیا تھا۔

۱۲ مارچ آگئی اور ہم سب لوگ مکان کی گیلری میں کرسیاں ڈالے تار والے کے انتظار میں سرخاکی وردی والے راہ گیر پر مسمریزم کی مشق کرنے لگے۔ کوئی دو یا تین بجے ہوں گے کہ ایک ایکسپرس ڈلیوری سے خط ملا جس میں ہمارے ایک دوست نے لکھا تھا کہ وہ بال بچوں کے ساتھ دو روز کے لئے دلی کی قدیم عمارتوں کی سیر کرنے آرہے ہیں اور ان کا قیام ہمارے گھر ہی پر رہے گا۔

میں نے خط پڑھ کر کہا کہ مہمانوں کا آنا بھی نیک فال ہے اس کے بعد شام کے ۵ بجے ایک ٹیلی گرام والا آتا ہوا دکھائی دیا اور اس نے ہمارے دروازے پر رُک کر ہمیں آواز دی۔ بیوی بچے اس کی آواز سُن کر مارے خوشی کے ننگے پاؤں زینہ سے نیچے اُتر گئے اور گھر بھر نے تار والے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تار والے نے تار حوالے کرتے ہوئے انعام مانگا تو اس روز کے خرچے کے لئے جو پانچ روپے کا آخری نوٹ جیب میں رہ گیا تھا وہ ہاتھ میں آگیا۔ میں ڈاکئے سے کہنے والا تھا کہ اُسے ٹرخاؤ مگر بیوی نے مارے خوشی کے کہا کہ نہیں جو اس کے نام کا نکل آیا اُسے دے دو۔ اس کے بعد تار لے کر میں نے کہا کہ چونکہ بہت مبارک تار ہے اس لئے گڈو سے جو میرا سب سے چھوٹا بچہ ہے اسے چاک کرا دیکھوں کہ اس قسم کے تار معصوم بچوں ہی سے چاک کرانا چاہیے۔ چنانچہ جونہی گڈو نے تار چاک کیا تو گرد و پیش کی فضا قہقہوں سے گونج گئی۔ میں نے جلدی سے گڈو کے ہاتھ سے تار لے کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا "افسوس آج دوپہر کو بھائی جان کا السیشن کتا مر گیا" یہ تار میری چھوٹی بہن کی طرف سے تھا۔



پھولوں کا راجہ گلاب

ایس ایم شاہ نواز

کہا جاتا ہے کہ باغ عدن میں سفید گلاب کا پھول کھلا ہوا تھا۔ حوا اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوئیں اور اُسے چوم لیا گلاب اس بات سے شرمایا اور سرخ ہوگیا۔

گلاب کی تاریخ بہت پرانی ہے گلاب کے ماہرین کا خیال ہے کہ تین کروڑ سال پہلے بھی دُنیا میں گلاب موجود تھا۔ شروع میں یہ صرف ایک جنگلی پھول تھا لیکن اس کے فطری حسن اور بے پناہ کشش نے انسان کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اس کی خوشبو انسانی حواس پر چھا گئی۔ انسان کو ابتدا سے ہی گلاب سے رغبت رہی ہے۔ یُگ یُگ سے کہاوتوں اور داستانوں کا موضوع رہا ہے۔ تاریخ طب، ادب، آرٹ، موسیقی، شاعری، دیومالا اور قدیم داستانوں میں جگہ جگہ گلاب کا تذکرہ ملتا ہے۔

تقریباً ہر زبان کی شاعری میں حسن کو ہمیشہ پھول سے تشبیہ دی گئی اور تشبیہ دیتے وقت شعراء کے ذہن میں گلاب کا پھول ہی رہا ہے۔ اُردو شاعری میں گلاب پر بے شمار اشعار موجود ہیں۔

نہ صرف گلاب کا پھول بلکہ اس کا کانٹا بھی فکری نشوونما کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ حسن کی حفاظت کے لئے پہرہ داروں کا تصور گلاب کے کانٹے سے مشابہت رکھتا ہے۔ اکثر کانٹے کو قدیم عربی شاعری میں رقیب کے نام سے یاد کیا گیا ہے کیونکہ عربی شاعری میں رقیب سے مراد وہ حریف نہیں ہے جو کسی حسین سے محبت کرتا ہو، بلکہ قدیم عربی شاعری میں رقیب سے مراد سرپرست سے ہے۔

سنسکرت کے قدیم مسودات میں بھی گلاب کا ذکر ملتا ہے۔

مہاتما بدھ کو بھی گلاب بہت پسند تھا جب وہ تیس سال کی عمر میں گھر بار تیاگ کر سچائی کی تلاش میں جنگلوں میں نکل گئے تو وہاں انہیں دو چیزوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا — ان میں ایک ہرن تھا اور دوسرا گلاب کا پھول۔

لیکن گلاب اپنی موجودہ امتیازی شان کے لئے مغلوں کا مرہونِ منت ہے مغل شہنشاہوں کو گلاب سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ دور دراز ملکوں سے گلاب کی نئی نئی اقسام منگوا کر شاہی باغات میں لگائی جاتی تھیں۔ شاہی خاندان کے افراد عقیدت و محبت کے اظہار کے لئے گلاب کے پھول اور کلیاں ایک دوسرے کو پیش کرتے تھے۔ شاہی حماموں میں غسل کے لئے گلاب کا عرق ڈالا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گلاب کا عطر ملکہ نورجہاں کی دریافت ہے۔ کالا گلاب شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا نے سب سے پہلے اپنے باغ میں پیدا کیا۔ یہ باغ دہلی میں اُس جگہ واقع تھا جہاں اب گاندھی گارڈن ہے۔ نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو گلاب بے حد پسند تھا جب کبھی گلاب کا ذکر آتا ہے تو ان دونوں کا نام ذہن میں ضرور آتا ہے۔

ہمارے ملک میں گلاب پر لوگوں کے نام بھی رکھے جاتے ہیں۔ جیسے گلابو، گلاب چند، گلاب سنگھ، گلاب بیگم وغیرہ۔

موجودہ دور میں گلاب کے شائقین نے اس کے رنگوں اور قسموں کے سلسلے

میں نئے نئے تجربے کرکے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ آج لوگ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے خواہش مند ہیں۔ ہندوستان میں آب و ہوا اور مٹی کی مناسبت سے گلاب کی سینکڑوں قسمیں پائی جاتی ہیں۔ گلاب کی کچھ اقسام ایسی ہیں جن میں قطعی خوشبو نہیں ہوتی۔ گلاب کا پھول تقریباً ہر رنگ کا ہوتا ہے لیکن قطعی سیاہ اور قطعی نیلا نایاب ہے۔ اس کے پھول کی طرح اس کے پودے بھی مختلف قامت کے ہوتے ہیں۔ گلاب کا پودا چھوٹی جھاڑی کی شکل میں بھی ہوتا ہے اور بیل کی مانند بھی۔

زمانہ قدیم میں ہندوستان میں گلاب کی بیشتر اقسام ہمالیائی علاقوں میں پائی جاتی تھیں لیکن اب یہ سارے ملک میں اگایا جاتا ہے۔ اس کی کاشت کے لئے پہاڑی علاقے موزوں ترین ہیں دراصل گلاب کو شدید گرمی یا شدید سردی کی برداشت نہیں۔

ہندوستانی گلاب غیر ممالک میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اس وقت اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کو ۵ لاکھ کٹ فلاورز کے آرڈر ملے ہوئے ہیں، اور مزید اضافے کی توقع ہے۔

ہندوستان میں موجودہ صدی کے شروع میں پیوندی گلاب کو بہت مقبولیت حاصل رہی لیکن کچھ عرصے بعد "ٹی روزیز" نے اُن کی جگہ لے لی۔ ان پھولوں میں چائے کی سی خوشبو ہوتی ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے گلاب کے شائقین "ہائبرڈ ٹیز" اور "فلوری بنڈ" گلابوں میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔

ہندوستان میں گلاب نے نہ صرف فنونِ لطیفہ پر گہرا اثر ڈالا ہے بلکہ معاشیات میں بھی اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کیا ہے اس سے بہت سی اشیاء تیار کی جاتی ہیں مثلاً تیل، روح، عطریات، عرقیات و ادویات غیر ممالک میں ہندوستان میں تیار کیا ہوا گلاب کا عطر بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ ایک طرف گلاب کا پھول انسانی تخیل کو تحریک دیتا ہے تو دوسری طرف گلاب کا عرق انسان کے دل کو تسکین پہنچاتا ہے۔ اختلاجِ قلب اور خفقان کے مریض اس سے راحت پاتے ہیں۔

گلاب ہماری زندگی کا ایک رنگ بن گیا ہے۔ ہمارے ملک میں اس کے بغیر کوئی تقریب مکمل نہیں ہوتی۔ چاہے وہ خوشی کا موقع ہو یا موت کا یا عبادت کا، ہر جگہ گلاب کی فرمانروائی ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر اس کے ہار بنائے جاتے ہیں، عظیم ہستیوں کے حضور میں اسے بطور احترام پیش کیا جاتا

غزل

عرش صہبائی

اُن کی مست آنکھیں ہیں ساون کی گھٹاؤں کی طرح
آپ بھی کافر ہیں وہ اپنی اداؤں کی طرح

ہم سمجھ بیٹھے ہیں اُن کو باوفاؤں کی طرح
جو بدل لیتے ہیں رُخ اپنا ہواؤں کی طرح

زندگی کی ناؤ اِن سے اِس قدر مانوس ہے
اَب ہیں امواجِ تلاطم ناخداؤں کی طرح

رُوح کو ایک تازگی ملتی ہے اُن کی یاد سے
وادیٔ کشمیر کی ٹھنڈی ہواؤں کی طرح

محفلِ دُنیا میں ہیں دُنیا سے لیکن بے نیاز
صحنِ مے خانہ میں ہیں ہم پارساؤں کی طرح

خدمت و ایثار، اخلاص و وفا، مہر و کرم
اب وجود اِن کا ہے گنبد کی صداؤں کی طرح

زندگی! تیرے ستم ہائے مسلسل کے نثار!
یہ کڑکتی دھوپ بھی ہے مجھ کو چھاؤں کی طرح

ہیں ابھی باقی یہاں عہدِ محبت کے نقوش!
دل کی بستی ہے اجنتا کی گپھاؤں کی طرح

چاند کی دھرتی کی صورت ہیں نگاہوں میں وہ آج
رازہائے زندگی جو تھے خلاؤں کی طرح

اپنی خاموشی میں بھی تقریر کا عالم ہے عرشؔ
ہم نے مانا کہ ہم ہیں بے نواؤں کی طرح

ہے۔ مزارات اور سمادھیوں پر بطور عقیدت چڑھایا جاتا ہے۔

ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ دنیا کے ہر حصے میں اس کی اہمیت ہے۔ یہ نگاہ کی تسکین اور رُوح کی بالیدگی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ گلاب کے ساتھ نفاست، طمانیتِ قلب اور پاکیزگی کا جو تصوّر وابستہ ہے وہ شاید کسی اور شے کے ساتھ ممکن نہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر دُنیا میں گلاب نہ ہوتا تو انسان ایک بڑی نعمت سے محروم رہتا۔

ڈبے عشق

اظہر افسر

افراد :-

پروفیسر
مس کیمیا
طالب

ایک وسیع کمرے کے بیچوں بیچ میز ہے جس پر کتابوں کا انبار ہے۔ نیچے فرش پر بھی ادھر اُدھر اخبار اور رسالے بکھرے ہوئے ہیں، ایک جانب دو تین معمولی کرسیاں ہیں۔ دوسری طرف ایک نقشی کرسی پر چالیس سالہ پروفیسر جدید طرز کا چشمہ لگائے کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔

دائیں جانب سے ایک نوجوان نہایت عمدہ سوٹ پہنے داخل ہوتا ہے۔ یہ طالب ہے۔

طالب :- میں نے کہا آداب عرض ہے۔

پروفیسر :- (چشمہ اُتار کر میز پر رکھ دیتا ہے) او ہو طالب ہیں، آیئے آیئے تشریف رکھئے۔

طالب :- (سامنے والی ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) جی۔

پروفیسر :- کہیئے خیریت !

طالب :- جی ہاں بالکل خیریت، دُعا ہے آپ کی، آپ شاید بھول گئے۔

پروفیسر : جی

طالب :- آپ نے مجھے بُلایا تھا،

پروفیسر :- بُلایا تھا، آپ کو ؟

طالب :- جی ہاں آپ نے فرمایا تھا کہ آج ٹھیک پانچ بجے میں آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں (اپنی کلائی پر دفیسر کو دکھاتا ہے۔) ٹھیک پانچ بجے ہیں۔

پروفیسر :- اوہ : پانچ بج گئے ۔

طالب :- جی ہاں : (گردن جھکالیتا ہے) اور ٹھیک پانچ بجے آپ مجھے وہ گُر بتانے والے تھے جس سے میں . . . .

پروفیسر :- جس سے تم ؟

طالب :- جس سے میں اپنی محبوبہ کیمیا کو رام کرسکوں ۔

پروفیسر :- (بُری صورت بناتا ہے) کیمیا — (پھر چہرہ بشاش بناکر) اوہ ہاں ہاں یاد آیا، بیٹھئے بیٹھئے آرام سے بیٹھئے ۔

طالب :- جی شکریہ، میں ٹھیک ہوں ۔

روفیسر: (کتاب بند کر دیتا ہے) لیکن ایک بات ہے۔
الب: جی!
روفیسر: سوال یہ ہے کیا وہ گر جو میں تمہیں بتا دوں، تم انھیں یاد بھی رکھ سکوگے،
الب: جی ہاں: حرف بہ حرف، اسی لیے میں اپنے ساتھ ایک نوٹ بک بھی لیتا آیا ہوں۔
(کوٹ کی جیب سے ایک دبیز نوٹ بک نکالتا ہے)
روفیسر: تو ساری باتیں تم لکھ لوگے،
الب: (جیب سے پن نکالتا ہے) جی ہاں اگر آپ اجازت دیں،
روفیسر: ضرور ضرور، میری جانب سے پوری پوری اجازت ہے، لکھو سب سے پہلی بات۔
طالب: جی!
پروفیسر: اپنی محبوبہ سے کبھی کبھی مل لیا کرو۔
طالب: (نوٹ بک کھول کر ایک صفحہ پر لکھتا ہے پھر گردن اونچی کر کے) مگر پروفیسر زرگر جی تو روز ملنے کو چاہتا ہے۔
پروفیسر: روز چلے جایا کرو، مگر کبھی کبھی کوئی تحفہ بھی دیا کرو۔
طالب: تحفہ!
پروفیسر: مگر یہ تحفہ کم قیمت کا ہونا چاہئے، نہایت سستا،
طالب: جی۔
پروفیسر: کبھی کبھی اس سے کہدیا کرو کہ تمہیں ایک بہت بری لت ہے۔
طالب: لت؟
پروفیسر: ہاں لت، ایسی لت جسے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔
طالب: کوئی نہیں چھڑا سکتا؟
پروفیسر: ہاں کوئی نہیں۔ بلکہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں،
طالب: یہ تو بہت بری بات ہوگی پروفیسر صاحب،
پروفیسر: بری نہیں سب سے عمدہ بات ہوگی۔ تمہاری محبوبہ یہ طے کرے گی کہ وہ اس لت کو تمہاری زندگی سے الگ کر کے رہے گی۔
طالب: پروفیسر صاحب کیا وہ . . . .

پروفیسر: نہیں وہ عمر بھر تمہاری کسی لت کو تم سے الگ نہیں کر سکے گی۔ یہ تو بس ایک سبق ہے۔ لکھو۔ اور اچھی طرح یاد کر لو — پھر کبھی کبھی . . . .
طالب: جی کبھی کبھی —
پروفیسر: کبھی کبھی ملنے جایا کرو تو گھنٹوں چپ رہا کرو۔
طالب: چپ —
پروفیسر: بالکل چپ۔ اور کبھی کبھی محبوبے سے یا جان بوجھ کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ بھی مار دیا کرو۔
طالب: ہاتھ پر ہاتھ؟
پروفیسر: ہاں لیکن زیادہ نہیں، صرف ایک بار، کبھی کبھی گھنٹوں اس کی طرف تکنے لگو — لیکن۔
طالب: لیکن؟
پروفیسر، لیکن اپنے لبوں سے کچھ نہ کہو۔
طالب: کچھ نہ کہوں؟
پروفیسر: بالکل نہیں، ہاں کبھی کبھی کوئی عمدہ شعر پڑھ دیا کرو، مگر شعر متقدمین کا ہو، اپنا نہ ہو، مثال کے طور پر اگر اس نے بنا کسی آرایش اور زیور کے سادہ کپڑے پہن رکھے ہوں تو شعر پڑھ دو،

سادہ لباس پہنا زیور اتار رکھا
اس سادگی پہ اس نے کتنوں کو مار رکھا

طالب اور جو اس نے زیور پہن رکھے ہوں تب؟
پروفیسر: تب کہو، نہ جانے کیوں مجھے زیوروں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی، میں زیور خود خریدنے کے بجائے خریدوانے میں لطف پاتا ہوں۔
طالب: جی
پروفیسر: کبھی بیٹھے بیٹھے اچانک اٹھ جایا کرو اور مصرع پڑھو۔ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے، پھر بیٹھ جایا کرو۔ اور دوسرا مصرع پڑھو، مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

طالب:۔ جی۔

پروفیسر: پھر لمبی لمبی چند سانسیں لے کر کہو یہ ہماری تمہاری آخری ملاقات ہے، آج کے بعد تم مجھے کبھی نہ دیکھ سکوگی۔

طالب: کبھی نہیں ؟

پروفیسر:۔ ہاں کبھی نہیں، پھر آٹھ دس دن تک اس سے ملنا چھوڑ دو،

طالب:۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

پروفیسر: لیکن اس طرح ہونا ضروری ہے۔

طالب: جی۔

پروفیسر: کبھی کبھی بچوں کی کہانیاں سنانا بھی بہت مفید ہوتا ہے خاص طور پر پریوں کی کہانیاں۔

طالب: پریوں کی کہانیاں ؟

پروفیسر: ہاں ایسی جن میں پری کی بے حد تعریف ہو اور پری بڑی دقت سے ملے، یا پھر ایک آدھ خط لکھو جس میں نہایت ادب سے درخواست کرو کہ وہ تم سے اکیلے میں کہیں ملے۔ نوٹ میں لکھو کہ بڑی ضروری بات کہنی ہے۔

طالب: پروفیسر! مگر یہ ترکیب لاجواب ہے۔

پروفیسر:۔ اور جب اکیلے میں ملو تو بلا وجہ جھگڑنا شروع کر دو،

طالب:۔ جھگڑنا ــــ ؟

پروفیسر: اور لڑنا بھی، پھر اچانک اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہو، بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہوجائے جنگ ہوکر، پھر بے اختیار ہنسنے لگو اور دیر تک ہنستے ہی جاؤ۔

طالب:۔ قہقہہ لگاؤں ؟

پروفیسر:۔ ہاں لگاؤ، ہوں ہوں اس وقت نہیں،

طالب:۔ (قہقہہ لگاتے لگاتے ایک دم چپ ہوجاتا ہے) ۔ جی۔

پروفیسر: زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اس کے ہونٹ، ناک، آنکھیں، گردن، کمر پنڈلیوں اور ٹخنوں اور دوسری ضروری ضروری چیزوں پر اساتذہ کے منتخب اشعار زبانی یاد کرو۔ ایک ایک شعر مسلسل یا فرداً فرداً اپنی کیمیا کے سامنے پڑھا کرو! پھر بڑی عاجزی اور انکساری سے گردن جھکا کر کہو میں اس لائق نہیں ہوں کہ کوئی مجھے کسی لائق سمجھے پھر بھی اتنا کہہ کر اپنی جیب سے نہایت سفید رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ لو۔

طالب:۔ رومال آنکھوں پر رکھ لوں ؟

پروفیسر:۔ ہاں! اور ایک آنکھ بچا کر تاثرات بھی دیکھتے جاؤ۔

طالب:۔ جی آنکھ بچا کر ؟

پروفیسر:۔ ہاں! یا ملاقات کے وقت بے اختیار آگے بڑھ کر اس کی گود میں اپنا سر رکھ دو اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگو۔

طالب:۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے۔

پروفیسر: ہوسکتا ہے۔ ؟

طالب: بڑی آسانی سے۔

پروفیسر: یا پھر اس سے کہو کہ میں تین چار سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے کے لئے باہر جا رہا ہوں ــــ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یا جانے پر مجبور ہوں۔

طالب:۔ بہت بہت شکریہ پروفیسر صاحب۔ اب میں جا رہا ہوں۔

پروفیسر:۔ جا رہے ہو، شہر چھوڑ کر جا رہے ہو، کتنے دن کے لئے ؟

طالب:۔ جی نہیں شہر چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں، پروفیسر صاحب آپ کے دیئے ہوئے سبق آزمانے جا رہا ہوں (نوٹ بک جیب میں رکھ کر رومال سے پسینہ پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

پروفیسر:۔ رگڑ کھاتے ہیں جب پتھر تو ہوتا ہے شرر پیدا
زمیں پر مینہ برستا ہے تو ہوتا ہے شجر پیدا ــــ جاؤ

طالب:۔ جی ہاں پروفیسر صاحب، کہ
"فلک کرتا ہے جب گردش تو ہوتا ہے قمر پیدا"

پروفیسر:۔ اور ــ "بشر کرتا ہے جب محنت تو ہوتا ہے ثمر پیدا" بات تو سنو۔

طالب:۔ خدا حافظ۔ (طالب دائیں جانب چلا جاتا ہے۔)

پروفیسر:۔ چلا گیا، پوری بات سنے بغیر چلا گیا، اس کا مطلب ہے اب مجھے شہر چھوڑ کر جانا ہوگا۔

(دائیں جانب ہی سے گلابی رنگ کے شلوار، شرٹ
میں ملبوس ایک ۲۲ سالہ لڑکی (کیمیا) داخل ہوتی
ہے ــــ)

یا :۔ آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے پروفیسر صاحب،

وفیسر :۔ آپ؟

یا :۔ شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا،

وفیسر :۔ جی بالکل نہیں،

یا :۔ بدنصیب ہی کو کیمیا کہتے ہیں۔

وفیسر :۔ کیمیا۔ یعنی طالب کی مطلوبہ، تو پھر جایئے جلدی کیجئے۔ طالب
آپ ہی سے ملنے گیا ہے۔

میا :۔ (بڑی ادا سے بیٹھ جاتی ہے۔) پروفیسر صاحب۔

وفیسر :۔ جی۔

میا :۔ ابھی کچھ دیر پہلے طالب چوراہے کے پاس دکھائی دیئے، میں
حیران ہوئی کہ یہ اس طرف کدھر، اُن کے پیچھے چلنے لگی تو وہ
بغیر کسی طرف دیکھے اپنی ہی دُھن میں یہاں آپ کے پاس پہنچے،
میں اس کھڑکی کے پیچھے کھڑی ہو کر ساری باتیں سُن چکی ہوں،

روفیسر :۔ ساری باتیں؟

میا :۔ جی، اور شکر ہے کہ میں اس مقام تک پہنچ گئی جہاں مجھے پہنچنا
چاہیئے تھا،

پروفیسر :۔ اور طالب ۔؟

میا :۔ کیمیا پر طالب زر نہیں زرگر قابو پاتا ہے پروفیسر صاحب

پروفیسر :۔ یہ ــ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

کیمیا :۔ آپ نہیں، کہیئے یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔

پروفیسر :۔ ہاں یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

کیمیا :۔ یہی کہ تجرّد کی زندگی بہت گزار چکے آپ، اور پھر وہ شعر نہیں سنا
آپ نے :۔ مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اُس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا،

(پروفیسر زرگر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیتا ہے
(کیمیا قہقہہ لگاتی ہے) (پردہ گرتا ہے)

آج کل دہلی

بقیہ: ماڈرن آرٹ

برنیدر پتیل۔ جینت پارکھ وغیرہ ہیں۔ ان کے شاہکار گیلری میں نمائش کے لئے الگ اور خاص طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر تجریدی اسلوب کے علمبردار ہیں۔ تجریدی اسلوب کے تین خاص ارکان ہیں یعنی تنظیم، تقابل، اور رنگ آمیزش، ان کے باہمی امتزاج سے تجریدی کنوس کی تخلیق کی جاتی ہے اس گروپ کے کچھ مصوروں نے بین الاقوامی سطح پر خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ یہ گروپ فن کو کسی حلقہ یا جغرافیائی حد کی میراث بنانے میں یقین نہیں رکھتا۔

بنگال کی نئی پیڑھی کے مصوروں کو بھی جن میں گوپال سانیال، پاٹن، ارون بوس، نجن چودھری، وغیرہ شامل ہیں گیلری میں جگہ دی گئی ہے۔ کشمیر میں بھی ایک ترقی پسند گروپ کام کر رہا ہے جس میں ترلوک کول اور نثار عزیز قابلِ ذکر ہیں جن کے تجریدی فن پارے گیلری میں نمایاں طور سے لگے ہوئے ہیں۔

فن سنگ تراشی کے نمونوں کی گیلری میں نمائندگی زیادہ نہیں ہے کیونکہ اس صدی میں فن کاروں کا رجحان زیادہ تر مصوری ہی کی طرف رہا۔ دوسرے فن سنگ تراشی میں فن مصوری کی بہ نسبت اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں جب تک کہ فن کار معاشی اعتبار سے خود کفیل نہ ہو۔ سنگ تراشی میں تجربات کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے زبردست مالی امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا عموماً طالب علم اس طرف بہت کم ہی رجحان دکھاتے ہیں۔

جو فن کار اس فن میں کم و بیش کام کر رہے ہیں۔ اُن میں رام کنکر امرناتھ سہگل، سنکھو چودھری، بیش داس گپتا، پرودو ڈویر والا، دھن راج بھگت، دھن پال، راگھو کنیریا، دھرمانی، سربری رائے چودھری۔ اور جانکی رام کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان سبھی کے شاہکاروں کو گیلری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس طرح یہ گیلری پورے ہندوستان کے جدید فنی تجربوں اور تحریکوں کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ یہاں جدید فنون لطیفہ سے متعلق ایک لائبریری بھی ہے جہاں طالب علموں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے کافی آسانیاں فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ پریزرویشن لیبارٹری بھی ہے جو بڑی جانفشانی سے فنی شاہکاروں کو محفوظ کرنے کا کام کرتی رہتی ہے۔ گیلری میں آنے والے طلبا اور عوام کو گائڈ کرنے کی بھی آسانیاں فراہم ہیں۔ ہر اتوار کو عام پبلک کے لئے آرٹ اور عام موضوع پر فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں آئیں تاکہ ہم اپنے تہذیبی ورثے کے ساتھ ساتھ نئی قدروں سے روشناس ہو سکیں۔



ظفر حمیدی

آگ کی لپیٹ میں تو سارا شہر آیا تھا
راکھ ہو گیا جل کر آہ میرا گھر تنہا
انجمن سجی کتنی داستاں بنی کتنی
ہے ہبوطِ آدم سے آدمی مگر تنہا
زندگی میں درد و غم ساتھ ساتھ رہتے تھے
کس طرح کٹے گا یہ موت کا سفر تنہا
خود نگر کوئی ٹھہرا، خود نما کوئی ٹھہرا
طرفگی کا یہ عالم اور مری نظر تنہا
ہر حسین چہرے کو گھورتے تھے رک رک کر
ڈھونڈھتے پھرے کس کو ہم نگر نگر تنہا
اک اتھاہ گمشدگی، اک نشاطِ بے پایاں
دشتِ کرب میں گزرے ہم جدھر جدھر تنہا
اس ہجومِ جلوہ میں اس نگار خانہ میں
کاش مجھ کو مل جاتا تیرا سنگِ در تنہا

دل کے اس خرابے میں کون آکے بستا ہے
کل بھی تھا ظفر تنہا آج بھی ظفر تنہا

کاوش بدری

نہ تبسم آپ کا معتبر، نہ تکلم آپ کا محترم
مرے تجربوں کے دیار میں نہ کرم کرم نہ ستم ستم
ابھی ریزہ ریزہ قدِ سحر ابھی پارہ پارہ قبائے شب
ابھی دور دور ہیں منزلیں ابھی چور چور قدم قدم
ابھی تیرے نقش و نگار میں ہیں فنا پذیر لطافتیں
اے مصورِ رخِ زندگی میرا رنگ بھی تو ہو کم سے کم
تب و تابِ صبحِ بہار ہی رگِ سازِ برگِ شجر شجر
رخِ یار و آتشِ سرد ہی شبِ غم میں حاصلِ کیف و کم
کوئی غم نہیں جو غروب ہو مہِ فکر ابرِ سیاہ میں
کہ ہر ایک دور کا رازداں کوئی ہم نوا، کوئی ہم قلم
یاں خدا پرست کا نور کیا، یاں نارِ سنگ پرست بھی
نہ ضیائے صحنِ حرم حرم نہ شرارِ حسنِ صنم صنم

مانی ناگپوری

دبی ہوئی شکستہ دل میں ہے بہارِ آرزو!
کہ خاکِ گلستاں سے آرہی ہے پھر گلوں کی بو
مہ و نجوم و کہکشاں ہیں زیرِ پائے جستجو
میں اس مقام سے قریب آگیا، جہاں ہے تو
میں چاہتا ہوں صبح کی ردائے پاک مانگ لوں
ستم شعار لائی ہے شمیمِ زلفِ مشک بو
سخنوروں کا شعر میں خیال جیسے لڑ پڑے
جو بات اُن کے دل میں ہے وہی ہے میری آرزو
کسی حریمِ ناز کا ذرا سا پردہ اُٹھ گیا:
بس اس کے بعد آج تک جنوں خراب کو بکو
نظامِ روز و شب میں انقلاب چاہتا ہوں میں
بجائے مہر و ماہ آئے سامنے وہ شعلہ رو
کسی کی مست انکھڑیاں ہیں مانی عمر سے شبنمی
یہی مقام ہے جہاں ملے ہیں رند با وضو



علیم افسر

کیا جرأتِ سخن سے ملا سوچتے رہے
ہم ٹوٹے کے پتھروں کو صدا سوچتے رہے
کیوں آکے پوچھتی تھی ہوا سوچتے
کیا ہوگا بادلوں کا پتا سوچتے
کیسے سلگتی ریت کی اب تشنگی بجھے
ساحل پہ آکے آبلہ پا سوچتے رہے
سر پہ چمکتی دھوپ تھی دل میں ہم
دریا کو کیوں ساتھ لیا سوچتے
ہاتھوں میں اپنے لیکے دھنک شام آگئی
سورج سے کیا ہوئی ہے خطا سوچتے رہے
ہم نے اِدھر اچھالے تو تھے مدعا کے
کیوں خالی ہاتھ آئی ہوا سوچتے
دامن کو اپنے کیسے بھگوتے سراب سے
پی جاتے کس طرح سے گھٹا سوچتے رہے
ہم شب کی سرحدوں کی طرف لوٹے
یہ دن بھی کچھ بُرا تو نہ تھا سوچتے
کسطرح پاؤں چاٹ گئے راستے کا درد
یہ کون ساتھ ساتھ چلا سوچتے رہے

تیج بہادر بھان

زندگی کا تقاضا

"پانچ بج گئے، صاحب"

چپراسی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ آس پاس نظر دوڑائی۔ میز پر فائلیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ مضمون اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا اور قلم نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ پل بھر کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ بکھری فائلوں کو ترتیب دے، قلم تلاش کرے اور مضمون کو ڈھنگ سے لکھ دے۔ بے ترتیبی سے اُسے بہت چڑ تھی لیکن دوسرے ہی پل یہ خواہش کندھوں کے ایک ہلکے جھٹکے کے نیچے دب گئی۔ فائلوں کو ڈھنگ سے جمانے یا قلم دان کو سجانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اب رہا ہی کیا تھا اس کی زندگی میں جسے سجاتا، سنوارتا؟

وہ اُٹھ کر دفتر سے باہر نکل آیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی شباب پر تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کے ننگے گلے میں سوئیاں سی چبھو دیں۔ غیر ارادی طور پر اُس کے ہاتھ کوٹ کے کالر اُٹھانے کو بڑھے، پھر اچانک رُک گئے۔ وہ کالر اُٹھائے نہیں تو گلا ننگا رہ جائے گا، ٹھنڈ جم جائے گی۔ ... رگ رگ جم جائے گی ... ... نمونیا کا حملہ ہوگا ... ... اور پھر سب کا خاتمہ — ... یہی کچھ تو ہوتا ہے اور یہی کچھ تو ہوا تھا اور اس کی بچی ہنستے کھیلتے انجانی سمتوں میں گم ہو گئی تھی۔

زندگی اور موت پر کسی کا بس نہیں۔ قدرت اٹل ہے اُسے قدرت سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن اُس کی بچی، معصوم بچی، زندگی کی صرف تین بہاریں ہی دیکھ پائی تھی۔ معصومیت کی سرحدوں سے ابھی باہر نہیں آئی تھی وہ۔ پھر بھی موت نے اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

کاش، یہ بے رحم موت اس پر بھی اپنے ہاتھ بڑھا دے، وہ بھی مر جائے! ... ... اور اپنی بچی کے پاس پہونچ جائے — شاید پندرھواں یا سولہواں دن تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ جیسے سوہوں صدیاں بیت گئی ہوں۔ اب تو یہ دوری برداشت سے باہر تھی۔ بچی کی یاد آتے ہی اُس کی آنکھیں مدھم ہو گئیں۔ سامنے سے آتا ہوا تانگا بے ڈھنگی بکروں میں بدل گیا۔ کسی راہ گیر نے اُسے بازو سے کھینچ کر تانگے کی زد سے بچا لیا۔ بوکھلا کر اُس نے "شکریہ" کا لفظ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ محلے کے بچے گلی میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بجلی کا کھمبا وکٹ کا کام دے رہا تھا۔ ایک لڑکا کمزوری لکڑی کا ٹکڑا ہاتھ میں لئے کھمبے کے سامنے تیار کھڑا تھا۔ دوسری طرف گیند لے کر ایک لڑکا دیکھ رہا تھا کہ کب راستہ صاف ہو اور وہ بال پھینکے۔ ساری گلی میں غلغلہ مچا تھا۔ اُس کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ آج اس کی بچی ہوتی تو وہ بھی کھیل رہی ہوتی۔ اُسے دفتر سے آتے دیکھ کر، دوڑی دوڑی آتی۔ اُس کے تھکے گھٹنوں سے لپٹ جاتی۔ باہوں میں جھول جاتی۔ شاید اپنی نئی گیند کی مانگ بھی کرتی۔ اُس کے پاؤں رُک گئے۔ اس کی احساس سے عاری نظریں کھیلتے ہوئے بچوں کو ٹٹولنے لگیں۔ جیسے کسی کی تلاش میں ہوں۔ گیند تھامے ہوئے بچے نے کھیج کر کہا "بیچ میں سے ہٹیے نا مجھے گیند پھینکی ہے۔"

یہ سُن کر وہ تیز تیز قدم بڑھاتا، گھر کی طرف مڑ گیا —

گھر میں کئی گیندیں تھیں۔ گیند کھیلنے کا بلّا بھی تھا، کئی طرز کے کھلونے بھی تھے۔ بچّی کے مرنے کے بعد اُس نے اُن ساری چیزوں کو ایک صندوق میں رکھ دیا تھا، دفتر سے گھر آکر وہ صندوق کھولتا تھا۔ ایک ایک کھلونے کو گھورتا۔ ایک ایک کپڑے کو تھپتھپاتا، چھوٹے چھوٹے جوتوں کو چومتا اور ساتھ ہی ساتھ آنکھوں سے دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔ اب نہ تو کبھی کوئی گیند گم ہوگی، اور نہ ہی کوئی نئی گیند کے لئے مچلے گا۔ نہ کوئی بلّا پکڑ کر کھمبے کے سامنے کھڑا ہوگا اور نہ کوئی اُن گڑیوں سے توتلی معصوم باتیں کرے گا۔ اب وہ تنہا ہے اور کچھ یادوں کے کھنڈر جن کے سہارے اُسے زندگی کے انگنت تکلیف آزما دن گزارنے ہیں۔

گھر پہنچ کر اس نے جوتے اتارے۔ ہاتھ منہ دھویا اور اُس گوشے میں گیا۔ جہاں وہ حسب معمول بیٹھتا ہے۔ کمرے کے دُوسرے گوشے میں اُس کی بوڑھی ماں رات کے کھانے کے لئے سبزی کاٹ رہی تھی۔ رسوئی میں اس کی بیوی چائے بنانے کے لئے چولہے میں کوئلے ڈال رہی تھی۔ اس سارے ماحول میں ایک کڑواہٹ سی اُبھر آئی تھی۔ محسوس ہوا کہ گھر میں کسی کو اس کی بچّی کا غم نہیں۔ کوئی سبزی کاٹ رہا ہے تو کوئی چائے بنا رہا ہے۔ وہ خود بھی تو آرام سے بیٹھا، اپنی بھوک مٹانے کی فکر میں تھا جیسے بچّی کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی — آج ماں بھی حسب سابق چپ تھی۔ ماں روز ادھر اُدھر کی باتیں چھیڑا کرتی تھی، جن کی حقیقت میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس کی ماں یہ فضولیات اس لئے چھیڑا کرتی تھی تاکہ اس کے اکلوتے بیٹے کا دھیان بچّی کی یاد سے ہٹ جائے۔ ماں تو بے وقوف ہے۔ بھلا ان معمولی باتوں سے اپنے دل کی دھڑکن کو کوئی بھول سکتا ہے۔ بچّی تو اُس کے دل کی دھڑکنوں میں بسی ہے۔ ماں کی اِن حرکتوں سے اُسے تکلیف ہوتی اور وہ چڑ کر دانستہ طور پر بچّی کا ذکر چھیڑ دیتا۔ بچّی کے نام سے اُس کی ماں رو پڑتی اور اُسے اطمینان سا ہو جاتا۔ لیکن اُس کی بیوی کی حرکت اطمینان کو پریشانی میں بدل دیتی۔ بیوی بچّی کا ذکر چھڑتے ہی دھاڑیں مار مار کر روتی تھی۔ سینہ کوٹتی۔ بال نوچتی۔ اور بے حال ہو کر سسکیوں میں ڈوب جاتی تھی۔ کئی بار اُس نے ارادہ کیا کہ بیوی کے سامنے بچّی کی چرچا نہ چلائے۔ بے چاری بیوی۔ نو مہینے بچّی کو اپنی کوکھ میں رکھا، خود بھوکی رہ کر بچّی کو کھلایا، رات رات بھر اُسے چھاتی سے لگائے جاگا کرتی تھی، ماں جو تھی۔ ماں سے بڑھ کر بچّی کا دُکھ اور کسے ہوگا؟ اُس کا جی چاہا کہ اپنے پیار سے بیوی کا غم غلط کر دے، میٹھی باتوں سے غمزدہ دل کو ڈھارس بندھا دے۔ اپنی مضبوط بانہوں میں اُس کے وجود کو سہارا دے۔ اب تو جیسے صدیاں بیت گئی تھیں، بیوی سے ہنسے — بولے۔ پر جب بھی اُس نے بیوی کے قریب ہونا چاہا، بچّی کی یاد آگئی۔ بچّی کی یاد آتے ہی اُس کے آنسو نہ تھمے تھے۔ اُسے روتے دیکھ کر بیوی بھی رو پڑتی اور دونوں ایک دوسرے کو تھامے من کا درد آنکھوں سے بہانے پر مجبور ہو جاتے —

کمرے کی خاموشی میں دم گھٹنے سا لگا تھا — اُبلتے ہوئے چولہے کی سُوں سُوں بھی اُس خاموشی میں کوئی تضاد پیدا نہ کر سکی تھی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں سر جھکائے سبزی کاٹنے میں محو تھی۔ بڑھاپے نے ماں کے سارے بال برف کی طرح سفید کر دیئے تھے۔ چہرے پر جھریوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ جسم میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ کچھ دنوں کی تو مہمان ہے — پھر شاید موت اس کی ماں کو بھی چھین لے گی۔ یکایک اُسے ایک بھیانک خیال آیا۔ اگر موت غلطی سے نوشگفتہ کلی کی بجائے، اس سامنے بیٹھے ہوئے مرجھائے پھول کو لے جاتی تو؟ وہ یکایک چونک پڑا۔ سارے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی — اُسے یقین نہ آیا کہ ایسا بھیانک خیال بھی اُس کے دماغ میں آسکتا ہے۔

کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو رہا ہے۔ بصورت دیگر بیٹا ہونے کے ناتے وہ اپنی ماں کے بارے میں ایسا نہ سوچتا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماں نے اُسے سوالیہ نظروں سے جانچا۔ ماں سے آنکھیں ملانے کی اُسے ہمت نہ ہوئی وہ نظریں چُراتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے طاقچے سے بچّی کے کھلونوں و کپڑوں کا صندوق اُتارا۔ اُس کے ڈھکن کو جھاڑا اور سامنے رکھ دیا۔ کانپتے ہاتھوں سے صندوق کا ڈھکن کھولا۔ یکایک فق سا رہ گیا — صندوق خالی تھا۔

اُس کی بچی کے کھلونے، کپڑے، جوتے — کچھ بھی اُس میں نہیں
.کچھ دیر وہ اُس کے خالی تلے کو گھورتا رہا — دھیرے دھیرے
ے رنج و غصے کے جذبات نمایاں ہونے لگے. وہ جان گیا کہ ماں
ع خاموش کیوں بیٹھی رہی تھی۔ یہ کوشش صرف اس کی ماں ہی کر سکتی
،جو چاہتی تھی کہ بچی کو بھول کر وہ ازدواجی زندگی کی چکی پیستا رہے. گویا
انسان نہیں — کوئی مشین ہے — وہ جھٹکے سے اٹھا اور
رازے کی طرف لپکا۔ دروازے پر بیوی چائے کی پیالی لئے کھڑی
،۔یکایک اس کے منہ سے نکلا —

" صندوق خالی ہے : "

.بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر صندوق کا ڈھکن
.کردیا اور اس پر چائے کی پیالی رکھ دی۔

" چیزیں کہاں گئیں ؟ " جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا تھا
.بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے آہستہ سے کہا —
یں نے پھینک دیں وہ سب چیزیں ! "

اُسے یقین نہ آیا۔ بھلا بھی ماں اپنی ممتا کو پھینک سکتی ہے ؟ ضرور
ں کی بیوی اپنی ساس کو محفوظ رکھنے کے لئے جھوٹ بول رہی ہے —

" سچ سچ کہہ دو کہاں ہیں چیزیں ؟ تم ماں ہو کر اپنی بچی کی چیزیں
یں پھینک سکتیں — "

وہ اور بھی نہ معلوم کیا کیا بکتا — اُس کے دل میں آگ جل رہی
ی۔لیکن بیوی کے پھوٹ پھوٹ کر رونے سے اُس کی زبان رُک گئی —
.بیوی نے روتے ہوئے اونچے لہجے میں کہا —

" ہاں ہاں، میں نے ماں ہو کر اپنی بچی کی چیزیں پھینک دیں موت
نے تو اُسے چھین لیا۔ اب وہ تمہیں بھی مجھ سے چھینے جا رہی ہے۔
یں — میں . . . . . !

. . . . اور وہ حیران سا کمرے کے وسط میں کھویا کھویا سا کھڑا
تھا۔ (ہندی سے ترجمہ) مترجم۔ اے۔ اے منظر

اپریل ۷۰ء کے شمارے میں صفحہ ۲۵ پر کستوربا گاندھی کی برسی کی تاریخ ۲۲ فروری کے بجائے ۱۲ فروری چھپ گئی ہے۔ قارئین تصحیح کر لیں۔

بقیہ: نئی کتابیں

جو وقتی سیاست پر مبنی ہوں گی، اُن کی دلچسپی اور اہمیت بھی وقتی ہوگی۔ اس کے علاوہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے مصنف مخصوص سیاسی خیالات رکھتے ہیں، اس لئے وہ لوگ اس سے پوری طرح لطف نہیں اٹھا سکیں گے، جو اُن کے سیاسی خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ مثلاً انہوں نے قریب قریب ہر مضمون میں چھاگلہ صاحب پر طنز و تعریض ہے۔ اسی طرح مرارجی ڈیسائی کا بہت ذکر آیا ہے، نیز اگر مصنف کو کسی شاعر یا ادیب سے اختلاف ہے یا اُن کی تخلیقات کو پسند نہیں کرتے تو اُن کے متعلق ایسے سوالات کرتے ہیں، جن سے اُن کی ناپسندیدگی بالکل واضح اور عیاں ہوتی ہے اس سے کتاب کی غیر جانبداری مجروح ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مصنف کو ان باتوں سے بلند ہونا چاہئے تھا

مجھے ایک بات اور محسوس ہوئی ہے وہ یہ کہ سوالات میں عام طور پر حشو و زوائد بہت ہیں۔

بہر حال شاہ نصیر صاحب فریدی کی اس کوشش کو وہ لوگ یقیناً پسند کریں گے، جو سیاسی لحاظ سے اُن کے ہم خیال ہوں گے اور مختلف مواقع پر مصرعے یا شعر پڑھنے کے عادی ہوں یا پسند کرتے ہوں۔

سنگم: جناب قادر صدیقی کے کلام کا مجموعہ ہے جو اُردو اور ہندی دونوں رسم خط میں ایک ساتھ شائع ہوا ہے۔

لُطف زندگی بخشا غم کی بے پناہی نے
ورنہ مار ڈالا تھا تیری کم نگاہی نے

قادر صدیقی کا یہ انداز ہر جگہ ہے۔ اشعار دل پر اثر کرتے ہیں۔ اور قاری کی دلچسپی ہر وقت قائم رہتی ہے۔ کل ہند، ہندی اُردو سنگم کا یہ تجربہ یقیناً کامیاب ہے۔ ضرورت ہے کہ اور کتابیں اس طرح شائع کی جائیں۔ اور یہ سلسلہ جاری رہے۔
ناشر مکتبہ کل ہند ہندی اُردو سنگم لکھنؤ۔ قیمت: تین روپے

(ادارہ)

نئی کتابیں

عبداللطیف اعظمی

اس کو غزل کہتے ہیں: از سعادت حسین، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۴۴ صفحات۔ مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۷ روپے، تاریخ اشاعت ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء، ملنے کا پتہ: نیشنل بک ڈپو، چار کمان، حیدر آباد ۲ (اے پی)

زیر تبصرہ کتاب ۹ مضامین پر مشتمل ہے، جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ (۱) شعر و شاعری کی آبرو ہے غزل (۲) میر کا غم (۳) ظفر کی سوگواری (۴) فانی کی قنوطیت (۵) تصوف اور اصغر (۶) غالب کا فکری آہنگ (۷) حسرت کی رومانیت (۸) یاس یگانہ کی رجائیت (۹) فراق کا جمالیاتی شعور

ان عنوانات سے کتاب کے موضوع اور مباحث کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب میں کوئی دیباچہ شامل نہیں ہے، جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ مضامین مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ اور کیا وجہ ہے کہ صرف آٹھ ہی شاعروں کو اردو غزل کی نمائندگی کے لئے منتخب کیا گیا ہے، علاوہ ازیں میری ناچیز رائے میں کتاب کے عنوان کا تقاضا تھا کہ ان منتخب شعراء کے صرف تغزل پر لکھنا چاہئے تھا، لیکن شاید فاضل مضمون نگار غزل کی رنگا رنگی دکھلانا چاہتے تھے۔ لیکن اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو غزل کی دوسری خصوصیات پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ بہر حال یہ مضامین محترم مضمون نگار کے وسیع مطالعہ اور گہرے فکر و تامل کا نتیجہ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ضرور پسند کی جائے گی۔

۱۴۴ صفحات کی اس کتاب کی سات روپے قیمت یقیناً بہت زیادہ ہے، خصوصاً جب آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدر آباد کے حسن و تعاون سے شائع ہوئی ہے

جلتے سول: از شمس فرخ آبادی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۹۶ صفحات مجلد مع گرد پوش، قیمت: دو روپے، تاریخ اشاعت: یکم جنوری ۱۹۶۸ء ملنے کا پتہ: شمشاد احمد خاں بنگلہ ۱۸ا روز روڈ عالم باغ لکھنؤ (یو پی)

جناب شمشاد احمد خاں صاحب شمس فرخ آبادی ایک نوجوان شاعر ہیں (سال ولادت ۱۹۳۲ء)

اس مجموعے میں جناب شمس کے دوست احباب کی تحریریں شامل ہیں جن میں موصوف کی شاعری کی تعریف کی گئی ہے

موصوف غزل بھی کہتے ہیں، نظم بھی اور گیت بھی۔ شروع میں تاثرات اور تعارف، مقدمہ اور عرض حال کے بعد صفحہ ۱۹ سے ۶۵ تک غزلیں ہیں اور صفحہ ۹۵ سے ۹۶ تک نظمیں گیت، قطعات وغیرہ ہیں غزل شروع ہونے سے پہلے حسب ذیل قطعہ ہے۔

یہ کہئے حادثاتِ زمانہ کی دین ہے
کیونکر نصیب ہوتی بھلا شاعری مجھے
ہر غم کو ڈھال دیتا ہوں تصویر کی طرح
حالات سے ملا ہے فنِ آذری مجھے

شمس صاحب آرٹسٹ بھی ہیں، قطعہ کے آخری مصرع میں اسی طرف اشارہ ہے، اسی صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے تصویروں کے ذریعہ سے اشعار کی وضاحت بھی کی ہے، جو میرے خیال میں بے ضرورت ہے۔

قاضی نذر الاسلام: مصنفہ: بسودھا چکرورتی، مترجمہ: عرش ملسیانی، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۰۵ صفحات، غیر مجلد، قیمت سوا دو روپے، تاریخ اشاعت مارچ ۱۹۶۹ء، ملنے کا پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

حکومت ہند کے ادارے "نیشنل بک ٹرسٹ" نے قومی سوانح حیات کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے، زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے اردو میں قاضی نذر الاسلام پر کوئی معتبر اور اچھی کتاب نہیں ہے اس لئے نیشنل بک ٹرسٹ نے پیش نظر کتاب شائع کر کے یقیناً ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

اگرچہ بنگلہ زبان کے اس انقلابی اور باغی شاعر، قاضی نذر الاسلام پر جسے عوام محبت میں صرف نذرل کہتے ہیں، اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں تھی مگر ان کی شاعری اور حالات زندگی پر بہت کافی لکھا گیا ہے، اس لئے شاید ہی کوئی

مالکا شخص ہو جوان کی شخصیت، الکی خدمات اور شاعری سے واقف نہ ہو، مگر
ہاں اُن کی انقلابی شاعری کو بہت زیادہ سراہا گیا، وہاں اُن کی شاعری پر
ت سے اعتراضات بھی کیے گئے۔ خاص طور پر اُن کے ترقی پسند خیالات سے
ن کے ہم عصروں میں سے بہت سے لوگوں نے شدید اختلاف کیا۔ "میرا جواب"
عنوان سے اس باغی شاعر نے ایک طویل نظم لکھی ہے، جس میں اُن کے اعتراضات
بڑی تفصیل سے اور بہت اچھے انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مختصر اقتباس
احظہ ہو۔

ہندو کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنی نظموں میں فارسی کے الفاظ استعمال کرتا
ہے یہ کٹر مسلمان ہے۔

عدم تشدد کے حامی عدم تعاون کی تحریک سے وابستہ لوگ بھی مجھ
سے خوش نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ میں تشدد کا ساز ہوں اور انقلابی دلوں کو ترغیب
دیتا ہوں۔

لیکن انقلاب پسند کہتے ہیں کہ یہ عدم تشدد کا حامی ہے، ورنہ یہ چرخے
کا گیت کیوں گاتا۔

قدامت پسند کہتے ہیں کہ یہ دہریہ ہے اور جدید یئے کہتے ہیں کہ میں
لنفیوشس کا پیرو ہوں۔

سوراجسٹ یہ کہتے ہیں کہ مجھے اُن سے اتفاق نہیں۔
سوراجسٹوں کے مخالف مجھے اپنے راستے کا کانٹا سمجھتے ہیں۔
مرد کہتے ہیں کہ میں عورتوں کا بہت گرویدہ ہوں
عورتیں کہتی ہیں کہ میں اُن سے نفرت کرتا ہوں
وہ دوست جو سمندر پار ہو آئے ہیں کہتے ہیں کہ میں انگلینڈ نہیں گیا،
اس لئے یہی میری حد ہے جو قابلِ شرم ہے۔

میرے مداح مجھے نئے دَور کا سورج کہتے ہیں، خواہ میں اس دَور کا
شاعر نہیں چلو چھوڑو میں لمحۂ موجود کی ایک ہذیان سہی۔

قاضی نذر الاسلام پہلا ادیب و شاعر ہے جس پر ہندوستان اور
پاکستان دونوں کو فخر ہے۔ حکومتِ ہند نے اُن کو پدم بھوشن کا خطاب دیا
ہے اور حکومت مغربی بنگال نے مکان بنانے کے لیے ایک قطعۂ زمین عطیہ کے
طور پر دی ہے اور تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ مستقل طور پر دیتی ہے، اسی طرح
حکومتِ مشرقی بنگال (پاکستان) بھی ساڑھے تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ دیتی
ہے۔ دونوں ملکوں میں اُن کی یکساں مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بناء پر فاضل مصنف
نے لکھا ہے کہ "بنگالی زندگی کی وحدت کے علمبردار کی حیثیت سے اُن کے تاریخی رول
کو مشرقی پاکستان والے بھی تسلیم کرتے ہیں، اس لئے وہ مشرقی پاکستان اور مغربی
بنگال کے درمیان ایک مستقل کڑی ہیں، وہ تقسیم سے پہلے کے بنگال کی ایک
پائدار تصویر ہیں اور رہیں گے۔" (صفحہ ۶۵)

اس کتاب کا ترجمہ جناب بالمکند عرش ملسیانی نے کیا ہے جو اُردو کے
اچھے شعراء میں سے ہیں اور اُردو صحافت کا طویل تجربہ رکھتے ہیں۔

کتاب بہت مفید اور معلومات افزا ہے، جو لوگ اُردو میں قاضی نذر الاسلام
کے حالات زندگی اور اُن کی شاعری کے متعلق واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں،
اُنہیں بھی یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہئے۔

طنزیاتی خاکے :- از شاہ نصیر فریدی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۴۶ صفحات، قیمت: ڈھائی روپے
تاریخ اشاعت: ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء ملنے کا پتہ:- رام پرشاد
اینڈ سنز بکسیلرز۔ ہاسپٹل روڈ آگرہ (یو پی)

زیر تبصرہ کتاب، ۱۶ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین
کی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے مختلف مسائل پر سوالات کیے گئے ہیں اور
ایک مصرع میں ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اُردو کے مشہور فکاہیہ اور مزاحیہ
نگار جناب فکر تونسوی نے "خاکوں کا خاکہ" کے عنوان سے اس کتاب کا دیباچہ
لکھا ہے۔ کتاب کا نام پڑھ کر شاید میری طرح وہ بھی چونکے، لکھتے ہیں: "طنزیاتی
خاکے" کی ترکیب میرے لئے نئی ہے لیکن جب کتاب پڑھی تو ترکیب اگرچہ
بدستور نئی رہی، لیکن طرزِ بیان وہی صدیوں کا جانا پہچانا تھا" فکر تونسوی
فرماتے ہیں۔

"فریدی صاحب کے خاکوں کا دائرہ بڑا وسیع ہے، اُن میں سماجی،
سیاسی، ادبی، مذہبی، اعتقادی حتیٰ کہ طبی مسائل کا احاطہ بھی کر لیا گیا ہے"
اس لحاظ سے مجھے یہ کتاب ضرور نئی اور انوکھی معلوم ہوئی کہ تمام جوابات مصرعوں
میں دیئے گئے ہیں مگر جو سوالات کیے گئے ہیں ان کے موضوعات میں، میرے
خیال میں، نہ وسعت ہے اور نہ گہرائی۔ زیادہ تر سوالات وقتی سیاست
اور جذباتی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وقتی سیاست کی عمر بہت کم ہوتی ہے
اس لیے ایسے مضامین یا کتابیں۔ چاہے وہ سنجیدہ ہوں یا مزاحیہ اور طنزیہ

(بقیہ ص ۴۵ پر)

مرد !

صرف 5 پیسے

خرچ کرکے

آپ اپنے کنبے کو

محدود رکھنے کی

طاقت حاصل کرسکتے ہیں



نرودھ استعمال کیجیے۔ محفوظ، آسان طریقہ۔

اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ کنڈوم اب

ملک بھر میں بازار میں عام ملتے ہیں۔

بچے کی پیدائش روکیے اور

منصوبہ بند کنبے کی خوشی کا لطف اٹھائیے۔

بچے کی پیدائش کو روکنا آپ

کے اختیار میں ہے

آب

ملک بھر میں

دستیاب

15 پیسے کے 3

سرکاری امداد سے

رعایتی دام

نرودھ استعمال کیجیے

اعلیٰ کوالٹی کے

ربڑ کنڈوم

فیملی پلاننگ کے لئے

پروویژن اسٹور، پرچون فروش، دوا فروش

جنرل مرچنٹ اور سگریٹ فروش وغیرہ بیچتے ہیں۔

69/956



مارچ کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بھاؤ نگر بندرگاہ سے ۵۴ کلومیٹر دور خلیج کھمبات میں علیا بیٹ کے مقام پر ساحل سمندر کے پاس تیل کے کنوئیں کی
،کا افتتاح کیا۔ پانی کی سطح کے نیچے سے تیل تلاش کرنے کی یہ پہلی ہندوستانی کوشش ہے (بائیں طرف) ڈریلنگ پلیٹ فارم اور رگ)



ol. 28 No. 10 A J K A L (Monthly) May 1970

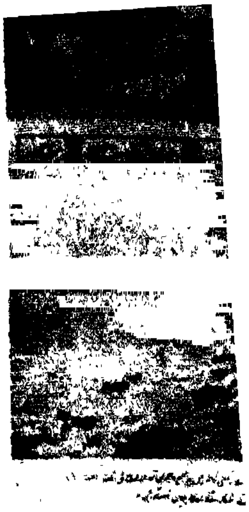
lited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509

آجکل

جون ۱۹۷۰ء

۶۰ پیسے

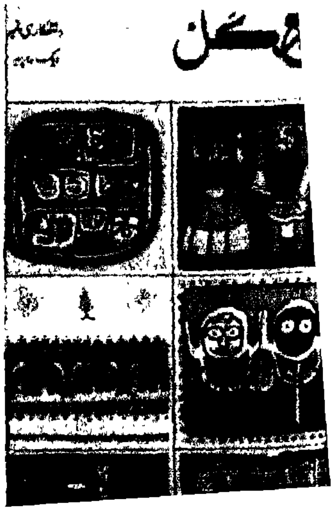
28 (11)

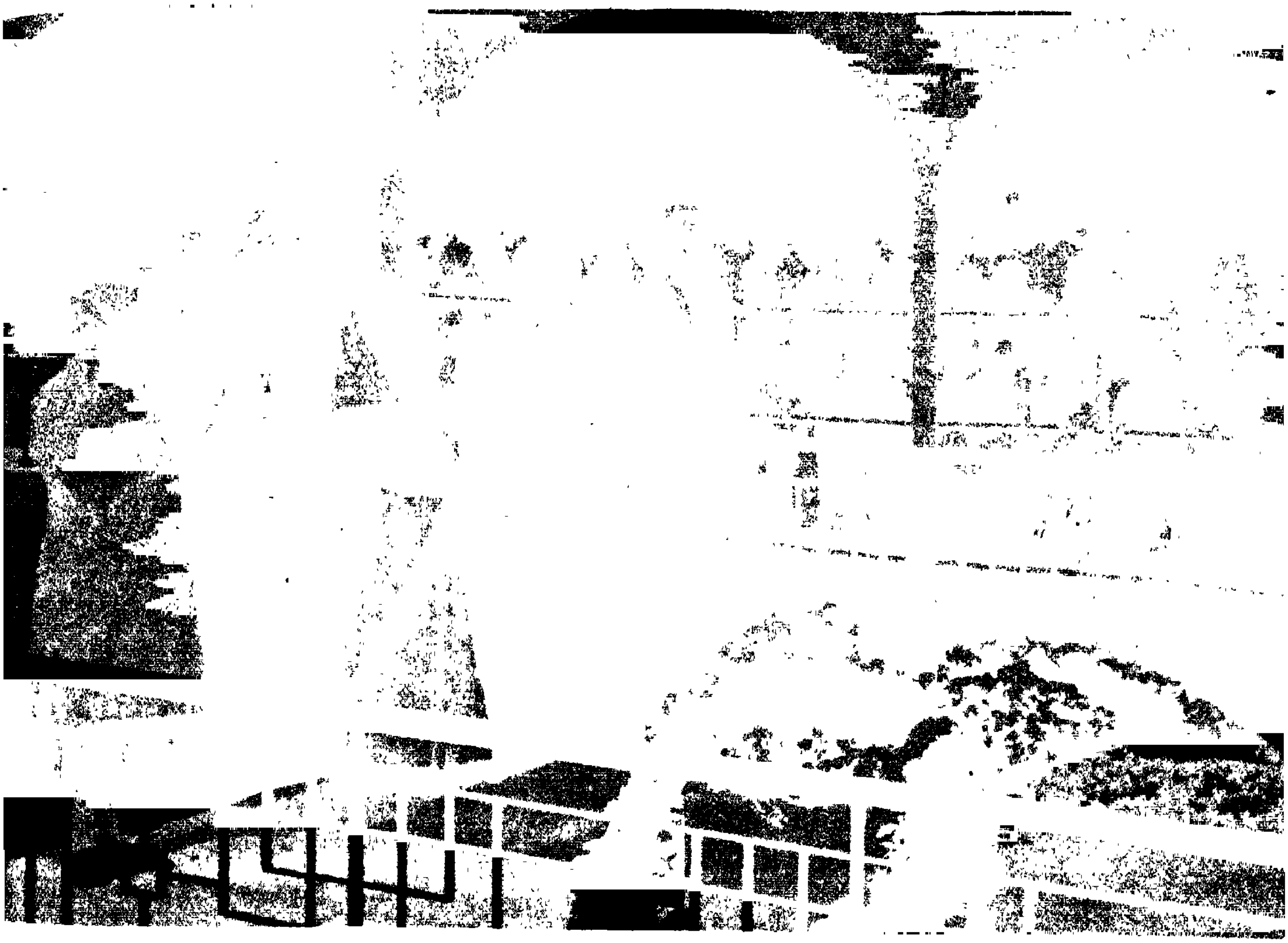












۳ مئی ۱۹۷۰ء کو جامعہ ملیہ نئی دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی پہلی برسی منائی گئی۔ اس موقع پر صدرِ جمہوریہ ہند کی جانب سے نائب صدر شری گوپال سروپ پاٹھک نے اُن کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھائے۔ سوگواروں میں وزیرِ اعظم ہند کے علاوہ سفراء اور دیگر ممتاز ہستیاں شامل تھیں۔
(تصویر میں بائیں سے دائیں) نائب صدر شری گوپال سروپ پاٹھک۔ شریمتی اندرا گاندھی، جناب علی سفیر الجیریا اور ڈاکٹر جان میکڈائرمڈ (نمائندہ اقوامِ متحدہ) مرحوم رہنما کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

اردو کا مقبول عوام مصور ماھنامہ

آجکل

نئی دھلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۸ — شمارہ ۱۱

جون ۱۹۷۰ء

جیٹھ اساڑھ شک سمت ۱۸۹۲

سرورق

عمل: گورچرن اروڑہ

ترتیب

شرح چندہ

فی پرچہ :- ۶۰ پیسے

زر سالانہ :- ۷ روپے ۲ سال کے لئے ۱۲ روپے

۳ سال کے لئے ۱۷ روپے

شائع کردہ :- ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاوس نئی دہلی

سلور جوبلی **آج کل** ضمیمہ

آج کل کے اٹھائیس برس

عرش ملسیانی



دوسری جنگِ عظیم نے جب کرۂ ارض کو اپنی آگ میں لپیٹ لیا تو انگریزی سامراجیت کو سخت خطرہ درپیش تھا انہوں نے ہندوستان کی مظلومیت کو استعمال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی چنانچہ ایران، افغانستان، دیگر اسلامی ممالک اور سرحدی علاقوں میں پروپیگنڈا کرنے کے لئے یہاں ایک ادارہ یونائیٹڈ پبلیکیشنز کے نام سے قائم کیا! اس ادارے سے فارسی میں رسالے جاری ہوئے ایک رسالہ نو پروں کے نام سے ۱۹۴۱ء میں پشتو زبان میں بھی جاری کیا گیا بعد میں اس کا اردو ایڈیشن اسی نام سے چھپنے لگا۔ نومبر ۱۹۴۲ء کے شمارے کو آج کل کا نام دیا گیا۔ یہ ہے آج کل کی ابتدا۔

اسی زمانے سے اُردو کا یہ باوقار رسالہ جاری ہے اس کا پہلا دور تقسیم ملک تک ہے۔ اس کے مدیر آغا محمد یعقوب دواشی تھے۔ دواشی صاحب لدھیانے کے ایک کامیاب وکیل تھے۔ شاہ شجاع کے ساتھ جو خاندان دہلی آ کر بس گئے تھے، انہیں میں سے ایک معزز خاندان سے دواشی صاحب کا تعلق تھا۔ فارسی ان کے گھر کی زبان تھی۔ اُردو ادب سے اچھا لگاؤ تھا انگریزی کے بڑے اچھے مقرر تھے اُن کے ساتھ مختلف مواقع پر مختلف نائبین کام کرتے رہے۔ وقار عظیم، معین احسن جذبی، راجندر ناتھ شیدا، فضل حق قریشی اور ... احمد ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں رگھوناتھ رینہ اور شیش چند طالب ... تقسیم کے بعد اس رسالے کو چلاتے رہے اور انہوں نے ۱۹۴۸ء میں گاندھی کی شہادت کے بعد گاندھی نمبر بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔

پہلے پہل 'آج کل'، کی ادبی حیثیت اتنی قابلِ اعتنا نہیں تھی۔ یہ مہینے میں ... بار چھپتا تھا۔ جنگ کے زمانے میں کاغذ کی بڑی قلت تھی، کوئی نیا رسالہ نہ چھپ سکتا تھا، نہ پنپ سکتا تھا۔ چھ آنے میں ساٹھ صفحے کا باتصویر رسالہ مقبولیت کی ... طے کرنے لگا۔ دواشی صاحب اور اُن کے رفقا نے اسے ایک اچھا ادبی ... بنا دیا۔ ہندوستان کے ہر اچھے ادیب اور شاعر سے ربط پیدا کیا اور ملک



دائیں سے بائیں

فضل حق قریشی

آغا محمد یعقوب دواشی

سر عبدالقادر

اور

وقار عظیم

اچھے اچھے افسانہ نگاروں کے افسانے شعراء کا کلام اور ادیبوں کے مقالے اس میں شائع ہونے لگے۔ ادیبوں کی تصویریں چھپیں جس سے اس کی زینت اور بڑھ گئی۔

رفتارِ زمانہ کے عنوان سے حکومت کی ضرورت کے مطابق اداریہ لکھا جاتا تھا لیکن ایک بات اچھی یہ تھی کہ "نگا پراپیگنڈا" اس میں نہیں تھا۔ رسالہ معلوماتی بھی تھا اور ادبی بھی بلکہ ادبی حیثیت زیادہ تھی چونکہ مطبوعہ مضامین وغیرہ کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا اس لیے ادیب کشاں کشاں اس کی طرف کھنچ آئے۔

شعراء میں قدیم و جدید شعراء حصہ لیتے تھے کس کس کا ذکر کیا جائے۔ جوش ملیح آبادی۔ مرزا ثاقب لکھنوی، یگانہ، عبدالمجید سالک، بے خود دہلوی، جگر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، اختر شیرانی، رضا علی وحشت، جلیل مانکپوری جو میر محبوب علی خاں نظام دکن اور ان کے جانشین میر عثمان علی خاں کے استاد تھے اس رسالے میں لکھتے تھے۔ امجد حیدرآبادی عام طور پر رباعی گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی ایک غزل اسی جریدے میں شائع ہوئی جس کا مقطع ہے ؎

نہ کرو کوئی آرزو امجد

اس شجر میں ثمر نہیں آتا

پروفیسر محمود شیرانی جید عالم تھے "پنجاب میں اردو" "فردوسی پر چار مقالے" اور دیگر تحقیقی تصانیف کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے فرزند اختر شیرانی کو شا[عر] کی حیثیت سے سب جانتے ہیں لیکن اس رسالے میں محمود شیرانی صاحب کا ا[یک] قصیدہ چھپا تھا۔ ٹونک سے نکلے تو لاہور میں عالم غربت کا احساس رہتا تھا یہ قصیدہ اسی موڈ میں ہے۔ آخری شعر ہے ؎

شدتِ رنج و غم و دردِ زمانِ غربت
کیا بیاں کیجئے کہ اب طاقتِ گفتار نہیں

شعراء میں صفی لکھنوی، نیاز فتح پوری کے ساتھ تاثیر، شور علیگ اور احمد ند[یم] قاسمی بھی تھے۔ ساحر لدھیانوی اسی آج کل میں وارد ہوئے تو شہرت کے آسمان پر پہنچے۔ اُن کی مشہور نظم "تاج محل" یہیں شائع ہوئی تھی۔ یگانہ نے خو[د] کہا ہے۔

ع خدا نے تجھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

اس انانیت پسند شاعر نے ایک غزل میں انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے

ماؤں کی خدائی ہو چکی بس ٭ خدارا بس دہائی ہو چکی بس
یں ہیقر بھی ہو سکتا ہے پانی ٭ دعاؤں کی رسائی ہو چکی بس
رے ہو کون سے گوشے میں تنہا ٭ یگانہ کیوں خدائی ہو چکی بس

وامی مارہروی کے گیت بھی بہت مقبول تھے۔

شخصیات پر بہت اچھے مضامین شائع ہوئے۔ سری نواس شاستری اہ محمد سلیمان، سر عبدالقادر، حسن نظامی، جوش ملسیانی، یگانہ چنگیزی، نوح اروی، رام بابو سکسینہ، محمود شیرانی، نیاز فتحپوری، اور کتنے ہی ادیبار ور اکابر ملک پر مضامین اور ان کی تصویریں شائع ہوئیں۔ رشید احمد صدیقی نے ڈاکٹر سین کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ظہور حسن ڈار نے اختر حسین رائے پوری مقالہ لکھا۔ فیض کا مضمون، جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے بہت دلچسپ ہے۔ اس میں فیض نے اس زمانے میں لکھا تھا کہ جوش کے یہاں انقلاب کا اجتماعی صور نہیں اور اس میں نظریاتی تنظیم بھی نہیں البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا د جوش نے کتنے ہی شعرا کو نئے راستوں اور منازل کی جانب چلنے کی ترغیب دی۔

مسعود حسین خاں کا عظمت اللہ پر مضمون 'ادب کا ایک باغی' کے عنوان سے چھپا۔ ان کے علاوہ حمید احمد خاں کا مضمون غالب کی بہو، باقر علی خاں کی بیوی بگا بیگم' سے ملاقات کے متعلق چھپا۔ وہ اس وقت بقید حیات تھیں اور غالب سے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں انہوں نے بتائیں۔ ڈاکٹر عابد حسین کا مقالہ ہندوستان کی مشترک تہذیب پر بڑا قابل قدر مقالہ ہے اور ان کے انداز خیال کا جو بعد میں پختہ تر ہو گیا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ خواجہ غلام السیدین کا مضمون "معلمی کا پیشہ" عشرت رحمانی کا مضمون "حشر کا ڈرامہ"، بڑے دلچسپ مضامین ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے مضامین تاریخی، جغرافیائی اور سائنسی موضوعات پر بھی تھے جس سے رسالہ بڑا دلچسپ ہو جاتا تھا۔

افسانوی ادب بھی بڑا معیاری ہوتا۔ ہر نقطۂ خیال کے افسانے شائع ہوتے۔ چند اچھے افسانہ نگاروں اور ان کے افسانوں کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

سلطان حیدر جوش	اندھے کی لاٹھی، آنریری یا اناڑی
تسنیم سلیم چھتاری	دور دیس کا رہنے والا
راجندر سنگھ بیدی	مہاجرین
علی عباس حسینی	ناکردہ گناہ
ہاجرہ مسرور	میرا بھیا
ایم اسلم	آخری آرزو
اپندر ناتھ اشک	کیا چارہ ہے
قدرت اللہ شہاب	رات کی بات
سہیل عظیم آبادی	سراب
غلام عباس	آئینے

اس فہرست سے یہ ظاہر ہوگا کہ ملک کے نمائندہ افسانہ نگار آج کل میں لکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد آج کل کا یہ دور ختم ہو گیا۔ ایک سال نئی تنظیم میں گزر گیا۔ اشاعت کی باقاعدگی میں بھی فرق آیا۔ چند شمارے شائع ہوئے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ آخری شمارہ گاندھی جی کی شہادت کے سلسلے میں خاص نمبر تھا جس میں جوش کی مشہور نظم 'اے شہنشاہ شہیداں السلام' چھپی تھی۔

اس کے بعد حکومت نے نئے ادارے کا انتخاب کیا اور تین رسالوں کے شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ جوش ملیح آبادی ایڈیٹر اور عرش، آزاد اور بلونت سنگھ اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ تین رسالوں کے نام ہیں آج کل، بساط عالم اور نونہال۔ پہلا تو حسب معمول ثقافتی اور ادبی پرچہ تھا۔ دوسرا سیاسیات عالم سے متعلق اور تیسرا بچوں سے متعلق۔ اردو کی یہ خوش وقتی دیر تک قائم نہ رہی اور ۱۹۴۹ء میں حکومت نے مؤخرالذکر دونوں رسالے بند کر دیئے۔ بچوں کی ضرورت کے لئے 'آج کل' کے آخر میں آٹھ صفحوں پر مشتمل بچوں کا آج کل' شائع ہونے لگا۔ یہ آٹھ صفحے ماہ مارچ ۱۹۵۰ء سے ماہ اکتوبر ۱۹۵۶ء تک شائع ہوئے اور اس کے بعد اس بنا پر بند کر دیئے گئے کہ بچے اس رسالے کے گاہک کیسے بن سکتے ہیں۔ جو زیادہ تر بڑوں کے لئے ہو۔

ماہ اگست ۱۹۴۸ء کو آج کل کے نئے دور کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ تینوں رسالوں پر ایڈیٹر اور تینوں اسسٹنٹ ایڈیٹروں کے نام شائع ہوتے تھے۔ لیکن اندرونی تقسیم کار کے مطابق آج کل کی ترتیب و تدوین راقم کے سپرد تھی۔ پہلے یہ ماہنامہ تھا۔ ماہ جنوری ۱۹۴۹ء سے ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء تک پندرہ روزہ ہو گیا اور بعد میں پھر ماہنامہ ہو گیا اور آج تک اسی حیثیت سے جاری ہے۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ اس کی اشاعت بہت زیادہ تھی ـــــ لیکن تقسیم ملک کے

بعد اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد یک دم کم ہوگئی۔ اور بتدریج کم ہوتی گئی۔ مقام شکر ہے کہ اب بھی اس کی اشاعت اردو کی موجودہ حالت کے پیش نظر تسلی بخش ہے۔

نئے نظام کے تحت اس جریدے کے مقاصد میں یہ بات خاص طور پر شامل تھی کہ ہندوستان کی مشترک تہذیب اور کلچر کو نمایاں کیا جائے۔ صرف یہی نہیں کہ چٹخارے دار غزلوں اور افسانوں کی بھرمار ہو بلکہ معقول ادبی، تمدنی معاشرتی اور تہذیبی مقالات بھی شائع کئے جائیں۔ یہ فرض اس جریدے نے نہایت ہی معقول طریقے سے ادا کیا ہے۔

جوش صاحب مدیر تو تھے لیکن جمالی اعتبار سے زیادہ اور جلالی اعتبار سے کم۔ پہلے شمارے میں انہوں نے ایک وثیقہ لکھا تھا جس کے راقم وہ خود تھے اور ان کے تینوں رفیقان کار، گواہ شد کے زمرے میں شامل تھے۔ اس میں انہوں نے قحط الرجال کا رونا رویا تھا اور کہا تھا کہ درجہ اول کے مضامین بہت کم ملتے ہیں۔ یہ ان کا اس زمانے کا تجربہ تھا جب انہوں نے دلی سے کلیم جاری کیا تھا۔ بہرحال انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ کوشش کی جائے گی کہ معیاری مضامین ہی شائع کئے جائیں۔ معیار ایک اضافی اصطلاح ہے نہیں معلوم کہ کسی ایک کا معیار کسی دوسرے کو منظور بھی ہوتا ہے یا نہیں۔

جوش صاحب کی قیادت ہی کافی تھی۔ ان کی مسلسل صحبت ہی دل و دماغ کی کم مائگی کو دور کرتی تھی۔ رسالہ نکلا اور مقبولیت کی منزلیں بھی طے کرنے لگا۔ پرانے اور نئے ادیب بڑی آن بان سے آئے۔ سالنامے بڑی شان سے نکلے۔ مگر یہ احساس پھر بھی کھٹکتا رہا کہ ملک کی تہذیبی خدمت کس طرح زیادہ سرگرمی سے کی جائے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا مضمون جو ایک طرح کی خودنگری کا تھا اس میں شائع ہوا۔ کے ایم پانیکار نے انگریزی نظم "بوڑھا مسافر" دی جس کا ترجمہ شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر تارا چند اور کملا دیوی چٹوپادھیائے کے مضامین شائع ہوئے ۱۹۵۰ء میں نئے دستور کی آمد پر جمہوریت نمبر شائع کیا گیا۔

رفتار زمانہ اب بھی شامل رہتا تھا لیکن ایک ماہنامے میں اس کا شامل ہونا ایک بے معنی سی بات تھی۔ مہینے دو مہینے کے بعد پرانے واقعات عالم پر تبصرہ یا رائے سراسر لغویات تھی، جب تک قارئین اسے پڑھتے ہیں، واقعات کا رُخ بسا اوقات تبدیل ہو جاتا تھا۔

جوش صاحب کا سایہ ہمارے لئے سایۂ عاطفت تھا لیکن سات سال مدیر رہنے کے بعد ان کی اضطراب پسند طبیعت پَر تولنے لگی۔ انہوں نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا اور ۱۹۵۵ء کے آخر میں وہ پاکستان تشریف لے گئے۔ اُن کے جاتے وقت کشمیر نمبر بڑی آب و تاب سے شائع ہوا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلم اکابر نے کشمیر اور ہندوستان کے اٹوٹ تعلق پر رائے کا اظہار کیا۔ کشمیری زندگی اور وادیٔ کشمیر کے حسن و جمال پر بہت اچھے مضامین شائع ہوئے۔ حکومت کشمیر نے اس شمارے کی بہت تعریف کی۔

جوش صاحب کے جانے کے بعد قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام پر پڑا۔ بوجھ اور ذمہ داری تو پہلے بھی میرے گلے کا ہار تھی لیکن ہر مخالفانہ اور معاندانہ وار کے لئے جوش صاحب ایک مضبوط ڈھال تھے۔ اب یہ ذمہ داری براہ راست میرے اپنے کندھوں کا بوجھ بن گئی۔ مظفر شاہ، مہدی عباس حسینی اور شہباز حسین مختلف وقفوں میں میرے رفیق کار رہے۔ ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں سے مجھے بہت مدد ملی۔ یہ تینوں افراد بہت اچھے کارکن اور مخلص رفیق تھے۔ اس زمانے میں ان صفات کا ملنا بہت مشکل ہے۔ افسوس کہ ۱۹۶۸ء میں مظفر شاہ صاحب جواں مرگی کا شکار ہو گئے۔ ان کی منکسر مزاجی، خندہ پیشانی، تہذیبی رواداری، اور تجربہ کاری اب



جوش ملیح آبادی

بھی یاد آتی ہے تو دل بیٹھ جاتا ہے۔ ترجمے اور تصنیف و تالیف کا بہت سا کام اس ادارے سے وابستہ تھا۔ آج کل کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہوتا رہا۔ دم مارنے کی فرصت نہ ملتی۔ جہاں سرکاری رسالے کو بہت سی سہولتیں میسر ہوتی ہیں وہاں دقتیں بھی شاملِ حال رہتی ہیں۔ کبھی چھپائی کا اچھا انتظام نہیں۔ کبھی حکومت کی پالیسی کا احتساب اچھے اچھے مضامین کو جزواً یا کلیتہً شائع کرنے سے روکتا اور کبھی حکومت کے تقاضے اس بات پر اصرار کرتے کہ اس میں پبلسٹی کا مواد زیادہ ہونا چاہئے۔

حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی، ہندی اور اُردو میں شائع ہونے والے تمام رسالوں کے ایڈیٹوریل بورڈ مقرر کئے جائیں۔ چنانچہ اُردو آج کل کیلئے ایک ایسا ہی بورڈ بنایا گیا۔ اس میں دلی سے پروفیسر محمد مجیب، بنشی گوپی ناتھ امن اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی شامل ہوئے۔ حیدر آباد سے ڈاکٹر محی الدین قادری اور کشمیر سے رحمان راہی صاحب۔ بعد میں سرور صاحب کشمیر چلے گئے، تو کشمیر کی نمائندگی ان کے سپرد ہوئی اور حیدر آباد کی نمائندگی پروفیسر عبدالقادر سروری نے کی۔ اس بورڈ کی حیثیت مشاورتی تھی سب سے مشورہ لینا تو مدیر کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ بورڈ نے خود ہی فیصلہ کیا کہ مشورے کا کام امن صاحب کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں ریٹائر ہونے تک میں موصوف کے مفید مشوروں سے فیض پاتا رہا اور خاص طور پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گیارہ سال کی طویل مدت میں میرا اُن سے کبھی اختلافِ رائے نہیں ہوا۔ بورڈ کی میٹنگ سال دو سال میں کبھی ہوتی تھی۔ اُن کے مفید مشورے سے مجھے بہت فائدہ پہنچتا۔ میں ہمیشہ زور دیتا رہا کہ رسالے کی صوری حیثیت بہتر بنائی جائے مگر اچھے کاتبوں کی کمی، لیتھو کی چھپائی کا دشوار گزار اور ناقص راستہ کچھ ایسی باتیں تھیں کہ ان پر ہم میں سے کسی کو قدرت نہ تھی۔ آفسیٹ کی چھپائی کا انتظام ۱۹۶۷ء سے ہو گیا ہے اور اب رسالے کی صوری حیثیت بہت اچھی ہے۔ بعد میں حکومت کے فیصلے کے مطابق رسالوں کے مشاورتی بورڈ بھی ختم کر دیئے گئے۔

'آج کل' کے خاص شمارے ملک بھر سے دادِ تحسین لیتے رہے ہیں خاص ادبی سالناموں کی جو رسم تھی وہ ۱۹۵۵ء سے ٹوٹی جب کشمیر نمبر چھپا۔ ۱۹۵۶ء میں اس کا معرکتہ آلارا خاص نمبر ہندوستانی موسیقی کے موضوع پر شائع ہوا۔ ایسے موضوع پر خاص نمبر شائع کرنا آسان کام نہ تھا لیکن ملک کے مشہور زندہ موسیقاروں اور موسیقی کے نقادوں نے ادارے کی بہت مدد کی۔ اس شمارے کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور اب ایک جلد بھی خریدنا چاہیں تو نہیں مل سکتی اس کے موضوعات اور مصنفین کی ایک تلخیص ذیل میں درج ہے:

استاد ولایت حسین خاں شفق اکبر آبادی نے ایک انمول نظم دی بعنوان مکالمۂ سُر و لَے۔ ڈاکٹر سمتی مٹاٹکر نے ہندوستانی موسیقی کے ارتقا پر مقالہ عنایت فرمایا۔ ولایت حسین خاں صاحب نے ایک مقالہ بھی بخشا بعنوان تھا فنِ موسیقی کے کچھ بھید۔ فن کار ہندوستانی ساز از ایس کرشنا سوامی، دربار رام پور اور موسیقی از نواب محمد رضا علی خاں نواب رام پور، امیر خسرو اور ہندوستانی موسیقی از ڈاکٹر سید ترغیب حسین، آگرہ گھرانے کی گائکی از عظمت حسین خاں، ہندوستانی موسیقی میں ٹیگور کا مقام از شانتی دیو گھوش، کیرانہ از جیون لال مٹو، کرناٹکی موسیقی از بی سمبھا مورتی۔ دھرپد از رحیم الدین خاں ڈاگر، ہندوستان کے چند مشہور موسیقار از امتیاز علی عرشی، قوالی از میکش اکبر آبادی بڑے فنی اور قابلِ ذکر مضمون ہیں۔ ان کے علاوہ تان سین۔ پنڈت بھاسکر راؤ بکھلے بوا، استاد حافظ علی خاں، سنگیت سمراٹ اللہ دیئے خاں، پنڈت وشنو ڈگمبر اور پنڈت بھات کھنڈے پر بھی مفصل اور دلچسپ مضمون اس رسالے میں شامل ہوئے۔ پروفیسر ڈی پی مکرجی کا انگریزی میں ایک معرکتہ الآرا مضمون شائع ہوا تھا "موسیقی کے عظیم استاد جنہیں میں نے سنا" اس کا اُردو ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔ خیال اور ہلکی پھلکی موسیقی پر بھی مضامین چھپے۔ دلیپ چندر ویدی کا مضمون "مجھے اب تک یاد ہے" بڑا دلچسپ اور معلوماتی تھا اس شمارے کی تالیف میں دلیپ چندر ویدی صاحب نے میری بہت مدد کی استاد ولایت حسین خاں اور رحیم الدین خاں ڈاگر بھی میرے بڑے کار آئے۔ سازوں، راگ، راگنیوں اور موسیقاروں کی نوّے کے قریب تصاویر اس رسالے میں شامل تھیں۔ یہ تھی پہلی بڑی کوشش جس سے ہندوستانی تہذیب کی یک جہتی اور رنگا رنگی میں یک رنگی کا منظر پیش کیا گیا۔ اس نمبر کے باب میں پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند نے لکھا تھا۔

"آج کل" کا موسیقی نمبر ایک کارنامہ ہے۔ اُردو ادب میں فنِ موسیقی کے متعلق عام فہم انداز میں ایسے اچھے مضامین اور ممتاز موسیقاروں کے متعلق ایسی معلومات مشکل سے کہیں اور یک جا ہوئی ہوں گی خسرو کے متعلق مضامین بھی بہت اچھے ہیں۔ اس معیاری اور جامع نمبر پر آپ تمام اُردو داں طبقے کے شکریے کے مستحق ہیں مجھے یہ دیکھ کر اور بھی مسرت ہے کہ "آج کل" آپ کی ادارت میں اور بھی دل کش ہوتا جاتا ہے۔"

مولانا نیاز فتح پوری، ڈاکٹر سید محمود، جعفر علی خاں اثر، انڈین پی ای این نے بھی تعریف کی اور پاکستان سے شوکت تھانوی اور ممتاز حسین کے تعریفی خطوط بھی آئے۔

موسیقی نمبر میں جن مضامین کی کمی رہ گئی تھی اُسے ہلکی پھلکی موسیقی نمبر شائع کرکے پورا کیا گیا۔ اس میں ٹھمری، ٹپہ، دادرا، غزل اور گیت پر مضامین شائع ہوئے۔ دو مضمون بعد کے شماروں میں پنڈت جیون لال مٹو سے حاصل کئے۔ ایک گوالیار گھرانے پر اور دوسرا 'طبلے' پر۔

۱۹۵۶ء میں گوتم بدھ کی ڈھائی ہزار سالہ برسی منائی گئی۔ اس موقعے پر نومبر ۱۹۵۶ء میں 'آج کل' کا گوتم بدھ نمبر شائع ہوا۔ یہ شمارہ بھی اپنی جامعیت کے لحاظ سے نادر تھا۔ اس میں ڈاکٹر رادھا کرشنن پروفیسر رادھا کمد مکرجی، پروفیسر محمد مجیب، کشک بکولا، میکش اکبر آبادی اور متعدد حضرات کے مضامین بدھ مت اور اس کی تعلیمات کے باب میں شائع ہوئے۔ ایک مضمون گندھارا فن کے ارتقاء پر بھی تھا۔ سرورق پر متفرادا ے بدھ کے مجسمے کی خوبصورت تصویر تھی۔

۱۸۵۷ء کی یاد میں ۱۹۵۷ء کے ماہ اگست کا شمارہ جنگ آزادی نمبر تھا اس کے لئے پروفیسر مجیب کا ایک نہایت ہی دلچسپ تاریخی ڈرامہ "آزمائش" موصول ہوا تھا جس کی سارے ملک میں دھوم مچی۔ اس شمارے میں مولانا آزاد آغا حیدر حسن مرزا، شیخ تصدق حسین لکھنوی، قاضی عبدالودود اور پروفیسر حارون شیرانی کے قابلِ قدر مضمون شامل ہوئے۔

۱۹۵۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہوا۔ ماہ اگست کا شمارہ ابوالکلام آزاد نمبر تھا۔ اس کے لئے پنڈت جواہرلال نہرو وزیراعظم نے بطورِ خاص ایک پیغام بھیجا تھا۔ یہ پُرمغز پیغام مولانا کی شخصیت پر ایک ایسے شخص کی صحیح رائے تھی جس نے انہیں بہت قریب سے دیکھا تھا اور جو اُن کا مداح تھا۔ یہ شمارہ مولانا آزاد سے متعلق بہت سی معلومات کا حامل ہے۔ مضمون نگاروں میں وہ لوگ خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں، جو اُن کے ساتھ رہے۔ مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، ہمایوں کبیر، پروفیسر محمد اجمل خاں، خواجہ غلام السیدین، ظفر حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر۔ ڈاکٹر سید محمود، بخشی غلام محمد، حافظ محمد ابراہیم اور مسز ارونا آصف علی کا اظہارِ عقیدت بھی شامل تھا۔ مولانا کی نادر تصویریں اور نایاب خطوط کے عکس اور متن بھی شاملِ اشاعت ہوئے۔ اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر بعد میں اُسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء میں بالترتیب رقص نمبر، ہندوستانی مصوری نمبر اور فنِ تعمیر نمبر شائع ہوئے۔ گنجائش نہیں کہ اُن کی پوری تفصیل یہاں دی جائے ان شماروں کے لئے مضامین جمع کرنا ایک ہفت خواں طے کرنا تھا۔ اکثر مضامین انگریزی میں ماہرین سے حاصل کرکے اُن کے تراجم شائع کئے گئے۔ یہ فنونِ لطیفہ کی خدمت بھی تھی اور ہندوستانی تہذیب کی بھی۔ لوگوں نے ان شماروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ملک کے ہر گوشے سے ان کے متعلق اچھی رائیں موصول ہوئیں۔

۱۹۶۴ میں ملک ایک بہت بڑے سانحۂ عظیم سے دوچار ہوا۔ ہندوستان کے محبوب رہنما سترہ سال لگاتار وزیراعظم رہنے والے پنڈت جواہرلال نہرو نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ ملک میں کہرام مچ گیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو تر نہ ہو۔ گاندھی جی کے سانحۂ ارتحال کے بعد یہ دوسرا بڑا زخم تھا۔ جو اہلِ ملک کے دلوں پر لگا۔ اس موقع پر اخباروں اور رسالوں نے خاص نمبر شائع کئے۔ 'آج کل' پر تو فرض عائد ہوتا تھا۔ اس کا ماہ نومبر کا شمارہ نہرو نمبر تھا۔ فراق گورکھپوری نے ایک طویل مضمون 'کچھ یادیں کچھ تاثرات'، کے عنوان سے لکھا۔ فراق صاحب، پنڈت موتی لال نہرو کے منظورِ نظر تھے۔ وہ اُن کی ذہانت کے عاشق تھے۔ جواہرلال سے بھی اُن کا ساتھ رہا۔ پرانی رفاقت کی کہانی فراق صاحب نے دلدوز انداز میں لکھی۔ ان کا ذکر آیا تو اپنے ہی ایک شعر سے اس کا آغاز کیا۔

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی نہ دیں گی ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہ گزر آئی

جوش صاحب کو پنڈت نہرو سے خاص محبت تھی۔ یہ محبت باہمی تھی جوش صاحب نے مرثیے کے طور پر ایک مسدس لکھا ۔۔۔ لکھنوی زبان اور لکھنؤ کا مزاج مرثیے کے لئے بہت موزوں ہے جوش صاحب نے دل کھول کر رکھ دیا۔ ٹیپ کے دو شعر دیکھئے۔

دُنیا وفورِ گریہ سے منہ ڈھانپنے لگی
رد یا جو آسماں تو زمیں کانپنے لگی

تیری چتا کی خاک ہے گنگا لئے ہوئے
پانی رواں ہے آگ کا دریا لئے ہوئے

بدرالدین طیب جی کا مضمون 'پنڈت جی میری نظروں میں' ایک بہت

اچھا مطالعہ تھا۔ خواجہ احمد فاروقی نے بھی ایک مضمون عطا فرمایا۔ "افسانہ آن شبے کہ یاد گزشت" اس میں ان کی پنڈت جی سے چند ملاقاتوں کا ذکر تھا۔ مضمون میں واقعہ نگاری بھی ہے اور درد و غم کی تصویر کشی بھی۔ اس شعر پر مضمون ختم ہوتا ہے۔ ۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

۱۹۶۵ء میں دستکاری نمبر آب و تاب سے چھپا۔ ۱۹۶۶ء میں ڈراما نمبر اور ۱۹۶۷ء میں اُردو تحقیق نمبر اس کے بعد یہ نیاز مند رخصت ہوا اور انیس سال کی براہ راست رفاقت ختم ہوئی۔ گو اب بھی آج کل میرا ہے اور میں آج کل کا ہوں۔ "وقت کوتاہ و قصہ طولانی" یہ تو خاص نمبروں تک بات رہ گئی۔ ادب کی خدمت میں بھی تو آج کل پیش پیش تھا۔

غالبیات کو ہی لیجئے۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں غالب کا انتقال ہوا تھا۔ ماہ فروری کے ہر شمارے میں بالالتزام غالب پر مضامین شائع ہوئے۔ عام شماروں میں بھی غالب پر کوئی اچھا مضمون مل جاتا تو شائع ہو جاتا۔ غالب کے غیر مطبوعہ متعدد خطوط شائع کیے گئے۔ غالب کی نادر تصویریں چھپیں۔ غالب کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا۔ اس کی زندگی اور کردار پر روشنی ڈالی گئی۔ مالک رام، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مختار الدین آرزو، خواجہ احمد فاروقی، احتشام حسین، محمد حسن اور لاتعداد لکھنے والوں نے غالبیات میں اضافہ کیا۔ اتنے مضامین شائع ہوئے کہ آخر میں ان مضامین کے دو مجموعے آئینۂ غالب اور گنجینۂ غالب کے نام سے شائع کیے گئے۔ پہلی کتاب کو تو دلی یونی ورسٹی نے ایم اے کے طلبار کے لئے امدادی کتاب کی حیثیت دی۔ اس ضمن میں غالب کے بہت سے مضامین اور نئے خطوط دوسرے رسالوں نے نقل کیے، مصنفین نے کتابوں میں حوالے کے ساتھ اور بغیر حوالے کے درج کئے۔ آج کل کے ادارے نے ہی ہندی میں غالب سے متعلق راقم کی کتاب "غالب بہ حیثیت شاعر اور انسان" شائع کی اور غالب کے خطوط کا ایک انتخاب جسے راقم نے ایڈٹ کیا ہے شائع کر رہا ہے۔ حمید احمد خاں لاہور یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے ان کا گراں قدر مضمون آئینۂ غالب میں چھپا تھا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ انہیں بھیجا گیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے لکھا کہ اس کتاب کے نسخے کو وہ اپنی لائبریری میں ایک قیمتی خزانے کی طرح رکھیں گے۔ کسے خبر تھی کہ آج کل جس روش پر چل رہا ہے دنیا ۱۹۶۹ء میں اس روش پر چل کر غالب کی صد سالہ برسی منائے گی اور دنیا بھر کے غالب پرست، غالب کو خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔

بے شمار تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔ جو تحقیق کرنے والے طلبار کے لیے آج بھی مشعل راہ ہیں۔ کئی بار قارئین کی شکایت موصول ہوئی کہ آپ بھاری بھرکم اور بعید از فہم مضامین شائع کرتے ہیں۔ توسیع اشاعت کے خیال سے کبھی معیار کو ترک بھی کرنا پڑتا۔ اور ہلکے پھلکے مضامین بھی شامل کرنے پڑتے۔ تحقیق کے رسیا پھر بھی اپنی نوازشیں ضرورت سے زیادہ شامل حال کرتے رہے۔ اُن کی محنت اور تلاش کے پیش نظر ان کا خیر مقدم کرنا فرض ہو جاتا۔ ہندوستان بھر کے ادیب اور شاعر آج کل سے وابستہ رہے۔ اول اول تو پاکستان سے بھی مضامین موصول ہوتے تھے، بعد میں یہ سلسلہ بہت کم ہو گیا۔ البتہ پاکستان میں اس کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہی بات اس رسالے کے قائم رہنے کے لئے بڑا جواز ہے۔ وہاں کی سرکاری زبان اُردو بھی ہے۔ مغربی پاکستان میں تو اُردو ہی کا دور دورہ ہے۔ اپنی باتیں اُنہیں بتانے کے لیے یا ہندوستان میں اُردو پڑھنے والوں کے لیے صالح ادب پیش کرنا ہو تو آج کل اُردو کا قائم رہنا ضروری ہے۔

آج کل میں بڑے بڑے نوادر شائع ہوئے۔ مہاتما گاندھی لالہ لاجپت رائے، عبدالحلیم شرر، عظمت اللہ خاں غالب اور نہ جانے کتنے لوگوں کے خطوط کے عکس چھپے۔ مرزا ہادی رسوا، مولوی مہیش پرشاد، نظیر اکبرآبادی، اور ایسے متعدد ادیبوں اور شاعروں کی نادر تصویریں چھپیں۔ سیماب، آرزو، صفی، حسرت موہانی، سالک وغیرہ کے انتقال پر وفاتیات کے کالم پُر کیے گئے اور مبسوط مقالے بھی لکھے گئے۔ راجہ رام موہن رائے کا رقعہ، کبوتر بازی، شیفتہ کا ایک غیر مطبوعہ خط 'اقبال کے پیغام کی عالم گیری' شمسو ں کی داستان، تلگو، تامل، مراٹھی، گجراتی، کنڑ، بنگالی، پنجابی اور ہندی سے متعلق مضامین، تاثر اور گرامی پر ہری چند اختر کے دو مضمون، خود ہری چند اختر کی موت پر میرے تاثرات' آغا حیدر حسن کے دو مضمون۔ میرے بچپن کی دلی، ہارون خاں شیروانی کے دو مضمون حسرت موہانی پر۔ کس کس مضمون کا ذکر کیا جائے ایک تنوع تھا ایک رنگا رنگی تھی۔ اہل کمال کی محفل تھی۔ خوب آراستہ رہی اور آج بھی آراستہ ہے۔

افسانوی ادب اور ڈرامے کی خدمت بھی آج کل نے بہت کی اس

مطبوعہ کہانیوں کا مجموعہ " آج کل کی کہانیاں" کے نام سے شائع ہوا اور
ت مقبول ہوا۔ اس کے لکھنے والوں میں اس صنفِ ادب کے نئے اور پرانے
م صف باندھے کھڑے ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، علی عباس
سینی، بلونت سنگھ، اختر اورینوی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس
یل عظیم آبادی، کنہیا لال کپور، اپندر ناتھ اشک، ذکی انور، رضیہ سجاد ظہیر
الحہ عابد حسین، جیلانی بانو، شکیلہ اختر، کوثر چاند پوری، واجدہ تبسم،
دیقہ بیگم، رام لعل، ستیش بترا، اور جوگندر پال سبھی موجود ہیں۔ کچھ نئے ادیب
ج کل' کے راستے سے شہرت کی رفعتوں پر پہنچے، ان میں ڈاکٹر محمد حسن،
گندر پال، اور فضا ابنِ فیضی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

افسانہ نگاروں میں سب سے پہلے علی عباس حسینی تھے۔ وہی اب
میں نہیں۔ ان کا انتقال بڑا ادبی حادثہ ہے۔ ان پر علی جواد زیدی کا
مضمون آج کل کی زینت ہو چکا ہے۔ موصوف کا مشہور افسانہ " مردار
رڈا" آج کل ہی میں چھپا ہے طرحی غزل بھی کہہ لیتے تھے۔ وہ یوں کہ
پریل کا شمارہ زیرِ ترتیب تھا۔ میں نے فرمائش کی کہ 'اپریل فول' کے
دان سے افسانہ چاہیے۔ اتفاق کی بات تھی کہ وہ موڈ میں آگئے اور یہ کہہ کر
ے افسانہ بھیجا کہ لیجیے طرحی غزل۔ کرشن چندر رسمی طور پر نہیں تھے لیکن
ن کا کرم بھی شاملِ حال ہو ہی جاتا تھا۔ ہر برسات میں نہ سہی لیکن کسی نہ کسی
سال یہ بادل بھی کھل کے برس ہی جاتا۔

شعراء کی نوازشیں تو جا و بے جا خوب ہوتی رہیں۔ غزلوں کا بے پناہ
سیلاب ہر موسم میں آتا رہتا جس کی غزل نہ چھپتی وہ مدیر کو مطعون کرتا اور
انبِ دار ٹھہراتا۔ اس ضمن میں بہت سی ناگفتنی باتیں ہیں۔ اس لئے اس پر
اکتفا کرتا ہوں کہ ع خاموشی در ثنائے تو حدِ ثنائے تست

۱۹۶۷ء کے ماہ ستمبر میں 'الوداع' کہتا ہوا میں ادارے ہی سے نہیں ملازمت
سے بھی فارغ ہو گیا۔ میرے بعد شہباز حسین صاحب نے بارِ ادارت سنبھالا۔
آج نرائن راز ان کے اسسٹنٹ رہے۔ ان کے جانے کے بعد اب نند کشور وکرم
ان کے ساتھی ہیں۔ شہباز حسین صاحب نے ۱۹۶۸ء میں اُردو نمبر نکالا اردو
سے متعلق ادبی اور معلوماتی مضامین شائع کیے۔ یہ نمبر اُردو سے متعلق ایک اچھی
دستاویز ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جدید ہندوستانی شاعری نمبر شائع کیا۔ اردو
شاعری پر عمیق حنفی صاحب نے ایک مبسوط مضمون لکھا جو ہر چند تشنہ تھا
لیکن ادارتی ضرورتوں کے مطابق تھا۔ دوسری ہندوستانی زبانوں کی شاعری کے
تراجم بھی شائع کیے گئے اور یہ لسانی اتحاد و یگانگی کی طرف ایک اچھا قدم
تھا۔ مجھے مسرت ہے کہ شہباز صاحب اپنی روایتی جانکاہی کے ساتھ آج کل
کی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور رسالہ اپنی آب و تاب اور افادیت کے
لحاظ سے اب بھی ہندوستان کا بہترین سنجیدہ رسالہ ہے۔ نئے لکھنے والے
ہر دور میں نمائندگی حاصل کرتے رہے ہیں لیکن یہ نمائندگی زیادہ تسلی بخش نہیں
تھی۔ اس کی بڑی وجہ نئے لکھنے والوں کی خام کاریاں تھیں۔ مقامِ مسرت ہے
کہ اب نئے لکھنے والوں کی نمائندگی نمایاں ہو رہی ہے۔ نئی شاعری، نئی افسانہ
نگاری کا چرچا عام ہے۔ کمار پاشی، عمیق حنفی، محمد علوی، عادل منصوری،
محمود سعیدی، بشیر بدر اور قاضی سلیم کی شعری تخلیقات آج کل کے صفحات
پر بے تکلف شائع ہوتی ہیں۔ جدید افسانہ نگار بھی منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ زیادہ
ادق اور تحقیقی مضامین کی کمی ہوتی جا رہی ہے آخر ان کے پڑھنے والے ہی کہاں
رہے۔ سال خوردہ لوگ کچھ میدان چھوڑتے نظر آ رہے ہیں۔ بہر حال زمانہ ہمیشہ
ایک سا نہیں رہتا۔

'آج کل' یہ دستور اُردو کی خدمت کر رہا ہے اس کی سلور جوبلی ۲۸ سال
کی زندگی گزر جانے پر منائی جا رہی ہے۔ دیر آید درست آید۔

۱۹۴۵ء میں ہندی 'آج کل' جاری ہوا تھا دونوں کی سلور جوبلی
بیک وقت منائی جائے تو یہ مبارک اور نیک اقدام ہے۔ یوں تو روزِ اجرا ہی
سے میں 'آج کل' میں لکھتا تھا۔ لیکن انیس سال اسی سے پورے طور پر وابستہ
رہا۔ اس طویل مدت ملازمت کی کتنی ناگفتنی باتیں ہیں جن کا ذکر ممکن نہیں لیکن آج کل
کے باب میں کتنی گفتنی باتیں ہیں جو بیان ہونے سے رہ گئیں

'آج کل' کا فائل جس لائبریری میں نہیں اس کا اردو شعبہ نامکمل ہے
اس جریدے نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے اور اس کے اندر ادب و ثقافت
کے بیش بہا خزانے جمع ہیں۔ سلور جوبلی کی مبارک باد تو ان فن کاروں کو ملنی
چاہیے جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اس کی آرائش کی۔ مجھے تو صرف یہی فخر
ہے کہ ان ادیبوں کے دروازے کا کامیاب فقیر رہا۔ بھیک ملتی رہی اور کاسہ
بھرتا رہا۔ خدا کرے کہ اس رسالے کی گولڈن جوبلی بھی ایک دن منائی جائے۔
اور مجھے یہ سعادت مقدر ہو کہ میں اسے بھی دیکھ سکوں اور ذرا تفاخر سے کہہ
سکوں ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ملاحظات

آج کل کے اجرا کو لگ بھگ ۲۸ سال ہو گئے۔ آج کل کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق جناب عرش ملسیانی کا مضمون بطور ضمیمہ شامل ہے اور اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

کسی ادبی رسالے کا اتنے دنوں تک اپنی مقبولیت کو برقرار رکھتے ہوئے جاری رہنا یقیناً ایک کارنامہ ہے جس کے لئے وہ تمام لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے آج کل سے متعلق رہے ہیں۔

'آج کل' کی یہ خوش نصیبی رہی ہے کہ اُسے اُردو کے نامور ادبا و شعرا اور ملک کی مقتدر ہستیوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آج کل نے نئے لکھنے والوں کو بھی خوش آمدید کہا ہے اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے 'آج کل' کے ذریعے شہرت پائی ہے۔

صالح اور سنجیدہ ادب کی ترویج، جمہوری اقدار کا فروغ اور تہذیبی اور لسانی کثرت میں وحدت کی ضرورت 'آج کل' کا مطمح نظر رہا ہے۔ اور یہ مقام مسرت ہے کہ ہمیں ایسے خوش ذوق اور سنجیدہ قارئین کی سرپرستی حاصل ہے جو تعداد میں نسبتاً کم ہونے کے باوجود اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہی لوگ رائے عامہ کو متاثر کرتے اور عوام کے خیالات میں تبدیلی لاتے ہیں۔

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ 'آج کل' میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی تخلیقات جگہ پائیں اس لئے ہم کسی معروف لکھنے والے کی تخلیقات جلد جلد شائع کرنے کے بجائے نسبتاً غیر معروف لکھنے والوں کو چھاپنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

"آج کل" ہندوستان کی تقریباً ہر ریاست میں پڑھا جاتا ہے ہندوستان سے باہر بھی متعدد ملکوں میں جاتا ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ افغانستان پاکستان، ماریشس، انگلینڈ، جنوبی افریقہ اور سعودی عرب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

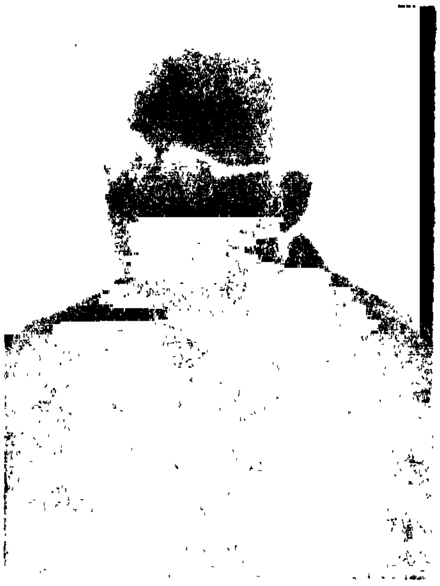
آج کل آپ کا رسالہ ہے۔ اکثر حضرات ہمیں اپنے تاثرات سے آگاہ کرتے ہیں ہم اُن کے مشوروں کی روشنی میں مناسب اقدام کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رکھئے تاکہ ہمیں علم ہوتا رہے کہ آپ کیا پسند اور کیا ناپسند کرتے ہیں۔

'آج کل' کی سلور جوبلی قدرے تاخیر سے منائی جا رہی ہے۔ ہم اس مبارک موقع پر اپنے قلمی معاونین اور قارئین کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ملتمس ہیں کہ وہ آئندہ اسی طرح 'آج کل' کو نوازتے رہیں۔

'آج کل' کے خصوصی شمارے عام طور سے مقبول ہوتے ہیں اس بار اگست کا شمارہ افسانہ نمبر ہے جس میں ہندوستان کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں کی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کا آپسی لین دین ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ امید ہے حسبِ سابق آپ کو یہ نمبر پسند آئے گا۔

امتیاز علی تاج اور شکیل بدایونی کی موت اردو کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ادارہ اُن کی موت پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتا ہے۔

مسعود حسین خاں



غبارِ کارواں

(۵)

اپنے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا آسان بھی ہے اور دشوار بھی ہے۔ آئے دن ایسے بے شمار لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے جو اپنے بارے میں بلا تکان و تکلف مسلسل بولتے رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا ماحصل صرف اُن کی ذاتِ گرامی ہے یا یوں سمجھیے کہ اُن کی قواعد میں واحد متکلم کے سوا اور کوئی صیغہ نہیں۔ اُن کی یہ دراز نفسی اپنے لئے تصفیۂ نفس کا وسیلہ اور دوسروں کے لیے بلائے جان بن جاتی ہے جب کہ یہ عمل بعضوں کے لیے اس قدر سہل ہے، میرے لیے سخت دشوار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی حساس آدمی اپنے بارے میں بہ مشکل رسوائی اظہار کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے۔ یوں تو انسانی انا اپنے اظہار کی مختلف شکلیں اختیار کر سکتی ہے۔ انا کے اظہار کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دوسروں پر اُسے مسلط کیا جائے، اس کے لیے مختلف پیرائے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ لام کاف، سب و شتم اور طعن و تشنیع، بے نیازی، بے رخی، اور تجاہلِ عارفانہ دیگر پیرائے ہیں جن کے لیے غزل کا محبوب بدنام ہے۔ غیر محبوب شخصیتیں بھی تغافلِ نگہ، کے تازیانے لگاتی ہیں۔ مسلسل مسکینی و عاجزی جس کا اظہار گفتگو میں اعتذاریہ جملوں اور تراکیب میں اکثر دیکھا گیا ہے، ایک مزید پیرائہ اظہار ہے۔ یعنی آپ اپنے بارے میں ہیچمدانی اور خاکساری کا دعویٰ کرتے ہوئے دوسرے کے بارے میں جس قدر سخت کلمات چاہیں کہہ ڈالیں، یہ فرض کرتے ہوئے کہ آپ نے ہر قسم کی جمع کے آگے از رہِ کسرِ انا ایک نفی کا نشان تو لگا دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جگ بیتی کی بہ نسبت آپ بیتی لکھنا دشوار ہوتا ہے اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ میری ذہنی نشو و نما میں کون کون سے عناصر کار فرما رہے ہیں اور میں اس پر غور کرنے لگوں تو فوراً نفس اور نفسیات کی کشمکش کا آغاز ہو جائے گا۔ نفسیات علم ہے، علم کا تقاضا ہوگا کہ خارجی نقطۂ نظر سے ماہرِ علم کی سفاکی کے ساتھ میں اپنی نفسیات کا جائزہ لوں۔ یہ دیکھوں کہ میری سرشت میں مختلف جبلتوں کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں۔ نسلاً اور وراثتاً میں نے کن میلانات کو پایا ہے۔ ماحول نے اُن کو کس طرح نکھارا یا بگاڑا ہے۔ تعلیم نے اُن کی کس ڈھنگ سے تہذیب کی ہے جذبات کس طرح احساسات اور احساسات کس نوع سے نصب العین میں تبدیل ہوئے ہیں۔ تخیلات کے صنم کدے میں آدرشوں اور شخصیتوں کے بُت کس وجہ سے بنے اور ٹوٹے ہیں۔ ظاہر ہے یہ خود سے متعلق ایک قسم کی نسلی، نفسیاتی تہذیبی و معتقداتی دستاویز کا فراہم کرنا ہے۔ لیکن میں اس قسم کی کوئی علمی دستاویز اپنے بارے میں فراہم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ مجھے اپنی ذات کے بارے میں ایک ایسے حافظے سے جو ردّ و قبول کا عادی ہے، ایک ایسی بصیرت سے، جو اپنے وجود میں گہری نہیں جاتی، ایک ایسے تجزیے کے ذریعے جو نفس کی گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتا کام لینا ہے۔ یہ سب کے سب خارجی وجود اور اشیا پر خوب خوب کارگر ہوتے ہیں لیکن اپنی ذات پر اُن کے منتر کا کوئی اثر نہیں کرتا۔

بہرحال خارجی مسلمات کے چند خاکے تو پیش کر ہی سکتا ہوں۔ نسلاً میرا تعلق پٹھانوں کے ایک ایسے قبیلے سے ہے جو اٹھارویں صدی کے وسط میں آفریدی قبائل کی سرزمین (بنوں، کوہاٹ) کی سکونت ترک کر کے نئے میدانِ عمل کی تلاش میں نوابینِ بنگش کی تحریک اور ترغیب سے قائم گنج (ضلع فرخ آباد۔ یوپی)

کے اطراف میں آکر بس گیا تھا۔ اس قبیلے کے کئی "خیل" تھے، جن پر قائم گنج کے بعض محلوں کے نام اب تک پائے جاتے ہیں۔ ددھیال کی طرف سے میرا تعلق تشکل خیل سے ہے اور ننہال کی جانب سے زریں خیل سے ہے۔ ددھیال کی طرف سے میرے مورثِ اعلیٰ مداخون (بڑا استاد) تھے جو پٹھانوں کے مولوی، صوفی، اور اہلِ دل تھے۔ زریں خیل، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تاجر پیشہ اور زر، زمین والے لوگ تھے۔ دونوں خیلوں میں پیشہ اور مزاج کے اختلاف کے باوجود قبائلی زندگی کی حمیت، شجاعت، خودی، خودداری اور مساوات پسندی یکساں طور پر پائی جاتی تھی۔ میری ذہنی نشوونما میں قبائلی زندگی کے ان تمام عناصر کی کار فرمائی کم و بیش ملنے کے امکانات ہیں۔ میں یہاں خاص طور پر حمیت، غیرت، خودی اور خودداری کا ذکر کروں گا جو پٹھانوں کے لئے معتقدات کا حکم رکھتے ہیں۔ انہیں قائم گنج کے پٹھانوں کی زبان میں لفظ "مڑک" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بڑا مڑک کا آدمی ہے۔ اس تصور کو کبھی کبھی اس محاورے سے بھی ادا کیا جاتا ہے کہ "وہ اپنی مونچھ نیچی نہیں ہونے دیتا۔" بے مونچھوں کے اس دور میں یہ محاورہ کس قدر بے معنی سا ہو گیا ہے لیکن میں نے اپنے بچپن میں ایک ایک گز لمبی مونچھوں والے پٹھان دیکھے ہیں۔ اس لئے میں مونچھ نیچی نہ ہونے دینے کے محاورے کی معنویت کو خوب سمجھتا ہوں۔ پٹھانی مڑک کا پہلا سماجی نتیجہ جو مرتب ہوتا ہے، وہ ہے اخوت اور مساوات کا تصور، جسے میں جمہوریت کی اساس سمجھتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں سرتاسر جمہوری ہوں یعنی چھوٹے بڑے کا سماجی تصور میرے ہاں نہیں پایا جاتا۔ میں چھوٹوں سے چھوٹوں اور بڑوں سے بڑوں کی طرح ملتا ہوں۔ میں کبھی پیش دستی نہیں کرتا لیکن کسی کو اپنے سے پیش دستی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اس سے سماجی تعلقات میں ایک قسم کا توازن سا آجاتا ہے۔ اور میں اپنا اور دوسرے دونوں کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اسی سے پٹھان کا انتقام کا تصور پرورش پاتا ہے جس کا تذکرہ تمام مورخین افاغنہ نے کیا ہے۔ جذبۂ انتقام اپنی بہترین شکل میں فسادِ معاشرہ کے لئے تریاق کا حکم رکھتا ہے۔ ہاں اپنی انتہائی شکل میں اس کا شمار یقیناً عیوبِ اخلاق میں ہوگا۔ عفو اگر بہ مجبوری ہو تو اس کو انسانی کمزوری شمار کرنا چاہیئے۔

میری ذہنی نشوونما میں ایک بڑا حادثہ جس کا گہرا اثر پڑا ہے، وہ ہے میرے والدین کا عمر کے ابتدائی حصے میں انتقال کر جانا۔ جب میں چار برس کا تھا تو میرے والد نے رحلت کی اور اس کے دو سال کے بعد ہی والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ اس کا امکان تھا کہ پیار و قدغن کے ماحول سے محروم ہو کر میں بعض نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا لیکن یہاں میری دستگیری میری ننہال کے مشترکہ خاندان نے کی، جو نانا، نانی کے علاوہ چار ماموؤں، ممانیوں اور اُن کے بچوں سے کھچا کھچ بھرا ایک متمول زمیندار گھرانا تھا۔ اس مشترکہ خاندان پر نانی صاحبہ بلا شرکتِ غیرے حکمراں تھیں اور چونکہ ہم تین بھائی بہنوں میں "اپنی مری ہوئی بیٹی کی تین نشانیاں" دکھائی دیتی تھیں، اس لئے محبتِ مادری کی کمی کو ہم لوگوں نے زیادہ محسوس نہیں کیا۔ میں اس لحاظ سے مشترکہ خاندان کی برکتوں کا خاص داعی اور شاہد ہوں۔ اس کی روز روز کی چیخ پیخ اور کھٹ کھٹ میں بچوں کو سمجھاؤ اور نبھاؤ کے سیکڑوں ڈھنگ نکالنے پڑتے ہیں اور یتیم بچے تو کھیلتے کودتے پل جاتے ہیں۔ نبھاؤ اور حفظِ مراتب کے یہ انداز اب میری زندگی اور شخصیت کا جزو بن گئے ہیں۔ میں بنیادی طور پر تنہائی پسند ہوں لیکن مردم بیزار نہیں۔ میرے لئے یہ بہت ہی آسان ہے کہ خود اپنے ساتھ زندگی بسر کر دوں۔ جی گھبرائے تو کتب خانے کی "نازنینانِ حرم" سے جی بہلاؤں۔ ورنہ جی بہلانے کی ضرورت محسوس ہو تو ہرے بھرے کھیتوں میں لیک چال سے نکل جاؤں، تاہم اچھے دوستوں اور نیک انسانوں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اپنے بچوں سے گھنٹوں کھیل سکتا ہوں اور اپنی گھر والی کو مسلسل چھیڑ سکتا ہوں۔ بچوں کو میں نے وہ تمام پیار دیا ہے جس سے میں خود محروم رہا ہوں۔ دوستوں کی شہادت ہے کہ بزمِ بے تکلف میں خوب اور اچھے فقرے جڑتا ہوں۔ مزاح سے لطف اندوز بھی ہوتا ہوں اور پیدا بھی کرتا ہوں۔ اور اس سب کو فیضان سمجھتا ہوں ننہال کے بھرے پُرے گھرانے کا، جہاں چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی، لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی، نوکر بھی تھے اور نوکرانیاں بھی اور سب کے اوپر نانی مرحومہ کی پُروقار شخصیت اور کڑک دار آواز جو اُردو کی چیدہ اور چنیدہ گالیوں کے ساتھ دو درجن سے اوپر اشخاص پر مشتمل اس خاندان کی رہنمائی کرتی تھی۔

میرا ذہن مذہبی رسوم پرستی سے ہمیشہ عاری رہا ہے۔ کچھ تو اس کی وجہ قائم گنج کی غیر مذہبی فضا تھی لیکن اس کی بہت کچھ ذمہ داری اسی ننہال کے مشترکہ خاندان پر ہے، جہاں مردوں میں مذہبیت برائے بیت تھی اور عورتوں میں صرف سہولت کی حد تک۔ مثلاً بچپن میں یہ بارہا دیکھنے میں آیا کہ نانی مرحومہ عین نماز میں، کسی ملازمہ کی ناپسندیدہ حرکت دیکھ کر نماز کی نیت توڑ دیتیں اور اُسے صلواتیں سنانے کے بعد پھر مشغولِ صلوٰۃ ہو جاتیں۔ عین تلاوت میں کسی ملازمہ کو ہوں ہاں کے ذریعے تاکید کرتے رہنا اُن کے معمولات میں سے تھا۔ ہر چند میری ددھیال میں اعتقاد اور تصوف کی طویل روایت رہی ہے اور میری ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہوئی جہاں اسلامی شعار کی پنج وقتہ پابندی سے سابقہ رہا، تاہم مذہب

میرے لئے ادائیگی رسوم سے کبھی عبارت نہ ہو سکا۔ البتہ ایک قسم کی سرّیت کے وجدان کی تڑپ مجھ میں اب تک باقی ہے۔ میں خاندان کے بعض دیگر بزرگوں کی طرح، ضعیف الاعتقاد کبھی نہیں رہا۔ اسی لئے مزاروں، قبرستانوں، نجومیوں اور نام نہاد بزرگوں کے آستانوں پر میں نے کبھی حاضری نہیں دی اور اگر دی تو صرف انسانی اور تاریخی احساسات کے ساتھ۔ لیکن جیسا ابھی کہہ چکا ہوں۔ سائنس کی جدید ترین انکشافات بھی میری اشیاء کی ماہیت اور سرّیت سے دلچسپی کو کم نہیں کر سکی ہیں۔ اس اعتبار سے میرا ذہن اُس سیلانی کا سا ہے جو بسنت رُت آنے پر پھولی ہوئی سرسوں کے مہکتے ہوئے کھیتوں کو علی الصبح دیکھ رہا ہو۔ روشنی بڑھ رہی ہو اور تاریکی کی سرحدیں سمٹ کر دور امرائیوں کی جانب بڑھ رہی ہوں طلوع آفتاب کے ساتھ ساتھ روشنی پھیلتی جائے اور سائے امرائیوں کے پاس جاکر ٹھٹک کر رہ جائیں۔ مجھے سرسوں کے روشن کھیتوں سے دلچسپی ہے لیکن نظر متلاشی و آوارہ امرائیوں کی ہے۔ جہاں سے آواز آرہی ہے۔

" ساری اُجلی راہیں جس میں کھو جاتی ہیں جاکر

جیسے مانگ مرے بالوں میں ! "

میں ان سایوں کی پرستش نہیں کرتا لیکن اُن کا منکر بھی نہیں۔ میں اُن سے بے تعلق بھی نہیں رہنا چاہتا۔ اس لئے کہ وہ روشنی کو پس منظر عطا کرتے ہیں۔ میں ان سایوں کو اپنے اخلاقی ضابطوں کا سرچشمہ بھی نہیں بناتا، اس لئے کہ اخلاقیات میرے لئے عبارت ہے سماجی بیوہار سے۔ پھر بھی نامعلوم اور غیر محسوس کی طرف ادب اور آرٹ کی تتلیوں پر سوار ہو کر پرواز کرنے کی کشش میرے لئے قائم رہتی ہے۔

عقل کی روشنی میں سایوں کی اس کشش کی وجہ غالباً یہ ہے کہ میں اپنی شخصیت میں عقلیت کے فانوس کے ساتھ جذبات کا آتشکدہ بھی رکھتا ہوں۔ میری ادب اور آرٹ سے دلچسپی کا یہی بڑا سبب ہے۔ اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران میں عمرانی علوم میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کے باوجود میرا دل ہمیشہ شعر و ادب سے وابستہ رہا اور اچھی موسیقی کی ایک تان اکثر ہوش و خرد چھین لے گئی۔ ابتدا میں کچھ تک بندی بھی کی، لیکن شعر لاوا بن کر پھوٹا۔ اس وقت جب میں تنقید و تاریخِ ادب سے ایم اے کی درسیات میں مسلح ہو چکا تھا۔ اوّل اوّل لاتوّں اعتنا چیزیں میں نے ۱۹۴۳ء میں کہیں پہلے گیتوں اور بعد کو غزلوں اور نظموں کی شکل میں۔ میرا خیال ہے کہ مجھ پر نزولِ شعر، کئی سال قبل ہو جاتا اگر میرا قیام چار سال تک اُردو کے ماحول سے دور بنگال میں نہ رہتا۔ جہاں سے میں نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کیا ہے۔ اور اگر میں چھ سات سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قدرے زاہدانہ ماحول میں نہ گزارتا۔ جامعہ ملیہ کے ماحول میں خیر و صداقت کے عناصر کی تربیت تو خوب ہوتی تھی لیکن حسن سے اس کی بےتوجہی مسلم تھی۔ میرا خیال ہے حسن، فرصت و اصراف دونوں کا متقاضی ہے۔ تخیل محض خیر و صداقت سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ عیش کا دلدادہ ہے، رنگ اور جل ترنگ کا رسیا ہے، اور قومی میدان کارزار میں ان دونوں کی گنجائش نہیں۔ جامعہ ملیہ کا جنم ایک قومی رزمیہ کے عہد میں ہوا تھا۔ اس وقت قوم کو سر بکف نوجوانوں کی ضرورت تھی جب یہ زمانہ گزر گیا اور قومی بزمیہ کا دور شروع ہوا اور یارانِ محفل جام بکف نظر آنے لگے تو یک لخت جامعہ کا مشن پورا ہو گیا۔

بات اپنے ذہنی نشو و نما کی تھی اور جا پہنچی کہاں۔ لیکن کوئی شخص خود کو ان اداروں سے علاحدہ نہیں رکھ سکتا جنہوں نے اس کی ساخت پرداخت میں حصہ لیا ہے۔ چنانچہ تخلیق شعر کا وہ لاوا، جس کا نکلنا بوجوہ ملتوی ہوتا رہا بالآخر ۱۹۴۳ء میں باقاعدہ طور پر پھوٹ نکلا۔ سرمایہ سخن میں کس نے کیا اضافہ کیا ہے، اس کا نہ تو کوئی شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ اس کا عصر۔ کوئی شخص اگر اپنے سرمایہ پر خود حکم لگانے کی جسارت کرے گا تو وہ محض تعلّی ہوگی۔ اسی طرح عصری شہرت اکثر و بیشتر اتفاقی ہوتی ہے یا تحریکاتی۔ ذوقؔ استادِ شہ تھے اس لئے اتراتے پھرتے تھے۔ ناسخؔ زبان داں تھے اس لئے اپنے سخن کی دھاک جما رکھی تھی۔ یہی حال ان درجنوں شاعروں کا ہے جن کی شہرت کسی سیاسی یا ادبی تحریک کی رَو پر آگے بڑھی ہے۔ وہ اُن خس و خاشاک کی طرح ہیں جو کسی تحریک کی لہر پر تیرتے ہوئے اوپر آگئے ہیں اور اس کے ختم ہوتے ہی گمنامی کے ساحل پر تنکے کے مانند پھینک دیئے جائیں گے۔ شاعر اہم ہو یا غیر اہم، بہرحال تخلیق شعر کا تجربہ، ناقدِ شعر کو گہری بصیرت عطا کرتا ہے۔ تقریباً دس سال تک تخلیق شعر کے کرب میں مبتلا رہنے کے بعد میری روح کو نہ صرف سبکساری کی لذت ملی بلکہ کارکنانِ تخلیق کے عالم تخلیق کا علم بھی بہم پہونچا۔ اس تخلیلی ریاضت کے ساتھ ساتھ میں نے اسی دوران میں دو ریسرچ ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ایک مادر علمی علی گڑھ سے (۱۹۴۵ء) اور دوسری عروس البلاد پیرس سے (۱۹۵۳ء) دوسرے الفاظ میں شدید تخلیق کے عالم میں تحقیق کو بہم رکھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایک نے دوسرے کو کیا فیضان یا نقصان پہونچایا۔ میرے ایک مشفق کا کہنا ہے کہ میری تحقیق میں اگر شعر کی جادوگری نہ ہوتی تو وہ اس قدر دلچسپ نہ ہوتی۔ ایک دوسرے ہمراز کا خیال ہے کہ الفاظ کی قدر

قیمت کا وہ نازک احساس اور ہیئت کا وہ تنوع جو میری شعری تخلیقات میں ملتا ہے، لسانیاتی ریاضت کے بغیر کسی طرح ممکن نہ تھا

تخلیقِ شعر کے دَور میں، میں نے گیت غزلیں نظمیں، آزاد نظمیں سب کچھ لکھیں۔ اُن میں سے بعض تخلیقات کی محرک میری ذاتی واردات ہیں جنہیں میں اُنگلی رکھ کر بتا سکتا ہوں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں کسی ایک واردات یا واقعہ کی تخصیص نہیں بلکہ اُن میں وقت کے فاصلوں اور بیتی ہوئی یادوں کے کئی رنگ اور کئی آوازیں یکجا ہو گئی ہیں۔ کم از کم ایک گیت نما آزاد نظم، "رُوپ بنگال" خالص تخیلی اور فکری ہے۔ اس کے کسی جزو کا انطباق کسی شخصیت یا شے پر نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ اُس کے کردار اور مناظر ذہن کے کن گوشوں سے اُبل پڑے ہیں۔ کوئی شخص یا شخصیت، منظر یا مناظر اس کے پس منظر میں نہیں، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نظم کے بیشتر حصے امتحان ہال میں انویجیلیشن ڈیوٹی، کی بوریت کو دُور کرنے کے لئے ٹہلتے ہوئے لکھے گئے تھے۔ نوک پلک کی درستی البتہ عرصے تک جاری رہی۔

میرے خیال میں تنقید کے لئے ہر شاعر کو اس قسم کی داخلی شہادت کا فراہم کرنا ضروری ہے، طرزِ ادا سے پا جانے کا ڈر اس لئے نہیں ہے کہ واردات اور شخصیتوں پر غزل کے پردے پڑے ہوئے ہیں، جن کا چاک کرنا شاعر کے تعاون کے بغیر کسی ناقد کے بس کی بات نہیں۔ سیاسی اشاروں کے حامل اشعار کی فوراً شناخت کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اُن کی نشاندہی کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ایک لطیفہ سناتا جاؤں۔ پاکستان بننے کے کچھ عرصے بعد کراچی کے ماہنامہ "ماہِ نو" میں میری ایک نظم "مدینۂ آدم" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے اسے ایک ایسے مجموعہ انتخاب میں دیکھ کر تعجب ہوا، جو تشکیلِ پاکستان سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں اور یہ انتخاب شیخ محمد اکرام جیسے مستند نقاد نے ترتیب دیا تھا۔ "مدینۂ آدم"، ایک خالص تخیلی نظم ہے۔ اس میں انسان کی اس ازلی اور ابدی جستجو کا عکس ہے، جو وہ مدینۂ آدم کے سلسلہ میں ہمیشہ سے کرتا رہا ہے۔ اور بس۔

۱۹۵۵ء کے بعد سے لسانیاتی ریاضت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ میری تخلیقی لہر کمزور ہوتی گئی۔ اب میری توجہ ترتیب و تہذیب متون قدیم اور دکنی اُردو کی ابتدا اور ارتقا کی جانب مرکوز ہوتی گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان متون کی میری قرأت قطعی اور آخری ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے ان کی صحت و ترتیب کے وقت اس اصول کو سامنے رکھا ہے کہ "خود سے سچے رہو"

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے اکثر پیش رو اس سلسلے میں ترتیب متون کے اس بُنیادی اصول پر قائم نہیں رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ء کے بعد میں نے صرف چند دوستوں اور بزرگوں کے شخصی مرثیے کہے ہیں۔ اُن کو لکھنے کے بعد ہی مجھے اس ادبی قول کی صداقت کا احساس ہوا، کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے۔

بنیادی طور پر میرا ذہن بت پرست کا ذہن نہیں، مذہبی سطح ہو یا کہ سماجی۔ اسی لئے میں نے بچپن سے نہ تو اصنامِ خیالی تراشے ہیں، اور نہ خداوندوں کو خدا سمجھا ہے۔ میں انسان کی پرستش کا بالکل قائل نہیں میری مساوات کی حس اس قدر بیدار ہے کہ انسانی عظمت پر حرمت و تقدیس کی عبا، قبا کبھی نہیں ڈالتا۔ ہر استاد کو اپنے پیشہ میں چھوٹے موٹے پجاریوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ میں نے اپنے طالب علم کو ہمیشہ اس بات پر ٹوکا ہے۔ معتقدین سے میں بڑا گھبراتا ہوں۔ نہ کسی کی پرستش کرتا ہوں اور نہ اپنی کروانا چاہتا ہوں (معاملاتِ حسن و عشق کی بات اور ہے) اور مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک زمانے میں علی گڑھ میں اقبال پر درس دیتا تھا تو ایک نہایت سادہ دل طالبہ نے درس کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ "ڈاکٹر صاحب مجھے آپ سے بڑی عقیدت ہو گئی ہے" تو میں نے نہایت مدھم لہجے میں یہ مشورہ اُسے دیا تھا کہ وہ اس عقیدت کو ڈاکٹر اقبال کی جانب منتقل کر دے۔ مجھے اپنی اس تلخ جوابی پر بعد کو افسوس رہا لیکن اس واقعہ سے میری طبیعت اور ذہنی اعتقاد کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ اشخاص، چاہے وہ کسی منصب اور حیثیت کے کیوں نہ ہوں، میرے لئے محض اشخاص رہتے ہیں۔ میں کسی شخص کی عزت یا تو اس کے کمالات کی بناء پر کرتا ہوں یا اس کی کرسی کی وجہ سے۔ کرسی کی عزت کرنا (نہ کہ خوشامد کرنا) میں سماجی ڈسپلن کا ایک اہم جزو تصور کرتا ہوں۔ کمالات کی عزت میرے دل کی تہہ سے اُبھرتی ہے۔ اس ضمن میں اُستاد، طالب علم، ملازم، بوڑھا، بچہ، ادنیٰ اعلیٰ، سب آ جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی سے بوجوہ عزت کے ساتھ محبت کا جذبہ آمیز ہو جائے تو وہ شخص میرے لئے عزیزوں سے زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ عزت و محبت کے عین اس عالم میں مجھے اس شخص کے "آدمی" ہونے کا احساس برابر رہتا ہے۔ اور بربنائے محبت و عزت اس کی آدمیت کی حرکتوں کو معاف کرتا رہتا ہوں۔ میرے کچھ دوستوں نے ہمیشہ اس بات پر تعجب کیا ہے کہ میرے تعلقات ایسے لوگوں سے بہت اچھے اور استوار رہتے ہیں جو دوسروں کی نگاہ میں "بوڑم" اور "چیزے" ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان کی شخصیت کے کھردرے کونوں کو میرے حسابِ دوستاں میں چھوٹ ہوتی ہے۔

یادوں کا چراغ لئے جب ماضی کے نہاں خانوں میں لوٹتا ہوں
تو نانی مرحومہ کے کردار کے بعد جن چہروں پہ توجہ رک رہ جاتی ہے

ان میں کچھ بزرگ، کچھ دوست، کچھ استاد اور کچھ ادبی و رُوحانی معلّم ہیں۔ بچپن میں محلے کے ایک نہایت معمولی انسان مکتب کے استاد، مسجد کے امام، حافظ عطا میاں کی شخصیت کا میرے دل پر گہرا اثر رہا ہے۔ آج بھی کسی انسان کو میں نیکی کا پیکر دیکھتا ہوں تو اُن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ چھوٹے قد کے دُبلے پتلے انسان، چہرے پر مختصر سی چھدری حنائی داڑھی، لمبا کرتا، علی گڑھ کٹ پائجامہ، کاندھے پر لمبا سا رومال، ہاتھ میں مختصر سا ڈنڈا۔ آہستہ رو، آہستہ گو، ہمدرد، نیاز مند، جدھر سے گزر جاتے نیکی کی خوشبو پھیلا جاتے۔ انھیں کے وسیلے سے میرا اب تک خیال ہے کہ خیر کا علم سے کوئی تعلق نہیں انہیں کے توسط سے جب کسی اشتراکی یا جمہوری تہذیب کا تذکرہ ہو جاتا ہے تو پوچھتا ہوں کیا یہ تہذیبیں عطا میاں جیسے انسان پیدا کر سکی ہیں۔ عطا میاں آج بھی میرے لئے انسانوں کو پرکھنے کی کسوٹی ہیں!

دوسری شخصیت جس سے میں اپنی ابتدائی تعلیم کے زمانے سے دوچار رہا خود اپنے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذات گرامی تھی جنہیں میں ذاکر میاں یا بڑے چچا کے نام سے پکارتا تھا۔ حافظ عطا میاں کی دوڑ مکتب و مسجد تک تھی۔ اس محدود زندگی میں خیر مجسم بنا اور رہنا نسبتاً آسان ہے۔ ذاکر میاں کی شخصیت خیر صداقت اور حسن تینوں کا مجموعہ تھی۔ وہ مشرق و مغرب آشنا تھے، اور ان کا اثر عمل کہیں زیادہ وسیع تھا۔ کمال خیر کے ساتھ ان کے یہاں نہایت اندیشہ بھی تھی، حسن کے اسباب جب تک مہیا نہ تھے، اس وقت بھی ان کی سادگی میں پرکاری تھی۔ جب فراہم ہو گئے تو کیا لباس، کیا نوادر کیا گل اور کیا گلاب ہر طرف نظر کی حنا بندی کر دی۔ یہاں تفصیلات میں جانے کا نہ موقع ہے اور نہ محل لیکن ذاکر میاں کی شخصیت کے بارے میں میرا ہمیشہ خیال رہا کہ وہ دور اور نزدیک ہر فاصلے سے یکساں تھی۔ ان کی فہم و فراست کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں لیکن وہ اس کے پتلے ہو کر بھی خود کو سادہ لوح نا سکے تھے۔ صرف اس لئے کہ دوسرا یہ سمجھے کہ وہ زیادہ فریس ہے۔ انہوں نے کانٹے کے وقت میں حق بات کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ لیکن حق گوئی کو پیشہ کے طور پر کبھی استعمال نہیں کیا۔ ان کا احساس حسن تیز اور جزئیات ہیں تھا لیکن انہوں نے عیش پسندی اور حسن پرستی میں ہمیشہ امتیاز کیا۔ بہرحال ہر دور میں (اپنے دور سرگرانی میں بھی) وہ میرے لئے انسانی عظمت اور کمالات کا ایک ایسا نمونہ رہے جسے دیکھ کر تحریک بھی ہوتی تھی، اور ترغیب بھی۔ کیا تقریر، کیا تحریر، کیا بوریا نشینی اور کیا مسند نشینی ہر بات اور مقام پر ایسا برتر پایا کہ جی مچلا یا کاش ہم بھی ایسے بن سکتے۔

استادوں کا تصور کرتا ہوں تو کئی تصویریں قرطاس ذہن پر اُبھرتی ہیں۔ ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نام سر فہرست ہے۔ میں رشید صاحب کی شخصیت سے زیادہ اُن کے فن سے اور علم سے زیادہ ان کی بصیرت سے متاثر ہوں۔ اُن کے فقرے ادبی ٹکسال کے سکّے رواں ہیں۔ ان کی انشاء پردازی نے ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔ وہ خواص پسند ہیں لیکن عوام شکار ہیں، محفل ہیں لیکن محفل سے گریزاں۔ مزاح نگار بھی ہیں، نقاد بھی اور انشاء پرداز بھی۔ لیکن میرا ایمان رشید صاحب کی انشا پردازی پر زیادہ ہے۔ مزاحیہ مضمون ہو کہ ادبی تنقید ان کی انشا پردازی ہر جگہ اُن کے کام آئی ہے اور اسی سے انہوں نے دوسروں کو شکست دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا "ادب ممنوعہ" یعنی خطوط جب کبھی مرتب ہو کر شائع ہوں گے تو ناقدین کو اُن کے ادبی مقام کا از سر نو جائزہ لینا ہوگا۔

دوسرے انشاء پرداز اور تصانیف جنہوں نے میری ذہنی ساخت پرداخت میں حصہ لیا ہے۔ غالب، اقبال، مہدی افادی، گئودان اور گیتا نجلی ہیں۔ غالب کی نظم و نثر دونوں کا میں نہ صرف قائل بلکہ گھائل ہوں۔ اس لئے اکبرآباد کے اس یتیم (اور درِ یتیم) کی ادبی پرستش سے کبھی میں یک لحظہ غافل نہیں ہوا۔ میرا عقیدہ ہے کہ عظمت غالب کی بازیافت کا دور ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ نقاد اس سے تھک جائیں اس کی بازیابی کی کاوشیں جاری رہیں گی۔ اور اردو حریم شعر کے ہر پردے میں یہی کافر صنم نکلے گا۔ میرے بتکدۂ ادب میں دوسرا لائق "پرستش کا فرہندی" اقبال ہے۔ اقبال دوسرا انقاد فکر شاعر ہے۔ دیوانِ غالب نے مجھے انسان شناس بنایا ہے، تو بالِ جبریل نے مجھے خدا شناس۔

ہندوستانی تہذیب کا سب سے عزیز پہلو میرے لئے اس کی رنگا رنگی ہے۔ یہ ملک قدیم زمانوں سے مختلف نسلوں، مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اس میں دراویدی تہذیب کی اصنام پرستی بھی ہے اور اسلامی تہذیب کی توحید پرستی بھی۔ یہاں کا توحید پرست، صنم پرست بھی ہے اور صنم پرست، توحید پرست بھی۔ مختلف تہذیبوں کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے مروّت اور رواداری کی روایت اور توازن قائم ہو گئے تھے۔ اس روایت کو آپ موجودہ حالات و واقعات کی روشنی میں نہ دیکھیں کہ آج کل ہم منکر "ہندوستانیت" ہیں۔ بلکہ چند دہوں قبل کی دوستیوں اور رواداریوں میں دیکھئے کہ ہم ایک دوسرے کو نہ چھوتے

(بقیہ ص ۲۳ پر)

سفارش

—— نریندر لوتھر

کرپال سنگھ میرے دفتر میں کام کرتا تھا۔ بڑا محنتی اور ذہین آدمی تھا۔ صرف دو تین بار ہی اس کا کام دیکھ کر میں اُس سے اتنا متاثر ہوگیا تھا کہ میں نے اُسے براہِ راست اپنے تحت میں لے لیا۔ دفتر کے دوسرے بابو اور بیشتر افسر کام سے بچنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ لیکن کرپال کبھی بھی کسی کام سے کتراتا نہیں تھا جو بھی کام سونپا جاتا وہ اُسے پورا کئے بغیر کبھی دفتر نہ چھوڑتا تھا۔ ایک ہی سال کے اندر میں اس کا اتنا گرویدہ ہوگیا کہ میں اس تلاش رہنے لگا کہ کس طرح اُسے ترقی دی جائے۔ حالانکہ وہ صرف اسسٹنٹ تھا اور اس کے اوپر سپرنٹنڈنٹ اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر، ڈپٹی ڈائرکٹر اور کئی افسر تھے لیکن قابلیت اور سوجھ بوجھ میں وہ کسی بھی ڈپٹی ڈائرکٹر کی برابری کرسکتا تھا۔ شاف کے بیشمار لوگ کبھی اس کی کبھی اس کی سفارش کے ذریعے ترقی پانے کی کوشش کرتے لیکن کرپال کبھی کسی سے سفارش نہ کرواتا۔ اسی وجہ سے میری نظر میں اس کی وقعت بہت زیادہ تھی۔ وہ آدمی صرف اپنے کام کی وجہ سے ہی 'آگے بڑھنے' کا مستحق تھا جب میں نے بے شمار سفارشوں کے خلاف صرف اسی کو ترقی دی تو مجھے اس بات پر بڑا فخر تھا کہ میں نے صرف قابلیت کو دیکھا۔ کسی سفارش سے مرعوب نہیں ہوا۔

میں نے اُسے اپنے کمرے میں بلا کر خود اُسے ترقی کا آرڈر دیا، ساتھ ہی میں نے اُسے مبارکباد دی اور یہ امید ظاہر کی کہ وہ ہمیشہ اپنی ہی قابلیت کی وجہ سے بہت ترقی پائے گا۔

وہ سپرنٹنڈنٹ بنا تو اور بھی تندہی سے کام میں لگ گیا۔ گو اس کا رتبہ اب اور اونچا ہوگیا تھا لیکن پھر بھی سپرنٹنڈنٹ پورا افسر نہیں سمجھا جاتا۔ افسری تب شروع ہوتی ہے جب انسان ڈائرکٹر بنتا ہے۔ چاہے ڈائرکٹر کے ساتھ ایڈیشنل، اسپشل، جوائنٹ، ڈپٹی، اسسٹنٹ یا سب لگا ہو مستقبل قریب میں میرے محکمہ میں کرپال کے لئے ابھی اور ترقی کے امکانات نہیں تھے اس لئے میں نے اُسے صلاح دی کہ اگر کسی اور محکمہ یا سرکاری کارپوریشن میں کوئی آسامی خالی ہو تو وہ اس کے لئے اپنی عرضی بھیجدے میں حتی الوسع کوشش کروں گا کہ اسے کہیں ڈیپوٹیشن پر بھیجدوں ڈیپوٹیشن سے عہدے میں ترقی کے علاوہ تنخواہ میں بھی معقول اضافہ ہوجاتا ہے۔

خوش قسمتی سے ایسا موقع جلد ہی ہاتھ آگیا۔ ایک محکمہ میں ایک ایسی آسامی کے لئے اشتہار نکلا جس کے لئے کرپال نہایت موزوں تھا۔ میں نے فوراً اس کی عرضی وہاں بھجوادی۔ عرضی بھیجدینے کے بعد کرپال سے بھی زیادہ مجھے نتیجے کا شدت سے انتظار رہنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا میں نے خود اپنی نوکری کے لئے درخواست دی ہو۔ پھر ایک دن کرپال کو انٹرویو کے لئے بلاوا آگیا۔ واپسی پر اس نے مجھے اپنے انٹرویو کا سارا حال کہہ سنایا۔ کیا کیا سوال پوچھے گئے، اس نے کیا کیا جواب دیئے۔ سب کچھ سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ کرپال کو وہ نوکری ضرور مل جائے گی۔

کرپال کے انٹرویو کے دو چار دن بعد ہی مجھے ہمارے شہر کی ایک

بہت ممتاز اور اہم شخصیت کا فون آیا۔ وہ صاحب مجھے کسی ضروری کام سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے تفصیل پوچھی تو کہنے لگے کہ آپ سے ذاتی طور پر ہی بات کریں گے۔ ایسی معزز شخصیتیں آتی ہیں تو ہمیشہ کسی نہ کسی ناجائز کام کی سفارش کرنے کے لیے۔ لیکن آج کل کے جمہوری دور میں کسی شخص سے ملنے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا اور پھر کسی ممتاز ہستی کو ملاقات کا موقع نہ دینا تو نہ صرف آداب کے خلاف ہے بلکہ ویسے بھی ناسمجھی کی بات ہے۔ میں نے اُنہیں اُسی دن سہ پہر کو بلایا

وہ صاحب آئے تو پہلے تو ادھر اُدھر کی رسمی باتیں کیں۔ انگریزوں کی طرح پہلے موسم کی بات کی پھر ہندوستانیوں کی طرح حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا۔ پھر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے ذرا کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ اصل موضوع کی طرف رجوع ہوئے۔

"ارے آپ کو تو معلوم ہوگا کہ انڈسٹری محکمہ میں ایک عہدے کے لیے ویکنسی نکلی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"سنا ہے آپ کے دفتر میں سے کرپال نامی ایک سپرنٹنڈنٹ کا نام بھیجا گیا ہے۔"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔" میں نے عرض کیا۔

"اگر وہ چنا گیا تو آپ اُسے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے۔؟"

"بے شک، میں نے کہا: "جب ہم نے عرضی بھیجی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اس کو چھوڑنے پر رضامند ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے اس معزز شخص کے چہرے کو دیکھا۔ اس تسلی کے باوجود بھی اس پر خوشی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ میرے ذہن میں کرپال کا خاکہ اُبھر آیا۔ آج پہلی بار مجھے اس پر غصہ آیا۔ آج اُس نے سفارش کا سہارا کیوں لیا؟ اور خاص کر میرے ساتھ۔ کیا اُسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا، کہ میں ہمیشہ قابلیت کی قدر کرتا ہوں۔ سفارش کی نہیں۔ مجھے انسانی فطرت پر افسوس ہوا۔ مجھے کرپال سے ہرگز ایسی توقع نہ تھی۔ وہ میری نظروں میں کچھ گر گیا۔

تھوڑی دیر اپنی ٹھوڑی کو ہاتھ میں لے کر انہوں نے اور سوال کیا۔

"وہ جو اس نے اتنی سروس یہاں کی ہے وہ تو ضائع جائے گی؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ وہ استعفا دے کر نہیں جائے گا۔ اُسے ڈیپوٹیشن پر بھیجا جائے گا۔"

اب سرکاری قواعد سے میری واقفیت کچھ اتنی زیادہ نہ تھی اور مجھے کچھ گھبراہٹ ہونی شروع ہو رہی تھی کہ وہ صاحب کہیں اس سے زیادہ مشکل سوال نہ پوچھ لیں۔ لیکن انہوں نے پوچھ ہی ڈالا۔

"اور اس کی Lien کا کیا ہوگا؟

Lien سرکاری نوکری میں ایک خاص چیز ہے۔ یہ گویا سرکاری نوکری اور اس کی ملازمت میں ناف کا رشتہ ہوتا ہے جب تک وہ اگلی ملازمت میں مستقل نہ ہو جائے اس کا یہ حق رہتا ہے کہ بوقت ضرورت اور اپنی مرضی سے اپنی پرانی جگہ واپس آجائے۔ میں نے اُنہیں بھروسہ دلایا کہ کرپال کی Lien معمول کے مطابق برقرار رہے گی۔

میں ابھی ابھی منتظر تھا کہ اُن کے چہرے پر وہ دمک کب آئے گی جو اپنی مراد پانے کے بعد آتی ہے۔ لیکن وہ صاحب ابھی بھی پریشان خاطر دکھائی دیتے تھے۔

"تو ــــ آپ کے خیال میں اس کے جانے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوگی۔ انہوں نے گویا آخری سوال پوچھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے مجھے کوئی ایسی رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے خوشی ہوگی اگر میرے محکمے کا کوئی بھی آدمی ترقی کرے۔ اور خاص کر اگر وہ کرپال جیسا دیانت دار اور محنتی آدمی ہو اور پھر میں نے ازراہ تسلی مزید کہا: "حضرت آپ بالکل فکر نہ کریں ہماری طرف سے کوئی اڑچن نہ ہوگی۔"

اُن کا چہرہ جیسے ایک دم بالکل اُتر گیا۔ ہاتھ ملتے ہوئے وہ قدرے ہچکچاہٹ سے بولے: "آپ میرا مطلب نہیں سمجھے میں کرپال کی سفارش لے کر نہیں آیا تھا۔ میری گزارش اور تھی۔ اس عہدے کے لیے جو انٹرویو ہوا تھا اس میں کرپال سنگھ کا نمبر پہلا ہے اور میرے داماد کا نمبر دوسرا ہے میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح کرپال سنگھ کو وہاں جانے سے روکا جا سکے تو . . . . . "

اُن کی بات ختم ہونے سے پہلے میرا چہرہ اُتر گیا۔

عمیق حنفی

دل کا رشتہ

یہ کاغذ کی کترن نہیں ہے

خزاں کے ستم پیشہ ناخن کا نوچا ہوا زرد پتا نہیں ہے۔

یہ وہ پھول ہے جو کہ اس ننھے پودے کی ٹہنگی پہ اک دن کھلا تھا

جو پودا ہزاروں میں سے ایک تخمِ محبت کے دِل سے اگا تھا

یہ ٹوٹا ہوا زرد پتا نہیں ہے۔

یہ وہ پھول ہے جس نے تنہائی کے ایک گوشے کو رنگ اور

خوش بو کی سوغات دی تھی

خزاں کی، قضا کی وہ ماں جائی، بے حس جدائی

اسے توڑ کر کامرانی کے نشّے میں کیوں چور ہے ؟

اسے دل کے اوراق کے بیچ محفوظ کر کے میں اپنے سے پہلے

کبھی آگ، مٹی، ہوا، اور پانی کی خوراک بننے نہ دوں گا۔

صلاح الدّین پرویز



پیاس

منہدم ہو گیا جذبات کا پاکیزہ شعور
جل گیا جسم مرا رُوح کی عریانی میں
میں کہ اب "میں" نہ رہا
ایک مدھم سا جنوں
پھر بھی مرے ذہن میں
بیٹھا ہے چھپا
— یہ گنہگار سسکتی ہوئی دیواریں
ایک مدت سے جو احساس پہ
قائم ہیں مرے
کون اک پیرِ خمیدہ آکر
اپنے روحانی عملیات سے
ڈھائیگا اُنہیں !!

علیم اللہ حالی

خلا

ان میں کیا ہے کہ رہیں، کچھ تو نہیں، کچھ بھی نہیں
اِن خلاؤں میں بھلا عمر بسر کیا ہوگی
کتنی دُور آئے ہیں کِس سمت نِکل آئے ہیں
اِن خلاؤں میں کہیں کوئی ٹھکانہ بھی نہیں
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
نہ کوئی سنگِ نشاں ہے نہ کوئی نقشِ قدم
کوئی اندازۂ منزل ہے ، نہ جادہ کوئی
اِن میں کیا ہے کہ رہیں کچھ تو نہیں کچھ بھی نہیں
وہ تمنا بھی نہیں دِل میں جو حسرت بن جائے
وہ حقیقت بھی نہیں جس کو فسانہ کہدیں
ایک ناکام سی کوشش ہی سہی، کچھ بھی سہی
ایک خواہش جسے تشکیل کی حسرت رہ جائے
اک طلب ایسی جو تکمیل سے سرشار نہ ہو
خواب جو خواب میں بھی تشنۂ تعبیر رہے
ایسی وحشت ہی کہ دُور اور بیاباں ہو جائے
تشنگی ایسی کہ تسکین گریزاں ہو جائے
ان خلاؤں میں مگر کیا ہے یہاں کچھ بھی نہ
ان خلاؤں میں بھلا عمر بسر کیا ہوگی

امشب صدائے تیشہ...

راج

"ظالم لوگ نہیں شیریں تیرے شہر کے — ہوا —"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا کہیں دور خلا میں گھور رہا تھا۔

"کھڑکی سے ہٹ جاؤ۔" میں نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔

اس نے گردن گھمائی اور میرے چہرے کو تکتے ہوئے، کچھ ایسے جیسے اُسے یہ بات کہنے میں تامل ہو رہا ہو، بولا۔ "یہ شیریں کے شہر کے لوگ — وہ اتنے ظالم کیوں ہیں۔؟"

"مجھے پتہ نہیں۔" میں نے جواب دیا: کھڑکی بند کر دو۔ دیکھو کتنی گرم لو آ رہی ہے۔"

اس نے چہرہ میری طرف سے ہٹا لیا اور پھر باہر دیکھنے لگا۔ میں نے کروٹ بدل لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن مجھے نیند نہ آئی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جب بھی وہ شیریں کے شہر کا ذکر چھیڑتا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی رُوح میں ایک طوفان سا اُٹھ رہا ہے۔

آخر میں اونگھ گیا لیکن فوراً ہی اُس نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔ وہ بہت ہی مضطرب تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے کرب جھلک رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"وہ پہاڑی —" اس نے انگلی سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ "ہونہہ۔؟" میں نے کہا

"کچھ نہیں۔" وہ بولا اور پھر خلا میں گھورنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے سنا وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"دور اُس پہاڑی پہ
اک الاؤ جل رہا ہے
اور چند دیوانی روحیں
چیختی چلاتی ہیں
اپنے لمبے بازوؤں سے
کسی کو یوں بلاتی ہیں؟
اپنے۔ لمبے۔ بازوؤں سے — کسی کو . . . "

ظاہر تھا وہ آپے میں نہیں تھا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور کھڑکی بند کر دی۔ پھر میں نے کندھے سے پکڑ کر اسے پلنگ پر لٹا دیا اور اس کا سر تھپتھپانے لگا۔ یکایک وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ذرا کھڑکی کھول دو۔ شاید نیچے منادی والا ہے۔" وہ بولا اور کان لگا کر کسی آواز کو سُننے لگا۔

"اب سو جاؤ، تم بہت تھک گئے ہو۔" میں نے کہا: "اور — اور پھر رات ہمیں جاگنا بھی تو ہے۔"

"کیوں؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا

"آج رات انسان چاند پر اُترنے والا ہے۔" میں نے جواب دیا اور اس

پورا شعر یوں ہے

امشب صدائے تیشہ از بے ستوں نیامد ؛ شاید بخواب شیریں فرہاد رفتہ باشد

کا سر تھپتھپاتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا ہیجان کم ہوتا گیا اور آنکھیں مندنے لگیں پھر اُس نے کروٹ لی اور چند ہی لمحوں بعد وہ گہری نیند سو گیا۔

میں نے کھڑکی کھول دی، اور باہر دیکھنے لگا۔ سامنے دریا تھا۔ ایک سڑک دائیں طرف سے آرہی تھی اور دریا پر سے گزرتی ہوئی اس پار بائیں کنارے پر نکل آئی تھی اور پھر بہت آگے جا کر ایک پہاڑی کے پیچھے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

ایک روز جب ہم دونوں کھڑکی میں کھڑے باہر دیکھ رہے تھے تو اس نے پوچھا تھا: یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

مجھے شرارت سوجھی: "شیریں کے شہر" میں نے جواب دیا

"یہ شیریں کون ہے؟" اس نے سوال کیا

"یہ بھی ایک داستان ہے، پھر کبھی سناؤں گا۔"

اور پھر ایک رات جب ہم سونے لگے، تو وہ بولا: "وہ شیریں والی داستان۔ تمہیں یاد ہے نا، تم نے وعدہ کیا تھا۔"

"اچھا، مگر سو مت جانا۔"

"میں ہنکاری بھرتا رہوں گا۔" اس نے یقین دلایا

"تو سنو:" میں نے کہا "ایک تھی شیریں"

"ہوں۔"

"ایک تھی شیریں،
ایک تھا کوہکن . . . . ."

"ہوں۔"

"ایک تھی شیریں،
ایک تھا کوہکن ،
اک پہاڑ . . . ."

"ایک تھی شیریں، ایک تھا کوہکن، ایک پہاڑ —" اس نے دہرایا

"ایک تھا کوہکن
ایک پہاڑ . . . ."

"یہ شیریں کہاں چلی گئی؟" اس نے سوال کیا

"دیکھو بیچ میں مت ٹوکو۔" میں نے جھلا کر کہا

"اچھا اب نہیں ٹوکوں گا۔" اس نے وعدہ کیا

"ایک تھا کوہکن ،
ایک تھا تیشہ ،
اک پہاڑ . . . . ." میں نے داستان جاری رکھی۔

"ہونہہ ۔"

"ایک تھا تیشہ ،
اک پہاڑ . . . . ."

اس بار اس نے ہنکاری نہیں بھری، شاید وہ سو گیا تھا۔ مجھے بھی نیند آنے لگی تھی۔

ایک تھا تیشہ۔
ایک تھا تیشہ
ایک تھا تیشہ
"ٹھک ٹھک۔ ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔ ٹھک ٹھک . . . ."

اس کے چند روز بعد ایک دن جب اُس سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش نظر آرہا تھا: "سنو یار، آج میں نے بہت لمبی سیر کی ہے۔ یہ اس دریا کے ساتھ ساتھ —" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"اچھا؟"

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا اور رک گیا اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا: جوں جوں میں چلتا گیا۔ اس کا پانی شفاف ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک جگہ مجھے اپنی روح کا عکس نظر آنے لگا . . . . ."

"اور جسم کا عکس؟" میں نے اسے ٹوک دیا۔

"پتہ نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن یہاں تو یہ دریا . . ." میں کچھ کہتے کہتے رک گیا

"ہاں، یہی تو اس کا المیہ ہے۔" اس نے ایک لمبی سی سانس لے کر کہا اور خاموش ہو گیا۔

اُس رات وہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ اس کے جملے خاصے بے ربط تھے۔ کچھ دیر بعد وہ چونک کر جاگ گیا۔ اور آنکھیں ملتا ملتا مجھ سے بولا "جانتے ہو، خدا ہونے سے پہلے میں کیا تھا؟"

"اب سو جاؤ" میں نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ لیٹ گیا اور میں نے بتی بجھا دی لیکن اندھیرے میں مجھے ایسا لگا جیسے وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ میں نے غور سے سنا۔ وہ پھر بڑبڑا رہا تھا۔

ایک بحر بے کراں۔

افق تا افق
اک ردائے نیلگوں
فلک در فلک
ایک نغمہ، ایک گیت
عرش تا فرش، فلک در فلک، افق تا افق . . . "

اس کے بعد وہ کافی دنوں تک نظر نہ آیا۔ میں نے کئی دفعہ اُسے ڈھونڈھنے کی کوشش بھی کی مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر ایک روز جب میں سو کر اٹھا، تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کمرے میں بیٹھا ہے۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ وہی تھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے، اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"کہاں رہے اتنے روز ؟" میں نے گلہ کیا

"شیریں کے شہر گیا تھا۔"

"شیریں کے شہر !" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں" اس نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور بات بدلنے کی غرض سے بولا۔ "سنا تم نے ! آج رات انسان کو چاند پر اتارنے کے لئے راکٹ داغا جائے گا۔"

اس نے کوئی توجہ نہ دی اور خاموش رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بولا "ایک روز ایک منادی والا یہاں آیا تھا۔"

"اچھا ؟"

"ہاں" وہ بولا، اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اور جیسا کہ ان منادی والوں کا دستور ہے، یہاں اس کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر وہ ہانک لگانے لگا۔

"سنئے جناب والا۔ کیا کہتا ہے منادی والا . . . "

اس نے بالکل منادی والے کی نقل اتارنی شروع کر دی۔

"منادی سُننا غور سے، پھر بات کرنا کسی اور سے

ہاں تو، صاحبان، آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی۔

کہ آج شام شیریں کے شہر میں فرہاد کو

نیلام کیا جائے گا۔ مال کو موقعے پر آکر

دیکھئے، اور پرکھئے اور بولی دے کر ثواب کمایئے۔"

— وہ کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر کہنے لگا۔ "ہاں تو، میں اس منادی والے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ سارا شہر گھومنے کے بعد جب وہ واپس جانے کے لئے دریا پار کر کے اس پار پہونچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ ریت یوں چمک رہی تھی جیسے کسی نے سورج کو ریزہ ریزہ کر کے اسے زمین پر بکھیر دیا ہو۔ پیاس کے مارے حلق سوکھا جا رہا تھا اور پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ میرا رہبر میری موجودگی سے بے خبر اپنی راہ چلا جا رہا تھا اور میں گرتا پڑتا اس کا دامن تھامے اس کے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ جب وہ اپنے جوتے میں سے ریت نکالنے کے لئے رکا تو میں اس کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"وہ شہر۔ اب کتنے کوس باقی ہے ؟" میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔

"تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہاں فاصلے کوسوں میں نہیں ناپے جاتے ؟" اس نے درشتی سے جواب دیا۔

"خیر، تو اتنا بتا دو ہم کتنی دیر میں وہاں پہونچ جائیں گے ؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم کتنی دیر میں وہاں پہونچنا چاہتے ہو" اس نے جواب دیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد گویا اس کا مخاطب میں نہیں وہ خود تھا بولا "اور اس پر کہ تم وہاں پہونچنا چاہتے بھی ہو، یا نہیں۔ کئی لوگ منزل پر پہونچ کر بھی واپس مڑ جاتے ہیں۔"

"ممکن ہے وہ منزل کی تاب نہ لا سکتے ہوں" میں نے نیم استفسار کے لہجے میں کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چلتا رہا۔ اب دُور حدِ نگاہ پر شہر کے مینار دکھائی دینے لگے تھے اور اُن کے پس منظر میں افق تھا — سرخ، بھیانک، زمین کو چومتا ہوا سا۔

"دیدۂ مرگ" میرے منہ سے بے اختیار نکلا

"کیا کہا ؟" وہ بولا

"کچھ نہیں — سنو تو، یہ ٹھک ٹھک کی آواز کہاں سے آ رہی ہے ؟" میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

اس نے جواب دینے کی بجائے اپنی رفتار تیز کر دی۔

شہر کے قریب پہونچ کر میں نے دیکھا کہ فصیل کے باہر لوگوں کا ایک جم غفیر اُمڈا چلا آ رہا ہے فصیل کے اوپر ایک چبوترہ سا بنا تھا جس پر ایک شخص کھڑا تھا۔

"کیا یہی وہ شخص ہے جس کی نیلامی ہوگی ؟" میں نے پوچھا

"ہاں" اس نے کہا اور تیزی سے چلتا ہوا اس ہجوم میں غائب ہو گیا۔ فصیل کے نیچے میدان میں ایک بہت بڑی تختی لگی تھی، جس پر مختلف انسانی اعضا

کی شکلیں بنی تھیں، اور ان کے سامنے اس عضو کو خریدنے والے کی طرف سے دی گئی بولی درج تھی۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ پیش کش لاکھوں روپے کی تھی۔ ہاں، البتہ روح کا خانہ خالی تھا۔ اس کے لئے کوئی پیش کش نہ تھی۔

میں نے شہر کا رخ کیا۔ شہر بالکل سنسان پڑا تھا۔ کیونکہ سب لوگ باہر نیلامی پر گئے ہوئے تھے۔ صدر دروازے کے پاس ہی ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے باہر ایک بوڑھا چوکیدار اونگھ رہا تھا۔

عمارت کے اندر بہت سی کلیں رکھی تھیں۔

'یہ کیا ہے ؟' میں نے پوچھا

'اس نے شاید میرا سوال نہیں سنا، اور مجھے اس کل کی طرف لے گیا۔ جس میں ہاتھ جتے تھے۔ وہ مٹھی کھولتے اور بند کرتے رہتے تھے اور جب مٹھی کھلتی تو چند سکے نیچے زمین پر گرجاتے۔

'یہ کیا ہے ؟' میں نے پھر پوچھا — اس نے شاید پھر میرا سوال نہیں سنا اور پھر مجھے لے کر آگے بڑھ گیا۔ جہاں زبان جتی تھی — الفاظ ہی الفاظ — ہر زبان میں، ہر لہجے میں، ہر آواز میں۔

"یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے ؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ جہاں ایک اور کل تھی۔۔

اور ایک اور ..... اور ایک اور ....

میں عمارت سے نکل آیا۔

شہر کے دروازے پر وہی منادی والا میری راہ تک رہا تھا۔

'میرا خیال تھا تم یہیں ہوگے۔' اس نے کہا۔

'ہاں، لیکن یہ تو بتاؤ — یہاں شیریں کے شہر میں — روح —؟

'تو پھر تیشہ کون چلائے گا۔؟' اس کو اس سوال کی جیسے پہلے سے ہی توقع تھی —

'تیشہ ؟ لیکن کیوں ؟'

کہتے ہیں پہاڑی کے اس طرف دودھ کا دریا ہے اس نے جواب دیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر فصیل کی طرف چل پڑا۔

ہمارے نیچے پہونچنے تک بولی شروع ہو چکی تھی اور سب لوگ نیچے میدان میں جمع تھے وہ منادی والا ان میں شامل ہو گیا۔

'پچیس روپے'

'چھبیس روپے'

'ستائیس روپے'

میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ چبوترے پر اکیلا کھڑا تھا۔ موقع غنیمت جان کر میں اس کے پاس جا پہونچا اور اس کے کان میں کہا 'تم باز نہیں آئے نا، میرے اتنا منع کرنے کے باوجود یہاں آپہونچے ہو۔" میں نے اسے ملامت کی —

اور کیا کرتا، اس نے جواب دیا۔ 'میرا مقدر یہی ہے۔

'لیکن ایک بات ضرور ہے دوست۔ ہو بڑے خوش قسمت۔ تمہاری قیمت لاکھوں روپے لگ چکی ہے۔ میں خود حساب لگا کر آیا ہوں" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

'تمہیں سخت دھوکا ہوا ہے؛ وہ بولا 'یہ قیمت میرے جسم کی ہے میری نہیں،'

نیچے نیلام جاری تھا۔ اٹھائیس روپے '۔ انتیس روپے ، انتیس روپے ایک ...' انتیس روپے دو ... ' انتیس روپے ...'

'تیس'

'تیس'

'تیس — تمام ہجوم بیک آواز پکارا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی'؟

صرف دور پہاڑی پر سے ٹھک ٹھک کی آواز برابر آرہی تھی۔

'یہ بولی تیس روپے پر کیوں رک گئی ؟' میں نے بالآخر پوچھا

'میں نے کہا تھا نا، تمہیں دھوکہ ہوا ہے'، وہ بولا، 'ابنِ آدم کی قیمت تو روزِ اول سے ہی تیس روپے مقرر ہو چکی ہے'

اس کے ساتھ ہی یکلخت سناٹا چھا گیا۔ ٹھک ٹھک کی آواز آنی بھی بند ہو گئی تھی۔ چند لمحے یہی عالم رہا۔ پھر یکایک ہجوم میں حرکت ہوئی اور وہ سب لوگ پہاڑی کی طرف بھاگ اٹھے۔ کچھ دیر بعد ایک جلوس ایک لاش کو اٹھائے نیچے میدان میں آکر رک گیا۔

لاش کو میدان میں رکھ کر وہ جلوس چبوترے پر آگیا۔ اور اس شخص کو ساتھ لے کر پھر پہاڑی کی طرف چل دیا۔ میں نیچے اتر آیا اور لاش کے سرہانے بیٹھ کر اس کے منہ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔

'ارے تم ؟' میرے منہ سے نکلا اور میری نظریں بے اختیار چبوترے کی طرف اٹھ گئیں لیکن جلوس اب پہاڑی پر پہونچ چکا تھا۔ اور تیشے کی آواز پھر سے سنائی دینے لگی تھی۔

۔۔ تب میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا ۔۔ '۔۔" اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔

" میرا خیال ہے کہ تم نے کوئی نہایت ہی بھیانک خواب دیکھا ہے" میں نے کہا: "اٹھو، منہ دھوؤ اور تیار ہو جاؤ ۔۔ آج انسان کو چاند پر اتارنے کے لئے راکٹ داغا جائے گا۔"

میں نے کھڑکی بند کر دی، وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے ایک کرسی کھینچی اور اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔

" انسان چاند پر اتر چکا ہے۔ نیچے نکڑ والی دکان پر سے ریڈیو نے اعلان کیا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بولا: "یہ کس کی آواز ہے؟ کیا منادی والا پھر آیا ہے؟"

" انسان چاند پر اتر چکا ہے" میں نے اسے بتایا اور ریڈیو آن کر دیا

وہ یکلخت اٹھا اور تیز تیز چلتے ہوئے جا کر کھڑکی کھول دی اور جھک کر نیچے گلی میں نہ جانے کس کو مخاطب کرتے ہوئے بولا: "سنا تم نے: انسان چاند پر اتر چکا ہے؟"

نیچے گلی میں ایک نیند بھری آواز: "سنتے ہو: انسان چاند پر اتر چکا ہے"

ایک ساتھ کئی آوازیں: "انسان چاند پر پہنچ گیا ہے۔"

ایک اور آواز (تمسخر بھرے لہجے میں) "انسان چاند پر پہنچ چکا ہے اب تمہارے خدا کا کیا ہوگا۔؟"

ایک دوسری (رقت بھری) آواز: "اس سے میرے اللہ کی عظمت، میرے کبریا کی کبریائی اور بڑھ گئی ہے۔"

میں نے ریڈیو آف کر دیا اور کھڑکی بند کرنے کے لئے آگے بڑھا مگر اس نے مجھے روک دیا اور کھڑکی میں جھک کر بولا۔ "انسان نے چاند کی سطح کو چھو لیا ہے۔"

ایک آواز: "بھلا، اب وہ وہاں کیا کر رہا ہوگا؟"

" میں بتاتا ہوں۔ وہ کیا کر رہا ہے" وہ بولا، اور کھڑکی میں اور نیچے جھک گیا ۔" اب وہ اپنے دائیں بائیں، اوپر نیچے دیکھ رہا ہے۔ آکاش وہاں نیلا نہیں، کالا سیاہ ہے۔ اب اس نے جھرجھری لی ہے شاید اسے سردی لگ رہی ہے۔ وہاں فضا نہیں ہے نا اس لئے وہاں سردی بہت زیادہ ہوتی ہے ۔۔" وہ بولتا چلا گیا جیسے آنکھوں دیکھا حال سنا رہا ہو ۔۔ دیکھو: اب وہ شخص کھڑا کچھ سوچ رہا ہے۔ اب اس نے ایک قدم اٹھایا ہے اور چاند کی سطح پر کچھ سوچ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ اسے اپنے قدموں کی چاپ کیوں سنائی نہیں دے رہی ہے۔ ۔۔ وہ دیکھو: جہاز میں بیٹھا دوسرا آدمی اسے پکار رہا ہے۔ مگر وہ اس کی آواز نہیں سنتا۔ وہاں کوئی کسی کو نہیں پکار سکتا، کوئی کسی کی آواز سے بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہاں اپنے قدموں کی چاپ تک سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے ۔۔ لیکن رکو: وہ دیکھو: ۔۔ جہاز کے اندر بیٹھے شخص نے اس کی کمر سے بندھی رسی کو جھٹک دیا ہے ۔۔ وہ شخص چونک کر جہاز کی طرف دیکھتا ہے اور اندر والے شخص کا اشارہ سمجھ کر جہاز کی طرف چل پڑا ہے۔ اب وہ جہاز میں بیٹھے شخص کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔

" یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے: ۔۔" میں غصے میں چلاتا ہوں۔ اور کھڑکی بند کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہوں مگر وہ دھکا دے کر مجھے پلنگ پر گرا دیتا ہے۔ اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور کھڑکی میں جھک کر نیچے گلی میں دیکھنے لگتا ہے۔

" . . . . . اب جہاز میں بیٹھے دوسرے شخص نے اس کے ہاتھ میں ایک تیشہ پکڑا دیا ہے اس نے تیشہ لے لیا ہے اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ ساتھی ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھا رہا ہے۔ اب وہ شخص تیشہ لے کر جہاز سے باہر نکل آیا ہے، اور سامنے پہاڑی کی طرف چل دیا ہے ۔۔ اب وہ پہاڑی کے دامن میں پہنچ گیا ہے، مگر رکتا نہیں۔ وہ چلتا چلا جا رہا ہے، بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔۔ کیونکہ ۔۔ کیونکہ ۔۔ "

"کیونکہ کیا؟" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل جاتا ہے۔

" ۔۔ کیونکہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہاں اس پہاڑی کے پیچھے کیا واقعی دودھ کا دریا ہے ۔۔ "

۔۔ وہ یکایک خاموش ہو جاتا ہے، اور میں حیرت اور خوف سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہوں ۔۔ وہ کھڑکی میں اور نیچے جھک جاتا ہے، اور اس کی آواز ایک بار پھر سارے ماحول پر چھانے لگتی ہے . . . .

. . . . " اب جہاز کے اندر بیٹھا آدمی پریشان ہو اٹھا ہے . . . . . . اور ۔۔ اور ۔۔ اس نے پھر رسی کو جھٹک دیا ہے۔ وہ شخص ٹھٹک

کر پہاڑی سے نیچے آگیا ہے ــــ اب اس نے تیشہ اٹھالیا ہے ــ اور اسے پوری قوت سے ایک پہاڑی پر دے مارا ہے ــ مگر تیشہ گنگ ہے ــ اس کی کوئی آواز نہیں آتی ــــ یہاں قدموں کی چاپ نہیں ـ کوئی کسی کو پکارتا نہیں ، تیشے کی ٹھک ٹھک بھی نہیں ـ اب اس نے پتھر اٹھاکر جھولے میں ڈال لیے ہیں ـ اور جہاز کی طرف بڑھ گیا ہے ـ ـ ـ ـ"

جونہی وہ سانس لینے کے لیے رکتا ہے ، میں کھٹاک سے کھڑکی بند کردیتا ہوں نیچے گلی میں شور سا ہونے لگتا ہے ـ

" سنتے نہیں ہو ! شاید نیچے منادی والا آیا ہے " وہ خفگی سے کہتا ہے اور زبردستی کھڑکی کھول دیتا ہے ــــ " دیکھو ، اب راکٹ داغ دیا گیا ہے ــــ " وہ نیچے جھک کر گلی میں کہتا ہے ـــ اور جہاز چاند کی سطح سے اوپر اٹھ گیا ہے اور خلا میں پہونچ گیا ہے ــــ چاند اب دور ، دور بہت دور پیچھے سمٹ رہا ہے ـ ـ ـ "

" اللہ ہوا ــ اللہ ہوا ــ " دور پہاڑی کی طرف سے ایک آواز آتی ہے ـ

" ہا ! ہا ! ہا ! " ایک قہقہہ سنائی دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مجمع کے بکھرنے کی آواز آنے لگتی ہے ــ لیکن وہ بولتا چلا جا رہا ہے ــ " ارے دیکھو ! ــــ اب جہاز کی کھڑکی کھل گئی ہے ، اور وہ شخص اس میں سے نکل کر باہر خلا میں پھیل رہا ہے ـ چند گز خلا میں چل کر اس نے یک لخت وہ رسی جو اسے جہاز سے منسلک کیے ہوئے تھی ، توڑ دی ہے ـ جہاز کی تمام بتیاں یک دم جل اٹھی ہیں لیکن جہاز اب بہت آگے نکل گیا ہے اور دھیرے دھیرے نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے ــــ اب وہ شخص خلا میں تیر رہا ہے ــــ اکیلا ــ تنہا ــ " یکایک گلی میں شور سا اٹھنے لگتا ہے ــ وہ کھڑکی میں بہت نیچے جھک گیا ہے ــ اور اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی ہے ــ بہت ہی دھیمی ــ وہ کہہ رہا ہے ـ ـ ـ " وہ بالکل اکیلا ہے ـ بالکل تنہا ــ تمام کائنات میں صرف ایک وہ ــــ ایک انسان تمام کائنات میں پھیلا ہوا ــ افق تا افق ، فلک در فلک ــ عرش تا فرش ـ ـ ـ ـ "

ــــ نیچے گلی میں شور بہت بلند ہوگیا ہے اور پھر یک لخت سناٹا چھا جاتا ہے ـ

++++++++++++++++++++

خاندانی منصوبہ بندی

راز الہ آبادی

جس کو دیکھو اس کے دل میں خواہشِ اولاد ہے
کون ہے جو اس تمنا سے یہاں آزاد ہے
ہر مصیبت کی غم اولاد ہی بنیاد ہے
اور اس غم کی نہ کچھ حد ہے نہ کچھ میعاد ہے
بنگئی ہے یہ تمنا ہی تمنائے حیات
جیسے ہو بچوں کی پیدائش ہی منشائے حیات
بے تحاشا پے بہ پے شام و سحر اولاد ہو
جس طرف بھی گھر میں اٹھ جائے نظر اولاد ہو
کم ہے ارمانوں سے گویا جس قدر اولاد ہو
چاہے فاقے کرنے پڑ جائیں مگر اولاد ہو
پیٹ خالی جسم پر پیوند ہی پیوند ہیں :
بچے پیدا ہو رہے ہیں اور آنکھیں بند ہیں
باپ کا منشا ہے ہر لڑکا بنے انجینئر
ماں کی مرضی ہے بنائے لڑکیوں کو ڈاکٹر
الغرض تعلیم میں کوئی نہ رہ جائے کسر
اپنی لائن میں بنے ہر ایک بچہ نامور !
نام سے اولاد کے ماں باپ کی شہرت بڑھے
اپنے بنگلوں میں چرچا ہو سکے عزت بڑھے
دیکھتے ہیں کیسے کیسے خواب بیچارے نہ پوچھ
آہ پھرتے ہیں یہ کیسے در بدر مارے نہ پوچھ
کس طرح رہتے ہیں اُن کی جان سے پیارے نہ پوچھ
بھوک سے روتے ہیں کیسے آنکھ کے تارے نہ پوچھ
فوج ہے بچوں کی لیکن پیٹ بھر روٹی نہیں
جسم پر کرتا نہیں ، ٹوپی نہیں ، دھوتی نہیں
پیٹ بھر کھانا تو دیتے ایک دو بچوں کو ہم
ڈھانک سکتے ان غریبوں کا بدن تو کم سے کم
بچے کم ہوتے تو کم ہو جاتے کچھ تو اپنے غم
رات دن کی الجھنوں سے ناک میں آتا نہ دم
دین دنیا کا نہ رکھا کثرتِ اولاد نے
زندہ ہم کو مار ڈالا کثرتِ اولاد نے

جون ۱۹۷۰ء

مرزا فرحت اللہ بیگ
کا
ایک دلچسپ مضمون

رشید قریشی

مرزا فرحت اللہ بیگ اُردو کے صاحب طرز جدت پسند اور خیال آفریں مزاح نگار تھے۔ اُن کا ذوق مزاح ایک ایسا سرچشمہ تھا جس کو ان کی طبیعت کی جولانیاں ہر وقت لہروں سے آباد رکھتی تھیں۔ ۱۹۳۶ء میں وہ سیشن جج گلبرگہ تھے۔ ایڈیٹر نظام گزٹ (ہفتہ وار) کے اصرار پر انہوں نے "سفر زیر دفعہ ۱۸۰ ضابطہ ملازمت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون متذکرہ ہفتہ وار کی ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

خدا بخشے سابق حکومت حیدرآباد اپنے ملازمین کے تعلق سے جہاں روادارانہ فیاض تھی، وہیں ملازمین کی طرف سے تنقید یا تضحیک کے معاملے میں بہت حسّاس اور سخت گیر بھی تھی۔ ضابطہ ملازمت کے دفعہ ۱۸۰ کے تحت ہر ملازم سرکار کو حج و زیارت کے لیے چھ ماہ کی رخصت خاص بہ عطائے سالم ماہوار پیشگی دی جا سکتی تھی۔ اس زمانے کے سفر کی دشواریوں اور وسائل سفر کی سست رفتاریوں کے پیش نظر یہ مدت مناسب اور ضروری تھی اور اس میں زاد راہ کے لیے رقم کی بہم رسانی بھی مضمر تھی لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری کو حالات سفر قلم بند کرنے کی تحریک ہوئی تو اپنے مضمون کی تمہید کے لیے انہوں نے اس دفعہ کو زیب داستان بنانے کے لیے منتخب کیا۔ ظاہر ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی نیت اس دفعہ کا مضحکہ اڑانے پر مائل نہیں تھی اور اصل بات یہ تھی کہ وہ پوری صاف دلی سے اپنے مضمون کو ایک مناسب آغاز دینے کی خاطر جس کا اُن کے سفر سے بھی تعلق تھا، اس دفعہ کو استعمال کرنے پر مجبور سے تھے۔ خود ان کی طرز نگارش کہہ رہی ہے کہ وہ صرف ایک شگفتہ کیفیت پیدا کرنا چاہتے تھے جو اس دفعہ سے منسوب تو ہے لیکن منسلک نہیں۔

یہ مضمون سررشتہ معلومات عامہ حکومت حیدرآباد کی نظر احتساب سے گزرا اور اس کا تراشہ معتمد صاحب عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ اس وقت نواب ذوالقدر جنگ بہادر اس عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے مراسلے کی پشت پر یہ حکم صادر فرمایا۔

"میں نے مضمون منسلکہ دیکھا نہایت نامناسب اور بازاری طرز کی عبارت ہے۔ ہائی کورٹ کو خاص طور پر توجہ دلائی جائے کہ اُن کی معقول تنبیہ ہونی چاہیے۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ آئندہ اس قسم کے مضامین شائع کرنے سے احتراز کریں۔"

حسب الحکم معتمد صاحب عدالت العالیہ سرکار عالی کے نام ہدایت جاری ہوئی۔

مراسلے کے مسودے پر مددگار معتمد (جناب غلام پنجتن صاحب) نے اس ہدایت کا اضافہ کیا "دو روز انتظار کرکے جواب طلب کیا جائے۔"

مجلس عدالت عالیہ سرکار عالی نے معتمد صاحب کوتوالی و امور عامہ



مرزا فرحت اللہ بیگ

سرکارِ عالی کو جواب ارسال کیا کہ تنبیہ کر دی گئی۔

اس تنبیہہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ بہت محتاط ہو گئے، اور فکر و خیال کی روانیوں کو بندشوں کا پابند کر دیا۔ حالات اور واقعات کو اپنا موضوع بنانے کی بجائے انہوں نے خالص ادب اور قدیم تاریخ کو اپنی صلاحیتوں کی آماجگاہ بنا لیا اور اس طرح ہمارا مزاحیہ ادب کئی دلچسپ خاکوں اور مسکراتی تحریروں سے محروم رہ گیا۔

اس مضمون کی نقل قارئین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل ہے۔ مضمون کے آخر میں باقی آئندہ درج ہے مگر اس کی نوبت کبھی نہ آئی۔

سفر زیر دفعہ ۱۸۰ ضابطہ ملازمت

از

مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب برائے سشن جج گلبرگہ شریف

اُردو کا ایک مشہور شعر ہے ؎

رات بھر خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

اس شعر کو نہ حقیقت سے تعلق ہے اور نہ مجاز سے بلکہ یہ دفعہ ۱۸۰ ضابطہ ملازمت کی توضیح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس دفعہ سے فائدہ اٹھایا تھا مضمون اچھا ہاتھ آگیا نظم کر دیا۔ دفعہ مذکور حسب ذیل ہے۔

"ہر ملازم سرکاری کو ۶ ماہ کی رخصت خاص بغرض حج و زیارت بعطائے سالم ماہوار پیشگی دی جا سکے گی۔" ظاہر ہے کہ وہ کونسا حج اور کونسی زیارت ہے جس میں ۶ مہینے لگیں اس لئے ہوتا یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے تو ملازمت کی تھکن اتارنے ولایت جاتے ہیں۔ وہاں رنگ رلیاں مناتے ہیں اور واپسی میں دو ایک درگاہوں میں بھی جھانک آتے ہیں اب اس مضمون کو اوپر والے شعر سے ملا کر دیکھئے کہ میرا کہنا سچ ہے یا جھوٹ۔

جب ضابطہ ملازمت نے دلچسپی کی ایسی راہیں کھول دی ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اس سے فائدہ اٹھائیں اور میں نہ اٹھاؤں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہاں کمانے والا ایک ہے اور کھانے والے بہت ہیں۔ بیوی کا ہونا تو ہر بھلے آدمی کے لئے ضروری ہے اور رہے بچے تو اس اتصال سے ان کا عدم سے وجود میں آنا ایک لازمی امر ہے۔ امیر تو گہرے دریا ہوتے ہیں اس لئے شاخیں کم نکلتی ہیں اب رہے غریب تو ان کے ہاں نیستی میں آٹا گیلا ہوتا ہے۔ اس سے ان پایاب دریاؤں کی اتنی شاخیں نکلتی ہیں کہ خود ان کا پانی خشک ہو جاتا ہے۔ غرض میرے لئے دو مصیبتیں تھیں ایک بیوی کی اجازت دوسرے گھر اور ولایت کے دوہرے اخراجات کا انتظام۔ مگر یہ کام دو برسوں کی محنت اور خوشامد سے کسی نہ کسی طرح آسان کر دیا۔ پہلے تو میں نے روز بیوی سے آ کر کام کی زیادتی اور صحت کی خرابی کا ذکر شروع کیا اور رفتہ رفتہ اُن کو یقین ہو گیا کہ بیوہ بننے میں تھوڑی کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس کے بعد اس بیماری کے سلسلہ میں علاج کا سلسلہ ملا دیا اور سینکڑوں ڈاکٹروں کی رائے کا حوالہ دے کر ثابت کر دیا کہ یہ مرض صرف ولایت جانے سے دفع ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ تم ولایت جاؤ گے تو ہم کھائیں گے کیا؟ جس کے یہ معنی ہوئے کہ تم مر گئے تو گزارہ ممکن ہے لیکن اگر ولایت گئے تو کسی طرح ہمارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا "بیگم پہلے پچاس ملتے تھے جب گھر چلتا تھا۔ پھر سو ہوئے جب گھر چلا۔ اب تین سو مل رہے ہیں اور گھر میں وہی برکت ہی برکت ہے۔ دنیا اُلٹی ترقی کر رہی ہے۔ انسان کپڑوں کا ڈھکوسلا پھینک کر صحیح معنوں میں حضرت آدم کی اولاد بن رہے ہیں۔ کھانے پینے میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ بناسپتی کھانے اور ٹھنڈا پانی پینے پر اُتر آئے ہیں۔ تم بھی تھوڑے دن اسی الٹی گنگا میں تیرو اور بجائے تین سو کے پچاس ہی میں گزارہ کرو۔ تمہارے اس ایثار سے ایک غریب کی جان بچ جائے گی۔" بھلا ایسی صاف اور صحیح منطق بیوی صاحبہ کی سمجھ میں کب آسکتی تھی فرمانے لگیں کہ "جی ہاں۔ پچاس میں گزارہ ہوتا تھا مگر تھے کون میں اور تم۔ خود ہی تو ان بچوں کی مصیبت تم نے مول لی اور خود ہی اب کہتے ہو کہ اس پچاس روپے میں سارا مہینہ کاٹو"۔ اس روز میں نے اس سلسلہ کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا چند روز کے بعد پچاس میں پچیس کا اضافہ کر کے پھر پیش کئے۔ یہ تجویز بھی نہایت سختی کے ساتھ نامنظور ہوئی۔ اس کے بعد سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ پچیس کا اور اضافہ کیا جائے اور اس کے ساتھ دہلی دکھانے کا بھی وعدہ کیا جائے۔ یہ منتر چل گیا اور بالآخر صلح نامہ کی یہ شرائط طے پائیں کہ بیوی صاحبہ اپنی لڑکا سے کے ساتھ دہلی کی سیر کریں اور یہ کمترین ولایت کے مزے اُڑائے اور واپسی میں مصر اور شام کی زیارتیں کر کے اور پکا مسلمان بن کر "کنج قفس ملازمت" میں پھر داخل ہو جائے۔

جب اس مشکل سے خدا نے نجات دی تو رخصت حاصل کرنے کی کارروائی شروع ہوئی۔ درخواست دی گئی۔ ڈاکٹری سرٹیفکٹ اور پاسپورٹ حاصل کئے گئے۔ یورپ کے تمام ملکوں کے علاوہ مصر، عراق، حجاز، شام، ایران غرض جتنے مم

ملک خیال میں آسکتے تھے سب پاسپورٹ میں درج کیے گئے۔ اتنا روپیہ تو تھا۔ ہی نہیں کہ نئے کپڑے بنوائے جاتے۔ اس نے شادی کی دو شیروانیاں نکالی گئیں۔ ایک جامہ وار کی تھی اور دوسری کم خواب کی۔ پولسن کے ہاں سے جرابیں جوتے رومال ٹوپیاں، سیفٹی ریزر برش، کنگھا، صابن، ڈرایرز، اونی بنیان سویٹر الا، بلا غرض کوئی سو ڈیڑھ سو کا سامان لایا گیا۔ لیکن اس کا خیال رکھا گیا کہ اس کو ولایت جانے کی اطلاع نہ ہو اور رقم کی ادائیگی ہماری واپسی پر منحصر رہے۔ پرانے دو سوٹ کشتیا درزی سے درست کرائے اور ایکسلسیر کمپنی میں پریس کرائے گئے۔ رخصت منظور ہوگئی چھ ماہ کی پیشگی تنخواہ مبلغ اٹھارہ سو روپے مل گئے۔ اس میں سے چھ سو روپے بیوی کے حوالے کرکے ان کو معہ بال بچوں کے دہلی پارسل کر دیا گیا۔ باقی بچے بارہ سو روپے جس کو یاروں سے تین سو روپے قرضہ لے کر پندرہ سو کیا گیا۔ کک اینڈ کمپنی سے پی اینڈ او کا ٹورسٹ ٹکٹ بذریعہ رگھوناتھ مل بنکر خریدا۔ باقی روپے کے سرکلر نوٹ بنوائے اور ایک جولائی کو پونے چھ بجے شام کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوئے۔

بمبئی بہت لوگوں کی دیکھی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کا حال لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف دو روز رہ کر جہاز میں سوار ہوئے اور ہندستان کو دور ہی سے سلام کرتے ہوئے ولایت کا رخ کیا۔ جہاز میں خود ہم پر کیا گزری اس کی اگر صراحت کی جائے تو یہ سفرنامہ حکیم جی کا مطب ہو جائے۔ اس کا حال میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ کیفیت میری انتڑیوں، معدے اور حلق سے پوچھو کئی روز تک اوع، اوع، اوع، اوع کا وظیفہ صبح سے شام تک پڑھنا پڑا۔ جب کہیں جا کر اس مصیبت سے نجات ملی۔

ٹورسٹ کلاس انگریزی لفظ ہونے سے تو بہت بھاری بھرکم ہوتا ہے لیکن عملاً دیکھا جائے تو وہی تھرڈ کلاس ہے۔ ریل کے تھرڈ کلاس میں ایک سہولت ہوتی ہے کہ اس میں جتنے لوگ بیٹھتے ہیں وہ سب سمجھتے ہیں کہ ہم تھرڈ کلاس آدمی ہیں۔ مگر جہاز میں یہ آفت ہے کہ صاحب لوگ سفر تو کرتے ہیں تھرڈ کلاس میں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں فرسٹ کلاس۔ مرغیوں کے ڈربے میں بند ہو کر گردن اس لئے اتنی اونچی کیے رہتے ہیں کہ مرغ نہیں شتر مرغ معلوم ہوں۔ خدا کسی ہندوستانی پر پی اینڈ او میں سفر کرنے کی مصیبت نہ ڈالے۔ بات کرنا اور ملنا ملانا تو کجا قریب میں کرسی بچھانے کی رواداری تک برتی نہیں جاتی۔ اگر خدانخواستہ آپ نے اپنی کرسی کسی صاحب بہادر کے پاس بچھا دی تو یقین رکھیے کہ وہ آپ کے بیٹھنے سے پہلے اپنی کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ غرض بندر سوئز تک پہونچنے میں جو قلبی تکلیفیں مجھے پہونچی ہیں، وہ بیان نہیں ہو سکتیں۔ ایک دن خیال آیا کہ ان واقعات کا ایک خط ٹائمز آف انڈیا کو لکھ کر سمندر میں کود پڑوں۔ سارا دن اسی سوچ میں گزرا کاغذ پنسل لے کر اپنی ملازمت کا حساب کیا اور یہ حساب کیا کہ اگر میں اس وقت ڈوب مرا تو بیوی بچوں کو کیا پنشن ملے گی۔ مگر پنشن کی کمی اور بال بچوں کی زیادتی نے ہمت توڑ دی اور "با ہمہ مرداں بباید ساخت" پر عمل کرنا پڑا۔ سوئز کے بعد سے ذرا جہاز کی اس ہوا میں تبدیلی ہوئی۔ کبھی کبھار کسی صاحب نے ذرا سیدھے منہ بات بھی کر لی۔ کوئی کھوسٹ میم صاحب ہم کو دیکھ کر ذرا مسکرا بھی دیں۔ کرسیاں پاس سے اٹھنی ذرا موقوف ہوئیں اور بالآخر ہمارے حقوق میں یہاں تک توسیع ہوگئی کہ ڈک کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس "اعلیٰ طبقہ بنی نوع انسان" کا ناچ بھی دیکھنے لگے۔ ہاں صرف ایک صاحب بہادر اسی طرح "فرنٹ" رہے۔ یہ صاحب یوپی میں کسی جگہ "ملازم درجہ اعلیٰ" تھے۔ اب پنشن لے کر گھر جا رہے تھے۔ بیوی مر چکی تھیں (اور ان کو مرنا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ ایسے شخص کے ساتھ رہ کر کوئی جی کیسے سکتا ہے۔) دو لڑکیاں ساتھ تھیں بڑی تیز و طرار تھیں۔ ہر وقت ادھر ادھر خاوند کی تلاش میں ٹہلا کرتی، پھرتی تھیں۔ کئی صاحب بہادروں پر ڈورے بھی ڈالے مگر کانٹا خالی آیا۔ ان دونوں کی نگرانی پر ایک "عمر دراز" آیا مقرر تھی۔ آگرے کی رہنے والی تھی۔ اسی بے چاری کی وجہ سے اب تک یہ کمترین بقید حیات ہے اور یہ مضمون لکھ رہا ہے ورنہ میرے "داخل فی الجنہ" ہونے میں ذرا کسر باقی نہیں رہی تھی۔ یہ آیا بھی صاحب بہادر کے بہت خلاف تھی۔ کہا کرتی تھی کہ "صاحب، خدا اس بڈھے کا نوکر نہ کرے ہم لوگوں کو تو یہ آدمی سمجھتا ہی نہیں۔ پندرہ روپے تنخواہ دے کر جانتا ہے کہ گویا مجھے خرید لیا ہے۔ ان بچیوں کی محبت ہے جو اس کے ہاں پڑی ہوں ورنہ میں تو کبھی کی لعنت بھیج کر اس کے گھر سے رخصت ہوگئی ہوتی۔" اس کی میم صاحب بڑی اچھی بیوی تھی۔ ہندوستانی بیویوں سے اس طرح ملتی

کہا جاتا ہے کہ عربوں کے سوا عین کی آواز اور کوئی قوم صحیح طور پر حلق سے نہیں نکال سکتی۔ اگر جہاز پر کوئی آ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے کہ جہاز کے روانہ ہونے کے کئی دن بعد تک ہر قوم کا آدمی حرف عین کی آواز ایسی اچھی طرح حلق سے نکالتا ہے، کہ عرب بھی سن کر ششدر رہ جائیں۔

تھی گویا وہ اس کی بہنیں ہیں۔ یہ بات اس موٹے کو زہر لگتی تھی۔ کوئی دن نہ جاتا تھا جو لڑائی نہ ہوتی ہو آخر اس تکا فضیحتی (فضیحتی) سے بیچاری کو دق ہوگئی۔ اور مرگئی مجھ کو دیکھو میں نے اس کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس کے بچوں کو پالا۔ سارے گھر بار کو سنبھالا۔ بیوی کی حیثیت سے اس کی خدمت میں نے کی۔ مگر اس موٹے کے ذرا بھاویں نہیں۔ اب بھی جو ساتھ آئی ہوں تو ان لڑکیوں کی زبردستی سے ساتھ آئی ہوں۔ نہیں تو ہمارے صاحب تو وہ ہیں جو مجھے گنگا جی ہی میں ڈبو کر آتے ؛" اس بڑھیا کی باتیں ایسی مزیدار ہوتی تھیں کہ میں گھنٹوں بیٹھا سنتا اور مزے لیا کرتا تھا اور مزا کیوں نہ آتا۔ دوست کی بھلائی اور دشمن کی برائی سننے میں مزا آتا ہی ہے۔ سوئز سے گزرنے کے بعد جب مجھے معلوم ہوگیا کہ اب ہم آزادی کی دنیا میں ہیں تو میں نے بھی اُن صاحب کو دق کرنا شروع کیا۔ جہاں وہ اپنی کرسی پر آکر بیٹھے اور میں اپنی کرسی اُٹھا کر وہیں پہونچا۔ ادھر میں بیٹھا اور اُدھر وہ اُٹھے لیکن آخر جاتے کہاں ؟ میں بھی اُن کا ہمزاد بن گیا تھا یہ کہہ نہیں سکتے تھے کہ میں ایک ہندوستانی کے پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ یہ کہہ نہیں سکتے تھے کہ ہوا کھانے ڈیک پر نہ آئیں۔ آخر میں نے اُن کو زچ کر دیا۔ اور اُن کو مجبوراً ایک ہندوستانی کے پہلو میں بیٹھنا ہی پڑا۔ اس کے بعد میں نے اُن کی لڑکیوں سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کا ڈھنگ ڈالا، اُنھوں نے لڑکیوں کو ڈانٹا۔ بھلا لڑکیاں کب سننے والی تھیں اُن کو ضد ہوگئی میں صاحب بہادر کا ہمزاد بنا تھا وہ میرا سایہ بن گئیں۔ جہاں میں ڈیک پر آیا اور دونوں نے آکر گھیر لیا۔ بلا وجہ وہ قہقہے مارتیں کہ خدا کی پناہ۔ صاحب بہادر منہ سے تو کچھ نہیں کہتے تھے مگر دل میں قتل عمد یا خودکشی کا ضرور تدبیریں سوچتے ہونگے آخر ان سے نہ رہا گیا اور برنڈزی ہی پر اتر گئے ' چلو " خس کم جہاں پاک " اس کے بعد راستہ ذرا آرام سے گزرا اور سترھواں روز تھا کہ ہم نے لندن میں نزول اجلال فرمایا۔ یہاں ہم نے کنجوسی کو اپنا رہبر اور دعوتوں کو اپنا مشکل کشا بنایا۔ آج اس کے ہاں کھانا کھایا تو کل اس کے ہاں جانے پی۔ اگر کوئی اللہ کا نیک بندہ نہ پھنسا تو " آئی تو روزی نہیں تو روزہ " پر عمل کیا یعنی ایک وقت کے کھانے پر چوبیس گھنٹے گزار دیئے۔

میں نے لندن میں کیا کیا دیکھا اور کس طرح بیس دن گزارے اس کا ذکر میں یہاں نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس کا تعلق میرے پورے سفرنامے سے ہے جو عنقریب شائع ہونے والا ہے اور اس کو فروخت کرکے میں اپنے اخراجات سفر نکالنا چاہتا ہوں۔ نہ میں یورپ کے سفر کی کوئی تفصیل اس مضمون میں بیان کروں گا کیونکہ ان واقعات کا ابھی سے چھپوا دینا اپنے خریداروں کی تعداد کو کم کر دینا ہے۔ ہاں مختصر سے حالات لکھے دیتا ہوں تاکہ میرے سفرنامے کا اشتہار بھی ہوجائیں اور ایڈیٹر صاحب پر میرا احسان بھی رہے۔

جو لوگ یہ سوچ کر یورپ جاتے ہیں کہ وہاں آوارگی بہت ہے وہ سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہاں آوارگی مطلق نہیں ہے البتہ سوداگری بہت ہے اور ظاہر ہے کہ سودا وہی لوگ خرید سکتے ہیں جن کے پاس ٹکے ہوں۔ اس لئے ہم جیسوں کا بلا ٹکے پیسے یورپ کا تماشہ دیکھنے جانا سخت بے وقوفی اور واپس آکر یہ غل مچانا کہ یورپ میں آوارگی بہت ہے قطعاً سفید جھوٹ ہے۔ اب رہے پیسے والے تو ان کے لئے یورپ ہی کیا ساری دنیا آوارہ ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انگلستان کی عورتیں ہندوستانیوں کو منہ نہیں لگاتیں کیونکہ یہ گھر کے بھیدی ہیں۔ جانتی ہیں کہ یہ نالائق تھوڑے بہت روپے لے کر یہاں آجاتے ہیں اور خالی پیٹ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں لیکن یورپ کے دوسرے حصوں اور خاص کر فرانس میں ہر ہندوستانی " نواب " ہے چاہے جیب میں کوڑی اور کھانے کو رزق نہ ہو۔ فرانس کے مرد ہوں یا عورت وہ انھیں مٹکا مٹکا کر اور ہاتھ نچا نچا کر باتیں کرتے ہیں کہ مزا آجاتا ہے۔ پیرس پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ کسی غیر ملک میں جانا اور وہاں کی زبان نہ جاننا کیا مصیبت لاتا ہے۔ مگر میں نے بھی وہاں والوں کو ایسا سبق دیا ہے کہ تمام عمر یاد کریں گے میں نے سوچا کہ دنیا میں دو ہی میٹھی زبانیں ہیں۔ ایک فرانسیسی دوسری فارسی۔ فارسی میں جانتا ہوں۔ فرانسیسی نہیں جانتا۔ مٹھاس کے لحاظ سے گڑ اور شکر ایک ہی چیز ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ فارسی کو فرانسیسی میں منتقل نہ کیا جا سکے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ فرانسیسی میں ت۔ ل اور ب (t. l. b) کے سوا جو حرف کسی لفظ کے آخر میں آتا ہے۔ وہ آواز نہیں دیتا اس کے علاوہ فرانسیسی کے دو تین الفاظ مثلاً لا (la) لی (le) بھی یاد تھے۔ میں نے تمام چیزوں کو ملا کر ایک زبان بنالی اور اشاروں کی مدد سے پوری طرح ہر بات کو سمجھانے کے قابل ہوگیا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ مجھے کسی سے یہ کہنا ہے کہ میں بازار جاتا ہوں اس کی فارسی ہوتی " می روم بہ بازار " می کی " ی " روم کا " م " اور بازار کی " ر " گرا کر اس میں لا داخل کر دیا اب یہ فقرہ فرانسیسی میں اس طرح ہوا " رولا باز "

(بقیہ ص ۲۳ پر)

ردیال سنگھ

فنونِ حرب میں تحریرِ رمزی کا مقام



علم حربیات میں جہاں مختلف فنون سپہ گری اور صف آرائی اپنا جداگا
ومی مقام رکھتے ہیں وہاں فن تحریر رمزی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ جنگ
، اسلحات، جسمانی صلاحیت، ذہانت، حزم، استقلال اور جرأت کی ضرورت ہوتی
۔ فن تحریر رمزی حذاقت ذہنی اور ذکاوت طبع کی متقاضی ہے اور کہا
سکتا ہے کہ ایک حد تک اسی پر فتح و نصرت کا مدار ہے۔ شعبۂ مراسلہ رسانی
مراسلات اور پیغام رسانی کے وسائل میں ایک مسلّم نیز محکم ذریعہ اور تحفظ کا
من ہے۔ فن تحریر رمزی کی وضاحت میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ فنونِ حرب
ایسا درجہ رکھتا ہے جیسے جسم میں روح۔ اس فن کے اصولوں کے مطابق
ام کے متن کو کچھ متبادل علامتی تحریر کی وساطت سے اس طرح منتقل کیا
تا ہے کہ طرفین (افراد پیغام بھیجنے والا اور پیغام وصول کرنے والا) تحریر کے
بادی موضوعے پیش از وقت واقف ہونے کی وجہ لئے سمجھ لیں۔ ان اصولوں
مدے رمزی تحریر کو سطحی شکل میں از سر نو منتقل کیا جاتا ہے تاکہ خدانخواستہ
یہ تحریر دوران مراسلت دشمن کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس رمزی تحریر
مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

فن تحریر رمزی کا وجود، جیسا کہ قرائن سے پتہ چلتا ہے، یونان سے
شروع ہوا اور اس کے بعد کئی ارتقائی مدارج طے کرتا، مختلف اشکال و
ہیات میں ڈھلتا عہد جدید کے تکنیکی اور علمی دور میں کافی تقدم حاصل کر چکا
ہے۔ زمانہ قدیم میں تحریر رمزی کے علم کو اہل یونان نے
Cryptography "قرابطو غرافی" کا نام دیا، یہ اصطلاح
یونانی زبان کے دو ارکان حرفی سے مرکب ہے، ان ہر دو ارکان میں سے ایک
رکن "قرابطو" ہے جس کے معنی پوشیدہ یا نہاں کے ہیں اور دوسرا رکن
"غرافی" ہے جس سے مراد تحریر یا نگارش ہے۔ قرابطو غرافی ارباب علم و
فن میں کافی دلچسپی کا مرکز بنا رہا اور اسالیب تحریر کے مختلف ہیئتوں کو
قبول و رد کرتا، اصلاح و تقدم کے میدان میں برابر جاری و ساری رہا۔

تاریخی مراجع و شواہد سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ تحریر رمزی
کا علم قدیم ترین زمانے میں بھی مروج تھا چنانچہ کتاب مقدس بائبل کے
حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ اس فن کو محدود پیمانے پر اپنایا گیا تاکہ ملک
کے پوشیدہ فوجی ٹھکانوں اور خفیہ امور کو محفوظ رکھا جائے۔ تاہم اس
فن کے ناقص اور غیر مستحکم اصول اس کی کامیابی کے زیادہ دیر تک ضامن نہ
رہ سکے اور اسے ایک غیر یقینی امر تصور کرتے ہوئے اس سے ہاتھ کھینچ لیا گیا کیونکہ
تحریر کے انکشاف کے نتیجہ میں دشمن مستفید ہو کر ملک کو نیست و نابود کر دیتا اور
اس کی تخریبی کارروائیوں کا رخ عین ایسے مقامات ہی ہوتے جن کا ذکر تحریر میں
قلمبند ہوتا جبکہ یہ مقامات ایک ممتاز فوجی اہمیت رکھتے۔

علم تحریر رمزی کی تاریخی تحقیق سے متعلق یہ ذکر کیا جا سکتا ہے کہ قرابطو
غرافی" کے ابتدائی اور تشکیلی دور میں سب سے پہلے جس طریقے کا تتبع کیا گیا
اس کا نام "Scytale Method"
یعنی تحریر قضیبی تھا۔ اس اصطلاح کے ضمن میں یہ واضح ہو کہ یونانی زبان
میں "Skytale" کے معنی عصا یا چھڑی کے ہوتے ہیں چونکہ

پیغام کی تحریر چھڑی پر کاغذ کی بہت کم چوڑائی رکھنے والی دھجی پہ لکھ کر چھڑی پر دھجی لپیٹنے کے بعد عمل میں لائی جاتی تھی، اس لئے یہ اس طریق عمل کی مناسبت سے اس نام سے ہی پکارا جانے لگا۔ چنانچہ چھڑی پر منقش تحریر جسے ہم تحریر تقضیبی بھی کہتے ہیں، یونان کے مشہور سپہ سالار "سپارٹن" کے ہاتھوں معرض وجود میں آئی۔ سپارٹن کا وضع کیا ہوا یہ نظام مراسلت بہت مقبول ہوا اور مقدونیہ کے سپاہ سالار پیغام رسانی اور سراغ رسانی میں اس کا عام استعمال کرنے لگے۔ یہ طریقہ بہت کامیاب رہا اور اس نے کافی فروغ پایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس کی تحریر انکشاف کے عدم "لغزش" کی ضامن تھی اور تحریر کی دھجی دشمن کے ہاتھ لگنے پر بھی غیر مربوط متن کو کوئی نہ سمجھ پاتا۔

"تحریر تقضیبی" یا چھڑی کی تحریر کے لئے وضاحت کرتے ہوئے یقین کیا جا سکتا ہے کہ طریقہ تحریر کے لئے دو چھڑیاں جن کا طول اور قطر بالکل برابر ہوتا، تیار کی جاتیں۔ ایک چھڑی ہر وقت پیغام بھیجنے والے کے پاس رہتی اور اسی طول اور موٹائی کی دوسری چھڑی جس کو پیغام بھیجنا مقصود ہوتا، کے پاس جمع رہتی۔ کاغذ کی ایک مخصوص چوڑائی والی دھجی کو ڈنڈے یا چھڑی پر لپیٹ دیا جاتا اور لپیٹنے کے بعد اس پر تحریر عمل میں لائی جاتی۔ تحریر کو عمل میں لاتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھا جاتا کہ تحریر لمبائی کے رخ کی حالت پر ثبت ہو۔ پیغام کی تحریر مکمل ہو جانے پر دھجی کو چھڑی سے اتار لیا جاتا اور قاصد کے حوالے کر دیا جاتا۔ اس طرح دھجی کے ہر حصے عرض پر غیر مربوط الفاظ پائے جاتے جن سے بحیثیت انفرادی کچھ مفہوم نہ نکل پاتا تا آنکہ اس دھجی کو چھڑی پر دوبارہ لپیٹ کر ویسے ہی ترتیب نہ دیا جاتا۔

"قرابطوغرافی" کے لیے ہی ایک مروج طریق کار کے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ "ہسطیوث" نامی یونانی کو جو شاہ فارس کے دربار میں اچھے منصب پر فائز تھا۔ یونان میں مقیم اپنے داماد "ارسطا غورث" کو بغاوت بپا کرنے کی ہدایت جاری کرنے کے متعلق پیغام پہونچانا مطلوب تھا لہذا اس نے اس امر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ راز کہیں منکشف نہ ہو پائے، ایک ایسے غلام کا انتخاب کیا جو اس کا مخلص اور معتمد علیہ تھا۔ پس اس غلام کا سر منڈوا دیا گیا اور اس کے سر پہ منقوط پیغام تحریر کیا گیا اور بعد ازاں اسے بال بڑھانے کا حکم دیا حتیٰ کہ بال پوری لمبائی میں بڑھ گئے۔ چنانچہ جب غلام ارسطا غورث کے پاس پہنچا تو اس نے ہدایت کے مطابق اپنا سر منڈوانے اور بعد ازاں منقوط تحریر پڑھنے کی گزارش کی۔ تحریر پڑھتے ہی ارسطا غورث نے لشکر آرائی کر کے فارس پر حملہ کر دیا اور تھوڑی ہی مدت میں فارس قلمرو شے یونان کی تحویل میں آگیا۔

فن قرابطوغرافی مختلف مراحل طے کرتا نشو و نما کے کئی ایک مختلف اصولوں میں ڈھلتا رہا تا آنکہ اہل یونان نے اس فن کی تقدیم اور پیش رفت میں ایک اور اضافی پہلو پیدا کیا اور فن کی اس شاخ کو Transposition Encipherment یعنی تحریر منقلب کا نام دیا گیا۔ اس طریق کار کی رو سے حروف تہجی کو ایک مربع شکل میں بالترتیب جمع کیا جاتا ہے۔ مربع کے راسی اور افقی اضلاع کو پانچ سطور پہ منقسم کر دیا جاتا ہے اور ان سطور پر ایک سے لے کر پانچ تک عدد تحریر کر دیئے جاتے ہیں۔ جب کسی حرف تہجی کا عددی صورت میں انتقال مقصود ہوتا تو اس کی اعدادی صورت لکھدی جاتی، مثلاً انگریزی کا ایک حرف تہجی H تحریر کرنے کے لئے اس کی تحریر منقلب ۳۲ ہوگی۔ عدد ۳۲ کا کیسے تعین ہوا اس کی وضاحت کے ضمن میں بیان کیا جائے کہ حرف تہجی راسی ضلع میں تین عدد پہ واقع ہے اور افقی ضلع کی سطر کے عدد نمبر دو پر لہذا اس کی تحریر منقلب متبادل عدد ۳۲ ہوا کیونکہ حرف تہجی "H" ایسے مقام پر واقع ہے جہاں راسی ضلع کی سطر نمبر تین اور افقی ضلع کی سطر نمبر دو کا تقاطع عمل میں آتا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے، کہ جہاں وہ آپس میں ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں۔

تشریح کے لئے ذیل کی جدول ملاحظہ ہو:

	1	2	3	4	5
1	A	F	L	Q	V
2	B	G	M	R	W
3	C	H	N	S	X
4	D	I	O	T	Y
5	E	K	P	U	Z

تاہم سپارٹن کا طریق تحریر منقلب اس طریق مربعی سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھا کیوں کہ اس کے اپنے وضع کردہ اسلوب کے مطابق حروف تہجی کو بالترتیب لکھنے کی بجائے ان کا مقام بدل دیا جاتا جس کی بنا پہ یہ منفرد اصول، مروج تحریر منقلب سے بنیادی طور پر ایک مختلف حیثیت رکھتا اور اس میں کافی ذہنی کاوش درکار رہتی۔ بعد ازاں تحریر منقلب سے جس کے

روف تہجی کو متبادل اعداد میں بدل دیا جاتا، ایک نئی وضع اختیار
یف تہجی کے بالمقابل کچھ غامض اور مبہم علامات ایجاد کی گئیں جو
ارقام کی جگہ مختلف موضوعہ علامتوں یا اشکال کی مظہر تھیں۔ جب کبھی
ی عمل میں لانا ہوتی تو مطلوبہ متبادل اشکال یا علامت کا حسب
تخاب کیا جاتا اور اس طریق کار کے لیے - Substi
tutional Encipherm — یعنی تحریر متبادل
ع کیا گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اہل روم نے بھی فن قرالبطوغرافی میں کافی
بعد اس میں نمایاں تغیر پیدا کیا یہاں تک کہ حروف تہجی کے
نئے پیچیدہ متوازی حروف تہجی کی ایجاد پیغام کی تحریر رمزی
کافی ذہنی کاوش کے سبب زحمت ثابت ہوتی۔ کیونکہ اس
نقش کو سمجھنے کی لئے کافی دقت کے علاوہ بہت حد تک طویل
بار ہوتا۔ اہل روم کے سپہ سالاروں کی تحریر رمزی کے حل
منے میں متبادل رموز کو ذہن نشین کرنے کی خاطر کئی کئی راتیں گنوانی
ایک سطحی صلاحیت رکھنے والا دماغ ایسے دقیق عمل کا متحمل
تا۔

لکہ الیزبیتھ کے عہد حکومت میں نامور فلسفی، سائنسداں اور ماہر
، بیکن نے فن تحریر رمزی کو کافی عروج دیا۔ اور اس میں
ے نقاط کا اضافہ کیا۔ اس محقق کا وضع کردہ طریق ' CIPHER
ے مشہور ہوا۔ یہ اصطلاح عربی زبان کے کلمہ "صفر" کی تصحیف ہے لیکن
سلم ماہر تحاریر رمزی ہے اور فن میں ایک ممتاز ترین مقام رکھتا
کے مداحوں کا دعویٰ ہے کہ بیکن کے وضع کردہ اصول کے مطابق تحریر
حل کو آسانی سے نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ بیکن کے اس اسلوب نے
تحریر کی تخلیق کی جسے BILATERAL CIPHER
یعنی تحریر از دو اجی کا نام دیا گیا۔ اس
ے تحت طباعت کے ہر منفرد ٹھپے پر بیک وقت برابر دو حروف نقش
، ان ہر دو میں ایک جلی ہوتا ہے اور دوسرا خفی ہر دو بڑے اور
وف کے درمیان بہت کم فاصلہ ہونے کے سبب اس کی ہیئت
یں کیا جا سکتا۔ ذہنی کاوش کے علاوہ اس میں بینائی پر کافی بوجھ
اور بالآخر آنکھ بہت دیر تک تمیز نہ کرنے پہ تھک کر ناکام ثابت
ہوتی ہے " CYPHER " کی اصطلاح کا مترادف نام کتابت سرّی
بھی ہے۔ تحریر رمزی کا دوسرا عمل " DECIPHER " کہلاتا ہے
جسے "تحلیل تحریر رمزی" کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کی رُو سے غیر مرتبط اور غامض
تحریری ترکیبوں کو اصالت متن پر منتقل کیا جاتا ہے جس سے تفہیم اور ترتیب
بحال ہو جاتی ہے اور متن اپنی ہیئت اصلی میں قاری کے سامنے آجاتا ہے۔
یہ تمام کام ایک خودکار آلہ معرض عمل میں لاتا ہے جسے میشن ٹائپ ایکس
پکارتے ہیں اور یہ آلہ فوجی دفاعی مہموں میں انتہائی ممتاز حیثیت رکھتا
ہے اور فوجی نظام میں جان سے بھی بڑھ کر عزیز رکھا جاتا ہے۔

بقیہ غبار کارواں

ہوئے بھی ایک دوسرے سے کس قدر قریب تھے۔ رام اور رحیم، کاشی و کعبہ کو یکجا
کرنے کا تصور عام ہو چکا تھا جس کے امین ہمارے سنت، سادھو، فقیر، درویش
اور شاعر و موسیقار رہے۔ کثرت میں وحدت کے خاکے بن رہے تھے۔ وحدت
تو میں کثرت کو گوارا بنایا جا رہا تھا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ رنگا رنگی، یہ
مروت و رواداری بیسویں صدی کے آغاز سے مسلسل درہم برہم ہوتی جا رہی
ہے۔ ہم بٹ چکے ہیں۔ شاید اور بٹنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ انسان انسان سے
بیزار ہے، دل ششدر، عقل لاچار ہے تو کیوں کر بنے، ہو تو کیوں کر ہو؟

تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیوں کر ہو

بقیہ مرزا فرحت اللہ بیگ

اُدھا ہاتھ سے بازار کی طرف اشارہ کرکے ادھر قدم اٹھایا لیجئے ہر سننے والا سمجھ گیا کہ
یہ شخص بازار جا رہا ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ بھی اس طرح عمل کریں تو آپ
کو ساری دنیا کے سفر میں کوئی دقت محسوس نہ ہو۔ فرانس کی صحبتیں کچھ ایسی
دلچسپ تھیں کہ میری جرمنی خاک میں مل گئی، اور بلا وجہ میں قارون سے حاتم
بن گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ بس یہی کہ جب میں برلن پہونچا تو "بس رہے نام
سائیں کا" والا معاملہ تھا۔ لیکن شکر خورے کو خدا شکر دے ہی دیتا ہے۔ جب
کوئی شخص کسی نیک کام کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، تو غیب سے اس کی مدد ضرور
ہوتی ہے۔





جھلکیاں

۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو اُردو کے مشہور شاعر اور فلمی دنیا کے مقبول نغمہ نویس شکیل بدایونی کا انتقال ہوگیا آپ ۵۴ برس کے تھے شکیل عوام میں بہت مقبول تھے فلموں کے لئے گیت لکھنے کی وجہ سے اس مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے فلمی گیتوں کو نیا رنگ و آہنگ دیا اور اُن کا معیار بلند کیا۔ ان کی بے وقت موت پر علمی و ادبی حلقے میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے۔

۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو ممتاز ڈرامہ نویس اور ادیب امتیاز علی تاج کا لاہور کے ایک ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ آپ پر نامعلوم افراد نے قاتلانہ حملہ کیا تھا افسوس ہے کہ آپ زخموں سے جانبر نہ ہوسکے۔

انارکلی کے علاوہ انہوں نے اُردو ادب کو چچا چھکن ایسا زندہ جاوید کردار عطا کیا تھا۔

ڈرامہ کے میدان میں تاج صاحب کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اسٹیج اور ڈرامہ میں ان کی دلچسپی کی وجہ سے ہی لاہور میں الحمرا تھیٹر کا قیام عمل میں آیا تھا نیز اُردو ڈرامے کی ابتدائی تاریخ اور ڈراموں کے سلسلے میں انہوں نے غیر معمولی خدمات سر انجام دی تھیں مجلس ترقی ادب لاہور کا قیام اور اُردو کی بلند پایہ علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت سے اُردو ادب تاج صاحب کے احسانات سے ہمیشہ زیر بار رہے گا ان کی موت بلاشبہ اُردو کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔



ڈوگری زبان کے مشہور افسانہ نویس نریندر کھجوریہ جن کا حال میں انتقال ہوگیا مرحوم صرف ۳۵ برس کے تھے اُن کی جواں مرگی پر ادارہ اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے



شہرہ آفاق وائلنسٹ یہودی مینوہن کو بین اقوامی مفاہمت کا جواہرلال نہرو ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سے پیشتر یہ ایوارڈ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اوتھانٹ، امریکہ کے ممتاز نیگرو رہنما مارٹن لوتھر کنگ اور ہندوستان کی آزادی کے عظیم مجاہد خان عبدالغفار خاں کو دیا جاچکا ہے۔ یہودی مینوہن ایک ماہر موسیقار ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے مشترکہ ورثے کے معتقد بھی ہیں اور آپ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو انسانی روابط اور بین اقوامی مفاہمت کے لئے وقف کر رکھا ہے

ن میں
دادا
م ولادت
تقریب -
ونشریات
شرکت کی،
اسک
پیدا ہوئے

شاستری پھالکے بمبئی میں ولسن کالج میں سنسکرت کے پروفیسر تھے پھالکے
سک میں ہی حاصل کی۔اس کے بعد وہ بمبئی کے جے جے اسکول آف آرٹس میں
ر وہاں سے انہوں نے ڈرائنگ کا کورس کیا۔ بعدازاں وہ آرٹس اور دستکاری
کے لیے بڑودہ کے کلابھون میں داخل ہوگئے۔ ڈرامے سے انہیں بچپن سے
اور زمانہ طالب علمی میں آپ نے کئی اسٹیج ڈراموں میں حصہ لیا۔ کچھ عرصہ
کے محکمہ آثارِ قدیمہ میں فوٹوگرافر اور ڈرافٹس مین کی حیثیت سے بھی کام کیا۔
مصوری میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ فلم مسیح کی زندگی دیکھنے سے ان کی زندگی
لاب برپا ہوا۔ اور انہوں نے فلم بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ کچھ عرصہ وہ انگلستان
ر سازوسامان منگواکر مطالعہ وتجربہ میں مصروف رہے اور پھر اپنی بیمہ پالیسیوں
انہوں نے دس ہزار روپیہ اکٹھا کیا، اور پھر مزید تربیت کے لئے ۱۹۱۲ء میں
چلے گئے۔

انے ہندوستان کی پہلی فلم "راجہ ہریش چندر" لگ بھگ چھ مہینوں میں تیار کی
یاری میں انہیں کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں
ئے۔ راجہ ہریش چندر کے علاوہ انہوں نے کئی فلمیں بنائیں جن میں ستیہ وان
نکا دہن، شری کرشن جنم، گنگا اوترن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
روری ۱۹۴۴ء کو ناسک میں پھالکے کا انتقال ہوگیا۔

****

۱۱ اپریل ۱۹۷۰ء کو ممتاز امریکی ناول نویس جان اوہارا کا ۶۰ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا

جان اوہارا نے لگ بھگ تین درجن ناول لکھے ہیں۔ ان میں اپوائنٹمنٹ ان سمارا" بٹرفیلڈ ۸"، پال جائے، فرام دی ٹریس، اور ٹین نارتھ فریڈرک کافی مقبول ہوئے۔ آخرالذکر تصنیف پر ۱۹۵۶ء میں انہیں نیشنل بک ایوارڈ ملا تھا۔ ناول نگار ہونے کے علاوہ وہ ایک مشہور صحافی بھی تھے اور وہ اخبارات میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے تھے۔



ایک حالیہ تقریب میں صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے ملک کی ممتاز شخصیتوں کو قومی اعزازات سے نوازا۔
تصویر میں ممتاز مورخ اور ادیب ڈاکٹر تاراچند کو صدر موصوف پدم وبھوشن کا اعزاز دے رہے ہیں۔

چاندنی رات میں جھیل ڈل کا منظر



تنہا انصاری مرحوم

ہم نشیں! ہے یاد اب بھی جھیل ڈل[1] کا وہ سماں
کررہی تھی چاندنی موجوں سے جب سرگوشیاں
کاروانِ ماہ و انجم کے بوڑھا آسماں
"ڈل" کے شیشے میں اتر کر ہو چلا تھا پھر جواں

[1] کشمیر کی مشہور جھیل

تھا زمیں پر آسماں "ڈل" چشم شاعر کے ل
طے کئے تھے عشق نے اک جست میں سب مر

آسمانِ نور تھا "ڈل" "کہکشاں ہر موج تھی
قطرے قطرے پہ فدا تھی شان کوہ طور کی
چُور نشے میں فضا تھی اور ہوا بہکی ہوئی
"لانک"[2] پر تھی زمزمہ پرداز کوئی جل پری

رقص فرما تھیں نسیم جاں فزا کی شوخیا
یاد ہے کرتی تھیں کس کی زلف سے گستاخیا

اُف! وہ تابندہ جبیں ملے نظر افروز رات
وہ سکوں رومان پرور، وہ تغیر بے ثبات
جیسے زد پہ حسن کی آکر رکی تھی کائنات
ہائے وہ اعجاز منظر، نغمہ بن جاتی تھی بات

میکدہ بردوش وہ معصوم سیل رنگ و ب
دفعتاً چھلکا دیا تھا جس نے جام آرزو

دُور ہم سے دھیرے دھیرے کچھ شکارے تھے رواں
اپنے پہلو میں لئے کچھ برق پارے تھے رواں
نور کے دریا پہ جیسے چاند تارے تھے رواں
یا خمار آگیں فطرت کے اشارے تھے رواں

کیسے بھولوں گا وہ فردوسی نظارے ہم نشیں
چاندنی میں وہ حسیں جلووں کے دھارے ہم نشیں

جگمگاتے وہ نظارے پھر بلاتے ہیں مجھے
حسن کے چنچل اشارے پھر بلاتے ہیں مجھے
زندگانی کے سہارے پھر بلاتے ہیں مجھے
دیکھ وہ سارے کے سارے پھر بلاتے ہیں مجھے

کنولوں کی چشم میگوں کررہی ہے ساحری
چاندنی میں گھل کے ڈل پر تیرتی ہے ساحری

خوش قسمت سے یہ شب بھی شب مہتاب ہے
عرش سے تا فرش رقصاں نورِ عالم تاب ہے
جس کے فیضانِ نظر سے آج بھی سیماب ہے

[2] جھیل ڈل میں ایک مصنوعی جزیرہ

دیوانِ فطرت کا حسین اک باب ہے
چاندنی مضراب لے کر آئی "ڈل" کے ساز پر
جھوم اُٹھے ہیں کنول اس بے صدا آواز پر
دُور سے اپنے آبِ ڈل" بہرِ سلام
کرتے ہیں میرے وطن کے خاص و عام
ہوں جگر جب لب پہ آئے تیرا نام
سکتا مگر تیری زیارت کو مدام
دل تو سرشارِ تمنا ہے مگر دامن تہی
اور مشکل ہے کہ تو نے دیکھی ہے شاہنشہی
انوں" مہادیو[١] کا ہے تحتِ جگر
ِ تجھ پر اُٹھی رہتی ہے پربت کی نظر
مشتاق سب اہلِ نظر اور دیدہ ور
سے فکرِ رنگیں کا ہے طالع اوج پر
تیرے آئینے میں منہ آ دیکھتی ہے چاندنی
چومتا ہے تیری پیشانی کو آ کر چاند بھی
ہے تیری تہہ میں ماہِ تاباں کا جمال
ٹ میں ہو جیسے" ماہ کنعاں" کا جمال
ے میں یا حسنِ فروزاں کا جمال
تانِ ضیا رہیں نورِ یزداں کا جمال
چاندنی میں یا اتر آیا ہے تجھ میں عکسِ" تاج"
عالمِ انوار سے بھی ملتا ہے جس کو خراج
ماضی میں تو نے بادشاہوں کا وقار
پُر اسرار ہنگاموں کا ہے تو راز دار
نف عشق پر کرتا ہے کیسے حسن وار
ہیں چاندنی میں تو نے "کیوپڈ" کے شکار
ذکر کیا اُن کا ہے خود تو کشتۂ ماہِ منیر
تیرے دل میں ہیں ترازو چاند کی کرنوں کے تیر
سے چاندنی کی طرح یاں تیرا مقام:
یکھے ہیں بہت سے شہر یاری کے نظام

کرچکی تاریخ اپنا کام اور قصہ تمام
ختم ہیں پچھلے فسانے آج ہے دَورِ عوام
چاند بنکر روحِ "بڈشاہ[٢]" اب یہاں آنے لگی
نے کے یوسف[٣] "حبہ خاتون[٤]" "لانک" پر گانے لگی
چاند جب ہوتا ہے لہروں پر تری گرمِ سفر
نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے مرا ذوقِ نظر
چاندنی میں جھومتے ہیں غنچہ و گل دیکھ کر
وہ تری کائی زمرد یہ ترے قطرے گہر
ہے دو بالا تجھ سے ہی شانِ نشاط و شالامار
چاندنی کہتی ہے تجھ کو حسن کا پروردگار
تیرے پہلو میں مثلِ باغاتِ فردوسِ نظر
آسماں لاتا ہے جن کی نذر کو شمس و قمر
گُل تو گُل ہیں تیا پتا جن کا ہے جادو اثر
غنچہ غنچہ ہے جہاں عنوانِ حسن کا ثمر
چاندنی بنکر اُترتی ہے جہاں روحِ سلیم
عطر برساتی ہے مہترو ہو کے ہم رنگِ نسیم
اک طرف تیرے کنارے خلد[٥] کی تصویر ہے
جس کے شوقِ دید میں جبرئیل بھی نخچیر ہے
اللہ اللہ رفعتیں وہ عرش دامنگیر ہے
رشکِ تقدیسِ ارم سرمایۂ کشمیر ہے
سجدہ گاہِ دل ہے صبحِ جنت الزار ہے
جس پہ قرباں صد بہارِ شامِ شالامار ہے
مل گئیں میرے وطن کو تیرے دم سے رفعتیں
دے چکی ہیں دل تجھے دُنیا کی ساری ملتیں
روکشِ فردوس ہیں تیری ہزاروں جنتیں
لوٹتے ہیں حور و غلماں خوب تیری دولتیں
چلتے پھرتے کھیت تیرے ہیں عجب اک شاہکار
سر عقیدت سے جھکاتا ہے جہاں دلِ بار بار

---

[١] س کا دوسرا نام شنکر آچاریہ کی پہاڑی بھی ہے یہ ڈل کے جنوب میں ہے
ل میں ایک مشہور پہاڑ ہے۔

[٢] سلطان زین العابدین جسے بڈشاہ کہا کرتے تھے۔ [٣] یوسف شاہ چک کشمیر کا آخری خود مختار بادشاہ [٤] یوسف شاہ چک کی ملکہ [٥] درگاہ عالیہ حضرت بل

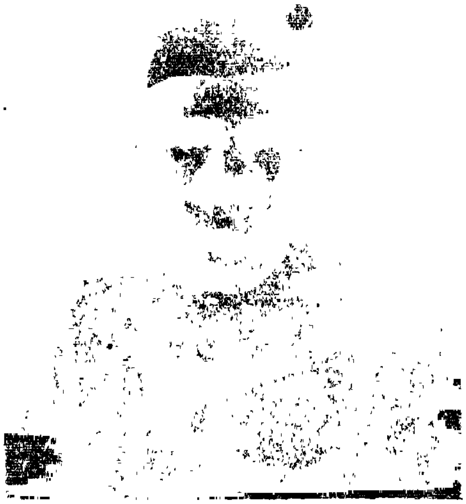


اسد علی

ہندی رسم الخط میں قرآن شریف

قرآن شریف کے متن اور معانی کو ہندی رسم خط میں شائع کرنے کی کوششیں بہت زمانے سے کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی، امام الدین رام نگری و دیگر حضرات نے کچھ کام کیے ہیں! اس کے علاوہ جماعت اسلامی نے بھی ترجمہ قرآن مجید کا ایک ہندی ایڈیشن شائع کیا ہے۔ لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ ان سب کے سامنے ہمیشہ یہ درپیش رہا ہے۔ کہ عربی کے الف، ع، ت، ط، ث، س، ص، ح، ہ، ذ ز، ض، ظ، ہ، و غیرہ کے تلفظ کو ہندی میں عربی انداز سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ اس سے قبل ق، خ، غ کو ہندی حروف کے نیچے ایک نقطہ لگا کر ادا کیا جاتا رہا ہے۔ مشتبہ الصوت عربی حروف کو ہندی میں لکھے جانے کے سلسلے میں کوئی کام نہیں ہوا تھا جس کی بدولت عربی الفاظ کو ہندی میں لکھے جانے پر لفظ کے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے تھے۔ عربی کو ہندی میں لکھ کر صحیح طور پر پڑھا اور سمجھا نہیں جا سکتا تھا۔

جناب نند کمار اوستھی جو شاعر، ڈرامہ نویس، مترجم اور کئی زبانوں کے عالم ہیں نے بیس سال کی مسلسل کوشش و کاوش کے بعد ان مشتبہ الصوت حروف کے لئے ہندی رسم الخط میں ہر آواز کے لئے علیحدہ علیحدہ حروف



پنڈت نند کمار اوستھی

ر کئے اوران میں خاص علامتیں قائم کی ہیں۔ نیز قرآن مجید کے سلسلہ کے کاموں
راکتوں اور ذمہ داریوں کو سمجھ کر اس راہ کی مشکلات پر عبور حاصل کیا ہے انہوں
، رموز اوقات، آیات، رکوع، منزل۔ ربع۔ نصف، ثلث، ہمزہ، وصل وغیرہ
لیے نئے نشانات مقرر کئے ہیں۔ جن سے عربی کے وہ حروف جو عربی زبان کی ہی
ہمیت ہیں زیادہ سے زیادہ صد تک ادا ہو سکتے ہیں۔ اب صحیح تلفظ کے ساتھ
ن مجید کی ہندی میں بھی تلاوت ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں کامیابی کے ساتھ لکھنے صحیح طور پر پڑھنے
یہ کامیاب کوشش ہر ہندوستانی کے لئے باعث فخر ہے۔

پنڈت نند کمار اوستھی کے اس گراں قدر کارنامے کے تین اہم حصے ہیں۔
لا تو یہ کہ انہوں نے قرآن مجید کے اصل متن کو عربی میں بلاک بنوا کر ہر صفحہ پر اتنا
ا دیا ہے جتنا ہندی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اس سے عربی اور ہندی دونوں
ن جاننے والے ہر آیت کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے قرآن مجید
ہندی ترجمہ بھی چھاپا ہے۔ یہ ترجمہ نہ جدید ثقیل ہندی ہے نہ قدیم اردو بلکہ عام
ہندوستانی زبان میں ہے۔ اس ترجمے کی بنیاد شاہ عبدالقادر دہلوی کے قدیم
ستند ترجمہ پر رکھی گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی اردو اور انگریزی کے دیگر مستند تراجم
بی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اردو داں طبقہ اس ترجمہ کو بلا تکلف سمجھ سکتا ہے۔

تیسرا اور سب سے اہم حصہ وہ ہے کہ انہوں نے قرآن شریف کے متن کو
ناگری رسم الخط میں اسی طرح لکھا ہے۔ کہ وہ صحیح طور پر پڑھا جا سکتا ہے



اسد علی

اس میں جو اضافے کئے ہیں اور اصطلاحات مقرر کی ہیں اس کو بہ آسانی سمجھنے کے
لئے گیارہ صفحات پر مشتمل ایک مفصل پیش لفظ میں اشارات و اصطلاحات کی مدد
سے پڑھے جانے کا طریقہ دیا ہے جس کو سمجھ کر پڑھنے کے بعد قرآن شریف کو عربی
تلفظ سے پڑھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

اگرچہ کسی بھی علمی کوشش کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا ہے تاہم یہ ایک
ایسا کام ہے جس کے ذریعے خدا کے کلام کو اور اس کے پیغام کو ان لوگوں تک
پہونچایا جا سکتا ہے جو ہندی کے سوا اور کوئی زبان نہیں جانتے۔ اس دور
میں اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کیونکہ مسلمان بچے اور نوجوان بھی ہندی
کا بڑے پیمانے پر مطالعہ کر رہے ہیں۔ قرآن کیا ہے؟ کہاں سے آیا؟ سبب
نزول کیا ہے۔ اس کی افادیت پر اگر چند صفحات کا اور اضافہ کر دیا جاتا تو
کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

تلفظ، ترجمے اور اس کے تفسیری نوٹس صحیح ہیں۔ یہ مستند ترجموں اور
تفسیروں کے مطابق ہی ہیں۔ یہ قرآن شریف بھون انی پرکاشن ۱۰۹ ڈالی
گنج لکھنؤ نے شائع کیا ہے اس کا ہدیہ پچیس روپیہ ہے۔



اسلم آزاد

وقت بے وقت ہر اک بات پہ لڑنے والو
یاد آتے ہو بہت ہم سے بچھڑنے والو

یوں سرِ راہ گزر دھول اڑاتے کیوں ہو
کہیں مٹی میں نہ مل جاؤ اکڑنے والو

پہلے پیشانی سے اپنی تو پسینہ پونچھو
داغِ رسوائی مرے ماتھے پہ جڑنے والو

مٹ نہ جائیں کہیں ہاتھوں کی لکیریں
کچھ پتہ ہے تمہیں اے ہاتھ رگڑنے والو

بزدلی چھوڑ کمیں گاہ سے باہر آؤ
دشمنی کے بھی کچھ آداب ہیں لڑنے والو

سعیِ ناکام پہ کیوں اپنی خفا ہوتے ہو
بھاگتے سائے کو ہاتھوں سے پکڑنے والو

ہیں بوسیدہ عمارت کے پلستر کی طرح
تم بکھر جاؤ گے خود ہم سے اکڑنے والو



آفتاب شمسی

زخم روشن ہوا زخموں کے کنارے چمکے
افقِ ذہن پہ پھر چاند ستارے چمکے
دہی تنہائی کے صحرا میں، ہجومِ افکار
تیرے اک جانے سے سب درد کے مارے چمکے
کوئی تشکیل نہیں کرتا خلا میں قصے
بارہا تیری نگاہوں میں اشارے چمکے
مہرِ خاموش تھی ہونٹوں پہ سرِ اک لمحے کے
رات جب اشک اُن آنکھوں کے کنارے چمکے
پیاسی دو ندیوں کے سنگم کی تمنا تھی ہمیں
اور جب دیکھا تو دو خون کے دھارے چمکے
ہم تو سمجھے تھے کہ اب کچھ نہیں خاکستر میں
آج تو راکھ میں دل کی بھی شرارے چمکے
خواب کی آس پہ آنکھوں کو رکھو بند ابھی
عین ممکن ہے وہ زلفوں کو سنوارے چمکے



غلام مرتضیٰ راہی

حرفِ مہمل ہوں اگر میں تو مٹانے دے مجھے
اپنا دامن تو کسی طرح بچانے دے مجھے
جستجو، صبر طلب ہے تو کوئی بات نہیں
ٹھوکریں کھاتے ہوئے راہ پہ آنے دے مجھے
حال میرا جو ہوا شہرِ تمنا میں، نہ پوچھ
آئینہ لا کہ ذرا خاک اُڑانے دے مجھے
ابھی طوفان مرے گرد ہی منڈلاتا ہے
اک چراغ اور سرِ راہ جلانے دے مجھے
اور سمتیں کہیں گمراہ نہ کر دیں مجھ کو
اپنے ہاتھوں کی لکیروں پہ ہی جانے دے مجھے
دُور سے ہی مری تصویر بھلی لگتی ہے
دیکھنے والوں کی خاطر میں تو آنے دے مجھے
ذرہ ذرہ مری تصدیق کرے گا راہیؔ
اپنی آواز تو صحرا میں اٹھانے دے مجھے



دیار گلستان

میسور

خالد عرفان

ریاستِ میسور کی شہ رگ تو شہر بنگلور ہے، لیکن شہر میسور، دارالسرور ہے،
لے بھی کہ ایک طرف فطرت نے اس کو حسن اور خوشگوار آب و ہوا کی دولت سے
مالا مال کیا ہے تو دوسری طرف ریاست کے فیاض حکمراں اور دانش ور وزیروں نے
ریاست کے اس سب سے بڑے نہ سہی لیکن قدیم تاریخی شہر کی نوک پلک سنوارنے
آرائش جمال میں بڑی تندہی اور دلچسپی دکھائی ہے۔

میسور ام البلاد نہیں ہے۔ نہ ہی روم کی طرح ایک ہی دن میں بنا ہے۔ اس
بنیاد بہت عرصہ پہلے رکھی گئی اور ایک چھوٹے سے گاؤں نے رفتہ رفتہ شہر کی صورت
اختیار کی ہے۔ آج اس کا رقبہ کوئی بیس مربع میل سے زیادہ ہے اور اس کی آبادی
ن لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ دیگر تاریخی و اہم شہروں کی طرح اس کی بنیاد کی بھی ایک
روایت ہے جس کا اندازہ اس کے نام سے ہی لگ جاتا ہے۔ دراصل میسور کنڑ زبان
کے دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ "مائی سا" سنسکرت لفظ "مہیش" کی مقامی زبان
کی صورت ہے جس کا مطلب ہے بھینس، اور "اُورُو" کا مطلب نکلتا ہے گاؤں۔
اس طرح نام سے اس واقعہ کی نشان دہی ہوتی ہے جس سے اس شہر کو منسوب
کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اس علاقہ میں ایک راکشس رہتا تھا جس کا سر بھینس کا تھا

اور جسم آدمی کا۔ اس کو "مہیشا سورا" کہا جاتا ہے۔ اس نے اطراف و اکناف میں
تباہی مچا رکھی تھی۔ آخر چامنڈی
دیوی کو اپنے معتقدوں پر رحم آگیا
اور دیوی نے ایک بھیانک لڑائی
میں اس دیو کا خاتمہ کر کے انہیں
اس عذاب سے چھٹکارا دلایا۔ اسی
واقعہ کی یاد میں آبادی کا نام "مہیشو
سورا پورا" رکھا گیا جو آگے چل کر
میسور بن گیا۔ جس طرح رفتہ رفتہ
نام حسین بنا اسی طرح شہر بھی
حسین بنتا گیا۔ اس قدر کہ اس کو آج
بجا طور پر "گارڈن سٹی آف
انڈیا" یعنی "دیار گلستاں"
کہا جاتا ہے۔



مہیشو سورا - راکشس

کھلی کشادہ سڑکیں، سڑکوں پر دُور رویہ گھنے سایہ دار درخت، کمانی دروازے خوبصورت چوراہے، مہاراجوں کے مجسمے، پھولوں کی کیاریاں اور فوارے ہر کسی کا دل موہ لیتے ہیں۔ کرزن پارک، نشاط باغ، پتلی پارک، کانت راج اَرس پارک — جیسے پارکوں میں پھولوں کی کیاریوں سے گھرے سبزے کے تختوں پر بیٹھ کر بڑی فرحت محسوس ہوتی ہے۔

اس حسین شہر کی سیر کا لطف پیدل چل کر ہی آتا ہے یوں تانگے کی سواری بھی کی جاسکتی ہے۔ ان تانگوں کو یہاں "شاہ پسند" کہا جاتا ہے یہ مضبوط بھی ہوتے ہیں اور آرام دہ بھی، لیکن ہوتے صرف تین سواریوں کے لئے ہیں۔ دور دراز کے مقامات کی سیر کے لئے ٹیکسی بھی مل جاتی ہے لیکن اُن کی کثرت نہیں: اور اس کی تیز رفتاری میں وہ لطف کہاں جو پیدل چل کر ملتا ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہاں زندگی بھاگتی ہے نہ دوڑتی ہے۔ بس چلتی رہتی ہے۔ ایک بے فکرے چرواہے کی مانند جس کو اپنی بھیڑوں کے کھو جانے کا بالکل اندیشہ نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ اسی سکون اور بے فکری کی خاطر میسور میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں میں علم دوست اصحاب بھی شامل ہیں اور ریسرچ کرنے والے ذہین دماغ بھی۔ اس طرح میسور رہا ہے نئی زندگی، نئے شعور کا سرگرم مرکز نہ سہی لیکن پختہ شعور اور سنجیدہ ذہن کی پناہ گاہ ضرور ہے۔

پڑھنے پڑھانے کی بات چلی ہے تو یہاں کی لائبریریوں کو نہیں بھلایا جاسکتا۔ ان میں مہاراجہ آرٹس کالج سے ملحقہ قدیم یونی ورسٹی لائبریری مقدم ہے اس کے قریب ہی دو اور مشہور کالج ہیں — یُوراجا سائنس کالج اور مہارانی کالج فار ویمنس یہ لائبریری ریاست کی بڑی لائبریریوں میں سے ہے۔ قدیم و جدید مخطوطات اور دستاویزی حیثیت رکھنے والی بیش بہا تحریروں کے لئے یہ لائبریری ایک لاجواب مخزن ہے۔ خود دکنی اُردو کے مخطوطات کی تعداد ایک ہزار بتائی جاتی ہے جن میں نایاب مثنویوں کے علاوہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ اور دیگر صوفی حضرات کا کلام بھی شامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنسکرت زبان کی جو تحریریں اور مخطوطات یہاں محفوظ ہیں وہ ملک کی کسی دوسری لائبریری میں نہیں ملتے۔ کنڑ زبان ہی کی پانسو سے زیادہ ایسی قدیم تحریریں محفوظ ہیں۔ ایک ہی کتاب کی مختلف خطوں میں نقل بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہرشا چرتر کی ایسی کوئی بیس نقلیں موجود ہیں یہاں ایسی تاریخی دستاویزی حیثیت کی حامل تحریریں بھی محفوظ ہیں جو قرب و جوار کے تاریخی مقامات مثلاً ٹمکور ضلع کے سِرا نامی مقام سے برآمد کی گئی ہیں۔ سِرا کبھی ریاست کا صدر مقام اور فوجی چھاؤنی رہا تھا۔ سنسکرت، عربی، ٹمل کی کئی انمول اور نادر کتابیں موجود ہیں جن سے تحقیقی کام میں بڑی مدد لی جاسکتی ہے۔ ان کے علاوہ کئی ایسے کتبے بھی موجود ہیں جن کے ذریعہ دراوڑی رسم الخط کے ارتقا کا پتہ چلایا جاسکتا ہے Indology میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہاں کافی مواد ہے۔

اس کے علاوہ ارباب ذوق کی ذہنی تسکین کے لئے دو اور کتب خانے موجود ہیں۔ ایک تو ہے پبلک لائبریری اور دوسری اورینٹل لائبریری۔ موخرالذکر کتب خانہ ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کی یادگار ہے اور اس میں سنسکرت اور کنڑ زبان کے بیش بہا نادر اور قدیم قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ اس ادارے کے زیر اہتمام سنسکرت زبان کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ دیواروں کی اندرونی اور بیرونی سطح پر بارہ ایسے کتبے بھی لگے ہوئے ہیں جن پر وجیانگر، ہوئیسلا، چالوکیہ، چولا اور نولمبا دورِ حکومت کی تحریریں کندہ ہیں۔ اسی طرح شاہی کتب خانے میں بھی قدیم مخطوطات کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے کنڑ زبان کی قدیم شاعری کے کئی گرانمایہ نسخے بھی شامل ہیں۔ جن میں مذہب سے لے کر فلسفہ تک کی بحث کی گئی ہے۔

پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لئے شہر سے قریب ہی ایک پرفضا مقام پر میسور یونی ورسٹی کا کیمپس تعمیر کیا گیا ہے۔ نام ہے۔ مانس گنگوتری (علم کا چشمہ) مانس گنگوتری کا کتب خانہ آج یہاں کا بہترین کتب خانہ ہے۔ اس میں دو لاکھ کے لگ بھگ کتابوں کے علاوہ مخطوطات و نادرات کا بیش بہا خزانہ پایا جاتا ہے

ایک اور تعلیمی اور ریسرچ کا ادارہ جو براہ راست مرکزی حکومت کی زیر نگرانی ترقی پذیر ہے وہ سنٹرل فوڈ ٹکنالوجی کل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے جو ایشیا بھر میں اپنی طرز کا واحد ادارہ ہے جہاں غذا اور نشوونما کے مختلف مسائل پر بڑی تندہی اور توجہ کے ساتھ تحقیقات کی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں یہاں ایک ایسی غذا تیار کی گئی جو چین بھارت لڑائی میں ہمالیہ کے سرد برفانی علاقوں میں کارآمد ثابت ہوئی تھی۔

بنگلور کی طرح میسور صنعتی شہر نہیں ہے لیکن دوسرے تاریخی شہروں کی طرح ترقی کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہ گیا ہے۔ یہاں کئی قدرتی وسائل پائے جاتے ہیں جن کو کام میں لاکر بہت جلد اس کو صنعتی مرکز بنایا جاسکتا ہے۔ میسور کے اردگرد ایسے صنعتی مرکز ہیں جن سے ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے

کپڑے سلک کی طرح میسور کا ریشم بھی کافی مشہور ہے۔ یہاں کی گورنمنٹ فیکٹری میں تیار کی گئی ریشمی ساریاں اور دیگر کپڑے دور دراز مقامات کو بھیجے جاتے ہیں۔ صندل کا تیل حاصل کرنے کا سرکاری کارخانہ مشہور زمانہ ہے۔

میسور کی دستکاری مشہور ہے۔ یہاں ہاتھی دانت اور صندل اور گلاب کی لکڑی پر بڑی نفاست، نزاکت اور خوشنمائی سے کام کیا جاتا ہے اور ان نازک اور سبک لیکن پائدار اشیاء کی بڑی مانگ ہے اس کے علاوہ لکڑی کے کھلونوں اور مرصع سازی کے لئے بھی میسور مشہور ہے۔ یہاں کے مشہور مرصع ساز

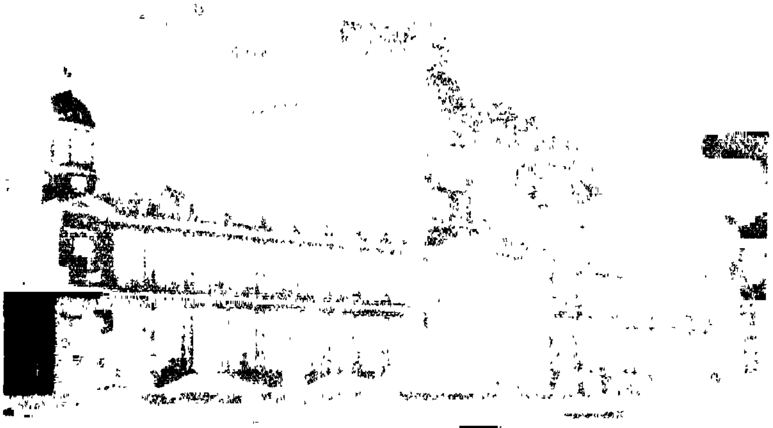


میر
شوکت
علی

جناب میر شوکت علی کو چند سال پہلے صدر جمہوریۂ ہند نے انعام سے نوازا تھا۔

میسور تاریخی شہر ہے۔ ہر تاریخی شہر کی طرح اس پر عظیم ماضی کی چھاپ ہے اور اس عظمت و سطوت کے نشان یہاں کے محلوں میں ہی نہیں، شہر کے چپہ چپہ پر ملیں گے۔ میسور کی تعمیر میں اینٹ اور چونے کے ساتھ وقت اور طویل ریاضت کے علاوہ حکمرانوں کی دولت اور اُن کے قابل وزیروں کی دُوراندیشی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ نہ وڈیر خاندان کے راجاؤں کا صدر مقام ہوتا نہ یہاں محل تعمیر ہوتے۔ نہ حکمرانوں کو مرزا اسمٰعیل، سرایم وسویریا، اور ماد ھوراؤ جیسے دیوان ملتے نہ شہر کی اس خوبصورتی اور حسن میں چار چاند لگتے۔ ان محلوں میں سب سے شاندار تو ریاست کے سابق حکمرانوں کا رہائشی محل ہے جو شہر کے بیچوں بیچ قدیم قلعہ کی حدود میں تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ محل فن تعمیر اور سنگ تراشی کے علاوہ حسن مصوری اور حسن آرائش کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ حالانکہ عمومی طور پر اس کی تعمیر میں ہند اسلامی طرز کا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس کے حاشیے، کنگروں اور طاقوں کی آرائش مکمل طور پر ہویسلا طرز تعمیر کی ہے۔ جس طرح بالکونی، چھتے اور غلام گردشوں کے ذریعہ عمارت کو تقسیم کیا گیا ہے اس سے روشنی اور سایے کا بڑا حسین امتزاج ہوتا ہے۔

للت محل ایک اور شاندار اور خوبصورت عمارت ہے۔ شہر سے پرے



للت محل

چامنڈی پہاڑی کے دامن میں سطح سمندر سے کوئی ڈھائی ہزار فیٹ کی بلندی پر باغوں اور چمن کے درمیان یہ خوبصورت عمارت ایک نگینہ کی طرح دمکتی ہے۔ یہاں سے شہر کا نظارہ بڑا دلفریب ہوتا ہے۔ کبھی اس محل کو شاہی مہمان خانہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

جگن موہن پیلیس کو میسور کا سالار جنگ میوزیم کہا جا سکتا ہے، حالانکہ یہ کسی فرد واحد کی کوششوں کا نتیجہ نہیں۔ یہ نہ صرف مصوری، فوٹو گرافی اور دیگر فنون لطیفہ کے انمول شاہ کاروں کے علاوہ عجائبات کا میوزیم ہے بلکہ کئی تاریخی قدر و قیمت والی نادر اشیاء کا مخزن بھی۔ ان عجائبات میں ٹیپو سلطان کے عہد کی چھینٹ چودھویں صدی کے راجہ بیدراتے کے زمانے کے وہ نادر کنول جن کی پنکھڑیوں پر اس خاندان کے راجاؤں کا حال کندہ ہے اور ہاتھی دانت کا ایک نایاب نقش وغیرہ شامل ہیں۔ قدیم کشمیری شالوں کی تعریف تو سننے میں آتی ہے لیکن یہاں ایسی دو شال محفوظ ہیں جن کی تیاری میں کہا جاتا ہے عمریں بیتی ہیں۔ اور دعویٰ ہے کہ یہ چار نسلوں تک چلیں گی۔ یہاں کے چترشالہ میں مصوری کے شاہ کار پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً مشہور زمانہ فنکار مہاراج روی ورما کے فن کے بہترین مظاہر یہاں جاذب نظر و توجہ ہیں۔

یہاں کا سینٹ فلومینا چرچ پورے جنوبی ہند میں مشہور ہے اور کافی وسیع و عریض ہے۔ یہاں بھی فن مصوری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مساجد میں کمانی دروازے کی مسجد اور مسجد اعظم تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

ایک اور تفریحی مقام ہے چڑیا گھر۔ یہ بذات خود ایک بلاغ ہے جہاں شیر ہو یا دریائی گھوڑا، سارس کے جوڑے ہوں کہ موسکے، بندر ہوں یا نہلفے تمام ملکی اور غیر ملکی جانوروں، پرندوں اور چند حشرات الارض کو اُن کے فطری



سینٹ فلو مینا چرچ

میسور

ماحول میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے یہیں ایک میوزیم بھی ہے جس کا ماحول ہر میوزیم کی طرح ماضی کی اُڑی اُڑی خوشبوؤں سمیت بوجھل سا ہے پھر بھی اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔

شہر میسور اپنی رواداری کے لئے بہت مشہور رہا ہے۔ نہ صرف یہاں کے حکمراں رواداری کی زندہ مثال رہے ہیں بلکہ یہاں کے لوگ بھی۔ دربار میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی باریابی کے علاوہ ان کی مناسب قدر افزائی ڈوپر دور حکومت کا طرۂ امتیاز رہا



مسجد اعظم میسور

ہے۔ شاندار ماضی اور ثقافت سے وابستگی کا اظہار بھی آئے دن ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ شاہراہوں کے نام بھی اس کے مظہر ہیں۔

میسور کی خوبصورتی میں فطرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت بادلوں میں ملفوف، غروب آفتاب کے وقت شفق کی سرخیوں سے مزین اور جگمگاتے تاروں کی چھاؤں میں رات کی آغوش میں سوتی ہوئی ہری بھری سنہری اور بھوری پہاڑیوں کے پس منظر میں شہر ایک ایسی حسینہ لگتا ہے۔ جس کی محافظ یہی پہاڑیاں ہیں۔ ان پہاڑیوں میں چامنڈی ہلس کو میسور شہر سے خصوصی نسبت حاصل ہے۔ کوئی ساڑھے تین ہزار فیٹ کی بلندی پر شہر سے تین میل پرے ان پہاڑیوں پر ان ہی چامنڈی دیوی کا مندر ہے جنہوں نے مہیشا سورا کو ہلاک کیا تھا۔ دراصل چامنڈی دیوی، شیوجی کی بیوی ہیں اور جن کو پاروتی یا درگا دیوی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے چامنڈی دیوی شاہی محل کی دیوی ہیں اور اس طرح اس مندر سے حکمرانوں کا خاندانی تعلق رہا ہے۔ اسی پہاڑی پر مہیشا سورا کا مجسمہ بھی لگا ہوا ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں اژدہا ہے۔

پہاڑی پر جانے کے لئے پختہ تارکول کی سڑک تو ہے ہی لیکن پیدل جانے والوں کے لئے سیڑھیاں بھی تراشی گئی ہیں جن کی تعداد ایک ہزار ہے اور جن کے ذریعے سے اوپر جانے والے یاتریوں کو آدھے فاصلے پر نندی کے درشن ہوتے ہیں۔ نندی دراصل ایک بہت بڑی چٹان میں تراشے ہوئے بیل کا بت ہے جس کی لمبائی کوئی ۲۵ فٹ اور اونچائی ۱۶ فیٹ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب سے کوئی ۲۹۵ برس پہلے اس کو صرف ایک رات میں تراشا گیا تھا اور وہ اس وقت کے فرمانروا ڈوڈا دیوا راجا کی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ تھی۔ اس مجسمے میں رسیوں، زنجیروں اور گھنٹیوں کو بھی اس خوبی سے تراشا گیا ہے کہ سترھویں صدی کے فن سنگ تراشی کا بہترین مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔

پہاڑی پر ایک چھوٹا سا محل للیتادری Lalitadri کے نام سے بنا ہوا ہے اور یہ پکنک سینٹر ہے

دسہرہ کے تیوہار کے فوراً بعد پونم کی رات، روشنیوں سے مزین فضا میں چامنڈی دیوی کا رتھ نکالا جاتا ہے تو لگتا ہے کہ الف لیلہ کی کوئی رنگین رات زندہ ہو کر سامنے آگئی ہے دیوی کے درشن کے لئے دور دراز سے ہزاروں عقیدت مند کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ دسہرہ یہاں کا سب سے بڑا تیوہار دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ دراصل دسہرہ دس راتیں ہیں جو پاروتی یا درگا دیوی کی یاد میں منائی جاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے میسور میں اس تیوہار کا

سے ایک حضرت حیدر علی اور حضرت ٹیپو سلطان شہید کا گرمائی مستقر سری رنگ پٹن ہے جو شہر سے نو میل کے فاصلے پر بنگلور، میسور روڈ پر واقع ہے۔ یہاں ان حریت پسند جنگ آزادی کے اولین سپاہیوں کا قلعہ اور محل واقع ہیں اور یہیں ان کے مزار بھی ہیں۔ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کے زمانے کی ہی ایک یادگار مسجد کے علاوہ ان کا وہ محل دیکھنے کے قابل ہے جس کو دریا دولت باغ سے موسوم کیا جاتا ہے اور جہاں

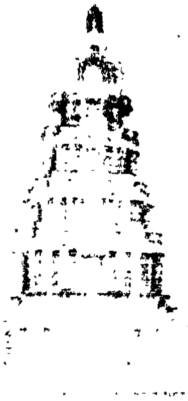


مقبرہ حضرت ٹیپو سلطان شہید

وہ گرما کے دنوں میں قیام پذیر ہوتے تھے۔ اس محل کو زمین دوز نہروں کے ذریعہ ٹھنڈا رکھا جاتا تھا۔ ان نہروں میں قریب بہنے والے دریائے کاویری سے پانی لیا جاتا تھا۔ آج اس محل کی حیثیت آثار قدیمہ کی ہے اور اس کی دیواروں پر میسور کی جنگوں کے مختلف مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اس عہد کی چند نادرات بھی نمائش کے لئے رکھی ہوئی ہیں۔

سری رنگ پٹن کی اہمیت کی اور وجوہ بھی ہیں۔ یہاں آکر دریائے ——— کاویری دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے جو پورے شہر کو اپنے حلقے میں لے کر پھر سے مل جاتی ہیں۔ ان کے سنگم پر غسل کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور یہ تفریحی مقام بھی بن گیا ہے۔ سری رنگ پٹن اصل میں سری رنگا سوامی کا گاؤں ہے جن کا یہاں ایک قدیم مندر ہے۔ یہاں آج کل سال میں دو مرتبہ میلہ بھی لگتا ہے۔ سری رنگ پٹن سے دس پندرہ میل آگے ریاست کی مشہور

Bird Sanchery





چامنڈی دیوی کا مندر

تعلق چامنڈی دیوی سے ہے۔ راجاؤں کے زمانے میں اس تیوہار کے موقع پر جشن شاہی منایا جاتا تھا۔ شاہی محل پر بہار چھا جاتی۔ سجا سنوار کر جب چراغاں کیا جاتا تو لگتا کہ تاروں بھرا آکاش دھرتی پر اتر آیا ہے۔ ان ہی دنوں دربار لگتا اور مہاراجہ زریں تخت پر جلوہ افروز ہوتے۔ اس کے علاوہ شاہی ہاتھی پر مہاراجہ کا جلوس دلہن جیسے سجے سجائے شہر کی شاہراہوں پر سے گزرتا تو عجیب سماں بندھ جاتا۔

دسہرہ کی ایک اور خصوصیت نمائش ہے جو مخصوص عمارت میں ہر سال اس موقع پر لگتی ہے۔

شہر میسور کی سیر مضافات کے دو مقامات کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ان میں



شاہی محل میسور دسہرے کے موقع پر چراغاں کیا گیا۔ احاطہ میں مندر ہے جس پر بھی میلے لگتے ہیں

رنگین تھتو ہے۔

ریاست کی کاشتکاری کا بیشتر انحصا[ر]

دریائے کاویری پر ہے جنوبی ہند کے اس بڑے دریا کے پانی کو میسور سے کوئی بارہ میل کے فاصلے پر کرشنا راج ساگر کے مقام پر کوئی پونے دو میل لمبا بند باندھ کر کوئی سوا لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی کا انتظام کر لینا انجینرنگ کا ایک عظیم کارنامہ ہے دراصل اس بند کی بنیاد حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ نے شمسی سال کے مطابق ۱۲۲۱ میں ایک بہت ہی شبھ گھڑی میں رکھی تھی جس کا حوالہ بند سے باہر لگے سنگین کتبے میں تفصیل سے فارسی زبان میں کندہ ہے۔ کاشتکاری کے لیے اس بند کا مقام ریڑھ کی ہڈی کی مانند تو ہے لیکن اس کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس سے ملحقہ برنداون گارڈن ہے جہانگیر نے شالیمار باغ کو دیکھ کر کہا تھا۔

"اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

برنداون گارڈن

برنداون دیکھ کر بے اختیار یہی الفاظ زبان پر آجاتے ہیں۔ رنگا رنگ پھولوں کے تختوں اور فواروں، سبزے کے قطعوں، مصنوعی جھیلوں سے آراستہ اس پارک کو پریوں کا دیس کہا جا سکتا ہے۔ شام کو جب چراغاں کیا جاتا ہے۔ تو سرخ، نیلے، سبز، گلابی، آسمانی اور رنگا رنگ کے نئے نئے ڈھنگ سے لگائے گئے بجلی کے قمقموں کی روشنی میں سارا منظر جنت کے تصور کو زندہ کر دیتا ہے۔ لگتا ہے ان گنت فوارے جل پریوں کی طرح ناچ رہے ہیں اور انارکلی مست و بے خود ہو کر کسی جہاں پناہ کے خوف سے بے نیاز، رقص کر رہی ہے۔

غزل

مہدی پرتاپگڈھی

رہِ جنوں میں خرد کا غبار حائل تھا ⁂ میں ایک عمر ملک ناشناسِ منزل تھا
وہاں کھلا ہے بھرم آپ کی رفاقت کا ⁂ جہاں خود اپنے کو پہچاننا بھی مشکل تھا
وصول کر نہ سکا وقت کی رگوں سے خراج ⁂ میں سوچتا ہوں کہ وہ شخص کتنا بزدل تھا
جو شخص پونچھ رہا تھا مرے بدن سے لہو ⁂ اسی کو لوگ بتاتے ہیں میرا قاتل تھا
عدو سمجھ کے ہوا جب میں برسرِ پیکار ⁂ یہ کیا، کہ میرا ہی چہرہ مرے مقابل تھا
غبارِ وقت نے دھندلا دیا اسے آخر ⁂ اک آئینے کی طرح سے کبھی مرا دل تھا
مجھے غرور تھا جس شخص کی رفاقت پر ⁂ سنا ہے وہ بھی مرے قاتلوں میں شامل تھا
مرے مزاج کی افتاد کر سکی نہ پسند ⁂ نہیں تو حسن کا مجھ کو قرب حاصل تھا
صلیبِ وقت پہ لٹکا ہوا تھا ذوقِ حیات ⁂ ہر ایک لمحہ شعور و نظر کا قاتل تھا
ہما ہے پہ زمانے کی تھی نظر جس کی ⁂ وہ آپ اپنے ہی فردِ عمل سے غافل تھا

چھپاتا کیسے میں چہرے کے خال و خد مہدی
جدھر نظر اٹھی اک آئینہ مقابل تھا

پنجابی کہانی

پھیر پھرائی



——— جسونت سنگھ وردی

کوٹھی کا پھاٹک کھلا اور ایک نوجوان خوبصورت لڑکی تیزی سے اندر چلی گئی اور پھاٹک پھر بند ہو گیا۔ کرمے نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے پھاٹک کھلتے اور بند ہوتے ہوئے دیکھا لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے مضبوط ہاتھوں سے پھاٹک کھول دے اور اندر جا کر سردار جی سے سب کچھ کہہ ڈالے۔

وسیع و عریض کوٹھی کو اس نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا اور اس کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہوا وہ کوٹھی کے بنگلے سے لگ کر بیٹھ گیا اور دھڑکتے دل کی حرکت کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں اندر جاؤں یا نہ جاؤں؟ اس نے وہی بات پھر سوچی جو گھر سے آتے وقت سوچی تھی۔ شاید سردار جی مجھ سے بات بھی نہ کریں۔ پھر... پھر..."

لیکن اُسے اس بات پر یقین نہ ہوا کیونکہ اس نے سردار جی کے چہرے کو ہمیشہ گیندے کے پھول کی طرح کھلا ہوا دیکھا تھا۔

"کئی لوگوں سے وہ بُرے ہیں" اس نے پھر سوچا لیکن نمبردار کے بیٹے سے تو اچھے ہیں۔ اور نمبردار کے بیٹے کی تمام حرکتیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں۔ اور وہ جیسے تڑپ اٹھا اور اس نے نفرت سے تھوک دیا لیکن یہ ہر تب بھی ختم نہیں ہوئی۔ نفرت پھر بھی کم نہ ہوئی۔ سردار جی سے ملنے کا خیال ایک لمحہ کے لیے وہ بھول گیا اور وہ کچھ دیر تک اپنی زندگی کے گزرے لمحات کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر اس کو بھائی کا بیمار پڑنا اور مرنا پھر فصل کا تباہ ہونا سب کچھ یاد تھا۔ ورکشاپ سے اس کی غیر حاضری بھی۔ سات تاریخ کو حاضر ہو کر وہ تنخواہ بھی نہ لے سکا۔ ہاتھ تنگ تھا۔ بہت دنوں تک غیر حاضر رہنے کی وجہ سے اب اسے ڈیوٹی بھی نہ مل رہی تھی۔ بھائی کا مر جانا کوئی اتنی بڑی وجہ نہیں ہوتی کہ انسان اپنا کام چھوڑ دے۔ وہ پندرہ دن سے دفتر میں سر مار رہا تھا لیکن اس کو ڈیوٹی پر نہیں لیا جا رہا تھا۔ اسے بمشکل ورکشاپ میں نوکری ملی تھی اور اس کے لیے پرانے ایس ڈی او کی کوٹھی پر تین سیر دیسی گھی پہنچانا پڑا تھا اور اگر اب ملازمت چلی گئی تو؟ ملازمت کے لیے وہ بابوؤں کے علاوہ مستری اور چھوٹے انسپکٹر کے پاس بھی گیا تھا۔ اگر کل والا حادثہ رونما نہ ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ تھک ہار کے گھر بیٹھ جاتا۔ کل کی بات ہی نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ سردار جی سے ضرور ملے۔ اس نے بھائی کی بیماری میں نمبردار سے پچاس روپے قرض لیے تھے اور کل نمبردار کا بیٹا روپے مانگنے آیا تھا۔ کرمے نے کچھ دن کی مہلت مانگی۔ لیکن وہ تو خوب لال پیلا ہوا تھا۔ کرمے نے اپنی مجبوری اور بھائی کی موت کا ذکر کیا لیکن وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کہتا چلا گیا۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو نہ ہی ہی... اپنی بھابی کو ہماری حویلی میں کوڑا پھینکنے کے لیے بھیج دیا کر۔ پھر سا تھ ہی ہی..."

نمبردار کے بیٹے کی آنکھوں میں شرارت تھی اس کی باتوں کا مطلب سمجھنے میں کرمے کو دیر نہیں لگی اور یہ باتیں کرمے کو زہر سی لگی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور چہرہ پسینہ سے تر اور ہو گیا تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکا تھا اور بے چاری بھابی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ تمام رات سو نہ سکا تھا۔ سویرے تک وہ نمبردار کے

بیٹے کو گالیاں دیتا رہا تھا۔ دفتر سے مایوس لوٹنے پر اس نے ایک بار سردار جی سے ملنے کا ارادہ کیا تھا۔

اس نے اپنے شل جسم اور لباس کی جانب دیکھا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔ تھکان سے چُور چُور ہو جانے پر بھی وہ امید کا دامن چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ سردار جی میری درخواست قبول کر لیں تو پھر ڈیوٹی بھی مل جائے گی اور تنخواہ بھی لیکن ... لیکن ... اگر وہ نہ مانے تو ... تو ... "

اس طرح وہ کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا۔ چاروں جانب اس کو تاریکی ہی تاریکی نظر آرہی تھی لیکن آگے بڑھ کر پھاٹک کھولنے کی جرأت اس کو نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے حلق پھاڑ کے اس کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ وہ کرے بھی تو کیا بچوں کے پیٹ وہ کس طرح بھرے گا۔؟ گھر کی ضرورتیں کس طرح پوری ہونگی اور زندگی کیسے گزرے گی؟

اس نے پھر کوٹھی کے پھاٹک کی جانب دیکھا لیکن اُسے کھولنے کی ہمت وہ پھر بھی نہ کر پایا۔ یوں اس سے قبل وہ کئی بار اس کوٹھی کے اندر گیا تھا۔ اپنے مزاحیہ طور طریقوں سے سردار جی کو خوش کرنے کے لئے اپنی فوجی زندگی کی دلچسپ باتوں سے سردار جی کی اُداسی دُور کرنے کے لئے۔ لیکن تب تو اُسے بلایا جاتا تھا۔ آج — وہ کیسے سردار کے سامنے جائے۔ آخر پیشانی کا پسینہ پونچھ کر اُس نے اپنے کمزور بدن اور بچی کچھی قوت جمع کی اور ہمت کر کے آگے بڑھا اور پھاٹک کا کنڈا گھما دیا۔ اس نے کئی بار دیکھا تھا کہ باہر سے پھاٹک اسی طرح کھلتا ہے۔ اور واقعی کڑک کی آواز سے پھاٹک کھل گیا لیکن پھر پانچ سات منٹ تک آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ آخر ایک بار پھر اس نے اپنے دل کو سنبھالا اور اداس چہرے پر تھوڑا بہت دکھ کا تاثر لا کر آگے بڑھا۔

سردار جی لان میں کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کے جیسے ہی ایک بھاری بھرکم سردار جی فوجی افسر کی وردی میں ملبوس اُن کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے۔

کرم سنگھ خاموش کھڑا رہا۔

ملٹری کا افسر اُٹھ کر جانے لگا: "بیٹھو۔ بیٹھو۔" کہتے ہوئے ایس ڈی او صاحب کی نظر اس پر پڑی تو اُس نے ہاتھ جوڑ کر کافی نیچے جھک کر ست سری اکال کہا۔ اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر سردار جی بولے: "ہلو! کرم سنگھ کیسے آنا ہوا۔؟"

اُن کی بات سُن کر کرما ایک بار تو چکرا گیا کہ کیا جواب دے۔ پھر اُس کو خیال آیا۔ کہ اپنا سارا دکھڑا جو آتش فشاں کی طرح اس کے اندر ابل رہا ہے وہ سردار جی کے سامنے انڈیل دے اور دہاڑیں مار مار کے رحم کے لئے پکار اُٹھے۔ لیکن وہ لمحہ بھر کچھ بھی نہ بول سکا۔

سردار جی اس کی جانب اشارہ کر کے فوجی افسر سے بولے: "یہ ہمارے ورکشاپ میں قلی ہے"

قلی لفظ نے کرمے کا سر جھکا دیا۔ فوجی افسر اس کو دیکھ کر کچھ حیران ہوا جیسے کسی نمائش میں کسی نایاب چیز کو دیکھ کر کوئی حیران ہوتا ہے۔ لیکن ایس ڈی او کی بات جیسے ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے جملہ پورا کیا۔ "لیکن دوسری جنگِ عظیم میں یہ سولجر رہ چکا ہے۔ اے بریو مین"

اب کی کرمے کا جھکا سر سیدھا ہو گیا۔ وہ اپنی تعریف سن کر اپنا ہر دکھ بھول گیا۔ ملٹری کی دلچسپ زندگی یاد آگئی اور اس نے اکڑ کر دونوں سرداروں کو فوجی سلیوٹ کیا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"آج تم کو یہ تماشہ بھی دکھاتے ہیں:" ایس ڈی او نے فوجی افسر سے کہا "کچھ دیر اور ٹھہرو۔ چائے کا ایک کپ اور پیتے ہیں اور تم کو کرمے کے کرتبوں سے خوش کرتا ہوں۔"

فوجی افسر نے کرمے کے گٹھے ہوئے افسردہ جسم میلی فوجی قمیص اور نیکر تراشی ہوئی داڑھی اور ففٹی رکھ کر باندھی ہوئی پگڑی کو ذرا غور سے دیکھا جیسے سوچ رہے ہوں کہ آخر اس معمولی سے آدمی میں کیا دلچسپی کا سامان ہو سکتا ہے۔

سردار جی نے نوکر کو آواز دے کر چائے کے لئے کہا اور پھر کرمے کی جانب مڑے: "ہلو! کرم سنگھ ہم تمہیں ملٹری اسپرٹ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ سمجھ گیا؟"

"یس سر!" اور کرمے نے ایک بار پھر سلیوٹ کیا۔ گھر کا غم اور ملازمت کی فکر اب اُس کے دل سے نکل چکی تھی۔

کرمے کے کوٹھی میں آنے سے پیشتر دونوں سردار گپیں تو ہانک رہے تھے لیکن یوں لگتا تھا کہ اُن کے پاس کوئی خاص موضوع نہیں تھا۔ کچھ پھول پتیوں کے علاوہ اُن کے دیکھنے کو بھی کوئی چیز نہ تھی اور ان چیزوں کو کوئی کتنی دیر دیکھ سکتا ہے؟ پھر سردار جی کی نازک اندام دوسری بیوی بھی تو ان کے پاس دیر تک بیٹھنے کے بجائے نوکر کو ساتھ لے کر شاپنگ کے لئے جانا زیادہ پسند کرتی تھی۔ کرمے کے آنے سے دونوں سرداروں میں ایک نیا جوش

یا اور اس سے دلچسپ کرتب دیکھنے کے لئے وہ بے چین ہو اُٹھے۔

"کرم سنگھ کی انگریزی بہت مشہور ہے" ایس ڈی او صاحب نے اپنے ساتھی کو بتایا۔" یہ خوب فر فر اور اصلی لہجے میں بولتا ہے۔ پھر مزا یہ کہ وہ اس کو وقع پر ہی شعر و شاعری میں تبدیل کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے تم انگریزی سنو۔ ہاں ہی کرم سنگھ شروع کرو۔"

اور کرم سنگھ نے انگریزی سنانے کے لئے موڈ بنا لیا۔ یہ انگریزی وہ ہزاروں مرتبہ لوگوں کو اور سردار جی کو سنا چکا تھا۔ ہر بار وہ کچھ نئے جملے کہتا اور کچھ پرانے بھول جاتا۔

اس نے انگریزی طریقے سے منہ بگاڑ کے بولنا شروع کیا" بیٹوین ناردرن ریلوے اسٹیشن رنگ مین از اور ایس ڈی او وندرفل فرینڈس ہی کیپس۔"

کیپس کو اس نے اس طریقے سے ادا کیا کہ دونوں سردار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ وہ پھر بولا" ہیپی ہی از . . . . گلیڈ فیلز . . . .

اسی طرح وہ انگریزی کے غلط سلط لفظ اور جملے بولتا رہا اور دونوں سردار کھلکھلا کر ہنستے رہے۔

تیز آواز اور ٹیون بدل بدل کر بولنے سے کرمے کی سانس پھول گئی لیکن انگریزی کے ختم ہوتے ہی معمولی سی تعریف کرنے کے بعد سردار جی نے انگریزی ناچ کی تجویز پیش کر دی۔

اب کرما بغیر کسی حیل حجت کے انگریزی ناچ ناچنے لگا۔ وہ چند برس پیرس کے قریب اور کئی دوسرے یوروپین ملکوں میں رہ چکا ہے اور کئی اس کو انگریزی ناچ ناچنے کا موقع مل چکا تھا اس لئے اب بھی کبھی کبھی اپنے غم کو بھلانے کے لئے وہ اس ہتھیار کا استعمال کرتا تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور روشنیاں جل چکی تھیں۔ ایک منٹ کے لئے اس نے محسوس کیا کہ وہ پیرس میں ہے اور اس کی بغل میں ایک حسین سی لڑکی کھڑی ہے اور وہ دونوں کسی ریسٹوران میں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ناچ رہے ہیں۔ کرمے نے لان کی گھاس پر ریستوران کا سماں باندھ دیا اور سردار جی خوش ہو کر اس کو اکساتے رہے۔

ناچ کے بعد پریڈ کی باری آئی جیسا کہ پہلے بھی ہوا کرتا تھا لیکن اب کی بار کرمے نے تعریف کے ہار گلے میں ڈالے جانے پر بھی پریڈ کے لئے حامی نہیں بھری۔ اس نے اس بات کی آڑ لی کہ وہ بہت تھک گیا ہے اور پھر دن بھی اس نے سویرے کی کھائی ہوئی ہے لیکن اس کی بات کاٹ کر فوجی افسر نے کہا: "ناکرنا ملٹری کے اصول کی خلاف ورزی ہے۔ آرڈر کی ضرور تعمیل ہونی چاہیے۔"

کرما دل اور جسم کا درد بھلا کر پھر ڈٹ گیا اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور چہرے پر جوش لا کر ظاہراً خوشی سے پریڈ کرنے لگا۔ لیفٹ رائیٹ رائٹ لیفٹ۔ فوجی سردار کے رُولر کو اس نے اپنی بندوق بنا لیا اور ٹوٹے ہوئے جوتوں کو ہی فوجی بوٹ سمجھ لیا کیونکہ پریڈ بالکل ہو بہو ہونی چاہئے تھی تبھی تو افسر خوش ہو سکتے تھے۔ لیفٹ رائٹ کرتا ہوا کبھی وہ جلدی جلدی چلتا کبھی دھیرے دھیرے اور کبھی اکڑ کے کھڑا ہو جاتا اور پھر چلنے لگتا اور زمین پر پیر ٹیک ٹیک کر اس نے اپنی ٹانگیں تھکا ڈالیں۔ گرد اُڑا دی اور جسم ہلا ہلا کر اس نے سر سے لے کر پیروں تک پسینہ بہا دیا۔ افسر خوش ہو رہے تھے لیکن اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا اور کچھ دیر بعد وہ تھک ہار کے پسینہ پونچھتا ہوا سلیوٹ مار کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"بہت خوب! گڈ، ویری گڈ!" کہہ کر دونوں افسروں نے اس کی تعریف کی۔ اس کے جسم کو تھپتھپایا اور شاباشی دی۔

اب وہ بالکل لاچار سا چہرہ لئے کھڑا تھا لیکن اس کو یقین ہو گیا تھا کہ سردار جی اب بہت خوش ہیں اور اس کے ساتھ خوب بے تکلف ہو گئے ہیں اس لئے اس کا کام ضرور بن جائے گا۔

ایس ڈی او نے نوکر کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا اور مسرت سے اپنے دوست کے چہرے کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ خوش تھے کہ کرمے کے کرتب دکھا کے انہوں نے اپنے دوست کو خوش کر دیا تھا۔ اُن کا دوست کرمے کی تعریف کر رہا تھا: "میں کسی سرکس یا مداری کا کھیل یا نمائش دیکھ کر بھی اتنا خوش نہیں ہوا جتنا کہ اس وقت ہوا ہوں۔ وندرفل۔"

اب سردار جی خود بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ بولے۔" یہ ہمارے گاؤں کے قریب کا رہنے والا ہے۔ کئی برس جرمنی، فرانس، برما وغیرہ میں رہ چکا ہے۔ کرتب تو آپ نے دیکھ ہی لئے، میرے یہاں آیا تو میں نے سوچا کہ آدمی کام کا ہے۔ فوراً ورکشاپ میں رکھ لیا۔ اب عیش کرتا ہے۔"

کرمے کا سر جھک گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے۔

اس کی فیملی کے باقی لوگ مزارعوں کا کام کرتے ہیں۔" سردار بولتا گیا۔" اس کی اپنی بھابی کے ساتھ خوب چھنتی ہے۔ لیکن بہو نہیں ہے ہی ہی!"

"کیوں بھئی۔ ٹھیک ہے؟" فوجی افسر نے کرمے سے بات کی تائید کے لئے پوچھا۔

اُس نے انجانے ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تیری بھابی کا اب کیا حال ہے؟ لڑتی تو نہیں تیرے ساتھ؟ تجھ سے اس کی ۔ ۔ ۔ ۔" سردار نے محبت سے پوچھا۔

لیکن فوجی افسر نے بات کاٹ کر کہا۔" بھابیاں کبھی لڑتی نہیں سرداجی بھابیاں تو گویا ۔ ۔ ۔ اس کی بھابی تو خوب صورت ہوگی۔؟ کیوں بھائی؟"

یہ چوٹ برداشت کر کے بھی کرما خاموش رہا۔

سردارجی نے کہا۔ خوب صورت نہ بھی ہو تو بھی جوان تو ہوگی، ہی گٹھے ہوئے بدن والی۔ ایک پکے آم کی طرح:"

"کیوں بھئی۔ تیرے ساتھ اس کی بنتی ہے کہ نہیں؟"

دونوں سرداروں کی آنکھوں میں طنز چھلک رہا تھا۔ کرما اب بھی کچھ نہ بولا۔ اس کا سر نیچا ہو گیا اور آنکھوں میں پانی بھر آیا اور کھارے پانی میں یکدم نمبردار کے بیٹے کا شرارتی چہرہ اُبھر آیا۔

دونوں سردار کوئی دوسری بات کہہ کر شرارت بھری ہنسی ہنس رہے تھے۔

"نمبردار کے بیٹے اور ان میں کیا فرق ہے؟" کرما سوچتے سوچتے رک گیا۔ اس کا جسم تھک چکا تھا اور درد سے دماغ اب ایسا ہو رہا تھا جیسے بھیجا کھوپڑی میں کھول رہا ہو۔ اس کو لگا کہ زور زور سے چیخ پڑے۔ دہاڑ مار کر رو پڑے اور ہی ہی، ہی ہی کر کے ہنستے ہوئے سرداروں کے منہ پر تھوک کر یہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ نمبردار کے بیٹے سے بھی تو وہ کچھ نہ کہہ سکا تھا۔

اُس نے سُنا سردارجی اس سے کہہ رہے تھے:" اچھا: بھئی۔ کرم سنگھ۔ جانے سے پہلے اب پیرس کی میم والی بات سُنا دے ۔ ۔ ہاں ہاں۔ کردے شروع؛ شاباش: بیٹھ کر ہی سہی۔"

کرما بیٹھ گیا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

"شرم مت کر۔ یہ سردارجی اپنے جیسے ہی ہیں۔" ایس ڈی او نے پھر کہا۔

لیکن کرما اتنا ہی بول پایا:" سردارجی۔ مجھے اب معاف کیجئے۔ میں ۔ ۔ ۔ میرے گھر پر مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ میرے بھائی کی موت ہوگئی ہے جی ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ میں پندرہ دن سے کام پر نہیں آسکا۔ اور میری غیر حاضریاں لگتی رہی ہیں۔"

سردارجی اُٹھے اور نوکر کو جلد چائے لانے کو کہا۔ اُن کے دوست رُول گھماتے ہوئے تاریکی میں پھول پتیوں کو گھور رہے تھے۔

کچھ دیر تک سب خاموش رہے۔ سردارجی کرمے کو مخاطب کرتے ہوئے بولے:" ہاں۔ تیرا بھائی مرگیا۔ بڑے دکھ کی بات ہے۔ تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ پر پندرہ دن غیر حاضر رہنے کا مطلب ہے کہ تو کام کرنا نہیں چاہتا۔"

"نہیں سرکار۔ ایسی بات نہیں ہے۔"

کرما چلایا:" میرے اُوپر دُکھ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ میرا بھائی سخت بیمار تھا اور اب وہ مرگیا ہے۔ بتائیے میں کیسے کام پر آتا؟" وہ سسک رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آنے لگا تھا۔

اس کی بات اَن سنی کر کے سردارجی نے پھر کہا۔ جو کام میں تیرا جی ہی نہیں لگتا تو عیش کر بھئی۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ تیری زندگی ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔"

"سرکار۔ میں کام سے تو جی نہیں چراتا ۔ ۔ ۔" کرمے نے دل نکال کر سامنے رکھ دیا۔

لیکن سردارجی نے ان سنی کر کے کہا:" دراصل تجھے سالے پیسے گھر میں دینے پڑتے ہیں اس لئے تو کام سے جی چراتا ہے۔ جن کے بھائی مر چکے ہیں۔ وہ بھی تو کام کرتے ہی ہیں۔"

اب کی بار کرما پھوٹ پڑا اور اُس نے پگڑی کے پلّو سے اپنا منہ چھپالیا۔ اس کی حالت ایک ایسے گھائل کی طرح تھی جس کے تازہ گھاؤوں پر نمک چھڑک کر پٹّی باندھی جارہی ہو۔ وہ رو رہا تھا لیکن رو نہیں پا رہا تھا۔

سردارجی کو اُس پر ترس آگیا۔ اپنے دوست کی جانب دیکھ کر وہ بولے:" یہاں شاید اس کا دل نہیں لگتا۔ اب تو اور بھی دُکھی لگتا ہے اور شاید ورکشاپ میں کام نہ کر سکے۔ آپ اس کو اپنے ساتھ یوپی لے جایئے۔ آدمی اچھا ہے۔

"چلا چل۔ فوجی افسر نے اپنا رُول گھماتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ دو روٹیاں کھا لیا کرے گا۔ آدمی تو کھوٹا نہیں ہے۔"

۔ کسی باگڑنی سے اس کا بیاہ بھی کروا دینا۔ سردارجی نے

(بقیہ ص ۴۴ پر)



جدید اردو شاعری

میری نظر میں

اختر بستوی

"جدیدیت" اُردو ادب کا سب سے نیا فیشن ہے۔ "فیشن" کا لفظ میں نے کسی تحقیر کے لیے نہیں استعمال کیا ہے بلکہ اُردو کے شعری ادب میں جدیدیت جس قسم کی چیز کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئی ہے اور نوجوان اہلِ قلم اس کی طرف جس طرح راغب ہوئے ہیں اس کی وضاحت کے لیے میری دانست میں "فیشن" سے زیادہ موزوں لفظ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ہر فیشن میں لازمی طور پر ندرت کی صفت پائی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ مروجہ طرز سے مختلف ہوتا ہے اس مسلمہ اصول کے تحت کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، بدلتے ہوئے حالات کی بدلتی ہوئی ضروریات کے لحاظ سے اس میں افادیت بھی ہوتی ہے۔ سماج کا ایک طبقہ جو ماضی کی روایات سے اپنے آپ کو اچانک منقطع کر لینا مناسب نہیں سمجھتا اس کی مخالفت کرتا ہے لیکن نئی نسل کے بہت سے افراد اسے فوراً اپنا لیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو اس کے فوائد و محاسن کو پیشِ نظر رکھ کر سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اُسے اپناتے ہیں مگر ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوا کرتی ہے جو محض اس لیے خود کو اس رنگ میں رنگ لیتے ہیں کہ اس طرح انہیں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا موقع ملے گا اور عوام و خواص کی نظریں اسی بہانے ان کی طرف بھی اٹھیں گی۔ جدید شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں فیشنوں کی طرح جدید شاعری کو بھی چند افراد کا اختراع قرار دیتا ہوں۔ یہاں اگر جدیدیت کے لیے فیشن کی مثال ہمارا

ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ادب اور شاعری کو ایک ایسے دھارے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کبھی ایک جگہ ٹھہرا نہیں رہتا بلکہ ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے اور نئے نئے مقامات و مناظر سے ہو کر گزرتا رہتا ہے۔ موجودہ دور کی پیچیدگیوں اور لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی ہوئی صورتِ حالات نے جہاں زندگی میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کی ہیں وہاں اس کی وجہ سے دُنیا کے ہر گوشے میں بولی جانے والی زبانوں کے ادب میں بھی انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ چنانچہ جدیدیت کی تحریک بھی دورِ حاضر کے فکری و سماجی پس منظر میں اُبھری ہے اور اسے ادب و زندگی کے ارتقائی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔ اس کے اثرات کسی ایک زبان تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر ادبی تحریک کی حیثیت سے سامنے آئی ہے۔ آج کل کسی زبان کا ادب بھی دنیا کی دیگر زبانوں کے ادبی اثرات سے محفوظ و منقطع نہیں رہ سکتا۔ اردو زبان کے ادب پر بھی جدیدیت کی عالمگیر تحریک کے ہمہ گیر اثرات کا عکس پڑنا لازمی تھا۔

آج کل ہم اردو شاعری میں جو نئی کروٹیں دیکھ رہے ہیں وہ انہیں اثرات کا نتیجہ ہیں اور بنیادی طور پر ان کی مخالفت کرنا یا اُن کا مضحکہ اڑانا گویا بھری دوپہر میں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر دھوپ کے وجود سے انکار کرنا ہے مگر ہر نئی ادبی تحریک بعض قسم کی شدت پسندی بھی اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔ جس کی وجہ ایک تو نظریاتی انتہا پسندی ہوتی ہے اور دوسری وجہ اس تحریک کے

مبلغوں اور علمبرداروں کی عملی بدعنوانیوں اور بے احتیاطیوں پر مبنی ہوتی ہے۔ اس شدت پسندی کی مخالفت اس وجہ سے ضروری ہوتی ہے کہ اس کے بغیر نہ تو اعتدال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ نوزائیدہ ادبی تحریک کی صالح روایات قائم ہو سکتی ہیں۔

اُردو کے جدید شعراء نے اپنے تخلیقی کارنامے دکھانے کے لئے نظموں کی طرف بھی توجہ کی ہے اور غزلوں کی طرف بھی۔ نظموں کے جو نمونے وہ پیش کر رہے ہیں وہ موضوعاتی اعتبار سے پرانی شاعری سے پوری طرح مختلف ہیں اور کافی حد تک عہدِ حاضر کے افکار و احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے یہ نظمیں بعض معاملات میں اُن نظموں سے مماثلت رکھتی ہیں جو میرا جی اور ن۔م راشد وغیرہ نے ہندوستان کی آزادی سے دس پندرہ سال قبل کہی تھیں اور اس اعتبار سے جدید شعراء نظموں کی ہیئت کے جو تجربات کر رہے ہیں انہیں جدت (Originality) کے بجائے تجدید (Revival) کہنا زیادہ مناسب ہوگا لیکن ہیئت کے مسئلے پر بعض ایسے نکات بھی جدیدیوں نے اپنے مضامین میں پیش کئے ہیں اور اُنہیں اپنی نظموں میں برت کر دکھایا ہے، جو مذکورہ بالا شعراء کی دسترس سے باہر کی چیز تھے۔ جدید شاعروں کی جدید ترین طرز کی آزاد نظموں پر بہت سے اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ اُن میں سے کچھ اعتراضات میں اپنے ایک حالیہ مضمون میں پیش کر چکا ہوں۔ جن کا یہاں اعادہ کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس وقت میں صرف ان بے اعتدالیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو جدید شعراء کی غزلوں میں نظر آتی ہیں۔

جدید شعراء کی غزلیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اُردو شاعری کی اس صنف کو پوری طرح اُدھر پال کر دینا چاہتے ہیں۔ افکار و موضوعات کے اعتبار سے وہ شعرائے متقدمین، متوسطین و متاخرین کے موادِ شعری سے بالکل ہی قطع تعلق کر کے اُردو غزل کو دورِ آہن و فولاد کے پیچیدہ و گنجلک مشاہدات و محسوسات سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں اور الفاظ و تراکیب کے لحاظ سے اُردو غزل کا ڈھانچہ یکسر بدل کر اُسے آج کل کی عام کھڑی زبان کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے ہیں۔

جدید غزلوں کے اشعار جن موضوعات و خیالات پر مشتمل ہوتے ہیں وہ اتنے نئے ہیں کہ آج سے پہلے کبھی انہیں غزل میں ادا نہیں کیا گیا تھا اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تعریف کی جانی چاہئے لیکن اگر آپ رسائل میں شائع ہونے والی جدید طرز کی غزلیں برابر پڑھتے رہے ہوں گے تو آپ نے یہ بھی غور کیا ہوگا، کہ پرانے موضوعات کو ترک کر کے جدید شعراء نے شروع شروع میں جن موضوعات پر طبع آزمائی کی تھی وہی اب رفتہ رفتہ ان کے مستقل موضوعات بنتے جا رہے ہیں، اور اس طرح اُن میں بھی ایک قسم کی فرسودگی سی آتی جا رہی ہے۔ اگر اس عیب کا سدباب نہ کیا گیا تو جدید شعراء کی غزلیں بھی موضوعاتی اعتبار سے پرانی غزلوں کی طرح چچوڑی ہوئی ہڈیاں بن کر رہ جائیں گی۔ ممکن ہے اس سلسلے میں یہ جواز پیش کیا جائے کہ ہر دور کے کچھ خاص افکار و تاثرات ہوا کرتے ہیں اور ایک خاص مدت تک ادبی تخلیقات میں ان کی تکرار ناگزیر ہوتی ہے۔ اگر پرانے غزل گو صدیوں تک ایک ہی لکیر پیٹتے رہے تو جدید شعراء پندرہ بیس سال تک ایک ہی راگ کیوں نہ الاپیں؟ میں اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارا آپ کا زمانہ گزشتہ زمانوں سے مختلف ہے۔ اس دور میں دنیا کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی اور اس کے مسائل و محسوسات بہت ہی تیز رفتاری کے ساتھ بدلتے ہیں لہٰذا موجودہ زمانے میں چند ہی موضوعات کے سہارے شاعری کی گاڑی کو کافی دنوں تک چلاتے رہنا نہ صرف یہ کہ جدیدیت کی سب سے بڑی صفت یعنی "ندرت" کے حق میں سمِ قاتل ہے بلکہ غیر فطری بھی ہے۔

موضوعات کے ساتھ ساتھ غزل کی ہیئت کو بدلنے کے لئے بھی چند ایک جدید شعراء نے ناکام کوششیں کی ہیں۔ کچھ دن ہوئے ایک رسالے میں مظہر امام صاحب کی ایک ایسی غزل میری نظر سے گزری تھی جس میں انہوں نے مصرعوں کو چھوٹا بڑا کر دیا تھا لیکن ردیف قافیہ کی پابندی کا لحاظ رکھا تھا۔ اس قسم کی کوششیں میرے خیال سے انتہائی مہلک ہیں اور اگر خدا نہ خواستہ اُن کا رواج عام ہو گیا تو غزل بالکل ہی فنا ہو جائے گی اور اس کی جگہ پر ایک بالکل ہی عجیب و غریب سی صنفِ شاعری جنم لے گی۔ لیکن خیریت یہ ہے کہ جدیدیت کے مبلغوں نے اس طرح کی کوششوں کو خود بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا اور اس راہ پر مزید قدم نہیں بڑھائے۔

سب سے بڑا انقلاب جو جدید شعراء غزل کی دنیا میں برپا کر رہے ہیں وہ الفاظ و تراکیب سے تعلق رکھتا ہے اور اُسے میں ایک انقلاب کہتا ہوں بلکہ اس کو انقلاب کہنا بھی بیجا ہوگا۔ زیادہ اچھا یہ ہے کہ اسے بغاوت کہا جائے۔ اب تک اُردو غزل کی اپنی ایک مخصوص زبان تھی اور اس کے الفاظ معمولی لفظوں کے بجائے علامتوں کی حیثیت رکھتے تھے۔

غزل کی یہ زبان کسی ایک ہی شاعر یا کسی ایک ہی دور کے شعراء کے

ایک مخصوص گروہ نے نہیں بنائی ہے۔ بلکہ صدیوں تک ہزارہا اساتذہ نے مشقِ سخن کی ہے تب جاکر یہ خوبصورت و بلیغ زبان وجود میں آئی ہے۔ جدید شعراء غزل کی اِس جامع زبان کے شاندار محل کو ڈھا رہے ہیں اور اس کی جگہ پر انتہائی بدشکل عمارت تعمیر کر رہے ہیں۔ اِن لوگوں نے غزل کی زبان کے اُن تمام مستعمل علاماتی الفاظ کا احترام کرنا چھوڑ دیا ہے اور اُن سے قصداً گریز کرنے لگے ہیں جن کی بدولت غزل کی زبان دوسری اصناف کی زبان سے مختلف و منفرد ہوا کرتی تھی اور انتہائی بے احتیاطی اور آزادی کے ساتھ ہر طرح کے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ ان میں کثیر تعداد ایسے لفظوں کی ہوتی ہے جو غزل کے مزاج سے بالکل ہی میل نہیں کھاتے۔

اس طریقۂ کار کے حامیوں کی دلیل یہ ہے کہ اگر غزل کی زبان کا ڈھانچہ پوری طرح نہ بدلا گیا تو وہ نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے گی۔ وہ لوگ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں شدت پسندی سے کام لینا بھی ضروری ہے اور عمداً ایسے الفاظ کا جا و بیجا استعمال کرنا لازمی ہے جو اب تک غزل میں نہیں برتے جاتے تھے۔ کیونکہ توڑ پھوڑ کے بغیر کسی قسم کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس خیال کا اظہار بھی کیا جاتا ہے کہ اب پرانی علامتوں کی جگہ نئی علامتوں کی تخلیق ہونی چاہیئے۔

جہاں تک دورِ حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کا سوال ہے، یہ بات کافی بحث طلب ہے کہ غزل کی مخصوص زبان اب اتنی ناکارہ ہو چکی ہے کہ موجودہ دور کے احساسات و مسائل کا اظہار اس کے توسط سے ہو ہی نہیں سکتا لیکن اگر ہم اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ غزل کی زبان کو وسعت دینے کی ضرورت ہے تب بھی الفاظ کے معاملے میں مذکورہ بالا شدت پسندی کا جواز نہیں نکلتا کیونکہ ہر قسم کی تعمیر کے لئے یہ اصول درست نہیں ہے کہ توڑ پھوڑ ضرور کی جائے۔ غزل کی زبان کو وسیع کرنے کا خیال جدیدیوں کے ذہنوں میں پہلے پہل نہیں آیا ہے بلکہ ہر دور میں عملاً اس کو وسعت دی جاتی رہی ہے۔ فصیح الملک داغ دہلوی نے اس میں بہت سے ایسے الفاظ رائج کئے جو اس سے پہلے غزل کے لئے غریب و ثقیل تصور کئے جاتے تھے اس طرح اقبال نے اپنی فلسفیانہ اور مقصدی شاعری کی ضرورتوں کی بنا پر اُردو غزل کے خزانۂ الفاظ میں بیش قیمت اضافے کئے۔ اگر جدید شعراء بھی اسی طرح کے اضافوں سے غزل کو مالامال کرتے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا لیکن مندرجہ بالا اساتذۂ سخن کے روّیے اور جدیدیوں کے طریقۂ کار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جدیدیت کے علمبردار اپنی غزلوں کے لئے لفظوں کا انتخاب کرتے وقت اس بات میں تمیز نہیں کرتے کہ وہ الفاظ نظموں کے لئے منتخب کر رہے ہیں یا غزلوں کے لئے، اور انھیں اس امر کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ غزل اُردو کی دوسری اصنافِ سخن سے کافی حد تک مختلف ہے اور چونکہ اس کی اپنی بعض بہت ہی پائیدار روایات ہیں اس لئے اس کی زبان میں کسی قسم کی توسیع ایک ہی جھٹکے میں ممکن نہیں ہے بلکہ تدریجی اور شستہ رو ترمیمات کے ذریعے ہی اسے وسعت دی جا سکتی ہے۔ رہا سوال نئی علامتوں کی تخلیق کا تو بنیادی طور پر یہ کوشش انتہائی مستحسن ہے اور اس سے اُردو غزل کو بہت فائدہ پہونچے گا لیکن اس معاملے میں بھی روّیہ وہی ہونا چاہیئے، جس کا میں ابھی ابھی ذکر کر چکا ہوں۔

غزل

رائے منوہر لال بہار

ہوش کو ڈھونڈنے جائیں کہاں میخانوں میں
ہو گئے گم وہ چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

ہم کو کافی ہے جلانے کے لئے دل کا چراغ
نکہ کیا ہے جو اندھیرا ہے شبستانوں میں

حالتِ دل مری آنکھوں سے نمایاں ہوگی
جو ہے شیشے میں وہی آئیگی پیمانوں میں

قصۂ عشق کچھ ایسا اثر انداز ہوا
وہ مجھے ڈھونڈھ رہے ہیں مرے افسانوں میں

ظرفِ میخوار کا اللہ رے تحمل ساقی
مے نہیں آگ بھری تھی ترے پیمانوں میں

جل رہے ہیں جو نشیمن تو کوئی بات نہیں
یہ ہے کیا کم کہ چراغاں ہے گلستانوں میں

اتنا جینے کا سہارا بھی رہے کیوں باقی
آیئے آگ لگا دیجئے ارمانوں میں

فصلِ گل کا ہے عجب رنگ گلستاں میں بہار
میری توبہ بھی گری ٹوٹ کے پیمانوں میں

نئی کتابیں

لالہ زار (سفرنامۂ ایران و عراق) از اطہر شیر

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۳۸ صفحات، معمولی جلد مع گرد پوش،
قیمت: تین روپے، سال اشاعت: ۱۹۶۹ء
ملنے کا پتہ:- منظر حسن، محلہ باقر گنج پٹنہ ۴

زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف جناب اطہر شیر صاحب ریاست بہار کے ایک نوجوان ادیب ہیں۔ موصوف کو حکومتِ ایران کی طرف سے ۶۷-۱۹۶۶ء کے لئے آریا مہر اسکالرشپ ملا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے کوئی سات ماہ تہران میں قیام کر کے فارسی زبان و ادب کا مطالعہ کیا اور وہاں کے مشہور اساتذہ سے استفادہ کیا۔ پیشِ نظر کتاب اسی زمانے کا۔ نومبر ۱۹۶۶ء تا جون ۱۹۶۸ء ۔ روزنامچہ ہے۔ اگرچہ روزنامچے میں چھوٹی چھوٹی باتوں نے زیادہ جگہ حاصل کر لی ہے اور سفرنامے کی حیثیت سے اس کی سطح بہت اونچی نہیں ہے مگر پھر بھی دلچسپی اور فائدے سے خالی نہیں، اور اس کتاب کے دیباچہ نگار جناب سید علی حیدر نیر صاحب کے الفاظ میں اس کی حیثیت ایسے کتابچے کی ہے جس کی اشد ضرورت سفرِ ایران کے سلسلے میں کسی نو وارد کو ہو سکتی ہے، علاوہ ازیں اس میں ایسے مواد بھی فراہم کر دیئے گئے ہیں جن سے موجودہ ایران سے متعارف ہونے میں مدد مل سکتی ہے"

اس کو میں نے از اول تا آخر غور اور توجہ سے پڑھا ہے۔ کتاب بہرحال دلچسپ اور معلومات افزا ہے، اگر مصنف طالب علم سے بلند ہو کر ایک محقق اور عالم کی حیثیت سے اسے لکھتا تو اردو کے سفرناموں میں، جن کی تعداد بہت کم ہے، ایک اونچی جگہ حاصل ہوتی اور اس صنفِ ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہوتا۔ مجھے اس میں جابجا زبان اور محاورے کی غلطیاں نظر آئیں جن پر واقعی مجھے سخت تعجب ہوا۔ ان کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس کتاب کے مصنف عربی اور فارسی کے فاضل اور مشرقی علوم کے ایک مشہور کتب خانہ کے اہم عہدہ پر فائز ہیں۔ ورنہ کتاب کی دلچسپی اور افادیت پر بہرحال اُن سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

معمارِ وطن :- آلِ احمد آوج بدایونی

سائز ۲۲×۳۰/۱۶، حجم ۱۲۸ صفحات، تاریخِ اشاعت ۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء
قیمت درج نہیں، ناشر: انجمن ذوق الادب۔ بدایوں (یوپی)

بدایوں اترپردیش کا ایک ایسا قصبہ ہے جس نے بہت اچھے عالم اور ادیب و شاعر پیدا کئے جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں ملک و قوم اور علم و ادب کی شاندار خدمت کی جسے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ محترم باپو- مہاتما گاندھی ۔ وہاں دو مرتبہ تشریف لے گئے۔ مرتب کے بیان کے مطابق "پہلی بار وہ خادمِ خلائق مولانا عبدالماجد بدایونی کے ایما پر ۱۲ مارچ ۱۹۲۱ء کو اپنی شریکِ حیات کے ساتھ تشریف لائے اور مدرسہ قادریہ میں قیام پذیر ہوئے اور قومی جلسوں میں شرکت فرمائی۔ دوسری مرتبہ ۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو سرزمین بدایوں کو رونق بخشی اور ڈاکٹر لچھمی نراین رائے زادہ کے دولت کدہ پر قیام فرمایا، اس مرتبہ آپ نے گرو کل، سورج کنڈ، اور آریہ کنیا پاٹ شالہ کو اپنے قدموں سے عزت بخشی اور ایک بڑے مجمع کو خطاب کیا" (صفحہ ۱۲) اس مناسبت سے بدایوں کی انجمن ذوق الادب نے جس میں وہاں کے سربرآوردہ ہندو مسلم ادیب و شاعر شامل ہیں، گاندھی جی کی اس شتابدی کے موقع پر بطور خراجِ عقیدت زیرِ تبصرہ مختصر کتاب شائع کی ہے جس میں ملک کے سیاسی اور سرکاری حضرات کے علاوہ ادیبوں کے پیغامات شامل ہیں اور بدایوں کے ادیبوں کے مختصر مضامین اور شعراء کا کلام شامل ہے۔ علاوہ ازیں فاضل مرتب کے قلم سے ایک مختصر پیش لفظ بھی ہے جس میں بدایوں کی علمی و ادبی حیثیت پر جناب رفیع الدین احمد سالک رحمانی (ڈسٹرکٹ و سشن جج بدایوں) کے قلم سے مقدمہ ہے۔

نئے معاشرے کا تنہا آدمی از حسن آرزو

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۶۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش۔
قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ: شیر شاہ اکادمی، محلہ شاہ جمعہ، سہسرام (بہار)

آج کل جدید شاعری میں انسان کی "تنہائی" کا بڑا ذکر آتا ہے، شاید اسی سے متاثر ہو کر یہ کتابچہ لکھا گیا ہے۔ اس میں معاشرے کے بارے میں مغرب اور مشرق کے مفکرین کے خیالات پیش کئے گئے ہیں اور آج کل معاشرے میں جو کشمکش نظر آتی ہے، مصنف کے نزدیک اس کی وجہ مذہبی اور اخلاقی اقدار کا زوال ہے۔ اس کا علاج نوجوان مصنف کی رائے میں یہ ہے کہ:

"مسٹر تنہا ہوں یا مسز تنہا ان کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ اپنی گمشدہ مذہبی و اخلاقی قدروں کو از سر نو بحال کر لیں اور اللہ کی رسّی مضبوطی سے پکڑ لیں کیونکہ ایسی ہنگامی حالت میں زندہ رہنے کے لئے "یقینِ محکم" کی دولت مذہب و اخلاق کی گود میں ہی نصیب ہو سکتی ہے۔" صفحہ ۵۷

افسوس کہ کتاب پر کسی جگہ بھی تاریخِ اشاعت درج نہیں ہے۔ یہاں تک کہ "تعارف" پر بھی تاریخ نہیں ہے، اور پیش لفظ پر بھی نہیں۔

(عبداللطیف اعظمی)

سرورِ سرمدی :- ناشاد کانپوری

ناشر :- ناشاد کانپوری پانڈو نگر کانپور

قیمت :- ساڑھے چار روپے - **صفحات** ۲۱۰

جنابِ ناشاد اپنے دلآویز رنگ اور دلدوز آہنگ کی بدولت اب سے بہت پہلے سحر طراز شاعر تسلیم کئے جا چکے ہیں اور اربابِ نقد و نظر نے آپ کو فنِ شعر میں وہ بلند مقام دے دیا ہے جو ہمیشہ سے خوش فکر اور خوش گو شعراء کے لئے مخصوص چلا آتا ہے۔

آپ کا کلام جنسی ہوسناکی، ابتذال اور عریانی سے یکسر پاک ہے۔ آپ کا عشق طنزیہ و طہارت کا پرستار اور شرافت اور پاکبازی کی اعلیٰ قدروں کا علمبردار ہے۔ آپ کے استاد حضرت شیام موہن لال جگر بریلوی کی رائے ہے کہ جو پاکیزگی آپ کی غزل میں ہے اسے اردو غزل میں نوادر سے سمجھنا چاہئے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ناشاد" صاحب کے لب و لہجے میں شائستہ تغزل کا ایسا رنگ ملتا ہے جو اس دور میں مفقود ہے۔" آپ کی غزلوں میں تغزل کے علاوہ فلسفۂ حیات، جبر و اختیار، تزکیۂ نفس، نیرنگِ عالم وغیرہ سے متعلق بھی نہایت عمدہ اشعار ملتے ہیں۔ آپ کے متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ شعر و سخن کے ہنگامۂ ہاؤ ہو میں آپ کی دلنشیں آواز سب آوازوں سے الگ سنائی دیتی اور صاف پہچانی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام

ہم نفس ہم زباں نہیں کوئی ؛ ہم جہاں ہیں وہاں نہیں کوئی
فضائے سرد و عالم جگمگائی ؛ یہ کس نے پھر نقابِ رُخ اٹھائی
کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے ؛ یہی دُنیا میں روز ہوتا ہے
دل سے مجبور ہوں کہ مرتا ہوں ؛ جان کر کون جان کھوتا ہے
سن رہا ہوں نغمہ ہائے سرمدی ؛ رقص پیہم کر رہی ہے زندگی
ہم تو جلوؤں ہی میں کھو کر رہ گئے ؛ سجدہ کیسا اور کیسی بندگی
اک تمنا تھی اُن سے ملنے کی ؛ عمر گذری مگر نہ بر آئی

تیرے در سے اٹھ تو جاؤں تو ہی منصفی سے کہہ دے
ہے مری جبیں کے قابل کوئی اور آستانہ

(منوہر سہائے انور)

وطن

"وطن" حضرت فیاض گوالیاری کی قومی وطنی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کی ۵۰ سالہ شعری کاوشوں کا مرقع ہے۔ ان نظموں میں جہاں انہوں نے اس دھرتی کی رعنائیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ وہاں ہندوستانی زندگی کے قبیح پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور یہ امر اس بات کا مظہر ہے کہ ان نظموں کا شاعر اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک دلِ دردمند رکھتا ہے۔

وطن میں شامل منظومات کے موضوعات سامنے کے اور ہمارے دیکھے بھالے ہیں لیکن فیاض صاحب نے انہیں کمال چابکدستی سے برتا ہے۔ یہ شاعر کے انفرادی مشاہدے اور انفرادی اسلوب کی چھاپ لئے ہوئے ہیں۔ فیاض صاحب کا اسلوب علاوہ دوسرے اجزا کے متعلقات میں ایک دلکش ربط پیدا کرنے کی مستحسن کوشش سے عبارت ہے۔ فیاض صاحب نے ہندوستانی زندگی کے سیدھے سادے نقوش میں حسنِ تخیل اور حسنِ بیان سے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ دیکھی بھالی چیزوں پر مکرر نظر کرتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ یہ ایسی تو نہ تھیں۔ پہلے ایسے نئی تو نہ تھیں

فیاض صاحب کا حسنِ بیان دیدنی ہے۔ انہوں نے سپاٹ سے سپاٹ صورتِ حال میں حسنِ شعریت سے غزل کا سا لطف و اثر پیدا کر دیا ہے۔ یہ خوبی بھی انہیں کا حصہ ہے کہ انہوں نے حسنِ بیان اور زورِ بیان میں اپنے مقصد اور اپنے تجربے اور اپنے مطمحِ نظر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی حب الوطنی کو آفاقیت اور وطن دوستی کو انسان دوستی میں خارج و مانع نہیں ہونے دیا۔

"وطن" کی نظمیں شاعر کی شائستہ حسیات اور نکھرے ستھرے ذوقِ جمال اور سچے احساس، گہرے جذبے، بھرپور مشاہدے اور اعلیٰ تخیل کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کے تخیل میں تازگی اور اسلوب میں تاثر ہے زبان و بیان پر کامل قدرت کی بدولت انہوں نے لفظوں کے ذریعے جو نقش بنائے ہیں وہ بڑے تازہ کار ہیں۔

بڑے سائز کے ۱۵۲ صفحات کے اس باتصویر مجموعے میں ۶۰ منظومات شامل ہیں۔ قیمت ۵ روپے ہے ملنے کا پتہ ہے۔ فیاض گوالیاری، چمن منزل، کرنل صاحب کی ڈیوڑھی، لشکر، گوالیار ۱، مدھیہ پردیش

(راج نرائن راز)

مخدوم محی الدین اُردو کے ممتاز شاعر بے لوث سیاسی رہنما اور بلند پایہ انسان تھے۔ اُن کی اچانک اور بے وقت موت نے ہزاروں انسانوں کو سوگوار کیا اور ملک و قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا۔

ہفتہ وار "نیا آدم" حیدرآباد نے اُن کی یاد میں ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے جس میں اُن کے دوستوں، ساتھیوں، اور مداحوں نے اس عظیم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ بیشتر مضامین، گہرے دکھ اور درد کے مظہر ہیں اور مخدوم کی عظمت کو اُجاگر کرتے ہیں۔

مضامین کے علاوہ شعراء کے منظوم مرثیے بھی ہیں۔ اس شمارے میں مخدوم کی وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے بساطِ رقص کی اشاعت کے بعد کہی تھیں

آخیر میں تصویروں کے آٹھ صفحات ہیں جن سے مخدوم کی زندگی کی مختلف دلچسپیوں اور مصروفیتوں کا علم ہوتا ہے مگر چونکہ ان تصویروں کے نیچے عنوان نہیں دیئے گئے ہیں اس لئے ان سے بجا طور پر استفادہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

"نیا آدم" نے یہ خصوصی شمارہ شائع کر کے ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ لیکن مخدوم کی شخصیت اور عظمت اس سے وسیع تر کوشش کی حقدار ہے۔

اس خصوصی شمارے کی قیمت ۲ روپے اور ضخامت ۲۰۵ صفحات ہیں، ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ ہفتہ وار "نیا آدم"، معرفت کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا، حیدرآباد سٹی کونسل، حمایت نگر، حیدرآباد۔۲۹

ماہنامہ "شاعر" بمبئی کا مہاتما گاندھی نمبر ایک کامیاب کوشش ہے جس میں مہاتما گاندھی کی شخصیت، نظریات اور تعلیمات کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ ہماری بڑی بدنصیبی ہے کہ اُردو میں مہاتما گاندھی سے متعلق اچھا مواد بہت کم ہے۔ شاعر کے اس خصوصی شمارے نے اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کیا ہے۔

پشپانجلی کے عنوان سے شاعروں کا خراجِ عقیدت شامل کیا گیا ہے اور گاندھی جی کی تحریروں کے اقتباسات اور ان کے منتخب مقولے بھی شامل کئے گئے ہیں۔

۲۷۰ صفحات پر مشتمل یہ خاص نمبر ایک وسیع ادبی کارنامہ ہے جس کے لئے مدیر شاعر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس شمارے کی قیمت چار روپے ہے، اور ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ ماہنامہ "شاعر" مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی۔۸۔ بی سی

آہنگ۔ جگ جیون روڈ گیا، اُردو کا ایک نیا ماہنامہ ہے جس کے دو شمارے پیشِ نظر ہیں۔ اس کے مدیر کلام حیدری اُردو کے جانے پہچانے ادیب ہیں اور ایک عرصے سے ہفتہ وار مورچہ نکال رہے ہیں۔ آہنگ اُن کے صحافتی تجربے اور سلیقے کا مظہر ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ آہنگ کو شروع ہی سے اُردو کے چوٹی کے ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل ہے جو اس کے خوش آیند مستقبل کا ضامن ہے۔

دوسرے ادبی رسالوں کی طرح یہ ماہنامہ بھی مقالوں، افسانوں نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ "ایک شاعر" ایک مطالعہ کا سلسلہ اچھا ہے۔ بہتر ہوگا اگر اس مطالعے میں خود شاعر سے اپنے نظریہ فن کے متعلق بھی کچھ لکھنے کو کہا جائے۔

بحیثیت مجموعی آہنگ ایک صاف ستھرا ادبی رسالہ ہے اور ہم اپنے اس نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ایک شمارے کی قیمت ۸۵ پیسے ہے اور سالانہ چندہ دس روپے ہے

(ادارہ)

سفر مدام سفر (شعری مجموعہ) بلراج کومل

ڈیمائی سائز، صفحات ۱۲۰، قیمت چار روپے

ناشر:۔ شب خون کتاب گھر، الہ آباد

بلراج کومل کی شاعری گزشتہ بیس بائیس سال کی ادبی تاریخ پر محیط ہے اور اس اثناء میں اُن کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے ان کا آخری مجموعہ "سفر مدام سفر" میرے سامنے ہے۔ اس مجموعے میں ان کے پہلے کے دو مجموعوں "میری نظمیں" اور "رشتۂ دل" کی چند منتخب نظمیں بھی شامل ہیں جن سے اُن کے جدید شعری رجحانات کے ارتقائی عوامل کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ بلراج کومل کی نظم "سفر مدام سفر" رابرٹ فراسٹ کی نظم "Stopping By Woods On A Snowy Evening" کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ خود بلراج کومل کا ذہنی ارتقاء ایک ایسے سفر مدام سفر کی مثال ہے جس میں اُن کی شاعرانہ حس رفتہ رفتہ داخل ہوتی ہوئی اور پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی ہوئی چلی گئی ہے۔ عمیق حنفی کے برعکس بلراج کومل، اساطیرو

تلمیحات سے استفادہ نہیں کرتے بلکہ روزانہ تجربوں کی چیزوں سے شعری پیکر اخذ کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا لہجہ وزیر آغا سے زیادہ قریب ہے۔

بلراج کومل کی بیشتر نظموں میں ان کا منفرد لہجہ صاف سنائی دیتا ہے جو نفسیاتی پیچیدگی اور معنوی تہہ داری کا حامل ہونے کی وجہ سے نہایت قابلِ قدر ہے۔ اُن کے وجدان نے شاعری میں "ہو" کا پیکر بڑی خوبی سے ابھارا ہے شاعر جب خود کو ایک ایسے جزیرے میں مقید پاتا ہے جس پر "موجِ امکان" کب کی گزر چکی ہے اور لہروں کی حشر انگیز گرم آواز سے اس کی ذات اَنگنت ذروں میں ٹوٹ کر بکھرنے والی ہے، تو ایسے میں شاعر خود اپنا یا اپنے جذبات کا خون نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ ؟

بلراج کومل کی بعض نظموں میں "وقت" کو اپنی ذات میں جذب کر لینے کا ایک بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ "عالمِ کل"، "کھویا ہوا لمحہ" "سرد تاریک شب" "درد کا لمحہ جاوداں" "دیوار" وغیرہ نظموں میں یہ خوبی خصوصیت کے ساتھ ابھری ہے۔ مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ "ڈرگ اسٹور" "موجِ امکان" "گزرتے لوگ" وغیرہ اُن کی قابلِ ذکر کامیاب نظمیں ہیں۔ بلراج کومل کا ایک اور رجحان کمزوری اور سطحی شاعری کا بھی ہے جو "اکیلی"، "یہ زرد بچے"، "ریڈیو" "اشتکار" "کاغذ کی ناؤ"، "دلکشی اس بزم کی" سے ہوتے ہوئے "بچوں کا جلوس"، "ٹین کے طوطے"، "سرکس کا گھوڑا" اور "بچے اور دشمن" تک پہونچتا ہے میری نظر میں یہ نظمیں بلراج کومل کی کمزور نظمیں ہیں اور ان میں مستعمل شدہ سپاٹ ذہنی پیکر ہمیں لمحۂ فکریہ عطا کرتے نیز تحت الشعور اور لاشعور کی عمیق تہوں سے شعور کی سطح تک کیفیاتی تجربات کی موجیں ابھار لانے سے قاصر ہیں۔ پھر بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ذہن پر بلراج کومل کی اچھی نظموں کی گرفت اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں اُن کی کمزور نظموں کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ "سفر مدام سفر" کتابت، طباعت، اور گیٹ اپ کے لحاظ سے بھی نہایت عمدہ ہے۔

(کرامت علی کرامت)

فاصلے از مدہوش بلگرامی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۲۸ صفحات، قیمت: ڈھائی روپے
ماہ اشاعت: اپریل ۱۹۶۹ء۔ ملنے کا پتہ: بیگم ہوشیار جنگ۔ "ادلار" سیٹن روڈ، باندرا۔ بمبئی ۵۰

زیرِ تبصرہ کتاب کے نوجوان شاعر کا سال پیدائش ۱۹۴۴ء ہے اور فلم میں کام کرتے ہیں۔ اُن کو شاعری کا ذوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا ایک صفحہ کا تعارف ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ "فاصلے" ایک طرح سے ایک بہت اہم مجموعۂ کلام ہے، کیونکہ ان میں زبان سے بے پروائی کا وہ رویہ نہیں ملتا جو اِن دنوں عام ہے۔"

اس کے بعد ایک ہی صفحہ کا تعارف زاہدہ زیدی صاحبہ (شعبہ انگریزی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) کا بھی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ مدہوش کے تاثرات، تجربات، زبان و بیان پر رومانیت غالب ہے اور اُن کا تخیل حسن و عشق اور غم و اندوہ کی بھول بھلیاں میں کھویا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ جو شاید اُن کی اُفتادِ طبع کے علاوہ ان کی عمر کا بھی تقاضا ہے۔"

شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

اب وہ دن میں بھی شب کا عالم ہے ہر صبح ہے شامِ تنہائی
فرقت کا زمانہ ختم سہی اندازۂ فرقت آج بھی ہے
مدہوشؔ مآلِ مدہوشی معلوم نہیں کیا ہو اپنا
تدبیر نہیں بنتی کوئی اور گردشِ قسمت آج بھی ہے

(عبداللطیف اعظمی)

بقیہ پیر پرائے

دوبارہ کہا

"ہاں، ضرور، ضرور"

اور معلوم نہیں کیوں۔ دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑے

تاریکی دھیرے دھیرے دن کے اجالے کو نگلتی جا رہی تھی۔ نوکر چائے لے آیا تھا۔ دونوں سردار اب چائے کی جانب گھومے۔

"کرمے۔ چائے پی لے۔ بھئی" سردار جی نے کرمے کو ہوشیار کیا۔

"آپ پیجئے سرکار" وہ دکھ سے چیختا ہوا دھیرے سے بولا۔ آپ مجھے ڈیوٹی دلا دیجئے سرکار۔ بابوؤں نے میرا ٹکٹ بند کر دیا ہے۔ میں بڑا ہی . . . ."

"اچھا۔ کل دفتر میں آجانا۔ پھر دیکھیں گے جیسا کہے گا کر دیں گے۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟" کہہ کر سردار جی نے چائے کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔

وہ باہر کی جانب چل دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔

(مترجم: مرجیت)

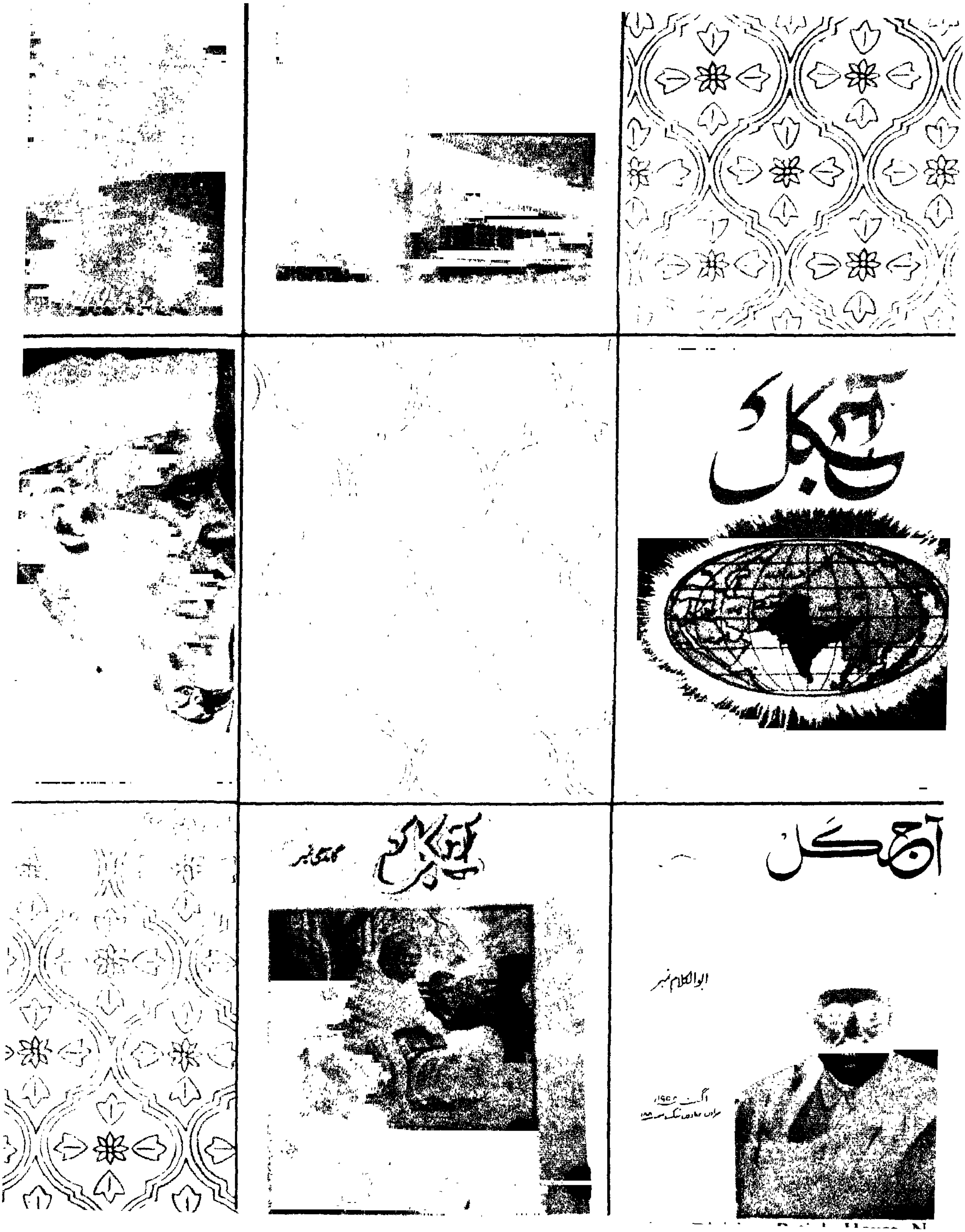


منصوبہ بند کنبہ وہ ہے
جس کے افراد کی دیکھ بھال آپ بخوبی کر سکتے ہیں
بھائی جان ، مجھے بتایئے ، آپ کیسے اتنی اچھی زندگی بسر کرتے ہیں۔
آسان طریقہ ہے ۔ میرا کنبہ چھوٹا ہے —— صرف دو بچے
صرف دو ؟ ہمارے ہاں تو آئے برس بچہ پیدا ہو جاتا ہے ! میں کیا کروں ؟
وہی کیجیے جو کچھ میں کرتا ہوں —— نرودھ استعمال کیجیے۔
اب مُلک بھر میں دستیاب
پروویژن اسٹور ، پرچون فروش ، دوا فروش ، جنرل مرچنٹ اور پان فروش بیچتے ہیں۔
بچے کی پیدائش کو روکنا آپ کے اختیار میں ہے۔
نرودھ استعمال کیجیے
اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ کنڈوم
فیملی پلاننگ کے لئے
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے رعایتی دام

70/2



۲۲ اپریل ۱۹۷۰ کو صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری اپنے چار دن کے دورے پر بھوٹان تشریف لے گئے۔ بھوٹان کے دارالخلافہ تھمپو ہیلی پڈ پہونچنے پر اُن کا شاندار استقبال کیا گیا تصویر میں شاہ بھوٹان ڈرگ گیالپو معزز مہمان کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔


آجکل
گاندھی نمبر
ابوالکلام نمبر

آجکل

جولائی ۱۹۷۰ء

۶۰ پیسے

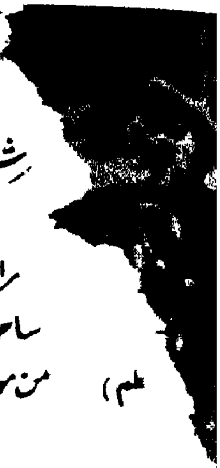


مضمون ہندوستان کے جنگلی جانور صفحہ



مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات شری ستیہ نارائن سنہا، آج کل اُردو اور آج کل ہندی کے جشن سیمیں میں تق
یہ تقریب ۲۶ مئی ۱۹۷۰ء کو ماؤلنکر ہال نئی دہلی میں بڑی شان وشوکت سے منائی گئی۔ اس تقریب میں اُردو اور ہندی کے
ادبا نے شرکت کی۔ (اوپر دائیں سے بائیں) مشہور اُردو شاعر جناب عرش ملسیانی، اطلاعات ونشریات کے وزیرِ مملکت
ممتاز افسانہ نگار اور ناول نویس محترمہ صالحہ عابد حسین، مشہور ہندی ادیب ڈاکٹر نگیندر اور نامور ہندی شاعر رام دھاری سنگھ د
شری گجرال کے پیچھے پبلیکیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر شری چمن لال سچار دواج کھڑے ہیں اور وزیرِ موصوف کو آج کل ہندی کا خا
(نیچے) مہمان ادیب وشعرا جنہوں نے جشن سیمیں میں شرکت کی۔ اگلی قطار میں دائیں طرف آج کل ہندی کے کہانی مقابلے میں
بیٹھے ہوئے ہیں۔





.وکتابت و ترسیلِ زر کا پتہ

ں ایڈیٹر آج کل' پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

اردو کا مقبول عوام مصور ماھنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۲۸ — شمارہ ۱۲

جولائی ۱۹۷۰ء

اساڑھ ساون شک سمت ۱۸۹۲ء

سرورق

بارہ سنگھوں کا جھنڈ

سالانہ چندہ ۷۔ ہندوستان میں ۷ روپے۔ پاکستان میں ۷ روپے (پاک)

دیگر ممالک میں ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ ۱۔ ہندوستان میں ۷۰ پیسے ، پاکستان میں ۷۰ پیسے (پاک)

دیگر ممالک میں ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

۲۶ مئی ۱۹۷۰ء کو ماؤلنکر ہال نئی دہلی میں آج کل (اُردو) اور آج کل (ہندی) کی سلور جوبلی کی تقریبات شان و شوکت سے منائی گئیں۔ اِس جلسے میں اُردو اور ہندی کے نامور ادبار و شعرا رنے شرکت کی

مرکزی وزیرِ اطلاعات و نشریات جناب ستیہ نارائن سنہا نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج کل (اُردو) اور آج کل (ہندی) ملک کے ہر علاقے کے ادَب کی عمدہ اور منتخب تخلیقات شائع کرکے اہم قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ملک کی زبانوں میں کس طرح کا ادب تخلیق کیا جارہا ہے اُن کا رجحان کیا ہے اور اب اُن کی کس طرح ترقی ہورہی ہے اور دوسری جانب اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دیش کی مختلف زبانوں کے ادَب میں نظریات اور خیالات کی کیسی ایکتا پائی جاتی ہے

وزارتِ اطلاعات و نشریات کے وزیرِ مملکت جناب اندر کمار گجرال نے کہا کہ ۲۵ برس تک کسی رسالے کی مسلسل اشاعت خوشی کی بات ہے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ ۱۹۷۲ء میں جو لوگ ووٹ دیں گے اُن میں ۵۴ فی صد ووٹر بالکل نئے ہوں گے۔ اُنہوں نے مختلف اعداد و شمار کے ذریعے بتایا کہ اس وقت ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کی عمر ۲۰ سے ۳۵ سال کے درمیان ہے۔ اس لئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ آج کل اُردو اور ہندی کو نوجوان لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنی چاہئے اور اُنہیں ملکی حالات، ثقافت اور فنونِ لطیفہ کی جانکاری بہم پہونچائی جانی چاہئے۔

مشہور شاعر اور آج کل کے سابق ایڈیٹر جناب عرش ملسیا[نی]... اُردو کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نویس محترمہ صالحہ عابد حسین نے آج[کل] اُردو کی خدمات اور خصوصیات پر روشنی ڈالی اور ان علمی ادبی روایتو[ں کا] ذکر کیا جو آج کل اُردو نے اپنی ۲۸ سالہ زندگی میں قائم کیں۔ عرش صاحب نے آج [کل] کے خاص نمبروں کا ذکر خصوصیت سے کرتے ہوئے کہا کہ آج کل نے مختلف اور موضوعات پر جو خاص نمبر شائع کئے ہیں، اُردو میں اُن کی حیثیت مُنب[فرد] اور مقدم ہے، اور یہ کہ اس سے پہلے ان فنون اور موضوعات پر اُردو میں خاطر خواہ مواد دستیاب نہ تھا۔

آج کل اُردو اور آج کل ہندی کے جشنِ سیمیں کی اس مشترکہ تقریب [میں] ہندوستان کے مشہور ہندی شاعر جناب رام دھاری سنگھ دنکر نے آ[ج کل] ہندی کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہندی میں ہفتہ وار رسائل [آن بان] شان سے نکل رہے ہیں لیکن ماہانہ جرائد کی روایت آہستہ آہستہ کم ہوتی جا [رہی] ہے۔ پہلے چاند مادھوری وغیرہ متعدد قابلِ ذکر ماہنامے شائع ہوتے [تھے مگر] زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے۔ ماہنامہ آج کل ہندی نے اپنے ادبی [سفر] کے ۲۵ برس کے ۲۵ سنگ میل طے کرلئے ہیں۔ یہ خوشی کا مقام ہے۔

مشہور ادیب اور دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ ہندی کے صدر ڈا[کٹر] نگیندر نے بھی آج کل کی ادبی خدمات کو سراہا۔

عبدالماجد دریابادی

غبارِ کارواں

(٦)

ہم نے اردو ادبا و شعرا سے گذارش کی تھی کہ وہ ہمیں لکھ بھیجیں کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں کون کون سے عناصر کارفرما رہے ہیں اور وہ کن افراد، واقعات یا کتابوں سے متاثر ہوئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ مضمون اسی سلسلے کی چھٹی کڑی ہے۔ اس سے پیشتر محترمہ صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر اختر اورینوی، ڈاکٹر گیان چند، پروفیسر جمیل مظہری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ ادارہ

لکھنؤ سے پورب کی جانب، فیض آباد کو ریل سے چلئے، جو خود اودھ ارالحکومت رہ چکا ہے، شجاع الدولہ کے زمانے تک۔ تو آدھو آدھ پر ـ اسٹیشن ملے گا، دریاباد۔ اسٹیشن سے ڈیڑھ دو میل دُور شمال میں چلئے صل قصبہ میں پہونچ جائیے۔ اودھ کے قصبات میں تھوڑی بہت امتیازی حیثیت ، ہوئے شروع انگریزی حکومت میں بجائے بارہ بنکی کے یہی ضلع تھا۔ ضلع کیا معنی تحصیل بھی نہیں۔

قصبہ کی بنیاد، آج سے کوئی ۵½ سو سال قبل، شاہان شرقیہ جونپور زمانہ میں پڑی۔ اس وقت ان اطراف کے حاکم کوئی صاحب دریا خاں نامی ۔ وہی میرے خاندان کے مورثِ اعلا، شاہ مخدوم محمد آبکش خلیفہ ابوالفتح پوری کو ایک متصل قصبہ محمود آباد سے لے کر آئے اور اپنے نام پر اس سہ کو آباد کرایا۔

اس قصبہ کے ایک قدوائی خاندان میں اس ننگِ خلائق کی پیدائش ملا مارچ ١٨٩٢ء میں ہوئی۔ سنہ ہجری کا مہینہ شعبان کا تھا (انگریزی کی تاریخ غالباً ١٦ تھی) نام ابھی قدوائی خاندان کا آیا ہے، دو لفظوں میں اس کی بت بھی سُن لیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے بزرگ قاضی معزالدین تھے، جنہیں احتراماً قدوۃ العلم والدین کہتے تھے۔ قاضی قدوہ اسی کا مخفف ہے مشہور کہ سلطان محمود غزنوی کے ہم عصر تھے۔ ہندوستان آکر قصبہ اجودھیا (ضلع آباد) میں آباد ہوئے۔ (اجودھیا ہی کا دوسرا نام اودھ ہے) اور اُن کی اولاد اودھ کے قصبات میں پھیل گئی۔ بڑاگاؤں، گدیہ، مسولی، رسولی، جگدر سہیارہ وغیرہ میں اب تک اُن کی آبادیاں موجود ہیں۔ ہمارے نسب ناموں میں اُن کا اسرائیلی ہونا درج ہے حضرت ہارون کی نسل سے تھے جن کا سلسلہ بائبل میں دیئے ہوئے شجرہ کے مطابق لاوی بن یعقوب پر ختم ہوتا ہے۔ اودھ کے عربی النسل شیوخ (صدیقی، عثمانی وغیرہ) بلکہ سادات تک نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور مناکحت کے رشتے ان سے کثرت سے قائم کئے۔

میرے دادا چار بھائی تھے۔ منجھلے کا نام مفتی مظہر کریم تھا۔ بڑے کا نام مولوی حکیم نور کریم تھا۔ جو میرے حقیقی نانا بھی تھے۔ اُن کی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا اور طبیب سے بڑھ کر طبیب گر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ مگر علاج اور مطب ایک خاص سن آجانے کے بعد قطعاً چھوڑ دیا تھا۔[ل] اور مشغلہ صرف مدرسی کو بنا لیا تھا۔ ساتھ ہی خطاط و خوشنویس بھی اعلا درجے کے تھے۔ خدا جانے کتنی کتابیں، تاریخ، حدیث تفسیر، لغت وغیرہ ہر علم و فن کی اپنے ہاتھ سے نقل کر ڈالیں۔ متعدد اب تک موجود ہیں۔ تالیف و ترجمہ سے بھی ذوق تھا۔ دو کتابیں

ل مطب چھوڑنے کا سبب بھی کچھ کم دلچسپ نہیں، فرنگی محل سے بڑے خصوصی تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ وہاں سے طلبی آئی، دسمبر کی سردی تھی اور رات کا وقت جھاڑے کا پانی برس رہا تھا۔ کوئی سواری بھی اس وقت نہ ملی، پیدل چلے گئے۔ واپسی میں جوڑوں اور ٹانگوں میں شدید درد پیدا ہو گیا بس اسی وقت سے عہد کر لیا کہ پیشہ چھوڑے دیتا ہوں جب تک پیشہ کروں گا کہیں اور کسی وقت جانے سے انکار کیسے کروں گا۔

زیادہ مقبول ہوئیں۔ ایک شفاء الامراض، دوسری ہے مخزن الادویہ۔ سالِ وفات ۱۸۷۱ء۔

دادا صاحب اپنے وقت کے ایک جید فقیہہ و عالم تھے، تحصیل علم فرنگی محل (لکھنؤ) میں مولوی عبدالحکیم صاحب سے کی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت شاہجہاں پور میں کلکٹری میں سررشتہ دار تھے۔ الزام ان پر یہ لگا (خدا معلوم صحیح یا غلط) کہ باغی اُن کے مکان پر جمع ہو کر بغاوت کے لئے منصوبے بناتے تھے اور یہ مذہبی فتوے دے کر اُنہیں اُکساتے تھے، بعد ختم شورشِ غدر مقدمہ چلا اور اسپیشل کمشنر شاہجہاں پور کی عدالت سے اُنہیں ۱۸۵۹ء میں نو سال کی سزا عبور دریائے شور (عوامی زبان میں کالے پانی) کی ہوئی اور ہندوستان کے متعدد علماء مثلاً مولوی فضل الحق خیرآبادی اور مولوی قاضی عنایت احمد (مصنف تواریخ حبیب اللہ) وغیرہ کا ساتھ رہا۔ اور اُن کو خود کو بھی کوئی عہدۂ "محرری" کا مل گیا (اس سے صحیح مراد کیا تھی یہ تو معلوم نہیں لیکن بہرحال تھی تو لکھنے پڑھنے ہی کی شکل) وہیں رہ کر انہوں نے عربی کی لغتِ جغرافیہ کی مشہور کتاب مراصد الاطلاع کا اُردو ترجمہ بھی کر ڈالا۔ اس کا قلمی نسخہ انہیں کے قلم کا ہمارے یہاں محفوظ ہے چھپا ہوا نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن ایک مخلص نے ابھی کئی سال ہوئے اطلاع دی، کہ انہوں نے ایک نسخہ انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں دیکھا ہے۔ قیدیوں کو "خوش اطواری" کی کچھ چھوٹ بھی ملا کرتی ہے۔ اس میں اُنہیں بھی کُل پونے سات سال جلاوطنی میں رہ کر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں پروانۂ رہائی مل گیا۔ اور وطن آکر فتویٰ نویسی وغیرہ میں مشغول رہے۔ وفات ۱۸۷۲ء میں پائی۔ پانچ لڑکیوں کے علاوہ اُن کے دو فرزند بھی تھے۔ بڑے عبدالرحیم، چھوٹے عبدالقادر میں میں اُنہیں چھوٹی اولاد کی چھوٹی اولاد ہوں۔ ایک بھائی اور ایک بہن دونوں مجھ سے بڑے تھے بھائی عبدالمجید مرحوم کوئی آٹھ سال مجھ سے سن میں بڑے تھے لیکن اتنے فرق کے باوجود میں ان سے بڑا بے تکلف تھا۔ بیچارے دمہ کے مریض بچپن سے رہے۔ باضابطہ تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تک پائی۔ یہ بھی اس زمانے کے معیار سے کچھ کم نہ تھی۔ باقی کتب بینی سے اپنی استعداد ہر قسم کی بڑھا لی تھی۔ اور اشعار کے تو کہنا چاہیئے کہ حافظ تھے خصوصاً مولانا شبلی اور مولوی ظفر علی خاں کے کلام کے۔ نائب تحصیلداری سے ملازمت میں داخل ہوئے اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر پہونچ کر پنشن لی۔

۱۹۴۲ء میں لکھنؤ میں کچھ دن سٹی مجسٹریٹی بھی کی۔ یہ عہدہ ایک خصوصی اہمیت

رکھتا تھا۔ خاصے مذہبی تھے۔ نماز کے پابند، منکسر المزاج، اور لوگوں کے بڑے ہمدرد، خصوصاً کنبہ والوں کے ساتھ۔ پنشن کے بعد بھی مسلمانوں کے عام رفاہ کاموں میں پوری دلچسپی لیتے رہے۔ بہن سن میں ۴، ۵ سال بڑی تھیں اور بڑی عابدہ، صالحہ تھیں۔ گویا معصوم صفت، شادی چچازاد بھائی ڈاکٹر محمد سلیم کے ہوئی۔ اولاد کوئی نہیں ہوئی۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔ والدِ ماجد کا ذ ذرا تفصیل سے کرنا تھا۔ اس لئے اُسے عمداً مؤخر کر دیا ہے۔

اُن کا سالِ پیدائش ۱۸۴۸ء ہے۔ تعلیم حسب رواج فارسی و ع کی اچھی خاصی پائی۔ زیادہ تر فرنگی محل ہی میں پڑھا۔ اور مولوی محمد نعیم صاحب فر محلی سے عقیدت شاگردانہ آخر تک رہی۔ بڑے سن پر پہونچ کر انگریزی کی بھ بہ قدر ضرورت تحصیل کر لی تھی۔ ملازمت کی ابتدا اسکول کی مدرسی سے ہوئی۔ کہ انگریز حاکم کو پڑھایا۔ اس نے خوش ہو کر عدالت میں سررشتہ دار بنا دیا۔ اس سے ترقی کر کے تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ ڈپٹی کلکٹری اس زمانہ میں معراج ترقی تھی۔ پنشن کے وقت سیتاپور میں تھے۔ نماز، روزے، مختصر وظیفے کے پورے پابند تھے۔ علمی صحبتوں کے حریص تھے اور کتابوں کے علاوہ اخبار خوب پڑھا کرتے۔ بعد پنشن لکھنؤ کے اُردو روزنامہ اودھ اخبار میں مضمون بھی کرتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں بیوی، لڑکی وغیرہ کے چھوٹے سے قافلے کو لے کر حج کو گئے اور سفا بعد فراغت حج ۱۱ یا ۱۲ ذی کو ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۳، ۱۴ ذی الحجہ کو عین فجر کے وقت داعی ا کو لبیک کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ قطعہ تاریخ حضرت اکبر الہ آبادی نے کہا۔ آخری شعر تھا ؎

اس قدر مصروف ذکر و شغل تھے بیشغل ہی سے نکلی تاریخ وفات

(۱۳۳۰ھ)

نکاح، سگی چچازاد بی بی نصیر النساء کے ساتھ ہوا تھا۔ اُن کو میں نے حب تہجد گزار پایا۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھی ہوئی تھیں۔ تلاوت کسی حال میں نا نہ ہوتی۔ ۱۹۴۰ء میں وفات پائی ۸۲-۸۳ سال کی عمر میں۔

دستور برادری اور گھرانے میں پانچویں برس بسم اللہ خو کا تھا۔ اپنی عمر ابھی چوتھے ہی سال میں تھی اور ۱۸۹۶ء تھا کہ بسم اللہ کر پا گئی۔ والدِ مرحوم لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ایک سہ پہر کو محفل آرا

ہوئی اور وطن کے ایک خوش اوقات و خوش صفات عالم صاحب، جو بھائی صاحب کی اتالیقی پر مامور تھے وہ زنانہ مکان کے صحن میں بسم اللہ کرانے بیٹھے مٹھائی کے خوان سامنے رکھے ہوئے اور عزیزوں، نوکروں چاکروں کا گردہ حلقہ جمائے ہوئے، مولوی صاحب بچارے نے پیار و شفقت کے لہجہ میں کہا کہ کہو بسم اللہ۔ یہاں جواب میں قطعی خاموشی۔ اب اور لوگ بھی اُن کے شریک کار ہوئے، لیکن اس ضدی لڑکے کی زبان پر بدستور قفل لگا ہوا تھا۔ والد مرحوم کو آخر غصہ آیا۔ اور کب تک نہ آتا۔ سمجھانے بجھانے، چمکارنے کی حد ہو چکی تھی۔ چھڑی ہاتھ میں لے انہوں نے جمانا شروع کر دی۔ لوگوں نے ہائیں ہائیں کرکے کسی طرح جان بچائی۔ چلمنوں کی آڑ سے والدہ و ہمشیرہ تکلیف دہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ پھر بلایا سمجھایا۔ آخر میں جو میری کھلائی تھیں اُن بچاری نے کہا کہ واہ میرے بھیا کو کیا بسم اللہ کہنا آتا نہیں۔ میں نے کہا آتا کیوں نہیں بس میں اُن کے ساتھ جا، مولوی صاحب کے کمرے کے باہر ہی سے اُنہیں چلا کر سُنا آیا۔ اُداسی خوشی سے بدلی، چہروں پر ہنسی اور مسکراہٹ آئی۔ اسی کو کہتے ہیں

"ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو!"

زندگی کا یہی سب سے پہلا اہم واقعہ ہے۔

گھر پر قرآن مجید ناظرہ اور فارسی کی وہی تعلیم رہی، جس کا اُس وقت شریف مسلمانوں کے ہاں عام رواج تھا۔ اُردو میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں اپنے رنگ میں بہترین کتابیں تھیں فارسی میں گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ پڑھا، اور امام غزالی کی فارسی کتاب کیمیائے سعادت بھی جو اپنے فن کی بہترین کتاب ہے۔ لیکن اوّل تو اتنی کم سنی میں پڑھنے اور سمجھ میں آنے کے قابل نہیں، دوسرے اس کا پڑھانا بھی ہر استاد کا کام نہیں۔ اور ہاں اسی اعلا کتاب کے پہلو بہ پہلو وہ گندی کتاب یوسف زلیخا بھی پڑھنا پڑی، صرف اس لئے کہ وہ منسوب ملا جامی کی طرف ہے۔ عربی کی شُد بُد شروع ہی کی تھی کہ اسکول میں عربی لے لی۔ اب سن کوئی ۱۱، ۱۲ سال کا تھا۔ پڑھائی سیتاپور کے ہائی اسکول میں ہو رہی تھی۔ عربی کے پہلے اُستاد لکھنؤ کے ایک ذی استعداد شیعہ حکیم محمد ذکی مرحوم تھے۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ کچھ روز بعد فرنگی محل کے ایک ذی علم اُستاد مولوی عظمت اللہ مرحوم آگئے۔ عربی ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی آئی۔ اُن کی بدولت آئی۔ بڑے شفیق بھی تھے اور قابل و فاضل بھی۔

اسکول کا ہر درجہ کھٹا کھٹ پاس کرکے ۱۹۰۷ء میں دسویں میں آگیا یہاں حساب میں بہت ہی کمزور تھا اور یہ کمزوری انہوں ہی کے ہاتھوں آئی تھی اپنے بھائیوں ہی نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب ساتویں سے جامیٹری اور الجبرا بھی پڑھو گے اور حساب تو مسلمانوں کو آتا نہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ تم کیسی پوزیشن حاصل کرو گے یہ سُن سُنا کر واقعی ہمت پست ہو گئی اور نفسیاتی مرعوبیت ایسی غالب آگئی کہ اِدھر حساب کا سوال سامنے آیا اور اُدھر دل کانپنے لگا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال ایک دانشمند اُستاد تھے اور مجھ پر بہت عنایت کرنے والے انہوں نے یہ دیکھ، میرے ہی ایک اچھے ہندو ساتھی کو حکم دیدیا کہ انہیں اسکول کے بعد آدھ گھنٹے کے لئے روک کر اس میں سوال حساب کے کرا دیا کرو تاکہ ان کی جھجک مٹ جائے اور ہمت کھل جائے۔ اس ساتھی بچارے نے یہ فرض تن دہی سے ادا کیا اور بعد کو جب میں نے کچھ نقدی بطور معاوضہ کے دینا چاہی تو کسی طرح اُسے قبول نہ کیا۔ حالانکہ بچارے کی معاشی حالت حاجتمندی کی سطح تک پہونچی ہوئی تھی — شرافت کسی خاص قوم و مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں۔ خیر، دسواں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ اسکولی تعلیم ختم کرکے جولائی ۱۹۰۸ء میں آکر کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوا۔ انٹرمیڈیٹ میں منطق اور انگریزی مضمون نگاری میں بہت اچھا رہا۔ انگلش، ہسٹری میں کم زور۔ عربی میں اوسط درجہ کا۔ بی اے میں آیا تو سائیکلوجی میں نام پیدا ہو گیا اور انگریزی مضمون نگاری میں بھی بہت اچھے نمبر ملنے لگے ۱۹۱۲ء میں بی اے سیکنڈ ڈویژن پاس کر لیا۔ ایم۔ اے فلسفے کا انتظام لکھنؤ میں نہ تھا علی گڑھ گیا وہاں انتظام تو تھا، مگر کچھ یوں ہی سا۔ زیادہ جی نہ لگا اور کورس کی ایک کتاب تو دستیاب ہی نہ ہوئی بس ۱۹۱۲ء میں امتحان دینے الہ آباد گیا (علی گڑھ اس وقت تک محض کالج تھا یونی ورسٹی نہ تھا) وہاں مولانا شبلی کے بھائی جنید صاحب نامور ایڈوکیٹ کے ہاں ٹھہرا۔ امتحان میں ناکام رہا۔ اسباب ناکامی کا ذکر کچھ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔

۱۹۱۳ء میں میں ایم اے کرنے دہلی گیا، سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل ہوا۔ والد مرحوم کا انتقال ۱۹۱۲ء کے آخر میں ہو چکا تھا۔ اور اب جو کچھ گھر میں روپیہ تھا ایک چلتے ہوئے بنک میں جمع تھا۔ اتنے میں خبر آئی کہ وہ بنک ٹوٹ گیا اور جو روپیہ اس میں تھا وہ ڈوب گیا۔ اپنا دل دہلی سے اچاٹ اور لکھنؤ کے لئے بیتاب تھا ہی، اس کو یہ بہانہ اچھا ہاتھ آگیا اور ایم اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ لکھنؤ واپس آگیا خیال یہ قائم کیا کہ دو برس کے عرصے میں انگریزی رسالوں میں مقالے فلسفہ پر

۔اے کی ڈگری کا کفارہ کر لوں گا: — لڑکپن کی نادانیاں اور خوش خیالیاں!
اب تلاشِ معاش شروع ہوئی، بڑی اُمید اس کی تھی کہ اپنے ہی کیننگ کالج
فہ و منطق کے جونیر لکچرر کی جگہ پر ہو جاؤں گا۔ پرنسپل ڈاکٹر کیمرن بھی بہت خوش
ز اُمید بر نہ آئی۔ تقرر ایک دوسرے صاحب کا ہو گیا۔ ریلوے اور ڈاکخانے
بناسب جگہیں نکلیں کوشش کی اور ریلوے کے لئے تو راجہ صاحب محمود آباد
بردست سفارش کی۔ بے سود رہی۔ انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری بابائے
ولوی عبدالحق بہت کام آئے۔ بجائے نے بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے
ہ اُجرت پر کرانے شروع کر دیئے۔ یہ امداد بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ اس سے
ل مولانا شبلی مرحوم اپنی زیرِ تصنیف سیرۃ النبی کے سلسلے میں انگریزی
ں کی تلاش کے لئے گھنٹے دو گھنٹے کے کام کے لئے پچاس روپے ماہوار
ے تھے۔

والد صاحب کے انتقال سے آمدنی کا اصل ذریعہ تو بند ہی ہو گیا تھا۔ بھائی
کی تنخواہ نائب تحصیلداری کی خود ہی قلیل تھی پورے خاندان کا اسی سے
چلانا دشوار ہو رہا تھا۔

۱۹۱۶ء تھا، جون میں شادی ہوئی۔ خرچ کا بار قدرتاً بڑھ گیا تھا علی گڑھ
صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے قدر افزائی فرمائی اور کانفرنس میں بطور
ی اسسٹنٹ کے بلا لیا۔ تنخواہ پونے دو سو ماہوار، مکان بلا کرایہ، یوں بھی
ہ وقت کے معیار سے بے بہا نہ تھی، اور پھر میں تو حاجتمند بھی تھا صاحبزادہ
صب بڑی شفقت و عنایت سے پیش آتے رہے لیکن اُسے کیا کیجئے کہ
رہا نگا تھا قطِ قلم سرنوشت کو"! ملازمت بہرحال ملازمت تھی۔ طبیعت ہر
کے قید و بند کو بار سمجھ رہی تھی، تیار نہ ہو پائی اور دو ہی مہینے کے اندر
بی صحت کا بہانہ کر کے وہاں سے استعفا دے دیا۔

۱۹۱۷ء آگیا۔ حیدرآباد میں عثمانیہ یونی ورسٹی کی داغ بیل پڑی اور اس
لئے بطور پیش خیمہ ایک نیا محکمہ سرشتہ تالیف ترجمہ کھلا۔ مولوی عبدالحق صاحب
نظامت میں اور میں اس کے لئے بہ حیثیت مترجم فلسفہ مقرر ہوا۔ تنخواہ کا آغاز
ن سو سے ہوا یعنی آج سنہ کے تین ہزار کے مساوی گیا اور گیارہ مہینے
ہاں قیام کیا۔

طبیعت کی بے قیدی یہاں بھی رنگ لائی۔ خیالات اپنے الگ ملحدانہ
ے دکن کی مذہبی صحافت کو (جیسی کچھ بھی وہ تھی) ایک موقع شدید نکتہ چینی
کا ہاتھ آ گیا۔ خوب خوب حملے ہوئے۔ یکم ستمبر ۱۹۱۸ء کو یہاں پہونچا تھا۔ آخیر جولائی
۱۹۱۸ء تک کس مشکل سے نباہ کیا پھر چھٹی لے کر لکھنؤ آیا اور یہاں سے استعفیٰ
بھیج دیا۔

۸۔ ۱۰ مہینے پھر بیکاری میں گزرے۔ عرض حال لکھ کر سر امین جنگ کے
چیف سکریٹری پیشگاہ مبارک کی خدمت میں بھیجا۔ یہ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں
مجھ پر بہت ہی مہربان رہے تھے کئی ہفتے کے بعد ان کا تار آیا کہ نظامِ دکن کی
خدمت میں پیش ہونے کے لئے تیار ہو کر آ جاؤ۔ گیا۔ اب کی سرکاری مہمان کی
حیثیت سے نواب صدر یار جنگ صدر الصدور امورِ مذہبی کے ہاں ٹھہرایا گیا۔
پیشی ہوئی اور کوئی ۳۵ منٹ تک باریابی رہی، ۲۵۰ روپے ماہوار کی پنشن تاحیات منظور
ہوئی۔ اور کام صرف مولانا شبلی کی طرح کتابوں کو سلسلہ آصفیہ سے منسوب
کر دینا۔ ظاہر ہے کہ اس سے آسان تر صورت اور کیا ہو سکتی تھی۔ قیام کی کوئی
قید نہیں، جہاں چاہوں رہوں۔

۱۹۴۲ء میں یعنی اجرائے پنشن کے ۲۰، ۲۲ سال بعد جب روپے کی
قیمت بہت گھٹ گئی۔ تو یہ رقم بھی عملاً اپنی چوتھائی رہ گئی۔ اب صدرِ اعظم نواب
امین الملک سر مرزا محمد اسماعیل تھے۔ ہوش بلگرامی میرے قدیم مہربان اب
نواب ہوش یار جنگ تھے اور اعلیٰ حضرت کے مقربِ خاص۔ انہوں نے میرا
معاملہ سر امین الملک کے سامنے پیش کیا اور اس میں اضافہ ہو کر پنشن اب ۲۰۰
ماہوار ہو گئی۔ دو ہزار کی رقم نقد عنایت ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں جب پولیس ایکشن ہوا
اور سلطنت آصفیہ مٹی تو یہ پنشن بھی بند ہو گئی۔ یہاں سے مولانا ابوالکلام
وزیرِ تعلیمات نے لکھا پڑھی کی۔ آخر میں خود پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا، جب
باکر ۱۹۵۱ء میں بحال ہوئی۔ پوری رقم دو سو کی نہیں بلکہ وہی قدیم ۲۵۰ کی جزوی بحالی کے
بعد رقم خزانہ حیدرآباد سے منتقل ہو کر اب خزانۂ لکھنؤ میں آ گئی اور اب تک یہیں
سے مل رہی ہے۔

پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ جہاں کوئی چیز چھپی ہوئی سامنے آئی،
عام اس سے کہ رسالہ ہو یا کتاب یا اخبار یا اشتہار، بس اسے پڑھنا شروع
کر دیا۔ رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں، ساتویں درجہ میں تھا اور عمر کے بارھویں سال
میں کہ اودھ اخبار (لکھنؤ) میں مراسلے اور مضمون بھیجنے لگا۔ نام سے نہیں کسی فرضی
نام سے۔ اور یہ زیادہ تر والد ماجد کے ڈر سے تھا، اور کچھ اپنے طبعی شرمیلے پن

سے بھی۔ آٹھویں درجہ میں پہونچا، تو ایک کتاب ہی مرتب کر دی۔ عیسائیوں کے جواب میں مولوی محمد علی رحم مونگیری (بانیٔ ندوہ) ایک ماہنامہ نکالتے تھے تحفۂ محمدیہ کانپور سے۔ بس انہیں کے مضامین سرقہ کر لئے گئے تھے۔ گورکھپور کے ایک وکیل صاحب تھے مولوی احسان اللہ عباسی چریاکوٹی، اُن کی کتابیں بھی خوب پڑھ لی تھیں۔ الاسلام وغیرہ۔ اس سے بھی لے کر مضمون لکھا کرتا تھا۔ وقت کے چلتے ہوئے عنوانات پر اور دائرہ اب اودھ اخبار سے وسیع ہو کر ریاض الاخبار (گورکھپور) اور اخبار الاسلام (امرتسر) تک پہونچ چکا تھا۔

ایک چھوٹا سا کلب بھی بعض سینیر لڑکوں اور بعض باہر والوں سے مل کر قائم کیا تھا۔ فرینڈز کلب کے نام سے ایک آدھ ہندو بھی اس کے ممبر تھے۔ اس کے ہفتہ وار جلسے بھی ہمارے ہی ہاں ہوا کرتے۔ علاوہ دوسرے پرچوں کے علی گڑھ منتھلی بھی اس میں آتا تھا، آدھا اُردو میں آدھا انگریزی میں۔ ایک آدھ مقالہ بھی اس کلب میں سُنایا۔ انگریزی کتابیں اسکول لائبریری سے لایا کرتا۔ ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ مستقل طور پر آگیا۔ کالج میں پڑھنے لگا۔ کتب بینی اور رسائل بینی وسیع ہو گئی تھی۔ اب ملک بھر کے رسالے اور اخبار رفاہ عام لائبریری، ایڈوکیٹ لائبریری اور سب سے بڑھ کر کیننگ کالج لائبریری سب کے دروازے کھلے ہوئے تھے ۱۹۱۰ء میں جب سے امیرالدولہ پبلک لائبریری کھل گئی، اُس کے چکر متواتر اور کثرت سے لگنے لگے۔ لائبریری ہی میں اگر کبھی چھٹی ہوتی تو وہ دن بہت کھلتا اور طبیعت برابر بے چین رہتی۔ کالج ڈبیٹنگ کلب میں تو خود کبھی زیادہ نہیں بولا۔ البتہ دوسرے مقرّروں کو برابر مدد دیتا رہتا۔ مسلمانوں کا ایک سنجیدہ سہ روزہ امرتسر سے وکیل نامی نکلتا تھا۔ ۱۹۰۸ء ۱۹۰۹ء میں اس میں بھی دو لمبے مضامین لکھے۔ ایک کا عنوان تھا محمود غزنوی اور دوسرے کا غذائے انسانی۔ بعد کو وکیل بک ایجنسی نے انہیں کو رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا اور اُن کی خوب دھوم رہی۔

۱۹۱۰ء تھا کہ لکھنؤ کے نئے ماہ نامہ الناظر میں مولانا شبلی کی الکلام پر تنقیدی نظر کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور اُس کے بڑے چرچے اُس زمانے میں رہے۔ پھر الناظر سے تو جیسے مستقل تعلق ہو گیا۔ برسوں اسی میں مضمون نکلتے رہے۔ کچھ نام سے اور کچھ فرضی ناموں سے۔ الٰہ آباد سے ایک ادبی ماہنامہ آب و تاب سے ادیب کے نام سے نکلا تھا۔ اس میں بھی ۱۲ء، ۱۳ء میں مضمون لکھے الٰہ و(لکھنو) کا معیار بہت بلند تھا۔ ۱۲ء میں اس میں ایک آدھ مضمون انگریزی سے ترجمہ کر کے دیا اور اس کے مضمون نگاروں کی فہرست میں اپنا نام دیکھ لیا۔

کالج چھوڑنے کے بعد مستقل قیام لکھنؤ ہی میں رہا۔ لکھنؤ اپنا وطن بن چکا تھا۔ مضمون نگاری کا سلسلہ اُردو، انگریزی دونوں میں رہا

معارف میں مضمون تو شروع ہی سے نکلنے لگے تھے ۱۹ء میں اس سے باضابطہ ادارتی تعلق پیدا ہو گیا۔ جو غالباً ۲۲ء تک قائم رہا۔ مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کی نگرانی ۲۵ء سے اپنے ذمہ رہی۔ باقی اس سے گہرا ادارتی تعلق شروع ہی یعنی ۱۳ء سے تھا۔

۲۵ء سے اپنا ہفتہ وار لکھنؤ سے سچ کے نام سے نکالا۔ پہلے ظفر الملک علوی کی شرکت میں اور پھر اپنا کر لیا۔

ایک دوست نے اسی زمانہ میں فرمائش کی کہ جدید تعلیم کے طریقوں پر ایک چھوٹا سا رسالہ لکھ دو۔ اس وقت تک عادت رات کو کام کرنے کی زیادہ تھی ایک رات کو اور زیادہ جاگ کر چند گھنٹے کے اندر مسودہ تیار کر دیا "فرائض والدین" کے عنوان سے اور ایک فارم تعلیمؔ کی طرف سے نقد معاوضہ اسی وقت ہاتھ آ گیا۔ الناظر، ادیب، معارف وغیرہ ہی معاوضہ دیتے تھے۔

فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع اسی دور کی تصنیفات ہیں (فلسفۂ اجتماع کو بعد میں اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر چکا ہوں۔) برکلے فلسفی کے مکالمات کا ترجمہ (شائع کردہ دارالمصنفین) بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ لیکی کی "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ترجمہ تاریخ اخلاق یورپ (دو جلدوں میں) اور بکل کی "ہسٹری آف سویلیزیشن اِن انگلینڈ" (تاریخ تمدن انگلستان) کی تین جلدوں میں سے بیشتر حصہ کا ترجمہ یہ سب اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ بس یہی رہ گیا تھا۔ ایک گم نام ڈرامے کا ذکر رہا ہی جاتا ہے۔ ۱۵ء میں زود پشیماں کے نام سے "ناظر" کی طرف سے شائع ہوا۔ اس کا ابتدائی مسودہ ریل کے ایک سفر میں، کان پور سے بمبئی تک میں تیار ہو گیا تھا۔

حیدر آباد میں جب یکم ستمبر ۱۷ء سے اخیر جولائی ۱۸ء تک رہا تو ایک خاصی ضخیم کتاب منطق پر تیار کر دی۔ نام تھا ایک پرانی کتاب کی نظر ثانی کا، لیکن نظر ثانی ہی میں گویا وہ ایک نئی کتاب ہی بن گئی۔ وقت بچ رہا تھا اس میں اپنے فن سے باہر ایک تاریخ یورپ کے ترجمہ کا تکملہ کر دیا۔ یہ دونوں کتابیں سررشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی کی طرف سے چھپیں۔

اگست ۱۸ء میں لکھنؤ واپس آ گیا اور اب اپنی مستقل تصنیف و

وتالیف کا دور شروع ہوگیا۔ پہلے ایک چھوٹی سی کتاب تحفۂ خسروی چھپی ہے۔ یہ محض ایک مجموعہ قرآن، حدیث، اور سعدی وغیرہ کے اقتباسات کا شعر وادب کے علاوہ تمامتر مغربی فلسفہ کے ماہرین کے افکار زیر مطالعہ آئے۔ برطانوی فلسفی اسپنـ ب وغیرہ تو گویا نوکِ زبان تھے ۱۹۱۸ء کے نصف آخر میں مطالعہ غیر مسلم فلسفہ وتصوف کا شروع ہوا۔ ہندو فلسفہ، بدھسٹ فلسفہ، چینی فلسفہ وغیرہ انگریزی کے ذریعہ سے۔

ہندو فلسفہ میں علاوہ گیتا کے انگریزی ترجمہ کے مسز بیسنٹ، تلک، بھگوان داس، آربند وگھوش وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ رہا ماہنامہ صبح امید (لکھنو) میں کچھ مضمون نگاری اسی رنگ کی شروع کی اور پھر مثنوی رومی کے مطالعہ نے تو گویا اس پر مہر لگا دی اور مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول بھی اس میں بڑی معین ہوئی۔ اب قلم کا رنگ بھی دوسرا ہوگیا۔ نفسیات مغربی کا غیر مضر اور صالح حصہ اب بھی قلم کا موضوع تھا مبادئ فلسفہ (۱) یا فلسفہ کی پہلی کتاب اور مبادئ فلسفہ فلسفہ کی دوسری کتاب۔ اور ہم آپ سب اسی رنگ کی نکلیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے مقالے، رامپور، پشاور، علی گڑھ میں پڑھے ہوئے رسالوں کی صورت میں شائع ہوئے قصص ومسائل، اسلام کا پیام، اسلام کی کہانی۔ جدید قصص الانبیاء وغیرہ انگریزی ترجمہ وتفسیر دونوں کا ولولہ باوجود اپنی بے علمی، کم استعدادی کے پیدا ہوگیا۔ چھ سات سال کی مدت میں کام ختم ہوا۔ اور تاج کمپنی لاہور نے س کا کاپی رائٹ دے کر خرید لیا۔ پھر اردو تفسیر کی نوبت آئی اور پہلے اڈیشن کے بعد، توفیق الٰہی نے کامل نظر ثانی اور معقول معتدبہ اضافہ کے ساتھ، دوسر ایڈیشن کے لئے دستگیری کی، پہلی جلد اس کی نکل چکی ہے۔ اور دوسری جلد بھی انشاء اللہ آج ہی کل میں نکلنے والی ہے۔ پانچ جلدیں اس کے بعد بھی باقی رہیں گی ۔راس کی طبع واشاعت کا اللہ ہی مالک ہے۔ مطالعہ قرآنی کے سلسلہ میں چھوٹے ے رسالے بھی کئی نکل چکے ہیں۔ تاج کمپنی (کراچی) نے انگریزی میں محض ترجمہ قرآن (تفسیر) کی فرمائش ابھی دو ہی چار سال ہوئے کی، اور جوں توں فرمائش پوری ہی گئی۔ ترجمہ کی آخری قسط یہاں سے اکتوبر ۱۹۶۱ء میں روانہ کی گئی۔ شروع ۱۹۵۸ء ، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی مرحوم نے مدراس مدعو کیا کہ کسی قرآنی موضوع پہ لکچر آکر دیجئے۔ چنانچہ موضوع تقریباً اچھوتا اور جدید "سیرت نبوی قرآن سے" بار کیا گیا اور فرمائش پوری کردی گئی۔ لکچروں کے دو اڈیشن نکل چکے، ایک اور ب بھی تمامتر قرآن سے ماخوذ اسی زمانہ میں اور تیار ہوگئی۔ بشریت انبیاء کے نام سے۔ یہ موضوع بھی اب تک تقریباً اچھوتا ہی رہا ہے، اور عین ان سطور کی وقت ایک دوسری فرمائش بھی پانچ لکچروں کی مدراس سے آئی ہوئی ہے، موضوع اختیار کیا گیا ہے "مشکلات القرآن، یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں" انتخاب اپنی تفسیر ہی سے ہوگا اور اس کے خصوصی نکتے۔ ان لکچروں میں ترمیم کے بعد پیش کر دئے جائیں گے۔

تفسیر ماجدی کے دوسرے اڈیشن کی باقی جلدیں اپنی زندگی میں یہی بہت بڑی اور غیر معمولی سی بات ہوگی۔ ہر جلد پر مصارف اتنے آرہے ہیں اگر ایک مخلص دستا پاخیر بندے کو آگے نہ کر دیتا تو کوئی صورت ہی طبع و ا کی نہ تھی۔

مذہبی تحریروں کے ذکر کی رَو میں یہ ذکر رہ ہی گیا کہ ادبی اور شعر بھی اس دَور میں فنا نہیں ہوا بلکہ برابر باقی ہی رہا۔ حضرت اکبر سے جو عقیدہ وہ خود ایک مستقل عنوانِ گفتگو ہو سکتا ہے۔ بہرحال کئی مضمونوں اور مضمو مجموعہ اکبر نامے کے نام سے اس درمیان میں شائع ہوگیا۔ انشائے ماجد جلد اول وجلد د نشریات ماجد جلد اول کے نام سے کئی مجموعے تیار ہوکر شائع ہوئے۔ شخصیا عقیدت حضرت تھانوی ؒ اور مولانا محمد علی سے رہی، اس کا ذکر آگے آرہا بہرحال حکیم الامت کے نام سے ایک جلد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی اور محمد علی ذاتی ڈائری، کے عنوان سے دو جلدیں محمد علی کی۔

ایمان وعقیدہ کی دُنیا میں بار بار تبدیلیاں ہوئیں: بچپن بھرا جوانی میں سخت مذہبی رہا، عمر کے سترھویں سال سے اسلامیت میں منعف ہونا شروع ہوا، انگریزی کتابیں پڑھ پڑھ کر۔ ان میں سے کسی میں اسلا براہ راست نہ تھا۔ بس ایسے معلومات وافکار جمع کر دیئے گئے تھے جن سے اسلام پر پڑتی تھی۔ مثلاً رسولِ اسلام کا فوٹو ایسا شائع کرنا (ایک مستند کے حوالہ سے) جس میں شکل وصورت سے بجائے کسی قسم کی نرمی اور نرم دلی خشونت اور اکھڑپن برس رہا ہو اور عبا کے ساتھ کمر میں تلوار پڑی ہوا پر تیر وکمان!

اور اس پرستم انگریزی کی ایسی کتابیں، ڈاکٹری یا کے موضوع پر، جن میں ضمناً یہ درج ہو کہ صرع یا ہسٹریا کی ایک قسم ایسی جسے لوگوں نے "وحی" سے موسوم کیا ہے، اور دوسری طرف وہ کتابیں

نفس مذہب کے منبوت پر حملہ ہے۔ عبادت، عصمت، حفظِ نفس، و نفس کشی کی ہر صورت پر چھینٹے ہیں اور اسراف، حظِ نفس، شہوت رانی وغیرہ کی حمایت کر کے اُن کی تبلیغ، حوصلہ افزائی کا حق ادا کر دیا گیا۔ اِن سب کا مِل مِلا کر نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت اسلام کی طرف سے بالکل برگشتہ ہو گئی اور نفس پر جادو الحاد و ارتداد کا چل گیا۔ بے تکلف لندن کی ریشنلسٹ ایسوسی ایشن کا ممبر بن گیا۔ اور اپنے کو کھلم کھلا ریشنلسٹ (عقلیت پسند) یا "ایگناسٹک" (لاادری) کہنے لگا۔ یہی غنیمت ہوا کہ سوشل حیثیت سے مسلمان اس وقت بھی رہا۔ یعنی مسلمانوں سے وہی میل جول، وہی مسلم برادری، وہی مسلم معیشت۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۹ء تک یعنی سترہویں سال سے لے کر ستائیسویں سال کی عمر تک یہی اندازِ فکر رہا۔ مغرب کی ٹھیٹ مادیت کا بُت ہندو فلسفہ کے مطالعہ سے ٹوٹا۔ اور رُوحانیت کے نام سے چڑھ اور بیزاری نہ رہی۔ ڈیڑھ دو سال اسی حالت میں گزرے اور ۱۹۲۰ء سے کہنا چاہئے کہ یہ مرتد ازسرِ نو اسلام لے آیا۔

دَورِ ظلمت سے دورِ ہدایت تک پہونچنے میں جن حضرات سے مدد ملی ان میں ایک امتیازی درجہ مشہور شاعر حضرت اکبر الہ آبادی کا ہے، حکیم و عارف تھے۔ کن کن لطیف حیلوں بہانوں سے مجھے رُشد و ہدایت کی طرف لاتے رہے، دوسرے رہبر اس سلسلے میں مولانا محمد علی تھے، اِن سے مجھے محبت ہی نہیں، عشق تھا۔ یہ ہر طرح ڈانٹ ڈپٹ کر میری اصلاح کے پیچھے پڑے رہتے۔ ہندوؤں میں بنارس کے فاضل فلسفی و درویش بابو بھگوان داس کی باتیں بھی بڑی مصلحانہ رہیں اور اس سلسلے میں نام گاندھی جی کا بھی آتا ہے۔ چھوٹے بڑے ہادی و رہنما اور بھی ملتے رہے۔ قسمت نے یاوری کی کہ مولانا اشرف علی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں رسائی ہو گئی۔ جہاں کا رنگ سب سے نرالا تھا۔ یہاں سے جو کچھ پایا بس اپنے ظرف کا منتہا وہی تھا۔

شوق اسکولی زندگی میں تھوڑا بہت کرکٹ اور ٹینس کا بھی رہا۔ لیکن زیادہ دلچسپی فٹ بال سے رہی اور اس میں بس اس درجے کا کھلاڑی سمجھا جاتا رہا کہ کالج میں آتے آتے پڑھنے کی ایسی لت پڑ گئی کہ شام کے کھیل کا وقت بھی پڑھائی کی نذر ہو گیا۔ کھیلنے دوڑنے کا کوئی وقت ہی باقی نہ رہا۔ ادھیڑ پن کے وقت تک ورزش پر مطلق توجہ نہ کی، ۴۵ سال کے بعد خیال آیا اور صبح تڑکے قبل فجر دوڑ کی مشق شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فائدے سے زیادہ نقصان ہاتھ رہا۔

آخر میں سخت قسم کی ورزشوں سے توبہ کی، اور ہلکی ورزش صبح ٹہلنے اور چلنے کی رکھی مدتوں یہ معمول رہا۔ اب کئی سال سے یہ بھی چھوٹ گیا ہے۔ صحت بہ حیثیت مجموعی اچھی ہے، بیمار نسبتاً کم ہوتا ہوں۔ کھانا ہر قسم کا بڑے شوق سے کھا لیتا ہوں۔ چائے ایک زمانے میں بہت زیادہ پینے لگا تھا۔ اب نسبتاً کم کر دی ہے۔ کان بہت اچھے رہے تھے۔ اب سن کے تقاضے سے گراں گوشی پیدا ہوئی ہے، اور اس سے کہیں بڑھ کر تکلیف دہ ضعف بصارت ہے، اس کا سب سے تباہ کن اثر خط پر پڑا ہے، اپنا خط خود نہیں پڑھ پاتا ہوں۔ لکھنے میں کثرت سے حروف چھوٹ جاتے ہیں اور دُور کی چیز تو بالکل ہی نہیں دیکھ سکتا ہوں۔

رات کو لکھنے پڑھنے کا کام سالہا سال سے بند ہے، اس ضعف بصارت کی وجوہ، لڑکپن اور نوجوانی میں بڑی ہی بے احتیاطیاں کی تھیں۔ ناکافی اور دُھندلی روشنی میں برابر مطالعہ کرتا رہتا تھا اور کبھی لیٹ کر بھی۔ اس کا خمیازہ جوانی ہی میں بھگتنا پڑا۔ بول کر لکھانے کی عادت نہیں، قلم جب ہاتھ میں آجاتا ہے جب ہی دماغ چلتا ہے۔ بڑا وقت خط و کتابت کی نذر ہو جاتا ہے، لوگ عجب عجب سوال لکھ بھیجتے ہیں، مثلاً یہ کہ لوگ عمر فاروق کو فاروقِ اعظم کیوں کہتے ہیں۔ کیا کوئی دُوسرے فاروق بھی ہوئے ہیں۔ اور یا یہ کہ حضرت یوسف سے شادی کے وقت بی بی زلیخا کا کیا سِن تھا اور اُن سے اولادیں کتنی ہوئیں وغیرہ۔ مروت میں اکثر جواب دیتے ہی بنتا ہے۔ کوئی اسسٹنٹ یا معاون پاس نہیں۔ کتابیں مکان کے مختلف حصّوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اُنہیں اُٹھ کر لانا اور حوالہ ڈھونڈھنے میں بڑا ہی وقت نکل جاتا ہے۔

شادی ہمارے ہاں ماں باپ کی پسند اور مرضی ہی سے ہوا کرتی ہے۔ اور اکثر خاندان ہی کی کوئی لڑکی اپنے عزیز سے منسوب ہو جاتی ہے۔ اپنی نسبت بھی اسی طریقہ سے بچپن ہی میں طے شدہ سمجھ لی گئی تھی۔ کسی نے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی جب میں کالج میں پڑھنے لگا، تو خیالات میں انگریزیت کے ساتھ اس بابِ خاص میں بھی "صاحبیت" نے زور کیا۔ لڑکی میں اور کوئی بُرائی نہ تھی۔ صورت شکل میں اوروں سے بہتر تھی۔ لیکن رہتی دیہات میں تھی شہر کی آب و ہوا سے ناآشنا۔ اور اپنے نزدیک سوعیبوں کا ایک عیب یہی تھا۔ جب بی۔ اے کر چکا پھر والد ماجد کچھ دن بعد دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ والدۂ ماجدہ کے کانوں تک یہ خبر اپنی نارضامندی کی پہونچا دی۔

غزلیں

بسمل سعیدی



عشق وہ اک نظامِ شوق، غم جو نہ دے خوشی نہ دے
صدمۂ ہجر اگر نہ دے مژدۂ وصل بھی نہ دے
جس میں نہ ہر نفس ہو موت، ختم ہو جس سے زندگی
عشق وہ زندگی تو کیا عشق وہ موت بھی نہ دے
آج اٹھیں دمِ وداع سجدہ ہو آخری مرا
کاش کہ اب مجھے خدا مہلتِ بندگی نہ دے
ہائے وہ دل کہ ہو جسے درد کی زندگی عطا
وائے وہ دل جسے خدا درد کی زندگی نہ دے
تجھ سے جدائی تو نہیں تیرے نہ ہونے کی دلیل
اپنا خیال کر مجھے طعنۂ بے کسی نہ دے
ہجر کی شام تا بہ مرگ حشر ہوئے بپا ہزار
اتنی طویل بھی خدا فرصتِ زندگی نہ دے
شکر قبول سجدہ کر شکر کے سجدے میں ادا
حاصلِ بندگی نہ لے غفلتِ بندگی نہ دے
غفلتِ حال ہی کو ہے عشرتِ زندگی نصیب
"ذہنِ فریب خوردہ کو زحمتِ آگہی نہ دے"
خندہ لبی سے بسمل آہ قلبِ فسردہ خوش ہو کیا
شمعِ مزار جس طرح قبر میں روشنی نہ دے

میرے گھر کے در و دیوار ابھی باقی ہیں
غمزدہ دل کے یہ غم خوار ابھی باقی ہیں
کچھ تو مقتل سے گئے اٹھ کے جنازوں کی طرح
کچھ تہِ خنجرِ خوں خوار ابھی باقی ہیں
مر گئے نادر و چنگیز تو کچھ بات نہیں
خیر سے آپ تو سرکار ابھی باقی ہیں
زلفِ پرخم کی قسم اس قدِ بالا کی قسم
مستحقِ رسن و دار ابھی باقی ہیں !!
شرمسار آپ نہ ہوں اپنی مسیحائی پر
لبِ جاں بخش کے بیمار ابھی باقی ہیں
آپ چلنے دیں ابھی بادۂ بجامِ سقراط
تشنہ لب اور بھی مے خوار ابھی باقی ہیں
آپ تنگ آ کے ابھی ہاتھ سے خنجر نہ رکھیں
اور کچھ جان سے بے زار ابھی باقی ہیں
آپ کچھ دیر ابھی اور نمک پاش رہیں
دل فگار و جگر افگار ابھی باقی ہیں !!
کچھ گئے حسن کے بازار سے سودا کر کے
کچھ شہادت کے خریدار ابھی باقی ہیں
بختِ بیدار کئی سو بھی گئے موت کی نیند
اور کچھ طالعِ بیدار ابھی باقی ہیں!
ماتمی رسم ابھی بزمِ طرب سے نہ اٹھے
مرنے والوں کے عزادار ابھی باقی ہیں
کتنے ہموار کئے اپنے شہیدوں کے مزار
پھر بھی کچھ آپ کے شہکار ابھی باقی ہیں
خودکشی کر نہ سکیں ہم تو ہمیں ہیں مجبور
آپ تو جان کے مختار ابھی باقی ہیں
دل کو ڈھا کر مرے تیشہ نہ رکھیں ہاتھ سے آپ
اس عمارت کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں
اطلاعاً یہ گزارش ہے بقولِ بسمل!
خنجر و دشنۂ اشعار ابھی باقی ہیں

عرش ملسیانی

دو چراغ اور بجھے

سید امتیاز علی تاج

آسکر وائلڈ کو سزا ہوئی تو مقامِ حیرت نہیں۔ امام بخش صہبائی اور میکش کو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں گولی سے اُڑا دیا اور منیر شکوہ آبادی کو سزائے عمر قید دی تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے لیکن امتیاز علی تاج قتل کر دیئے گئے۔ یہ خبر سُنی تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک ادیب اور نستعلیق قسم کے شریف بزرگ کا قتل، انارکلی اور چچا چھکن کے خالق کا قتل کتنی درد انگیز بات ہے۔

ریلوے روڈ لاہور پر سید ممتاز علی نے دارالاشاعت قائم کیا۔ یہ ادارہ بچوں کے لئے اُردو کی کتابیں اور رسالے شائع کرتا۔ پھول اور تہذیب نسواں کی سارے ملک میں دھوم تھی۔ انہیں خدمات کے صلے میں سید ممتاز علی شمس العلماء بنائے گئے۔ ان کے صاحب زادے سید امتیاز علی تاج بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلے۔ صاحب طرز مکالمہ نگار اور ادیب تھے۔ چچا چھکن کے عنوان سے مضامین لکھے جو ملک بھر میں مشہور ہوئے۔ تاج صاحب پرانی شرافت اور وضعداری کا نمونہ تھے۔ جوانی میں مشرقی لباس پہنتے، چوڑی دار پاجامہ، سلیم شاہی جوتہ، کٹاؤ کے کام کا کرتا، سنہری کمانی کی عینک، گورے چٹے جسم پر یہ چیزیں خوب پھبتیں۔

شوکت تھانوی نے اُن سے ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں وہ ایک فلم ساز دلسکھ پنچولی کی دعوت پر لاہور آئے تو تاج صاحب بھاول پور روڈ پر رہتے تھے۔ طوطے اور بلبیاں پالنے کا شوق تھا۔ فلموں کے لئے مکالمے بھی لکھے۔ ریڈیو کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شوکت تھانوی کو یا، علامہ کہا کرتے تھے۔ پنڈت ہری چند اختر بھی ایک زمانے میں اُن کے ادارے سے وابستہ رہے۔ چراغ حسن حسرت اور دوسرے لاہور کے ادیبوں سے بڑے اچھے مراسم تھے۔ "آج کل" کا ڈرامہ نمبر، شائع ہوا تو اس کی بہت تعریف کی۔ ایک خط میں یہ بھی لکھا کہ ہندوستان میں جتنی تھیٹر کمپنیاں، تو ٹنکیاں ہوئی ہیں سب کی فہرست اور تاریخ مرتب ہو جائے تو بڑا کام ہو جائے۔ دلی تشریف لائے تو آج کل کے دفتر میں بھی تشریف لائے۔

مرحوم تاج صاحب اور اُن کی اہلیہ محترمہ حجاب امتیاز دونوں صاحب طرز ادیب رہے ہیں۔ اُن کی تحریر کی بے ساختگی، افسانہ و ڈرامہ کی دنیا میں ان کا وقار زندہ و پائندہ رہے گا۔ اقبال اور سر عبدالقادر کے بعد ادیبوں کی ایک لمبی قطار ہے جو لاہور میں پروان چڑھی، سالک، مہر، حسرت، پطرس، حفیظ، تبسم، تاثیر، صلاح الدین احمد، حامد علی خاں، ہری چند اختر، کنہیا لال کپور سب اسی قطار میں کھڑے نظر آتے تھے۔ کچھ چل دیئے، کچھ باقی ہیں اور فرشتۂ اجل کی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

انارکلی، ہمیشہ زندہ رہنے والا ڈرامہ ہے اس سے تاج صاحب بھی زندہ رہیں گے۔ انہیں ڈرامہ اور اسٹیج سے بڑی دلچسپی تھی۔ "اصفہان کے تک بند" ایسے ڈرامے آپ نے لکھے۔ انھیں کی کوششوں نے لاہور میں 'الحمرا' تھیٹر کو جنم دیا جہاں تاج صاحب کے ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ اُردو ڈرامے کی تاریخی تحقیق سے اُنہیں بڑی دلچسپی تھی اس کے لئے عمر بھر وہ مواد جمع کرتے رہے۔

تاج صاحب نے مجلس ترقی ادب قائم کی۔ اس کے تحت نایاب کتابیں شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ اس ادارے کی طرف سے متعدد کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ اسی کے تحت ایک تحقیقی سہ ماہی رسالہ صحیفہ بھی شائع ہوتا ہے۔ بچوں کے لئے انہوں نے سمندری جل پریوں کی کہانیوں کا بھی ایک

خوبصورت سلسلہ لکھا تھا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۷۰ء کو جب آپ قریب ستر برس کے تھے۔ آپ کی زندگی کا ڈرامہ ایک خونیں سین پر ختم ہوا۔

مرحوم شائستگی اور رواداری کا نمونہ تھے۔ بذلہ سنج تھے خوش پوش اور خوش سیرت تھے۔ ثقافتی دنیا کے ایک ستون تھے۔ خوبصورت تھے اور خوبصورت چیزیں جمع کرتے تھے۔ چاروں طرف حسن تھا۔ رومان تھا دودمان شائستہ کے چشم و چراغ تھے۔ ادب کے جھولے میں پلے۔ ادب کی فضا میں جوان ہوئے۔ اور ادب کی خدمت کرتے کرتے چل بسے۔

(۲)

شکیل بدایونی

ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جہاں اُردو یا ہندی کو تھوڑا بہت دخل ہو اور شکیل بدایونی کے نام سے وہ گھر واقف نہ ہو شکیل نے فلمی دنیا میں بڑی مقبولیت اور شہرت پائی۔ افسوس کہ فلمی دنیا کا یہ گیت کار ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو صرف ۵۴ سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد چل بسا جگر نے تو اپنے لیے کہا تھا مگر یہ شعر شکیل کی رحلت پر بھی صادق آتا ہے۔

جان کر من جملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

شکیل اوسط درجے کے غزل گو شاعر تھے لیکن مقبولیت کچھ خدا کی دین ہے اور کچھ مواقع کی۔ فلمی دُنیا میں وہ کیا گئے کہ شہرت اُن کو اپنے پروں پر لے اڑی اور مقبولیت اُن کی غلامِ بے دام بن گئی۔ اُردو پر شکیل کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنے نغموں کو ملک کے گوشے گوشے میں بلکہ یوں کہئے کہ گھر گھر میں پہونچا دیا۔

۱۹۴۲ء میں لدھیانے سے تبدیل ہوکر دلی آیا جس اتفاق سے اسی دفتر میں پہنچا جہاں شکیل بھی تھے۔ میں شکیل، نخشب تینوں اس زمانے کے متنی شاعر تھے جو آواز کے زور اور نغنے کی سحر آفرینی سے مشاعرے لوٹتے پھرتے تھے۔ شکیل کو شہرت کی خواہش تھی وہ مشاعرے کے بعد دوسرے دن کا اخبار بھی پڑھتے اور اگر ان کا ذکر اخبار میں ہوتا تو خوش ہوتے۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ اُن کی یہ خواہش ایک حقیقت بن جائے۔

احسان دانش کاندھلے سے نکل کر لاہور جا بسے تھے اور مزدور، افلاس وغیرہ سے متعلق مضامین اور نظمیں لکھ رہے تھے اور ان کی نظمیں ان کے تجربے اور جذبے کی صحیح ترجمان تھیں۔ اس لئے وہ مقبول ہوئیں شکیل نے سوچا کہ نظم گوئی کے میدان میں وہ کیوں پیچھے رہیں۔ انہوں نے ایک طویل نظم لکھی جس کا عنوان تھا "چور" مشاعروں میں جب وہ غزل ختم کرتے تو چاروں طرف سے اس نظم کی فرمائش ہوتی اور لوگ بیک زبان "چور" "چور" پکارتے۔ یہ بات ایک باقاعدہ مذاق بن گئی۔

۱۹۴۶ء میں شکیل دلی چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ ان کے کلام کے تین مجموعے چھپے ہیں جن کے نام ہیں "رعنائیاں" "فردوس گوش" "اور دور کوئی گائے"۔

چند سال ہوئے دلی کے چیمس فورڈ کلب میں جشنِ شکیل منایا گیا تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر شکیل الرحمان کی مرتبہ و مولفہ کتاب — "شکیل بدایونی کی رُومانی شاعری" شائع کی گئی تھی۔ اس جشن کے موقع پر دونوں کو دیکھ کر میں نے کہا تھا۔ "یہ جشن شکیل نہیں، شکیلین ہے۔"

شکیل ۲۰ اگست ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ان کا وطن بدایوں تھا جو اہل علم کا مرکز رہا ہے۔ یہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ فطرتاً شریف بھی تھے، اور راسان دوست بھی شکیل، شکیل الرحمن کو ایک خط میں لکھتے ہیں —

"۔۔۔ بدایوں کے سوختہ خاندان سے ایک بزرگ تھے جن کا نام تھا منشی ہدایت اللہ اُن کے دو صاحبزادے تھے ایک کا نام منشی حضور احمد تھا اور دوسرے صاحبزادے تھے مولوی جمیل احمد قادری سوختہ۔ اُن کے صرف ایک لڑکا ہوا جو خاکسار ہے۔ منشی حضور احمد کی صاحبزادی ریاض بتول کی شادی مولوی قیصر حسین قادری سے ہوئی اور اُن کی بڑی لڑکی سلمیٰ سے میری شادی ہوئی اور اس وقت پانچ بچے میرے چشم و چراغ ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ رضیہ، صفیہ نجمہ، جاوید، اور طارق۔ ۱۹۳۶ء میں ہائی اسکول کا امتحان اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں کے طالب علم کی حیثیت سے الہ آباد بورڈ سے پاس کیا تھا۔ ۔۔ میرے والد مولوی جمیل احمد قادری بمبئی میں خوجہ سنی مسجد میں امامت کرتے تھے اور عالم و واعظ تھے۔ اس لئے وہ زیادہ تر بمبئی میں رہتے تھے اور میں بدایوں میں مولانا ضیاء القادری کی زیر نگرانی رہتا تھا مولانا ضیا القادری میرے والد کے ایک بے حد عزیز دوست، مربّی اور پڑوسی تھے۔ اس وقت اُن کی عمر ۹۰ سال کی ہے اور کراچی میں مقیم ہیں۔ نعت و منقبت کے مسلم الثبوت شاعر ہیں، اور پائے کے عالم، صوفی اور درویش ہیں۔

میرے والد اور اُن کے تعلقات اس قدر گہرے تھے کہ لوگ اُن کو سگا بھائی سمجھتے تھے اور اس طرح دونوں کا خاندان ایک ہی خاندان معلوم ہوتا تھا۔ بدایوں میں جتنے شعرائے کرام اور علماء آتے تھے مولانا ضیاء القادری سے ملتے تھے اس لئے مجھے بھی اُن سے ملنے کا شرف حاصل رہتا تھا۔ اور مولانا ہی کے زیر

[illegible]

(شکیل بدایونی)

ایک اور خط میں انہوں نے اپنی زندگی کے باب میں کچھ اور تفصیلات دی ہیں۔

"۔۔۔ میری ابتدائی تعلیم اُردو، عربی، فارسی کی گھر پر ہوئی۔ بدایوں کے ایک بزرگ مولوی عبدالغفار مرحوم میرے پہلے اُستاد تھے جنہوں نے میرے مکان کے دروازے پر مدرسہ قائم کر رکھا تھا کچھ عرصہ عربی کی تعلیم مولوی حبیب الرحمٰن سے حاصل کی۔ جب انگریزی کی تعلیم شروع کی تو میرے محلے کے بزرگ بابو رامچندر نے مجھے پڑھایا اور اس کے بعد کافی عرصہ تک اچھیانی قصبہ کے رہنے والے ماسٹر رفیق احمد سے گھر پر تعلیم حاصل کی۔ ماسٹر رفیق کے بعد مرزاؤں کی گلی میں رہنے والے ایک ماسٹر سے جن کا نام اختر صاحب تھا تعلیم حاصل کی۔ ایک سال میں نے اپنے والد کے پاس بمبئی رہ کر تعلیم پائی جہاں یعقوب سکنڈری اسکول اور پاپولر ہائی اسکول میں داخلے لئے اور گھر میں ماسٹر الطاف حسین صاحب سے پڑھتا رہا اور پھر اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں میں آگیا۔

"میرے دادا منشی ہدایت اللہ ریٹائرڈ سرویر آستانہ قادریہ بدایوں کے خاص رکن اور عقیدت گزار تھے۔ اس لئے میرے والد اور والدہ بھی اسی آستانہ کے بزرگ حضرت شاہ عبدالمقتدر کے مرید ہوئے۔ شاہ صاحب موصوف کی وفات میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہو چکی تھی، اور مسند قادریہ کے جانشین ان کے برادر گرامی عالم جید حضرت مولانا شاہ عبدالقدیر بن چکے تھے۔ اس لئے بچپن کے زمانے میں مجھے آستانہ قادری کی حاضری کے بے شمار موقعے ملا کرتے تھے۔"

عام طور پر شکیل کو ایک رومانی شاعر کہا جاتا ہے لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری قدیم رنگِ تغزل کی حامل ہے۔ جس میں حسن وعشق کی واردات بھی ہے ساقی و مےخانہ کا ذکر بھی ہے چاکِ دل اور چاکِ جگر کا تذکرہ بھی اور اُردو شاعری کی پرانی سمبالزم بھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ شراب نہیں پیتے تھے لیکن انہوں نے ریاض خیرآبادی کی طرح شیخ، واعظ اور ناصح پر طنز کی بوچھار کی ہے۔

افسوس کہ اُردو کا یہ فن کار جس نے فلمی دنیا میں اُردو کی ساکھ منوالی کم عمری ہی میں ہم سے الگ ہو گیا۔ اس کے گانے جن فلموں میں خاص طور پر مقبول ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔ میلا، آن، اُڑن کھٹولا، بیجو باورا، مدر انڈیا، سن آف انڈیا، مغلِ اعظم، گنگا جمنا، دیدار، گھونگھٹ، چودھویں کا چاند

[illegible]

بولی اُن کی مادری زبان بھی ہے اور اس میں اُنہیں بڑا کمال حاصل تھا۔

نوشاد فلموں کے مشہور میوزک ڈائرکٹر ہیں اُن کی دھنوں اور شکیل کے گیتوں نے بڑی مقبولیت پائی۔ گانے والے، گانے والیاں اور قوال ان کا کلام گاتے ہیں اور سامعین سے بےحد داد حاصل کرتے ہیں۔ اُن کی دو غزلیں تو بےحد گائی گئی ہیں۔

" اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا "

اور دوسری "جام تک نہ پہونچے، نام تک نہ پہونچے"

"ایک اور مشہور غزل ہے۔ محبت کر بیٹھے، شرارت کر بیٹھے" لیکن وہ زبان وبیان کے اسقام سے خالی نہیں۔ آخر میں شکیل کی شاعری کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

آپ کے جاتے ہی آباد ہوئی بزمِ خیال
بن گئی اور بھی تقدیر بگڑ جانے سے

الزامِ جنوں دیں نہ مجھے اہلِ محبت
میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ دیوانہ نہیں ہوں

اب تو خوشی کا غم ہے نہ غم کی خوشی مجھے
بےحس بنا چکی ہے بہت زندگی مجھے

لطیف پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے
محبت آئینہ ہو چکی تھی وجودِ بزمِ جہاں سے پہلے

میں تو اس عالم کو کیا سے کیا بنا دیتا مگر
کس کی چلتی ہے حیاتِ مختصر کے سامنے!

پنہاں ہے قہقہوں میں صدائے شکستِ دل
دُنیا اسی کا نام ہے پروردگار کیا؟

کتنی لطیف کتنی حسیں کتنی مختصر
اک نوشگفتہ پھول کی نکہت ہے زندگی

صدق وصفائے قلب سے محروم ہے حیات
کرتے ہیں بندگی بھی جہنم کے ڈر سے ہم

غم کو خوشی کی صورت بخشی
اس کا بھی سہرا آپ کے سر ہے

رہ کر طلسم خانۂ ہستی میں اے شکیل
اکثر تو میں خود اپنے ہی سائے سے ڈر گیا

مرحوم

منوّر لکھنوی

راج نرائن راز

لکھنؤ کے ایک کائستھ سکسینہ گھرانے نے علم و ادب، صحافت اور شعر و سخن کی جو طرح ڈالی، اُسے پانچویں پُشت میں حضرتِ منوّر لکھنوی نے ہر اعتبار سے تقویت پہونچائی۔ اُس زمانے کے دستور کے مطابق، اس گھرانے کے جدِ امجد منشی اُودے راج مطلع اور پھر اُن کے صاحب زادے منشی ایشوری پرشاد شعاعی نے فارسی شعر گوئی کو اپنا شعار بنایا۔ حضرتِ منوّر لکھنوی کے دادا منشی پُورن چند ذرہ اس گھرانے کے پہلے فرد تھے جنھوں نے اُردو میں شاعری کی۔ حضرتِ منوّر کے والد ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد اُفق نے نظم و نثر، طبع زاد تصانیف و تراجم، دونوں میں اپنی طبع کے جوہر دکھائے۔ صحافت سے اُن کا رشتہ گہرا رہا۔[1] اُردو صحافت میں یہ امتیاز حضرتِ اُفق کو حاصل ہے کہ اُنھوں نے "نظم اخبار" کے نام سے ایک منظوم اخبار نکالا، جو بہت دنوں تک بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار میں ساری خبریں منظوم ہوا کرتی تھیں، جو حضرتِ اُفق کی قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہے۔

اس گھرانے کا ماحول ابتدا ہی سے مذہبی تھا۔ اس میں دیو بانیوں کی گونج اکثر سنائی دیتی تھی۔ حضرتِ اُفق کی تصانیف سناتن دھرم پرکاش، سناتن دھرم کی تاریخ اور سوانح عمری گورو گوبند سنگھ اور تراجم میں رامائن یک قافیہ، مہابھارت، رام ناٹک وغیرہ اسی امر کا اشاریہ ہیں۔ اسی ماحول میں حضرت منوّر لکھنوی نے ۷ جولائی ۱۸۹۷ء کو آنکھ کھولی۔ اور اُن کی شخصیت، سیرت اور شاعری کے خد و خال اسی ماحول میں متعین ہوئے۔

فارسی شعر گوئی سے شغف اُن کا رشتہ اُن کے جدِ امجد منشی اُودے راج مطلع اور منشی ایشوری پرشاد شعاعی سے استوار کئے ہوئے ہے۔ فارسی شعر گوئی میں حضرت رائے سدھ ناتھ بلی فراقی دریابادی کے اس شاگردِ رشید نے نہ صرف یہ کہ فارسی میں دادِ سخن دی بلکہ فارسی کے کلاسیکی سرمایہ، حافظ، خیّام، بابا طاہر اصفہانی کے کلام کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ اُن کا حافظ کے اشعار کا ترجمہ "وجدانِ حافظ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ خیّام اور دیگر شعراء کے کلام کے تراجم ابھی زیورِ طبع سے محروم ہیں۔ حضرتِ منوّر لکھنوی نے فارسی کے کلاسیکی سرمایہ ہی کے نہیں بلکہ ہندوستانی شعراء کے فارسی کلام کے اُردو ترجمہ پر بھی توجہ کی ہے۔ "سوزِ اقبال" اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ علامہ



منوّر صاحب اپنی اہلیہ محترمہ اور گھر کے بچوں کے ساتھ

اقبال کے "ارمغانِ حجاز" کا یہ اُردو ترجمہ طباعت کے تکمیلی مرحلوں میں ہے۔

حضرتِ منوّر کی ادبی خدمات نصف صدی کا قصہ ہیں۔ یہ تصنیف، تالیف و ترجمہ پر محیط ہیں۔ اُن کا نام ذہن میں آتے ہی سنسکرت کی شاہکار تصانیف کے بے مثل تراجم کا خیال آتا ہے، جو فی الواقع حضرتِ منوّر کا حصہ ہیں۔ تراجم کے ذیل میں مقدس ہندو صحیفے گیتا کا، گلزارِ نسیم کی بحر میں، منظوم ترجمہ اردو میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یوں تو اُردو میں گیتا کے متعدد شعری و نثری تراجم دستیاب ہیں، لیکن مشاہیرِ ملک نے اسے گیتا کا بہترین اُردو ترجمہ قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں حضرتِ منوّر لکھنوی کے اُن تراجم کا اجمالی ذکر بھی مناسب معلوم

[1] حضرتِ منوّر نے بھی سلسلۂ معاش کا آغاز ۱۵ برس کی عمر میں اودھ اخبار کی نامہ نگاری سے کیا تھا۔

ہوتا ہے، جو انہوں نے سنسکرت کے عالمی شہرت کے ڈرامانگار کالی داس کی تصانیف کے کئے ہیں۔ کمار سمبھو، شکنتلا اور مالویکا گن متر (غیر مطبوعہ) اس سلسلے میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تراجم اُردو قاری کو سنسکرت شاعری کی نفاستوں اور لطافتوں سے بہ طریقِ احسن روشناس کراتے ہیں۔ سنسکرت کی دیگر تصانیف کے تراجم میں گیت گووند، مدرا راکھشس قابلِ ذکر ہیں۔ ان مطبوعہ تراجم کے علاوہ متعدد تراجم ایسے بھی ہیں، جو ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے۔ ان میں وکرم اروشی، رگھوونش وغیرہ خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

حضرت منورؔ نے اس باب میں مغرب کی خوشہ چینی بھی کی متعدد شعرا کی نظموں کے علاوہ اُنہوں نے مشہور جرمن شاعر گیٹے کی عالمی شہرت کی تصنیف "فاؤسٹ" کا منظوم ترجمہ بھی کیا، یہ ترجمہ میکس ملر بھون نئی دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

حضرت منور لکھنوی کے اہم مطبوعہ وغیر مطبوعہ تراجم کی تعداد بلا مبالغہ بیس سے زائد ہے۔ اِن تراجم کی داد تو اہلِ فن نے دی، لیکن شاید یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اِن کارناموں کی قدر و اہمیت کا کماحقہٗ اعتراف نہیں ہوا۔

ترجمے کے فن کو ادنیٰ سمجھنے کا ایک رجحان ہمارے یہاں عام پایا جاتا ہے۔ ترجمہ اور مترجم کی اہمیت کا اندازہ ایک اسی امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ فرٹز جیرالڈ کو خیام کی رباعیات کے انگریزی ترجمہ کی بدولت شاید خیام سے بڑھ کر شہرت اور قدر و منزلت حاصل ہوئی ہے اور حد تو یہ کہ خیام کے مترجموں نے فرٹز جیرالڈ ہی کے ترجمہ کا ترجمہ کیا ہے۔ اُردو میں عدمؔ کی "دو جام" پر فرٹز جیرالڈ کے اندازِ ترجمہ کی چھاپ گہری ہے۔ اور میراجی نے تو فرٹز جیرالڈ کا ترجمہ کیا، جو پچھلے دِنوں لاہور سے "خیمے کے آس پاس" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ایسے میں بڑے مترجم، حضرت منورؔ لکھنوی کی قدر ناشناسی کیا واقعی ہماری بدقسمتی نہیں۔

دیگر مذاہب کے مقدس صحیفوں کے تراجم کے بغیر حضرت منورؔ کے تراجم کا ذکر شاید نامکمل رہے گا۔ بودھی صحیفے دھمپد، جینی صحیفے یوگ سار، قرآن کریم کی بعض سورتوں، انجیل مقدس کے بعض حصص اور سکھ منی صاحب کے بعض حصص کے تراجم اس ذیل میں خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ اسلام، سکھ مت، بودھ مت اور جین مت کے مقدس صحیفوں کے ان تراجم کے علاوہ حضرت منورؔ نے اِن مذاہب کے مشاہیر پر نظمیں بھی لکھیں۔ اِن تراجم اور منظومات کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، یہ وسیع المشربی اور انسان دوستی کے سچے جذبہ کی تخلیق ہیں۔

تراجم کے سلسلے میں آخری لیکن شاید سب سے اہم وہ خدمت ہے جو حضرت منورؔ نے اُردو کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کر کے اُردو زبان کی خدمت انجام دی ہے۔ انجمن ترقی اُردو، پاکستان کراچی، جو اُردو لغت مرتب کر رہی ہے اس میں، لغت کی ترتیب سے متعلقہ بورڈ نے ان تمام ہندی و سنسکرت الفاظ کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو حضرت منورؔ نے اپنے تراجم میں استعمال کئے اور جو اس سے پیشتر کسی اُردو لغت میں نہیں ملتے۔ اِن الفاظ کی صحت، مفہوم و مطلب اور اُن کے صحیح استعمال کے باب میں حضرت منورؔ لکھنوی کے اشعار و جملے سند کے طور پر درج کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے[2] یہ یقیناً زبان کی بہت بڑی خدمت ہے۔

تراجم کے علاوہ منورؔ صاحب کی غزلیات و نظمیات کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُنہوں نے تمام اصناف میں شاعری کی ہے۔ جہاں غزل جوانی چاہتی ہے، وہاں رباعی پختگی و پیرانہ سالی کی مقتضی ہوتی ہے جس طرح منورؔ صاحب نے اپنی غزلوں کی اشاعت کو وقتِ دگر پر اٹھائے رکھا بالکل اُسی کے برعکس اپنی رباعیات کو اوّل وقت میں شائع کیا۔ ان کا پہلا مجموعۂ رباعیات کا "نذرِ ادب" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ حضرت منورؔ کا شمار اُردو کے معروف رباعی گو شعرا، جوشؔ، فراقؔ، امجدؔ اور رواںؔ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ابتداً پند و دانش کے جذبات کا اظہار چاہنے والی اس صنفِ سخن نے بعد میں ہر قسم کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ منورؔ صاحب کی رباعیا

---

[1] مطبوعہ تراجم: بھگوت گیتا موسوم نسیم عرفاں — (منظوم — حالیہ اشاعت ۱۹۶۱) کمار سمبھو (منظوم — ۱۹۵۲ء) دھمپد (منظوم — ۱۹۵۴ء) وجدانِ حافظ (منظوم — ۱۹۵۶ء) مدرا راکھشس (ڈراما — ۱۹۵۸ء) ساگر سنگیت معروف بہ بحرِ ترنم (نثری — ۱۹۶۲ء) گیتانجلی (نثری — ۱۹۶۳ء) شکنتلا نثری و شعری — ۱۹۶۳ء) گیت گووند (شعری — ۱۹۶۴ء) میری یادداشتیں (نثری)

غیر مطبوعہ تراجم:— چاروت، صہبائے دوام (رباعیاتِ عمر خیام) الہامات ایزدی "گیتانجلی (منظوم) یوگ سار، تعبیر منظوم (قرانِ کریم کی سورتوں کے مطالب منظوم) الہاماتِ مغرب (انجیلِ مقدس کے بعض حصص کا منظوم ترجمہ) نالۂ بےکس، سری روپ کلا، مالویکا گن متر۔

[2] اُردو نامہ کراچی

وعات کی گوناگونی اور رنگا رنگی کا دلکش مرقع پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے "زیرۂ گل" نام سے اپنی رباعیات کا مجموعہ مرتب کیا تھا اُسے چھاپے کی روشنائی ابھی سر نہیں آئی۔

رباعیات کے اس مختصر سے مجموعے کے علاوہ منوّر صاحب کی نظموں ایک مجموعہ "کائناتِ دل" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ "کائناتِ دل" ل کی نہیں، دیدہ و دل کی کائنات ہے۔ ان کی نظموں کے موضوع گوناں گوں یں۔ ان کی شان کفِ گل فروش کی نہیں، دامانِ باغباں کی ہے۔ مظاہرِ فطرت سے لے کر مصائبِ وطن تک، شاید ہی کوئی موضوع ہو، جسے منوّر صاحب نے پنی نظموں میں نہ برتا ہو۔ قدرتی مناظر اور قدرت کے مظاہر کا حسن اُن کی نظموں ں دیدنی ہے۔ وہ سرس کے پھولوں کا عکس ہو، یا ٹیسو کے پھولوں کی بہار، وہ برسات کے بادلوں کا مثلِ فیلِ مست خرام ہو یا مور کا کیف زا رقص، خوشبو میں بسے حنائی ہاتھوں کا نقش ہو، یا مارواڑی نازنینوں کی آخرِ شب فلک پیما الاپیں، برف پوش ہمالہ کا شکوہ ہو یا صاف شفاف گنگا کا تقدس، بسنت کے زرد زرد پھول ہوں یا ہولی کی فضائے رنگا رنگ میں اُڑتا ہوا عبیر و گلال، سبھی پر منوّر صاحب کے حسنِ تخیل اور حسنِ تخلیق کی چھاپ گہری ہے۔ اُن کی نظمیں لطیف جذبات اور نازک احساسات کی آئینہ ہیں۔ انہیں زبان و بیان پر جو بے مثل قدرت حاصل تھی، اُس نے اُن کی منظومات میں مرقعوں سی کیفیت پیدا کر دی ہے جدت ان کی خوبی اور ندرت اُن کا خاصہ ہے۔ اُن کی نظمیں تغزل کی سی کیفیت رکھتی ہیں۔

قومی مسائل نے بھی منوّر صاحب کو متوجہ کیا تھا۔ اُن کے فوری پیشرو علامہ اقبال، چکبست، سرور جہاں آبادی، وغیرہم اور اُن کے ہم عصر محروم، جوش فراق، آنند نراین مُلّا، ساغر نظامی، روش صدیقی اور دیگر شعرائے ملک کی تحریک آزادی کے ترجمان تھے۔ اس زمانے کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اُردو شاعروں کے جذبۂ وطن سے ملو تھا۔ وطن دوستی کے جذبہ سے سرشار اُردو شاعروں نے مادرِ وطن کے ہر ہر حسن و قبح پر نظر کی۔ بیشتر صورتوں میں یہ نگاہ اولین دکھائی دیتی ہے۔ منوّر صاحب بھی اُردو شعراء کے اسی قبیلے کے فرد تھے۔ اپنے مزاج اور اپنے ابتدائی پیشے یعنی صحافت کے اعتبار سے اُن کا اس قبیلے کا فرد نہ ہونا البتہ اچنبھے کی بات ہوتی۔

اُس زمانے کے اہم شاعروں کی طرح حضرت منوّر کی نظر قومی مصائب اور مسائل پر بھی رہی۔ اُن کی قومی وطنی نظموں میں ایک محبِ وطن کا دردمند دل دھڑکتا سنائی دیتا ہے۔ وہ دل جوش مند رکھتے تھے۔ وطن کی محبت میں وہ جذبات کی رَو میں کبھی بہے نہیں۔ ملک کی آزادی و ترقی کا یہ حامی و حمایتی، ایک سچے ہندوستانی کی حیثیت سے، اختلافات کی بنا پر قومی رہنماؤں سے خائف بھی رہا ان کا اندازِ نظر رومانوی نہیں۔ حقائق ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر رہے تاہم انہوں نے ان حقائق کو ایک شاعر کی طرح برتا۔

مذہب تحریکِ آزادی اور ہندوستانی سماج کے سُدھار میں کس طرح ممد و معاون بنا ہے۔ منوّر صاحب کی نظمیں شاید اس کی بہترین مثال ہیں۔ منوّر صاحب کی مُتعدد قومی وطنی نظمیں اُن کے پہلے مجموعۂ کلام "کائناتِ دل" میں شامل ہیں۔ ان کی حیثیت منور صاحب کی ایسی نظموں کی معتدبہ تعداد کے پیشِ نظر محض نمونے کی ہے۔ اُن کی قومی وطنی نظموں کا مجموعۂ "سوزِ وطن" جو بڑی حد تک تحریکِ آزادی کی شعری تاریخ ہے، اپنی اشاعت کا منتظر ہے۔

منور صاحب کی نظموں کا اندازِ بیشتر راست اور بیانیہ ہے۔ یہ اپنے اندر ایک عجیب دلکشی رکھتا ہے اُن کے اس اندازِ بیان نے انہیں تراجم کی طرف راغب کیا یا اُن کے ذوقِ ترجمہ نے اس انداز کی تشکیل میں معاونت کی۔ اس کا فوری فیصلہ ممکن نہیں ہے۔ تاہم اُن کے اس انداز نے ترجمہ و تخلیق دونوں کو لازم و ملزوم بنا دیا۔

منوّر صاحب کی تخلیقات کا ایک بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلیات کے دو انتخابات نوائے کفر اور ادائے کفر شائع ہو چکے ہیں۔ منوّر صاحب کی شخصیت اور سیرت کے جو نقش ہمیں ان کی قومی، وطنی، مذہبی اور مظاہرِ فطرت سے متعلق منظومات میں ملتے ہیں، انہیں کے عکس ان کی غزل کے اشعار سے نمایاں ہیں۔ منوّر صاحب کی غزلوں میں جو چیز فوری طور پر متوجہ کرتی ہے، وہ اُن کا پاکیزہ ذوق اور شائستہ حیات ہیں۔ اُن کی غزلوں میں ممکن ہے کوئی بات "بازناں گفتن" والی ہو، لیکن اس بات کی سطح "بازناں گفتن" والی نہیں۔ اُن کی غزل کے موضوعات گو غزل کے مروجہ موضوعات سے بہت مختلف نہیں، لیکن اُن کے ذوق کی پاکیزگی، حیات کی شائستگی، مختلف اندازِ نظر اور جداگانہ اسلوب نے اُن کے لب و لہجہ میں ایک انفرادیت پیدا کر دی ہے۔

منوّر صاحب کی غزل کے اجزائے ترکیبی، عمل اور ردِ عمل کی کشاکش میں مزاج کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی کیفیتیں محرومی و ناکامی کے احساسات، اعتدال

میں لائی ہوئی حُزنیہ کیفیات، تا دیر قائم رہنے والی ہلکی سی خلش چھوڑ جانے والا طنز، دیومالائی تشبیہیں، تلمیحیں، استعارے اور دھیما دھیما آہنگ ہیں۔

محرومی و ناکامی کے جذبات نے حضرت منوّر کی غزل میں ٹیس اور کسک کی جو کیفیت پیدا کی اس کی پرچھائیاں ہم اُن کی منظومات کے پیچھے کارفرما دردمندی کے احساس میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ منوّر صاحب نے محرومیوں کو اپنی راہ کا روڑہ نہیں بنایا اور نہ گھبرا کر فرار کی راہ اختیار کی اُن کی غزل میں محرومی و ناکامی کے جاری و ساری احساسات دراصل تبصرے ہیں: متاعِ دل و جاں کے۔ یہ عبارت ہیں متاسف خندہ سے اور زیرِ خند کیفیتوں سے اور تا دیر قائم رہنے والی ہلکی سی خلش چھوڑ جانے والے طنز کی خوبی و خوبصورتی بھی انہیں سے آئینہ ہے۔ اعتدال جو منوّر صاحب کے مزاج کا خاصہ تھا۔ اِن حُزنیہ کیفیتوں کو گوارا بنائے ہوئے ہے یہ کیفیات ہمارے احساسات کو اس لئے بھی چھوتی ہیں کہ یہ ہم سب کی مشترک ہیں سانجھے دُکھ سُکھ کا نتیجہ ہیں۔ ان کی اثرانگیزی کا راز منوّر صاحب کے معتدل لب و لہجے اور دھیمے آہنگ میں تھا اُن کے مزاج میں شدت نہیں۔ اُن کی رجائیت: بھی بجھی سہی، اختیاری نہیں۔ اُن کے مزاج کا حصہ تھی۔ یہ زندگی کو سر اور بسر کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی

حضرت منوّر کی بیشتر تخلیقات و تراجم کا سرچشمہ مذہب تھا۔ مذہب اور اس سے وجود پانے والے اخلاق کے نقوش اُن کی غزلوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ چونکہ مذہب منوّر صاحب کے مزاج کا حصہ تھا۔ اس لئے دیومالائی پیکر، تشبیہیں تلمیحیں اُن کے اشعار میں بار پا گئی ہیں۔ ان سے غزل کا مزاج مزید ہندوستانی ہوا ہے۔ معنوی وسعت کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عجیب پاکیزگی آئی ہے۔ اِن کے علاوہ منوّر صاحب نے جو تشبیہیں، علامتیں برتی ہیں وہ نہ کل پرانی تھیں نہ آج پُرانی ہیں۔ اور نہ شاید کل پرانی ہوں گی۔ ان کے انفرادی استعمال نے اُنہیں ایک نئی معنویت عطا کی تھی۔ بڑے تازہ کار اثرات پیدا کئے ہیں۔ بیشتر صورتوں میں یہ نو تخلیق کا مرتبہ رکھتی ہیں۔

مختصراً حضرت منوّر کے اشعار میں لفظ و معنی کی ایک نئی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری مرحوم نے اُن کے بارے میں بجا لکھا ہے "قدرِ اوّل کے شعراء اب بھی غزل ہی کی زمین سے ابھرتے ہیں۔ اور اُنہیں میں ایک منوّر صاحب ہیں"۔ منوّر صاحب کے تعلق سے، علامہ مرحوم کی رائے کا اطلاق دوسری اصناف شاعری پر بھی ہوتا ہے۔

آخر میں منوّر صاحب کے اُن نثری مضامین کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے سنسکرت ادب، سنسکرت کے شاعروں، اُردو کے ہندو شعراء اور اُن کے کلام سے متعلق لکھے اور جو وقتاً فوقتاً ملک کے مُقتدر رسائل میں شائع یا آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے۔ منوّر صاحب نے اپنے ایسے مضامین کا انتخاب "معروضات" کے نام سے کیا تھا۔ یہ ابھی شائع نہیں ہوا۔



منوّر صاحب کی ادبی خدمات کے تجزیئے کے اس مرحلے میں، منوّر صاحب ہی کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آ رہا ہے۔

؎ خود اعتمادی یہ کہہ رہی ہے، مرے اِک اِک شعر سے منوّر
مزاج نکھرے گا شاعری کا، ادب کو شائستگی ملے گی

دوسرے مصرعے کو ذرا سے تصرّف کے بعد یوں کرلیں تو شاید زیادہ مناسب اور حسبِ حال ہوگا۔

ع مزاج نکھرا ہے شاعری کا، ادب کو شائستگی ملی ہے۔

— اور اس میں کوئی تعلی نہیں۔



گومتی

صغرا مہدی

میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی ــــ

کوئی درد بھری آواز میں گا رہا تھا۔ یہ آواز سُن کر میری یادوں کے پردے پر اُس کی تصویر اُبھر آئی۔ لگا جیسے وہ سفید ساڑھی میں موٹے موٹے منکوں کی مالا پہنے ماتھے پہ تلک لگائے محویت کے عالم میں میرا کا یہ بھجن گا رہی ہو۔

مجھے یاد آیا۔ اس نے کہا تھا "آپ دُوسرے اسکول میں بھی مجھے یاد کریں گی۔"

"کیوں نہیں، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے" میں نے اُسے گلے سے لگا لیا تھا۔

وہ اسکول بلکہ میں نے تو وہ شہر بھی چھوڑ دیا مگر اب بھی وہ مجھے یاد آتی ہے۔ دِل چاہتا ہے معلوم کروں وہ کہاں ہے، کیسی ہے؟

اس کا نام گومتی تھا۔ وہ ہمارے اسکول میں مائی تھی مگر وہ اپنے کو (Water Woman) واٹر وومین کہا کرتی تھی۔ اسی کے ذمے اسکول کا گھنٹہ بجانا، پانی پلانا اور دوسرے چھوٹے موٹے کام تھے جنہیں وہ بہت ذمہ داری اور شوق سے کرتی۔ اس کے علاوہ لڑکیوں اور اُستانیوں کے کام بھی کر دیتی جس کا معاوضہ وہ چند میٹھے بول چاہتی۔ اس کے برعکس اگر کوئی اُستانی یا لڑکی اُس پر دھونس جماتی تو گومتی بھِر جاتی۔ وہ کسی کی ٹیڑھی بات ذرا بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ کہا کرتی "آپ بڑی ہوں گی' اپنے گھر کی، میں کیوں کسی کی دھونس سہوں۔ میں تو گورنمنٹ سرونٹ ہوں، اور آخری جملے میں اس کی آواز میں غیر معمولی کڑاک آجاتی۔

اُس کا خیال تھا کہ وہ بہت اچھی انگریزی جانتی ہے۔ اپنی گفتگو میں موقع بے موقع انگریزی لفظ استعمال کرتی۔ میں اس سے پوچھتی "تم نے یہ انگریزی کہاں سے سیکھی گومتی" تو وہ کھل جاتی۔ "ارے اب کہاں بہن؟ آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر تو سب بھول بھال گئی۔ اس سے پہلے جس اسکول میں تھی وہاں کی پرنسپل تو بس انگریزی ہی بولا کرتی تھیں۔ اُن کے ساتھ رہ کر میں بھی سیکھ گئی" اور پھر وہ غلط سلط جملے، ادھورے محاورے سُنا سُنا کر مرعوب کرنے لگتی۔

اسکول میں جب کوئی نئی ٹیچر آتی گومتی اس کا پُرزور خیر مقدم کرتی۔ اس کی بے انتہا خاطر مدارات ہوتی بالکل اسی طرح جیسے وہ گومتی کے گھر مہمان آئی ہو۔ بلکہ اس کو اسکول کے حالات، پرنسپل کے مزاج اور اُستانیوں کی عادات کے بارے میں معلومات بھم پہونچائی جاتیں۔ جو اُستانی اِن باتوں کو سُن لیتی گومتی اس پر سخت مہربان ہو جاتی اور اُس کے برعکس اگر کوئی اُسے جھڑک دیتی تو پھر وہ اس کو قطعی نظر انداز کر دیتی ایسے جیسے اس کا اسکول میں وجود ہی نہ ہو۔

میں اُسے پہلے ہی دن پسند آگئی تھی کیونکہ میں نے اُسے آپ سے مخاطب کیا تھا۔ اس کی نصیحتوں پر عمل کیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اُسے یقین دلایا کرتی کہ وہ اپنی وضع قطع سے مائی نہیں نیچر لگتی ہے۔

وہ مجھے جب خالی دیکھتی آجاتی اور اپنی بیتی زندگی کی کہانی سُنانے لگتی جسے بار بار دہرانا ہی اب اُس کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت بن گیا تھا۔

"بہن میرے ماں باپ کھاتے پیتے تھے۔ اُنہوں نے مجھے بہت لاڈ پیار سے پالا تھا۔ میں تھی بھی اُن کی اکلوتی اولاد۔ میرا بھیا تو بہت بعد میں پیدا ہوا تھا۔ میری شادی کے بعد"

"تم کتنی بڑی تھیں اس وقت" میں پوچھتی۔

"بس پندرہ پورے کر کے سولہویں میں لگی تھی۔ میرے پتی بہت سُندر بہت اچھے تھے۔ بس اکیلے ہی تھے۔ دسواں پاس تھے۔ بالکل بابو لگتے تھے فوٹو اُتارنے کی بڑی سی دکان، نہیں نہیں اسٹڈیو تھا۔"

"اُس نے تمہاری بھی کوئی تصویر اُتاری تھی۔"

"ایک؟ نہ جانے کتنی اُتار ڈالی تھیں۔ کام ہی کیا تھا بس طرح طرح کے کپڑے پہنا کر تصویریں اُتارا کرتا تھا۔ دُنیا کی چیزیں لا کر دیتا کہتا تو تو میرے دل کی رانی ہے۔ بس بنی سجی رہا کر۔ مگر تین سال بعد خود تو چپکے سے چل بسا اور میں۔" اُس کی آواز بھرا جاتی

"کیا ہوا تھا اُسے۔"

"موٹر کے نیچے آگیا تھا۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں، مگر وہ آنسو پی کر کسی کام میں لگ جاتی یا پھر بھجن گانے لگتی۔ اور تھوڑی دیر بعد اُس کے چہرے پر وہی سکون اور طمانیت ہوتی۔

میں سوچتی رہ جاتی، آخر یہ اپنی کہانی کا اختتام یہیں پر کیوں کرتی ہے۔ کبھی یہ کیوں نہیں بتاتی کہ پھر اس پر کیا بیتی۔ کیسے اُس نے اپنی بھرپور جوانی کاٹی تھی۔ کتنی حسین رہی ہوگی یہ عورت اپنی جوانی میں۔ جب بڑھاپے میں یہ حال ہے۔ وہ اپنی عمر پچاس سے اوپر بتاتی۔ مگر دیکھنے میں شکل سے چالیس بیالیس کی لگتی۔

"گومتی تم اپنی جوانی میں کیا غضب ڈھاتی ہوگی؟" میں اُسے چھیڑتی۔ وہ ہنس دیتی "آپ تو مذاق کرتی ہیں۔" پھر شرما کر کہتی "بہن جی! یہ نہ پوچھو کہ کیسی کانٹوں بھری راہ سے گزری ہوں۔ اگر بھگوان ساتھ نہ دیتا تو نہ جانے کہاں ہوتی، کیسی زندگی بتا رہی ہوتی۔ مگر میں نے جو بھگوان کا دامن تھاما تو پھر چھوڑا ہی نا۔ اور اب تو نیا پار ہوگئی ہے اب کیا ڈر۔"

اُس کو میرا کے بہت سے بھجن یاد تھے۔ جن کو وہ بہت خوش الحانی سے گاتی۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھا "تم کو میرا کے بھجن کیوں اتنے پسند ہیں؟"

"انہیں گا کر مجھے شانتی ملتی ہے۔"

"کیا خاص بات ہے ان میں۔ مجھے تو سب بھجن ایک سے لگتے ہیں۔"

"بہن جی عورت کے دل کی تڑپ عورت ہی جان سکتی ہے۔" اور میں دنگ رہ گئی۔

گرمیاں ہوں یا جاڑے وہ ہر صبح گنگا اشنان کو ضرور جاتی، پھر پوجا پاٹ کرتی۔ کیرتن گاتی، ہر منگل کو برت رکھتی اور بڑے نہانوں پر وہ ہردوار وغیرہ بھی جایا کرتی۔ میں اُسے منع کرتی۔ بھلا اس سردی میں کیا مصیبت ہے کہ روز گنگا پر جا کر نہاؤ۔ گھر میں بھی تو نہایا جا سکتا ہے۔ کیا فائدہ ان برتوں سے جو تم ہر منگل کو رکھتی ہو۔ تھوڑا آرام کیا کرو۔"

وہ مجھے ان نظروں سے دیکھتی جیسے کوئی بچے کو نادانی کی بات کہتے ہوئے دیکھتا ہے۔ پھر مسکراتی، کس قدر درد میں ڈوبی ہوتی تھی اسکی مسکراہٹ "بہن جی اسی کے سہارے تو میں نے اپنی پہاڑ سی زندگی بتائی ہے۔ یہی سب سے بڑا سہارا ہے۔" اور بعد میں وہ جھوم جھوم کر مجھے بھگتی کے گیت سُنانے لگتی۔ اس وقت اس کے چہرے پر جو روحانیت ہوتی اس سے میں بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکتی۔

وہ مجھے بہت فخر سے بتاتی کہ اُسے محلے میں کیرتن گانے، دوسری مذہبی رسومات ادا کرنے بلایا جاتا ہے۔ بہت سی عورتیں میری چیلیاں ہیں۔ یہ تو میں بھی دیکھتی کہ اس کے پاس طرح طرح کی عورتیں آیا کرتیں، جن سے وہ مجھے بھی ملواتی۔ گومتی کی زندگی کی باقی کہانی مجھے اس کی ایک چیلی ہی سے معلوم ہوئی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ گومتی کے بیوہ ہونے کے بعد جب تک ماں باپ زندہ رہے پھر بھی چین سے گزری مگر اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی عزیزوں، رشتہ داروں نے جو کچھ انہوں نے چھوڑا تھا، ہتھیا لیا اور گومتی اپنے بھائی کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ وہ تو خیر بچہ ہی تھا۔ گومتی اس وقت سے نوکری کر کے اپنا اور اپنے بھائی کا پیٹ پال رہی

ہے۔ وہ بچارا تو اندھا ہے۔ بس مندر میں بیٹھا رہتا ہے۔ ماس کے بال بچوں کو گومتی پالتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ گومتی محلے بھر میں سب کا خیال اور خدمت کرتی ہے اور سارے محلے والے اُسے دیوی سمجھتے ہیں۔

واقعی جب گومتی کی چیلیاں آتیں تو اس کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر عجب عقیدت و احترام کا تاثر ہوتا۔

گومتی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے سب بھتیجے بھتیجیوں کو پڑھا رہی ہے۔ اس کا بڑا بھتیجا دسویں میں ہے "میں اسے بالکل بابوؤں کی طرح رکھتی ہوں۔ بہن جی۔ ویسے تو سب میرے ہیں مگر اس کو تو میں نے گود لیا ہے اور وہ مجھے کہتا بھی اماں ہے۔ بس اب تو بھگوان سے ایک ہی پرارتھنا ہے کہ وہ اُسے کسی قابل کر دے پھر تو میں نوکری چھوڑ کر مزے سے گھر میں بیٹھوں اور دن رات کیرتن گاؤں۔"

میں سوچنے لگتی کہ اس عورت میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کی کس قدر زبردست قوّت ہے۔ یہ کبھی ہراساں نہیں ہوتی۔ ناامید نہیں ہوتی۔ قناعت اور صبر و شکر کا سبق اُس نے کہاں سے پڑھا ہے۔

ایک دن گومتی اسکول میں نظر نہ آئی۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اُس کا بھتیجا ایک ایکسی ڈنٹ میں ختم ہو گیا۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔ گومتی کے بھگوان کو اس کا یہ امتحان بھی لینا تھا۔ مگر نہیں وہ اُسے نہ سہار سکے گی۔ پاگل ہو جائے گی۔ نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ دل چاہتا تھا کہ اس کے پاس جاؤں مگر ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اُس سے کیا کہوں گی۔؟

تیسرے دن جو میں اسکول پہونچی تو دیکھا گومتی گھنٹہ بجا رہی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُسے دیکھا۔ چہرے پر چند جھرّیاں تھیں۔ آنکھوں میں غم کے سائے مزید گہرے تھے مگر چہرے پر وہی سکون تھا۔

میں نے آہستہ سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر نہایت صاف آواز میں بولی "بہن جی بھگوان تو ہے۔"

میں آنسو ضبط نہ کر سکی۔

ساحر ہوشیارپوری

غزل

جس کے من کو بھائے سانپ
کیوں اُس کو ڈس جائے سانپ

اِن کو دودھ پلاتا ہوں
جیسے ہوں ماں جائے سانپ

ختم ہوئی میعادِ غم
نیک خبر یہ لائے سانپ

ق

جب دیکھو اس دُنیا میں
انساں کو ڈس جائے سانپ
لطف تو جب ہے خود کو بھی
انساں سے ڈسوائے سانپ

اِن کی دو ہی قسمیں ہیں:
اپنے اور پرائے سانپ

کتنی تلخ حقیقت ہے
انساں کے ہمسائے سانپ

جوبن، مستی، شرم، حیا!
کیا کیا رُوپ دکھائے سانپ

ہیں کتنے پابندِ وفا
نام لیا اور آئے سانپ

راہ تکتے ہیں جوگی کی
اپنا پھن پھیلائے سانپ

صبح سے چھپ کر بیٹھے تھے
سانجھ ہوئی اور آئے سانپ

ساحر تیرے شعروں میں
کیسے کیسے آئے سانپ!!



ہم اپنی آواز چاہتے ہیں

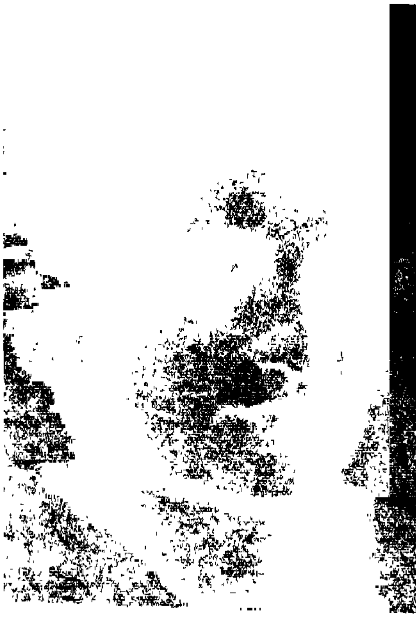
ذرا ذرا فاصلے پہ ہم سب خموش بیٹھے
خراشِ آوازِ اجنبی کے ہر ایک امکاں سے
خود کو محفوظ کر رہے ہیں
(ہماری بستی میں آج کی رات کاٹنے کو
رُکا ہے اک اجنبی مسافر)
ہم اُس کو محفوظ کر رہے ہیں
ہمارے ہاتھ ــ ایک سے عمل میں
اُٹھا کے ساحل سے سیپ کنکر
ٹھہر ٹھہر کر
پرے سمندر
یں پھینکتے جا رہے ہیں ــ جیسے
ہی ہو طرزِ سخن یہاں کا
ہی ہو جیسے الم بیاں کا
یہ جانتے ہیں ــ (جبھی تو چپ ہیں)
ہ ان سبھی کنکروں کو اک بار
پھر سمندر میں پھینکنے کو
ہیں ہے درکار ایک پورا جنم
جسے ہم
ہ کر سکیں گے کبھی بھی حاصل
ہ اجنبی مہاں بھی تک تک کے ہم کو اب ہو چکا ہے شامل
سی عمل میں
کہ جس عمل پر
نہ ہم کو حیرت ہی ہو رہی ہے
نہ غصہ ہی آ رہا ہے (خود پر نہ دوسرے پر)
نہ آ رہی ہے ہنسی ہی ہم کو
نہ اپنی آنکھوں میں اپنی اس بے بسی پہ
آنسو ہی آ رہے ہیں
نہ ہم کو وہ لفظ مل رہا ہے
جو اجنبی مہماں کو ــ ہم کو ــ (یہ جو بھی آدھے ادھورے ہم ہیں)
یہی بتا دے
کہ غیر وابستگی، اُداسی، اُچاٹ ساجی
کسی جگہ خود کو سونپ دینے سے بے نیازی
یہ معجزہ ہے !
کہ سانحہ ہے ؟
یہ جذبہ کیا ہے :
(ہمارے جذبات کے سمندر کو کیا ہوا ہے؟)
(ہماری آواز کا لہو کون پی گیا ہے ؟)
یہ جذبہ کیوں ہے !
(یہ سرد مہری ہے یا جنوں ہے ؟)
(یہ باہر اندر خلا رسا کیوں ہے ؟)
یہ کیا زمیں ہے، یہ کیا سمندر ہے، کون ہم ہیں !
یہ کن صداؤں کا ہم الم ہیں !
کہ اجنبی ہم میں ہو کے شامل بھی اجنبی ہے
یہ ہم میں عظمت کی کیا کمی ہے !
کبھی تو اے آسماں جیسی عظیم آواز کے بزرگو
یہ ہم سے پوچھو
کہ ہم کو آخر قبول موت اپنی کونسی ہے۔
نہ جانے کیسا تمہارا جی ہے۔
ہمارا مرنا ہی سہل کر دو
ہمارا رشتہ رہا ہے تم سے، یہی خبر دو
کہاں ہماری جڑیں ہیں یہ کھود کر دکھاؤ
کبھی کوئی اپنا حق جتاؤ
وہ پتھروں کے زمانے جیسا ہی ظلم ڈھاؤ
ہمارے ان بے تکان جسموں کو توڑ کر چور چور کر دو
ہمیں کوئی خوف ہی دلاؤ
ہمیں گپھاؤں میں بند کر دو
گپھاؤں پر اک چٹان دھر دو
ہمارے تم سامنے ہی آؤ
ہمارا کوئی تو کام کر دو
ہماری آنکھوں میں ریت بھر دو
کہ رو سکیں ہم
ہمارے منہ اپنے وقت جیسے قدیم ہاتھوں سے کھول کر اُن
میں سیپ ٹھونسو

کہ کچھ کہیں ہم
اُٹھا کے ہم سب کو آکٹوپس کے سامنے ڈال دو کہ خود کو
ذرا سا پہچان تو بھی لیں ہم
زندمی صداؤں میں ہم کو گھر لوٹنے کو کہہ دو
جو چونک اُٹھیں ہم
جہاں سے ہم آئے ہیں ہمارا پتہ وہ پوچھو
جو بول دیں ہم
تمہاری شفاف عظمتوں سے کچھ اس طرح ہم الگ ہوئے ہیں
کہ اب زمیں کو ہی پھر سمندر میں پھینکنا چاہنے لگے ہیں
یہ چاہتے ہیں
کہ ایسی آواز ہم سُنیں جو
تمام تر ہو
ہمارے اپنے کٹے دھڑے کی
کہ ہو جواب تک کی عظمتوں سے بہت پرے کی
ہم اپنی آواز چاہتے ہیں۔
ہم اپنی آواز چاہتے ہیں
ہم اپنی آواز چاہتے ہیں

من موہن تلخ

ممتاز ہندوستانی نژاد سائنس داں ڈاکٹر ہرگوبند کھورانہ جنہوں نے مصنوعی جین تیار کر کے عظیم سائنسی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ڈاکٹر کھورانہ اس وقت امریکی شہری ہیں اور انہیں تناسل و توالد کے راز سے پردہ اٹھانے کے عظیم سائنسی کارنامے پر نوبل پرائز بھی مل چکا ہے۔ مصنوعی جین کی ایجاد سے مستقبل قریب میں تناسلی منصوبہ بندی ممکن ہو سکے گی اور من پسند صلاحیتوں کے بچے پیدا کئے جا سکیں گے ـــ تصویر میں ڈاکٹر کھورانہ (دائیں جانب) اپنے ایک رفیق کار کے ساتھ سائنسی تجربے میں مصروف ہیں۔





لنکا میں منعقدہ عام انتخابات میں شریمتی سری ماؤ بھنڈار نائک کی قیادت میں بائیں بازو کے متحدہ محاذ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء سے شریمتی بھنڈار نائک پھر لنکا کی وزیراعظم بن گئی ہیں۔ شریمتی بھنڈار نائک کو دنیا کی پہلی خاتون وزیراعظم ہونے کا فخر حاصل ہے۔



ماہ مئی کے آخری ہفتے میں پاکستان کے مشہور شاعر جناب فیض احمد فیض ہندوستان تشریف لائے۔ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ان کا پرجوش خیرمقدم کیا گیا۔ فیض صاحب اپنے قیام کے دوران شروع جون میں نیشنل بک ٹرسٹ کی جانب سے منعقد کئے گئے رائٹرز کیمپ میں شرکت کے لئے میسور بھی گئے۔

(تصویر میں) سجاد ظہیر صاحب آکاش وانی بھون نئی دہلی میں ریڈیو کے لئے فیض صاحب (دائیں) کا انٹرویو لیتے ہوئے۔

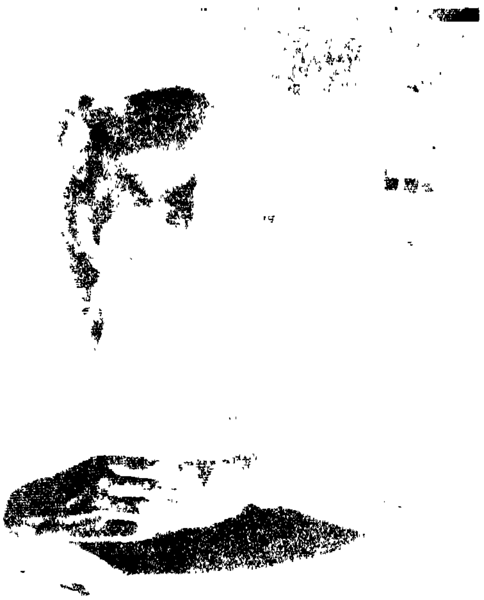


دن ڈھل گیا

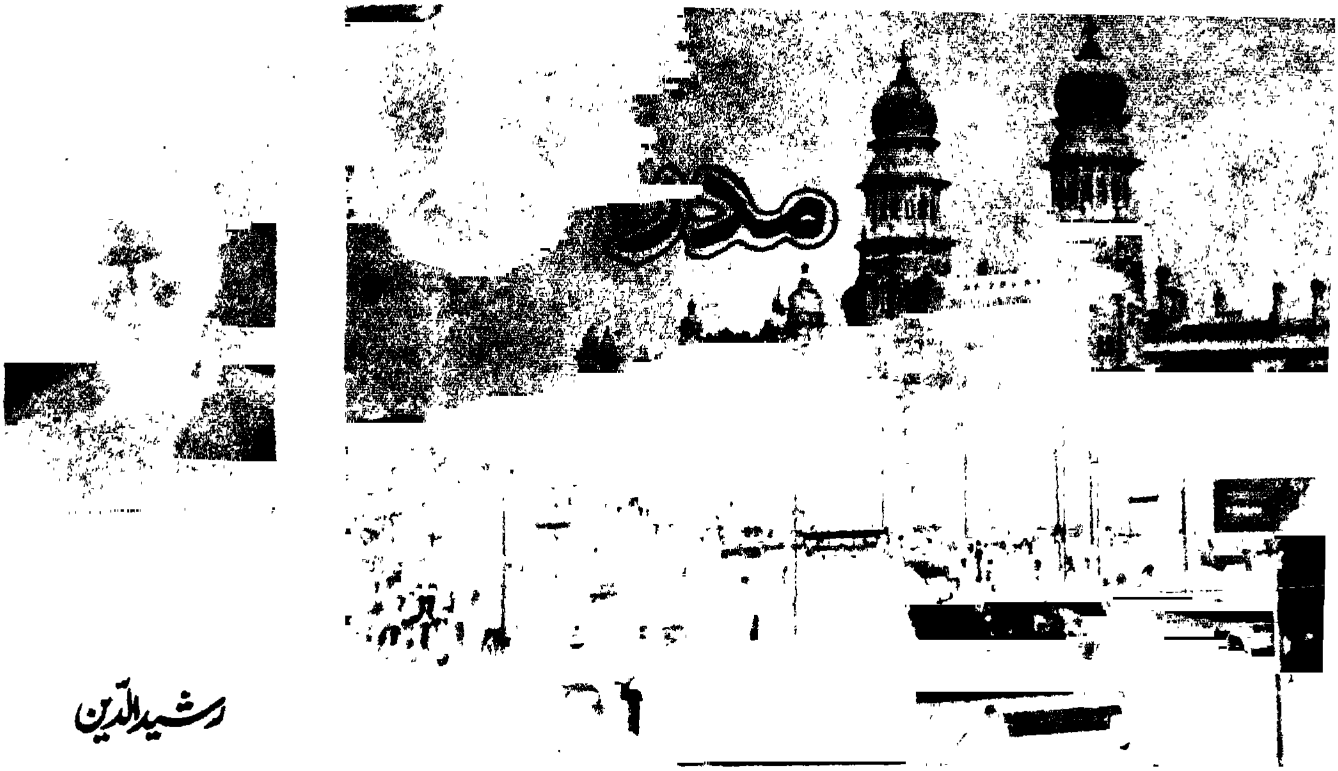


۲۳ مئی ۱۹۷۰ء کو مرکزی وزیرِ قانون شری پنم پلی گووندا مینن کا دل کا شدید دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ شری مینن یکم اکتوبر ۱۹۰۸ء کو چلاکیڈی ضلع تریچور (کیرالہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے مدراس یونی ورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور پھر فوجداری وکیل بن گئے اور ساتھ ہی ٹریڈ یونین اور پرجا منڈل تحریک میں بھی سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ ۴۷-۱۹۴۶ء کے دوران وہ ریاست کوچین کے وزیرِ اعظم رہے۔ وہ ۱۹۵۴ء میں کیرالہ کے تکھیہ منتری اور ۱۹۶۵ء میں لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ وہ ۱۹۶۶ء میں مرکزی وزیرِ خوراک اور مارچ ۱۹۶۷ء میں وزیرِ قانون و سماجی فلاح بنے۔ بنکوں کو قومیانے سے متعلق قانون اُن کا عظیم کارنامہ ہے۔ اُن کی موت سے ملک ایک عظیم محبِّ وطن، مدبّر اور اچھے قانون داں سے محروم ہوگیا ہے۔

۲۴ مئی ۱۹۷۰ء کو اُردو کے نامور شاعر جناب بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی کا ۷۳ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم دو برس سے صاحبِ فراش تھے۔ اُن کی موت اُردو شعر و ادب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اِدارہ اُن کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ (مضمون صفحہ ۱۶ پر ملاحظہ فرمائیں)



۷ جون ۱۹۷۰ء کو انگلستان کے ممتاز ناول نویس ای ایم فورسٹر کا ۹۱ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ آپ کا شمار دورِ جدید کے عظیم ناول نویسوں میں ہوتا تھا۔ ای ایم فورسٹر ۱۳-۱۹۱۲ء میں ہندوستان تشریف لائے اور اس کے بعد انہوں نے ہندستان میں انگریزی راج کے اوّلین دور سے متعلق ایک ناول "اے پیسیج ٹو انڈیا" تصنیف کیا جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ دوبارہ ہندوستان آئے، اور ۱۹۵۳ء میں انہوں نے ہندوستان سے متعلق ایک اور ناول "دی ہِل آف دیوی" تصنیف کیا۔ اِن دو ناولوں کے علاوہ ویئر اینجلز فیئر ٹو ٹریڈ" "لانگسٹ جرنی"، "اے رُوم وِد اے ویو" اور "ہوورڈ اینڈ" اُن کی یادگار ہیں۔



رشید الدین

مدراس ہندوستان کے اُن بڑے اور جدید شہروں میں سے ہے جو یہاں یوروپی اقوام کے آنے کی وجہ سے آباد ہوئے۔ ہندوستان کے دو سب سے بڑے شہر کلکتہ اور بمبئی بھی اس طرح آباد ہوئے۔ یوروپی اقوام جب یہاں سے سمندر کے راستے تجارت کے لئے آئیں تو انہوں نے ساحلوں کو ہی اپنا ٹھکانا بنایا اور پھر رفتہ رفتہ اُن کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ ساحلی مقام بھی ترقی کرتے گئے۔ چنانچہ ہندوستان کے یہ تین متذکرہ صدر شہر اور پاکستان کے سابق دارالخلافہ کراچی اس طرح آباد ہوئے اور انہیں روز افزوں ترقی نصیب ہوئی۔ یہ سارے شہر بڑی حد تک مغربی وضع کے ہیں اور ان پر مغربی تہذیب کی گہری چھاپ ہے۔ ہندوستان کے ان ساحلی شہروں کو ہم بڑی حد تک مغرب کے ترقی یافتہ اور بڑے شہروں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔

شہر مدراس کی ابتدا، پندرہویں صدی عیسوی میں پرتگالیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ جس وقت اس شہر کی بنیاد پڑی، ہندوستان میں مغل سلطنت کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ انگریز، فرانسیسی، پرتگالی اور ولندیزی اقوام کی تجارت کے بہانے ہندوستان میں آمد و رفت شروع ہو چکی تھی اور انہیں اسی تجارت کے نام پر مغل حکومت سے کافی سہولتیں بھی حاصل تھیں۔ اسی زمانے میں پرتگالیوں نے میلا پور کے مقام پر ایک فیکٹری تعمیر کی۔ اس کے بعد انہوں نے سینٹ تھامس کے مقبرے کے پاس ایک رومن کیتھولک چرچ قائم کیا۔ بس یہیں سے مدراس شہر کی ابتدا ہوتی ہے۔

فورٹ سینٹ جارج جو بعد میں انگریزوں کی زبردست پناہ گاہ بن گیا، ۱۶۵۳ء میں تعمیر ہوا۔ انگریز، فرانسیسی، پرتگالی، اور ولندیزی ان چاروں یوروپی اقوام میں مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد کشمکش شروع ہوئی، اور ہر قوم یہ چاہنے لگی کہ وہ یہاں جم جائے اور اُن کے ملک و قوم کو ہندوستان کو نو آبادی بنا لینے کا شرف حاصل ہو۔ ایک طویل کشمکش کے بعد انگریزوں کو اس میں فتح ہوئی چنانچہ مدراس اس ابتدائی کشمکش کے دوران انگریزوں کے ہاتھ آیا اور انہوں نے اُسے اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا۔ اس مرکز سے ایک طرف انگریزوں نے ہندوستانیوں کا مقابلہ کیا اور دوسری طرف اپنی حریف مغربی اقوام کو بھی زک دی۔ کلائیو کے زمانے میں مدراس انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا زبردست مرکز بن گیا اور یہیں فورٹ سینٹ جارج میں تمام تیاریاں اور سازش کرنے کے بعد اس نے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ جیسے محب وطن اور بہادر ہندوستانی کو شکست دی۔ بعد میں ہندوستان میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا مگر پلاسی



پارتھا سارتھی مندر

کی جنگ کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہ جنگ انہوں نے مدراس کے مرکز ہی سے جیتی تھی۔ بعد میں انگریزوں کے مرکز کلکتہ اور بمبئی بھی ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ وہ سارے ہندوستان کے واحد حکمراں بن گئے۔

انگریزوں نے مدراس شہر پر اپنی تہذیب کے گہرے اور دائمی نقش چھوڑے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہاں بے شمار چرچ نظر آتے ہیں، جن میں سینٹ میری کا چرچ سب سے ممتاز ہے جسے سارے مشرق میں پہلا پروٹسٹنٹ چرچ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مدراس میں کرسچن بھی کافی تعداد میں ہیں اور یہ سب وہ مقامی باشندے ہیں جنہوں نے انگریزوں کے زمانے میں اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ انگریزی کا بھی یہاں کافی عمل دخل ہے اور آج بھی تامل کے بعد جو اس شہر کی عام زبان ہے، صرف انگریزی ہی ایک ایسی زبان ہے جس کے ذریعہ ایک نووارد وہاں کے باشندوں سے بات کر سکتا ہے اور اپنا کام نکال سکتا ہے۔ اس طرح انگریزوں نے مدراس پر اپنے مذہب، کلچر اور زبان تینوں کا اثر ڈالا ہے اور اُن ہی کے زمانے میں یہ شہر ہندوستان کا ایک اہم اور بڑا شہر بنا۔

آج مدراس، کلکتہ، بمبئی اور دہلی کے بعد سارے ہندوستان کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے اس کی آبادی تقریباً سوا سترہ لاکھ ہے اور یہ پچپن مربع میل پر مشتمل ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رُو سے تو یہ سارے ہندوستان کا تیسرا بڑا شہر تھا مگر گزشتہ چند سالوں میں دہلی کی آبادی بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے وہ ہندوستان کا تیسرا بڑا شہر بن گیا اور مدراس چوتھے نمبر پر آگیا پھر بھی مدراس جنوبی ہند کا سب سے بڑا شہر ہے اور کئی باتوں میں اُسے ہندوستان کے دیگر شہروں میں امتیاز حاصل ہے۔ جنوبی ہند کے دیگر بڑے شہر حیدر آباد بنگلور اور ٹریونڈرم ہیں جو آبادی میں مدراس سے بہت کم ہیں۔

مدراس، کلکتہ اور بمبئی کی طرح اونچا ہی اونچا اور گنجلک شہر نہیں ہے بلکہ دہلی کی طرح پھیلا ہوا اور کشادہ ہے۔ یہاں کی عمارتیں زیادہ بلند نہیں صرف ایک لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کی عمارت



لائف انشورنس کارپوریشن کی بارہ منزلہ عمارت

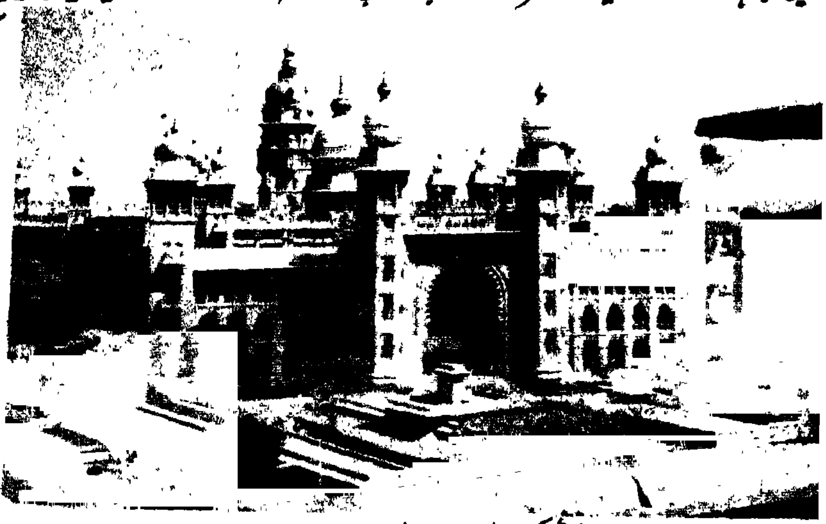


مرینا مدراس

جوبارہ منزلہ ہے اور حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے ورنہ عام
ر پر یہاں دو یا زیادہ سے زیادہ تین منزلہ عمارتیں ہیں
مارے شہر میں مختلف پارکس اور باغات ہیں جو شہر کی
بصورتی میں اضافہ کرتے ہیں اور جہاں اُن ممتاز مدراسی
لوں کے مجسمے نصب ہیں جنہوں نے انگریزوں کے زمانے
یں شہر میں کوئی نمایاں کام انجام دیا۔ مدراس میں منادر
ی بہت ہیں جن میں ٹریلیکن کا پارتھا سارتھی مندر، میلاپور
کپلیشور مندر اور ترودوتیار کے قریب کا قدیم شیو مندر
اص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ منادر ایک طرف تو مذہبی اہمیت
ے حامل ہیں اور دوسری طرف قدیم ہند وطرزِ تعمیر کا بھی اچھا
مونہ ہیں گرجوں اور منادر کے بعد مدراس میں مساجد بھی دیکھنے
ملتی ہیں۔ ہندوؤں کے بعد مدراس میں قابلِ لحاظ آبادی مسلمانوں ہی کی ہے۔ ان
کے بعد کرسچنوں کا نمبر آتا ہے۔ اس طرح یہ شہر تین فرقوں اور تین تمدنوں کا
سنگم ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کا عام پیشہ تجارت ہے اور تجارت میں بھی
چمڑے اور بیڑی کی صنعت سے یہ لوگ زیادہ تعداد میں وابستہ ہیں۔

مدراس ایک ساحلی شہر ہے اور یہاں کا ساحل بے حد وسیع اور خوبصورت
ہے۔ شہر میں یوں تو کئی تفریحی مقامات ہیں مگر ہر روز شام میں یہاں ساحل میرینا
پر مقامی اور بیرونی باشندوں کا ایک جمگھٹا رہتا ہے۔ مدراس کا یہ ساحل آٹھ
میل لمبا ہے اور اسے دُنیا کا دوسرا سب سے بڑا اور اچھا ساحل ہونے کا فخر
حاصل ہے۔ دُنیا کا سب سے اچھا اور وسیع ساحل کیلی فورنیا (امریکہ) کا ہے۔
ہندوستان میں اور بھی بہت سے ساحلی شہر ہیں مگر ان میں کسی کا بھی ساحل
اتنا اچھا نہیں ہے۔ ساحل میرینا سے قریب جو عمارات واقع ہیں اُن میں نیشنل آرٹ
گیلری، ہائی کورٹ اور میوزیم کی عمارت شامل ہیں۔

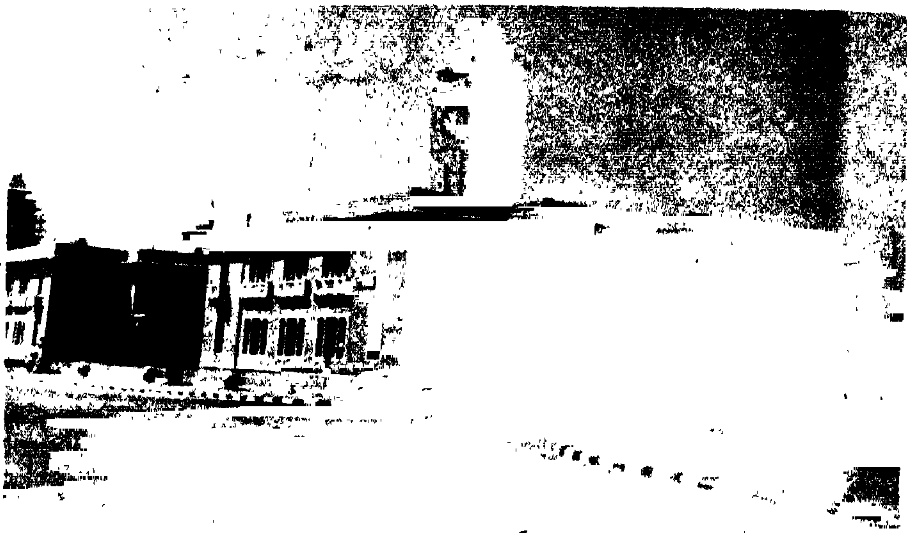
ساحل میرینا سے شہر کی طرف آئیے تو سمندر کے کنارے کنارے بہت
خوبصورت عمارتوں کی ایک قطار لگی ہوئی ہے جن میں نئی طرز کی عمارتیں بھی ہیں اور
قدیم طرز کی بھی۔ سب سے پہلے وار میموریل ملتا ہے۔ یہ اُن ہندوستانی سپاہیوں کی
یاد میں بنوایا گیا ہے جو دوسری جنگ عظیم میں کام آئے تھے۔ پھر مدراس یونی ورسٹی
کی عمارات ہیں جن میں کچھ قدیم ہیں اور کچھ جدید۔ مدراس یونی ورسٹی
ہندوستان میں قائم شدہ قدیم ترین یونی ورسٹیوں میں سے ہے
اُسے قائم ہوئے ایک سو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے۔
انگریزوں کے زمانے میں بھی یہ یونی ورسٹی اپنے اونچے معیار اور اعلیٰ
انگریزی دانی کی وجہ سے ممتاز سمجھی جاتی تھی اور آج بھی اس کا یہی
حال ہے۔ مدراس یونی ورسٹی کی بلڈنگیں ختم ہوتے ہی ہماری نظریں
ایک عظیم الشان محل پر پڑتی ہیں۔ یہ کسی زمانے میں کرناٹک کے
نوابوں کا محل تھا جسے چیپاک محل کہا جاتا ہے اور جہاں آج کل سرکاری
دفاتر قائم ہیں۔ اس سے متصل پریذیڈنسی کالج قائم ہے جو سولہویں
صدی عیسوی میں اطالوی طرز پر بنایا گیا تھا۔ پریذیڈنسی کالج کے



ہائی کورٹ مدراس

مرکزی مقام بھی یہی ہے۔ سنٹرل ہی کے علاقہ میں مور مارکیٹ بھی ہے جو شہر کا بڑا خوبصورت اور سستا مارکیٹ ہے۔ یہاں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ مور مارکیٹ سے متصل ہی میونسپل کارپوریشن کی خوبصورت عمارت ہے اور اس سے ذرا آگے زولوجی چڑیا گھر ہے۔ سنٹرل ہی میں مسلمانوں کی صدیق سرائے ہے جہاں کوئی بھی مسلمان سیاح تین دن تک بالکل برائے نام کرائے پر قیام کر سکتا ہے۔

سینٹرل کے قریب ہی فورٹ سینٹ جارج ہے، جہاں آج کل سیکریٹریٹ کے دفاتر، مجلس مقننہ اور اس کا دفتر اور بعض دوسرے دفاتر ہیں۔ فورٹ سینٹ جارج



یونی ورسٹی کی عمارت

کی بڑی تاریخی اہمیت ہے اور اپنے ابتدائی زمانے میں یہ انگریزوں کی زبردست پناہ گاہ تھا۔ پیری روڈ ماؤنٹ روڈ کے بعد مدراس کی دوسری خوبصورت سڑک ہے۔ گنڈی میں راج بھون کی وسیع و عریض عمارت ہے جہاں ایک خوبصورت پارک بھی ہے اس کے قریب ہی بچوں کی تفریح گاہ ہے جو چلڈرنس کارنر (گوشۂ



مدراس کا سنٹرل اسٹیشن

مقابل سوئمنگ پول ہے جو تمام عصری اور جدید ضروریات سے آراستہ ہے اور جہاں لڑکوں کو پیراکی سکھائی جاتی ہے۔

اڈیار جنوبی سمت میں شہر کا آخری کونہ ہے۔ یہ مقام بھی مدراس میں بہت سی چیزوں کے لئے مشہور رہے۔ یہ بڑا پُرفضا اور کشادہ مقام ہے یہیں ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اس کے علاوہ مشہور انگریز خاتون مسز اینی بسنٹ کی آخری قیام گاہ بھی یہیں ہے جنہوں نے انڈین نیشنل کانگرس میں رہ کر ہندوستان کی آزادی کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ تھیاسوفیکل سوسائٹی کا صدر دفتر بھی یہیں ہے۔ جس کی شاخیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں ایک بڑا مشرقی کتب خانہ بھی ہے۔ کلاکشیترا کے نام سے اڈیار میں بھارت ناٹیم رقص کا ایک ادارہ بھی قائم ہے جہاں اس عظیم کلاسیکی رقص کی تعلیم دی جاتی ہے۔

شہر کی سب سے خوبصورت اور پُرفضا شاہراہ ماؤنٹ روڈ ہے جو سات میل لمبی ہے۔ اور قلب شہر میں واقع ہے۔ اس کے دونوں جانب بڑی بڑی دکانیں، ہوٹل، سینما گھر اور اسٹوڈیو وغیرہ ہیں۔ لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کی بارہ منزلہ عمارت بھی اس روڈ پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ جیمنی فلم اسٹوڈیو بھی اس سڑک پر ہے مگر مدراس کی اصل بہار دیکھنی ہو تو وہ آپ کو سنٹرل کے علاقے میں نظر آئے گی۔ سنٹرل کا علاقہ بے حد معروف اور چہل پہل کا علاقہ ہے۔ یہاں مدراس کا خوبصورت اور عظیم الشان ریلوے اسٹیشن ہے جنوبی ریلوے کے دفاتر کی خوبصورت عمارت بھی یہیں ہے۔ اس کے علاوہ بسوں کا

اطفال) کہلاتی ہے۔

ہندوستان کا ایک بڑا اور ایک حد تک تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہونے کے علاوہ مدراس جدید ہندوستان کا ایک اہم صنعتی مرکز بھی ہے۔ یہاں ریلوے کا ایک زبردست ورکشاپ ہے جہاں انڈین ریلویز کا ہر قسم کا سامان بنتا ہے۔ یہاں سائیکلیں تیار کرنے کے کارخانے بھی ہیں اس کے علاوہ یہاں موٹروں کے ٹائر اور ٹیوب بھی بنتے ہیں۔ یہاں فولاد کی نلکیاں اور دوسرا سامان بھی تیار ہوتا ہے۔ یہاں کپڑے کی صنعت بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ شکل میں ہے اور کپڑے کے متعدد چھوٹے بڑے کارخانے یہاں موجود ہیں جن کا کپڑا یہیں تیار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مدراس کی لنگیاں اور دھوتیاں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ مدراس میں فلمی صنعت بھی کافی ترقی یافتہ ہے۔ سارے ہندوستان میں بمبئی کے بعد یہ فلموں کا دوسرا بڑا مرکز ہے۔ یہاں بڑے بڑے فلم اسٹوڈیو قائم ہیں اور ہزاروں آدمی اس صنعت سے وابستہ ہیں۔ مدراس میں تامل کے علاوہ تلگو، کنڑی، ملیالی اور ہندی کے فلم بھی بنتے ہیں۔ ان بڑی اور اہم صنعتوں کے علاوہ مدراس میں چھوٹے پیمانے کی بہت سی صنعتیں قائم ہیں جن میں چمڑے اور بیڑی کی صنعتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

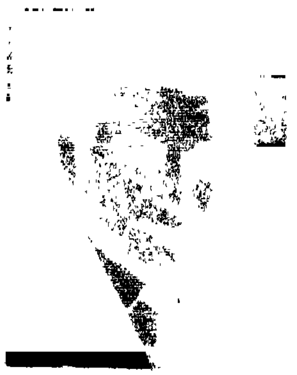
تامل مدراس میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور اکثریت کی مادری زبان بھی یہی ہے۔ تامل کے بعد مدراس میں بولی جانے والی دوسری قابلِ ذکر زبان انگریزی ہے۔ ہندوستان کے شاید ہی کسی شہر میں انگریزی کا اتنا چلن ہوگا۔ جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے، بہ ظاہر اس شہر میں اس کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ گو وہاں سڑکوں پر آپ کو کوئی اُردو بولتا نظر نہیں آئے گا مگر طبقہ خواص میں اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ بعض مسلمانوں کے علاوہ پنجابی، سندھی اور گجراتی جو تجارت کی غرض سے قابلِ لحاظ تعداد میں یہاں مقیم ہیں، اُردو ہی بولتے ہیں اور اُردو کے شیدائی ہیں۔ پنجابیوں نے تو یہاں اُردو کی ایک انجمن "پنجاب ایسوسی ایشن" بھی قائم کر رکھی ہے۔

دیکھا جائے تو مدراس سے اُردو کا ناتا بہت پرانا ہے۔ آج سے ۲۵، ۳۰ سال قبل "مدراس میں اُردو" لکھ کر نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے سابق ریاست مدراس میں اُردو کا جائزہ لیا تھا اور وہاں کے شعراء، ادباء اور اہلِ علم و ادب کا تذکرہ قلمبند کیا تھا۔ آج بھی مدراس میں شعراء، ادبا اور اہلِ علم کی کمی نہیں، بلکہ کوئی تیار کرنے بیٹھے تو ایک اچھا خاصہ تذکرہ مرتب ہو سکتا ہے۔

مدراس میں اُردو کی بہت سی انجمنیں، ادارے، اسکول اور کالج ہیں۔ وہاں کی اُردو انجمنوں میں اے۔ جے۔ اُردو سمینار، دارالتصنیف، پنجاب ایسوسی ایشن، کرسنٹ ایسوسی ایشن، بلومنگ لٹریری سوسائٹی، مجلس مصنفین اور اُردو ایسوسی ایشن شامل ہیں۔ اے۔ جے اُردو سمینار کے زیر اہتمام مدراس شہر میں ہر سال ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ منعقد ہوتا ہے جس میں سارے ہندوستان سے چوٹی کے شعراء کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس مشاعرہ میں ہزاروں کی تعداد میں ٹکٹ خرید کر اہلِ مدراس اپنی اُردو دلچسپی کا عملی ثبوت دیتے ہیں۔ اس مشاعرہ کا ساوونیر بھی شائع ہوتا ہے جس میں مشاعرہ کی تفصیلی روئیداد، شاعروں کے حالات زندگی اور تصاویر اور اس میں پڑھا گیا کلام شامل ہوتا ہے۔ اُردو سمینار کے زیر اہتمام ایک اُردو لائبریری بھی ہے جو مدراس کی ایک عظیم الشان لائبریری ہے اور جہاں قدیم و جدید دور سے تعلق رکھنے والی ہر صنف سے متعلق کتابیں موجود ہیں۔ ایک عربی اُردو مدرسہ اور ایک رات کا مدرسہ بھی اس ادارے کے زیر انتظام چلایا جاتا ہے۔

پنجاب ایسوسی ایشن، کرسنٹ ایسوسی ایشن، بلومنگ لٹریری سوسائٹی، مجلس مصنفین اور اُردو ایسوسی ایشن وقتاً فوقتاً ادبی اور شعری نشستیں منعقد کرتی رہتی ہیں۔ مدراس میں اعلیٰ اُردو تعلیم کا سب سے بڑا مرکز نیو کالج ہے جو ساؤتھ انڈیا مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر نگرانی قائم ہے جس کے پرنسپل ہندوستان کے مشہور عالم مولانا عبدالوہاب بخاری ہیں اور جہاں اُردو پڑھنے والے طلباء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دیگر کالجوں میں گورنمنٹ آرٹس کالج اور پریذیڈنسی کالج میں اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ اُردو کی طالبات کے لئے ایس۔ آئی۔ اے۔ ای۔ ٹی کالج اور کوئین میری کالج میں اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ ان کالجوں کے علاوہ کئی ہائی اسکول اور پرائمری اسکول ہیں جہاں اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ مدراس سے ایک اُردو اخبار "مسلمان" بھی شائع ہوتا ہے جو پچھلے تیس سال سے جاری ہے اس کے علاوہ تین ہفتہ وار "نصرت"، "آزاد نوجوان"، اور "سرکار" بھی شائع ہوتے ہیں۔ کئی ماہ نامے بھی نکلے اور بند ہوئے۔ فی الحال کوئی ماہ نامہ شائع نہیں ہوتا۔ بہرحال اُردو کے تعلق سے مدراس بھی ہندوستان کے دیگر شہروں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

مدراس بڑا خاموش، پرسکون اور خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کی عمارتوں میں ہندو، مسلم اور عیسائی تینوں قسم کا طرزِ تعمیر ملتا ہے اور تینوں مذاہب اور عقائد کے لوگ بھی یہاں بڑے پیار و محبت کے ساتھ رہتے ہیں۔



غزل مثلث

نظیر حسین نظیر مظفر نگری

(۱)

خانۂ دل خراب ہوجائے ÷ زندگی اک عذاب ہوجائے
شوق اگر کامیاب ہوجائے

(۲)

اس تلاطم میں اس تباہی میں ÷ کہیں ایسا نہ ہو اس آندھی میں
زندگی بے نقاب ہوجائے

(۳)

لطف باقی رہے، مزہ محفوظ ÷ رکھے اُس وقت سے خدا محفوظ
جب محبت عذاب ہوجائے

(۴)

آگ لگ جائے آشیانے میں ÷ اور اب کیا ہے اس زمانے میں
جب حقیقت سراب ہوجائے

(۵)

پاس آنا اگر نہیں منظور ÷ مسکرانا اگر نہیں منظور
اک نگاہِ عتاب ہوجائے

(۶)

اس خرابات میں، معاذ اللہ ÷ نہ کریں ہم جو گاہ گاہ گناہ
زندگی اک عذاب ہوجائے

(۷)

دوستوں کی "نوازشوں" کا نظیر ÷ حال کچھ بھی اگر کروں تحریر
ہر ورق اک کتاب ہوجائے



غزل

کرامت علی کرامت

ہم اہلِ درد جو جینے کا اہتمام کریں
رسومِ عشق کو اک روز کیوں نہ عام کریں؟

تری جبیں پہ تقدس کی وہ تجلی ہے
مہ و نجوم بھی جھک کر جسے سلام کریں

غمِ حیات نے بھی اپنا ساتھ چھوڑ دیا
چلے بھی آؤ کہ جینے کا اہتمام کریں

جبینِ شوق پہ چمکے گا درد کا سورج
نمازِ عشق میں پہلے تو ہم قیام کریں

نظر پہ چھا گئی آفاقیت تو دل نے کہا
عقیدہ جو بھی ہو ہم اس کا احترام کریں

مذاقِ فطرتِ مضطر کا یہ تقاضہ ہے
زمیں پہ صبح کریں اور خلا میں شام کریں

فضائے ذہن میں اُڑتے ہیں فکر کے پنچھی
اب آؤ اُن کو ذکاوت سے زیرِ دام کریں

جسے سمجھتے تھے شاداب وہ تو بنجر ہے
اب اور کس لئے جشنِ مہ تمام کریں

یہ کہہ رہا ہے کرامت ہمارا جذبِ نہاں
خود اپنا قصۂ غم کیوں نہ ہم تمام کریں

دُنیا کی مشہور پیش گوئیاں



سیوک شرما

نومبر ۱۹۶۲ء کی پہلی تاریخ تھی۔ واشنگٹن کے ایک فیشن ایبل ریستوران میں دو خواتین دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف تھیں ان میں سے ایک تھی واشنگٹن کی مشہور امیرزادی مسز ہارے کوپ اور دوسری تھی اس کی سہیلی مسز ڈکسن۔ اچانک مسز ڈکسن بے چین ہوگئی اور اس کے چہرے پر رنج و دہشت کے بادل چھا گئے اس نے چیخ کر کہا "اُسے گولی سے اُڑا دیا جائے گا" "کِس کو" مسز ہارے کوپ نے گھبرا کر پوچھا "صدر کو" مسز ڈکسن نے جواب میں کہا۔

تین ہفتے بعد صدر جان ایف کینیڈی جب امریکہ کی ریاست ٹیکساس کے شہر ڈلاس کی ایک سڑک پر موٹروں کے ایک جلوس کے ہمراہ گزر رہے تھے تو اُنہیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

یہ پیشین گوئی کرنے والی مسز جین ڈکسن ایک شرمیلی اور خانہ دار خاتون ہیں۔ وہ کوئی پیشہ ور منجم یا جیوتشی نہیں ہے۔ مستقبل کے حالات بتانا اس کا ایک شغل ہے۔ اتفاقیہ اس لئے کہ نہ تو اُس نے اس شغل کو سوچ سمجھ کر اپنایا ہے اور نہ ہی اس پر اس کا کوئی بس ہے۔ قدرت نے اس خاتون کو کچھ ایسی عجیب و غریب صلاحیت دی ہے کہ دُنیا بھر میں رُونما ہونے والے اہم واقعات کی تصویر اس کے ذہن میں از خود اور خواہ مخواہ کھنچ جاتی ہے جسے وہ بیان کر دیتی ہے۔ علم نجوم یا پامسٹری سے جین ڈکسن کا کوئی تعلق نہیں۔ ابھی وہ بقیدِ حیات ہیں۔ اُن کی ہزاروں پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہو چکی ہیں۔

ابھی وہ کمسن بچی تھی کہ ایک خانہ بدوش عورت نے جین ڈکسن کا ہاتھ دیکھ کر اس کی ماں کو بتایا تھا کہ اس لڑکی میں پیش گوئی کرنے کا قدرتی ملکہ ہے۔

ابھی وہ نو برس کی تھی کہ لوگ اُس سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھنے لگ گئے تھے۔ ہالی وُوڈ کی مشہور فلم سٹار میری ڈریسلر کو اس کی بے روزگاری کے زمانے میں جین نے بتایا تھا کہ وہ ایک مشہور فلم اسٹار بنے گی۔

ہندوستان کے بٹوارے کے بارے میں جین ڈکسن نے کافی عرصہ پہلے ہی بتا دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر امریکہ کی وزارت خارجہ کی طرف سے منعقد کی گئی ایک تقریب میں جین ڈکسن بھی شامل تھی معزز مہمانوں کا آپس میں تعارف کرانے کی رسم کے دوران اس کا تعارف ہندوستان کے ایک اعلیٰ افسر سے کرایا گیا اس افسر کے ساتھ مصافحہ کرتے ہی جین ڈکسن کہنے لگی "آپ کے ملک کا بٹوارہ ہونے والا ہے"۔ چونکہ اُن دنوں اس قسم کے کوئی بھی آثار نہیں تھے اس لئے افسر مذکور نے مسز ڈکسن کی اس

بات پر شبہ اور تعجب کا اظہار کیا۔ اس پر مسز ڈکسن نے مزید کہا "آپ کے ملک کا بٹوارہ ہوگا اور آپ اس بٹوارے کے بعد تقسیم شدہ دوسرے حصّے (پاکستان) میں نقلِ وطن کر جائیں گے اور وہاں جاکر بہت بڑے عہدے پر فائز ہوں گے۔"

مہاتما گاندھی کی شہادت سے متعلق بھی جین ڈکسن نے اسی طرح حیران کُن انداز میں پیش گوئی کی تھی۔ ۱۹۴۸ء کا آغاز ہوا ہی تھا۔ سالِ نو کے جشن کی ایک اعلیٰ سطح کی پارٹی میں جین ڈکسن بھی موجود تھی (اُسے اعلیٰ سے اعلیٰ پارٹیوں میں شمولیت کی دعوت دی جاتی ہے) کھانے پینے اور ناچ گانے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کسی سلسلے میں کسی شخص نے باتوں باتوں میں ہندوستان کا ذکر کر دیا۔ ہندوستان کا نام سنتے ہی جین ڈکسن پکار اٹھی "ہندوستان! وہاں کا گاندھی تھوڑے دنوں تک ہلاک کر دیا جائے گا۔"

یہاں یہ بتانا ضروری ہوگا کہ ہندوستان کے بارے میں اس قدر اہم اور معرکہ آرا گوئیاں کسی غیر معروف شخص کو کانا پھوسی کے طور پر نہیں بتائی گئی تھیں۔ یہ دونوں پیش گوئیاں امریکہ کے وزارتی سطح کے اعلیٰ ترین حکام کی موجودگی میں کی گئی تھیں اور ان کا تذکرہ نہ صرف امریکہ کے مقامی اخباروں میں بلکہ ریڈرز ڈائجسٹ جیسے عالمی شہرت کے امریکی رسالوں میں بھی چھپ چکا ہے۔ ریڈرز ڈائجسٹ کے ۱۹۶۴ء کے ستمبر کے شمارے میں ان تمام واقعات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

کئی واقعات کا علم تو جین ڈکسن کو برسوں پہلے ہو جاتا ہے۔ مثلاً صدر کینیڈی کی موت کے بارے میں اُسے پہلی بار علم ۱۹۵۲ء میں ہوا تھا۔ کینیڈی کے کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے سے بھی آٹھ برس پہلے۔ یہ ایک الہام کی صورت میں تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جین ڈکسن کے ذہن میں امریکہ کے صدارتی چناؤ کی وہ تاریخ آئی جس میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار کو کامیاب ہونا تھا۔ ساتھ اُسے یہ بھی دکھائی دیا کہ ڈیموکریٹک پارٹی کا یہ کامیاب اُمیدوار اپنے عہدے کی مدّت ختم ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی جان ایف کینیڈی کی (جو اُن دنوں سینیٹر تھے) شکل و صورت کے واضح خدوخال بھی ڈکسن کے سامنے نمودار ہو گئے۔

اس بات کا ذکر جین ڈکسن نے ایک جرنلسٹ سے کیا جو امریکہ کے ایک رسالے 'PRAADE' کے لئے اس سے انٹرویو لینے آیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں پریڈ رسالے کے ماہ مئی کے شمارے میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا: "۱۹۶۰ء کے چناؤ کے بارے میں مسز ڈکسن نے پیش گوئی کی ہے کہ صدر کے عہدے کے لئے ڈیموکریٹک پارٹی کا امیدوار کامیاب ہوگا لیکن اپنے عہدے کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی اُسے قتل کر دیا جائے گا۔"

پریڈ میں اس خبر کی اشاعت کے علاوہ ڈکسن نے اس پیشین گوئی کا ذکر امریکہ کے کئی مشہور و معروف اشخاص سے کیا۔ مثال کے طور پر رفاہِ عام کے کاموں کے لئے مشہور امریکی کروڑپتی سیمویل ہال کے خاندان کے کینیڈی خاندان کے ساتھ نہایت قریبی تعلقات تھے۔ سیمویل ہال کی بیوی مس کے ہال، جین ڈکسن کے مداحوں میں سے تھی اور جین ڈکسن سے اس کی ملاقات اکثر ہوتی رہتی تھی۔ ڈکسن نے بارہا مس کے ہال سے درخواست کی کہ وہ صدر کینیڈی کو پیش آنے والے اس المناک حادثے سے متعلق آگاہ کر دے۔ صدر کینیڈی کی ہلاکت کے بعد مس ہال نے بتایا کہ وہ صدر کینیڈی کے ساتھ جین ڈکسن کی پیش گوئی کا ذکر اس لئے نہ کر سکی مبادا کینیڈی جیسا نڈر اور بے خوف انسان اسے توہم پرستی بتاتے ہوئے میری ضعیف الاعتقادی کا مذاق اُڑائے۔

جمعہ کے دن، جس روز کینیڈی کی موت واقع ہوئی، جین ڈکسن نے صبح کے ناشتے کے وقت کہا تھا "آہ! یہی وہ دن ہے جس دن یہ حادثہ پیش آنے والا ہے۔"

امریکہ کے مرحوم صدر فرینکلن روزویلٹ، جین ڈکسن کی خداداد قابلیت کے بہت قائل تھے اور وہ اکثر اُس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آخری بار انہوں نے نومبر ۱۹۴۴ء میں جین ڈکسن کو وائٹ ہاؤس میں کھانے کی دعوت پر بُلایا۔ صدر روزویلٹ نے مسز ڈکسن سے سوال کیا کہ ابھی اور کتنے عرصہ تک وہ جئیں گے۔ "زیادہ سے زیادہ چھ ماہ" ڈکسن نے جواب میں کہا۔

پانچ ماہ بعد ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو صدر روزویلٹ کا انتقال ہو گیا۔

جین ڈکسن کی پیش گوئیوں کا موضوع محض امریکہ کے صدر ہی نہیں رہے۔ ۱۹۴۵ء میں اس نے سر ونسٹن چرچل کو، جو اُن دنوں امریکہ کا دورہ کر رہے تھے، بتایا کہ وہ برطانیہ میں پارلیمنٹ کے انتخابات جلدی نہ کرائیں ورنہ اُنہیں شکست ہو جائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ چھ برس کے اندر ہی وہ پھر

برسرِ اقتدار آجائیں گے۔ لیکن چرچل کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اس لئے انہوں نے اسی برس ماہ جون میں چناؤ کرائے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے اس ہردل عزیز ہیرو کو جنگ کے ختم ہونے کے صرف دو ماہ بعد انتخابات میں شکست کا سامنا ہوا اور اُسے وزارتِ عظمیٰ سے علیٰحدہ ہونا پڑا۔ لیکن جیسا کہ ڈکسن نے بتایا تھا چھ برس کے اندر ہی وہ پھر برسرِ اقتدار آگئے۔

جین ڈکسن قدرت کا ایک انوکھا اور نرالا شاہکار ہے۔ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مستقبل میں جھانکنے کے لئے اُسے نہ ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ نہ سیارگان کے پیچیدہ زائچے بنا کر حساب کتاب کرنے کی۔ ایک قدرتی جھرنے کی طرح پیش گوئیاں اس میں سے خود بخود پھوٹتی ہیں۔ کسی کے ساتھ مصافحہ کرتے وقت انگلیوں کے چھو جانے سے وہ اس شخص کے ساتھ ہونے والے کسی اہم واقعہ کو بتا دے گی یا اُس کے سامنے کسی شخص یا جگہ کا نام لیا گیا تو وہ اس شخص یا جگہ پر ہونے والے کسی غیر معمولی واقعہ کو ظاہر کر دے گی۔

اور یہ سب کچھ نہایت اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوتا ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ہالی وُوڈ کی مشہور فلم اسٹار کیرول لومبارڈ کے ساتھ جین ڈکسن کی اچانک ملاقات اور حیران کن پیش گوئی ہے۔ ایک بار جین ڈکسن لاس اینجلز میں اپنے بال بنوانے کے لئے ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں گئی۔ باربر نے اس کا تعارف فلم اسٹار کیرول لومبارڈ کے ساتھ کروایا، جو بال بنوانے کے بعد سیلون سے باہر نکلنے کو ہی تھی۔

کیرول لومبارڈ کے ساتھ مصافحہ کرتے ہی جین ڈکسن پکار اٹھی "مس لومبارڈ آیندہ چھ ہفتے تک ہوائی سفر ہرگز نہ کرنا" فلم اسٹار نے جواب میں کہا کہ چند ہی روز میں اُسے فوجیوں کی دلچسپی کے لئے پروگرام میں شرکت کی غرض سے کہیں باہر جانا ہے اور ہوائی جہاز میں اس کی سیٹ بک ہو چکی ہے۔ اُس پر جین ڈکسن نے کہا کہ خدارا وہ اس دورے کو ملتوی کر دے اور ان دنوں اگر وہ کوئی سفر کرنا ہی چاہے تو ریل گاڑی یا موٹر کار سے کرے۔ کیونکہ ہوائی سفر میں اس کی زندگی کو سخت خطرہ ہے۔ کیرول لومبارڈ نے پوچھا "زمینی سفر میں خطرہ کیوں نہیں موت تو کہیں بھی آسکتی ہے۔" جین نے جواب دیا "تمہارے سر پر منڈلانے والے موت کے بادل فی الحال زمین سے بہت اونچائی پر ہیں"۔ لومبارڈ نے ایک سکّہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "چلو ٹاس کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر یہ سکّہ سیدھے رُخ پڑا تو میں ہوائی جہاز سے سفر کا پروگرام ملتوی کر دوں گی، اُلٹے رُخ پر برقرار رکھوں گی"، سکّہ الٹے رُخ پڑا۔ لومبارڈ ہنستے ہوئے یہ کہہ کر چلدی "جو ہونا ہے سو ہو کر رہے گا۔ خدا حافظ مسز ڈکسن میرے لئے دعا کرنا۔"

کچھ ہی دن بعد اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ جس ہوائی جہاز میں فلم اسٹار کیرول لومبارڈ سوار تھی وہ گر کر تباہ ہو گیا ہے اور اس جہاز کا کوئی بھی مسافر زندہ نہ بچ سکا۔

۱۹۶۱ء کے موسم گرما میں جین ڈکسن نے پیش گوئی کی تھی کہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل ڈاگ ہیمرشولڈ اسی سال ستمبر کے وسط میں ہوائی حادثے میں ہلاک ہو جائیں گے۔

ڈاگ ہیمرشولڈ کو اٹھارہ ستمبر ۱۹۶۱ء کو ہوائی حادثہ پیش آیا تھا۔ جس میں وہ ہلاک ہو گئے تھے۔

اسی طرح اکتوبر ۱۹۶۱ء میں جین ڈکسن نے ایک اور سانحہ کے بارے میں پیش گوئی کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ کہ ہالی ووڈ کی شہرہ آفاق فلم سٹار میریلین منرو اگلے سال کے اندر اندر خودکشی کرے گی۔ اس پیش گوئی کے ٹھیک نو مہینے بعد دُنیا کی اس چہیتی فلم ایکٹریس نے زیادہ تعداد میں نیند آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی تھی۔

ظاہر ہے کہ موجودہ ایٹمی دور میں لوگ جین ڈکسن کی مافوق الفطرت صلاحیت کے سامنے جلدی سے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے ہوں گے، اس لئے مسز ڈکسن کی اس عجیب و غریب صلاحیت کو ہر ممکن طریقے سے آزمائش کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک بار ایک موٹر کار کی لاٹری نکالی جانی تھی۔ کچھ ہوشیار لوگوں نے سوچا کہ مسز ڈکسن کی آزمائش کا نہایت اچھا موقع ہے۔ لہٰذا انہوں نے مسز ڈکسن سے کہا کہ وہ لاٹری نکلنے سے پہلے اس نمبر کو لکھ دے جو لاٹری میں نکلنے والی پرچی کا ہوگا۔ اس لاٹری میں کل چودہ ہزار ٹکٹیں تھیں۔ یعنی جین ڈکسن کی کامیابی کا امکان چودہ ہزار کے مقابلے میں صرف ایک تھا۔ جین ڈکسن نے صحیح نمبر لکھ دیا۔

ہالی ووڈ کے مشہور فلم ایکٹر باب ہوپ نے ایک نرالے طریقے

سے جین کا امتحان لیا۔ باب ہوپ اور جین ڈکسن دونوں ٹیلی وژن کے ایک پروگرام میں حصہ لے رہے تھے۔ اچانک باب ہوپ نے مسز ڈکسن سے کہا "دو یقینا" آپ یہ نہیں بتا سکتیں کہ آج تیسرے پہر گاف کے کھیل کے دوران میں نے کتنے سکور بنائے، اور میرے ساتھی نے (جس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔) کتنے سکور بنائے۔"

بلا تامل مسز ڈکسن نے جواب دیا۔ "تم نے بانوے اور تمہارے ساتھی صدر آئزن ہاور نے چھیانوے۔"

باب ہوپ یہ بالکل صحیح جواب سُن کر ششدر رہ گیا۔ باب ہوپ اور صدر آئزن ہاور کے علاوہ اور کسی بھی شخص کو اس روز کے کھیل اور اس میں کئے گئے سکور کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔

امریکی مصنف مس روتھ مانٹ گمری نے اپنی کتاب دی کرسٹل بال میں جین ڈکسن کی سوانح حیات نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ لندن سے حال ہی میں شائع ہوئی ایک کتاب

The Story of Fulfilled Prophecy

میں جسٹس گلاس نے جین ڈکسن کی ہوش ربا پیش گوئیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

جین ڈکسن اپنی نوعیت کی پہلی یا واحد شخصیت نہیں ہے۔ تاریخ کے تقریباً ہر دور میں قدرت نے ایسی باکمال شخصیتوں کو پیدا کیا ہے۔ علم الغیب میں دسترس رکھنے والے گمنام یا مقامی طور پر معروف تو سینکڑوں ہزاروں ہوئے ہوں گے اور اب بھی ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوئے ہیں جنہیں عالمی اور دائمی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ایسے نامور غیب دانوں میں سرِ فہرست سولہویں صدی میں فرانس کے منجم مائیکل ناسٹراڈیمس ہیں جن کی پیش گوئیوں سے دنیا حیران رہ گئی۔

مائیکل ناسٹراڈیمس نے واقعات کے رُونما ہونے سے مہینوں یا برسوں نہیں بلکہ صدیوں پہلے مستقبل کے بارے میں جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ آج تک حرف بحرف سچی ثابت ہوئی ہیں۔ انقلاب فرانس سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے ناسٹراڈیمس نے تاریخ کے اس اہم ترین واقعہ کے رُونما ہونے کی تاریخ بتا دی تھی۔

ناسٹراڈیمس کی پیدائش چودہ دسمبر ۱۵۰۳ء میں ہوئی اور وفات تین جولائی ۱۵۶۶ء میں اُن کی حیات میں انگلستان کا شمار صفِ اول کی طاقتوں کی کسی گنتی میں نہیں تھا۔ وہ زمانہ فرانس اور اسپین کے عروج کا تھا۔ لیکن ناسٹراڈیمس نے پیش گوئی کی تھی کہ انگلینڈ دُنیا کی عظیم ترین اور وسیع ترین سلطنت کا مالک ہوگا اور تین صدیوں سے بھی زیادہ عرصے تک اقوام عالم میں انگلستان سرِ فہرست رہے گا۔ اور یہ پیش گوئی ایک تاریخی حقیقت ہے۔

اسی طرح ناسٹراڈیمس نے اپنے وقت سے صدیوں بعد ہونے والے واقعات میں نپولین اور ہٹلر کے عروج اور زوال کے بارے میں بھی پیش گوئیاں کی تھیں۔ ناسٹراڈیمس نے بیسویں صدی کے آخری سال سے متعلق بھی ایک پیش گوئی کی ہوئی ہے، جس کے علم سے ہمارے سکون میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ ناسٹراڈیمس نے نپولین اور ہٹلر کو انسان دشمن بتایا تھا لیکن اسی قسم کا ایک تیسرا شخص جولائی ۱۹۹۹ء میں برسرِ اقتدار آئے گا جسے ناسٹراڈیمس نے دہشت اور خوف کے شہنشاہ، کا نام دیا ہے۔ اس خونخوار شیطان کے اُبھرنے کے بعد جولائی ۱۹۹۹ء سے لے کر ستائیس برس تک انسانی لاشوں کے انبار لگیں گے۔ اور لفظی و حقیقی معنوں میں خون کی ندیاں بہیں گی۔ روئے زمین پر جہنم کے نظارے دیکھنے میں آئیں گے۔ ناسٹراڈیمس نے مزید لکھا ہے کہ اس دوران پہلی نسل کی ایک قوم اینٹ سے اینٹ بجائے گی۔

(باقی آئندہ)

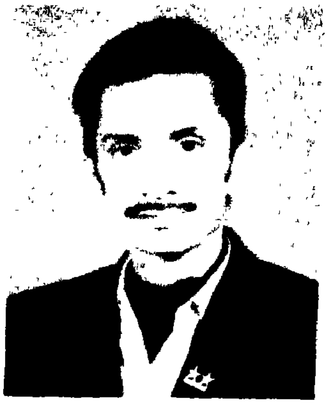
بقیہ ہندوستان کے جنگلی جانور

کو ہر سال تقریباً ۱۰۰ جانوروں کا شکار کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں ۲۰ فی صد مویشی شیر کی غذا بنتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بھوک کی شدت سے مجبور ہو کر شیر طبعی موت مرے ہوئے جانور بھی کھا لیتا ہے۔

شیر ایک رات میں ۱۵، ۲۰ میل کے علاقہ کا گشت کرتا ہے۔ اس کی رفتار ۱۲، ۱۴ میل فی گھنٹہ سے زائد نہیں ہوتی۔ شیر جنگلی بھینسے اور جنگلی کتّوں کے غول سے خائف ہوتا ہے اور حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ آدم خور شیر بہت خطرناک ہوتا ہے۔

افریقہ میں شیر ببر اور شیر کی مخلوط نسل بھی پائی جاتی ہے جسے ٹائگن (Tigon) کا نام دیا گیا ہے۔

حکومتِ ہند نے جنگلی جانوروں، درندوں اور پرندوں کی بقائے نسل اور افزائش نسل کی غرض سے ۳۰ نیشنل پارک، ۱۲۲ سینکچوریاں اور ۱۲ زولوجیکل گارڈن قائم کئے ہیں، جن کا مجموعی رقبہ ۱۵۲۷۵ مربع کلومیٹر ہے۔



ہندوستان کے جنگلی جانور

متین سید

کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں، ہر ایک گھنٹے میں ۳۵ ہزار جنگلی جانور شکار کئے جاتے ہیں شکار، انسان کا قدیم ترین مشغلہ ہے۔ زمانۂ قدیم میں انسان نے اپنی اشتہا مٹانے اور غذا حاصل کرنے کی غرض سے جنگلی جانوروں کا شکار کیا تھا۔ مہذب دور میں شکار بہترین تفریحی شغل تصور کیا جانے لگا۔

افریقہ کے علاوہ، دنیا میں ہندوستان جنگلی جانوروں کا عظیم ترین مسکن ہے اور سیاحوں اور شکاریوں کی جنت کہلاتا ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ۵ ہزار قسم کے جنگلی پرندے اور ۴۰۰ اقسام کے جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ ہر سال دنیا کے ہر حصے سے ہزاروں سیاح اور شکاری جنگلی جانوروں اور پرندوں کا شکار کرنے، تصویر کشی، یا ان کے قدرتی ماحول میں ان کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے ہندوستان آتے ہیں۔ سیاحت اور شکار ہمارے ملک کے لئے زرِمبادلہ حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

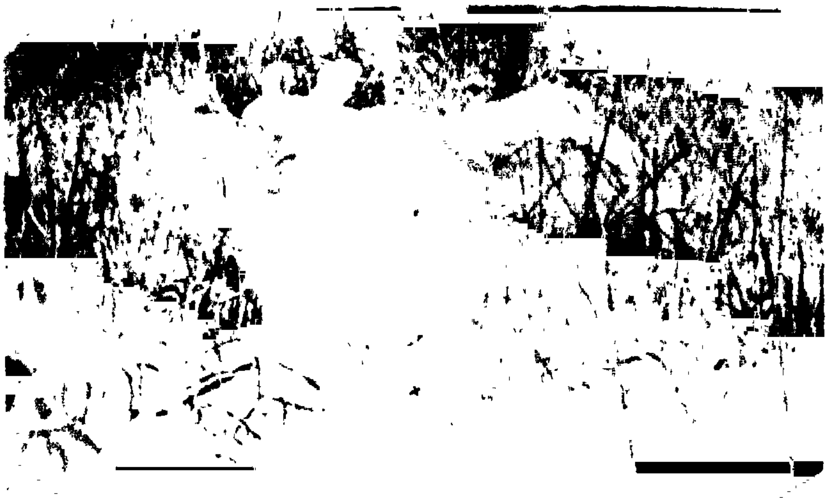
شمالی ہندوستان اور ہمالیہ کی ترائی میں کئی قسم کی جنگلی بکریاں (تھار، بارہ وغیرہ) شیر، تیندوے اور بھورے ریچھ، سانبھر، کاکر، نیل گائے اور چیتل پائے جاتے ہیں۔ وسطی ہندوستان میں شیر، تیندوے، ریچھ، سانبھر چیتل، نیل، ہرن، چوسنگھا، مارخور، زرنخ وغیرہ ملتے ہیں اور جنوبی ہندوستان میں جنگلی ہاتھی، جنگلی بھینسہ، بارہ سنگھا، ایک سینگ والا گینڈا، ریچھ مگرمچھ، سانبھر ہرن، جنگلی کتے وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں بے شمار پرند بکثرت پائے جاتے ہیں شکار کئے جانے والے اہم پرند، تیتر، بٹیر، فاختہ، بطخ، قاز، سارس جنگلی مرغ جنگلی کبوتر، پن ڈبی، ٹیکلا وغیرہ ہیں۔

ایک سینگ والا گینڈا اور کالا ہرن، ہندوستان کے علاوہ کہیں نہیں پائے جاتے۔ شیر ببر افریقہ کے علاوہ صرف ہندوستان میں گیر کے



ہاتھی



گینڈا

جنگلات) میں پایا جاتا ہے۔طاؤس ہندوستان کا قومی پرندہ ہے اس لئے اس کا شکار کرنا قانوناً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کالا ہرن اور گینڈا بھی اسی ضمن میں آتے ہیں اور اُن کی نسل برقرار رکھنے کی غرض سے اُن کے شکار پر بھی پابندی ہے۔

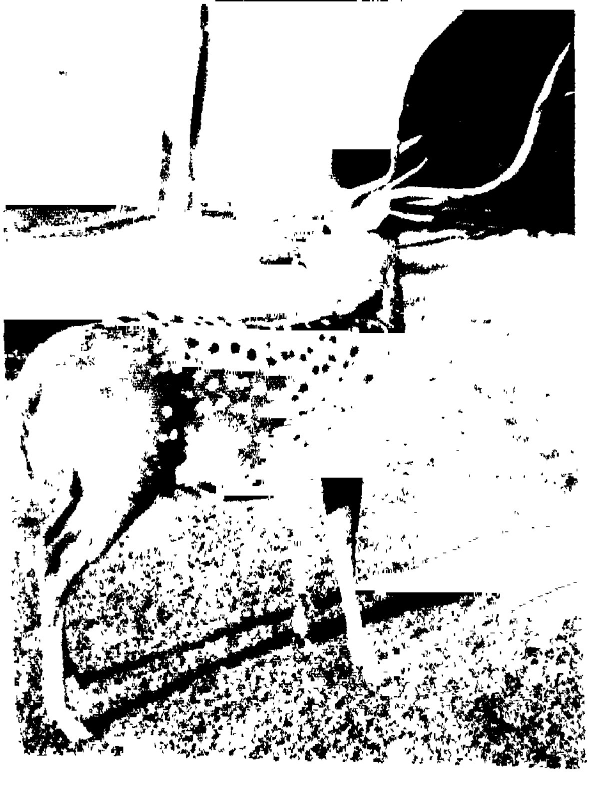
ہرن کی نسل کا سب سے چھوٹا جانور "چوسنگھا" یا چکارہ کہلاتا ہے۔ چوسنگھے کے سر پر چار سینگ ہوتے ہیں، دو بڑے اور دو چھوٹے اس کی مادہ کو 'بھیڑکی' کہتے ہیں۔ مادہ کے سینگ نہیں ہوتے۔ چوسنگھا اکثر تنہا، یا اپنی مادہ کے ساتھ چٹانی یا میدانی علاقہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ لمبی گھاس والے میدانوں میں جو پہاڑ کے دامن میں کسی چشمے کے قریب ہوں، رہائش پسند کرتا ہے۔ مزاجاً تنہائی پسند اور شرمیلا جانور ہے۔ اس کا قد تقریباً ۲۶ انچ، سینگ ۲ سے ۵ انچ تک اور وزن ۲۰ سے ۵۰ پونڈ تک ہوتا ہے۔

جنگلی بکری چوسنگھے سے بڑی ہوتی ہے اس کی جلد پر نرم، گھنے سیاہی مائل بال ہوتے ہیں۔ اور سینہ اور پیٹ سفید ہوتے ہیں۔ کان بڑے، اور سانبھر کے کانوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے جنگلی بکری دشوار گزار پہاڑی ڈھلانوں میں رہتی ہے۔ اس لئے اسے شکار کرنا محال ہوتا ہے۔ اس کا اوسط قد تقریباً ۲۶ انچ، سینگ کی لمبائی ۴½ انچ اور وزن ۵۵ پونڈ سے ۶۱ پونڈ تک ہوتا ہے۔

ہرن، ہندوستان کے تقریباً ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ ہرن کی مادہ تقریباً تین ماہ میں بچے دیتی ہے (عموماً مارچ اور ستمبر میں) بچوں کی تعداد ایک دو سے زائد نہیں ہوتی۔ دو سال کی عمر میں نر کی جلد سیاہی مائل ہونا شروع ہوتی ہے اور سینگ نکل آتے ہیں۔ ہرن، زراعتی خطوں کے قریب، گھاس کے میدانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہرن کا اوسط وزن ۷۰ پونڈ سے ۱۰۵ پونڈ تک اور سینگ کی لمبائی ۲۳ انچ تک ہوتی ہے۔

چیتل بہت حسین جانور ہے۔ عموماً پہاڑوں کے دامن میں چشمے کے قریب، نسبتاً کم گھنے جنگلات میں رہتا ہے۔ فطرتاً شرمیلا جانور ہے اور آدمی سے بہت خوف زدہ رہتا ہے۔ اگر کسی درندے یا کسی آدمی کی آہٹ محسوس کرتا ہے تو تیزی سے بھاگنے کے بجائے آہستہ آہستہ کسی محفوظ مقام پر پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا اوسط وزن ۱۹۰ پونڈ تک اور قد ۳۶ انچ تک ہوتا ہے۔

بارہ سنگھا کم یاب جانور ہے۔ اس کے شاخ دار سینگ بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ سینگ میں چونکہ عموماً ۱۲ شاخیں ہوتی ہیں۔ اسی مناسبت سے اُسے بارہ سنگھا کہا جاتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ بلند آواز، اور شور کرنے والا چرندہ ہے۔ کسی قسم کے خطرہ کا احساس کرتے ہی تمام غول تیز آوازیں نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی معمولی آواز، گدھے کی آواز سے مشابہ، لیکن مقابلتاً باریک ہوتی ہے۔ بارہ سنگھا گھنے جنگل میں رہتا ہے اس کی نظر کمزور اور قوت



بارہ سنگھا

شامہ تیز ہوتی ہے۔ ۴۰۰ گز کے فاصلے تک آدمی یا کسی جانور کی بُو سونگھ سکتا ہے۔ فطرتاً سادہ لوح ہوتا ہے۔ زیادہ دُور تک تیزی سے نہیں دوڑ سکتا۔ قد تقریباً ۴۷ انچ اور سینگ کی لمبائی ۲۵ انچ تک ہوتی ہے۔

سانبھر، ہرن کی نسل کا سب سے بڑا جانور ہے۔ گنجان جھاڑیوں اور گھنے جنگلات میں رہتا ہے۔ چشموں کے کنارے اُگنے والی لمبی رَس دار گھاس اس کی پسندیدہ غذا ہے۔ مہوے کے پھل بہت رغبت سے کھاتا ہے۔ اس کی سماعت بھی بہت تیز ہوتی ہے۔

مادہ سانبھر، دو یا تین سال میں ایک مرتبہ بچے دیتی ہے۔ بچہ ڈیڑھ سال کی عمر تک صرف ماں کا دُودھ پیتا ہے۔ سانبھر بہت چالاک جانور ہے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی تیز رفتاری سے فرار ہوجاتا ہے اور کئی فرلانگ تک دوڑتا چلا جاتا ہے۔ عادتاً جھاڑیوں کی اوٹ میں رہتا ہے۔ میدانی علاقے میں بہت کم نظر آتا ہے۔ اوسط قد ۵۵ انچ، اور سینگ کی لمبائی ۵ انچ تک ہوتی ہے۔



نیل گائے

نیل گائے ہندوستان میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ لیکن اسے "گائے" کہنا غلط ہے کیونکہ اس کی شباہت گھوڑے سے ملتی ہے۔ زراعتی خطوں کے قریب میدانی علاقوں میں رہنا پسند کرتی ہے۔ یہ قد اور وزن کے لحاظ سے بہت بڑا جانور ہے۔ ڈھاک اور پلاس کے پتے اور گنا اس کی محبوب غذا ہے۔ کاشت کو سب سے زیادہ نقصان اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ گردن گھوڑے کی طرح جلد سیاہ، کھال موٹی اور بھدی ہوتی ہے۔ نیل ہمیشہ غول میں رہتے ہیں۔ اُن کا اوسط قد ۵۲ انچ سے ۵۶ انچ تک، وزن ۴۴۰ پونڈ سے ۶۰۰ پونڈ تک اور سینگ کی لمبائی ۸ انچ سے ۱۰ انچ تک ہوتی ہے۔

شیر ببر، گجرات میں گیر کے جنگلات میں پائے جاتے ہیں۔ حکومت نے اُن کی نسل برقرار رکھنے کے لئے اُن کا شکار ممنوع قرار دیا ہے۔ اور ان کی خاص نگہداشت کی جاتی ہے۔ شیر ببر چھوٹی جھاڑیوں والے میدانی علاقہ میں رہتے ہیں۔ نیم ریگستانی علاقہ اُن کی رہائش گاہ ہے۔ تنہائی پسند جانور ہے۔ اُسے ہندوستان کا قومی جانور قرار دیا گیا ہے۔

چیتے کی نسل نایاب ہوتی جارہی ہے۔ کسی زمانے میں چیتا، ہرن کے شکار کے لئے سدھایا جاتا تھا۔ چیتے اور تیندوے کی ہیئت میں بہت کم فرق ہے، چیتا تیندوے سے جسامت میں بڑا اور زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ اس کی گردن لمبی اور جلد زرد ہوتی ہے جس پر خوبصورت سیاہ دائرے ہوتے ہیں۔ اس کے ناخن، کتے کے ناخنوں کی مانند سخت ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف تیندوے کے ناخن نرم ہوتے ہیں اور وہ اپنے ناخنوں کو حسب خواہش جلد کے اندر کرلیتا ہے۔ چیتا بہت تیز رفتار درندہ ہے۔ ایک فرلانگ کے فاصلے تک ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے اور اپنی تیز رفتاری کے باعث اپنے شکار کو بآسانی زیر کرلیتا ہے۔

تیندوا ہندوستان کے کئی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی بصارت اور سماعت تیز ہوتی ہے لیکن قوت شامہ کمزور ہوتی ہے۔ جوڑا ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ مادہ کا زمانہ حمل ۱۵ ہفتے ہوتا ہے۔ ۱۴ سے ۲۱ دن کے عرصہ میں بچوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ تیندوا عموماً آبادی کے قریب رہتا ہے اور چھوٹے جانوروں مثلاً بکری، کتے وغیرہ کا شکار کرتا ہے۔ کسی جانور کا شکار کرتے وقت کسی چٹان یا جھاڑی کے پیچھے پوشیدہ ہوجاتا ہے اور اپنے شکار کو بہت قریب آنے کا موقع دیتا ہے۔ پھر اچانک حملہ کرکے جانور کی گردن توڑ دیتا ہے۔ اپنے

شکار کردہ جانور کو ہمیشہ سینہ کی طرف سے کھانا شروع کرتا ہے (اس کے برخلاف شیر ہمیشہ پچھلی رانوں کی طرف سے کھانا شروع کرتا ہے) تیندوا پیٹ چاک کر کے اپنے شکار کردہ جانور کا دل گردہ اور آلائش کھا جاتا ہے اور کبھی کبھی محض اپنی حیوانی خواہش کی تکمیل کے لئے ایک رات میں کئی جانور ہلاک کر دیتا ہے اور صرف خون پی کر چلا جاتا ہے۔ تیندوا آدمی سے زیادہ خائف نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی بلاوجہ حملہ کر دیتا ہے چونکہ بے حد چالاک درندہ ہے، اس لئے اس کا شکار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آدم خور تیندوا، آدم خور شیر سے زیادہ خطرناک اور ہلاکت خیز ہوتا ہے۔ گھر میں داخل ہو کر سوئے ہوئے آدمی کو ہلاک کر دیتا ہے اور بالکل خائف نہیں ہوتا۔

تیندوا، شیر کی طرح، روشنی یا آگ سے نہیں ڈرتا اور درخت پہ چڑھ سکتا ہے۔ لیکن پانی سے خائف ہوتا ہے۔ کئی دن تک پیاسا رہ سکتا ہے۔ تیندوے کی گردن، دانت، شانے اور پنجے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کے ناخنوں میں خطرناک زہر ہوتا ہے۔ اس کا اوسط قد ۷ فٹ، دُم کا طول ۲۸ انچ سے ۳۰ انچ، اور وزن ۶۰ پونڈ سے ۱۳۰ پونڈ تک ہوتا ہے۔

شیر ہندوستان کے علاوہ برما، لاؤس، تھائی لینڈ، ملایا، سماترا اور سائبیریا کے جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی ۸ فٹ سے ۱۰½ فٹ تک وزن ۲۵۰ پونڈ سے ۵۰۰ پونڈ تک ہوتا ہے۔ شیر کی اوسط عمر ۲۰ سال ہوتی ہے۔ اس کی بصارت اور قوت شامہ کمزور لیکن قوتِ



سفید شیر

سماعت تیز ہوتی ہے۔ ۲۲ فٹ سے ۲۴ فٹ کی اونچائی تک چھلانگ لگا سکتا ہے اور ۹ فٹ سے ۱۲ فٹ کے فاصلے تک پنجہ مار سکتا ہے۔ مادہ شیرنی کا زمانۂ حمل ۱۵ ہفتے یا ۱۰۵ دن ہوتا ہے۔ وہ ہر تین سال بعد، عموماً ابتدا فروری سے آخر مارچ تک ۲، ۳ سے ۶ تک بچے دیتی ہے۔

بچوں کی پیدائش سے کافی عرصہ قبل شیرنی، شیر سے علٰحدہ ہو جاتی ہے اور کسی غار یا گھنی جھاڑی میں رہنے لگتی ہے۔ بچے پیدائش کے وقت بلی کے بچوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ۱۵، ۲۰ یوم میں اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اُن کی پرورش ماں کے دودھ پر ہوتی ہے اور دو ماہ کی عمر میں وہ ماں کے ساتھ اپنی جائے رہائش سے باہر نکل آتے ہیں۔ ۱۶ ماہ کی عمر میں شکار کرنا سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ۵ سال میں اُن کی جسمانی ساخت مکمل ہو جاتی ہے۔

شیر دن میں دو مرتبہ، علی الصبح اور سرِ شام، پانی پینے کے لئے اپنی جائے رہائش کے قریب واقع چشمہ یا ندی پہ آتا ہے۔ دن میں اکثر سال کے جنگل میں کسی گھنی سایہ دار جھاڑی میں آرام کرتا ہے۔ گرمی اور پیاس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کم گہرے چشمے کو تیر کر پار کر سکتا ہے۔ اپنے بھاری جسم کی وجہ سے درخت پر نہیں چڑھ سکتا۔

شیر کی زندگی کا بیشتر حصہ غذا کی تلاش میں بسر ہوتا ہے۔ اُسے غذا حاصل کرنے کے لئے کافی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ دوسرے جنگلی جانور شیر سے زیادہ تیز رفتار اور چالاک ہوتے ہیں۔ شیر کی بُو سونگھتے ہی فرار ہو جاتے ہیں۔ شیر چونکہ تیز رفتاری سے نہیں دوڑ سکتا اس لئے اُسے جانوروں کا شکار کرنے میں کافی وقت اور مسلسل جدوجہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ایک جانور کا شکار کرنے کے لئے شیر کو ۲۰ سے ۳۰ مرتبہ تک کوشش کرنا پڑتی ہے تب وہ کامیاب ہوتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بڑے جانوروں کا شکار کرنے میں ناکام ہو کر اور بھوک سے مغلوب ہو کر شیر کبھی کبھی جنگلی پرندوں، بندر، مینڈک یا پرندوں کے انڈوں سے اپنی اشتہا مٹانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

شکار کرنے کے بعد شیر ہمیشہ اپنے شکار کردہ جانور کو پچھلی رانوں کی طرف سے کھانا شروع کرتا ہے۔ وہ جانور کے پیٹ کی اندرونی آلائش نہیں کھاتا جب تک وہ اپنے شکار کردہ جانور کا گوشت نہ کھالے، دوسرے جانور کا شکار نہیں کرتا۔ ایک جوان شیر کی اوسط خوراک ۱۵ سے ۲۰ پونڈ گوشت روزانہ ہوتی ہے یعنی ایک شیر اوسطاً ایک سال میں ساڑھے تین ٹن گوشت کھاتا ہے۔ چونکہ ہر جانور کے جسم کا ۶۰، ۷۰ فیصدی حصہ ہی کھانے کے لائق ہوتا ہے۔ اس لئے شیر

(بقیہ ص ۳۵ پر)

کیف احمد صدیقی

خود غرضی

ہکشادہ انگنائی میں
۔ ڈلیا کے اندر چاول
وپ میں رکھے سوکھ رہے ہیں
ول کے ہر دانے کو
رج کی کرنیں چاٹ رہی ہیں
موپ کی شدت
اول کے اندر کی نم آلود حرارت
یس رہی ہے۔
نگن کی دیواروں پر
یہ بھوکی چڑیاں
باول کے ہر دانے کو
لچائی نظر سے دیکھ رہی ہیں
بھی کبھی
وہ ہمت کر کے
ڈلیا کے بھی پاس آتی ہیں
لیکن تھوڑی دور پہ بیٹھی
گھر والی کے خوف سے فوراً اُڑ جاتی ہیں
گھر والی کے ہاتھ میں
اک لمبی سی چھڑی ہے
لیکن اس کے دل میں اپنی بھوک کے آگے
ان چڑیوں کی بھوک کا کچھ احساس نہیں ہے۔
دھوپ میں چاول سوکھ رہے ہیں
چاول کے ہر دانے کو
سورج کی کرنیں چاٹ رہی ہیں

غزلیں



قیصر شمیم

ایک ندی بڑھ کے جب دریا ہوئی
اپنے سوتے سے بھی بے گانہ ہوئی
دل کی سطح پرسکوں کو کیا ہوا
کیسی ہلچل یک بیک پیدا ہوئی
اے بدلتے منظرو، کچھ تو کہو!
پاؤں کے نیچے زمیں تھی کیا ہوئی
ریت پر بنتے بگڑتے کچھ نقوش
لیجئے، یہ آپ کی دنیا ہوئی!
جس میں تھے کچھ دلربا خوابوں کے گھر
کب کی وہ بستی تہہ و بالا ہوئی
شہر پر الزام ہے سیلاب کا
مل کے اک دریا سے وہ رسوا ہوئی
کیا کریں گی پھر مہاجر بستیاں
آگ کی آندھی اگر برپا ہوئی
گرد جو تھی پتھروں کے دور کی
وہ بھی میرے عہد کا حصہ ہوئی
خانہ زاد روشنی جو نسل تھی
وہ بھی اپنی دھند میں یکتا ہوئی
شور اے قیصرؔ بہت ہے شہر میں
روح کی فریاد بھی بے جا ہوئی



ذکاء الدین شایاں

درخت جھک گئے، پتوں نے آنکھیں کھولی ہیں
ہوائیں، بہتی ہوئی لہرے جو بولی ہیں
دمکتی کرنیں۔ غم آلود گرد کی نظریں
جو ہم چلے ہیں، تو سب ساتھ ساتھ ہولی ہیں
تمام شہر بیاباں کے راز لانا ہیں
ہوا نے رات کے پانی سے آنکھیں دھولی ہیں
فسردہ سینوں کو بے رنگ و پُرسکوں پاکر
ہم اہلِ غم نے، تیری یادیں ہی پھبولی ہیں
کبھی کبھی تو ہوا یہ بھی ہے کہ ہم سے دور
وہ نرم پلکیں خود آپس میں مل کے رولی ہیں
سوائے چند دھندلکوں کے، آئے گا اب کون
شفق نے ٹیلوں پہ یہ کیوں کتابیں کھولی ہیں



فخر رضوی

اچھا بھی اس کو کہنے سے ہو جاتا تھا خفا
وہ بھی عجیب شخص تھا جانے کہاں گیا
اُس کے بدن کا لوچ بھی جی خوش نہ کر سکا
اپنے وجود پر مجھے کل رات شک ہوا
خاموشیوں کی کائی جمی تھی زبان میں
مجمع لگا ہوا تھا، کوئی بولتا نہ تھا
تو سر سے پاؤں تک مجھے اچھی طرح سے دیکھ
یہ وہم دور کر لے کہ سایہ ہوں میں ترا
سوچا ہے اب کسی کو نہ اپنا کہوں گا میں
اپنا جسے کہا وہی بے گانہ ہو گیا!
ہر سو ہری بکھری ہیں ملامت کی پتیاں
اے فخرؔ اب خلوص کا موسم چلا گیا

دوَر آفریدی

جدید اُردو شاعری

——— میری نظر میں

جدید یا جدید ترین شاعری کیا ہے ؟ اور کیا نہیں ہے ! اس کی بہت سی تاویلیں ہیں۔ اس کے ابتدائی اور بنیادی محاسن یہ ہیں، مثلاً جدید ذہن کا شاعر ایسے الفاظ سے گریز کرتا ہے جو کثرت سے اُردو شاعری میں استعمال ہوتے آرہے ہیں چونکہ وہ بہت عام ہیں، وہ ہر بڑے اور چھوٹے شاعر کے یہاں بکثرت ملتے ہیں۔ یہ اسی وجہ سے اپنی معنوی قدر و منزلت تک کھو چکے ہیں۔ ایسے الفاظ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ نشاندہی کے لئے ایک دو لفظ یہاں دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً نشیمن۔ چمن وغیرہ وغیرہ۔

ایسے الفاظ کی جگہ، جدید شاعر ان ہی کے ہم معنی الفاظ ڈھونڈتا ہے، جو شاعری میں، اب تک بہت کم سامنے آئے ہیں، یا ضرورتاً اُن کو برتا جاتا ہے۔ لیکن اُن کا چلن عام نہیں ہے۔ مثلاً نشیمن کی جگہ شبستاں، یا آرام گاہ، یا سکون زار۔ چمن کی جگہ مدھوبن، لالہ نما یا دھنک زار۔ پہلے لفظوں کے مقابلے، بعد کے الفاظ صوتی اور معنوی حیثیت سے زیادہ معنی خیز ہیں۔ یہ ایک قسم کی جدیدیت ہوئی کہ نئی صوتی اور معنوی حیثیت سے خوبصورت الفاظ کا انتخاب کیا جائے۔

جدیدیت کی دُوسری ابتدائی خصوصیت ہے کہ اس میں زبان صاف ستھری یا نکھری ہوئی پیش کی جاتی ہے۔ یہ گنجلک نہیں ہوتی اس میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ قدیم زبان اور رسائی کا رکھ رکھاؤ نہیں ہوتا : وقت کی ترقی کرتی ہوئی زبان کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہ قدیم تراکیب سے گریز کرتی ہے چونکہ قدیم تراکیب کی اہمیت اس وقت کم ہوگئی ہے، اس لئے اس کو اس جدید عہد میں پسند نہیں کیا جاتا۔ ترقی کرتی ہوئی زبان میں بہت سی گنجائشیں ہیں۔ اس میں اخذ کا مادّہ ہے یہ دُوسروں کے ادب کی صحت مند قدروں کو اپناتی ہے اور جدت میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ عمل صرف اُردو کی جدید شاعری میں ہی نہیں، دُنیا کی تمام جدید و اعلیٰ زبانوں میں جاری ہے۔ اسوجہ سے کل اور آج کی زبان کا فرق، قدیم و جدید کی صورت میں بے حد نمایاں ہو گیا ہے ——— جتنا وقت گزرتا جائے گا یہ فرق نمایاں ہوتا رہے گا۔

جدید شاعری اُردو میں محاورہ بندی کی دوست نہیں ہے۔ اس میں بہت کم محاورے ملتے ہیں۔ بعض کے یہاں نام کو بھی نہیں ملتے۔ البتہ نئے محاورے بنانا، جدید شاعری کی ایک کوشش ہے۔ مثلاً گلاب بجھنا : (گلاب مرجھانے کے معنی میں۔) سورج سرد ہونا (سورج ڈوبنے کے معنی میں) یہ اور ایسی دوُسری فکری اختراعات، جدیدیت کو فروغ دے رہی ہیں اور دیتی رہیں گی۔

لیکن جدید شاعری کی زبان اگر لایعنی صورتیں اختیار کرنے لگے تو یہ بدعت ہوگی اور ہر نوع بدعت کو ہر کوئی برداشت نہیں کرتا۔

جدید شاعری فکر و مفہوم کے اعتبار سے بہت آگے ہے۔ قدیم کا صرف کچھ ازلی اور ابدی حقائق پر تکیہ تھا اور ہے۔ اس نئی شاعری میں جستجو

اور فکری طور پر، آگے بڑھ کر کچھ کہنے کا جذبہ ہے، اور اظہار ہے۔ اس میں لاتعداد مفاہیم ہیں، جو کل تک کی شاعری میں نمایاں ہو کر سامنے نہیں آئے تھے، یہ نئی شاعری کا اضافہ ہیں۔

جدید ترین تشبیہات، استعارے اور کنائے اس کے اعلیٰ محاسن ہیں۔ ان سب میں اسلوب، یا طرزِ ادا یا بات کہنے کا ڈھنگ، سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جو جدید شاعر، ذہنی طور پر جتنا سلجھا اور نکھرا ہوا ہے، وہ اتنا ہی جدیدیت میں کامیاب ہے۔ اس کے یہاں زبان کی صفائی، الفاظ کا انتخاب، محاورے کی تراش خراش، سب کچھ اچھا ہوگا۔ جدید ہوگا، نکھرا ہوا ہوگا اور دل کو موہ لینے والا ہوگا۔

جدیدیت کے ابتدائی محاسن کی بات ختم ہوئی۔

اس جدیدیت میں (موجودہ وقت ۶۵ء کے لگ بھگ) جو اضافہ کثرت سے ہوا ہے، وہ یہ ہے، مثلاً ابہام، یا فکری گہرائی اور گیرائی، اشاریت، علامت تشبیہ اور علمی عمل!

آج کا نیا شاعر تخلیقی عمل کے وقت، سب سے زیادہ ابہام کو ترجیح دے رہا ہے۔ اس میں فکر اس حد تک آگے ہے۔ کہ ہر پڑھنے والا یا سننے والا، شاعر کی پیش کردہ تخلیق کو اُس طرح نہیں سمجھ پاتا جس مفہوم میں شاعر نے اپنی تخلیق دی ہے بلکہ ہر شخص اس کو اپنے طور پر ایک دوسرے سے مختلف معنی میں سمجھتا ہے۔ یہ موجودہ ابہام یا فکری گہرائی اور گیرائی کی شکست ہے۔ فتح نہیں ہے۔

اس نئی شاعری کا دوسرا عنصر اشاریت کا ہے۔ یہ واضح ہے تو اس نوع سے بہتر، کوئی دوسری شاعری نہیں ہو سکتی! لیکن اس کو بھی فکری گورکھ دھندوں میں پیش کیا جاتا ہے اور اس طرح یہ کسی تہنیت کے بجائے ایک دردِ سر بن چکی ہے۔ کاش ہمارے نوعمر شعرا اس طرف ذرا بھی توجہ دیں تو یہ اُردو شاعری کے لئے ایک نیک قدم ہوگا۔

تیسرا عمل علامتی ہے۔ اس میں نیا شاعر ایک لفظ یا عنوان کے تحت کسی فکر، شے یا شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً ایک شاعر نے پنڈت جواہرلال نہرو (مرحوم) کو "گلاب" تصور کر کے نظم تخلیق کی اور گلاب کی خصوصیات میں، پنڈت جواہر لال کی شخصی حیثیت کو اجاگر کیا۔ اس میں تخلیقی عمل شعری محاسن کے ساتھ تھا اور واضح تھا۔ لیکن ایسا کوئی عمل، جب بھی مبہم ہوگا۔ علامتی شاعری پروان نہیں چڑھے گی۔

جدید شاعری میں چوتھا عمل تشبیہ کا ہے۔ اس کی ہمارے نوعمر شعراء میں بہتات ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس میں تشبیہ کے اعلیٰ ڈھنگ کو مدِنظر نہیں رکھا جاتا! بلکہ سماجی دباؤ کے زیرِ اثر جو شاعر کا اپنا ذہن ہوتا ہے، وہ ہر شے کو اُس عینک سے دیکھتا ہے۔ مثلاً سورج کو سیاہ کہنا خود شاعر کے ذہن کی پیداوار ہے۔ چونکہ شاعر فکری حیثیت سے، وقت کی سیاہی میں، خود کو مبتلا پاتا ہے۔ یا زلف کو سورج کی تابندہ کرنیں، کہا جائے! تو یہ خود نئے شاعر کے سمجھنے کی بات ہے، دوسروں کو سمجھانے کی نہیں ہے۔

سورج کو چاندی کے ٹکڑے سے، زلف کو شام سے تشبیہ دینا سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ ایسی کوئی تشبیہ جو شعری یا ظاہری مناسبت کی ضد پر منحصر ہو عقل قبول کرنے سے انکار کرتی ہے اور اس طرح اختلاف کی، ایک راہ کھلتی ہے، جو بہر نوع! درست نہیں! چونکہ اختلاف حقیقت کا مثبت پہلو نہیں ہے منفی پہلو ہے۔

اور اس جدید شاعری پر، علم یا علمی عمل سب سے زیادہ حاوی ہے۔ ہر تخلیق ایک علمی شاہکار بنانے کی کوشش لگتی ہے۔ اس میں شاعری کی زبان نہیں ہوتی! جذباتی نظریئے نہیں ہوتے۔ کیفیاتی لہک مہک نہیں ہوتی۔ صوتی خوبی یا سندرتا بھی نہیں ہوتی۔ ایک فلسفیانہ نظریہ، ہر تخلیق میں ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھار اتنا بلند ہوتا ہے کہ سرے سے نظم کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

کچھ جدید شعراء تو، شاعری کی زبان تک کو پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ ہر وہ لفظ جو زندگی کی روز کی ضرورتوں میں کسی طرح بھی بولا سمجھا جاتا ہے، وہ اس نئی شاعری میں ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ سرکاری دفتر کا ہے یا نیم سرکاری دفتر کا، وہ تجارت پیشہ لوگوں کے لئے وقف ہے، یا کسی دستکاری کی فضا کا ہے۔ وہ انگلش کا بھی ہے، فرانسیسی کا بھی اور جرمن کا بھی۔

ان تمام مذکورہ عناصر و علائم میں کیا زندہ رہنے والا ہے اور کیا نہیں ہے! اس کا فیصلہ ہر شخص اپنے طور پر کر سکتا ہے! اور کر رہا ہے!! اچھا تو یہی ہے کہ ہم خود اُن عناصر سے گریز کریں، جو ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں۔ اس سے جدید شاعری کا بول بالا ہوگا! جس طرح آج ہمارے ماضی کی کچھ صحت مند قدریں ہمارے ساتھ ہیں اور رہیں گی۔ اس طرح ہم، اُس شنیدہ خطرے سے بھی بچ جائیں گے کہ یہ جدید شاعری جلد فنا ہو جائے گی۔

اس وقت ہمارا نیا تعلیم یافتہ طبقہ، ایک بڑی تعداد میں، صرف

(بقیہ ص ۴۷ پر)

نئی کتابیں

"تحریر و تنقید" (تنقیدی مضامین)

مصنف: طیب انصاری

ناشر: پرویز بک ایجنسی۔ پوسٹ بکس ۱۸۹ حیدرآباد ۱

قیمت: تین روپے

"تحریر و تنقید" طیب انصاری کے تیرہ ۱۳ مضامین کا مجموعہ ہے جو اپریل ۱۹۶۹ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ "تحریر و تنقید" کے عنوان سے مصنف نے پیش لفظ لکھا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مقدمہ ہے۔ طیب انصاری کے نقطۂ نظر اور اندازِ تحریر کا اندازہ اُن کے جملوں سے ہوگا۔

"میر پسندی ادب کے لئے مہلک زہر ہے، غالب پرستی کا رجحان ادب کو زندگی سے محروم کر دے گا۔ ہمیں اقبال کی راہ اختیار کرنی چاہئے" (ص ۱۲)

جو کہنا چاہتے ہیں اور جس طرح کہنا چاہتے ہیں اُن پر نظر رکھئے اور لب و لہجہ پر غور فرمائیے:

"میں احتشام حسین اور ممتاز حسین سے کہوں گا کہ وہ زندگی کو قریب ہو کر دیکھیں"

"کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہا ہے، میں اُن کی تنقید کو ان ہی الفاظ سے یاد کروں گا" (ص ۱۲)

علامہ نیاز فتحپوری نے جاتے جاتے کیا ظلم کیا ہے۔ اسے بھی دیکھئے بہت کم لوگوں کو اس کی خبر ہوگی (ص ۱۲)

"نیاز اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن جاتے جاتے آثار چھوڑ گئے۔ رومانویت پسند گروہ آج بھی زندہ ہے" (ص ۱۲)

طیب صاحب نے تنقید نگاری کے لئے جو نسخہ لکھا ہے وہ قابل غور ہے۔ ظاہر ہے اُردو تنقید کو ایک چنگیز یا ہلاکو کی ضرورت ہے۔ فرماتے ہیں:

ڈاروِن کے بال و پر نوچ لیجیے، فرائڈ کی آنکھیں نکال لیجئے، مارکس کی ناک کاٹ لیجئے اور ملارمے اور رواں بو (راں بو) کے ہاتھ کتر لیجئے (یا کان) تاکہ وہ اشاروں اور کنایوں میں باتیں کرنا چھوڑ دیں"

"شدت وحدت، کے مقامات" کی چند مثالیں یہ ہیں:

"جگر، فانی اور میر بہترین شاعر ہیں اور غالب سے بہتر لیکن اقبال کے مدِمقابل بہت پست قد شاعر ہیں" (ص ۱۵۴)

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے۔

"میرا مشورہ تھا کہ طیب انصاری صاحب قدرے توقف سے اپنا مجموعہ شائع کرتے تو ممکن ہے نظرِ ثانی کے بعد بعض شدتِ وحدت کے مقامات کو فکر سے خنک و خوشگوار بنا سکتے ہیں لیکن اُنہیں اپنے نقطۂ نظر کی جرأت ا[...] صداقت پر اس قدر ایقان تھا کہ وہ اس توقف کے لیے گنجائش نہ نکال [...]

زندگی کے کھیل اور دِن رات (افسانے)

مصنف: ل احمد اکبرآبادی

ناشر: انجمن ترقی اردو ہند (مغربی بنگال) ۹۰ بی بولائی دست[...]

اسٹریٹ، کلکتہ ۱۳

قیمت :- ۵ روپے (پانچ روپے)

"زندگی کے کھیل" میں بارہ کہانیاں ہیں اور "دن رات" میں گیارہ کہانیاں۔ کتابت اور طباعت اچھی اور گٹ اپ عمدہ ہے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک کی کہانیاں شریک ہیں۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے ابتدائی اُردو کہانیوں کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ عرصے سے ل۔ احمد صاحب کے یہ مختصر افسانے نایاب تھے۔ پریم چند کے بعد اُردو افسانوں میں کام کرنے کے لئے یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔ ل۔ احمد صاحب کا اپنا انداز ہے چھوٹے چھوٹے واقعات صاف اور دلکش اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ اس دور کے ایسے افسانہ نگاروں کے حقیقت پسندانہ رجحان کو سمجھنے میں اس افسانوی مجموعے سے یقیناً مدد ملے گی۔

ملاحظاتِ نفسی

مصنف :- ل۔ احمد اکبر آبادی

ناشر :- انجمن ترقی اُردو (مغربی بنگال) ۹ بولائی دت، اسٹریٹ کلکتہ ۱۳

قیمت :- دو روپے پچاس پیسے

جج، صناع، شوہر، اور صحافی کی نفسیات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے یا افسانوں میں اُن کی نفسیات اُجاگر ہوئی ہے۔ افسانوں کے عنوانات سے تو ایسا لگتا ہے کہ اُن کی نفسیات کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے کی شعوری کوشش ہوئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانوں میں اُن کی نفسیات کے رنگ ظاہر ہوئے ہیں۔ کتاب کے نام سے بھی غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس مجموعے کے افسانے —— ایسے افسانے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ل۔ احمد صاحب نے کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کی کوشش اِس زمانے میں کی تھی جب اس کی اہمیت کا احساس فنکاروں کو زیادہ ہو گیا تھا۔ کل ممکن ہے اِن عنوانات کے تحت یہ افسانے لکھے گئے ہوں لیکن آج تبدیلی ضروری تھی۔ مصنف کو خود اس بات کا احساس ہے، وہ لکھتے ہیں "علم النفس سے میری شناسائی فلسفہ جذبات پڑھ لینے کی حد تک ہے" ہر افسانہ دلچسپ ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۹ء تک کے یہ افسانے کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کو پیش کرتے ہیں۔ اُمید ہے ادبی حلقوں میں جناب ل۔ احمد اکبر آبادی کے یہ دونوں مجموعے پسند کئے جائیں گے۔ اُردو افسانوں میں تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ تحفہ غنیمت ہے۔

ادبی تاثرات (حصہ اوّل)

مصنف :- ل۔ احمد اکبر آبادی

ناشر :- انجمن ترقی اُردو ہند (مغربی بنگال) کلکتہ ۱۳

قیمت :- سات روپے پچاس پیسے

جناب ل۔ احمد اکبر آبادی کے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ گٹ اپ خوبصورت ہے، لکھائی چھپائی عمدہ ہے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء تک لکھے ہوئے مضامین ہیں جو اس دَور کے رسالوں میں چھپے تھے، آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے تھے اور ادبی محفلوں میں سُنائے گئے تھے۔ یہ مضامین یونی ورسٹی، کالجوں کے طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ ل۔ احمد صاحب ایک افسانہ نگار ہی نہیں، ایک سنجیدہ نقاد بھی ہیں۔ محنت سے لکھے گئے مضامین نایاب تھے۔ نظرِ ثانی کے بعد اُنہیں یکجا کرکے شائع کیا گیا ہے۔ مطالعہ وسیع اور گہرا ہے۔ چند مضامین اہم ہیں۔ مثلاً شاہ مبارک آبرو، افسانہ، مطالعۂ لغت، نیاز فتح پوری۔ اور اُردو کی نفاست میں آگرہ کا حصہ وغیرہ۔ "جاپانی شاعری" اور "سیفو" پر اُن کے مضامین دلچسپ فکر انگیز ہیں۔ ۲۰۳ صفحات کی یہ کتاب اس لائق ہے کہ اُسے کتب خانوں کی زینت بنایا جائے۔

رُوسی فکر اور مفکّر

مولفہ :- ل۔ احمد اکبر آبادی

ناشر :- انجمن ترقی اُردو (مغربی بنگال) کلکتہ ۱۳

قیمت :- پانچ روپے

سوویت ماخذوں سے مرتب کئے ہوئے یہ مضامین معلومات سے پُر اور دلچسپ ہیں۔ سوویت یونین کی تہذیبی زندگی کی تصویریں متاثر کرتی ہیں۔ تاجیک اور ازبک فن کاروں کا تعارف اور ملا علی شیر نوائی اور نظامی گنجوی سے متعلق سوویت فنکاروں اور نقادوں کے خیالات کا جائزہ عمدہ ہے۔ اُردو میں ایسی کتابوں کی کمی ہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے روسی مقالات سے روشنی حاصل کی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ ل۔ احمد صاحب کی یہ کتاب بھی پسند کی

جامِ جم : جناب مضطر حیدری کے کلام کا مجموعہ ہے۔

"غزل ہو یا نظم، قطعہ ہو یا رباعی یا کوئی اور صنفِ سخن میں نے اپنی شاعری میں ابتدا ہی سے "تعمیری پہلو" کو مدِنظر رکھا۔ شاعر انسانی رُوح کا معمار ہوتا ہے۔ میں بھی فن میں اس کا قائل ہوں۔ ترقی پسند ادب کی طرف میرا رجحان جذباتی نہیں بلکہ کافی غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ لیکن میں نے اپنی تخلیقات میں اس بات کا ہمیشہ ہی خیال رکھا ہے کہ موضوعات ایسے نہ ہوں جو تعمیرِ حیات کے منفی ہوں" مضطر حیدری

شاعر کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ "جامِ جم" کے مطالعے کے بعد آپ "تعمیرِ حیات" کے مفہوم اور شاعری کے "تعمیری پہلو" کو سمجھ پائیں گے ؎

اگر چہ کچھ ایسے بھی ناخدا دیکھے ؛ جو خود ڈبو کے سفینے تلاش کرتے ہیں

اور یہ بھی سنئے :۔ (مضطر حیدری)

یہ ہمیں تھے کہ بھرم آپ کا رکھا ہم نے
ہم کبھی حسرتِ دیدار سے آگے نہ بڑھے
رباب و تیشہ و سیف و قلم تراشے ہیں
ہمیں خدا ہیں ہمیں نے صنم تراشے ہیں
کتنے سادہ ہیں آج تک ہم لوگ
آپ کا اعتبار کرتے ہیں

قیمت :۔ دو روپے پچاس پیسے ناشر :۔ اُردو سبھا، نمبر ایف/۱ تانتی بگان تھرڈ روڈ، فلیٹ ۱۱، کلکتہ ۱۴

کرشن چندر، جناب سعید احمد اکبر آبادی، علامہ جمیل مظہری اور پروفیسر پرویز شاہدی مرحوم نے مضطر حیدری کی شاعری اور اُن کے شاعرانہ مزاج کو سمجھا ہے۔ بنگال میں رہ کر ایسے فنکاروں نے جو کام کیا ہے، اس کی قدر ہونی چاہئے۔ ضرورت ہے کہ ایسے تمام علاقوں کے فنکاروں کی تخلیقات سامنے آئیں جن علاقوں میں اُردو نے علاقائی زبانوں کے ساتھ رہ کر اپنے طور پر صدیوں زندہ رہنے کی کوشش کی ہے۔

رام محمد ڈیسوزا

خوبصورت اور دلکش، دل کو موہ لینے والا پیارا اسلوب اور انتہائی اہم موضوع۔ ایک صاحبِ طرز کہانی کار نے حقیقتوں کو ایسا فنکارانہ جذباتی لہجہ عطا کیا ہے کہ میں تھوڑی دیر یہ سوچتا رہا کہ ایسی عمدہ نثر لکھنے والا اب تک کہاں تھا؟

"رام محمد ڈیسوزا" کا تیسرا اڈیشن شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ قیمت تین روپے ہے۔

علی رضا نے جن کرداروں کو منتخب کیا ہے اُن کی نفسیات، اُن کے بنیادی جذبات اور اُن کے نفسی عمل اور ردِ عمل پر اچھی طرح غور کیا ہے۔ اس خوبصورت کہانی کو پڑھتے ہوئے آپ کو محسوس ہوگا جیسے خود کرداروں نے اپنے اظہار کے لئے علی رضا کا انتخاب کیا ہے۔ ہندوستانی معاشرے کی رُوح کا المیہ شدّت سے متاثر کرتا ہے۔ یہ ناولٹ ایک سوال بھی ہے۔ تین غنڈوں نے ایک معصوم بچے کی آنکھوں میں بھگوان، خدا، اور گاڈ تینوں کو دیکھ لیا۔ کیا پڑھے لکھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ انسانیت کی وحدت کی بات کرنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن خود اپنی ذات کو اس وحدت کے ساتھ دیکھنے والے کہاں چلے گئے ہیں؟

علی رضا کا رجائی نقطۂ نظر مستحکم ہے۔ وہ بھارت کی تہذیب کی ابدی رُوح کو پہچانتے ہیں۔ یہ بات نہ ہوتی تو اس ناولٹ میں کثرت میں وحدت کو وہ کس طرح دیکھ پاتے۔ ہر طرف تو انتشار ہی تھا، اندھیرا ہی تھا۔ اُن کے طنزیہ جملوں میں ہمدردی کا جذبہ، المیہ حقائق میں دردمندانہ لہجے کے ساتھ تہذیب کی رُوح کی روشنی کا احساس، نفسیاتی کیفیتوں میں سب سے بہتر نفسیاتی کیفیت کے جوہر (Essence) کی نشاندہی — اس ناولٹ کی یہ بنیادی خصوصیات ہیں۔

میں علی رضا صاحب کے اس ناولٹ کا ایک بار پھر استقبال کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو، ہر کتبہ میں اُسے پڑھا جائے۔ طلبا اس کا مطالعہ کریں۔

ہر ایک شخص پہ پرچھائیں کا خیال ہوا ؛ تری گلی میں عجب طرح کا اُجالا ؎
میرے ہر ہر گام پر سنگِ حوادث تھے مگر ؛ اپنے سائے سے نہ جانے کس لئے ٹکرا
کچھ تم سے شکایت تھی نہ دُنیا سے گلہ تھا ؛ میں یونہی ذرا دیر کو خاموش ہوا ؎

عمر گریزاں ہو کہ ہو تیرا تصور ؛ سائے کی طرح ساتھ مرے کوئی لگا تھا
ا جانے کس واسطے مصلوب ہوا ہوں ؛ دُنیا میں تو بہتوں نے ترا نام لیا تھا
وہ مفہوم ہے جو لفظ کا شرمندہ نہیں ؛ زیست اس کو کہو یا میرا سراپا کہہ لو

حرا صحرا " جناب صبا جائسی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جسے "کتاب مر" علی گڑھ نے شائع کیا تھا۔ قیمت دُو روپے ستر پیسے ہے۔ چند اشعار ے شاعر کے بُنیادی رجحان اور اس کے مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی لیات کے احساس کے ساتھ نئے مشاہدے اور تجربے ہیں جن کی دلآویزی تاثر کرتی ہے۔ "صحرا صحرا" کی غزلوں کا آہنگ یقیناً ہر دل کو کسی نہ کسی طرح چھوئے گا۔

درخشاں : حفیظ بنارسی

ساون تری زلفوں سے گھٹا مانگے ہے
خوشبوئے بدن بادِ صبا مانگے ہے
صدقے تری رعنائی پہ اے جانِ بہار
ہر گل ترے جینے کی دعا مانگے ہے

جناب حفیظ بنارسی کی یہ خوبصورت رباعی اُن کے مجموعۂ کلام "درخشاں" میں شامل ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں شاعر نے بہت کہا ہے۔ "درخشاں" غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعوں کا ایک انتخاب ہے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ قیمت ۵ روپے ہے۔ کلچرل اکادمی رینا ہاؤس، جگ جیون روڈ گیا نے شائع کی ہے۔ سرورق چترکار مدھر نے بنایا ہے جس سے مجموعہ اور حسین بن گیا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین، حضرت فراق گورکھپوری، ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور پروفیسر جمیل مظہری نے حفیظ بنارسی کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے اب باقی کیا رہ جاتا ہے! "درخشاں" ہر کتب خانے کی زینت بنے، اور شاعر غیر مرئی عناصر کو اپنے "احساس اور جذبے" سے مشخص کر کے دل اور دماغ دونوں کو گرفت میں لے لے، ہم یہی چاہتے ہیں

گلشن گلشن : پریم پال اشک

"تین پتے" میں حسن، عشق، بہار، پیاس، دیوالی، بچے کی عید۔ ایسی نظمیں پریم پال اشک کے مجموعہ "گلشن گلشن" میں شریک ہیں۔ عنوانات سے نظموں کے موضوعات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مجموعہ اُردو پبلی کیشنز اُردو بازار دہلی نے شائع کیا ہے، قیمت دو روپے پچیس پیسے۔ غزلیں، نظمیں دوہے، گیت سب شریک ہیں۔ اشک کے دوہے یقیناً زیادہ پسند کئے جائیں گے۔ زبان صاف اور خیالات واضح ہیں۔ شاعر فوق البیانی اور بلند آہنگی سے خود کو جس قدر بچا لے اتنا ہی اس کے حق میں اچھا ہے۔ اُمید ہے "گلشن گلشن" ہر حلقے میں پسند کیا جائے گا

جوئے کہکشاں : امجد نجمی

جا کے دریا پہ بھی پیاسا آیا
سوزشِ تشنہ لبی
بڑھتی جاتی تھی مگر
ایک قطرہ نہ لبوں تک پہونچا
موجِ سیلاب بنی میرے لئے موجِ سراب
چشمۂ زہر میں تبدیل ہوا چشمۂ آب
چار سو کتنی گھٹائیں چھائیں
لیکن ایک بوند نہ دھرتی پہ گری
تلخیٔ کام و دہن اور بڑھی ـــــ اور بڑھی
ساحلِ خشک سے کچھ بھی نہ ملا
جا کے دریا پہ بھی پیاسا آیا

جناب امجد نجمی کے کلام کا مجموعہ "جوئے کہکشاں" اُڑیسہ ساہتیہ اکاڈمی بھونیشور سے تین روپے میں مل سکتا ہے۔ امجد صاحب اُردو کے ایک بزرگ شاعر ہیں جنہوں نے روایتی شاعری سے زیادہ کلاسیکی آہنگ کو ہمیشہ پسند کیا اور نئے ہیتی تجربوں کو اپنے احساس اور جذبے کے اظہار کے لئے منتخب کرتے ہوئے کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ "جوئے کہکشاں" شاعر کے مخصوص لب و لہجے کے مطالعے کے لئے ایک اچھا تحفہ ہے۔

"زندگی سے زندگی کی طرف" نازش پرتاب گڈھی کی ایک طویل نظم ہے اگست ۱۹۴۲ء کی تحریکِ آزادی اس کا موضوع ہے۔ نیشنل آرٹ پرنٹرس سرائے گڈھی الہ آباد نے یہ طویل نظم شائع کی ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے تحریر فرمایا ہے ــ ۔ ۔ ۔ ۔

. . . زندگی سے زندگی کی طرف" جس کے بیشتر حصے میں نے اُن سے سُنے اور سالوں میں پڑھے ہیں اس کا کھُلا ثبوت ہے کہ "یہ ہمیشہ فکر و فن دونوں احترام ملحوظ رکھتے ہیں"۔ نظم کی خطابت، بُلند آہنگی اور فوق البیانی کا سپ پر یقینا اثر ہوگا۔

"لسان الصدق" پہلا ماہنامہ تھا جو مولانا ابوالکلام کی ادارت میں کلکتہ سے ۱۹۰۳ء کے نومبر سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ جناب عبدالقوی دسنوی نے **"مضامین لسان الصدق"** میں مولانا آزاد کی تحریروں کو جمع کیا ہے۔ عمدہ کام ہے، اُردو والوں کے لئے ایک اچھا تحفہ ہے۔ پانچ حصے ہیں: مقاصد، مضامین، معلوماتی تحریریں، انتقاد، اور "لسان الصدق" سے متعلق بعض ہم عصروں کی رائیں۔ مرتب کے دیباچے سے روشنی ملتی ہے۔ عبدالقوی صاحب ایک باشعور محقق ہیں، ہم دامن پھیلائے اُن سے کچھ اور مانگ رہے ہیں۔ مولانا آزاد کے یہ مضامین اُردو طلبا کی مدد کریں گے۔ مولانا کے بنیادی اسلوب کی اور خصوصیات ظاہر ہوں گی۔

اُردو کے نثری اسالیب کے مطالعے میں لسان الصدق کے ان مضامین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قیمت: دو روپے پچاس پیسے

ناشر: نسیم بک ڈپو لکھنؤ

"بے مقصد شاعری کے حق میں نہیں اور بھرتی کے اشعار قطعی طور پر مجھے پسند نہیں۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ غزل میں اگر سب نہیں تو کم از کم تین چار اشعار ایسے ہوں جو نہایت شگفتہ، برجستہ، اور چونکا دینے والے ہوں . . . قدیم اور جدید شاعری کے امتزاج سے جو رنگ پیدا ہو سکتا ہے میں نے اُسے اختیار کرنے کی کوشش کی ہے"

مہر چند کوثر

"صبوحی" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) برنالہ، پنجاب اُردو اکاڈمی چنڈی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔ کوثر صاحب ۱۹۵۴ء سے شاعری کر رہے ہیں۔ غزل کے رسیا ہیں۔ اُمید ہے "صبوحی" کی غزلیں پسند کی جائیں گی۔

ابھی سے آ گئے آنسو تمہاری آنکھوں میں
ابھی تو خیر سے آغاز ہے فسانے کا

آنکھیں ہیں وہی رکھتی ہوں جو تاب نظارہ
جلوے ہیں وہی جن سے ہو تسکین نظر بھی

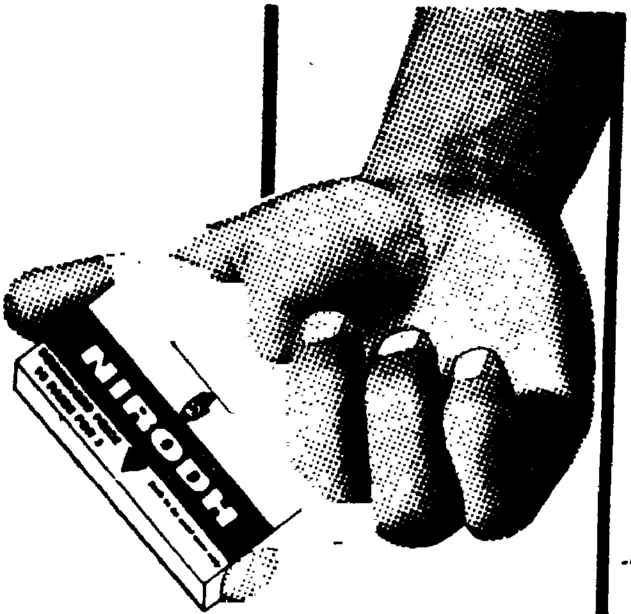
عمدہ گٹ اپ ہے۔ اچھی کتابت ہے۔ "صبوحی" کی غزلوں سے کوثر کے ذوق اور اُن کی ریاضت کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

بقیہ: جدید اردو شاعری

شہرت کی بھوک میں بھی جدیدیت کو اپنا رہا ہے۔ یہ شعر کو شعری محاسن میں تہی کرنے سے تہی ہے۔ اِن کے یہاں کثرت سے، مصرع یا شعر یا مکمل تخلیق بے وزنی ہوتی ہے۔ بحر کے ارکان کم و بیش کرتے وقت، الفاظ اُن پر پورے نہیں اُترتے اور نظم کا اکثر حصہ نثر کے مترادف ہو جاتا ہے۔ قافیے کے علم سے تو سرے سے ہی ناواقفیت ہے۔ قواعدِ زبان یا گرامر میں صیغوں جیسی آسان چیز کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس طرف کچھ توجہ دینا از بس ضروری ہے ورنہ ایسی جدید شاعری، اعلیٰ جدید شاعری کا کوڑا سمجھ کر نظر انداز کر دی جائے گی۔

لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جدید شاعری نے کچھ نہیں دیا ہے۔ اس میں فرد کی فکری زندگی اور مانگ اور اس کے اظہار کو بڑا دخل ہے۔ کل تک کی (قدیم) شاعری اس سے بے بہرہ تھی۔ آج کی جدید شاعری میں زندگی بسر کرنے کا جذبہ ہے اور اس کو سنوار کر گزارنے کا حوصلہ ہے۔ مایوسی ہے تو اُس سے فرار نہیں ہے، مجادلہ ہے۔ فکری تنہائی یا اکیلے پن کا کرب ہے، تو یہ بے جا نہیں ہے۔ چونکہ اِس سائنٹفک یا عقلی اور عملی عہد میں، زندگی رونے دھونے کا نام نہیں، زندگی آج کی ہر مشکل پر قابو پانے کا ایک ذریعہ ہے۔

البتہ اس عہد کی جدید شاعری کے بارے میں، میں یہاں تک کہتے نہیں ڈرتا کہ کل تک مارکسی نظریات کی شاعری کا ہماری اُردو شاعری پر زبردست دباؤ تھا! آج جدید امریکی، فرانسیسی اور انگریزی شاعری کا ہماری جدید شاعری پر غیر معمولی دباؤ ہے اور اثر ہے۔ اس سبب سے ہمارے اپنے ہندوستانی کلچر کی شاعری، ہمارے یہاں سے معدوم ہو چکی ہے۔ یہ دونوں دباؤ جب ختم ہو جائیں گے، اس وقت ہماری اپنی شاعری سُر رخ ہوگی۔ وہ جدید بھی ہوگی اور اعلیٰ بھی! اُس پر سومنہ اور ہزار باتوں کی تہمت بھی نہیں ہوگی۔



بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچہ تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

نرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کے کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

صرف 5 پیسے خرچ کر کے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کر سکتے ہیں

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پرویژن اسٹور، کریانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

70/61



۲ جون ۱۹۷۰ء کو وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی پانچ روزہ سرکاری دورے پر ماریشس پہنچیں جہاں اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ شریمتی گاندھی ہندوستان کی پہلی وزیرِ اعظم ہیں جو بحرِ ہند میں واقع اس جزیرے کے آزاد ہونے کے بعد تشریف لے گئی ہیں۔
(اوپر) وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی ماریشس کے فن کاروں اور ادیبوں کے ساتھ۔
(نیچے) ۶ جون ۱۹۷۰ء کو ماریشس کے وزیرِ اعظم شری رام غلام اور اُن کی اہلیہ محترمہ وزیرِ اعظم کو الوداع کہہ رہے ہیں۔





۸ جون ۱۹۷۰ء کو صدرِ جمہوریۂ ہند شری وی وی گری سوئٹزرلینڈ، فن لینڈ اور پولینڈ کے دورے پر تشریف لے گئے۔ پالم ہوائی اڈے پر وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی، اُن کے ساتھی وزراء اور ممبرانِ پارلیمنٹ نے اُنہیں الوداع کہا۔

Vol. 28 No. 12 AJKAL (Monthly) July 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509